

امریکہ اور اس کے اتحادی اٹھائیس ملک کی افواج کا اکیلے عراق کے خلاف جنگ کرنا کوئی بہادری نہیں اور نہ ہی قابلِ تحسین۔ بہادری تو اُس فردِ مجاہد کی ہے جو اللہ اکبر کا نعرۂ مستانہ لگاتے ہوئے بے خطر کود پڑا آتشِ نمرود میں عشق کے مصداق اٹھائیس ممالک کی نیند حرام کئے ہوئے ہے۔

اداریہ



ماہنامہ
شانِ ہند

جلد ۵۲ شمارہ ۱

چیف ایڈیٹر
سرور تونسوی

جوائنٹ ایڈیٹر
مطرب صحرائی

اشاعت کا
۵۲ واں سال

اس شمارے کی اہم جھلکیاں

امیر سعودیہ نے امریکہ کو اپنی حفاظت کے لئے بلا کر مسلمانانِ عالم کی توہین کی ہے ۔ بلبل چہ گفت ... سرور تونسوی

"جو شعر میں سنانے جارہا ہوں اس پر اگر آپنے داد نہ دی تو میرا دل ٹوٹ جائے گا ۔ سخن در سخن، خامہ بگوش کے قلم سے ۔

بندہ پوچھتا پھرتا ہے شہروں کی ہواؤں سے
ہزاروں سال پہلے کا کسی نے بن بھی دیکھا ہے
(دیپک قمر)

بد دماغ سے بد دماغی کا مظاہرہ ہو تو مجھے بڑا لطف آتا ہے ۔ جیسے وہ شخص اپنے ہی جوشاندہ میں جوش کھا رہا ہو ۔
ادھر ادھر کی ، رشید احمد صدیقی

کال گرل ، شعر سنیئے ، اگر آپکی سمجھ میں آجائے ؟ (اداریہ شذرے) "بسول کا مشاعرہ" (آنکھوں دیکھا کانوں سنا) ۔ ضمیر کی آواز ، (کہانی) حاصلِ مطالعہ ۔

حقیر آستانی ، عروج زیدی ، وجاہت علی سندیلوی، یوسف ثانی ، سوہن راہی کی غزلیں ـ بارگاہِ رسالتمآب (شورش کاشمیری کی نعت)

سرخ و سیاہ حاشیے ، باب انتقاد ، من کہ مکتوب الیہ ، مستقل کالم بدستور

پرنٹر ، پبلشر ، پروپرائٹر : وِدیا پرکاش سرور تونسوی
طباعت : خواجہ پریس ، جامع مسجد دہلی ۔ مقامِ اشاعت : دفتر ماہنامہ "شانِ ہند" فلیٹ ۵ انصاری مارکیٹ دریا گنج نئی دہلی ۱۱۰۰۰۲ ۔

ہندو پرست ہوں نہ مسلماں پرست ہوں
دامن پرست ہوں نہ گریباں پرست ہوں
ہر ذرۂ وطن سے ہے فیاض مجھ کو پیار
یعنی وطن پرست ہوں انساں پرست ہوں
فیاض گوالیاری

قیمت فی شمارہ ـ پانچ روپے
قیمت سالانہ پچاس روپے
لائف ممبری ...

ممالکِ غیر سے
بذریعہ سمندری ڈاک ـ/۱۰۰ روپے
بذریعہ ہوائی ڈاک ـ/۲۰۰ روپے

قارئینِ شانِ ہند کو
جشنِ جمہوریت
مبارک ہو

غزل

ڈاکٹر حقیر استانی مرحوم



میرے بعد میرا تذکرہ ہُوا تو کس لئے
میرے بعد بھی یہ حادثہ ہُوا تو کس لئے

میری ذات کا، مرے شعور کا، جنون کا
میرے بعد کوئی آئینہ ہُوا تو کس لئے

عشق تھا مجھے کہ وہ فتور تھا دماغ کا
میرے بعد یہ معائنہ ہُوا تو کس لئے

میں خیالِ خام تھا، کہ مرکزِ حیات تھا
میرے بعد اس کا فیصلہ ہُوا تو کس لئے

زندگی گزار دی حقیرؔ خواب کی طرح
میرے بعد میرا تجزیہ ہُوا تو کس لئے



خلیجی جنگ میں ہندوستانیوں کی
عراق سے ہمدردی

کشمیری مسلمانوں کی قومی دھارے میں شمولیت کی راہ ہموار کرنے میں معاون

مشرقِ وسطیٰ کی جنگ کی وجوہات کچھ بھی ہوں، مگر ہندوستان کے ہر غیر مسلم کو چاہیے تھا کہ عراق کے پریذیڈنٹ جناب صدام حسین کی مخالفت کسی طور بھی نہ کرتا۔ کیونکہ ہندوستانی

مسلمانوں کو اس جنگ میں مسلمانوں کی اجتماعی اموات اور مالی نقصان سے جو ذہنی کوفت ہوئی ہے، اس کے نتیجے میں امریکن پریذیڈنٹ کے پتلے جلائے جانے اور صدام حسین صاحب کی حمایت میں جلوس نکالے جانا ایک قدرتی امر تھا۔

جب ہم یہ کہتے ہیں کہ ہندوستانی مسلمانوں کو ہمارے ساتھ ایک ہی ملکی دھارے میں بہ جانا چاہیے اور کشمیری مسلمانوں کو بھی چاہیے کہ وہ علیحدگی کی خطرناک راہ چھوڑ کر ہندوستان کی ملکی سالمیت میں شامل ہو کر ایک ہی دھارے

میں آجائیں تو پھر آپ یک مرد مومن کے خواہشمند کیوں ہیں کہ مسلمان تو آپ کے ساتھ ایک ہی دھارے میں شریک ہوں، اور آپ مسلمانوں کے برے وقت میں اُن کے شریک غم نہ ہوں۔ تالی دونوں ہاتھوں سے بجتی ہے۔ آپ مسلمانوں کے شریک غم بنیئے، وہ آپ کے ساتھ ہر مرحلہ پہ ساتھ دینے کے لئے تیار ہوں گے۔

نہ ہی جنگ یقیناً موجودہ صورت حال اختیار کرتی اگر سعودیہ کے حکمران نے امریکی فوج کو اپنی حفاظت کے لئے نہ بلایا ہوتا۔ کیونکہ امریکہ تو چاہتا ہی تھا کہ یہ جنگ ہو اور وہ اپنی چودھراہٹ قائم کر سکے۔

امیر سعودیہ نے امریکہ کو اپنی حفاظت کے لئے بلا کر مسلمانان عالم کی توہین کی ہے اور وہ مسلم ممالک جو عراق کے خلاف امریکی جھنڈے تلے لڑائی میں شریک ہوئے ہیں انھوں نے بھی اپنی عقل و دانش کو امریکہ کے پاس گروی رکھ دیا۔ اور تو اور ہمارے پڑوسی ملک پاکستان نے بھی اپنی فوج سعودیہ میں بھجوائی۔ گو کہا یہ گیا ہے کہ پاکستانی فوج محض حرم پاک کی پاسبانی کرے گی، مگر یہ بھی ایک طرح سے

> **اُس نے مسئلۂ فلسطین جو تحت الثریٰ میں مدتوں سے دبا دیا گیا ہے، ایک ہی جنبش میں اُسے بام ثریا پر پہنچا دیا ہے۔**

عراق کی مخالفت کا کھلا ثبوت ہے۔

امریکہ اور اس کے اتحادی اٹھائیس ممالک کی افواج کا اکیلے عراق کے خلاف جنگ کرنا کوئی بہادری نہیں اور نہ ہی قابل تحسین۔ بہادری تو اس مرد مجاہد کی ہے جو اللہ اکبر کا نعرۂ مستانہ لگاتے ہوئے کود پڑا آتش نمرود میں عشق کے مصداق اٹھائیس ممالک کی نیندیں حرام کئے ہوئے ہے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ اس جنگ میں عراق کو ہر طرح کے جانی و مالی نقصان سے دوچار ہونا پڑ رہا ہے، مگر اس نے مسئلۂ فلسطین جو تحت الثریٰ میں مدتوں سے دبا دیا گیا ہے، ایک ہی جنبش میں اُسے بام ثریا پر پہنچا دیا ہے اور وہ مسلم ممالک جو امریکہ کے زیر سایہ اس جنگ میں شریک ہیں اُن کے لئے ایک سوالیہ نشان اسلامی جھنڈے پر لگا دیا ہے کہ مسلمانوں کے سب سے بڑے دشمن اسرائیل کو امریکہ کے سایہ میں پناہ دینے والوں میں شامل رہنا چاہتے ہو، یا محافظ اسلام صدام حسین کے عراقی پرچم کے ساتھ اپنے اپنے ملکوں کے پرچم لے کر اسرائیل سے فلسطین کا غصب کیا ہوا علاقہ واپس دلانا چاہتے ہو۔

مندرجہ بالا حقائق کے پیش نظر اگر ہندوستان کا مسلمان صدام حسین کی حمایت اور امریکن پریزیڈنٹ بش کی مذمت میں نعرہ زن



بیا برادر
آ رے بھائی

ہے تو کسی غیر مسلم کو اس سے حق کیوں ہے چاہیے تو یہ تھا کہ ہندوستان کا ہر شخص بلا تخصیص مذہب و ملت اپنے مسلمان بھائیوں کے ساتھ ہم زبان ہو کر صدام حسین کی حمایت میں نعرہ زن ہوتا تا کہ مسلمان یہ سمجھنے میں حق بجانب ہوتا کہ ہمارے ملک کے غیر مسلم ہمارے ساتھ ہیں، تو ہم کیوں نہ اُن کے ساتھ مل کر ملکی سالمیت کے دھارے میں شریک ہوں اور کیوں نہ کشمیر کے مسلمانوں سے کہیں کہ وہ ہندوستان کے ساتھ رہنے میں ہی اپنی عافیت سمجھیں، اور اُسی دھارے میں وہ بھی شامل ہوں جس میں باقی ہندوستان کے مسلمان شامل ہیں۔

ہمیں افسوس سے کہنا پڑتا ہے کہ غازی آباد میں صدام حسین کی حمایت میں نکالے گئے جلوس پر حملہ کیا گیا۔ حملہ کرنے والے کون ہیں، یہ کسی سے پوشیدہ نہیں۔

ہم دل و جان سے چاہتے ہیں کہ ہر ہندوستانی خواہ وہ کسی بھی مذہب و ملت کا ہو صدام حسین کی حمایت میں امریکی صدر سے احتجاج کرے کہ وہ عربوں کے خون کے بہانے میں فراخ دلی سے کام نہ لے۔ ہم حکومتِ ہند کے اس اقدام کی قدر کرتے ہیں کہ اُس نے عراق کے خلاف اپنی افواج نہ بھیج کر غیر جانبدار ہونے کا ثبوت دیا۔ مگر اس کا کیا علاج کہ امریکی ہوائی جہازوں کو دورانِ جنگ بمبئی، آگرہ اور مدراس کے ہوائی اڈوں سے ایندھن مہیا کیا گیا۔ یہ اقدام امریکہ سے کچھ قرض لینے میں سہولت فراہم کر سکتا ہے مگر ہماری دیرینہ غیر جانبداری کو اس سے جو دھکا پہنچا ہے اس کا اندازہ شاید ہماری حکومت نہ لگا سکے۔ یہ بھی کوئی تعریف کے قابل نہیں کہ ہمارے ہاں کے ذرائع ابلاغ، ریڈیو، ٹیلی ویژن اور غیر مسلم میڈیا نے مشرقِ وسطیٰ کی جنگ میں کھلے الفاظ میں امریکن لابی کو ہی مقدم جانا۔

ہم بی۔ جے۔ پی کے اس موقف کی یقیناً تعریف کریں گے جو اُس نے اپنے بھوپال کے اجلاس میں خلیجی جنگ کے خاتمہ کے لئے اختیار کیا۔

ہماری یہ دلی خواہش ہے کہ ہندوستان کا ہر شخص خلیجی جنگ میں صدام حسین کی حمایت کرے اور امریکن طریقِ کار کی مذمت۔ کیونکہ صدام حسین نے کشمیر کا معاملہ ہو یا تیل کی بہم رسانی کا، ہندوستان کا ہمیشہ ساتھ دیا۔

کال گرل

سید مظفر حسین برنی کا انکشاف، ایک غیر مُلکی تصنیف کی روشنی میں

حال ہی میں دلی کے ایک پریس آفیسر مسٹر عظیم اختر کی تصنیف لطیف "حرفِ نیم کش" کی رسمِ رونمائی کے موقع پر خاصی دلچسپ باتیں سننے کو ملیں۔ کیونکہ اس کتاب میں عظیم اختر صاحب نے اردو کے لیکچرار حضرات، اردو کے شعراء، ادیبوں، نقادوں، اردو اکادمی کے ممبران، اردو کی کتابوں پر ایوارڈ یافتہ حضرات، اردو کے مختلف موضوعات پر سیمینار کرانے والوں اور اُن سیمیناروں میں مقالہ پڑھنے والوں، اردو کے مختلف موضوعات کو مدِ نظر رکھتے ہوئے تھیسس لکھنے والوں اور ان کے گائیڈ پروفیسروں، اردو کے مجاہدوں، اردو اکادمیوں کی طرف سے اردو تصانیف کے مسودوں کو اکادمی کی مالی امداد سے شائع کرانے والے درجنوں مسائل پر جن چبھتے ہوئے اور طنزیہ انداز میں چوٹیں کی ہیں، ان سے متعلق اس تقریب میں مقالات پڑھنے اور تقریر کرنے والوں میں مہمانِ خصوصی جناب سید مظفر حسین برنی کی تقریر گو انتہائی مختصر تھی، مگر جب انھوں نے فرمایا کہ اردو سے متعلق سیمیناروں میں ہی یہ رسم نہیں پائی جاتی کہ من ترا حاجی بگویم تو مرا ملا بگو پر عمل کیا جاتا، بلکہ یہ بیماری بین الاقوامی سطح تک ہر زبان سے متعلق سیمیناروں میں پائی جاتی ہے۔ اگر کسی جاپانی دانشور نے کسی چینی دانشور کو اپنے یہاں کسی سیمینار میں بلایا ہے تو یہ چینی دانشور اپنے ہاں کسی منعقدہ سیمینار میں اپنے اس محسن جاپانی دانشور کو بلاتا ہے۔ اور یہ سلسلہ اسی طرح چل رہا ہے۔ چنانچہ اسی موضوع پر ایک غیر ملکی مصنف کی تصنیف شائع ہوئی ہے جس کا نام ہے "کال گرل" ـــــ تو ہمارے اردو دانشوروں کے منہ تک کر رہ گئے۔

"کال گرل" کتاب کا نام رکھنے والے اس غیر ملکی مصنف کو اگر لٹریچر کے نوبل پرائز سے نوازا جائے تو بھی کم ہے۔ کیونکہ آجکل ہر زبان کے کے خود ساختہ "مجاہدین" نے خود نمائی اور جلبِ زر سے متعلق جو طریقے اختیار کر رکھے ہیں، وہ سمگلروں اور وطن دشمنوں کے طریقہ ہائے کار سے مختلف نہیں ہیں۔

دوسری زبانوں سے متعلق تو ہم ذاتی طور پر کچھ کہنے کی اہلیت نہیں رکھتے مگر زبانِ "اردو" کے مجاہدین نے جو لوٹ مچا رکھی ہے اور "من ترا حاجی بگویم تو مرا ملا بگو" کے قول پر کار بند ہو کر جن منصوبہ بند طریقوں سے اپنا الو سیدھا کر رہے ہیں، وہ یقیناً "کال گرل" کہلائے جانے کا مستحق ہے۔

شعر سنیئے! اگر آپ کی سمجھ میں آجائے!

اُردو اکادمی دہلی اور ساہتیہ کلا پریشد کا مشترکہ مشاعرہ جشنِ جمہوریت ۲۲، جنوری ۱۹۹۱ء کو لال قلعہ میں منعقد ہُوا۔ اس مشاعرہ میں ایک شاعر ممتاز ارشد نے کلام سُنانے وقت سامعین مشاعرہ سے مخاطب ہوتے ہوئے کہا کہ "شعر سنیئے، اگر آپ کی سمجھ میں آجائے۔"

اس قسم کی تعلّی وہ شاعر کیا کرتے ہیں جنھیں احساسِ کمتری کا احساس بڑی طرح سے ہوتا ہے اور وہ اپنے اس احساسِ کمتری کو دبانے کی غرض سے اس قسم کی حرکتیں کرتے ہیں اور بظاہر یہ تأثر دینے کی کوشش کرتے ہیں کہ وہ بہت بڑے شاعر ہیں اور اُن کے کلام کو سمجھنا کوئی آسان بات نہیں ہے۔ حالانکہ حقیقت یہ ہوتی ہے کہ نہ تو وہ بڑے شاعر ہی ہوتے ہیں اور نہ ہی اُن کے کلام میں کوئی خاص بات ہوتی ہے، بلکہ قطعاً سطحی اور گھٹیا درجہ کا کلام ہوتا ہے۔ رہی یہ بات کہ "شعر سنیئے، اگر آپ کی سمجھ میں آجائے" والا مُعاملہ، تو ایسے شاعروں کا یہ علم بخوبی ہوتا ہے کہ سامعین میں بعض لوگ ایسے بھی ہوتے ہیں جو ایسے شاعر کو تو کیا اُس کی سابقہ سات پشتوں کو بھی برسوں درس دے سکتے ہیں۔ ممتاز ارشد کو یا خدا اس لئے نہیں اُترا، کہ اُن کی کچھ غزلیں مشہور مغنی بیگم اُدھاس نے گائی ہیں۔ اور عوام یہ بھی بخوبی جانتے ہیں کہ ممتاز ارشد نے مشہور شاعر جناب قتیل شفائی کے کلام کا چربہ کس قدر بھونڈے انداز میں اُتارا ہے۔

ممتاز ارشد اُس سرزمین پہ پیدا ہوئے ہیں جہاں تعلّی خلافِ تہذیب سمجھی جاتی ہے اور کسی کو اپنے سے کمتر سمجھنا غیر مہذب ہونے کی علامت۔

اُمید ہے کہ آئندہ وہ مشاعروں میں کلام سُنانے وقت سامعین کی اس طرح توہین کرنے سے گریز کریں گے۔

فکر مت کیجیے!

خوش رہیے!

لازمی بنیادی عناصر، وٹامنوں اور جڑی بوٹیوں کا نادر مرکب

اب کوئی اور دباؤ یا تناؤ نہیں!

روزمرہ کی زندگی کی اُلجھنیں، پیچ در پیچ مسئلوں کا بوجھ اور اس پر مزید یہ کہ صبح سے لے کر شام تک کاموں میں جُٹے رہنا آپ کے لیے اعصابی دباؤ اور غیر معمولی تھکاوٹ کا سبب بنتا ہے۔ سنکارا ہمیشہ ہر حال میں آپ کی تھکن اور تناؤ کو دُور کرتا ہے اور خرچ شدہ قوت کو تیزی سے بحال کرتا ہے۔ یہ قدرتی خون کو تیز کرتا ہے، بڑھی ہوئی بے چینی سے بچا کر رکھتا ہے اور نظامِ ہضم کو درست رکھنے میں مدد دیتا ہے۔ سنکارا سے چاق و چوبند رہ کر دنیا کی جدوجہد کا کامیابی سے مقابلہ کیجیے۔

خواتین کے لیے ایک نعمت!

آپ گھریلو کام کاج اور کنبے کی دیکھ بھال میں اپنا سارا وقت صرف کرتی ہیں، لیکن آپ خود اپنے لیے کیا کرتی ہیں! کیا آپ تھکن اور اکتاہٹ محسوس کرنے لگی ہیں؟ سنکارا لینا اپنا روزمرہ کا پروگرام بنایئے۔ یہ آپ کو نئے سرے سے چستی اور طاقت پہنچائے گا۔ حاملہ اور دودھ پلانے والی خواتین کے لیے سنکارا خاص طور پر مفید ہے، کیونکہ اس میں فولک ایسڈ، وٹامن بی اور آئرن شامل ہے۔ سنکارا سے نئی قوت حاصل کیجیے اور خوش و خرم زندگی گزاریے۔

طالب علموں کے لیے نہایت اہم!

کلاسوں کی مصروفیت، ہوم ورک میں اضافہ، امتحانات کی بوجھل تیاری اور طاقت محنت والے کھیل کود کی وجہ سے بچے تھک جاتے ہیں۔ دماغی اور جسمانی قوت کے زیادہ خرچ سے ان میں سستی پیدا ہو جاتی ہے۔ خوشی کی بات یہ ہے کہ سنکارا اس تمام ناخوشگوار حالت کو بدل دیتا ہے۔ اس میں موجود طاقت بخش اجزا، (خاص طور سے زنک اور آیوڈین) دماغی خلیوں کو لازمی قوت بخشتے ہیں اور طالب علموں میں سیکھنے اور یاد کرنے کی صلاحیت کو بہتر بناتے ہیں۔

ہر فرد کے لیے ہر موسم میں مفید!

سنکارا میں آپ کے کنبے کی طاقت کے لیے تمام ضروری مقوی اجزا، وٹامن اور بہت سی جڑی بوٹیاں شامل ہیں۔ سنکارا مکمل الکوحل اور کیفین سے پاک ہے۔ اس لیے اس سے نشہ نہیں ہوتا اور نہ ہی اس کی عادت ہوتی ہے۔

• کمزور اور ناتواں ہو جانے کی صورت میں • سخت محنت والے کام • وٹامن کی کمی • صحت کی بحالی • وزن کی کمی • تغذیہ کی خرابی اور تھکاوٹ میں • غذا کو زیادہ سے زیادہ جزو بدن بنانے • طالب علموں کی دماغی اور ذہنی نشو و نما • حاملہ اور دودھ پلانے والی خواتین کے لیے خاص طور سے سنکارا لینے کی سفارش کی جاتی ہے۔

ہمدرد سنکارا

مشہور عالمی ٹانک — ہر موسم میں سب کے لیے

HTA 8772 URD

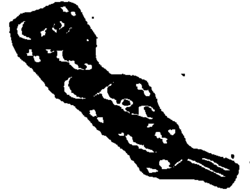


ایکتا پریڈ

ہمارے مرد، عورتیں اور بچے،
ہندو، مسلم، سکھ، عیسائی،
بودھ، جین، پارسی .....
مشرق سے، مغرب سے، شمال سے، جنوب سے
ملک کے چاروں کونوں سے ہزاروں کی تعداد
میں یومِ جمہوریہ کی تقریبات میں حصہ لینے کیلئے
آتے ہیں۔
اس طرح وہ ایک بار پھر ایکتا اور اتحاد کا مظاہرہ
کرتے ہیں اور ذات پات، نسل و مذہب،
خطے اور زبان کی رکاوٹوں کو توڑنے کیلئے خود کو
وقف کر دیتے اور ہمارے کروڑوں عوام کی
فلاح و بہبود کے لیے کام کرتے ہوئے قوم کو
لوہے کی طرح مضبوط بنانے کا عہد کرتے ہیں۔

آئیے پریڈ کے جذبے کو برقرار
رکھیں اور مل کر آگے بڑھیں۔

cavp 90-750.



اٹھارہ سال بیشتر کا ایک یادگار مشاعرہ

سولن کا مُشاعِرہ

شبابؔ ایشیائی

یہ سولن کا ٹھوڈو گراؤنڈ ہے۔ سہ پہر جون کی خوشگوار شام اور رات کے دس بجا چاہتے ہیں۔ آج یہاں آنجہانی پدم شری کرنل موہن کی یادگار میں ایک عظیم الشان مشاعرہ منعقد ہو رہا ہے۔ مشاعرہ گاہ سامعین اور اہلِ ذوق سے کھچا کھچ بھرا ہوا ہے اور اسٹیج خوبصورتی سے آراستہ کیا گیا ہے۔ اس کے پیچھے مرحوم کرنل موہن کی ایک قدِ آدم عظیم تصویر آویزاں کی گئی ہے۔

سٹیج پر شعراء حضرات خوش گپیوں میں معروف ہیں ان میں ساحر ہوشیارپوری۔ جگن ناتھ آزاد۔ نذیر بنارسی۔ رام کرشن مضطر۔ وسیم بریلوی۔ عزیز وارثی۔ عالم فتحپوری۔ عرش صہبائی۔ شباب للت۔ [illegible] اشک۔ ہلال سیوہاروی۔ راز گلاٹی۔ راہی شہابی۔ میرا قزلباش۔ جمیلہ بانو۔ ساغر بیگم۔ مس نکہت خاں اور دوسرے شعراء جو باہر سے تشریف لائے ہیں پیش پیش نظر آ رہے ہیں۔ شملہ سے کاہن سنگھ جمال، طلعت عرفانی، کرشن کمار طور، سریش چندر شوق۔ ارمان شہابی۔ احسن رضوی۔ ضیا صدیقی۔ کلام پڑھنے کے لئے بے تاب ہیں۔ اب عالی جناب لال چند پرارتھی وزیر محکمہ جنگلات ہماچل جو بہت اچھے شاعر، نباضِ سخن مقرر اور آرٹسٹ بھی ہیں اور چاتک تخلص فرماتے ہیں۔ ڈائس پر تشریف لائے ہیں۔ ان کے ساتھ کانگڑہ کے ہونہار نوجوان شاعر ساغر پالم پوری بھی ہیں بخشی [illegible] اپنا کلام سنا رہے ہیں۔ اور کرنل موہن کی ذاتِ گرامی کے بارے میں اپنے تاثرات کا ذکر کر رہے ہیں کنور مہندر سنگھ بیدی سحر بھی مشاعرہ کے فرائض سرانجام دے رہے ہیں۔

انہوں نے حضرت چاند کلوی کی آمد پر خوشی کا اظہار کرتے ہوئے اعلان کیا کہ اب صحیح معنوں میں مشاعرہ کا آغاز ہوتا ہے تاخیر کے لئے سامعین سے معافی مانگ لی ہے۔ سحر صاحب نے چاند کلوی سے درخواست کی کہ وہ صدر مشاعرہ کے فرائض سرانجام دیں۔ چاند صاحب نے اپنے مخصوص انداز میں آگے بڑھتے ہوئے صدارت کی مسند سنبھالی جلد ہی مشاعرہ میں ایک اشتیاق کی لہر دوڑ گئی ہے اور سب نے اپنی نظریں سٹیج کی جانب مرکوز کر دی ہیں۔ چاند کلوی نے مشاعرہ شروع کرنے سے پیشتر اپنی مختصر مگر پُرمعنی تقریر میں حاضرین سے خطاب کرتے ہوئے فرمایا کہ آنجہانی کرنل موہن ایک فرشتہ سیرت انسان تھے انہیں آرٹ کلچر اور اردو ادب و شاعری سے بے حد محبت اور لگاؤ تھا۔ حب الوطنی کا جذبہ ان میں کوٹ کوٹ کر بھرا ہوا تھا۔ ان کی یاد اور پیار و محبت کو تازہ کرنے کے لئے۔ شری [illegible] منیجر سولن بریوری نے آج اس عظیم مشاعرہ اور اجتماع کا اہتمام کیا ہے۔ اس کے لئے وہ مبارکباد کے مستحق ہیں۔ یہ سلسلہ جب تک ممکن ہو جاری رہنا چاہیئے۔

صدر مشاعرہ مرحوم کرنل موہن کو خراجِ عقیدت پیش کر رہے ہیں۔ اور مجھے ڈاکٹر اقبال کا یہ شعر یاد آگیا ہے

ہزاروں سال نرگس اپنی بے نوری پہ روتی ہے
بڑی مشکل سے ہوتا ہے چمن میں دیدہ ور پیدا

دیکھئے۔ کاہن سنگھ جمال مائک پر تشریف لا رہے ہیں اور چند قطعات مرحوم کرنل موہن کی یاد میں اور ایک

قطعہ مرحوم ڈاکٹر محمود جو ان کی ایک مشہور و معروف ادبی ہستی تھے، کے بارے میں پڑھ رہے ہیں۔ شور و غل میں مجھے کچھ سنائی نہیں دے رہا ہے صرف یہی سُن رہا ہوں ؎

عمر بھر روئے گی یہ جانِ وفا تیرے بعد

اب میرِ مشاعرہ نے جناب ہلالؔ سیوہاروی کو دعوتِ سخن دی ہے۔ جو مزاحیہ رنگ میں شاعری کرتے ہیں انسان کے بارے میں یہ قطعہ بہت پسند ہوا ہے ؎

یہ سمجھتا تھا کہ انسان خُدا تھا پہلے
دیوتا تھا یا کوئی بھوت بلا تھا پہلے
آج کے دور میں جو لیڈر کو دیکھا میں نے
تو میں سمجھتا ہوں کہ انسان گدھا تھا پہلے

میرِ مشاعرہ کی فرمائش پہ ہلالؔ صاحب اپنی مشہور نظم

عورت کی مانگ ہے اس دیش میں کم کیجئے

پڑھ رہے ہیں جو بے حد پسند کی جا رہی ہے۔ ان کے بعد سائرہ بیگم مائک پر تشریف لے آئی ہیں اور اپنی غزل ترنم میں پڑھ رہی ہیں۔ اب میرِ مشاعرہ کنور مہندر سنگھ بیدی سحرؔ نے اعلان کیا ہے کہ وہ اپنی نظم پڑھیں گے۔ جو انہوں نے ۱۹۷۱ء کی جنگ پاکستان سے متاثر ہو کر قبلہ جوش ملیح آبادی کی نظم کے جواب میں کہی ہے اس نظم نے اہلِ مشاعرہ کے دل موہ لئے ہیں۔ ایک ایک بند لاجواب ہے اپنا کلام پڑھنے اور خوب داد حاصل کرنے کے بعد انہوں نے فرمایا ہے کہ وہ کھانا کھانے جا رہے ہیں ان کی جگہ تھوڑی دیر کے لئے جناب رشن اشک سینئر سکریٹری کے فرائض سر انجام دیں گے۔ چنانچہ اشک صاحب نے باری باری جناب آزاد گلاٹی، ارمان شہابی کو دعوتِ سخن دی ہے جنہوں نے سامعین سے دل کھول کر داد لی ہے۔ جناب ساغرؔ پالم پوری مرحوم کرنل موہن کے اعزاز میں اپنی طویل نظم سنا رہے ہیں اس کا ایک بند ملاحظہ ہو ؎

تنگ احساس پہ کیا برق گرائی تو نے
اک جواں سال کی کیوں ہستی مٹائی تو نے
دلِ شاعر پہ یہ کیا چوٹ لگائی تو نے
اے اجل کونسی صندل تھی جو جلائی تو نے

محفلِ ادب کی تو جان تھے کرنل موہن سچے معنوں میں ایک انسان تھے کرنل موہن۔ ساغر صاحب اپنی تازہ غزل ترنم میں پڑھ رہے ہیں۔ جس کیلئے ان کو خوب داد مل رہی ہے ؎

پھر تصور میں ترا نقش اُبھر آیا ہے
صبح کا بھولا ہوا شام کو گھر آیا ہے
اس کی لہروں میں تڑپتا ہے ترا عکسِ جمیل
وہ جو دریا ترے گاؤں سے گزر آیا ہے

ہاں ! اب لمرِ کشمیر جواں سال شاعر عرشؔ صہبائی مائک پر تشریف لائے ہیں۔ ان کا نام سنتے ہی شعرا حضرات اور سامعین چونک اُٹھے ہیں تحت اللفظ میں کلام پڑھنے میں کمال رکھتے ہیں۔ واہ واہ کے شور کا یہ عالم ہے کہ ان کی غزل کے چند اشعار ہی سُن سکا ہوں ملاحظہ فرمائیے ؎

دل میں ہیں جذبۂ قُرب و درد کے پیکر کتنے
ایک قطرے میں سمائے ہیں سمندر کتنے
اپنی آنکھوں سے لگایا انہیں پھولوں کی طرح
حق پرستوں پہ برستے رہے پتھر کتنے
غیر ممکن تھا کہ میں دستِ طلب پھیلاتا
سامنے میرے چھلکتے رہے ساغر کتنے

عرش صاحب کے بعد جناب احسن رضوی کو دعوتِ سخن ملی ہے۔ ان کی غزل کا میں ایک ہی شعر نوٹ کر پایا ہوں ؎

اس مطلعِ ہستی پہ ستارے سا اُبھر آئیں
چھٹ جائے اگر تھوڑی افکار کی بدلی

اب حضرت بمل کرشن اشکؔ نے آواز دی کہ وہ اپنا کلام سُنا رہے ہیں۔ سولن شہر کے بارے انہوں نے ایک خوبصورت رُباعی پیش کی ہے سُنئے ؎

ان جلووں کا اہتمام لے کر آتا
یہ چہرے پہ درد و بام لے کر آتا
اے رہبرِ و تیز گام جب تو لوٹے
اس شہر کی ایک شام لے کر آتا

اشک صاحب کا پڑھنے کا انداز اپنا ہی ہے۔ جو کم شعرا کو حاصل ہوگا۔ جب وہ رُباعی پڑھ چکے تو مجھے مرحوم اخترؔ شیرانی کی طویل نظم کا ایک شعر یاد آگیا جو انہوں نے سولن کے پر فضا مقام کے بارے میں کہی تھی ملاحظہ ہو ؎

سولن کی وادیوں میں ہمیں کب بلاؤ گے
پھر مہر و وفا کی راہ ہمیں کب دکھاؤ گے

ہماچل کے مشہور و معروف غزل گو شاعر جناب ساحرؔ ہوشیار پوری جو چھوٹی بحر میں شعر کہتے ہیں۔ اہلِ مشاعرہ سے مخاطب ہو رہے ہیں ان کی غزل کے چند اشعار قابلِ غور ہیں ؎

کیوں کہا تھا وفا شعار مجھے
اب ہے اپنا ہی انتظار مجھے
سر بلندی میرے ضمیر میں ہے
میں ترا نقش ہوں اُبھار مجھے
اپنے بندوں سے جنہیں پیار نہیں
ایسی دُنیا سے کیوں ہو پیار مجھے

اس کے بعد باری باری کرشن کمار طورؔ۔ رام کرشن مضطرؔ۔ عزیز وارثی۔ شباب للت، راجی شہابی سے طلعت عرفانی نے اپنا اپنا کلام سُنا کر حاضرینِ مشاعرہ سے خوب داد حاصل کی ہے۔ رات کے دو بج گئے ہیں۔ کچھ لوگ اُٹھ کر چلے گئے ہیں مگر اہلِ ذوق کے اشتیاق کا صبر قابلِ داد ہے۔ اب قومی شاعر جناب نذیر بنارسی کو دعوتِ سخن دی گئی ہے۔ پست قامت کشادہ پیشانی چہرہ پُر جلال۔ کا یہ عالم کہ والہانہ انداز میں اپنا کلام کہتے ہیں۔ ان کو کمال حاصل ہے ان کی ایک غزل کے چند اشعار ملاحظہ ہوں۔ ؎

آج تک نہ دل سے نکلی نہ نکلے گی
میری حسرت ہے کسی پھول کی خوشبو تو نہیں
ہندوؤں کو شک ہے کہ مسلمان ہے نذیر
مسلمان کو شک ہے کہ ہندو تو نہیں

اب جنابہ جمیلہ بانو اپنی غزل ترنم میں پڑھ رہی ہیں چند اشعار قابلِ غور ہیں۔ ؎

ابھی تو ہے ایسی نگاہِ شعور اے ساقی
کہ زندگی جاگ اُٹھے میکدہ سنبھل جائے
وہ صبح آئے کہ پھر جس کی کوئی شام نہ ہو
جو تیرا خواب میرے خواب سے پہلے بدل جائے

اس کے بعد جناب وسیم بریلوی مائک پر آئے ہیں۔ اُن کا ترنم لاجواب ہے خوب داد حاصل کر رہے ہیں۔ چند اشعار سنئے ؎

عجیب درد کا رشتہ دکھائی دیتا ہے
کہ ہر غم آشنا اپنا دکھائی دیتا ہے
جسے تیری طرح جینے کا سلیقہ ہو
اُسی نگاہ پہ پہرہ دکھائی دیتا ہے

اب حضرت عالم فتحپوری تحت اللفظ میں اپنا کلام پیش کر رہے ہیں ان کی مشہور نظم "انسان بنو" کے لئے سامعین دل کھول کر داد دے رہے ہیں۔ ایک شعر ملاحظہ ہو ؎

میرے بیٹے ہو تو ہندو نہ مسلمان بنو
عہد حاضر کا تقاضا ہے کہ انسان بنو

ان کے بعد شمع کے مقبول نوجوان شاعر سرشچندر شوق کی باری آئی ہے ان کی غزل کے چند اشعار جن پر ان کو خوب داد ملی ملاحظہ کیجئے ؎

کبھی پھولوں سے بھی دکھتا ہے بدن انسان کا
اور نیند کبھی اسکو کانٹوں پر بھی آجاتی ہے
زندگی کے لئے تنہائی تو لازم ہے۔ مگر
ہو مسلسل تو یہ انسان کو کھا جاتی ہے

دہلی کے جواں سال شاعر امیر آغا قزلباش جب ترنم میں اپنی غزل پڑھ چکے تو میر مشاعرہ نے اعلان کیا کہ اب وہ شاعر آپ سے مخاطب ہو رہے ہیں جن کو شاعری ورثہ میں ملی ہے۔ یہ ہیں جناب جگن ناتھ آزاد آنجہانی قومی شاعر منشی تلوک چند محروم کے فرزند ارجمند۔ آزاد صاحب نے معذرت چاہی کہ ان کی طبیعت ناساز ہے اسلئے صرف فرض کی ادائیگی کر پائیں گے۔ انہوں نے کہا کہ مرحوم کرشن موہن نے ان کے والد سے اردو سیکھا ہے۔ آزاد صاحب نے کلام سے اہل مشاعرہ کو وجد میں لا دیا ہے۔ ہر طرف سے واہ واہ کی صدا سنائی دے رہی ہے نمونہ ملاحظہ ہو۔

؎ نظر میری پہنچنے ہی پائی تیرے چہرے پر
تیرے چہرہ پر جلووں کی کچھ ایسی پاسبانی تھی
خواہاں تجھ سے ملنے کا یقیں لیکن نہیں آتا
خدا جانے تیرا ملنا حقیقت تھی کہانی تھی

ان کی ایک تازہ غزل کے چند اشعار بھی سنئے ؎

اے دلِ ناداں نہ کر شکوہ آرائی بہت
بزم میں اہل نظر کم ہیں تماشائی بہت
کچھ نہ کچھ رفعت شعر سے پائی ضرور
لیکن اس فن سے ہوئی ہے رسوائی بہت

اب صدر مشاعرہ فخر کور جناب چاند کوی کو میر مشاعرہ نے دعوت سخن دی ہے۔ چاند صاحب جہاں بھی جاتے ہیں مشاعرہ کو لوٹ لیتے ہیں۔ ہمیں حیرانی ہوتی ہے کہ انتہائی مصروفیات کے باوجود وہ اس قدر فصیح و بلیغ کلام کہنے کا وقت کب نکالتے ہوں گے۔ اس تھوڑے سے عرصہ میں آسمانِ ادب پر ان کا نام بجلی چاند چمک رہا ہے۔ جناب چاند کی طرح غزل تحت اللفظ میں پڑھ رہے ہیں اور شعرا حضرات و سامعین ایک ایک شعر پر بے پناہ داد حاصل کر رہے ہیں ان کی مرصّع غزل کے چند اشعار سنئے ؎

مجھ سے نہ کیجئے دو جہاں کی بات
جب تک سمجھ نہ پائے کوئی دوستی کی بات
پھیری نگاہ اس نے بھی تقدیر کی طرح
اتنی کہاں تھی تاب دلِ ناتواں کی بات
تب تک گھٹا گھٹا سا رہے گا زمیں کا دل
جب تک سمجھ نہ پائے گی یہ آسماں کی بات
ابھرے رہو خیال میں ماضی کے حادثو!
شاید رہے نہ یاد کبھی رفتگاں کی بات

شعرا حضرات اور سامعین کے اصرار پر ان کو ایک تازہ غزل پڑھنے پر مجبور کیا گیا۔ واہ کیا خیالات اور کیا بلند طبع آزمائی کی داد دیجئے ؎

مقام شوق تک میرا دکھائی دیتا ہے
چمن سے تا افق کے قریب محل میں
خزاں کا پھول بھی کھلتا دکھائی دیتا ہے
کے شعور کے تھکے ہوئے الاؤ میں
ہر جسم پگھلتا دکھائی دیتا ہے

اب رات کے تین بج چکے ہیں۔ میر مشاعرہ نے اہل سولن کا شکریہ ادا کرتے ہوئے مشاعرہ کی کارروائی کو ختم کرنے کا اعلان کر دیا۔ اور اہل ذوق اور شعرا حضرات سٹیج پر ایک دوسرے کو مبارکباد دینے کیلئے جمع ہوگئے ہیں۔ جناب چاند کوی کے ارد گرد بہت زیادہ ہجوم لگ گیا ہے۔ میں تو سولن مشاعرہ سننے آیا ہوں۔ میں ان شعرا حضرات سے معذرت چاہوں گا جن کا کلام مجھے یاد نہیں رہا یا نوٹ نہیں کر سکا۔

سُخن در سُخن

خامہ بگوش

اگر کوئی ہمارے تین پسندیدہ شاعروں کے نام پوچھے تو ہم رسوائی کے خوف سے بے نیاز ہو کر میر غالب اور بشیر بدر کے نام لیں گے میر و غالب کے نام تو تین کی تعداد پوری کرنے کے لیے ہیں، ورنہ اصل پسندیدہ شاعر ایک ہی ہے۔ میر و غالب کے نام اس لئے بھی ذہن میں آتے ہیں کہ ایک مرتبہ کسی انٹرویو لینے والے نے بشیر بدر سے سردار جعفری، مجروح سلطان پوری اور کیفی اعظمی کے بارے میں ان کی رائے پوچھی، تو انہوں نے فرمایا کہ میرا معاملہ تو میر و غالب سے ہے، وہی میرے حریف ہیں اور میں انہیں اپنا حریف سمجھتا ہوں۔

بشیر بدر کی شاعری کی تعریف میں ہم صفحوں کے صفحے سیاہ کر سکتے ہیں، جن کی سیاہی کسی بھی گناہ گار کے نامۂ اعمال کی سیاہی سے مقابلہ کر سکتی ہے، لیکن ان کی شاعری سے زیادہ جو چیز ہمیں پسند ہے، وہ مشاعروں میں کلام سنانے کا انداز ہے، بلا شبہ انہوں نے اپنے لئے ایک نئی راہ نکالی ہے، مشاعرے میں وہ اپنی آواز کا جادو اس طرح جگاتے ہیں کہ سامعین ان کے ایسے شعروں پر بھی داد دینے پر مجبور ہو جاتے ہیں، جو اگر کوئی دوسرا شاعر سنائے، تو داد کی بجائے سزا کا مستحق قرار پائے، شعروں کے ساتھ ساتھ بشیر بدر کو ان کی نثر پر بھی داد ملتی ہے، ہر شعر سے پہلے وہ ایک آدھ جملہ مزید ارشاد فرماتے ہیں، جو کچھ اس قسم کا ہوتا ہے۔

• جو شعر میں سنانے جا رہا ہوں، اس پر اگر آپ نے داد نہ دی تو میرا دل ٹوٹ جائے گا۔

• میں کتنے دور سے چل کر آپ کے شہر میں آیا ہوں، یقین ہے کہ مجھ مسافر کو آپ شجرِ داد کے سائے سے محروم نہیں رکھیں گے۔

• میں اپنا کلام صرف سخن فہموں کو سناتا ہوں اور ان سے داد پاتا ہوں، آپ سخن فہم ہیں، اس لئے آپ کی داد میرے لیے سند کا درجہ رکھتی ہے۔

ذرا دیکھئے اس شعر میں میں نے کیسی نازک بات کہی ہے، یہ نازک بات نہیں، نازک شیشہ ہے، یہ شیشہ آپ کی خاموشی کے پتھر سے ٹوٹ جائے گا، اس لئے داد سے محروم نہ رکھیے گا۔

ایک مرتبہ ہم نے ایک شاعر کے بارے میں لکھا تھا کہ وہ بہت وسیع المطالعہ ہیں، کیونکہ سارا سال مشاعرے پڑھتے رہتے ہیں بشیر بدر بھی وسیع المطالعہ ہیں، لیکن ان کا مطالعہ مشاعروں تک محدود نہیں ہے، انہوں نے اردو ادب خصوصاً جدید اردو غزل کا گہرا مطالعہ کیا ہے، ۱۹۴۷ء کے بعد کی غزل کے بارے میں ان کی ایک ضخیم تنقیدی و تحقیقی کتاب شائع ہو چکی ہے، جس میں کثرت سے ایسے شعر درج کئے گئے ہیں، جو جدید رجحانات کی عکاسی کرتے ہیں، ان میں زیادہ تعداد خود بشیر بدر کے شعروں کی ہے اور کتاب کے ضخیم ہونے کا سبب بھی یہی ہے۔

بشیر بدر کی ایک ادا ہمیں بہت پسند

ہے کہ وہ شعروں میں تعلّی سے کم کام لیتے ہیں، نثر میں خوب کھول کر دل کی باتیں بیان کرتے ہیں۔ اپنے بارے میں بجا طور پر ان کی رائے یہ ہے کہ وہ موجودہ عہد ہی کے نہیں، آنے والے زمانوں کے بھی بہت بڑے شاعر ہیں۔ انہوں نے اپنے مجموعۂ کلام ”آمد“ کے دیباچے میں صاف صاف لکھا ہے کہ آج کی غزل میں مجھ سے زیادہ مقبول اور محبوب شاعر بقیدِ حیات نہیں۔ ہندوستان کی ۸۰ کروڑ آبادی، پاکستان کے ادبی مراکز، مغرب میں ٹورنٹو، شکاگو، نیویارک اور لندن کے اردو حلقوں میں کتنے لوگ مجھے پسند کرتے ہیں، اس کا اندازہ لگانا دشوار ہے، لیکن یہ یقین کے ساتھ کہا جا سکتا ہے کہ جو اردو اور ہندی بول سکتا ہے، وہ میری غزل سے نہیں بچ سکتا۔ یہ میرا اترانا ہوگا، اگر میں یہ کہوں کہ ریلوے اسٹیشن، بس اسٹینڈ، دفتروں اور ہر جگہ یہ خطرہ موجود رہتا ہے کہ آٹوگراف لینے والے معصوم لڑکے اور لڑکیاں مجھے پہچان سکتے ہیں۔“

اس اقتباس کو پڑھ کر معصوم لڑکے اور لڑکیاں ہی نہیں عام لوگ بھی بخوبی پہچان لیں گے کہ بشیر بدر نے خود پرستی کی آخری حدوں کو چھو لیا ہے۔ مگر ہماری رائے اس سے مختلف ہے۔ بشیر بدر خود پرستی کے مرض میں مبتلا نہیں ہیں، بلکہ خود شناسی کے درجے پر فائز ہیں، بلاشبہ موجودہ زمانے میں ان سے زیادہ مقبول اور محبوب شاعر بقیدِ حیات نہیں ہے [illegible] ہے بقیدِ حیات ہونا بقیدِ ہوش و حواس ہونے سے بالکل مختلف معاملہ ہے اور یہاں اس سے بحث نہیں ہے، یہ بھی درست ہے کہ جو شخص اردو یا ہندی بول سکتا ہے، وہ بشیر بدر کی غزل سے نہیں بچ سکتا، کیونکہ اردو یا ہندی بولنا ایسا جرم نہیں ہے کہ آدمی سزا سے بچ جائے۔

بشیر بدر نے اپنی تعریف میں اتنا کچھ لکھا ہے کہ شاعری کی طرح نثر میں بھی وہ اپنے آپ کو دہرانے لگے ہیں۔ اسی صورتِ حال کے پیشِ نظر ان کی بیگم راحت بدر صاحبہ نے ان پر نثر لکھنے کی پابندی لگا دی ہے اور یہ شعبہ اپنے ہاتھ میں لے لیا ہے۔ لگتا یوں ہے کہ آئندہ بشیر بدر اپنی تعریف خود نہیں کریں گے، یہ فریضہ ان کی بیگم صاحبہ انجام دیں گی۔ بیگم صاحبہ نے نہایت شاندار طریقے سے اس کام کا آغاز کیا ہے۔ پچھلے دنوں بشیر بدر نے امریکہ میں مشاعرہ گردی کی تھی۔ بیگم صاحبہ ساتھ تھیں۔ انہوں نے اس سفر کی دلچسپ روداد لکھی ہے جو دہلی کے رسالے ”بیسویں صدی“ میں بالاقساط شائع ہو رہی ہے۔ اس وقت اس سفرنامے کی ابتدائی دو قسطیں ہمارے سامنے ہیں۔

بیگم صاحبہ نے سب سے پہلے اپنا تعارف ان الفاظ میں کرایا ہے ”عمر ۳۰ سال، لاابالی اور چنچل ہونے کی وجہ سے اور بھی کم لگتی ہوں۔ میں نے بی ایس سی کیا۔ اس کے بعد اردو غزل نے مجھے مار لیا۔ بھوپال یونیورسٹی سے اردو میں ایم اے، فرسٹ کلاس، اور بی ایڈ بھی کر لیا۔ اب اردو ہی میں پی ایچ ڈی کر رہی ہوں۔“

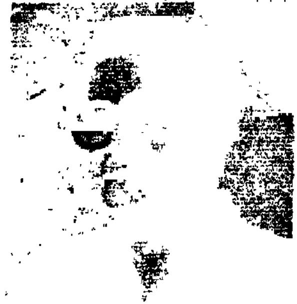
اس کے بعد امریکہ کا ویزا حاصل کرنے کی تفصیلات بیان کی گئی ہیں۔ امریکی سفارت خانے میں بشیر بدر سے پوچھا گیا کہ آپ کی اور آپ کی بیوی کی عمر میں اٹھارہ برس کا فرق کیوں ہے۔ بشیر بدر نے اس کا یہ شاعرانہ جواب دیا ”اس میں میری غلطی نہیں ہے۔ آپ یقین جانئے میں محبت اور حسن کا شاعر ہوں۔ میری شاعری سے اتنے بڑے ملک میں جو چند لڑکیاں واقعی سنجیدگی سے متاثر ہوئیں، ان میں سب سے زیادہ عمر انہی کی ہے۔“ حیرت ہے کہ ۸۰ کروڑ کی آبادی میں بشیر بدر کی شاعری سے صرف چند لڑکیاں متاثر ہوئیں۔ خیر اس سے کیا فرق پڑتا ہے، بشیر بدر کے حریف مرزا غالب کی زندگی میں بھی ان کی مقبولیت کا دائرہ زیادہ وسیع نہیں تھا۔

بیگم صاحبہ نے بشیر بدر کی شاعرانہ اور شخصی عظمت کے جو واقعات بیان کئے ہیں، ان میں سرِ فہرست یہ ہے کہ اٹلانٹا کے مشاعرے کا جو پوسٹر شائع ہوا تھا، اس میں بشیر بدر کا نام کلیم عاجز اور قتیل شفائی کے ناموں سے پہلے لکھا گیا تھا۔ یہ یقیناً بہت بڑا اعزاز ہے۔ اس پوسٹر کو محفوظ کرنے کے لئے کسی عجائب گھر میں رکھوا دینا چاہیے، تاکہ سند رہے اور آئندہ زمانے میں اگر کوئی بشیر بدر کو ان کی شاعری کی وجہ سے عظیم شاعر نہ سمجھے، تو اس پوسٹر کو بطور شہادت پیش کر کے اس کا منہ بند کر دینا چاہیے۔ بلکہ پوسٹر کو اس کے منہ پر ہی چپکا دینا چاہیے۔

بشیر بدر کی عظمت و مقبولیت کا ایک واقعہ بیگم صاحبہ نے ان الفاظ میں بیان کیا ہے: ”دور سے آواز آئی، بدر صاحب رکیے اور وہ ہم سے ملے۔ یہ آپ کی شاعری کی بارہ سال سے عاشق ہیں۔ یہ چنڈی گڑھ میں پہلی دفعہ آپ کی گرفتار ہوئیں۔ آپ نے شادی میں ذرا جلدی کر دی...
وہ تیکھے تیور، کتابی شکل والی ایک خوبصورت لڑکی تھی بعد میں معلوم ہوا وہ سکھ ہے۔ بشیر بدر نے میرا تعارف کرایا محبت سے گلے ملیں۔ مجھے فیض کی نظم ”رقیب“ یاد آ گئی۔“

بیگم صاحبہ نے بشیر بدر کی تعریف و توصیف تک اپنے آپ کو محدود نہیں رکھا، بلکہ امریکہ کے مشاعروں میں برصغیر کے جو دوسرے شعرا شریک تھے ان کی کردار کشی میں بھی کوئی کسر اٹھا نہیں رکھی۔ مثلاً مذکورہ سکھ خاتون کے حوالے سے انہوں نے لکھا ہے کہ ندا فاضلی نے ان سے فون پر اکیلی باتیں کیں۔ دوسرے روز وہ خاتون ایک گوری جوان کو ساتھ لے کر آئیں تاکہ ندا فاضلی کی مزاج پرسی کی جائے۔ بشیر بدر نے جب یہ دیکھا کہ صورتِ حال تشویش ناک ہے تو وہ خاتون کو ساتھ لے کر موقع واردات سے غائب ہو گئے۔ یہ واقعہ بیان کر کے بیگم صاحبہ نے ایک تیر سے دو شکار کیے ہیں۔ ایک طرف تو ندا فاضلی اخلاقی طور پر پس ماندہ ثابت کیا ہے اور دوسری طرف بشیر بدر کی اخلاقی عظمت کا نقش ثبت کیا ہے کہ انہوں نے ندا فاضلی کی [illegible] رہے کہ سکھ خاتون کے ساتھ ... کر دیا۔

وہ بقول بیگم صاحبہ ہاتھوں ہاتھ لیا جاتا تھا امریکہ کے مشاعروں میں کلیم عاجز اور قتیل شفائی کے سامنے شاید بشیر بدر کا چراغ جل نہیں سکا اسی لئے بیگم صاحبہ نے ان دونوں کا ذکر نہایت محبت آمیز انداز میں کیا ہے۔ خصوصاً قتیل شفائی کے بارے میں جو کچھ لکھا ہے، اس سے معلوم ہوتا ہے کہ مشاعروں میں وہ کچھ زیادہ ہی مقبول ہو گئے تھے سشراب کے حوالے سے قتیل شفائی کے متعلق بہت سی ایسی باتیں لکھی گئی ہیں جو ناقابل یقین ہیں۔ مثلاً ایک موقع پر قتیل شفائی سے بیگم صاحبہ نے کہا ہماری قوم شرابی کو تباہ ہوتا ہے جو پیتے ہیں ذلیل ہوتے ہیں، قتیل شفائی نے ہرگز ایسی بات نہیں کہہ سکتے یہ بات وہی کہہ سکتا ہے جو پینے کے بعد بھی ویسا ہی رہے جیسا وہ پینے سے پہلے تھا۔



غزلیں

دیپک قمر

آگ میں جل جائے گی یہ پدمنی بس میں نہیں
روپ کا پردا بنے کیا آرسی بس میں نہیں

یہ پہاڑ، سمندر یا خود سے بڑا اجاڑ ہے
موت تو بس میں ہے لیکن زندگی بس میں نہیں

رنجشیں اور چاہتیں جنگل کے گھوڑوں کی طرح
دشمنی بس میں نہیں اور دوستی بس میں نہیں

چاند تارے اک نہیں سب انسانوں کی غلام
خود سر و مغرور ہونا آدمی بس میں نہیں

ہر گھڑی آواز کی ہے گنگناہٹ گونجتی
توڑ دے گی ہر سمادھی خامشی بس میں نہیں

کر رہے ہیں گھپ اندھیرے دن میں بھی من مانیاں
من چلی، ہر جائی، چنچل روشنی بس میں نہیں

گاؤں کا معصوم، سادہ دل نہ کہا جائے بھرم
ناچتی پھرتی نگر کی زندگی بس میں نہیں

مینکا سی رت بھگو کے رس میں پھر اڑ جائے گی
یہ بسنتی پھول والی کامنی بس میں نہیں

جوت اپنے دیپ کی بہتر ہے جو فانوس میں ہے
اپنے وہ کس کام کی جو چاندنی بس میں نہیں

مجھے پتھر کے یُگ کا آدمی آواز دیتا ہے
نئے شہروں میں تیری زندگی کا حال کیسا ہے

خیالوں کو کھلونے جان کر وہ توڑ دیتا ہے
مرے دل میں کوئی پاگل سا بچہ کون بیٹھا ہے

جو پہلے تھا، وہ اب بھی ہے، سدا ہی رہنے والا ہے
بگڑنے اور بننے کا یہ چکر بھی تو دھوکا ہے

کتابیں ہی کتابیں ہیں سوالوں سے الجھتی سی
سمجھ میں کچھ نہیں آتا ابھی پڑھ پڑھ کے دیکھا ہے

پرندہ پوچھتا پھرتا ہے شہروں کی ہواؤں سے
ہزاروں سال پہلے کا کسی نے بن بھی دیکھا ہے

قدم پڑتے ہیں جیسے ہر گھڑی آکاش کے دل پر
عجب آنگن ہمارا ہے نہ ٹیڑھا ہے نہ سیدھا ہے

بجھیں گے یا کہ ڈوبیں گے ابھی کچھ کہہ نہیں سکتے
ہتھیلی کے سمندر میں لکیروں کا بھنور سا ہے

یہاں آ کر رکے تھے وہ ذرا دم بھر کو سستانے
تھکے آرام کرنے سے ارادہ پھر سفر کا ہے

زباں کی گھن گرج سے سب انہیں کتنا ڈراتے ہیں
بھری محفل میں سادہ بات والا وہ اکیلا ہے

اِدھر اُدھر کی

رشید احمد صدیقی

ریل کے فرسٹ کلاس میں سفر کرنا خوش نصیبی ہے بشرطیکہ سفر خرچ دوسرے کے ذمّہ ہو۔ اس کے علاوہ حلیہ شریفوں جیسا، لباس صاف ستھرا جس میں سب نہیں تو ایک آدھ کپڑا اس کا تیار کیا ہوا ضرور ہو۔ یہ اس لئے کہنا پڑتا ہے کہ بعض کپڑے حسب و نسب کے اعتبار سے تو نجیب الطرفین ہوتے ہیں، لیکن ان میں خاصیت کچھ اس طرح کی ہوتی ہے کہ دھلے ہونے پر بھی دھلے نہیں معلوم ہوتے۔ اور بعض لوگ ایسے ہوتے ہیں جن کے جسم پر صاف کپڑا بھی صاف نہیں معلوم ہوتا۔ خدا کے ایسے بندے بھی پائے جاتے ہیں، جن کے جسم پر میلا کپڑا بھی میلا نظر نہیں آتا۔ یہ کرشمے کپڑے کے ہوں یا پہننے والے کے، کچھ نہیں کہا جا سکتا۔ ممکن ہے اس میں 'غبار'، 'دھند'، 'جالا' وغیرہ کو دخل ہو جو فضا میں اکثر، میری آنکھ میں بیشتر اور سُرمے کے اشتہارات میں ہمیشہ ملتے ہیں۔

ٹرین میں جیسا کھانا، جن برتنوں اور جس شکل میں پیش کیا جاتا ہے، اس سے بچنے کے لئے ستھرے ناشتہ دان میں گھر کا کھانا ہو — تھرماس یا صراحی میں صاف پانی ہو۔ ہولڈال ایسا ہو جیسے اسی سفر کے لئے خریدا گیا ہو۔ نہ یہ کہ بستر پرانی ادوان یا میلی گرہ دار ہولڈال کے ٹکڑے سے بندھا ہو۔ ساتھی مسافر ایسے نہ ہوں جن کی بیویاں ہر اسٹیشن پر گرد آلود آبخورے میں دودھ اور پتے میں دہی بڑے خرید کر شوہر کے لئے فراہم کرتی ہوں۔

اکثر دیکھنے میں آیا ہے کہ نوجوان خوبصورت خوش پوش اور خوش اطوار بیویاں یہ سارے کام انجام دینے پر مصر رہتی ہیں۔ اتنا ہی نہیں، بلکہ گرمی یا برسات کا موسم ہو تو بار بار ہولڈال سے تولیہ نکال کر شوہر نامدار کو مسلسل پسینہ پونچھتے رہنے کے لئے دیتی رہتی ہے اور شوہر صرف بنیان میں ملبوس تکیہ لے کر کبھی اوپر کی برتھ پر جا لیٹتا ہے، کبھی فوراً ہی اٹھ کر غسل خانے میں داخل ہو جائے گا، اور وہاں سے نکل کر پھر برتھ پر دراز ہو جائے گا۔ اس کی یہ اور دوسری اضطراری حرکتیں اس بات کی غمازی کرتی ہیں کہ فرسٹ کلاس میں اسے وہ چین یا فضا نہیں میسر ہے جس کا وہ دراصل عادی ہے۔ تندرست ہٹے کٹے شوہر کا سفر میں بیوی سے خادمہ کا کام لینا بڑی بدتمیزی ہے۔

ہمسفر کی سیرت کا اندازہ اس طرح بھی کرتے ہیں کہ وہ اپنی بیوی کے ساتھ کیا اور کیسا سلوک روا رکھتا ہے۔ نیز غسل خانہ استعمال کرنے کے طور طریقوں سے واقف ہے یا نہیں۔ ایسا تو نہیں کہ فرسٹ کلاس میں سفر کرنے کے آداب سے وہ بری ہو گیا۔ شریفوں کا شیوہ تو یہ ہے کہ وہ اوّل درجہ ہی میں نہیں، تھرڈ کلاس میں بھی فرسٹ کلاس میں سفر کرنے کے آداب ملحوظ رکھتے

تھا۔ ہر اسٹیشن پر خوانچہ والے ٹنگ چلی مچھلی، پکوڑے، دہی بڑے، چھولے، گنڈیری یا آلو وغیرہ کھاتے، پیتا چاٹتے۔ اور ان کو کمپارٹمنٹ میں ڈال دینے سے مجھے بڑی گھن آتی ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے جیسے اس وحشی اور گنوار نے غسل خانہ اور کمپارٹمنٹ ایک کر دیا ہو مجھے ذوقِ لطیف ملتی ہے۔ سب سے زیادہ اس لئے کہ اس سے میں دوسروں کو "مستغنی الاحوال" بنا سکتا ہوں۔ لیکن ایسے دوستوں کو چھینے سے بھی کچھ ناپسند نہیں کرتا جو دولت کے زعم میں اقدارِ عالیہ کو نظرانداز کر دیتے ہیں۔ اقدارِ عالیہ جتنے بھی ہوں، ہوا کریں۔ بذاتِ خود میں نے اس میں حفظِ مراتب اور صفائی ستھرائی کو بھی شامل کر رکھا ہے۔

یہ ساری باتیں ناخواندہ مہمان کی طرح ذہن میں آگئیں۔ ظاہر ہے، جیسے یہاں سے کسی نہ کسی طرح اور جلد سے جلد گلوخلاصی کرنے کی فکر دامن گیر ہوتی ہے۔ اس کا ایک طریقہ یہ ہے کہ اپنا بوجھ ہلکا کرنے کے لئے ناظرین کو بھی اس میں شریک کرے۔ دراصل جو واقعہ بیان کرنا چاہتا تھا وہ یہ ہے کہ ایک بار یونیورسٹی کے خرچ پر فرسٹ کلاس میں سفر کرنے کا اتفاق ہوا۔ ایک "صاحب" پہلے سے موجود تھے۔ کالے کرود۔ کم سخن۔ بشرے سے بڑے ذہین۔ اپنے سے شغلی۔ دوسروں سے بے نیاز، عمر کے اُس حصے میں جب وہ ہوتی تو ہے کسی قدر زیادہ لیکن کم کر کے بتانے کی خواہش ہوتی ہے۔ یہ اس لئے کہنا پڑا کہ ایسا وقت بھی آتا ہے جب اصل عمر سے زیادہ بتانے میں تسکین حاصل ہوتی ہے۔ اپنے کو نہیں تو دوسروں کو!

کمپارٹمنٹ میں داخل ہوا تو کچھ ایسا محسوس ہوا جیسے موصوف کو میرا آنا پسند نہ آیا ہو۔ حلیہ شریف کا کوئی سوال نہ تھا۔ اس لئے کہ میری صورت دیکھ کر وہ کیا کوئی بھی احساسِ کمتری کا شکار نہیں ہو سکتا۔ میں نے نہایت شریفانہ لہجہ اور آداب کے ساتھ سلام کیا۔ اس کا جواب انھوں نے اس طرح دیا کہ میں اُن سے آئندہ کسی قسم کی توقع نہ رکھوں۔ اُن کے اس سلوک سے دل ہی دل میں بہت محظوظ ہوا۔ بددماغ سے بددماغی کا مظاہرہ ہو تو مجھے بڑا لطف آتا ہے۔ جیسے وہ شخص اپنے ہی جوشاندہ میں جوش کھا رہا ہو۔ اس وقت مجھے وہ مثل یاد آئی جو کہیں پڑھ چکا تھا یعنی اُس بدصورت عورت سے زیادہ بددماغ اور مغرور کوئی دوسرا نہیں ہو سکتا جس کی شادی ہو گئی ہو!

ان کی طرح میں یا میری طرح وہ ٹرین سے سفر کے تو قائل تھے، لیکن ٹرین کے آب و دانہ کے نہ تھے۔ اس لئے دونوں نے خورد و نوش کا انتظام پبلک سیکٹر کے بجائے پرائیویٹ سیکٹر سے کر رکھا تھا۔ اُن کا ناشتہ دان تا جینی کا تھا، میرا المونیم کا۔ جہاں تک اندازہ لگانے کا تعلق ہے خوراک فرو کرنے کی جو صلاحیت بظاہر اُن میں معلوم ہوتی تھی، اس کی رُو سے اُن کا ناشتہ دان بڑا۔ اور اسی اعتبار سے میرا چھوٹا تھا۔ اسی سے ناشتہ دانوں کی مشمولات و مقدار کا حساب بھی لگایا جا سکتا ہے میرے پاس پانی کی صراحی اور گلاس تھا۔ انہوں نے اس کا انتظام بوتلوں میں کر رکھا تھا۔ میں گلاس میں پانی انڈیل کر پیتا تھا۔ وہ براہِ راست بوتل سے پیتے تھے۔ اُن کا پینا بالجبر تھا، میرا بالستر۔

میں دوپہر کا کھانا گھر سے کھا کر چلا تھا۔ یوں بھی ایک زمانے میں میں کھانے میں نہ وقت کا پابند تھا نہ بھوک کا۔ جب ملا، جتنا ملا کھا لیا۔ کبھی دو ایک وقت بیشگی کا بھی۔ یوں بھی کھانے کے فنکاروں نے بتایا ہے کہ کھانے کے لئے بھوک کو مواقع کو اہمیت دینی چاہیئے۔ اسی طرح اگر دو ایک وقت کھانا نہ ملے یا طبیعت کے مطابق نہ میسر آئے تو آمادۂ فساد نہ ہونا چاہیئے۔ شریف آدمی کو ٹھکانے کا کھانا بالضرور مل کر رہتا ہے۔

گھر سے کھا کر چلنے میں ایک مصلحت یہ بھی ہوتی ہے، روکھا پھیکا روزمرہ کا کھانا تو حسبِ معمول گھر پر کھا لیا۔ اسی طرح اچھے ناشتے کی مقدار میں جو ہمسفر ہونے والا تھا کمی نہ آئی دُوسرے گھر والوں کا کہنا یہ تھا سفر شروع نہ ہو چکا ہو تو سفر کے کھانے میں ہاتھ لگانا کیسا! پھر یہ بھی ممکن ہے کہ راستے میں دُوسروں کو بھی نزدیک دسترخوان کرنا پڑے تو کھانے کی کمی کی وجہ سے اس کی نوبت نہ آئے کہ ایک دُوسرے سے تا اختتامِ سفر آنکھ نہ ملا سکیں۔ اس لئے میں سفر میں ناشتے کی مقدار اور ذرا زیادہ ہی رکھتا ہوں۔

لنچ کا وقت آیا۔ ہمسفر نے ناشتہ دان کھولا اس کا دیا سب کچھ موجود تھا۔ جیسے انہوں نے اس رغبت سے اتنا جلد جلد اور اس مقدار میں کھانا شروع کیا۔ جیسے وہ اپنا نہیں کسی دُوسرے کا کھانا کھا رہے ہوں۔ میں اسی کا منتظر تھا کہ رسماً یا اخلاقاً مجھے بھی شرکت کی دعوت دیں گے چونکہ میرے پاس خود کھانے کا سامان موجود تھا۔ اس لئے انہیں میری طرف سے اُنھیں کوئی خطرہ نہیں ہونا چاہیئے تھا۔ دعوت دینے کا بدلہ میں بھی ادا کر سکتا تھا۔ لیکن کچھ ایسا معلوم ہوا کہ کھانے کے معاملے میں وہ سہرِ نقد کو یقین پر ترجیح دینا پسند کرتے ہیں۔

اُنھوں نے مُطلق التفات نہ کیا تو میں غور میں پڑ گیا کہ یہ کس قبیلے یا قماش کے آدمی تھے کہ اتنا معمولی اور بے ضرر آداب ملحوظ رکھنے کی بھی توفیق نہ ہوئی۔ وہ کچھ اس طرح کھانے کے شغل میں منہمک رہے کہ میں اُن کی ولایت، قومیت، سکونت، دار و مال وغیرہ کے بارے میں کوئی رائے قائم نہ کر سکا۔ وہ کھاتے رہے، اور میں پیچ و تاب میں مبتلا رہا۔ یکایک اُنھوں نے ایک مسلم پیاز نکالی اور اُوپر کا ہلکا پھیکا سرخ چھلکا دُور کر کے براہِ راست دانتوں سے کاٹ کر اس طرح کھانا شروع کیا جیسے وہ پیاز نہ تھی، آڑو یا آلوچہ تھا۔ اس کے بعد کچھ دیر تک طرح طرح کی مٹھائیوں سے شغل فرماتے رہے، ایک بوتل کا نصف پانی غٹ غٹ پی گئے اور اطمینان کا "ڈکار آہنگ سانس" لیا۔ ناشتہ دان بند کر دیا اور چونکہ اس کے کو گرمی کا موسم تھا، سر سے پاؤں تک کمبل تان کر لیٹ رہے۔ گرمی کا موسم، دوپہر کا

وقت، کمبل کا اوڑھنا، کچھ سمجھ میں نہ آیا۔ ذرا دیر میں خراٹے کی آواز آنے لگی۔ معلوم نہیں کیوں مجھے سوتے میں خراٹے کی آواز اور باوازِ بلند کلمہ پڑھنے سے بڑی وحشت ہوتی ہے۔ وحشت کے بجائے کوئی اور لفظ لکھنا چاہتا تھا لیکن "سنگ اٹھایا تھا کہ سر یاد آیا" کی بنا پر جہاں کا تہاں رہ گیا۔

گاڑی چلتی رہی، وہ خراٹے لیتے رہے، اور میں سوچتا رہا۔ کچھ اس طرح سے سوچتا جس پر دیکھنے والوں کو اونگھنے کا گمان ہو۔ ایک بڑے اسٹیشن پر گاڑی رکی۔ پلیٹ فارم پر اُن کی پذیرائی کیلئے اتنے اور ایسے لوگ نظر آئے کہ مجھے خدشہ ہونے لگا کہ اُن کی پذیرائی میری گرفتاری پر نہ ختم ہو۔

وہ کمپارٹمنٹ سے سامان اتارنے کے لئے اس طرح جھپٹے کہ میں سمٹ کر اپنی سیٹ کے گوشے میں پاؤں اٹھا کر بیٹھ گیا کہ کہیں اسباب کے ساتھ اس خاکسار "اسبابِ بغاوتِ ہند" کو بھی حراست میں نہ لے لیں۔

جس ہنگامے پر کمپارٹمنٹ اور پلیٹ فارم کی رونق تھی، وہ کچھ ماند پڑی تو اپنے ہی جیسے کھُلے اوراوقات کے ایک صاحب سے دریافت کیا کہ یہ بزرگ کون تھے۔ انہوں نے نام، القاب اور منصب بتائے تو اطمینان ہو گیا کہ جو کچھ اُن کے بارے میں خیال تھا وہ صحیح تھا۔ اور کھانے پر دشمنا بھی مدعو نہ کرنے اور سموچے پیاز علی الاعلان کھانے میں وہ بالکل حق بجانب تھے۔

ایک کام کے سلسلے میں کئی سال یونیورسٹی لائبریری جانا پڑتا تھا جہاں دفتر واقع تھا۔ ایک دن کیا دیکھتا ہوں کہ عمارت کے سامنے دُور دُور تک شوقِ شہادت میں سرشار ہجوم (غالباً گرمی کا موسم تھا) بجز پیلے رنگ کی قمیصوں اور چست پتلونوں میں ملبوس یونیورسٹی اور اطراف و جوانب کے نوجوانوں کا ہجوم مُتلاطم ہے۔ مجمع بڑھتا جاتا تھا اور اس کے بے قابو ہونے کے آثار بھی پیدا ہو چلے تھے۔ قریب کے ایک صاحب سے پوچھا یہ کیا ماجرا ہے۔

پہلے تو انھوں نے مجھے سر سے پاؤں تک اس طرح دیکھا جیسے ان کے سامنے میں نہ تھا، اصحابِ کہف میں سے کوئی صاحب تھے۔ پھر بولے آپ نہیں جانتے کہ لائبریری میں آج ایک فلم کی شوٹنگ ہونے والی ہے۔ ایک کمپنی آئی ہوئی ہے۔ میں نے عرض کیا تو اس میں کیا حرج ہے۔ فرمایا ہیرو اور ہیروئن کو ہماری نئی خوبصورت لائبریری میں مصروفِ مطالعہ یا معاشقہ دکھانے والے ہیں۔ میں نے عرض کیا یہ تو کوئی ایسی بات نہیں۔ یہ تو یوں بھی ہوتا رہتا ہے۔ کہنے لگے آپ کہیں باہر سے آئے ہوئے معلوم ہوتے ہیں۔ پوائنٹ یہ ہے کہ لائبریری، یونیورسٹی اور "تا بہ ثریا ایران ما است" ہیرو اور ہیروئن بننے کا پہلا حق ہمارا ہے، ورنہ پھر یہ کیا جائے کہ ان دونوں میں سے ایک پبلک سیکٹر کا ہو، دوسرا پرائیویٹ کا۔

میں نے کہا پرائیویٹ اور پبلک سیکٹر کا دردِ سر تو حکومت کا ہے۔ ہم آپ اس جھگڑے میں کیوں پڑیں۔ ہمارا آپ کا دردِ قولنج دوسرا ہے۔ آپ تو جانتے ہوں گے ہر ڈرامے میں ہیرو ہیروئن کے علاوہ کیریکٹر بڑا جاندار ہوتا ہے۔ بولے وہ کیا۔ میں نے کہا ویلن کا! ایک مسخرے کی بھی ضرورت ہو گی۔ پہلے پر آپ اکتفا کیجئے، دوسرے پر میں! اس وقت تو ان فلم والے غریبوں کو پیٹ کا دھندہ کر لینے دیجئے۔ ہم آپ تو مخبری ہیں، کہیں اور راستہ نکال لیں گے۔ مسکرا کر بولے "مجھ کو بھی پوچھتے رہو تو کیا گناہ ہو"۔ میں نے مؤدب ہو کر داد دی، تو گرج کر فرمایا: "ہر کہ شمشیر زند سکہ بنامش خوانند"۔ مجھے اطمینان ہو گیا کہ اب جب کہ یہ شعر پڑھنے لگے ہیں، کچھ نہ کر پائیں گے۔

اتنے میں ایک نوجوان سادہ لباس میں نمودار ہوئے۔ غالباً پولیس کے محکمے سے تعلق رکھتے تھے۔ پوچھا کیوں جی، یہ کون تھا جس نے ابھی ابھی کربان کا نام لیا تھا۔ میں ڈر گیا اور ... "من نہ بودم" کہتا ہوا آفس میں جا چھپا — تھوڑی دیر بعد جھانک کر دیکھا تو معلوم ہوا مجمع منتشر اور مطلع صاف ہو گیا ہے۔ تعجب ہوا کہ انقلاب زندہ باد کا نعرہ لگائے بغیر اور سر پھٹول کے بغیر مجمع کس طرح پسپا ہو گیا۔ بتایا گیا کہ اربابِ یونیورسٹی نے سمجھایا، پولیس نے دھمکایا۔ فلم والوں نے راہِ فرار اختیار کی۔ اس لئے "تماشہ نہ ہوا"۔

بات آئی گئی ہو گئی۔ جاڑا، بہار، گرمی، برسات اور ان کے صبح و شام اکتا دینے والی یکسانیت کے ساتھ گزرنے لگے جن کو میں زندگی کا ناقابلِ برداشت خلجان سمجھنے اور محسوس کرنے لگا ہوں۔ ورنہ ایک زمانہ تھا جب ہر رُت میں نیا سماں، نئی بات پاتا تھا۔ خیر یہ بات تو برائے بیت تھی۔ واقعہ یہ ہے کہ "از کار رفتہ" اور تقریباً "تا بعد الطبیعات" ہو جانے کے باوجود یہ خیال برابر آتا ہے کہ تیمور کے گھر کی عظمت کہاں گئی، اور کیوں گئی؟ اس کا جواب تو واضح ہے یعنی خانہ خرابی اعمال کی زد میں آ گئی۔ رہا یہ کہ کہاں گئی، اس کے بارے میں گمان ہوتا ہے وہ کہیں گئی نہیں ہے۔ صرف متاعِ کاسہ ہو کر رہ گئی ہے اس لئے کوئی اس کا خواہاں نہ رہا۔

جہاں سنیئے، جدھر دیکھیئے، نوجوانوں کا یکساں حال ہے۔ ایک زمانہ تھا بھلا یا بُرا جب اخلاق و عادات میں نوجوان اپنے بوڑھوں اور بزرگوں کی تقلید کرتے تھے۔ اب بوڑھے اور بزرگ نوجوانوں کے اخلاق و عادات، لباس اور طور طریقوں کو اپنانے میں فخر محسوس کرتے ہیں۔ بوڑھوں کا یہ طریقہ جتنا مضحکہ خیز ہے، اُتنا ہی حیرت انگیز بھی ہے۔ یوں تو زمانے کا دستور ہمیشہ سے یکساں چلا آتا ہے۔ لیکن ایک نئی بات ضرور ہوئی ہے کہ پہلے زمانے میں بوڑھا ہونے سے کچھ قبل ہی لوگ اپنے کو بوڑھوں سے [illegible] اسے شرافت اور وضعداری کا تقاضا اور امتیاز سمجھتے تھے۔ اب بوڑھا ہونے پر بھی اپنے کو بوڑھا سمجھنا عار سمجھتے ہیں — [illegible] نہیں بلکہ [illegible] بھی دیکھئے جب جوانی نے تو نوجوانوں سے بھی زیادہ [illegible] قرار دیئے جانے کی فکر میں رہتے ہیں۔ کیا جب اس طرح کی [illegible] معنی ہے، حقا

سکتی ہے تو گھٹتی سے۔

اب صورت حال کچھ اس طرح کی ہے کہ فرد ہو یا جماعت، اپنے کو ہر طرح کے احتساب سے آزاد سمجھتی ہے۔ جس کے جی میں جو آتا ہے کرتا ہے، چاہے اس کا نتیجہ کچھ بھی ہو۔ اب گناہ، گناہ نہیں رہا۔ مان یہ لیا گیا ہے کہ جرائم کا ارتکاب برا نہیں۔ صرف اتنی احتیاط ضرور کر لینی چاہیئے کہ ملک کا قانون گرفت میں لے کر سزا نہ دے سکے۔ رہے اخلاقی گناہ۔ ان کو ہر شخص کا ذاتی معاملہ قرار دے کر نظر انداز کر دینا چاہیئے۔ ایسے معاملات میں دخل دینا فرد کی آزادیٔ فکر و عمل میں مخل ہوتا ہے جو سب سے بڑا گناہ یعنی Bad Taste یا رکاکت ہے۔ مثلاً ناداری اور بھوک سے مجبور ہو کر کوئی بد نصیب دو مٹھی اناج، ایک آدھ روٹی چرا لے تو اس کو جیل بھیج دیا جائے۔ لیکن اگر کوئی شخص اپنی بیوی کو زد و کوب کرتا رہے اور دوسرے کی بیوی سے التفات کرے تو یہ اس کا ذاتی فعل ہے۔ اس میں حائل ہونا بد مذاقی ہے۔ حالانکہ یہ ایک مسلمہ امر ہے کہ اچھے یا برے شخصی اعمال ہی سوسائٹی کے قوام کو بناتے یا بگاڑتے ہیں۔ بالفاظ دیگر شخصی یا نجی بد اعمالی جب کو ہماری تہذیب نظر انداز کرتی ہے۔ وہی قومی اجتماعی بد اعمالی کی محرکِ اعظم ہوتی ہے۔

اسے ایک تسلیم شدہ حقیقت مان لیا گیا ہے کہ جو خرابیاں ہم اپنے ارد گرد دیکھتے ہیں ان کے اسباب جہالت، افلاس، بیماری اور ناموافق ماحول ہیں لیکن اس سے بھی انکار نہیں کیا جا سکتا کہ ہماری کوششوں سے ان مصائب میں بہت کمی آگئی ہے۔ اور جہالت ... آتی جا رہی ہے۔ جسے بحیثیت مجموعی ہم نے معیارِ زندگی کی بلندی کا نام دے رکھا ہے۔ یہ یوں ...

[illegible]

معیارِ زندگی ... اونچا ہونے سے معیار [illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

کے نشیب و فراز کا کوئی علاقہ معیارِ اخلاق کے نشیب و فراز سے نہیں یا پھر معیارِ زندگی کو ہر حال میں بڑھانا چاہیئے۔ معیارِ اخلاق اپنی صحت و سلامتی کے لئے کوئی دوسرا دروازہ دیکھے۔

زندگی کے معیار کو بلند کرنے کے لئے جو ذرائع اور وسائل اختیار کئے جا رہے ہیں، وہ ٹھیک ہیں لیکن اس کی مضرتوں سے بچنے اور بچانے کے لئے اخلاقی اقدار کو مؤثر و مستحکم کرنے کی بھی اتنی ہی کوشش کرنی چاہیئے۔ ایک ترقی یافتہ قوم اور ملک کے جرائم و ذمائم وغیرہ غیر ترقی یافتہ قوم اور ملک کے جرائم و ذمائم سے کہیں زیادہ سنگین اور دور رس ہوتے ہیں۔ معیارِ زندگی کو یک طرفہ ترقی دینے کے خطرات کی طرف سے دور اندیش کا خیالات میں دیر تک الجھتا رہا۔ اسی کے بعد زندگی کے معمولات شروع ہو گئے اور "خس پندار و کرا ہیں کشاکش با دوست" کا طلسم ٹوٹ گیا۔

علی گڑھ کا گرمی کا زمانہ بڑا تکلیف دہ ہوتا ہے۔ اکثر ایسا محسوس ہونے لگتا ہے جیسے اس موسم میں قضا و قدر ہم سے آدمیت کا شرف چھین لیتے ہوں۔ گرد، گرمی، تیز لو تمام موجودات پر کرب و کراہت کا عالم! موت سے ڈرنا تقاضائے فطرت ہے۔ لیکن ہر قیمت پر زندہ رہنے کی خواہش بھی کسی لعنت سے کم نہیں۔ ساری زندگی نیکنامی میں بسر کرنے کے بعد علی گڑھ میں گرمی کے زمانے میں مرنا بڑی ہی بد نصیبی ہے۔ دوڑ دھوپ، تجہیز و تکفین کا انتظام، عزیزوں اور شریفوں کا میت کو دفنانے قبرستان لے جانا اور وہاں دیر تک انتظار کی زحمت اٹھانا بڑا تکلیف دہ خیال ہے۔ جو آدمی جتنا بڑا ہوتا ہے، اتنا ہی زیادہ اس کی تجہیز و تکفین میں شریفوں کو اذیت اٹھانی پڑتی ہے۔ یہ صورت حال مرنے والے کے لئے کسی طرح موجب فخر نہیں ہو سکتی۔ اسی طرح کے خیالات غالب کے سب [illegible] شعر ادا کیا تھا۔

ہوئے مر کے ہم جو رسوا، ہوئے کیوں نہ غرقِ دریا
نہ کبھی جنازہ اٹھتا، نہ کہیں مزار ہوتا

اس بات سے غالب اتنے [illegible]

سے ایک منزل پہلے کی بھی اپنی خواہش کا اظہار کر دیا تھا۔ مشہور قطعہ کا صرف آخری شعر کہہ بنا کافی ہوگا

پڑیے گر بیمار تو کوئی نہ ہو تیماردار
اور اگر مر جائیے تو نوحہ خواں کوئی نہ ہو

جب بھی کبھی موسم نہایت درجہ خراب ہوتا ہے تیوہار یا آس پاس کوئی اور تقریب ہونے والی ہوتی ہے تو اللہ سے دعا کرتا ہوں کہ ایسے مواقع پر میری موت نہ ہو۔ نارمل حالات میں چاہے جب ہو جائے۔ اس سلسلے میں ایک لطیفہ بھی سن لیجئے۔

لندن میں دوشنبہ کا ۸ بجے سے ۱۰ بجے دن تک کا وقت آفس یا کارخانہ وغیرہ کے ملازموں کے لئے بڑی بھاگ دوڑ کا ہوتا ہے۔ ہر شخص اپنے کام پر ٹھیک وقت سے پہونچنا چاہتا ہے۔ زیر زمین بجلی سے چلنے والی گاڑیاں بڑی پابندی اور تیزی سے آتی جاتی رہتی ہیں۔ ایسے ہی ایک دوشنبہ کو ۸ - ۱۰ بجے کے درمیان چلتی گاڑی کے سامنے چھلانگ لگا کر ایک شخص نے خودکشی کر لی۔ گاڑی روک دی گئی اور نعش کو علیحدہ کئے جانے کا انتظام کیا جانے لگا۔ اس میں کچھ وقت صرف ہوا۔ سواریوں میں سے ایک خاتون نے اکتا کر فرمایا۔ "کمبخت کو خودکشی کے لئے دوشنبہ ہی کا دن۔ اسی گاڑی اور اسی وقت کا انتخاب کرنا تھا۔"

ایک دن گرمی انتہا پر تھی۔ لائبریری سے نکل کر کڑی دھوپ اور تیز لو میں گھر واپس آ رہا تھا۔ سڑک پار کی تو حاشیہ پر لگے ہوئے ایک جنید درخت کی جڑ پر بیٹھا ہوا ایک شخص نظر آیا۔ جسم پر صرف ایک میلی پھٹی لنگی تھی۔ چھتری سنبھالتا جھکڑ سے بچتا جلد جلد وہاں سے گزرا۔ غور سے دیکھنے کی ضرورت نہ تھی نہ ہمت پڑی، کہ کون شخص تھا اور وہاں بیٹھا کیا کر رہا تھا۔ کچھ ہی دور نکلا تھا۔ خیال آیا کہ درخت کے پاس سے گزرتے ہوئے کچھ آواز سنی تھی جس کا میں نے کچھ خیال نہیں کیا اور یہ سوچتا ہوا آگے بڑھ گیا کہ کوئی فقیر ہوگا جس نے پیسے مانگے ہوں گے۔ کچھ دور جانے کے بعد بھوک اور موسم دونوں کی سختی اور زیادہ محسوس ہوئی تو فقیر کا خیال آیا کہ اس پر معلوم نہیں

کیا گزر رہی ہوگی۔ بادلِ ناخواستہ اٹھا۔ جیب سے کچھ پیسے نکالے اور اس شخص کے پاس آکر کہا "یہ لو، تمہاری آواز اچھی طرح نہیں سُن سکا تھا۔" قریب سے دیکھا تو معلوم ہوا کہ وہ روٹی کے چند ٹکڑوں پر اُبلی ہوئی ترکاری اور ساگ کھا رہا تھا۔ مجھے دیکھ کر کھڑا ہوگیا۔ اور بڑے اعتماد لیکن انکسار سے کہا۔

"میاں اللہ آپ کو اچھا رکھے۔ آپ کو دھوکا ہوا۔ میں نے کچھ مانگا نہیں تھا۔ کھانے کا وقت تھا۔ میں کھا رہا تھا۔ آپ بھی شاید بھوکے گزر رہے تھے۔ منہ سے نکل گیا۔ میاں کھانا حاضر ہے۔ آپ کے لائق یہ ساگ اور سوکھی روٹی نہ تھی لیکن باپ دادا کی ڈالی ہوئی عادت کو کیا کہوں۔ کھانا کھاتے وقت کسی کو پاس دیکھتا ہوں تو اس طرح کی بات منہ سے نکل ہی جاتی ہے۔ کوئی شریک ہوجاتا ہے تو دل خوش ہوجاتا ہے۔ نہیں ہوتا جب بھی ایک طرح کی تسکین ملتی ہے۔ مزدوری میں جو پیسے مل جاتے ہیں، اس سے گزر بسر ہوجاتی ہے۔ اُس کا شکر ہے محنت مزدوری سے سارے کام چلاتا رہتا ہوں۔ پیسے آپ اپنے پاس رکھیں۔"

میں نہایت شرمندہ ہُوا اور اُس مزدور کے نقیرِ غیور کے مقابلہ میں اپنے تمام مناصب و مراتب پر لعنت بھیجتا ہُوا گھر پہنچ گیا۔

غزلیں

موجِ طوفاں! پیڑ اونچے بہہ گئے
خار و خس کیسے سلامت رہ گئے

پاس تھے اپنے، گُلو دُودی رہی
ہم تو دریا میں بھی پیاسے رہ گئے

اے غبارِ کارواں جلدی نہ کر
ساتھ تیرے ہم بھی پیچھے رہ گئے

شیخ جی بہلا کے سب کو لے گئے
میکدے میں ہم ہی ساقی رہ گئے

اک نگاہِ خشمگیں طوفان تھی
سارے ایوانِ تمنّا ڈھہ گئے

اب صلیب و دار تک جائے گا کون
نام لیوا حق کے پیچھے رہ گئے

اجنبی جیسے جو تھے دُور سے
آئینہ بن کر وہ اپنے رہ گئے

بولنا سچ جُرم ہے اس شہر میں
جو نہ کہنا تھا ہمیں وہ کہہ گئے

زندگی کیا قسمتِ تیرا اب رہا؟
غم دیے تُو نے وہ ہنس کر سہہ گئے

جو نظر یے حرفِ آخر تھے بنے
وقت کے دھاروں میں کیسے بہہ گئے

وجاہت علی سندیلوی

اندھے گونگے اگر دھمال کریں
بولتے شاہ کیوں ابال کریں

سنبھلو پاگل ہوا نہ کردے بگاڑ
اٹھو گلشن کی دیکھ بھال کریں

کیوں خزاں چھوئے اُس غنچے کو
پاسباں جس کو پائمال کریں

اب کے دونوں میں فرق کچھ بھی نہیں
آ منائیں خوشی ملال کریں

دوستو! زندگی یہی تو نہیں
جو کلنڈر ماہ و سال کریں

سر نگا ہو تھی اُن کی مسند تک
کیا مجال اب جو قیل و قال کریں

اعتبار ایک بار ہوتا ہے
چھوڑیے پھر کہاں وبال کریں

یہ بھی ہے ارتکاب جرم سوزی
گر نہ جائیں گے جو سوال کریں

اُن کو سب اختیار ہے ثاقی
جس کو چاہیں اُسے نہال کریں

یوسف ثاقی سلیمانی

جب کہیں جسم نہ سایہ ہوگا
چاند کا زخم بھی تازہ ہوگا

اس سے آگے بھی ہے دُنیا شاید
جانے والوں نے یہ سوچا ہوگا

دھوپ میں تپنے دے اب میرا بدن
تیرا آنچل بھی نہ میلا ہوگا

عمر بھر اشک پئے ہیں اُس نے
کتنی صدیوں کا وہ پیاسا ہوگا

آئینہ نے کے ہمیشہ جو چلا
اُس کا اپنا بھی تو چہرہ ہوگا

پیڑ پتوں کا جشن بھول گئے
کس نے موسم کو ستایا ہوگا

مجھ سے کترا کے گزرنے والا!
وہ مرا دوست ہی پیارا ہوگا

سوہن راہی (انگلینڈ)

منشی پریم چند نے اپنے افسانوں میں دیہاتی ماحول کی جس خوش اسلوبی سے عکاسی کی ہے اس کی مثال دیکھنی ہو

تو

ڈاکٹر اودے سرن ارمان

کے افسانوی مجموعوں کو پڑھیئے۔ آپ بے ساختہ یہ کہنے پر مجبور ہوجائیں گے کہ ڈاکٹر ارمان ہندوپاک کے افسانہ نگاروں کی صفِ اول میں خصوصی مقام رکھتے ہیں۔

مان سروور

ڈاکٹر ارمان کا اوّلین افسانوی مجموعہ جو اکیس ایسے افسانوں پر مشتمل ہے جو دیہاتی معاشرہ کی صحیح عکاسی کرتے ہیں۔ ہر افسانہ قاری کے دل و دماغ کو یہ سوچنے اور کہنے پر مجبور کرتا ہے کہ

"جو کہا تو نے وہ میرے دل میں تھا۔"

قیمت: -/۲۱ روپے۔ ڈی لکس -/۲۵ روپے

ہر بار کہا دل نے

زمانۂ جدید کی تمام تر اشاعتی خوبیوں سے مزین یہ افسانوی مجموعہ ہر لحاظ سے اتنا دلچسپ، دلکش اور پُرلطف ہے کہ جسے پڑھنے کے بعد آپ دیہاتی زندگی کو ایک نعمتِ غیر مترقبہ کہنے پر مجبور ہوں گے۔ اور یہ خوبصورت افسانوی مجموعہ آپ اپنے احباب کو تحفۃً پیش کریں گے۔ قیمت: -/۳۵ روپے۔

کرنوں کے پدچن

ڈاکٹر ارمان کی یہ ہندی تصنیف سوانحی خاکوں پر مشتمل ہے جسے پڑھ کر آپ زندگی کو بہتر انداز میں بسر کرنے کے گُر سیکھ سکیں گے۔ سنہ ۱۹۹۰ء کی انتہائی درجہ کی خوبصورت کتاب جو کمپیوٹر لیزر پر کمپوز ہوئی ہے۔

قیمت: -/۵۰ روپے

ملنے کا پتہ:-

یو۔ ایس۔ اے ہسپتال۔ گاندھی روڈ۔ بلاری۔ ضلع مرادآباد۔ یو۔پی۔ ۲۰۲۴۱۱۔

تقسیم کار:-

دفتر ماہنامہ "شانِ ہند"۔ فلیٹ نمبر ۸۔ انصاری مارکیٹ، دریا گنج۔ نئی دہلی۔ ۱۱۰۰۰۲۔

साहित्य कला परिषद्, दिल्ली

(दिल्ली प्रशासन का सांस्कृतिक विभाग)

४/६ बी, आसफ अली रोड, नई दिल्ली-११०००२

साहित्य कला परिषद् दिल्ली के नागरिकों को घर-घर पहुंच कर कला एवं संस्कृति प्रदान कर रही है।

साहित्य कला परिषद् के अन्तर्गत विभिन्न योजनाएं :—
संगीत, नृत्य, नाटक एवं ललित कलाएं।

* युवा कलाकारों को आगे प्रशिक्षण हेतु संगीत, नृत्य, नाटक तथा ललित कलाओं के क्षेत्र में छात्रवृत्तियां/फैलोशिप प्रदान करना।
* युवा महोत्सव : विभिन्न कलात्मक क्षेत्रों में कार्यरत युवा कलाकारों के लिए पूरी तरह समर्पित-संगीत, नृत्य, नाटक और ललित कलाओं का एक उत्सव।
* राष्ट्रीय एवं अन्तर्राष्ट्रीय स्तर के कलाकारों की खोज करने के लिए वार्षिक-संगीत, नृत्य तथा नाटक उत्सव।
* दिल्ली शहर तथा देहात के निवासियों के लाभार्थ कला एवं संस्कृति के कार्यक्रम।
* राष्ट्रीय एकता तथा सांस्कृतिक जागरण के उद्देश्य से दिल्ली के कलाकार दूसरे प्रांतों में भेजे जाते हैं तथा प्रांतों के कलाकार 'कला प्रदर्शन' के लिए दिल्ली बुलाए जाते हैं।
* प्रतिवर्ष साहित्य कला परिषद्-संगीत, नृत्य, नाटक तथा ललित कलाओं के क्षेत्र में शानदार योगदान के लिए दिल्ली के श्रेष्ठतम कलाकारों को सम्मानित करती है।
* रचनात्मक लेखन में लगे लेखकों को प्रोत्साहित करने के लिए परिषद् नाट्य-लेखन प्रतियोगिताओं का आयोजन करती है।
* पुरस्कृत नाटकों के मंचन हेतु साहित्य कला परिषद् द्वारा नाट्य उत्सवों का आयोजन किया जाता है।
* परिषद् कला-शिविरों का आयोजन करती है, जिनमें वरिष्ठ तथा उभरते हुए कलाकार, कला एवं शिल्प के क्षेत्र में खुले वातावरण में साथ-साथ काम करते हैं।
* ललित कला की प्रदर्शनियों के लिए निःशुल्क कलावीर्थी की सुविधा।

—साहित्य कला परिषद्

ضمیر کی آواز

ڈی۔ اے۔ ہیریسن قربان

رام داس کے الیکشن میں جیتنے کی خبر ملتے ہی سارے گاؤں میں خوشی کی لہر سی دوڑ گئی۔ رات کو گاؤں میں چراغاں کیا گیا۔ ہر آدمی کی زبان پر ایک ہی جملہ تھا کہ اب ہمارا گاؤں شہروں سے مقابلہ کرے گا۔

برہمنوں کا یہ چھوٹا سا گاؤں ایک ندی کے کنارے آباد تھا۔ اس لئے یہاں کی زمین زرخیز تھی۔ یہاں پانچ چھ گھرانے نیچی ذات والوں کے تھے۔ دو گھر مسلمانوں کے باقی سب برہمنوں کے تھے۔ ان میں زیادہ لوگ دوسروں کے کھیتوں میں محنت مزدوری یا بٹائی پر کاشتکاری کر کے اپنا پیٹ پالتے تھے۔ کچھ کے پاس اپنی زمین تھی جو زمینداری سسٹم کی سبھی پرتھا کے تحت انکو ملی تھی برہمنوں کے بھی دو چار گھر خوشحال تھے۔

رام داس کے آباؤ اجداد اسی گاؤں کے رہنے والے تھے لیکن مدت دراز سے وہ شہر میں جا بسے تھے وہاں انہوں نے ایک فیکٹری لگالی تھی اور آرام و آسائش کے ساتھ زندگی گزار رہے تھے۔ گاؤں میں آنا جانا ختم سا ہو گیا تھا۔ البتہ انکے دو چار رشتہ دار باپ دادوں کی زمین پر قبضہ جمائے بیٹھے تھے۔ الیکشن کا زمانہ آیا تو یار لوگوں نے رام داس کو بھی الیکشن لڑنے کے لئے آمادہ کر لیا پیسہ کی کمی نہ تھی۔

وہ الیکشن کے سلسلے میں اپنے حلقہ کے اس گاؤں میں دو چار مرتبہ آئے لوگوں سے ملے۔ ایک دن انہوں نے تمام گاؤں والوں کو اکٹھا کر کے میٹنگ کی اور کہا:۔

بھائیو آپ جانتے ہیں کہ میں اسی گاؤں کا رہنے والا ہوں۔ کاروباری مصروفیات کی وجہ سے میں یہاں نہیں آپاتا ہوں۔ لیکن گاؤں کے تمام حالات سے واقفیت حاصل کرتا رہتا ہوں۔ مجھے بڑا دکھ ہوتا ہے کہ آزادی کے بعد اس ہمارے گاؤں میں کوئی ترقی نہیں ہوئی۔ ہمارے ہریجن بھائیوں کی حالت میں بھی کوئی سدھار نہیں آیا۔ جب تک ہماری پچھڑی جاتی کے لوگوں کی ترقی نہیں ہوگی دیش ترقی نہیں کر سکتا۔ ملک کی ترقی کا دار و مدار آپ لوگوں کی ترقی پر منحصر ہے۔ صدیوں سے آپ کے اوپر ظلم ہو رہا ہے۔ لیکن اب ایسا نہیں ہونے دیا جائے گا۔ میرا بھتیجہ ہر نرائن یہاں آپکے درمیان رہتا ہے آپکو جب بھی کوئی شکایت ہو اس سے کہیئے وہ اُسے دور کریگا یا مجھے آکر خبر کرے گا اب آپ لوگ ایک ایک کر کے مجھے بتائیے کہ گاؤں میں کن کن چیزوں کی کمی ہے۔ میرا سکریٹری سب لکھے گا۔ اور میں الیکشن میں کامیاب ہوتے ہی ان کاموں کو پورا کرونگا۔ ہاں بولیئے۔

بڑی بلند آواز میں بابو رام داس کی جے بولی گئی اسکے بعد ان کے بھتیجے ہر نرائن کی جے اور زندہ باد کے نعرے لگائے گئے۔ اب لوگوں نے بولنا شروع کیا۔

" حضور گاؤں میں پکی سڑک ہونی چاہیئے۔

" سرکار مہنگائی نے کمر توڑ کر رکھ دی ہے۔ دو وقت کا کھانا ملنا مشکل ہو رہا ہے۔

• صاحب جس زمین پر ہم کاشتکاری کرتے چلے آ رہے ہیں سرکاری حکم کے باوجود ہمیں اس کے پٹے ابھی

تک نہیں ملے۔

صاحب ہماری بہو بیٹیوں کی عزت ہر وقت خطرے میں رہتی ہے اس کا کچھ بندوبست ہونا چاہئے۔

غرضیکہ کسی نے کچھ کہا کسی نے کچھ۔ رام داس جی نے سب کو یقین دلایا کہ بہت جلدی یہ سب کام ہو جائیں گے۔ بس آپ لوگ مجھے ووٹ دے کر کامیاب بنا دیجئے۔ ہاں سکریٹری صاحب آپ نے سب کچھ لکھ لیا ہے، مجھے یاد دلاتے رہیئے گا۔ سکریٹری نے اونچی آواز میں کہا جی سرکار سب کچھ لکھ لیا ہے۔

اس دن کے بعد سے گاؤں والے خوابوں کی دنیا میں رہنے لگے۔ جاہل اور ان پڑھ لوگوں کو بہلانا اور بہکانا کتنا سہل و آسان ہوتا ہے۔ بابو رام داس الیکشن جیت گئے تو گاؤں والوں کو ایسا لگا کہ چار چھ مہینوں میں انکے گاؤں کا نقشہ بدل جائے گا اور ان کے گھروں میں خوشحالی پیدا ہو جائے گی۔ یہ بھی سننے میں آیا کہ بابو رام داس بڑی پارٹی میں شامل ہو گئے ہیں اور شاید وہ وزیر بن جائیں گے۔

اس خبر کے سنتے ہی انکے اس دور کے بھتیجے ہرنرائن کو تو گویا حکومت مل گئی۔ وہ نہ صرف اپنے گاؤں میں بلکہ آس پاس کے گاؤں میں مونچھوں پر تاؤ دیتے دندناتے پھرنے لگے جس گھر سے چاہا گھی اور دودھ منگوا لیا جس کھیت سے چاہا چارہ کٹوا لیا۔ جسے چاہا بیگار میں پکڑ کر دن بھر مزدوری کرالی۔ ہریجنوں پر مصائب کا پہاڑ ٹوٹ پڑا۔ ہرنرائن کی گرد چمچوں کا اجتماع ہو گیا دو چار غنڈے بھی پلنے لگے یعنی اس تمام حلقے میں ہرنرائن کا راج ہو گیا۔ بابو رام داس کے نام کی وجہ سے پولس والے اور سرکاری حکام بھی اس سے آنکھیں ملاتے ہوئے کتراتے تھے۔

ایک دن کلوا کی جوان لڑکی کو انکے ایک آدمی نے زبردستی پکڑ لیا اور ایک کھیت میں لے جا کر اسکی عصمت دری کر دی۔ جب کلوا ہرنرائن سے شکایت کرنے گیا تو اس نے ڈانٹ کر کہا تم لوگ اپنی اوقات میں رہو۔ میرے آدمیوں پر ایسے جھوٹے الزام لگاؤ گے تو کھال کھینچ لونگا۔ اس بات کی خبر جب گاؤں والوں کو ہوئی تو بہت گھبرائے۔ انہوں نے مشورہ کیا کہ شہر جا کر بابو رام داس کو ان باتوں کی خبر کر دی جائے۔

اسی روز شام کو ہرنرائن کے دو آدمی چھرنا کے گھر آئے اور بولے چھوٹے سرکار نے حکم دیا ہے کہ کل اپنی لڑکی کو ان کے گھر کام کرنے بھیج دینا کچھ مہمان آنے والے ہیں دیکھو غلطی نہ ہو۔

دراصل چھرنا کی لڑکی چمپا بہت خوبصورت اور حسین تھی ویسے تو چھرنا اسے گھر سے کم ہی نکلنے دیتا تھا لیکن ہرنرائن کے کسی آدمی نے اسے دیکھ لیا تھا اور جا کر مالک سے اسکے حسن کا چرچا کر دیا تھا بس اسی روز سے انکی آتش ہوس بھڑک اٹھی تھی اور آج اسے ٹھنڈا کرنے کا پروگرام بن گیا تھا۔ غریب اور بے سہارا لوگوں کے گھر میں حسن کا جنم لینا اور جوانی میں قدم رکھنا گھر والوں کے لئے وبال جان بن جاتا ہے میکے میں بھی اور سسرال میں بھی۔

چھرنا نے ہر چند بہانے بنانے کی کوشش کی لیکن اسکی ایک نہ چلی۔ دوسرے دن اس نے اپنی عورت سے چمپا کو ہرنرائن کے گھر لے جانے کو کہا وہ آنا کانی کرنے لگی بولی۔

• مجھے چھوٹے سرکار کی نیت ٹھیک نہیں لگتی۔

• اس لئے تو تجھے اسکے ساتھ بھیج رہا ہوں پگلی وہ بڑے آدمی ہیں اونچی جات کے ہیں ہم نیچی جات کے ہیں ہمارے ساتھ کوئی کوکرم نہیں کر سکتے۔ ہمیں چھونے سے انکی جات بگڑ جائے گی۔

• پھر بھی مجھے ڈر لگ رہا ہے۔

• مگر جانا تو پڑے گا ہی۔ انکے چاچا منتری ہیں ندی میں رہ کر مگرمچھ سے بیر نہیں کر سکتے۔

دن چڑھے دونوں ماں بیٹی انکے گھر پہنچ گئیں چمپا کو دیکھتے ہی وہ حیران رہ گیا۔ ان جھونپڑیوں میں ایسے ایسے لعل موجود ہیں اور ہمیں پتہ تک نہیں۔ وہ چمپا کو اپنے بانہوں میں جکڑ لینے کے لئے بے چین ہو گیا اس کے دو آدمیوں نے چمپا کی ماں سے کہا تو اندر والے کمرے کو صاف کر جب تک تیری لڑکی بابوجی کا کمرہ جھاڑے گی وہ اسکی ماں کو حویلی کے اندر لے گئے اور ایک کمرے میں گھسا کر باہر سے دروازہ بند کر دیا۔ چمپا بابوجی کے کمرے میں جھاڑ پونچھ کرنے لگی۔ اتنے میں بابوجی اندر داخل ہوئے ایک جلتا ہوا شعلہ آنکھوں کے سامنے دہک رہا تھا انہوں نے اندر سے دروازہ بند کر لیا چمپا چیخی چلائی مگر درندوں کے بیچ کون اسکی سنتا۔ جو ہونا تھا ہو گیا۔ ہرنرائن اپنی ہوس بجھا کر باہر نکل آئے اور چمپا اور اسکی ماں کو حویلی سے باہر کر دیا۔ دونوں روتی پیٹتی گھر پہنچیں اور جو کچھ ہوا تھا بتایا سنکر تمام ہریجنوں کا خون کھولنے لگا۔ وہ سب ہرنرائن کے گھر پہنچے مگر وہاں اس کے لوگوں نے انکی خوب پٹائی کی۔ وہ لوگ پولس چوکی گئے وہاں تھانے دار نے سنی ان سنی کر دی اور انہیں بھگا دیا۔ اب وہ لوگ شہر بابو رام داس کے پاس پہنچے۔ دن بھر دھوپ میں بیٹھے اُن کا انتظار کرتے رہے شام کو وہ باہر نکلے۔ ان سے داد و فریاد کی اور تمام حال سنایا۔ وہ آنکھیں چڑھا کر بولے تم لوگ اپنی اوقات بھول گئے۔ ایک برہمن کے خاندان پر ایسی تہمت لگاتے تمہیں شرم آنی چاہیئے۔ بھاگو اور پھر کبھی میرے رشتہ داروں کے خلاف زبان نہ کھولنا۔

لیکن سرکار۔۔۔ ایک نے ہمت کر کے کہا۔

خاموش رہو! میں کچھ سننا نہیں چاہتا۔ تم مجھے بدنام کرنا چاہتے ہو۔ چلے جاؤ یہاں سے۔

چپراسی نے انہیں گیٹ کے باہر نکال دیا وہ اپنا سا منہ لے کر لوٹ گئے۔ آپس میں کہنے لگے کہ یہ کیسا راج ہے کیسے چناؤ ہیں۔ جنہیں ہم ووٹ دے کر سرکار بناتے ہیں وہ ہماری جان کے دشمن ہو جاتے ہیں۔ ہماری بات تک نہیں سنتے۔ ایسا ظلم تو انگریز سرکار میں بھی نہیں ہوتا تھا۔ کم از کم ان کے یہاں سنوائی تو ہوتی تھی یہ رام داس کیسے کیسے وعدے کر کے گیا تھا۔ اب ہمیں خود اپنی حفاظت کرنی پڑے گی۔

شام کو تمام ہریجن لاٹھیوں سے لیس ہو کر ہرنرائن کی حویلی پہونچے اور شور شرابا کرنے لگے اندر سے کچھ غنڈے ڈنڈے لے کر باہر آگئے خوب جم کر لڑائی ہوئی پندرہ بیس آدمی زخمی ہوئے ہرنرائن کے بھی دو تین آدمی گھائل ہوئے۔ اسی رات قریب دو بجے ہریجنوں کے گھروں کی طرف سے رونے چلانے کا شور بلند ہوا۔ انکی جھونپڑیاں آگ کے شعلوں میں گھری ہوئی تھیں سمجھنے والے جانتے تھے کہ یہ کام ہرنرائن کے آدمیوں نے کیا ہے۔ آن کی آن میں ہریجن بے گھر ہو گئے کوئی راستہ نہ دیکھ کر وہ سب شہر میں ڈی۔ ایم کی کوٹھی پر گئے اور وہاں دھرنا دے دیا۔ ڈی ایم نے انکی بات سنکر ایس پی

کو حکم دیا کہ اس معاملہ کی جانچ کرے۔ لیکن اس سے پہلے کہ ایس پی وہاں پہنچے مام داس کا فون آگیا کہ گاؤں کے ہریجنوں کو اچھا سبق سکھایا جائے۔ چنانچہ گاؤں کے چوکیدار کی طرف سے رپورٹ درج کرائی گئی کہ رات کو ہریجنوں کی بستی میں اتفاقیہ آگ لگ گئی۔

انہوں نے بابو ہر نرائن کے گھر پر چڑھائی کر دی اور فوجداری کا معاملہ عدالت میں پہنچا۔ پانچ ہریجنوں کو دو دو سال کی قید سنادی گئی بستی کے تمام لوگ سہم کر رہ گئے لیکن یہ فیصلہ سنتے ہی یکایک دارو غہ جی کے چہرے کا رنگ بدل گیا وہ کورٹ سے سیدھے گھر پہنچے اور چپ چاپ اپنے کمرے میں لیٹ گئے۔ انکو پریشان دیکھ کر انکی بیوی نے پریشانی کی وجہ دریافت کی تو آنکھوں میں آنسو بھر کر بولے۔

• کیا بتاؤں شیلا۔ میں نے ایسا گناہ کیا ہے جسکی تلافی ممکن نہیں ہے مجھے خدا کبھی معاف نہیں کرسکتا

• مگر ہوا کیا۔

• اب مجھ سے پولس کی ملازمت نہیں ہو سکتی۔

• کیوں ؟

• اس لئے کہ ہمیں رات دن اپنے ضمیر کا خون کرنا پڑتا ہے۔ انصاف کا گلا گھونٹنا پڑتا ہے۔ میں نے جان بوجھ کر غریب ہریجنوں کے گھر تباہ ہونے دیئے اور پھر انہیں مظلوموں کو سزا بھی دلوا دی۔

• اس میں آپ کا کیا قصور۔ آپ کو تو اپنے اعلیٰ حاکموں کے حکم کے مطابق کام کرنا پڑتا ہے۔

• ہاں لیکن اپنے ملک میں ہم ایمانداری کے ساتھ اپنے فرائض انجام نہیں دے سکتے۔ مجھے معلوم ہے کہ ہر نرائن نے ان غریبوں پر کتنا ظلم کیا ہے لیکن وہ منسٹر کا بھتیجہ ہے۔ ہم اس کے خلاف کوئی کارروائی نہیں کرسکتے بلکہ الٹا اس کا ساتھ دینا پڑتا ہے۔ اگر ہم ظلم روکنے کے لئے کوئی قدم اٹھاتے ہیں تو ہمارے خلاف تحقیقاتی کمیشن بیٹھا دیا جاتا ہے۔ ہمیں معطل کر دیا جاتا ہے۔ ہماری آنکھوں کے سامنے بستیاں جلائی جاتی ہیں۔ دوکان اور مکان لوٹے جاتے ہیں۔ ریل اور بسیں پھونکی جاتی ہیں سرکاری املاک کو برباد کیا جاتا ہے۔ غنڈے بدمعاش دن دھاڑے قتل کرتے ہیں اور ہم کچھ نہیں کرسکتے کیونکہ ہمیں اپنی نوکری پیاری ہے۔ اب بتاؤ کہ ان حالات میں ہم کس طرح نوکری کرسکتے ہیں۔

• لیکن دوسرے حاکم بھی تو ملازمت کرتے ہیں۔

• ہاں کرتے ہیں۔ اپنے ضمیر، اپنے اخلاق اور اپنے دھرم کو زندہ دفن کرنے کے بعد۔ شیلا مجھ سے یہ سب برداشت نہیں ہوتا۔ اُن بے سہارا لوگوں کی جھونپڑیوں سے اٹھتے ہوئی آگ کی لپٹیں اور ان کا بلک بلک کر رونا میری آنکھوں کے سامنے گھوم رہا ہے۔ میں پاگل ہوجاؤنگا"

شیلا پاگل۔ جاؤ تم جاکر سو جاؤ۔

صبح ہوتے ہی تھانہ میں کہرام مچ گیا۔ دارو غہ جی نے رات کے سناٹے میں خودکشی کرلی تھی۔

حضرت عروج زیدی

ہم راز دردِ دل ساقی [illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

راہ میں خود اپنے [illegible]

کلامِ شاعر بخطِ شاعر

[illegible]

ہند و پاک کے جانے پہچانے فنکار حضرت عروج زیدی مرحوم کی چوتھی برسی ۴ فروری ۱۹۹۱ء کو ہوگی۔ سالِ گزشتہ کی طرح اس سال بھی چوتھی برسی پر ۴ فروری کو بعد نمازِ فجر ختمِ کلام پاک، مرحوم کے مزار پر گل پوشی و چراغاں ادا کی جائے گی۔ بعد نمازِ ظہر ختمِ کلام پاک، بعد نمازِ عصر فاتحہ خوانی۔ شب میں رامپور و بیرون کی مختلف اُردو تنظیموں کے نمائندے مرحوم کی گرانقدر اُردو خدمات پر روشنی ڈالیں گے۔ مرحوم کی تصانیف کی اشاعت کا پروگرام ترتیب دیا جائیگا۔ مرحوم کی شاعری اور نثر دونوں میں ایسے بہت سے گوشے باقی ہیں جس پر مزید کام کرنے کی ضرورت پر غور کیا جائے۔ مرحوم کے خلف اکبر عرفان زیدی نے عقیدت مندوں سے پروگرام میں شرکت کی اپیل کی ہے۔

بارگاہِ رسالت مآب ﷺ

فداہ اُمی وابی

شورش کاشمیری

اُس شخص سراپا رحمت سے اِس ذات پہ یکسر نورِ خدا ہم ارض و سما کو دیکھ چکے لیکن کوئی اُس جیسا نہ ملا

سجدے کو جبیں تک آ پہنچے یثرب کی زمیں تک آ پہنچے ہم عینِ یقیں تک آ پہنچے، اے صلِ علیٰ اے صلِ علیٰ

اُس ذاتؐ پہ حجت ختم ہوئی، نبیوں کی شہادت ختم ہوئی یعنی کہ نبوت ختم ہوئی. پھر کوئی نہ اُس کے بعد آیا

سورج نے ضیا اُس چشم سے لی اُس نطق سے غنچے پھول بنے اُٹھا تو ستارے فرش پہ تھے، بیٹھا تو زمیں کو عرش کیا

اُس نورِ مجسم سے پہلے. اُس ذاتِؐ مکرم سے ہٹ کر تاریخ کے ظلمت زاروں میں جو عقدہ تھا عقدہ ہی رہا

ہم ایسے فقیروں کی زد میں دولت بھی رہی حشمت بھی رہی اُس در سے ہمیں جب نسبت ہے دارا و سکندر چیز ہیں کیا

سیرت کے درخشاں موتی ہیں اصحابِ مدینہ رولتے ہیں سینا پہ گئے تو کچھ نہ ملا. جو کچھ بھی ملا یثرب سے ملا

جب دوش پہ گیسو کھلتے ہیں واللیل کی شرحیں ہوتی ہیں لولاکَ لما کے سانچے میں اک نورِ مجسم ڈھل کے رہا

اونٹوں کے چرانے والوں نے اُس شخص کی صحبت میں رہ کر قیصر کے تبختر کو روندا، کسریٰ کا گریباں چاک کیا

اُس نام کی عظمت عرش پہ ہے اُس شخص کا چرچہ فرش پہ ہے وہ ذاتؐ نہیں تو کچھ بھی نہیں قرآں کی ہر آیت سے کھلا

بطحا کے مسافر دیکھ کے چل یہ اُس کے نقوشِ پا ہی تو ہیں تاریخ کے لالہ زاروں میں از غارِ حرا تا کرب و بلا

کیا بات کہی ہے مرشد نے اللہ کی اُس پر رحمت ہو سبحان اللہ ما اجملکَ ما احسنکَ ما اکملکَ

حاصلِ مُطالعہ

کمال گیاوی

آسمان کی طرف ہمیشہ ہاتھ دُعا کے لئے اُٹھتے ہیں اور آخر کار ظاہر یہ ہو جاتا ہے۔

اے بھیڑیئے! کیا میں نے تجھے بتایا نہیں تھا کہ کسی روز چیتا تجھ پر حملہ کر دے گا۔

میرے بھائی! اگر تجھے یہ منظور نہیں کہ تیرے ساتھ کوئی برائی ہو، تو وہ برائی کسی اور کے ساتھ نہ کر۔ اگر تجھے اپنی ماں عزیز ہے تو مجھے ماں کی گالی نہ دے۔

کمزور شخص پر زیادتی کرنا مروّت نہیں چیونٹی سے کینہ پرور ہی دانہ چھینتا ہے۔

اگر تو چاہتا ہے کہ تمام لوگ تجھے دوست اور مہربان سمجھیں، تو جس شخص سے تیری مُلاقات ہو اُس جیسا بن جا۔

ایسا درخت جو تیس سال نشوونما پاکر مکمل درخت بن گیا ہو، آندھی کا ایک تھپیڑا اُسے جڑ سے اُکھاڑ سکتا ہے۔

کسی کو خوش کرنے کے لئے کسی کو آزردہ کرنا اچھی بات نہیں۔

اگر تجھ سے بڑا شخص تجھے گالی دیتا ہے تو بہتر ہے کہ تو جواب میں خاموشی اختیار کر۔

جس جانور کی قسمت میں روزی نہ ہو، اُسے دجلہ میں بھی مچھلی نہیں ملتی۔ اور جس مچھلی کی اجل نہ آئی ہو، وہ خشکی پر بھی نہیں مرتی۔

جب تو نے بُری بات کہہ دی تو اپنے آپ کو بدگو سے محفوظ نہ سمجھ۔ کیونکہ بُرے شخص کو نیک کوئی نہیں کہے گا۔

درویش وہ ہیں جو ذکر، شکر، خدمت، بندگی، ایثار، قناعت، توحید، توکّل، تسلیم اور تحمّل سے بہرہ ور ہوتے ہیں۔ جس شخص میں یہ اوصاف ہوں، وہ واقعی درویش ہے خواہ اُس نے قبا ہی زیب تن کر رکھی ہو۔ لیکن جو لوگ بے نماز، لالچی، ہوس باز ہوں ــــــ دن کو شہوت رانی میں مصرُوف رہیں اور رات کو.. خوابِ غفلت میں پڑے رہیں اور جو کچھ ملے اُس پر ہاتھ صاف کرتے رہیں ـــ اور جو کچھ مُنہ میں آئے بکتے رہیں، ایسے لوگ زندیق ہیں ـــ خواہ انھوں نے عبا پہن رکھی ہو ــــــ

بادل سے بارش کا ایک قطرہ ٹپکا۔ جب اُس نے دریا کی پہنائی دیکھی تو بہت شرمندہ ہُوا۔ کہنے لگا ـ دریا کے مقابلہ میں میری کیا بساط ہے۔ میرا وجُود تو نہ ہونے کے برابر ہے۔ جب اُس نے اپنے آپ کو حقارت کی نگاہ سے دیکھا تو صدف نے اُسے اپنی آغوش میں لے لیا۔ آخرکار وہ لُولُوئے شاہوار بن گیا ـــ اُسے یہ بُلند مرتبہ اس لئے مِلا کہ وہ پست ہو گیا تھا۔ اُس نے نیستی کا دروازہ کھٹکھٹایا اور اُسے زندگی مِل گئی۔

شکر ادا کرنے سے یا شکایت کرنے سے تقدیر نہیں بدلتی۔ جو فرشتہ ہَوا کے خزانے پر وکیل ہے اُسے پرواہ نہیں ہوتی کہ ہوا چلنے سے کسی بیوہ کا چراغ بجھ جائے گا۔

جو شخص دو کوس میں مقبول ہو نے سے
تم ... نت ... شہرت حاصل کر لی
شہرت ... سلامت کر دیتی ہے۔

... بات کہی اور تجھے فیصلہ ... جب
... تو ... جتنے ... تو حقوق ... کر
... نہیں کرتے۔

سختی ... ہونی چاہئے جیسا کہ
... جیسے ... ہوتا ہے اور
... بھی ... ہے۔

دیوار کے سامنے کچھ کہنا ہے تو اس بات
کا خیال رکھو ... دیوار کے پیچھے کوئی کان نہ ہو۔

کسی کے نفس کی خباثت کئی سالوں میں
بھی معلوم نہیں ہو سکتی۔

جو عالم عمل نہیں کرتا، وہ نہ محقق ہے
اور نہ دانشمند۔ بلکہ ایک چوپایہ ہے جس پر چند
کتابیں لدی ہوئی ہیں۔

اگر تو باپ کی میراث چاہتا ہے تو باپ کے
علم کا وارث بھی بن۔

جوان عورت کے پہلو میں تیر کا لگنا، اس
سے بہتر ہے کہ اس کے پہلو میں بوڑھا شخص بیٹھے۔

تو اس شخص پر ناز کر جو تیرا خریدار ہے۔

صیاد ہر بار تنکا پکڑنے میں کامیاب
نہیں ہوتا ممکن ہے کسی دن چیتا اسے پھاڑ ڈالے۔

طمع عقلمند آدمی کی آنکھ پر بھی پٹی باندھ
دیتی ہے۔

چیونٹی ... بہتر ہے جس کے پر نہ ہوں
تو جان ہونے سے پہلے خاک ہو جا۔

... جو کچھ بھی کہتا ہے، باطل ہے۔

اگر روزی عقل کی بدولت ملتی تو نادان
بھوکے مر جاتے۔

جس شخص کی فطرت ہی بری ہو، اس
پر نیکی کا سایہ نہیں پڑ سکتا۔

زہریلے سانپ کو مارنا اور اس کے بچے کی
پرورش کرنا عقلمندوں کا شیوہ نہیں۔

دوست مہربان ہو تو دشمن کچھ نہیں کر سکتا۔

عافیت کی قدر وہی جانتا ہے جو مصیبت
میں گرفتار رہا ہو۔

میں دامن کہاں سے لاؤں میرے بدن
پر تو کپڑا ہی نہیں ہے۔

حد سے زیادہ ناراض ہونے سے وحشت
پیدا ہوتی ہے اور بے وقت مہربانی سے دبدبہ
جاتا رہتا ہے۔ نہ تو اتنی سختی کر کہ نفرت کا
موجب ہو اور نہ اتنی مہربانی کر کہ کمزوری پر
محمول ہو۔

جس نے بے فائدہ عمر گزاری، اس کی
مثال اس شخص کی سی ہے جس نے تمام پونجی دے ڈالی
ہو اور کوئی چیز نہ خریدی ہو۔

دو شخصوں نے بے فائدہ تکلیف اٹھائی
ایک وہ جس نے مال جمع کیا اور خرچ نہ کیا۔ دوسرے
وہ جس نے علم حاصل کیا اور اس پر عمل نہ کیا۔

اگر بے وقوف پتھر چینی کے کاسہ کو توڑ دے
تو پتھر کی قیمت نہیں بڑھے گی اور سونے کی قدر
نہیں گھٹے گی۔

اگر آپ منصف ہوتے اور ہم قانع تو دنیا
سے سوال کی رسم ہی اٹھ جاتی۔

انتقام کی قدرت نہ ہو تو خاموش رہنا
چاہئے۔ خدا کبھی موقع دے تو بدلہ چکا دینا
چاہئے۔

جاہلوں کی باتوں کا جواب خاموشی ہوتا ہے۔

میں نے ایسا کوئی شخص نہیں دیکھا جس
نے مجھ سے ہنر سیکھ کر اسے مجھی پر نہ آزمایا ہو۔

ہمیشہ سیدھی راہ چلنا چاہئے۔ خواہ اس
طرح زیادہ فاصلہ طے کرنا پڑے۔

جب تک انسان بات نہیں کرتا، اس کے
کے عیب و ہنر چھپے رہتے ہیں۔

زیادہ بولنے والا جھوٹا ہوتا ہے۔

نادان وہ ہے جو اپنی غلطیوں سے سبق
نہیں سیکھتا۔

عقلمند وہ ہے جو دوسروں کے تجربے
سے فائدہ اٹھاتا ہے۔

اگر ہُما دنیا سے معدوم بھی ہو جائے تو کوئی
سا شخص بھی اُلو کے سایہ میں نہیں آئے گا۔

ابتدا میں دنیا میں ظلم کی بنیاد بہت قلیل
تھی۔ جو بھی آیا، اس نے اس میں اضافہ کیا اور
نوبت یہاں تک پہنچ گئی۔

دوسروں پر پتھر پھینکنے والے کو چاہئے
کہ اپنے آپ کو محفوظ نہ سمجھے۔

میں نے اس لئے بابل کی اینٹ سے اینٹ
بجا دی کہ اس کے باشندوں کے نزدیک نہ نیکی نیکی
رہی تھی، نہ بدی، بدی۔

تندرستی سے بہتر کوئی تونگری نہیں۔

طلب علم میں شرم مناسب نہیں کیونکہ
جہالت ندامت سے بدتر ہے۔

LIAISON PEOPLE

MAY HELP YOU IN SOLVING YOUR **PROBLEMS**

OUR ADVISE WILL SAVE YOUR

TIME TENSION MONEY

A WELL EXPERIENCED TEAM OF PROFESSIONALS. RETIRED SENIOR OFFICERS FROM C.C.I. & E. D.G.T.D. MINISTRY OF COMMERCE. INDUSTRIES. TEXTILE. FINANCE. LAW. DEPARTMENT OF ELECTRONICS. IS AT YOUR SERVICE

- FORMATION AND RECOGNITION OF EXPORT HOUSE-TRADING HOUSE.
- FIXTATION OF NORMS AND ISSUE OF ADVANCE LICENCE-C.G. LICENCE.
- INTERPRETATION OF PROVISIONS OF IMPORT/EXPORT POLICY.
- ASSESSMENT OF THE VALUE OF OLD/NEW MACHINERY-RAW MATERIALS.
- INDUSTRIAL LICENCE. FOREIGN COLLABORATION. FOREIGN LOANS
- ENFORCEMENT-LITIGATION CASES AND APPEALS.

AND ANY OTHER MATTER WITH MINISTRY OF COMMERCE-INDUSTRY FINANCE-AGRICULTURE-STEEL-TEXTILE AND ANY OFFICE LIKE MMTC-STC ETC. AT DELHI.

SALE • PURCHASE OF R.E.P./ ADDITIONAL LICENCES

AWAITING FOR YOUR CALL



fairdeal impex india

L-4, Connaught Circus, New Delhi. Phones: 3328562, 3328664

Grams: FAIRIMPEX Telex: 31-65404 SAQI IN

Phones: Res. K. L. NARANG 6418040 S. L. MANOCHA 2210637

کالی داس گپتا رضا کی طرف سے سلسلۂ غالبیات میں ایک

اور اضافہ

غالب کی بعض

تصانیف کے بارے میں

مصنف اور کتاب کا نام دونوں ہی اس بات کی ضمانت ہیں کہ کتاب
کا ہر ہر لفظ مستند ہے

عمدہ کتابت۔ روشن طباعت مضبوط جلد
اور معیاری سرورق بہت جلد منظر عام پر آرہی
ہے

رابطہ۔ وِل پبلی کیشنز :- ۱۰۷ اجولی بھون ۱۰ نیو مرین لائنس
بمبئی

سُرخ و سیاہ حاشیئے

جیون لال شرما لندن

۔۔۔ے شیخ تُو جنت کی کہانی پہ نہ جا۔
(عرش ملسیانی)

ڈاکٹر بلی گراہم عیسائی مذہب کے بہت ۔۔معزز پریچر ہیں۔ عالمگیر شہرت کے مالک۔ ۔۔ئے پائے کے مُقرّر ۔۔۔ اُن کو سُننے کے لئے ۔۔ لاکھوں کی تعداد میں اکٹھے ہو جاتے ہیں۔

ایک مرتبہ ایک چھوٹے سے قصبے میں جہاں ۔۔موصوف پہلی مرتبہ گئے تھے، ایک نو عُمر ۔۔کے سے ڈاک خانے پہنچنے کا راستہ "پوچھ ۔۔ے" ۔۔۔ جو" میاں صاحبزادے "نے ۔۔یت سُتھرے انداز میں بیان کر دیا۔

ڈاکٹر بلی گراہم خوش ہوئے، شکریہ ۔۔کیا اور مہربانہ انداز میں لڑکے سے کہنے لگے۔

"میں آج شام اس قصبے کے چرچ ہال ۔۔۔ لوگوں کو یہ بتلانے والا ہوں کہ جنت پہنچنے کا صحیح راستہ کیا ہے ....."

اللہ کے بندے کی بات ابھی پوری کہاں ہوئی تھی کہ لڑکے نے ماتھا سکیڑ لیا اور لمبی کھینچ کر کہا" تو ۔۔۔ ؟

"خود تو پوسٹ آفس کی راہ پوچھ رہے ہیں ۔۔ اوروں کو جنت کی راہ بتائیں گے ۔۔۔ ہوں ۔۔"

ع "جب کھو ۔۔ ہُوں بھول کر دستے ہیں منزل کا پتہ"
(آرزو لکھنوی)

یہ محبت بھی تو احساس کا اک دھوکا ہے۔
(نریش کمار شاد)

میں اپنے دوست اور کولیگ بستی بی ارنی گبس سے پوچھ رہا تھا کہ وہ گذشتہ شام کلب میں کیوں نہیں آیا۔

"کل اپنی بیوی مارگریٹ کے لئے دن بھر شوفر بنا رہا۔ ڈیزی کو اپنی ہالی ڈے کے لئے نئے کپڑے خریدنے تھے۔"

"میں جانتا ہوں کہ تم اپنی مارگریٹ سے والہانہ محبت کرتے ہو۔ شوفر تو کیا زر خرید غلام بنے رہتے ہو۔ مگر یہ ڈیزی کون ہے بھائی ۔؟"

"مارگریٹ کی بیٹی!"

"یعنی آپ جناب اپنی لاڈلی بیٹی کو شاپنگ کے لئے لے گئے تھے۔"

"بیٹی ؟۔ لاڈلی بیٹی ؟ ۔۔ میری تو کوئی اولاد نہیں ہے بھائی۔"

"یہ ڈیزی ؟ جسکا ابھی ذکر کیا ۔۔ ؟"

"کہا تو ۔۔ ڈیزی میری بیوی مارگریٹ کی بیٹی ہے ...... اُس کے پہلے خاوند سے۔ دُوسرے خاوند سے وہ چھوٹا بلا ہے ٹام۔ اور ہم دونوں کے کوئی اولاد نہیں ہے۔ تھینک گاڈ۔ (کچھ سمجھے۔ یُو انڈین گٹ)

ع " برہم ہوئی ہے یوں بھی طبیعت کبھی کبھی "
(ناصر کاظمی)

میرا جُدا مزاج ہے اُن کا جُدا مزاج

(داغ دہلوی)

کئی گرجا گھروں کے باہر نوٹس بورڈ پر لکھا ہوتا ہے۔
"عیسیٰ بچاتا ہے۔" (Jesus saves)
ایسی ہی ایک تحریر کے نیچے کسی آزاد خیال منچلے نے یہ اضافت لگا دی:
"اور موسیٰ لٹاتا ہے۔"
(And Moses spends)
ایک بی بیاتاں یعنی مسز سپینٹ ترفت اس اضافتی تحریر سے خوب محظوظ ہوئی۔ فرمانے لگیں: ٹھیک ہی تو ہے۔ میں اسی لئے اپنے خاوند کو عیسیٰ صفت کہتی ہوں۔ وہ خوب کماتا ہے اور خوب بچاتا ہے۔ اور میں؟ تو بس حضرت موسیٰ کی معترف ہوں۔ میاں جی کا پے پیکٹ ہاتھ آتے ہی شاپنگ کو نکلنے کی تیاری شروع کر دیتی ہوں اور بصد شوق بائی بائی کر Buy Buy کرتی ہوں۔
مولانا نے اس منصفانہ تجزیہ کو بنائے رکھئے۔
ع " یوں چلئے راہِ شوق میں جیسے ہوا چلے " (داغ دہلوی)

تمہیں مومن کی خودداری پہ کیا کیا اعتماد۔

(مومن دہلوی)

کنگسلے ایمس (Kingsley Amis) ایک نامور اور انعام یافتہ ادیب ہیں۔ ایک بار شغل مے میں "مشغلہ" ہو رہا تھا۔ کچھ قلمکاروں میں یہ بحث چل نکلی کہ کنگسلے صاحب کا رنگ کیا ہے۔
پانچ چھ "پیالوں" کے بعد تو ہر قلمکار خود اپنے رنگ میں آجاتا ہے۔ لہٰذا ہر قلمکار نے اپنے اپنے رنگ کے مطابق رائے زنی شروع کر دی۔
ملاحظہ فرمائیں:—
سیاسی:۔ اُن کا رنگ بلیو ہے۔
کیونکہ آپ کنزرویٹو ہیں۔
ادبی:۔ جی نہیں، سیاہ رنگ ہے جناب کا۔
کیونکہ آئرلینڈ والوں نے اُنکی تحریروں پر فحاشی کا الزام۔۔۔ لگا کر گویا منہ پر کالک پوت دی ہے۔
نظریاتی:۔ کنگسلے کا رنگ سُرخ ہے۔
کیونکہ ایک وقت تھا کہ آپ جناب کارل مارکس کے بہت بڑے پیروکار تھے۔
جسمانی:۔ آپ کا رنگ عنابی ہے۔
کیونکہ وہ بے تحاشہ پئے رہتے ہیں۔
اخلاقی:۔ اجی کنگسلے کا رنگ تو سفید ہے۔ بالکل سفید۔ کیونکہ وہ اپنی طلاق شدہ بیوی کے ساتھ رہتے ہیں، جو خود اپنے خاوند نمبر تین کے ساتھ رہ رہی ہیں۔

ع " الفت اُس شیریں شمائل سے دلی رکھتے ہیں ہم "
(ظفر)

بابِ انتقاد

اِملا نامہ (طبع دوم)

مرتب:۔ پروفیسر گوپی چند نارنگ
ڈیمائی سائز ، صفحات:۔ ۱۲۸
اشاعت سنہ ۱۹۹۰ء ۔ قیمت:۔ نو روپیہ
ناشر:۔ ترقی اُردو بیورو ، نئی دہلی

اِملا نامہ کا یہ نظر ثانی شدہ اور اضافہ شدہ
یڈیشن ترقی اُردو بیورو کی خدمتِ اُردو کا ایک
رثبوت ہے
'اِملا نامہ' کا یہ ایڈیشن چھپائی ، کتابت
رکاغذ کے لحاظ سے اپنی نظیر آپ ہے ۔ ہر وہ
فص جو اُردو لکھنا پڑھنا جانتا ہے ، اُس کے
س اِس کتاب کا ہونا اُتنا ہی ضروری ہے ،
متنا دُوسری ضروریاتِ زندگی کیونکہ اُردو اِملا
ے مُتعلق جو ہندوستان اور پاکستان میں
ش رفت ہوئی ہے اُس سے ہر اُردو داں کا
واقف ہونا ضروری ہے ۔ ہندو پاک کے
ں سے زائد صاحبُ الرّائے حضرات کی آرائے
رامی (اِملا نامہ کے پہلے ایڈیشن کے بارے
ں) بھی اس بار شامِل اشاعت کی گئی ہے ۔
شر ، یا دفترِ شانِ ہند سے طلب فرمایئے ۔

شراب نوشی اور منشّیات کی لت ۔

مصنّف : حسین فاروقی
ڈیمائی سائز ۔ صفحات : ۹۶
سنہ ۱۹۹۰ ء ۔ قیمت : آٹھ روپیہ
ناشر:۔ ترقی اردو بیورو ، ویسٹ
بلاک ۸ ، آر ۔ کے پورم نئی دہلی ۶۶

ترقی اُردو بیورو نے یہ مفید کتاب شائع
کر کے شراب اور دیگر منشیات کے عادی لوگوں
کے علاوہ اُن معالجین پر بھی احسان کیا ہے جو
منشیات کے عادی مریضوں کا علاج کرتے ہیں ۔
سگریٹ نوشی ، سگریٹ کا دھواں ۔
سگریٹ کے سبب ہونے والی بیماریاں مستورات
اور سگریٹ نوشی ، سگریٹ کی عادت کو ترک
کرنے کے امکانات ، شراب کی سمت پہلا
قدم ۔ شراب اور اعصاب ، شراب اور ادویات ۔
تاریخی پس منظر ۔ ادویات اور آج کا نوجوان ،
افیم اور اس کی قسم کی ادویات ، فریبِ خیال کی
ذمہ دار ادویات ، کیتابس ، گانجہ اور سماج ،
دماغی تحریک کی ذمہ دار ادویات ، بے جا طور پر
استعمال کی جانے والی ادویات ، نادرا طور پر
استعمال کی جانے والی ادویات ، لت کی ذمہ دار
ادویات ایسے اٹھارہ مختلف عنوانات پر سیر
حاصل بحث کی گئی ہے ۔ ضرورت ہے کہ محکمۂ
تعلیم اس کتاب کو آٹھویں درجہ کے بعد نصابِ
تعلیم میں شامل کرے تاکہ ہمارے نوجوان نشہ کی
لت سے بچ سکیں ۔
"ناشر ، یا دفترِ شانِ ہند سے یہ کتاب
دستیاب ہے ۔

دیوانِ آبرُو

مُرتب : ڈاکٹر محمد حسن
ڈیمائی سائز ، قریباً چار سو صفحات
سنہ ۱۹۹۰ء ۔ قیمت : پچیس روپے

مُرتب فرماتے ہیں کہ :

" آبرُو شمالی ہند میں اُردو کے پہلے شاعروں
میں ہیں اور اُن کا کلام شمالی ہند کی اُردو شاعری
کی اوّلین یادگاروں میں سے ہے ۔ آبرُو کا انتقال
سنہ ۱۱۴۶ھ میں ہُوا اور اُن کا دیوان اپنے دَور کی
عکاسی کے اعتبار سے صحیح معنوں میں گویا مُرقعِ
دہلی ہے ۔ یہ تاریخی یادگار اَدبی اور جمالیاتی کیف
سے بھی خالی نہیں ہے ۔
کُلّیاتِ آبرُو کے چھ مخطُوطے اس وقت
تک دریافت ہو چکے ہیں ۔ ایک خدا بخش لائبریری
پٹنہ میں ہے ، دُوسرا رام پُور میں ، تیسرا پٹیالہ
میں ، چوتھا کنگز کالج کیمبرج کی لائبریری اِنگلستان
میں موجُود ہے ۔ پانچواں فورٹ ولیم کالج کا نسخہ
ایشیاٹک سوسائٹی کلکتہ کی لائبریری میں ہے
اور چھٹا مولانا عبدُالحق کے ذاتی کتب خانے کا ہے
جو اَب انجمن ترقیٔ اُردو پاکستان (کراچی) کی
مِلکیت ہے ۔"
" دیوانِ آبرُو کا یہ تیسرا ایڈیشن ہے
جو غنیمت ہے ۔ پہلے دو ایڈیشن ناقص اور قطعًا
نامکمل تھے ۔ ڈاکٹر محمد حسن نے اس ایڈیشن کو
جس جانکنی سے ترتیب دیا ہے اس کی تفصیل
شروع کے ان عنوانات ۔ تعارف ، دیباچہ ،
اولیت کا مسئلہ ، طرزِ کلام ، لسانی اہمیت ،
منتخب ابیات ، کچھ اِملا کے مُتعلق ، دیباچۂ طبعِ
سوم ، کے تحت جو سیر حاصل معلومات فراہم
کی ہیں ، وہ یقینًا قابلِ تعریف ہیں ۔ دیوان کے
آخر میں قریبًا ایک صد صفحات میں فرہنگ
دیوانِ آبرُو دیا گیا ہے جس سے قاری کو کلامِ
آبرُو سمجھنے میں آسانی ہوگی ۔ ڈاکٹر محمد حسن
کی اس اَدبی کاوش کی جس قدر بھی تعریف کی
جائے کم ہے ۔

مَن کہ مکتوب الیہ

حضرت!

آں جناب کے کلکتہ کے پروگرام کا کیا ہوا؟ آپ جب بھی کلکتہ کا قصد کریں، یہ خیال رکھیں کہ آپ کا ایک نادیدہ عقیدت مند آسنسول میں بھی موجود ہے۔ آپ کو ایک شام اہلِ آسنسول کے نام بھی وقف کرنی ہے تاکہ یہاں کے اصحابِ فکر آپ کے بیش قیمت تجربات و مشاہدات سے فیض یاب ہو سکیں۔

مخلص۔

مشتاق اعظمی، آسنسول

مکرمی، آداب!

آپ نے میرا مضمون "دیوانِ غالب بخطِ غالب۔ رُودادِ اشاعت" شائع فرمایا تھا۔ مشکور گزار ہوں۔ اب ایک کرم اور کیجئے۔ میرا یہ خط شائع فرمایئے، ممنون ہوں گا۔

میں نے یہ لکھا تھا کہ مرحوم محمد طفیل (مدیر "نقوش") نے میری اور بیگم طفیل کی موجودگی میں جناب محترم ڈاکٹر نثار احمد فاروقی صاحب کو انیس ۱۹ ہزار روپئے دیئے تھے۔ اس کی تفصیل اس طرح تھی:

پانچ ہزار فاروقی صاحب کے لئے، چھ ہزار توفیق احمد کے لئے اور آٹھ ہزار محترم مالک رام صاحب کے لئے۔

فاروقی صاحب انکار کرتے ہیں کہ انھوں نے یہ رقم مرحوم طفیل صاحب سے نہیں لی۔ فاروقی صاحب کو چاہئے کہ وہ بیگم طفیل سے اس کی تردید کروائیں۔ اگر بیگم طفیل نے اس کی تردید کر دی تو میں برصغیر کے ہر اس شخص سے جو اُردو بولتا، پڑھتا اور لکھتا ہے، دست بستہ معافی مانگ لوں گا۔

بیگم طفیل کو یکم جنوری سنہ ۱۹۹۱ء کو میں نے بتایا کہ طفیل مرحوم نے جو رقم آپ کی موجودگی میں فاروقی صاحب کو دی تھی، اس سے وہ انکار کرتے ہیں۔ بیگم صاحبہ نے بتایا کہ "دو روز قبل مرحوم نے بیس ہزار روپے لا کر دیئے تھے اور کہا تھا کہ اس میں سے انیس ہزار فاروقی کو دینے ہیں۔ میری اور آپ کی موجودگی میں یہ رقم مرحوم نے فاروقی کو دی تھی۔ اب وہ مجھے جھوٹا کہہ رہا ہے، میرے مرحوم شوہر کو جھوٹا کہہ رہا ہے، آپ کو جھوٹا کہہ رہا ہے۔ میرے مرحوم شوہر نے فاروقی کی اُس وقت مالی مدد کی جب وہ پڑھتا تھا۔ اسے شرم نہیں آتی جھوٹ بولتے ہوئے۔ وہ خود جھوٹا ہے۔"

یہ گفتگو جس وقت ہوئی، طفیل مرحوم کی تین پوتیاں بھی موجود تھیں۔

مخلص

لطیف الزماں خاں

ملتان (پاکستان)

محترمی سرور صاحب، تسلیمات!

آپ ہر طرح سے بعافیت ہوں گے۔ آپ کی دُعا سے یہاں بھی سب لوگ بخیریت ہیں اور خیر و عافیت کے طالب۔

اچھے دنگے فساد اور ہنگامے ہوئے۔ کاروبار سبھی کے چوپٹ ہو کر رہ گئے ہیں۔ اگر آج سروے کیا جائے تو وہ مذہب اور دھرم کے ٹھیکیدار یہی کہتے ہوئے پائے جائیں گے کہ یہ سب کچھ سیاست اور کرسیوں کا چکر ہے۔ آپ تو شہر میں بیٹھے ہوئے ہیں، میں دیہات میں رہتا ہوں۔ مجھے خوب اچھی طرح سے معلوم ہے کہ چھوٹے چھوٹے بچوں اور نوعمر لڑکوں کے ذہن اور دماغ میں کس درجہ نفرت اور فرقہ پرستی کا زہر گھول دیا گیا ہے۔ جب ملائم سنگھ یادو جی کا پارہ شباب پر تھا اور وہ جب قائدِ مسلم بنے ہوئے تھے، اُس وقت نوجوان مسلمان بُری طرح سے بھٹکا اور اب یہ عالم ہے کہ مسلمانوں کے ہر چوتھے پانچویں گھر میں دیسی پستول اور نہ جانے کیا کیا موجود ہے۔ جب یادو جی نے مسلمان کو سبق دیا اور اس کی مظلومیت (حالانکہ اس رُخ سے سوچنا میرے مشرب میں ہمیشہ سے کفر رہا ہے۔ کم از کم میں نے کبھی ایسا محسوس نہیں کیا) پر ٹسوے آنسو بہائے۔ ہمارے پاس ایسے شکایتی خطوط آتے رہتے ہیں کہ مسلمان بم بنا رہا ہے — مسلمان ہتھیار خرید رہا ہے تو ہم کہتے ہیں وہ ضرور بم بنائے، وہ ضرور ہتھیار خریدے۔ اس کا اثر یہ پڑا کہ آج جھونپڑوں اور دیہاتیں مسلمانوں کے ہاں کٹے (یہاں دیسی پستول کو کٹا کہتے ہیں) دھڑا دھڑ آ گئے۔ اگر ان کو سمجھایا گیا یہ کیا کر رہے ہو، یہ بُری بات ہے۔ یادو آج ہیں، کل وہ نہ رہے تب کیا ہوگا۔ کیوں اس کے اشتعال دلانے سے پاگل بن رہے ہو، تو حضور والا ایک بھی نہیں سُنتا تھا اور ایسا محسوس ہوتا تھا یہ مُنہ پر نہ تھوک دے۔ یہاں بھی ایک میلہ پر خطرہ ٹلا ہے۔

بات کچھ بھی نہیں تھی۔ میلہ میں ایک مسلمان لڑکے کے ساتھ ہندو لڑکے کا کوئی ذاتی جھگڑا ہوا اور گاؤں کے پردھان دھرمپال نے اسی وقت اسے ختم کرا دیا۔ وہ اتفاق سے وہاں موجود تھے۔ پھر اس بات کو ہوا دی گئی اور اب بات یہاں جا پہنچی کہ ہندو لڑکی کو چھیڑا گیا ہے۔ مسٹر صمصام خاں نے قرب و جوار کے سنجیدہ اور صاف دماغ ہندوؤں کو بلا کر اُن کے سامنے اس مسئلہ کو پیش کیا اور تمام حالات صحیح اُن سے بتلائے، خدا بھلا کرے اتر و (یہ سابق پردھان ہیں) صاحب کا اُنھوں نے صرف ایک سوال کیا کہ جس کی لڑکی کو چھیڑا گیا ہے وہ پنچایت کے روبرو آکر بیان دے۔ اب سب چپ ——! کیونکہ ایسا ہوا ہی نہیں تھا، لہٰذا یہ خطرہ ٹل گیا۔ دونوں طرف آگ لگانے والے زیادہ ہیں۔ خدا اس ذہن کو بدلے۔

جس اخبار کبھی بھی نظروں سے گزرتا ہے تو وہ اُمر اُجالا سے بھی کہیں زیادہ بکواس کرتا ہے۔ ایسے اخباروں پر کب تک پابندی لگے گی؟ دیہات میں ایسے اخباروں نے نفرت کی آگ بھڑکا رکھی ہے۔

آپ کا قیمتی وقت ضائع کر رہا ہوں —— اور سنائیے کچھ کام قبضہ میں آیا، یا ابھی ڈاک میں گڑبڑی ہے؟... مُضطرب صاحب کام کر رہے ہیں؟ روحی صاحبہ اور اُن سے سلام کہیے... اور کوئی حکم؟

خیر طلب
کریم الاحسانی

قابلِ صد احترام عالیجناب بھائی صاحب
نمسکار!

اُمید کہ مزاجِ گرامی بخیر ہوں گے۔ بعنوان "بچھڑے ہوئے لوگ" ایک کہانی بھیجی تھی۔ شاید مل گئی ہوگی۔

بہت کچھ لکھنے کو جی کرتا ہے مگر سچ بولنے پر سزائے موت ہے۔ بے شمار بے خطاؤں اور معصوموں کا بے رحمی سے مذہب کے نام پر خون بہایا جا رہا ہے گھروں اور دوکانوں کو نذرِ آتش کیا جا رہا ہے۔ وہ مسموم ہوائیں چل رہی ہیں کہ دم گھٹ رہا ہے۔ مگر حکومت حقیقت کو چھپانے میں لگی ہوئی ہے۔ اقتدار کا جنون سیاستدانوں کو پاگل بنائے ہوئے ہے۔ سوال ہندو مسلمان کے خون خرابے کا نہیں ہے، ایک انسان کے دوسرے انسان کے ساتھ ظالمانہ برتاؤ کا ہے۔ ذہنی طور پر بہت پریشان رہتا ہوں۔ چند ذمہ داریوں کی زنجیر بغاوت کے جذبات کو جکڑے ہوئے ہے "گویم مشکل وگرنہ گویم مشکل"

آپ کا چھوٹا بھائی
ارمان بلاری

محترم المقام سردار تونسوی صاحب،
سلام مسنون!

مجھے خود نہیں معلوم کہ میں کس جذبے کے تحت آپ کو یہ عریضہ ارسال کر رہا ہوں اور میں یہ بھی نہیں جانتا کہ آپ عمر کی کس منزل میں ہیں لیکن حضور والا کے نام اور کام سے کسی حد تک آشنا ضرور ہوں۔ یہ "آشنائی" "شانِ ہند" کے توسط سے ہے۔

میں ان دنوں شدید ذہنی اُلجھنوں سے دوچار ہوں۔ طبیعت سخت اُداس رہتی ہے۔ اسی اُداسی میں آپ کی تصنیفِ لطیف "یہ کوئے یار یہ اندازِ محرمانہ گزر" پڑھنی شروع کی۔ ابتدا میں محسوس ہوا کہ ہنسی مذاق کی باتیں ہیں مگر جیسے جیسے آگے بڑھتا گیا، آنکھیں کھلتی گئیں۔ ایک سو تیس صفحات پڑھ کر کتاب فقط اس ڈر سے بند کر دی کہ اگر ابھی ختم کر دوں گا تو اپنی جان پر ظلم کروں گا۔ بخدا میری اُداسی کافور ہو گئی۔ اتنی اچھی اور شگفتہ تحریر پڑھ کر دل باغ باغ ہو گیا۔ یہ کتاب تو عبرت کا ایسا مرقع ہے کہ "گلستانِ سعدی" کی یاد تازہ ہو جاتی ہے۔ اس بیش بہا تصنیف پر میری جانب سے مبارکباد قبول فرمائیں۔ خدائے بزرگ و برتر آپ کو خوش و خرم اور تندرست رکھے۔

آپ کی تحریروں کا مداح
ظفر کمالی

محبِ مکرم، تسلیم!

آپ کا ۸ ستمبر کا کرم نامہ کل ملا۔

اس زحمت و عنایت کے لئے شکریہ ادا کرتا ہوں ——

کیا میں، کیا میرا امکان اور کیا میرا سایہ، آپ مجھے شرمندہ کرتے ہیں۔

میں "تحقیق کی تاریخ" کا کام ہاتھ میں لئے ہوں۔ لیکن کام کی رفتار بہت سست ہے۔ دائم المریض اہلیہ کے لئے روزانہ ڈاکٹروں کے چکر لگانے ہوتے ہیں۔ یونیورسٹی لائبریری فاصلے پر ہے۔ عمر بڑھ چکی ہے۔ سوچا ہے کہ جو تھوڑا بہت وقت ملے اُسے کتاب کی تیاری میں لگاؤں مضمون لکھنے میں نہ گنواؤں۔

رام لعل صاحب آپ کا ذکرِ خیر کرتے رہتے ہیں۔

اُمید ہے آپ کا مزاج بخیر ہوگا۔

مخلص
گیان چند

جنابِ والا شان سردار تونسوی صاحب
آداب و تسلیمات!

بہت دن ہوئے۔ آپ کا نوازش نامہ موصول ہوا تھا۔ لگاتار مسلسل ہڑتال اور غنڈہ گردی نے ناک میں دم کر رکھا تھا۔ ہم لوگ کئی دنوں تک باہر کی دنیا سے کٹ گئے تھے۔ ایسا معلوم دیتا تھا کہ ملک میں کوئی سرکار نہیں۔ قاعدہ قانون کو بالائے طاق رکھ کر عام جنتا کا جینا دوبھر ہو گیا تھا۔ اب ذرا راحت ملی ہے حضرت فراق نے خوب کہا تھا ؎

ایک عمر کے غور و فکر سے بس یہ حقیقت جانی ہے
علم و دانش سے بڑھ کر ایک بچے کی نادانی ہے

شانِ ہند کے شمارے مل رہے ہیں۔

عزیزی مہر چند لال کا مضمون بہت عجیب ہے۔ میری ناقص رائے میں ان کو اپنے مضامین جن میں روداد مشاعرہ اور شاعر لوگوں کے دلچسپ

واقعاتِ زندگی ہوں، کتابی شکل میں شائع کرنے جائیں۔

آپ کا عزیز بھائی
دتارام شباب

محترم سرورؔ صاحب۔ تسلیم!

مُلکی حالات کچھ سرپھرے لوگوں کی وجہ سے اتنے وحشتناک ہوگئے ہیں کہ نئے سال، جیسے بقرعید، یا ہولی اور دیوالی کی مُبارکباد دیتے ہوئے بھی اب وحشت سی ہوتی ہے۔ خدا ان لوگوں کو حقیقت سمجھنے کی توفیق دے ___ لکھنؤ کے حالات بالعموم ٹھیک ہی رہتے ہیں۔ یہاں کرفیو کی ابھی تک کچھ زیادہ اہمیت نہیں ہے۔ پچھلے دنوں کچھ علاقوں میں کرفیو کے نام پر کرفیو کم اور احتیاطیں زیادہ تھیں۔ اس وقت بھی عام زندگی معمول پہ ہے۔

آپ کافی دنوں سے لکھنؤ نہیں آئے۔ اُردُو اکادمی یو۔پی کے نئے سکریٹری چندا صاحب سے آپ کی مُلاقات نہیں ہوئی ہوگی۔ مَیں اُن سے دوبار مِلا ہوں۔ میرے ذاتی تاثرات کے علاوہ یہاں اَدبی حلقوں میں عام تاثر یہی ہے کہ اتنا معقول، فرض شناس، حُسنِ اخلاق و مروّت کا پیکر سکریٹری اُردُو اکادمی کو پہلے نصیب نہیں ہُوا۔

چندا صاحب کو ابھی تھوڑا ہی وقت ہُوا ہے کہ اکادمی کے اندرونی معاملات سدھارنے کے لئے وہ جس طرح اقدامات کر رہے ہیں، اُنکے خاطر خواہ نتائج برآمد ہو رہے ہیں اور اُن کی خوش انتظامی کا عام طور پہ اعتراف کیا جارہا ہے۔ آپ لکھنؤ آنے پر اُن سے مِل کر یقیناً خوش ہوں گے۔ شانِ ہند میں اُن کے بارے میں ایک مُستقل اداریہ لکھا جاسکتا ہے۔ اُن کا طریقۂ کار دُوسری اکادمیوں کے لئے نمونہ بن سکتا ہے۔

اب آپ لکھنؤ آجائیے۔

مناسب سمجھیں تو قیام میرے ساتھ فرمائیں۔

ڈاکٹر منظر رضی

(لکھنؤ)

آدرنیہ تونسوی بھائی صاحب،

محبتیں بصد احترام

آپ کے خط کا شکریہ۔ یہاں بھی یہی حال ہے۔ ایک تو صحت کی غارتگری کے ہاتھوں بڑا نالاں ہوں۔ ایک نومشق شاعر کی غزل کی طرح مصرعہ مصرعہ بے ربط و بے جوڑ ہو رہا ہے۔ کوئی نہ کوئی بیماری چپکے سے اپنا کام کرتی رہتی ہے۔ آجکل ساری عمر کی رفاقت کا دم بھرنے والے دانت بے وفائی پر اُتر آئے ہیں۔ سردی بھی وجہ ہوسکتی ہے۔ میری پوری کوشش ہے کہ یہ جلدی شہادت کا رُتبہ نہ پائیں۔ آگے جو منظور ہو۔

پنجاب کی حالت دن بدن خراب ہوتی جارہی ہے۔ اجل کا مذاق اُڑانے والے پنجابی آج خود ہی خاک و خون ہورہے ہیں۔ چاروں طرف اُداسی، بے رونقی، بے بسی، خون آشام جبر اور مشکبی فضائیں ہیں۔ آخر اس آشفتہ سری کا کیا علاج ہوگا؟ ۔ آپ نے ٹھیک فیصلہ کیا۔ کہیں نہ جائیں۔

آدر سہت۔

آپکا بھائی
اندرپرتاپ نیئر
لدھیانہ

ماہنامہ شانِ ہند

جلد ۵۲ شمارہ ۲

چیف ایڈیٹر
سرور تونسوی

جوائنٹ ایڈیٹر
مطرب صحرائی

اشاعت کا ۵۲ واں سال

پرنٹر، پبلشر، پروپرائٹر: وِدّیا پرکاش سَرور تونسوی
طباعت: خواجہ پریس، جامع مسجد دہلی۔ مقامِ اشاعت: دفتر ماہنامہ "شانِ ہند" فلیٹ ۵ انصاری مارکیٹ، دریا گنج، نئی دہلی ۱۱۰۰۰۲۔

اِس شمارے کی اہم جھلکیاں

جو فرقہ وارانہ فسادات مُلک بھر میں ہوئے، اُن کو کچھ ہندی اخبارات نے ایسی ہَوا دی کہ زرد صحافت بھی اپنا مُنہ کالا کر کے رہ گئی۔ — بلبل چہ گُفت — اِداریہ

فارسی زبان سیکھنے کا شوق پیدا ہُوا تو چالیس میل کا سفر پیدل طے کر کے نکودر حاضر ہوئے اور رہنمائی کیلئے درخواست کی۔ "حدائق البلاغت" کا نسخہ لے کر پیدل ہی واپس گئے۔
— "میرے خواجہ تاش" — ساحر ہوشیارپوری۔

لیجئے اب ہم اپنے ہی اشعار سے اصلاح و توجیہ پیش کرتے ہیں۔
— "حُسنِ اصلاح" — زاہد علامی۔

آل انڈیا مُشاعرہ (آنکھوں دیکھا کانوں سُنا)
پٹھان کی بیٹی، سادھو۔ (کہانیاں)۔

حقیر آسانی، دیوانہ رو ہنگی، دلیپ بادل، بسمل نقشبندی کی غزلیں۔ ماہیا (دیپک قمر) تجزیہ (یوگیندر بہل تشنہ کی نظم)
"یہ کوئے یار"، باب انتقاد، مَن کہ مکتوب الیہ
— تحقیقی کالم — بدستور

ہندو پرست ہُوں نہ مسلماں پرست ہُوں
دامن پرست ہُوں نہ گریباں پرست ہُوں
ہر ذرّۂ وطن سے ہے فیّاض مجھ کو پیار
یعنی وطن پرست ہُوں، اِنساں پرست ہُوں
فیّاض گوالیاری

قیمت فی شمارہ — پانچ روپے
قیمت سالانہ — پچاس روپے
لائف ممبری — پانچ سو روپے

ممالکِ غیر میں:۔
بذریعۂ سمندری ڈاک — ۱۰۰/- روپے
بذریعۂ ہوائی ڈاک — ۳۰۰/- روپے

غزل

ڈاکٹر حقیر آستانی مرحوم



متاعِ زندگانی ہے مذاقِ زندگانی ہے
بشر کی داستاں ہر دم نئی ہر دم پُرانی ہے

نئے قصّے، نئے چرچے، نئے پہلو، نئی قدریں
اُسی کو وقت کہتے ہیں کہ جس کی حکمرانی ہے

سُرودِ حال سے ہے منسلک شاموں کی رعنائی
یہ حشمت اور یہ شوکت وگرنہ آنی جانی ہے

خدا کا فضل ہے سب پر، نگہباں ہے خدا سب کا
بہر صورت مگر تقدیر خود اپنی بنانی ہے

حقیر آستانی اب اِدھر کم آتے جاتے ہیں
بھلے کچھ بھی کہو اُن پر یہ رحمت آسمانی ہے

علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کا مثالی کردار

علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے کچھ طلباء نے مولانا ابوالکلام آزاد کی شان میں گستاخی کی تھی اور یہ کلنک اس یونیورسٹی کے مسلم طلباء کے ماتھے پر ایسا لگا کہ دھلنے میں نہیں آ رہا تھا۔ بھلا ہو پروفیسر فاروقی صاحب کا کہ۔۔۔۔

بابری مسجد اور رام جنم بھومی کے سلسلے میں ماہ اکتوبر سنہ ۹۰ء اور اس کے بعد جو فرقہ وارانہ فسادات ہمارے ہاں ملک بھر میں ہوئے، ان کو کچھ ہندی اخبارات نے ایسی ہوا دی کہ زرد صحافت بھی اپنا منہ کالا کر کے رہ گئی۔ ان اخبارات نے مسلم یونیورسٹی علی گڑھ سے متعلق جو غلط بیانی کی اور جھوٹے الزامات لگا کر اس قابلِ ذکر یونیورسٹی کو بدنام کرنے کی مذموم کوشش کی، اس پہ ہزار ہا نفرین بھی کم ہیں۔ حالانکہ حقیقت یہ ہے کہ ان فرقہ وارانہ فسادات میں علی گڑھ مسلم یونیورسٹی نے جو قومی اور سیکولر قسم کی خدمات انجام دی ہیں، ان کی جس قدر بھی تعریف کی جائے کم ہے۔ یار لوگوں نے تو ہزار کوششیں کیں کہ

حکومت یونیورسٹی کے ہوسٹلوں کو خالی کرنے کا حکم دے، تاکہ طلبا اپنے اپنے گھروں کو جاتے ہوئے آسانی سے راستے میں قتل کیے جاسکیں مگر وائس چانسلر نے اس مطالبہ کی ڈٹ کر مخالفت کی اور کسی مجبوری میں طلباء کو ہوسٹل خالی کرنے کے احکامات جاری نہیں کیے۔

اس یونیورسٹی میں ہمیشہ غیر مسلم طلباء اور اساتذہ کی خاصی تعداد رہی ہے اور اب بھی ہے مگر کیا مجال کہ فرقہ وارانہ فسادات کی اس ہول ناک رَو میں کسی ایک بھی غیر مسلم کو یونیورسٹی کے احاطہ میں کوئی گزند پہنچی ہو، جبکہ یونیورسٹی کیمپس کے باہر مسلمانوں پر حملے ہوئے۔

ہم پروفیسر ایم۔ این۔ فاروقی وائس چانسلر علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے شکر گزار ہیں کہ انھوں نے اس نازک موقعہ پر یونیورسٹی کو ایک خاص سیکولرزم کا مثالی ادارہ بنائے رکھا۔ اور انہوں نے بنارس ہندو یونیورسٹی کے طلباء اور اساتذہ کو اپنی یونیورسٹی میں مدعو کر کے جو مذاکرات کرائے، وہ بڑے مفید اور دُور رس نتائج کے حامل ثابت ہوئے۔

ملک بھر کے اساتذۂ کرام کو چاہیئے کہ وہ پروفیسر فاروقی کے نقشِ قدم پر چلتے ہوئے اپنے اداروں کو سیکولرازم کی راہ پر گامزن رکھیں کیونکہ طلباء پر اپنے ماں باپ کے ساتھ ساتھ اپنے اساتذہ کے کردار کا بھی بڑا اثر پڑتا ہے۔ اس لئے ہر اُستاد کا یہ ایمان ہونا چاہیے کہ وہ دل کی گہرائیوں سے اپنے آپ کو سیکولرازم کا اچھا نمونہ بنائے تاکہ اس کے تحت تعلیم حاصل کرنے والے طلباء بھی اپنے اُستاد کے کردار کو اپنائیں۔

آزادی سے پہلے علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے کچھ طلباء نے مولانا ابوالکلام آزاد کی شان میں گستاخی کی تھی۔ اور یہ کلنک اس یونیورسٹی کے مسلم طلباء کے ماتھے پر ایسا لگا کہ دُھلنے میں نہیں آرہا تھا۔ بھلا ہو پروفیسر فاروقی صاحب کا کہ جن کے عہدِ وائس چانسلری میں علی گڑھ یونیورسٹی کے طلباء نے فرقہ وارانہ فسادات کی زد میں ہونے کی بجائے سیکولرازم کا دامن تھاما اور بلا تخصیص مذہب و ملت یونیورسٹی کے ہسپتال میں مریضوں کو خون دے کر ان کی زندگیاں بچائیں۔

چاہیئے تو یہ تھا کہ سارے ملک کے اخبارات و رسائل، ہمارے ذرائع ابلاغ اور ہمارے سیکولر لیڈران کرام ایک زبان ہو کر علی گڑھ یونیورسٹی کے طلباء، اساتذہ اور وائس چانسلر کی ان مساعیٔ جمیلہ کی تعریف کرتے مگر اس کا کیا کیا جائے کہ ہمارے دُور درشن اور ریڈیو نے یونیورسٹی کے اس اعلیٰ کردار کو اُجاگر کرنے کی بجائے فرضی اور من گھڑت کہانیوں کو اور بھی تشہیر دی۔ اور یونیورسٹی کو بدنام کرنے کی کوشش کی۔

ہماری نحیف آواز مسلم یونیورسٹی علی گڑھ کے ساتھ ہوئی بے انصافی کا ازالہ تو نہیں کر سکتی، مگر ہمیں دلی خوشی ہے کہ یونیورسٹی میں تعلیم حاصل کرنے والے ہمارے بچوں، یونیورسٹی کے اساتذہ اور وائس چانسلر نے جو کردار نبھایا ہے' وہ جہاں انسانیت، شرافت، قومی یکجہتی کا جیتا جاگتا نمونہ تھا، وہاں اُن بیتے دِنوں میں ایسی جنبش پیدا کرنے کا موجب ہوا جس سے انسانیت اور شرافت کی قدر پہچانی جانے لگی ہے۔

ضروری اطلاع جوابِ طلب اُمور کے لئے جوابی پوسٹ کارڈ یا لفافہ ضرور بھجوائیے، ورنہ تعمیلِ حکم سے معذوری سمجھئے۔ (مینجر)

حسرت موہانی کی یاد میں

آل انڈیا مُشاعِرہ

عرفان زیدی بدایونی

آج مارچ کی ۱۲ تاریخ اور سنیچر کا دن ہے۔ کنوینر مشاعرہ کمیٹی مسلم ہوسٹل یونیورسٹی آف الٰہ آباد کی طرف سے جاری کردہ دعوت نامہ سے مجھے بھی نوازا گیا ہے۔ میرا عارضی قیام ہوٹل سمیرا کے کمرہ نمبر ۱۰۵ میں ہے۔ یہ ہوٹل الٰہ آباد ریلوے اسٹیشن سے چند فرلانگ کی دُوری پر واقع ہے۔ اس وقت شب کے ۸ بجے ہیں۔ یہاں سے مسلم ہوسٹل کا فاصلہ تقریباً ۴ کلومیٹر ہے اس لیے مشاعرہ گاہ میں بروقت پہنچنے کی تیاری کر رہا ہوں۔ ریلوے اسٹیشن کے برج سے اُتر کر مدن موہن مالویہ مارگ الیفنٹ پارک کا پتا بتا کر رکشہ کیا ہے اور مشاعرہ گاہ میں پہنچ گیا ہوں۔ اسلام احمد انصاری صاحب (ایڈوکیٹ) کے صاحبزادے سے وعدہ تھا کہ ½ ۸ بجے تک میں پنڈال میں ضرور پہنچ جاؤں گا۔ داخلہ بذریعہ پاس ہے۔ عوام کا ہجوم غفیر مشاعرہ گاہ کے گیٹ پر اندر پہنچنے کے لیے بیتاب ہے لیکن طلباء کے نمائندے گیٹ پر بڑی سختی سے احکام کی پابندی کر رہے ہیں۔ صرف ان لوگوں کو ہی اندر جانے کی اجازت دی جا رہی ہے جو اپنے ساتھ پاس لائے ہیں۔ ہوسٹل کی عمارت دُلہن کی طرح سجائی گئی ہے زرق برق لباس میں ملبوس طُلباء و طالبات اپنے مہمانوں کے استقبال میں مصروف ہیں۔ سردی کی شدت اور شبنم افشانی سے بچنے کے لیے قناتوں اور شامیانوں کا انتظام ہے۔ اسٹیج اتنا کشادہ بنایا گیا ہے جس پر تمام شعراء کے بیٹھنے کے بعد بھی جگہ باقی ہے۔ سامنے ایک بورڈ لگایا گیا ہے جس پر فراقؔ گورکھپوری کا قول درج ہے :

"اُردو کا حق چاہیے بھیک نہیں"

مُشاعرہ کا انعقاد بیادِ مولانا حسرتؔ موہانی کیا گیا ہے۔ اس وقت شب کے ۱۰ بجے ہیں۔ مولانا حسرتؔ سے متعلق مختصر نثری تقاریر کے بعد آغازِ مُشاعرہ کا باقاعدہ اعلان ہُوا ہے۔ صدارت کے لیے علی سردار جعفری صاحب کا نام پیش کیا گیا ہے اور نظامت کے لیے انور جلال پوری کا۔ جعفری صاحب تحریک و تائید کے بعد سلیٹی رنگ کے سوٹ میں ملبُوس سفید رنگ کے ریشمی مفلر کو گلے میں زیب تن کیے مائک پر تشریف لائے ہیں اور مختصر تقریر کر رہے ہیں :

"مجھے بڑی مسرت ہے کہ میں برسوں کے بعد الٰہ آباد مُشاعرے میں شرکت کے لیے آیا ہوں۔ میں ۱۹۳۹ء میں جب لکھنؤ میں طالب علم تھا، اُس زمانہ میں یہاں اکثر آتا تھا۔ یہ زمانہ وہ تھا جب یہاں کے مُشاعروں میں جگرؔ، جوشؔ اور فراقؔ شرکت کرتے تھے۔ افسوس آج یہ تینوں ہستیاں دارِ فانی سے کوچ کر چکی ہیں۔ مجھے مسرت ہے کہ آپ نے آج کے مُشاعرہ کو حسرتؔ کے نام سے منسوب کر کے ایک بہت بڑا انقلابی قدم اُٹھایا ہے۔

حسرت کا شمار عظیم انقلابی شخصیتوں میں ہونا چاہیئے تھا جو بد قسمتی سے نہیں ہوا۔ حسرت کی آواز بغاوت اور انقلاب کی پہلی آواز تھی۔ ایم۔ او کالج کے مشاعرے میں ایک شوخ شعر پڑھنے پر ان کا پرنسپل سے جھگڑا ہوا تھا جس پر انھوں نے پرنسپل کو بتایا تھا کہ اخلاقیات کے دو معیار ہوتے ہیں۔ ایک آپ کا معیار اور دوسرا ہمارا۔ یعنی ایک سامراجی اور ایک ہندوستانی۔ حسرت نے انقلاب کی آواز کانگریس کے انقلابی پروگرام سے ۹ سال پہلے ہی بلند کر دی تھی۔ حسرت نے جس وقت جیل کاٹی وہ ۱۹۴۰ء کی جیلوں سے مختلف تھی۔ حسرت کو ۲۰ سیر گیہوں روزانہ پیسنا پڑتا تھا۔ ہاتھوں میں چھالے پڑ گئے تھے۔ جب ہندوستان میں کمیونسٹ پارٹی کا وجود بھی نہیں تھا اس وقت انھوں نے کمیونزم کا نعرہ دیا تھا۔ آخر عمر تک افلاس میں زندگی گزار دی مگر حرفِ شکوہ لب پر نہ آیا اور خوشدلی کیساتھ جیل کی صعوبتوں میں اس طرح کے اشعار کہتے رہے ؎

ہے مشقِ سخن جاری چکی کی مشقت بھی
اک طرفہ تماشہ ہے حسرت کی طبیعت بھی

انھوں نے آخر میں کہا :

"میرے لیے ذاتی صدمے کی بات یہ ہے کہ حضرت فراق گورکھپوری ہمارے درمیان سے اٹھ گئے۔ حضرت جوش کا غم ابھی ہم بھلا بھی نہیں پائے تھے کہ تازہ غم اور اٹھانا پڑا۔ اردو کی بزم سونی ہو گئی ہے لیکن فراق کی آواز زندہ ہے ؎

بارہا بار زمانہ ادھر سے گزرا ہے
نئی نئی سی ہے کچھ تیری رہگذر پھر بھی"

جناب جعفری صادقی تقریر کے بعد تمام آداب کو بالائے طاق رکھتے ہوئے مستی کے عالم میں اسٹیج پر رکھے گئے گاؤ تکیے پر اس طرح پیر پسار کر دراز ہو گئے گویا اپنی آرام گاہ میں محوِ خواب ہوں۔ اسٹیج پر موجود شعراء اس کوشش میں ہیں کہ جعفری صاحب کی نگاہ سے اوجھل نہ ہونے پائیں۔ اس لیے وہ زیادہ سے زیادہ قریب ہونے کی کوشش کر رہے ہیں۔

لیجیے مائک سنبھال لیا ہے جناب انور جلالپوری نے۔ چہرے پر سیاہ داڑھی ہے، وہ سفید کرتہ، پائجامہ اور کتھئی رنگ کی جواہر جیکٹ زیب تن کیے آنکھوں پر چشمہ لگائے اعلان کر رہے ہیں کہ اب باقاعدہ مشاعرہ کا آغاز کیا جاتا ہے۔

ریسرچ اسکالر جناب اسلم الہ آبادی کو دعوتِ سخن دی ہے۔ جناب اسلم گرم سوٹ زیب تن کیے گلے میں سرخ رنگ کی ٹائی لگائے بایاں ہاتھ پینٹ کی جیب میں ڈالے بڑے وقار کے ساتھ مائک کے سامنے آ کر کھڑے ہو گئے ہیں۔ ترنم سے غزل شروع کی ہے ؎

سرخیِ رنگِ حنا ان کی اتر جائے گی
جب مرے حادثۂ دل کی خبر جائے گی

مطلع پر مناسب داد ملی ہے اور وہ آگے بڑھ رہے ہیں ؎

کوئی تو پہنچے گا منزل کے قریں اے لوگو!
میں نہ جاؤں گا مری گردِ سفر جائے گی

اِدھر اسلم صاحب اپنی جگہ پر واپس آئے ہیں، اُدھر اناؤنسر کی آواز ابھری ہے کہ اسلم صاحب کی غزل میں ان کی عمر جھلک رہی تھی۔ اکثر شعراء غزل میں اپنے تجربات بیان کرتے ہیں اور کچھ ان واقعات کو جو اپنے والد سے سُن رکھتے ہیں۔

اعلان ہو رہا ہے کہ اب آپ جناب نذیر بنارسی کے شاگردِ رشید جناب ثاقب بنارسی سے ان کا کلام سماعت فرمائیے۔ ثاقب صاحب سفید سوٹ میں ملبوس کتھئی رنگ کی خوشنما جرسی زیب تن کیے بکھری زلفوں کے ساتھ مائک کے سامنے آ کر کھڑے ہوئے ہیں اور ترنم سے غزل شروع کی ہے ؎

ہر عقدۂ مشکل تو آسان کیا میں نے
دیکھوں ترے گیسو میں اب رہ گئے خم کتنے

ایک صاحبزادہ نے آوازہ کسا :

"میاں پریشانی ہو رہی ہو تو کنگھی لاؤں۔"

اس پر ایک زوردار قہقہہ بلند ہوا ہے اور جناب ثاقب ان تمام باتوں سے بے نیاز پڑھ رہے ہیں ؎

وہ صاحبِ ایماں ہوں میں عشق کی دنیا میں
میرے لیے بکھرے ہیں گیسوئے صنم کتنے

مشاعرہ میں خاموشی کا ماحول دیکھ کر جناب انور جلالپوری نے استدعا کی ہے کہ آپ لوگ مشاعرہ کا ماحول بنائیے، داد دیجیے تاکہ شعراء کی حوصلہ افزائی ہو۔ طالبات کی طرف سے آواز بلند ہوئی ہے کہ آپ کوئی عمدہ غزل سنوائیے، ہم داد دینے کو حاضر ہیں۔ جناب انور جلالپوری نے شعراء کی فہرست سامعین کو بتائی۔ اس میں جناب زبیر رضوی کے نام کا اعلان کیا۔ اس پر میں چونک پڑا۔ اسٹیج پر جو شعراء حضرات بیٹھے ہیں میں ان سے بخوبی واقف ہوں۔ میں نے اسٹیج تو اسٹیج پنڈال میں بھی زبیر صاحب کو نہیں دیکھا۔ ایک طائرانہ نظر ڈال ہی رہا تھا کہ انتظامیہ کمیٹی کے رکن نے اناؤنسر کو بتایا کہ زبیر رضوی صاحب تشریف نہیں لائے ہیں، زبیر مرزا صاحب کے نام کا اعلان کیجیے۔ اناؤنسر نے غلطی پر معذرت کے ساتھ زبیر مرزا صاحب کے نام کا اعلان کیا۔ لیجیے اناؤنسر نے اب اعلان کیا ہے کہ جمالیات اور تہذیب کا امتزاج دیکھنے کے لیے جناب حسن فتح پوری سے ان کا کلام سماعت فرمائیے۔ حسن فتح پوری ہلکے پیازی رنگ کا سوٹ زیب تن کیے، گلے میں ٹائی لگائے کمر کے پیچھے ہاتھ باندھے مائک کے سامنے آ گئے ہیں۔

تحت اللفظ ایک قطعہ پڑھا ہے ؎

چند گزرے ہوئے لمحوں کی کہانی مانگے
عشق ہر حال میں اشکوں کی روانی مانگے
زندگی تجھ سے خوشی مانگ رہا ہوں ایسے

جس طرح ریت سے پیاسا کوئی پانی مانگے

غزل بھی سن لیجئے ؎

یہ نہ دیکھ پائیں گے مفلسوں کی مجبوری
اہلِ زر کی آنکھوں میں پتلیاں نہیں ہوتیں

مشاعرے میں اب گرمی آتی جا رہی ہے۔ آہ و واہ کی آوازیں بلند ہونے لگی ہیں ؎

جب کوئی مقابل ہو یہ خیال بھی رکھیئے
دشمنوں کے ہاتھوں میں چوڑیاں نہیں ہوتیں
وقت کی شکایت تو بس وہ لوگ کرتے ہیں
نبضِ وقت پر جن کی انگلیاں نہیں ہوتیں

حسن فتح پوری کے بعد اعلان ہوا ہے کہ جناب عرفان جلالپوری سے ان کا کلام سماعت فرمایئے جو اچھی آواز کے مالک ہیں۔

تعارف کے سلسلے میں آواز کے جادو کی بات کہنا غالباً شاعر کی شخصیت اور فن کی خصوصیت میں داخل ہو گیا ہے۔ لیجئے عرفان صاحب مائک کے سامنے آ گئے ہیں۔ کالی شیروانی گلے میں مفلر سر پر گرم ٹوپی۔ اس لباس کیساتھ تحت اللفظ میں ارشاد کیا ہے ؎

آج اپنی عدالت سے انصاف نہیں ملتا
مظلوم ہے سولی پر ظالم ہے تماشائی

آواز بلند ہوئی ہے کہ ہائی کورٹ کے ضلع میں بیٹھ کر یہ بات کہنا مناسب نہیں ہے یہاں تو صبح سے شام تک انصاف تقسیم ہوتا ہے۔

پانی میں اترنے کی ہمت جو نہیں رکھتے
وہ ناپنے آئے ہیں دریا تری گہرائی

جناب عرفان جلالپوری غزل سنا کر اپنی جگہ واپس جا رہے ہیں۔ اناؤنسر کی آواز ابھری ہے' فرما رہے ہیں کہ ایک پریشان حال پینٹر تصویر بنانے کی دھن میں کاندھے پر جھولا لٹکائے چلا جا رہا تھا۔ اتفاقاً اس کے قریب سے ایک شاعر گزرا۔ شاعر صاحب کو دیکھ کر پینٹر اس کے قدموں پر گر گیا۔ شاعر صاحب اس صورتِ حال سے گھبرا گئے اور پینٹر سے معلوم کیا:

"بھائی کیا بات ہے' تم اتنے پریشان کیوں ہو؟"

اُس نے ادب سے گزارش کی کہ میں ایک مدت سے جناب کی تصویر بنانے کی فکر میں ہوں لیکن جناب کا جو حلیہ بتایا گیا تھا اس سے مشابہ کوئی شخصیت نہیں پڑتی تھی۔ آج آپ نظر آ گئے ہیں تو اتنا کرم کیجئے کہ چند منٹ مجھے دے دیں تاکہ میں آپ کی تصویر بنا لوں۔

اس کے اختتام پر صفِ سامعین سے ایک زوردار قہقہہ بلند ہوا ہے اور اسی کیساتھ اناؤنسر نے جناب عادل لکھنوی کو دعوتِ سخن سرائی دی ہے۔ عادل صاحب کتھئی رنگ کی شیروانی زیبِ تن کیے ہوئے' سر پر اونچی باڑھ کی ٹوپی لگائے' لمبی داڑھی اور دراز گیسوؤں کے ساتھ مائک پر آ گئے ہیں۔ ان کو دیکھتے ہی ایک زبردست قہقہہ پھر بلند ہوا ہے۔ عادل صاحب نے مائک پر آتے ہی فقرہ چست کیا کہ آج کل کی اولاد اپنے باپ کو باپ بتانے میں شرم محسوس کرتی ہے۔ باپ محنت کر کے بیٹے کو اعلیٰ عہدہ پر پہنچاتا ہے جب وہی مزدور باپ بیٹے سے ملاقات کے لئے کوٹھی پر جاتا ہے تو بیٹا پہرے دار سے یہ کہہ کر اُسے نکلوا دیتا ہے کہ یہاں تو ہر شخص یہی کہتا آتا ہے کہ میرا بیٹا ہے اس سے کام کرا لینا کیا مشکل ہے۔ یہی حال ہمارے انور صاحب کا ہے۔ مجھے ان سے کوئی شکایت نہیں ہے۔ اس فقرہ بازی کے ساتھ لیجئے' ان کی مزاحیہ نظم سے بھی آپ لطف اندوز ہوں۔ نظم کا عنوان کوئی نہیں ہے اسے آپ کی صوابدید پر چھوڑ دیا ہے ؎

عجب یا روز زمانے کی ہوا ہے
پہاڑ آئینے کے آگے کھڑا ہے
نہیں میرا یہ سب کا فیصلا ہے
مرا لڑکا ہے اور مجھ سے بڑا ہے

میں کیا سمجھوں نئی نسلوں کی راہی
ہے نہ داڑھی اور نہ مونچھیں صرف سر کے بال ہیں
عورتیں اور پھیل ہیں مرد سب نڈھال ہیں

باپ میرا اپنی نا اہلی کا اندازہ کرے
اُس کا بیٹا ہو گیا شاعر تو دنیا کیا کرے
شاعروں کے کام آئے کچھ بھلا اپنا کرے
آدمی بیکار ہو تو شہر میں چندا کرے

مشاعرہ ہے کہ اس میں زندگی کی اُمنگ ہی پیدا نہیں ہو رہی ہے۔ ہر شاعر سپاٹ طریقے سے آتا ہے غزل پڑھتا ہے اور چلا جاتا ہے۔ لیجئے اب انور جلالپوری خود اپنے نام کا اعلان کر کے مائک پر فرما رہے ہیں کہ اس محفل میں جناب علی سردار جعفری صاحب موجود ہیں اس لئے غزل سنانے کی خواہش پوری کر رہا ہوں۔

نہ جانے کونسی وہ مصلحت کے قیدی تھے
چلا کے تیر جو اپنی کمان چھوڑ گئے

تمام شہر کے بچے یتیم بھی تو نہیں
کھلونے والے جو اپنی دکان چھوڑ گئے

سجائے فرصتیں اپنی پرانے کاغذ پر
عجیب لوگ تھے اک داستان چھوڑ گئے
وہ جس کو پڑھتا نہیں کوئی بولتے سب ہیں
جناب میر بھی کیسی زبان چھوڑ گئے

لیجئے اب اعلان ہوا ہے کہ سرزمینِ بدایوں کے ایک ایسے نوجوان شاعر سے ان کا کلام سماعت فرمائیے جو پڑھتا بھی خوب ہے اور کہتا بھی اچھا ہے' اور وہ ہیں جناب قمر جاوید سہسوانی۔ جناب قمر جاوید میرے عزیز دوست جناب حسین بدایونی کے بھانجے ہیں۔ مسکراتے ہوئے مائک کے قریب آئے ہیں۔ سیاہ کوٹ اور سوئٹر میں ملبوس ہیں۔ بڑے عمدہ ترنم سے غزل شروع کی ہے ؎

ہماری زیست کا کیا ہے رہی رہی نہ رہی
تمہارا حسن رہے' تم رہو' وقار رہے

مشاعرہ میں زندگی کی لہر دوڑ گئی ہے۔ مکرر مکرر کی صدائیں بلند ہو رہی ہیں۔ جناب کیف بھوپالی فرما رہے ہیں ان صاحبزادے کے اگر یہی تیور ہیں تو کچھ کر گزریں گے۔ آگے ارشاد ہوا ہے ؎

خدا کرے کہ تری زندگی کے گلشن میں
خزاں نہ آئے سدا موسمِ بہار رہے

قمر جاوید کے بعد اناؤنسر نے اعلان کیا ہے

اب جدید غزل کے نوجوان شاعر جناب معراج فیض آبادی سے ان کا کلام سماعت فرمائیے۔ معراج صاحب پتلون اور سفید کرتہ زیب تن کیے گلے میں کتھئی رنگ کی چادر ڈالے مائک کے قریب آگئے ہیں۔ طلباء نے ان کے حلیہ سے لطف اندوز ہونے کے لئے طرح طرح کے جملے استعمال کرنا شروع کر دیئے ہیں۔ معراج صاحب فرما رہے ہیں سمجھ میں نہیں آتا کہ مائیں اپنے بچوں کو کھو کا کیوں چھوڑ دیتی ہیں۔ اسی افراتفری کے ماحول میں معراج صاحب ترنم سے غزل سُنا رہے ہیں ؎

اور کیا دے گا یہ رشتوں کا تھکا ہارا نظام
گھر سے ہم صرف بزرگوں کی دُعا لائے ہیں

معراج صاحب کی غزل سے مُشاعرے میں جان سی پڑ گئی ہے۔ لوگ محسوس کر رہے ہیں کہ معراج صاحب نے آج کی زندگی کا کرب اپنے اشعار میں سمیٹ لیا ہے۔ ابھی لوگ معراج صاحب کی غزل کے تاثر میں کھوئے ہوئے تھے کہ اناؤنسر نے اعلان کیا کہ جناب منظر بھوپالی سے ان کا کلام سماعت فرمایئے۔ منظر صاحب گرم سوٹ میں ملبوس مائک کے قریب آئے ہیں اور مُرادآباد کے فسادات کی روشنی میں لکھے گئے اشعار بصورتِ غزل سُنا رہے ہیں ؎

یہ سیاست ہے مرے مُلک کی اربابِ وطن
عید کے دن بھی یہاں قتل ہُوا کرتے ہیں

انقلاب آئے گا، آئے گا، ضرور آئے گا
ہم نہیں کہتے مگر لوگ کہا کرتے ہیں

مُشاعرہ اب گام بہ گام منزلِ کامیابی کی طرف بڑھ رہا ہے۔ لوگ ہمہ تن گوش ہو کر شعراء کے کلام کو سُن رہے ہیں اور ضروری داد سے نواز رہے ہیں۔ اب اعلان ہُوا ہے شاعری حُسن کی ترجمانی ہے، اور حُسن یا تو فطرت میں ہے یا پھر عورت میں۔

ماحول میں جادُو جگانے کے لئے اب محترمہ نسیم نکہت لکھنوی کو زحمتِ غزل سرائی دے رہا ہوں۔ محترمہ نسیم نکہت صاحبہ جو ڈائس پر رونق افروز تھیں، بڑی شانِ بے نیازی کے ساتھ اپنی جگہ سے اُٹھی ہیں۔ کالے پرنٹ میں ساڑی اس پر کوٹ زیب تن کئے ہیں۔ زُلفوں کو شانوں پر لہرانے کے لئے آزاد چھوڑ دیا ہے۔ زندہ دل نوجوان ہمہ تن گوش بنے ان کو دیکھ رہے ہیں۔ کیمرہ مین بھی حرکت میں آگئے ہیں۔ ترنم سے غزل پڑھنے کی کوشش کر رہی ہیں۔ انترہ اُٹھانے میں سانس ساتھ نہیں دے رہی ہے مگر قطعہ پڑھ رہی ہیں ؎

ساز کے ساتھ میں نغمات بدل جاتے ہیں
تم بدلتے ہو تو دن رات بدل جاتے ہیں
بے وفائی کا زمانے سے کروں کیا شکوہ
وقت کی دھوپ میں حالات بدل جاتے ہیں

غزل کے چند اشعار بھی سُن لیجئے ؎

بھیگی ہوئی آنکھوں سے جو بیزار بہت ہیں
وہ ہنستے ہوئے لوگ بھی بیمار بہت ہیں
اے گردِ سفر پاؤں کے چھالوں سے اُلجھ مت
ہم اہلِ جنوں جو بھی ہوں خوددار بہت ہیں
غم ہائے زمانہ، غمِ دل اور غمِ جاناں
سُنتی ہوں کہ میرے بھی پرستار بہت ہیں
ہر موڑ پہ مل جاتے ہیں ہمدرد ہزاروں
شاید مری بستی میں اداکار بہت ہیں

محترمہ جو آرزوئیں لے کر تشریف لائی تھیں وہ پوری نہ ہو سکیں اور بہت معمولی داد پا کر جسے مُشاعرے کی داد نہ کہنا ہی بہتر ہوگا، اپنی جگہ تشریف لے آئی ہیں اور اب دعوتِ سخن دی گئی ہے جناب زبیر مرزا صاحب کو۔ زبیر مرزا صاحب گرم سوٹ زیب تن کیے ڈائس پر تشریف لائے ہیں اور بڑے عمدہ ترنم سے غزل شروع کی ہے ؎

ہم کہ خود ہی دیتے ہیں روپ نت نئے اس کو
وقت ہی محافظ ہے، وقت ہی لٹیرا ہے

گرد گرد ہیں شامیں دھوپ دھوپ ہیں صبحیں
آگیا کہاں یارو، کیا یہ گاؤں میرا ہے؟
کوٹھیوں کے پیچھے سے اک صدا اُبھرتی ہے
یہ حسین جہاں بابا تیرا ہے نہ میرا ہے
کس کو معتبر سمجھوں، کس کو اپنا گردانوں
کل جو میرا اپنا تھا، آج تیرا میرا ہے

مُشاعرہ کا ماحول کچھ ایسا اُکھڑا اُکھڑا ہے کہ اس کو کنٹرول کرنا مُشکل ہو رہا ہے۔ وقت زیادہ ہو گیا ہے، سردی کی شدت ہے اور ہر شخص اس موڈ میں ہے کہ اس کا پسندیدہ شاعر جلد بُلایا جائے مُشاعرہ کے بگڑتے ماحول کو دیکھ کر تقدیم و تاخیر کی دیواریں توڑ کر جناب کیف بھوپالی کو زحمتِ سخن دی جا رہی ہے۔ تعارف کراتے ہوئے جناب انور جلال پوری فرما رہے ہیں کہ جب مشاعرہ کا رنگ بگڑ جاتا ہے تو اس کو سنبھالنے اور دلوں پر بارشِ کیف کرنے کے لئے حضرتِ کیف بھوپالی کو ہی بُلانا پڑتا ہے۔ کیف صاحب جو ڈائس پر میرے قریب بیٹھے تھے، اس جملے پر چراغ پا ہو گئے ہیں۔ مائک کے قریب پہنچ کر فرما رہے ہیں :

"جب تعارف کرانے کی اہلیت نہیں ہے تو تعارف کرانے کی ضرورت کیا ہے۔ آپ کی نظر میں گویا میں مجمع لگانے والا ہوں۔"

ایک سیکنڈ گنگنانے کے بعد لحن داؤدی میں غزل شروع کر دی ؎

زندگی شاید اسی کا نام ہے
دُوریاں، مجبُوریاں، تنہائیاں

داد کا ریلا ہے کہ کم ہونے میں نہیں آ رہا ہے — کئی فوٹو گرافروں نے ایک ساتھ کیمرے میں کیف صاحب کو بند کر لیا ہے۔ مکرر مکرر کی صدائیں بُلند ہو رہی ہیں اور کیف صاحب بڑے والہانہ انداز میں پڑھ رہے ہیں ؎

کیا زمانے میں یونہی کٹتی ہے رات
کروٹیں، بیتابیاں، انگڑائیاں

کیف صاحب نے غزل ختم کی اور تیزی سے اپنی جگہ آنے کے لئے بڑھے کہ ایک اور، ایک اور کی آوازیں بُلند ہوئیں۔ مجبُوراً کیف صاحب کو پھر مائک کے سامنے آنا پڑا۔ فرما رہے ہیں ؎

ہم نہ پیئیں گے بھیک کی ساقی

لے یہ تیرا پیمانہ پڑا ہے

کیف صاحب اپنے لب و لہجہ کے انوکھے پن سے ایک نمایاں حیثیت کے مالک ہیں چنانچہ کامیاب و کامران اپنی جگہ واپس آ گئے ہیں۔ انور جلال پوری نے کیف صاحب کے رنگ کو ہلکا کرنے کے لیے جناب آفتاب لکھنوی کو دعوتِ سخن دی ہے۔ لیکن وہ کیف صاحب کے رنگ کو اُتارنے میں کامیاب نہ ہو سکے۔ ان کا ایک قطعہ آپ بھی سُن لیجیے ؎

سوال یہ ہے بڑھاپے میں اب کہاں جائیں
ہر ایک شخص یہ کہتا ہے بھائی ٹل جاؤ
میں ان کے گھر پہ جو پہنچا تو اُن کی ماں نے کہا
تمھاری عمر زیادہ ہے، تم نکل جاؤ

آفتاب صاحب مناسب داد کے ساتھ اپنی جگہ پر واپس آ گئے ہیں۔ لیجیے اب دعوتِ سخن محترمہ تبسم صدیقی کو دی جا رہی ہے۔ تبسم صاحبہ میرے اور کیف صاحب کے قریب ہی تشریف فرما تھیں۔ پھولدار ساڑی میں ملبوس ہیں۔ مائک کے قریب آ کر فرما رہی ہیں کہ اگر آپ لوگ اجازت دیں تو کچھ سناؤں۔ اس پر ایک آواز بلند ہوئی ہے کہ سناؤ گی نہیں تو کیا شکل دکھانے کے لیے مائک کے سامنے آئی ہو۔ اس جملے کو سُن کر جھنجھلاہٹ میں ایک قطعہ پڑھا ہے ؎

اُداسیوں کا سب اس کی حساب کر دوں گی
ہنسا ہنسا کے میں اس کو گلاب کر دوں گی
وہ دیکھنے کو اگر مل گیا کہیں اب کے
پڑھوں گی اتنا کہ چہرہ کتاب کر دوں گی

زندہ دل طلباء نے بڑا لطف لیا ہے اور کیسے کیسے فقرے چست کیے ہیں جن کا لکھا جانا خلافِ ادب ہے، اب ان کی غزل کے اشعار سے بھی لطف اٹھائیے ؎

اب کے بچھڑوں گی تو کھو جاؤں گی
راستہ روک لے پاگل میرا

ایک صاحبزادے جو میرے قریب ہی بیٹھے ہیں اور انتظامیہ کمیٹی کے ممبر ہونے کی سند بیج کی شکل میں سینے پر لگائے ہوئے فرما رہے ہیں راستہ تو ضرور روک لیتا مگر کیا کروں پولیس افسران ضرورت سے زیادہ ہی یہاں آ گئے ہیں ان کے اس جملے پر تبسم صاحبہ بھی مسکرائے بغیر نہ رہ سکیں اور جواباً فرما رہی ہیں اپنی اپنی ہمت کی بات ہے۔ آگے ارشاد ہوا ہے ؎

کھو گیا کھیلتے بچپن کی طرح
وقت کی بھیڑ میں اک پل میرا

عمدہ غزل، خوبصورت پیرایۂ بیان، حسین اور دلکش ترنم اور اس پر جملوں کی بوچھار نے مشاعرہ میں رنگ لا دیا ہے۔ تبسم صاحبہ غزل پڑھ کر اپنی جگہ واپس آ گئی ہیں اور اناؤنسر نے اعلان کیا ہے کہ اب میں اپنے مشاعرے کے اس شاعر کو دعوت دے رہا ہوں جو نوجوانوں کے دلوں کو اپنی آواز سے مسحور کرتے ہیں۔

ہاف آستین کی بوشرٹ اور سفید پتلون پہنے بکھرے ہوئے بالوں کو جنبش دیتے ہوئے جھومتے جھامتے نور اندوری صاحب مائک کے قریب آئے ہیں اور وہی گھِسی پِٹی غزل شروع کی ہے جو متعدد مشاعروں میں سُنا چکے ہیں۔ صفِ سامعین سے نئی غزل کا مطالبہ زور پکڑ رہا ہے۔ تقاضہ شدید ہوتا جا رہا ہے چنانچہ ایک صاحبزادے کھڑے ہو گئے ہیں اور انھیں کے انداز میں یہ مصرع پڑھا ہے ؎

"تمھاری غزل تو پرانی رہے گی"

مگر وہ نور اندوری ہی کیا جو ایسے احتجاج کا کوئی نوٹس لیں۔ وہ تو جھوم جھوم کے فرما رہے ہیں:

ابھی وقت ہے تو کوئی کام کر لیں
کہاں مدتوں تک جوانی رہے گی
سرِ شام اُس نے بکھیری ہیں زلفیں
سحر تک فضا زعفرانی رہے گی

نور صاحب کو تین شعر پڑھنے کے بعد غزل کو بدلنا پڑا ہے اور اسی ردیف بحر میں دوسری غزل شروع کر دی ہے ؎

کہیں بھی وفا کی نشانی نہیں ہے
یزیدوں کی بستی ہے پانی نہیں ہے

اب ایک ایسی ہستی کو دعوتِ سخن دی جا رہی ہے جسے مشاعروں کو اپنے کلام اور ترنم سے لوٹ لینے کا فن آتا ہے اور یہ ہیں جناب فنا نظامی کانپوری کشمکشی رنگ کی شیروانی، کالی ٹوپی، سفید داڑھی اور آنکھوں پر چشمہ لگائے پوری شاعرانہ سج دھج کے ساتھ مائک پر آئے ہیں اور فرما رہے ہیں کہ علالتِ طبع کے باوجود حسرت موہانی کی یاد میں منعقد ہونے والے اس مشاعرہ کی کشش مجھے یہاں کھینچ لائی ہے۔ یہ مشاعرہ اس ہوسٹل میں ہو رہا ہے جہاں بے ادبی کرنے والوں کو اٹھا کر باہر کر دیا جاتا تھا۔ آج جس ماحول میں یہ مشاعرہ سُنا جا رہا ہے اس سے مجھے تکلیف پہنچ رہی ہے۔ اتنی عظیم ہستی کی یاد میں مشاعرہ اور اتنی بے کیفی کی فضا میں، تعجب کا مقام ہے۔ فنا صاحب کی تقریر سامعین پر اثر کر گئی ہے اور انھوں نے تحت اللفظ غزل سُنا کر خوب خوب داد وصول کی ہے۔ آپ بھی سنیے ؎

ہم بھی اسی چمن کے ہیں گو خار ہی سہی
تھوڑی جگہ گلوں کے برابر ہمیں بھی دو

ہم نے دیا ہے اپنا لہو شاخ شاخ کو
اب آئی ہے بہارِ گلِ تر ہمیں بھی دو

ایسا بھی کیا کہ سیرِ بہاراں تمھیں کرو
تسکیں کے واسطے کوئی منظر ہمیں بھی دو

یارو! دلیر کون ہے پھر ہوگا فیصلہ
جیسا تمھارے پاس ہے خنجر ہمیں بھی دو

جو ٹوٹ کر بھی سیکڑوں شکلیں بنا سکے
ایسے ہی آئینہ کا مقدر ہمیں بھی دو

حقیقت افروز باتیں اور شعری قالب میں ڈھلی ہوئی! جناب فنا نظامی کا کلام بہت پسند کیا گیا ہے۔ وہ "داد" کے شور میں اپنی جگہ واپس آئے ہیں اور اب اعلان ہوا ہے کہ جناب راحت اندوری سے ان کا کلام سماعت فرمائیے راحت صاحب مائک کے قریب آئے ہیں چند اشعار آپ بھی سُن لیجیے ؎

کشتی پہ آنچ آ جائے تو ہاتھ قلم کروا دینا
لاؤ مجھے پتواریں دو میری ذمہ داری ہے

ایک ایک قطرہ تول کے دے گا ایک ایک پیگ لگے گا
اب ساقی فرضوں کا نہیں ہے اب ساقی بیوپاری ہے
پھولوں کی خوشبو لوٹی ہے تتلی کے پر نوچے ہیں
یہ رہزن کا کام نہیں ہے رہبر کی مکاری ہے

ساحت صاحب کے بعد جناب تصور زیدی کو دعوتِ سخن دی گئی ہے۔ تصور صاحب بھی شاعرانہ وقار کے ساتھ مائک کے قریب آئے ہیں۔ سامعین پر ایک طائرانہ نظر ڈالی ہے، شخصیت اور کلام کا اثر رنگ دکھا رہا ہے، فرما رہے ہیں ـــ

بکھر چکی تھی جب آواز تو خیال آیا
کہ خامشی کو بھی جینے کی آرزو ہوگی

آخری بار جہاں ہم نے پکارا تھا تمہیں
اس سے آگے تو خموشی بھی نہیں جاتی ہے

آواز دے کے اپنے ہی در پہ کھڑا تھا میں
خاموشیوں نے چپکے سے اندر بلا لیا

موخرالذکر شعر کے مصرعہ ثانی میں "ذم" کا پہلو تلاش کر کے مصرعِ اولیٰ کے آخری ٹکڑے سے ربط پیدا کیا جا رہا ہے۔ اسٹیج پر سرگوشی کے ساتھ زیرِ لب تبسم کی بہار بھی دیکھنے میں آرہی ہے۔ تصور صاحب داد وصول کر کے واپس گئے ہیں اور ادھر اناؤنسر کی آواز ابھری ہے کہ نظم کو حسن عطا کرنے کا نام ہے وسیم بریلوی۔ لیجئے وسیم صاحب کنٹری سوٹ اور جرسی زیب تن کیے مائک کے قریب آئے ہیں اور اپنے مخصوص ترنم میں غزل سنا رہے ہیں ـــ

اُس نے یوں باندھ دیا خود کو نئے رشتوں میں
جیسے مجھ پر کوئی الزام نہ آنے دے گا

کہیں کہیں سے آہ و واہ کی صدائیں سن کر وسیم صاحب فرما رہے ہیں کہ خاموشی کے لئے شکر گزار ہوں لیکن الہ آباد والی داد تو دیجئے۔ ان دو مصرعوں میں آج کا ہندوستان ملاحظہ ہو ـــ

سب اندھیروں سے کوئی وعدہ کیے بیٹھے ہیں
کون ایسے میں مجھے شمع جلانے دے گا

بھیگی جھیل، کنول، باغ، مہک، سناٹا
یہ مرا گاؤں مجھے شہر نہ جانے دے گا

الہ آباد میں فلم چل رہی تھی "جبر خاتون" جس کے گیت جناب شہریار کے تحریر کردہ ہیں، طلبا میں ایسی تعداد زیادہ تھی جو سمجھ رہی تھی کہ شہریار بھی شکیل اور مجروح کی طرح اچھے ترنم کے مالک ہیں۔ لہٰذا انھوں نے شہریار کے نام کی رٹ لگا رکھی تھی۔ لہٰذا شہریار صاحب کو بلایا گیا۔ انھوں نے مائک کے قریب آکر تحت اللفظ میں "فراق کی نذر" کے عنوان سے چند اشعار سنائے ـــ

بھٹک گیا کہ منزلوں کے وہ سراغ پا گیا
ہمارے واسطے خلا میں راستہ بنا گیا
صراحیِ دل کی آنسوؤں کی اوس سے بھری ہوئی
اسی لئے عذابِ ہجر اس کو راس آگیا

سامعین کے ضبط کا باندھ ٹوٹ گیا اور وہ فلم کے گیت کا مطالبہ کرنے لگے۔ شہریار صاحب نے غزل تحت اللفظ سنانی شروع کی تھی کہ "ترنم سے ہوگی" کا شور بلند ہوا۔ وہ صرف شاعر تھے گویا بننا ان کے بس کی بات نہ تھی۔ ظاہر ہے کہ ان کے لئے اس کے سوا کوئی اور چارہ کار نہ تھا کہ لاحول پڑھتے ہوئے اپنی جائے نشست پر پہنچ جائیں۔ لیجئے اب جناب ضمیم جے پوری تشریف لائے ہیں۔ شیروانی، پاجامہ اور آنکھوں پر ہلکے فریم کا چشمہ لگائے برسوں کے ریاض سے تیار کی ہوئی اپنی مطبوعہ غزل سنا رہے ہیں۔ آج بھی وہ ان کی نظر میں تازہ ہے۔ پرانی غزل کو نئی بتا کر باذوق سامعین کی نذر کر رہے ہیں ـــ

اپنے مٹنے کا غم کچھ نہیں غم یہ ہے
کون اُٹھائے گا یوں تیرے غم زندگی؟
زندگی کے لئے عمر درکار ہے
زندگی کے لئے اتنی کم زندگی!
مرتے مرتے بھی ہم مسکراتے رہے
رکھ لیا ہم نے تیرا بھرم زندگی

ضمیم صاحب اپنے ترنم کی داد پاکر واپس آئے ہیں اور اعلان ہوا ہے کہ لیجئے اب ایسے شاعر کا کلام سماعت فرمائیے جس کی غزلوں میں ہجر و وصال اور نظموں میں گاؤں کی سوندھی مٹی کی خوشبو ملے گی۔ میری مراد ہے جناب نذیر بنارسی سے۔ جناب نذیر بنارسی جو شیروانی اور ٹوپی زیب تن کیے ہوئے ہیں، اپنی جگہ سے قدرے آگے بڑھ کر ڈائس پر بیٹھ گئے ہیں اور سب سے ٹوپی اتار کر مائک نیچے کیے جانے کا مطالبہ کیا ہے۔ پستہ قد ہونے کے باعث کھڑے ہو کر پڑھنا ان کے بس کی بات نہیں تھی۔ اس لئے بیٹھ کر پڑھ رہے ہیں۔ ان کا شعر ملاحظہ فرمائیے ـــ

ہے قدم قدم پہ خطرہ مگر آگے بڑھ رہا ہوں
اسے موت کیسے روکے جسے زندگی بلائے
ذرا دم تو لے لے طوفاں! کہ تھکا ہے راستے کا
میرے دل کے توڑنے میں ترا دم نہ ٹوٹ جائے

جناب نذیر بنارسی مناسب داد وصول کر کے اپنی جگہ واپس آگئے ہیں اور اناؤنسر نے اعلان کیا ہے کہ شاعری مسرت بھی ہے اور شاعری بصیرت بھی۔ ایسی شاعری کے لئے آج کا ناقد جناب معین احسن جذبی کا نام لیتا ہے۔ ـــــــ انھوں نے دو غزلیں سنائی ہیں۔ آپ بھی چند شعر ملاحظہ فرمائیں ـــ

جنوں کی راہ الگ تھی مگر خرد والے
ہر ایک گام پہ ہم کو پکارتے ہی رہے
خبر نہیں انھیں اہلِ جہاں نے کیا بخشا
رہِ طلب میں جو دامن پسارتے ہی رہے
کلی کے ساتھ مری چشم خوں فشاں ہوگی
گلوں کے ساتھ دلِ داغدار بھی ہوگا

جذبی صاحب کے بعد اعلان ہوا ہے کہ ترقی پسند تحریک میں چند دانشور پیدا ہوئے تھے ان میں ایک نام علی سردار جعفری صاحب کا ہے۔ لیجئے اب صدرِ محترم سے ان کا کلام سماعت فرمائیے۔ جعفری صاحب نے مائک کے قریب آکر غزل سنائی ہے ـــ

باعثِ رشک ہے تنہا رویِ رہروِ شوق
ہمسفر کوئی نہیں دوریِ منزل کے سوا
ہم نے دنیا کی ہر اک شے سے اٹھایا دل کو
لیکن اک شوخ کے ہنگامۂ محفل کے سوا

صدرِ مشاعرہ کی اس غزل کے خاتمہ پر اعلان کیا گیا ہے کہ وہ محفلِ شعر و سخن جو بیادِ حسرت موہانی سجائی گئی تھی، اب ختم ہوتی ہے۔ ـــــ

نصف صدی سے
ملک و ملت کی خدمت
میں ایک اہم اور منفرد
حیثیت کا حامل



آپ کی
اور آپ کے کاروبار میں
ترقی کا ضامن

آپکا اپنا بینک

بمبئی مرکنٹائل کوآپریٹو بینک لمیٹڈ

(شیڈولڈ بینک)

جو سماج کے ہر طبقہ کا ساتھی اور مددگار ہے۔ جہاں فارین ایکسچینج سے متعلق سبھی سہولیات دستیاب ہیں۔ جہاں جمع کی گئی رقم پر دوسرے کاروباری بینکوں

سے ایک فیصد زیادہ منافع ملتا ہے

ہمارے کھاتے دار ہی ہمارا سب سے بڑا سرمایہ ہیں۔

عازمین حج کیلئے زر مبادلہ کے خصوصی انتظامات

ہمارے بینک کی اعلیٰ ترین معیاری خدمات کا نمونہ ہیں

ہیڈ آفس
زین رنگون والا بلڈنگ
۷۸ محمد علی روڈ
بمبئی ۴۰۰۰۰۳ مہاراشٹرا

فارین ایکسچینج ڈپارٹمنٹ
۳۶ نیتاجی سبھاش مارگ
دریا گنج نئی دہلی ۱۱۰۰۰۲
فون ۳۲۶۸۲۶۶، ۳۲۶۴۳۷۴،
۳۲۶۶۸۶۹
ٹیلیکس Zain-in ۳۱-۶۶۸۲۳

دہلی آفس
۳۶۵۵ نیتاجی سبھاش مارگ
دریا گنج نئی دہلی ۱۱۰۰۰۲
فون ۳۲۷۱۳۹۵

میرے خواجہ تاش

ساحر ہوشیار پوری

دبستانِ داغ کا ایک اور روشن چراغ بجھ گیا۔ جناب رتن پنڈوروی نے ۴ر نومبر کو پٹھان کوٹ میں داعیٔ اجل کو لبیک کہا۔ ان کی پوری زندگی جستجو، محنت، لگن اور استقلال کی درس آموز داستان ہے۔

۷ر جولائی سنہ ۱۹۰۷ء کو پنڈوری، ضلع گورداسپور میں ان کا جنم ہوا۔ ان کے ذی علم والد پنڈت متھراداس "کھٹ شاستری" کہلاتے تھے اور علاقے بھر میں محترم تھے۔ لیکن فلاکت کا یہ عالم تھا کہ دو وقت کی نانِ جویں بھی میسر نہیں تھی۔ ملارام رتن پنڈوروی نے ایسے ماحول میں جیسے تیسے قریب کے گاؤں سے پانچویں جماعت تک تعلیم حاصل کی۔ ورنیکلر مڈل کا امتحان پاس کیا۔ زیرک اور ذکی تھے۔ لہٰذا مدرسین کی حوصلہ افزائی اور نظرِ عنایت سے جے۔وی کی سند نارمل اسکول، گورداسپور سے حاصل کرکے سنہ ۱۹۲۵ء میں بطور نائب مدرس اسکول میں ملازمت اختیار کرلی۔ اسی دوران میں فارسی زبان سیکھنے کا شوق پیدا ہوا، تو چالیس میل کا سفر پیدل طے کرکے قبلہ جوش ملسیانی کی خدمت میں خود حاضر ہوئے اور رہنمائی کے لئے درخواست کی۔ ان سے "حدائق البلاغت" کا نسخہ لے کر پیدل ہی واپس گئے۔ اس کے بعد قدم قدم پر دشواریوں اور دشواریوں کا مقابلہ کرتے ہوئے ادیب فاضل اور منشی فاضل کے امتحانات پاس کئے۔ عربی کا درس حاصل کیا اور انگریزی میں بھی شُد بُد پیدا کرلی۔

جناب رتن کی شاعری کا آغاز سنہ ۱۹۳۶ء میں ہوا۔ حضرت جوش ملسیانی کی شفقت اور تربیت سے ان کی صلاحیتوں کو ابھرنے اور نکھرنے کا موقع ملا۔ پھر جوش صاحب ہی کی اجازت سے اعتبارُ الملک جناب دل شاہجہانپوری سے بھی مشورۂ سخن کیا۔ اور انھوں نے ابو البلاغت کے خطاب سے نوازا۔ جناب رتن نے جملہ اصنافِ سخن میں طبع آزمائی کی ہے۔ وہ نثر نگاری میں بھی ید طولیٰ رکھتے تھے۔ فنی اور ادبی تحقیق سے بہ طورِ خاص رغبت تھی۔ عروض پر مکمل دسترس تھی۔ علم نجوم کے ماہر تھے۔ علمِ طب سے بھی شغف تھا۔ سنسکرت کے عالم تھے۔ تصوف اور روحانیت میں درک حاصل تھا۔ عبادت اور یادِ الٰہی کے اتنے پابند کہ کبھی سفر میں بھی ناغہ نہیں ہوا۔ گویا ان کی ذات جامع الصفات تھی جس پر دانشوری کی تعریف کا صحیح اطلاق ہو سکتا ہے۔

رتن صاحب کی مطبوعہ تصانیف کی تعداد بہ شمولِ مجموعہ ہائے کلام پینتیس ہے اور ہر تصنیف ان کے تبحرِ علم اور ہنرمندی کا شاہکار ہے۔ لیکن میری نظر میں ان کی چار کتابیں "سِترِ مغفرت" (گیتا کا منظوم ترجمہ)، "ہندی کے مسلمان شعراء"، "تحقیقی مباحث" اور "فنِ تاریخ گوئی" ایسی معرکہ آرا تصانیف ہیں جو رہتی دنیا تک ان کا نام روشن رکھیں گی اور "ثبت است بر جریدۂ

عالمِ دوامِ ما" کی ضامن ہوں گی۔

جنابِ رتن ہمہ دان ہوتے ہوئے بھی خود کو ہیچ مداں کہتے تھے۔ نہ تعلّی، نہ تصنّع، نہ تفاخر گویا عجز و انکسار کا ایک زندہ کردار تھے۔ شاخِ ثمر دار کے مانند سرنگوں اور مؤدب رہنا ان کی نیک سرشتی کا خاصّہ تھا۔ اپنے عزیزوں اور خوردوں سے محبت و مؤدّت کا اظہار ایسے سلیقے سے کرتے تھے کہ اُس میں جذبۂ احترام کا پہلو بھی ملحوظ رہے۔ میں عمر میں اُن سے اندازاً بیس برس چھوٹا ہوں، لیکن انھوں نے اپنے التفات آمیز سلوک سے بزرگی اور خوردی کا یہ دہ کبھی بیچ میں حائل نہیں ہونے دیا۔ اُن کی اعلیٰ ظرفی کے اِس پہلو کی ایک جھلک درجِ ذیل خط میں ملاحظہ کیجئے:۔

پنڈوری
۲۴ مارچ ۱۹۷۹ء

سرمایۂ ایثار و مروّت، قبلہ جناب ساحرؔ صاحب!

آداب نیاز مندانہ و دُعائے فقیرانہ۔

جناب رازؔ لائل پوری صاحب کے خطِ محبت نمط میں جناب کا ذکرِ خیر پڑھ کر پُرانی یادیں تازہ ہوگئیں۔ آپ کا ایک حکم جو بمقام فریدکوٹ صادر ہُوا تھا ہنوز خوزجان ہے۔ صحت بے وفائی کر گئی۔ سیدرد وار کے دَورے اور آشوبِ چشم نے اس ہیچمدان فقیرِ حقیر کو سراپا تقصیر بنا دیا۔ لیکن اس حکم کی تعمیل ضرور ہوگی۔ دیر آید درست آید۔

ایک مقالہ (پنجاب کے اُستاد غزل گو شعرا) خاکسار کے زیرِ بحث ہے۔ اس میں جناب کا ذکرِ خیر شدّ و مد سے کیا جائے گا۔

صحت کی خرابی کے سبب باہر نہیں جا سکا ورنہ ہوشیار پور کے مشاعرے میں جناب کے دیدارِ پُرانوار ضرور نصیب ہوتے۔ احباب کی خدمت میں سلام شوق۔ زیادہ نیاز!

خاک نشیں، رتن پنڈوروی

خرابیٔ صحت اور ضعف کے سبب سری ہرگوبند پور کو چھوڑ کر یہاں اپنے آبائی گاؤں میں آنا پڑا۔"

یہ خط کیا ہے صحیفۂ اخلاص و حلم ہے۔ ایسے بلند خیالات کی حامل شخصیتیں اِس جہانِ فانی سے رُخصت تو ہو جاتی ہیں کہ ہر ذی روح کے لئے مَوت برحق ہے، لیکن اُن کی یاد نہاں خانۂ دِل میں ہمیشہ زندہ و پائندہ رہتی ہے اور اُن کے اخلاقِ حمیدہ کی خوشبو فضائے ارضی کو معطّر و معنبر بنائے رکھتی ہے۔

رہے نام اللہ کا ــــ!



ماہیا

دیپک قمر

موسم کا یہ چکر ہے
چھڑکاؤ ہے بوندوں کا
بس نام کی برکھا ہے

ہو ساتھ تو کیسے ہو
سونے سا بدن میلا
جب ہاتھ لگے سے ہو

اپنا ہے نہ اوروں کا
ناپیں گے نہ تولیں گے
یہ مال ہے چوروں کا

ہر منہ کی صدا باندھی
ہر جھوٹ نے سچ بن کر
کیا خوب ہوا باندھی

پنگھٹ ہے نہ پنہارن
اک ٹیو ہے لوہے کا
سینچے ہے زمیں کا تن

خود اپنی ہوا سے ہے
ہم نے تو یہی سمجھا
جو ہے وہ سدا سے ہے

آکاش زمیں میرے
کس کام کی یہ دنیا
جب تم ہی نہیں میرے

بگڑی ہوئی صورت ہے
دھرتی کی ہوا بدلی
ناساز طبیعت ہے

جب بھور بھئی جاگے
پھر کام سے دفتر کو
پاگل کی طرح بھاگے

الٹی ہو کہ ہو سیدھی
پھیرو کہ نہ تم پھیرو
یہ مالا ہے منکوں کی

کیا رعب جمائے ہے
ہے جیٹھ بڑا پاپی
اک آنکھ نہ بھائے ہے

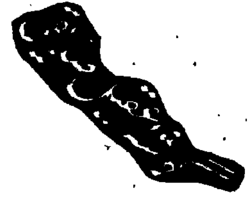
کس سوچ میں ڈوبی ہے
کیا ہوگا کترنی سے
کنجوس کی کترن ہے

دیکھا ہے تو دیکھا کیا
بے حد سے پرے بے حد
آکاش کی سیما کیا

آپس میں سمونا ہے
دونوں کو محبت میں
احساس بھی کھونا ہے

اس میلے سے یوں نکلی
وہ ملنے کو خود آیا
جب بھی وہ ہوئی اکلی

اب بیچ میں اک پل ہے
اک تٹ پہ پیا بیٹھا
اک چھور پہ پاگل ہے



حُسنِ اصلاح

زارؔ علامی

"اصلاح" کے لغوی معنی ہیں: صحت، درُستی، مرمت، ترمیم، تصحیح اور نظرِ ثانی۔ یعنی کسی بھی چیز کو دوبارہ اِس ڈھنگ سے سنوارنا اور سجانا کہ وہ جاذبِ نظر ہو جائے۔

کہتے ہیں اللہ تعالیٰ نے آدم علیہ السّلام کا پُتلا اپنے ہاتھوں سے بنایا اور اُس پُتلے کے خدوخال سنوارنے کے بعد ہی فرشتوں کو حکم دیا کہ وہ اس کو سجدہ کریں۔

جب خداوندِ دوعالم کو اپنے ہاتھوں سے بنائے ہوئے شہ کار پہ نظرِ ثانی کرنا پڑی تو پھر انسان کی (جو مرکبِ خطا و عصیان ہے) اوقات ہی کیا ہے۔

کچھ لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ اُن کی جملہ تخلیقات ہر قسم کے معائب سے پاک و صاف ہیں، اور اُن میں کسی قسم کا جھول نہیں، وہ سراسر خوش فہمی میں مبتلا ہیں۔ البتّہ یہ ضرور ہے کہ جو اصحاب عمیق النظر، پختہ کار اور کہنہ مشق ہیں، اُن کے یہاں غلطی کا امکان بہت کم ہوتا ہے۔

جن حضرات کا تنقیدی شعور بالغ ہوتا ہے وہ اپنی تخلیقات پر گاہے گاہے ناقدانہ نظر ڈالتے رہتے ہیں اور جو اسقام یا خامیاں اُن کو نظر آتی ہیں، اُن کو سنوارنے کی سعی کرتے رہتے ہیں۔ اسی وجہ سے ان لوگوں کے شاہکار مُقابلتاً زیادہ جاذبُ النظر ہو جاتے ہیں۔ بعض اوقات یہ کوشش اس لئے بھی ہوتی ہے کہ اُن کے شاہکار ترقی پاکر خوب سے خوب تر ہو جائیں۔ لیکن یہ سلیقہ ہر فن کار کو میسّر نہیں ہوتا۔ اِس اسلوب میں پختگی لانے کے لئے مطالعہ اور مسلسل ریاض کی ضرورت ہے۔ اگر یہ طریقۂ کار کسی کاملِ فن کی رہنمائی میں ہوتا ہے تو برسوں کی منازل دیکھتے ہی دیکھتے سر ہو جاتی ہیں۔

اس حقیقت پر جملہ فن کاروں کا اتفاق ہے کہ جملہ فنونِ لطیفہ میں شاعری کا رُتبہ سب سے اُونچا ہے۔ یوں تو دوسرے فنون میں بھی باقاعدہ ریاض اور سوجھ بوجھ کی ضرورت ہے مگر شاعری کا تعلق چونکہ خارجی حُسن کے علاوہ باطنی حُسن بھی ہے۔ لہٰذا یہ فن کچھ زیادہ ہی جگر کاوی کا مُتقضی ہے ؎

خوں سے سینچا پڑتا ہے کلامِ رنگیں
مُنہ سے یہ لعل اُگلنا کوئی آسان نہیں
زارؔ علامی

شعر کا ظاہری حُسن تو یہ ہے کہ کلام میزانِ عروض پہ تُلا ہُوا ہو اور بہ اعتبارِ زبان و بیان بالکل صاف سُتھرا ہو۔ سلاست و روانی بدرجۂ اتم موجود ہو۔ ردیف اور قافیہ اپنی جگہ درُست ہوں۔ اور ان کے علاوہ مشاہیر کی عائد کردہ پابندیوں کا پُورا خیال رکھا گیا ہو۔

لیجئے، اب ہم اپنے ہی اشعار مع اصلاح و توجیہہ پیش کرتے ہیں۔

ناموزونیت

رُباعی زارؔ:۔

غم ہی سے ہے شوکت و شانِ حیات
غم ہی کو جانتا ہوں سامانِ حیات
غم ہی کے دامن میں چھپی ہیں خوشیاں
غم ہی سے اصل میں ہے امکانِ حیات

اِصلاح:۔

غم ہی سے فقط ہے شوکت شانِ حیات
غم ہی ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ علیٰ حال
غم ہی ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ علیٰ حال
غم ہی ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ علیٰ حال

توجیہ:۔ اصلاح سے پہلے مصرعۂ اوّلی ناموزوں تھا۔

سلاست و روانی

رُباعی زارؔ

تضحیک سے ہوتی ہے ہمیشہ سُبکی
کِس کام کا وہ کام جو کر دے ہلکی
اے زارؔ شگفتوں لکھنا سلیقہ سیکھو
ہر وقت کی اچھی نہیں ہا ہا ٹھی ٹھی

اِصلاح:۔

تضحیک ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ علیٰ حال
کِس کام ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ علیٰ حال
اے زارؔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ علیٰ حال
ہر وقت کی اچھی نہیں ہی ہی ٹھی ٹھی

توجیہ: محاورہ "ہا ہا ٹھی ٹھی" بھی درست ہے مگر سلاست اور روانی کے پیشِ نظر "ہا ہا" کی جگہ "ہی ہی" رکھا گیا ہے۔ "ہی ہی ٹھی ٹھی" نے جو لطف دیا وہ اہلِ زباں سے پوشیدہ نہیں۔

شعرِ زارؔ:۔

جذبِ اُلفت میں اثر ہے تو وہ دن دُور نہیں
راہ پر آئیں گے کترا کے نکلنے والے

اِصلاح:۔

جذبِ اُلفت میں ہے تاثیر تو انشاءاللہ
راہ پر ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ علیٰ حال

توجیہ: یوں تو پہلا مصرعہ بھی رواں دواں تھا، مگر اس خیال سے کہ کوئی بھی کام اللہ کی مرضی کے بغیر پایۂ تکمیل تک نہیں پہنچتا، ہمیں پہلے مصرعہ کو تبدیل کرنا پڑا۔ اب شعر نسبتاً زیادہ رواں دواں بھی ہو گیا اور معنی میں بھی خاص لُطف پیدا ہو گیا۔ وجہِ اصلاح یہ حقیقت بھی ہوئی کہ "تاثیر" غیر اختیاری ہے، اس لئے انشاءاللہ کہنا بہت ضروری تھا۔

حُسنِ ردیف

شعرِ زارؔ:۔

روشن ہُوا ہے ذہن میں یوں آس کا چراغ
تاریکیوں میں نُور کا دریا بہا دیا

اِصلاح:۔

روشن ہُوا ہے ذہن میں یوں آس کا دیا
تاریکیوں ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ علیٰ حال

توجیہ: جس غزل سے یہ شعر لیا گیا ہے اُس کا مقطع یوں ہے ؎

مہتاب و آفتاب و طلسمات کا 'دیا'
میری نظر نے حُسن کو کیا کیا بنا دیا

یہ غزل بقیدِ ذُو قافیتین و بقیدِ یک قافیہ تخلیق ہوئی ہے۔ شعر کو مطلع بنانے کے لئے یہ اِصلاح لُطف کو دوبالا کر رہی ہے۔ وجہِ اصلاح کا ایک پہلو یہ بھی ہے کہ "چراغ" کے مُقابلہ میں 'دیا' یعنی دیپک کی ہستی نہ ہونے کے برابر ہے اور اس کی روشنی گھپ اندھیروں میں ڈُوبتے کے لئے ایک تنکے کی شان اہم ہوتی ہے۔ یعنی ضرورت کے وقت ایک بے حقیقت چیز بھی بہت بڑا کام کر جاتی ہے۔ ایک پہلو اور ــــ "آس" ہندی لفظ ہے اور "چراغ" فارسی۔ "کا" حرفِ اضافت۔ "آس کا چراغ" دُرست ہوتے ہوئے بھی ذوقِ سلیم پر بار معلوم ہوتا تھا۔ اسی لئے "آس کا دیا" بنایا گیا ہے۔

سادگی

شعرِ زارؔ:۔

عِشق کی راہ میں اے زارؔ سنبھل کر چلنا
مُنہ کی کھاتے ہیں یہاں دوڑ کے چلنے والے

اِصلاح:۔

راہِ اُلفت میں ذرا دیکھ کے چلنا اے زارؔ
مُنہ کے بَل کب نہ گرے دَوڑ کے چلنے والے

توجیہ:۔ ظاہرداری میں شعر میں کسی قسم کی کوئی کمی نہ تھی لیکن غور کرنے پر کئی کمزوریاں نظر آئیں۔

۱۔ سنبھل کر چلنا ۔۔ گرنے سے بچ کر چلنا۔ "گرنا" فعل اختیاری بھی ہے اور غیر اختیاری بھی۔

مُنہ کی کھانا ۔۔ مُنہ پر چوٹ کھانا

"مُنہ پر چوٹ کھانے" کے کئی اسباب ہو سکتے ہیں جن میں سے ایک سبب "اوندھے مُنہ گِرنا" بھی ہو سکتا ہے۔

فعل غیر اختیاری کی صُورت میں سنبھلنے کی تلقین کرنا بے معنی ہو جاتا ہے۔ اسی طرح جب مُنہ پر چوٹ کے اسباب اور بھی ہو سکتے ہیں تو دوڑ کر چلنے والوں کے ساتھ یہ ٹکڑا۔۔ بے معنی ہو کر رہ جاتا ہے۔

اب اصلاح سے شعر میں کسی قسم کا اُلجھاؤ نہیں رہا۔ "دیکھ کر چلنا" یعنی رستے کی ناہمواری اور اینٹ پتھر کا خیال رکھنا تاکہ ٹھوکر نہ لگ جائے اور ٹھوکر کھا کر اوندھے مُنہ نہ گر جاؤ۔

مُنہ کے بَل گرنے میں مُنہ کی کھانے کا پہلو بھی مُضمر ہے۔ دوڑ کر چلنے والے کسی وقت بھی ٹھوکر کھا کر اوندھے مُنہ گر سکتے ہیں۔ یہی وجہِ اِصلاح ہے۔ محاورے کے استعمال میں بھی کوئی فرق نہیں پڑا۔

تخیّل میں آمیزشِ جذبات

تخیّلِ عوام اور تخیّلِ شاعر میں اگر کوئی فرق ہے تو صرف یہی کہ شاعر اپنی بات میں جذبات کی چاشنی بھی بھر دیتا ہے اور اسی چاشنی

کے سبب ایک معمولی اور بے رُوح خیال میں بھی زندگی سی آجاتی ہے۔ اور اسی زندگی کو "تڑپ" کا نام دیا جا سکتا ہے۔

شعرِ زارؔ ؎

اب ہُوا افزوں ہمارا اضطرابِ آرزو
لذّتِ غم بڑھ گئی چوٹیں اُبھر جانے کے بعد

اصلاح:-

اب ہُوا دل پر ہمارے سوزِ پنہاں کا اثر
لذّتِ غم بڑھ گئی چوٹیں اُبھر جانے کے بعد

توجیہ: شعر دو لخت ہو کر رہ گیا تھا۔ چوٹیں اُبھرنے کا سبب بھی مفقود تھا۔ بعدِ اصلاح شعر میں کسی قسم کا اُلجھاؤ نہیں رہا۔ "سوزِ پنہاں" کے اثر سے چوٹیں اُبھریں اور چوٹیں اُبھرنے سے لذّتِ غم بڑھی۔ یہ افزونیٔ لذّتِ غم ایک عجیب کیفیت کی حامل ہو گئی۔

زبان و بیاں (سُقُوطِ الف)

اساتذۂ کرام نے ہندی اور اُردو کے الفاظ میں حرفِ علت 'ا' ساقط کرنا جائز قرار دیا ہے۔ مگر کچھ مقامات ایسے آتے ہیں جہاں ہندی اور اُردو کے الفاظ میں بھی یہ سُقُوط ذوقِ سلیم کو اچھا نہیں لگتا۔

رُباعیِ زارؔ ؎

عاقل ہے تو ہرگز نہ ہو محبوسِ قفس
آزاد نہیں ہوتے گرفتارِ ہوس
جن لوگوں کی طلب کا دامن ہے دراز
وہ جنت بھی پا کر نہیں کہتے "بس"

اصلاحؔ:-

عاقل ... علیٰ حال
آزاد ... علیٰ حال
جن لوگوں ... علیٰ حال
وہ جنت بھی پا کے نہیں کہتے "بس"

توجیہ: اصلاح سے پہلے چوتھا مصرعہ اس وزن پر تھا: "مفعولُ فاعلن مفاعی لن فع" زباعی کا یہ وزن تو درست ہے مگر "فاعلن" بنانے کے لئے "میں پا کر" کو "میں پا کر" بنانا پڑتا ہے۔ یعنی "پا" کا الف ساقط کرنا پڑتا ہے۔ اسی لئے اِصلاحی مصرعہ میں "کر" کی جگہ "کے" بنایا گیا ہے۔ اب مصرعہ کا وزن یہ ہو گیا:

مفعولُ مفعول مفاعی لن فع

نُدرتِ مضمون

بلندیٔ تخیل، معنی آفرینی، اور نُدرتِ مضمون شعر کے باطنی حُسن سے متعلق ہے۔ اگر ظاہری حُسن میں باطنی حُسن بھی شامل ہو جائے تو شاہکار کی دل کشی میں دو چند اثر آجاتا ہے۔

رُباعیِ زارؔ ؎

کیا پوچھتے ہو بادۂ احمر کا کمال
ہر شے سے فزوں ہے اس شے کا جلال
اس آگ کو پی کر کبھی دیکھو تو سہی
اس آگ سے جل جاتے ہیں اندوہ و ملال

اِصلاح:-

کیا پوچھتے ------ علیٰ حال
خورشید سے افزوں ہے اس شے کا جلال
اس آگ .... علیٰ حال
اس آگ ...... علیٰ حال

توجیہ: ہر شے میں جلال نہیں ہوتا ــــ "خورشید" آگ بھی ہے اور اس کا جلال اپنی جگہ مُسلّم بھی ہے۔ خورشید اور شراب میں مناسبت بھی ہے۔ اصلاح سے مضمونِ رباعی میں نُدرت آگئی۔

شعرِ زارؔ:-

ہماری زندگی سازِ شکستہ
ہماری داستاں کیا داستاں ہے

اِصلاح:-

ہماری زندگی ہے کورا کاغذ
ہماری ... علیٰ حال

توجیہ: شکستہ میں ہائے مختفی ہے۔ ترکیبی صُورت میں اس کا سُقوط لازم ہے۔ یہاں الف کی صُورت بن گئی۔ یعنی "سازِ شکستا" "شکستا" فعولن کے وزن پر آیا ہے جبکہ اس کو "فعول" کے وزن پر آنا چاہئے۔ "ساز" کا "داستان" سے تعلق قائم کرنا دُور کی بات ہے۔ "کورا کاغذ" کہہ کر صحیح مناسبت قائم کرنے کے علاوہ معنی میں خوبصورتی لانے کی کوشش کی گئی ہے۔

رُباعیِ زارؔ ؎

سرچشمۂ انوار بنے پھرتے ہیں
شائستۂ اسرار بنے پھرتے ہیں
اسلوبِ نگارش سے جو بے بہرہ ہیں
آئینۂ افکار بنے پھرتے ہیں

اصلاح:-

سرچشمۂ ...... علیٰ حال
شائستۂ ...... علیٰ حال
معلوم نہیں ابجدِ فن بھی جن کو
آئینۂ افکار بنے پھرتے ہیں

توجیہ: کئی کمزوریوں اور مضمون کو ترقی دینے کے پیشِ نظر تیسرا مصرعہ بدلنا ضروری تھا۔

۱۔ رُباعی بقید ذو قافیتین کہی گئی۔ ردیف "بنے پھرتے ہیں" تیسرے مصرعہ میں "بے بہرہ ہیں" میں تقابلِ ردیفین جڑ دی۔

۲۔ "اسلوبِ نگارش" نہ جاننے والا فن سے واقف ہو سکتا ہے مگر عمل نہ ہونے اور مشق نہ ہونے کے سبب فنکار نہیں ہو سکتا۔ لیکن جو شخص فن سے واقف ہی نہیں، وہ عامل ہو ہی نہیں سکتا، اس لئے کہ عمل کے لئے علم کا ہونا ضروری ہے۔

۳۔ رُباعی کے ۱، ۲، ۴، تینوں مصرعے صنعتِ ذو قافیتین میں تخلیق ہوئے ہیں۔ اور ردیف "بنے پھرتے ہیں" ہے۔ ردیف میں بناوٹ کا پہلو صاف طور پر ظاہر ہے۔ اس بناوٹ کا تقاضا ہے کہ تیسرے مصرعے میں "ہی" یا "بھی" مزید آئے۔ لہٰذا مصرعہ یوں تبدیل کیا جا سکتا تھا: "اسلوبِ نگارش سے جو واقف ہی نہیں" لیکن یہاں بھی وہی مندرجہ بالا "عامل" ہونے کی بات آڑے آتی ہے۔ نیز "ہی" کے مقابلہ میں "بھی" زیادہ اہم معنی کا حامل ہے۔ اصلاح کے بعد اب رُباعی کی شان کچھ اور ہی ہو گئی۔

معنی آفرینی

شعرِ زائر ؎

تمام جلوے ہی ڈھل جائیں گے حقیقت میں
نظر کو حُسن کی آئینہ دار ہونے دے

اِصلاح:-

مجاز آپ ہی ڈھل جائے گا حقیقت میں
نظر کو . . . . . . علیٰ حال

توجیہ:

جلوے آخر جلوے ہیں، لہٰذا اُن کا حقیقت میں ڈھلنا بے معنی سی بات ہے۔ مجاز کا حقیقت میں ڈھلنا اپنے دامن میں نہایت حَسین معنی سمیٹے ہوئے ہے۔

پروازِ تخیل و معنی آفرینی

شعرِ زائر ؎

اب نہ مُنہ کھولے گا یہ بھول کے رِندوں کے خلاف
آج یوں شیخ کا مُنہ بند کیا ہے ہم نے

اِصلاح:

زہر اُگلے گا نہ اب بھُول کے رِندوں کے خلاف
جام سے شیخ کا مُنہ کیل دیا ہے ہم نے

توجیہ:-

"مُنہ کھولنا" اور "مُنہ بند کرنا" دونوں محاوروں میں تضاد ضرور ہے مگر شعر سپاٹ سا ہو کر رہ گیا ہے۔ "یوں" یعنی "اس طرح" کی کوئی فصاحت نہیں۔ مصرعۂ اوّل میں "یہ" محض بھرتی ہے۔

مُنہ کھولنا . . . . دہن کُشادن یا باز کردن کا ترجمہ ہے۔

زہر اُگلنا . . . مُنہ سے زہر ڈالنا۔ بُرا بھلا کہنا۔

زاہد رِندوں کے حق میں کسی موذی سے کم نہیں اور مُوذی کی فطرت ہی زہر اُگلنا ہے۔ "مُنہ کیلنا" "مُنہ بند کرنا" کے مقابلہ یقیناً بہتر ہے۔ اور جام سے شیخ کا مُنہ کیلنا تو ایک چلتا ہوا جادو ہے۔ ایک دقیق پہلو اور۔ صوتی اعتبار سے "صہبا" اُن الفاظ میں سے ہے کہ اس کی ادائیگی کے اختتام پر لب بند ہو جاتے ہیں۔ اسے "سے" کیل دینے کا جواز اس سے بہتر ممکن نہ تھا۔

شعرِ زائر ؎

عجیب چال چلے اب کی بار دیوانے
ہوا میں اُڑ گئے ہو کر غبار دیوانے

اِصلاح:-

غضب کی چال چلے اب کی بار دیوانے
ہوا میں . . . . علیٰ حال

توجیہ:-

"عجیب چال چلے" سے صرف فریب دینا کے معنی ہی برآمد ہوتے ہیں، جبکہ "غضب کی چال چلنا" میں تیزیٔ رفتار کا پہلو بھی مضمر ہے اور یہ "دیوانوں کا غبار بن کے اُڑنا" کیلئے ایک مناسب وجہِ جواز بھی ہے۔

"غضب" کی تبدیلی کا باعث یہ بھی ہے کہ غضب میں استعجاب کے ساتھ جوش بھی ہے اور فرزانگی کی وہ علامت بھی ہے جس کا احساس دیوانے کو تو نہیں ہوتا، البتہ خرد مندوں کے لئے لمحۂ فکریہ ضرور فراہم ہو جاتا ہے۔

شعرِ زائر ؎

پیری آئی تو بعنوانِ شباب آئی ہے
ناتوانی میں عجب جوشِ توانائی ہے

اِصلاح:-

پیری . . . . علیٰ حال
ناتوانی میں نیا جوشِ توانائی ہے

توجیہ:-

"ہر کہ آمد عمارتِ نَو ساخت"۔ یہی خیال وجہِ اِصلاح ہے اور اسی تبدیلی سے یقیناً معنی کا حُسن دو بالا ہو گیا۔

صوتی اعتبار سے "نا" اور "نیا" قریب المخرج ہونے کے علاوہ حُسن کو مزید نکھار اس لئے بنا رہے ہیں کہ دونوں میں سبب اور وتد کا اختلاف پایا جاتا ہے۔ —— ——

پٹھان کی بیٹی

پریم کمار جوہر

رینک اینڈ کمپنی کے ری سیپشن (Reception) کاؤنٹر کے سامنے ایک لمبا تڑنگا پٹھان نمودار ہوا اور بولا "مجھے شام کمار صاحب سے ملنا ہے"

کاؤنٹر پر بیٹھی ری سیپشنسٹ (Receptionist) مینا مہرہ پٹھان کو دیکھتے ہی گھبرا گئی۔ اس کے ذہن میں بجلی کی تیزی سے وہ بات آئی جو کہ اس نے کچھ لوگوں کی بابت سن رکھی تھی کہ وہ لوگ پٹھانوں سے روپیہ اُدھار لیتے ہیں اور بصورت عدم ادائیگی پٹھان اپنے قرضداروں کا پیچھا اپنے ہاتھ میں چھرا لے کر کرتے ہیں۔ کیا مسٹر شام کمار نے بھی اس پٹھان سے روپیہ قرض پر لے رکھا ہے؟

مینا نے قدرے کانپتے ہوئے ہاتھوں سے پٹھان کو کرسی پر بیٹھ جانے کا اشارہ کیا۔ اُسے ڈر تھا کہ پٹھان اس کی بات نہیں مانے گا مگر پٹھان نے پھرتی سے کرسی پر جا بیٹھا اور اس کی نظریں مینا کے معصوم چہرے پر اٹک گئیں۔

اتنے میں کسی نے شام کمار کو پٹھان کی آمد کی خبر کر دی۔ شام کمار دوڑا دوڑا پٹھان تک پہنچا اور اس کے چہرے کو غور سے دیکھنے لگا۔

"السلام علیکم! مجھے پہچانا؟" پٹھان نے کرسی سے اٹھتے ہوئے کہا۔

"نہ"

"او میں منصور خان ہوں! تمہارا دوست! تمہیں یاد ہے برادر؟" کتنے سال پہلے میں تمہیں جہانگیر نمو پیلس کے قریب ملا تھا۔ جب میری بچی بیمار تھی......"

"اوہ منصور خان!" یہ کہتے ہوئے شام کمار نے گرمجوشی سے پٹھان کا خیر مقدم کیا اور دونوں ایک دوسرے سے بغلگیر ہو گئے۔

مینا مہرہ اور دفتر کے لوگ حیرانی سے یہ منظر دیکھ رہے تھے۔

شام کمار پٹھان کو اپنے کمرے میں لے گیا۔

آج سے قریباً سولہ برس پہلے کی وہ شام شاہ فلم ڈسٹری بیوٹرز کے دفتر میں چھٹی ہو جانے کے بعد شام کمار جہانگیر نمو پیلس کی گلیوں میں گزرتا ہوا بس اسٹینڈ کی جانب جا رہا تھا کہ اسے ایک پٹھان نے روکا۔

"برادر! میں خیرات نہیں مانگتا۔ مگر تم سے امداد مانگتا ہوں۔ میری بچی سخت بیمار ہے میری دودھ پیتی معصوم بچی مر رہی ہے، مگر اس کے علاج کے لئے روپیہ درکار ہے۔ میں اپنے یار، دوستوں کے پاس بھی گیا مگر بدقسمتی سے کوئی بھی نہیں ملا اور میں ادھر آن نکلا کہ خدا کا کوئی تو بندہ میری مدد کرے گا۔

"مگر میرے پاس تو مشکل سے ایک روپیہ ہے، اور مجھے بس کا ٹکٹ بھی لینا ہے۔"

"خدا قسم! میں نے تم سے پہلے تو کسی

کا ہاتھ پکڑا تو اُنھوں نے بھی ایسا ہی جواب دیا۔ "مَیں تمہیں خدا کا واسطہ دیتا ہوں کہ میری بچّی کے واسطے کچھ کرو..." اُس کی آواز میں بڑا درد تھا۔

شام کمار نے پٹھان کی آنکھوں میں دیکھا جن میں التجا ٹپک رہی تھی اور کہا "اچھا تو مَیں اتنا کر سکتا ہوں۔ مَیں ایک ڈاکٹر کو جانتا ہوں۔ ڈاکٹر روہتگی۔ اُدھر کمار سینما کے سامنے دکان ہے۔ تم اپنی بچّی کو لے آؤ تو اُسے ڈاکٹر صاحب کو دکھا دیتا ہوں۔"

پٹھان کی جان میں جان آئی۔ تُرکمان گیٹ جامع مسجد کے نزدیک واقع کسی گلی سے اپنی بیوی اور بچّی کو رکشا میں بٹھا کر لانا تھا۔ مگر اُس کے پاس رکشا کے لئے بھی پیسے نہ تھے۔ چنانچہ شام کمار نے ایک واقف کار پنواڑی سے دو روپے ادھار لے کر پٹھان کو دئیے اور وہ شام کمار کو دُعائیں دیتا ہوا جامع مسجد کی جانب چل پڑا، یہ کہتا ہوا "اِنشاء اللہ، مَیں پندرہ بیس منٹ میں لوٹ آؤں گا۔ تم یہیں میرا انتظار کرنا۔ خدا کے واسطے!"

شام کمار قریباً پون گھنٹہ تک گلی کی نکڑ پر انتظار میں کھڑا رہا۔ اِس دَوران اُس نے دیوار پر لگے ہوئے تمام پوسٹر پڑھ ڈالے اور ایک چائے والے سے چائے بھی پی، لیکن پٹھان کہیں نظر نہ آ رہا تھا۔

مگر شام کمار کو پٹھان رکشا میں سوار نظر آیا۔ اسکے ساتھ ایک عورت برقعہ پہنے اور ہاتھوں میں ننھا بچہ لئے بیٹھی تھی۔ بچے کے جسم کے گرد کمبل جیسی چیز لپٹی ہوئی تھی۔

بچّی کا بے حِس و حرکت جسم پہلی بار تب تھوڑا سا ہلا اور اُس کے مُنہ سے دَبی ہوئی چیخ نکلی جبکہ ڈاکٹر روہتگی نے اُسے ایک انجکشن لگایا۔ پھر ڈاکٹر صاحب نے دوائی کی چار پڑیا دیتے ہوئے چار چار گھنٹے کے بعد ایک پڑیا پانی میں گھول کر بچّی کو پلانے کی ہدایت دی۔ ڈاکٹر نے اپنے رجسٹر میں بچّی کا نام 'رُخسانہ' درج کیا اور اس کے باپ کا نام منصور خان۔

پٹھان اور اُس کی بیوی ڈاکٹر کو بے شمار دُعائیں دیتے ہوئے ڈاکٹر کے کلینک سے باہر نکل گئے۔ شام کمار نے دبی آواز میں ڈاکٹر سے کہا۔

"ڈاکٹر صاحب آپ بچّی کا مکمّل علاج کر دیں۔ جب تک کہ یہ تندرست نہ ہو جائے۔ مَیں آپ کا بِل پہلی تاریخ کو چکا دوں گا۔"

"بِل کی فکر نہیں مگر..." ڈاکٹر نے کچھ دَبی آواز میں شام کمار کے کان میں کہا "بچّی کی حالت بہت نازک ہے۔ میرے خیال میں اُس کا بچنا محال ہے۔ صرف بھگوان ہی بچا سکتا ہے اسے۔ مَیں نے بہترین علاج دے دیا ہے۔ بچّی کو ڈبل نمونیہ ہُوا ہے۔ دونوں پھیپھڑوں میں سُوجن آ چکی ہے۔ سانس اکھڑ چکی ہے۔ اب آگے ان ماں باپ کی تقدیر..."

پٹھان اور اُسکی بیوی بچّی کو لئے رکشا میں سوار ہوئے تو شام کمار نے اُن سے کہا "کل صبح یہیں آ جانا۔ بچّی کو لے کر دس بجے۔ ڈاکٹر صاحب کو دکھا دیں گے۔"

منصور خان نے "ہاں" میں سر ہلایا — رکشا آگے بڑھ گئی۔

شام کمار نے بس اسٹینڈ کی راہ لی۔

بس میں سفر کرتے وقت بھی ڈاکٹر کے الفاظ اُس کے کانوں میں گونج رہے تھے۔ "بچّی کو ڈبل نمونیہ ہُوا ہے۔ اُس کا بچنا محال ہے — آگے ان ماں باپ کی تقدیر..."

پھر یہ خیال آتے ہی کہ اگر واقعی بچّی چل بسی تو کل روز وہ پٹھان اور اُس کی بیوی کو کس حالت میں دیکھے گا۔ اس کا جسم کانپ اُٹھا۔

اُس رات وہ اسی فکر کے باعث وہ دیر تک سو نہ سکا۔ کافی رات گئے اُس کی آنکھ لگی تو شام کمار نے خواب میں دیکھا کہ کچھ مسلمان لوگ ایک بچّے کی لاش اُٹھائے ہوئے اُسے دفنانے کے لئے جا رہے تھے۔

اگلی صبح شام کمار پونے دس بجے ہی گلی کے نکڑ پر کھڑا منصور خان کی راہ دیکھ رہا تھا۔ اُس کا دِل دھک دھک کر رہا تھا۔ "وہ بچّی زندہ تو نہ ہوگی؟ مر ہی گئی ہوگی۔ اتنی ننھی سی جان اور ڈبل نمونیہ۔ مگر آجکل بڑی کارگر دوائیں بھی تو دستیاب ہیں۔ ڈاکٹر نے کہا تھا نا، کہ بہترین دوا دے دی ہے۔"

شام کمار اِنھیں پریشان خیالات کے تانے بانے میں اُلجھا تھا کہ اُس کی نظر سامنے سے آنیوالی ایک رکشا پر پڑی۔ جس میں منصور خان رکشا میں سوار تھا۔ شام کمار کا دِل اندر سے ہِل گیا۔ "تو بچّی واقعی چل بسی!"

منصور خان رکشا سے چھلانگ لگا کر اُترا اور شام کمار سے گلے ملتے ہوئے بولا۔

"اللہ کا فضل اور تیری مہربانی۔ بچّی کی حالت بہت بہتر ہے۔ اس کا بخار بھی کم ہو گیا ہے۔ اور سانس بھی سہولیت سے لے رہی ہے۔ مَیں بچّی اور اس کی والدہ کو ڈاکٹر کی دُکان پر بیٹھا آیا ہُوں۔"

منصور خان کی بیوی بُرقعہ پہنے اور اپنی بچّی کو گود میں لئے ڈاکٹر کی دوکان پر مریضوں کے بینچ (Bench) پر بیٹھی تھی۔ شام کمار نے اُس کے قریب جا کر بچّی کو ایک نظر دیکھنا چاہا۔ ماں نے بچّی کو اپنے ہاتھوں میں ذرا اونچا اُٹھایا۔ پھر اپنے چہرے سے ذرا سا بُرقعہ سرکا کر ایک آنکھ سے شام کمار کے چہرے کو دیکھا۔ اور چشمِ نم سے اُس کا شکریہ ادا کیا۔ شام کمار کو لگا کہ جیسے اُس عورت کی رُوح اُس کی آنکھ میں اُتر آئی تھی۔ شام کمار بیتاب ہو اُٹھا، لالی سے بھری ہوئی سوجی ہوئی آنکھ دیکھ کر، جو طالبِ مرادت بھر رو رہی تھی۔ مگر جس میں اب شکریہ کا ایک آنسو موتی کی طرح چمک رہا تھا۔ ایک ہفتہ تک علاج معالجہ کے بعد بچّی مکمّل طور پر شفایاب ہو گئی۔

شام کمار اور منصور خان دوست بن چکے تھے۔ منصور خان شام کو اکثر شام کمار کے دفتر کے قریب اس کا انتظار کرتا۔ اور دفتر سے چھٹی ہوتے ہی شام کمار اُسے آن ملتا۔ پھر دونوں گھومتے پھرتے

لال قلعہ کے قریب وسیع میدان میں، جامع مسجد کے گرد و نواح میں، یا پھر چاندنی چوک۔ کبھی کبھی دریا گنج کی جانب بھی نکل جاتے۔ بازار میں کچھ کھا پی بھی لیتے۔ کئی لوگ پٹھان کی ایک باؤ کے ساتھ اتنی گہری دوستی پر حیران بھی ہوتے اور ان کی پیٹھ پیچھے ہنسنے لگتے۔

چھ ماہ کے بعد منصور خان کو اپنی بیوی اور بچی کے ساتھ کابل واپس جانا پڑا۔

رینک اینڈ کمپنی کے دفتر میں شام کمار کا کمرہ...... منصور خان اور شام کمار خوب گھل مل کر بات چیت میں مصروف ہیں۔ سامنے چائے اور کچھ کھانے کے لوازمات بھی رکھے ہیں۔ شام کمار منصور خان کو بتا چکا تھا کہ اس نے فلم ڈسٹری بیوشن کے دفتر کی نوکری چھوڑ کر اس دفتر میں بہتر ملازمت حاصل کر لی تھی۔

ادھر منصور خان نے بتایا "میں کل ہی دلی پہنچا۔ آج صبح آپ کے پرانے دفتر میں گیا تو انھوں نے یہاں کا پتہ دیا۔ کابل جا کر میں اپنے وطن غزنی میں مقیم رہا اور ڈرائی فروٹ کا کام شروع کیا۔ اللہ کے فضل سے کام چل نکلا۔ ارے ہاں! میں تمہارے واسطے کچھ کابلی بادام، کشمش اور سردا لایا ہوں۔ اتنا رس دار اور میٹھا سردا دنیا بھر میں اور کہیں نہیں ملتا۔ میں کل ہی دے جاؤں گا۔"

"وہ تو ٹھیک ہے، مگر تم نے اپنی بیٹی رخسانہ کی بابت کچھ نہیں بتایا۔ میں جب بھی پوچھتا ہوں تم کہہ دیتے ہو 'خیر ہے۔ خیر ہے'۔ اب تو وہ سیانی ہو گئی ہو گی۔ کیا کرتی ہے آج کل...؟ پڑھ رہی ہے کیا...؟"

منصور خان سن ہو گیا۔ اس کا چہرہ غم میں ڈوب گیا۔ پھر اس کے گلے سے آواز ابھری۔

"ہاں میرا لختِ جگر رخسانہ! جس کے لئے تم اور ڈاکٹر صاحب مسیحا ثابت ہوئے تھے۔ عمر کے ساتھ ساتھ اس کی خوبصورتی بھی دوبالا ہوتی گئی۔ ہونہار، فرمانبردار، جانِ پدر۔ میرے دوست و احباب اسے دیکھتے تو میری قسمت پر رشک کرتے...!"

"مگر وہ آجکل کیا کر رہی ہے۔ اسے ساتھ کیوں نہیں لے آئے؟"

"وہ اپنے گھر چلی گئی ہے" منصور خان کی آواز میں درد تھا۔

"اپنے گھر چلی گئی... تمہارا مطلب ہے کہ اس کی شادی ہو گئی ہے؟"

"نہیں! وہ تو عرش پر واقع اپنے گھر چلی گئی۔ اس کا انتقال ہو گیا۔"

تھوڑی دیر تک دونوں میں بولنے کی طاقت نہ رہی۔ ایک خاموشی ان کے درمیان چھا گئی۔

"کیا ہوا تھا اسے؟" شام کمار نے ہمت بٹورتے ہوئے پوچھا۔

"ڈبل نمونیا...... ہم پٹھان لوگوں کا عقیدہ ہے کہ فلک سے بجلی جہاں ایک بار گر جائے، وہاں دوبارہ ضرور گرتی ہے۔"

—— ——

تجزیہ

یوگندر بہل تشنہ

یہ حرص و ہوس، یہ مہر و وفا، یہ جاہ و حشم کی عریانی
یہ ملنے بچھڑنے کا رونا، یہ دیدہ و دل کی ویرانی
یہ اہلِ وفا کی بیزاری یہ اہلِ ریا کی پرکاری
یہ شور و شغب، یہ سناٹے، یہ شہرِ ہوس کی اندھی گلی
یہ عقل و خرد، یہ مکر و ریا، یہ جور و ستم، یہ زعمِ خودی
اور ذہن و دل پہ چھائی ہوئی بس عیش طلب کی بدمستی

سوچو تو ذرا دم بھر کے لئے اس وقت کا عالم کیا ہوگا
جیون کا رشتہ جب ٹوٹے گا کیا رنگ لائے گی بے خبری
ڈھونڈو گے اندھیرے میں رستہ جب جسم سے رشتہ ٹوٹے گا
اور نورِ حقیقی سے ملنے، بھٹکے گی یہ روح کی تنہائی
سوچو تو کہاں سے آئے ہو، تم کون ہو، کیا ہو، سمجھو تو
لو شام ہوئی گھر کی سدھ لو، اب ختم کرو یہ بدمستی

کب تک باطل کی آنکھوں سے اے تشنہ آنکھ چراؤ گے
ہے وقت ابھی، اب بھی سن لو، ہاتف کی صدائے حقانی

سادھو

سلام بن رزاق

وہ تھکا ماندہ سادھو اس گاؤں میں پہلی بار داخل ہوا تھا مگر اس نے گاؤں کی حدود میں اس اعتماد سے قدم رکھا جیسے گاؤں کے سارے گلی کوچے اس کے دیکھے بھالے ہوں۔

گاؤں کے کنارے ایک کنویں پر بہت ساری عورتیں پانی بھر رہی تھیں جن میں بوڑھی جوان سبھی شامل تھیں ان مختلف عمر کی عورتوں پر نظر پڑتے ہی وہ ٹھٹک گیا اس کے بوڑھے چہرے کی جھریاں مزید گہری ہو گئیں اور ماتھے پر اندرونی کرب کی ایک لکیر سی ابھر آئی۔

زمانہ حال کی لمحہ لمحہ بدلتی بساط پر جینے والے ان بے بضاعت لوگوں پر اسے بڑا ترس آیا۔ ان میں سے ایک ایک کے مستقبل کا احوال وہ کھلی کتاب کی طرح پڑھ سکتا تھا۔ خصوصاً اس کی نگاہیں اس دوشیزہ پر جم کر رہ گئیں جو کنویں کی منڈیر پر جھکی ڈول سے پانی کھینچ رہی تھی اس کے چھل بل کرتے لباس سے پتہ چلتا تھا کہ وہ ایک نوبیاہتا دلہن ہے۔ اس کا جسم ہلدی کی گانٹھ جیسا چمکدار اور پرکشش تھا وہ اتنی نوعمر تھی کہ شباب کی آمد آمد کے باوجود اس کے چہرے پر بچوں جیسی معصومیت باقی تھی۔

سادھو کے دیکھتے ہی دیکھتے اس کا چہرہ مسخ ہو گیا اور ہلدی کی گانٹھ جیسا پرکشش بدن مردہ ڈھور کی مانند پھولنے لگا۔ سادھو نے گھبرا کر چہرہ دوسری جانب پھیر لیا اور بھرائی آواز میں ایک راہ گیر سے بولا۔

"اس لڑکی کو دیکھتے ہو۔ وہ ابھی کنویں میں ڈوب کر مر جائے گی۔"

پھر بغیر رکے تیزی سے آگے بڑھتا چلا گیا۔ ابھی وہ سڑک کے پہلے موڑ پر پہنچا تھا کہ عقب سے عورتوں کے بے تحاشا چیخنے چلانے کی آوازیں آنے لگیں مگر اس نے مڑ کر نہیں دیکھا۔ دیکھنے کی ضرورت بھی نہیں تھی وہاں جو کچھ ہونا تھا اس نے اپنی نگاہِ پیش بیں سے پہلے ہی دیکھ لیا تھا۔

تھوڑی دور چلنے کے بعد اسے ایک خستہ حال جھونپڑی دکھائی دی جس میں ایک سیاہ فام لوہار اپنے وزنی ہتھوڑے سے لوہا کوٹ رہا تھا سامنے بڑا سا الاؤ دہک رہا تھا جس میں سے آگ کی چنگاریوں کا فوارہ سا اڑ رہا تھا الاؤ کی سرخ روشنی میں وہ لوہار یوں دکھائی دے رہا تھا جیسے ابھی ابھی سمندر منتھن کے بعد اسی آگ سے کسی سیاہ فام سورج کی طرح برآمد ہوا ہو۔ پاس ہی ایک چھوٹا بچہ بڑے انہماک سے شعلوں کی لپ لپاتی زبانوں سے اڑنے والی چنگاریوں کا رقص دیکھ رہا تھا۔ سادھو نے یہ سب دیکھا مگر اسے بڑا تاسف ہوا کہ اس نے اس طرف کیوں نگاہ کی۔ پیش آنے والے حادثے نے اسے ایک بار پھر مضطرب کر دیا اور اس نے پاس کھڑے ہوئے شخص سے کہا۔

"آہ! اب یہ بچہ جھلس کر مر جائے گا" اور تیزی سے آگے بڑھ گیا۔ وہ شخص سادھو کی اس بات پہ پہلے تو چونکا پھر دور جاتے سادھو کو کوئی پھیری سمجھ کر اس پر ایک مستفسرانہ نگاہ ڈالی اور استہزائیہ انداز میں ہنسا۔ وہ بچہ اسی کا تھا اور پچھلے کئی روز سے اسی طرح روزانہ وہاں آکر بیٹھتا تھا اور لپ لپاتے شعلوں کا تماشا دیکھتا رہتا تھا کبھی ایسی ویسی بات نہیں ہوئی۔ اتنے میں لوہار اٹھا

اُس نے آنچل سے پیشانی اور گردن کا پسینہ صاف کیا اور لکڑی بھاری گٹھریا ڈوں کو ڈھیلا چھوڑ کا ہر پانی پینے کے لئے اندر چلا گیا۔ سادھو تیز تیز قدم اُٹھاتا کسی ان دیکھی انجان زنجیر سے بندھا چلا جا رہا تھا سامنے کٹر پر ال کا پیڑ تھا وہ جانتا تھا کہ اُس درخت سے سرسبز سایے تک پہنچتے پہنچتے کوئی چیخ سنائی دے گی اور دنیا ہی بچا ہوا ہے۔ اس سے درخت کی ٹھنڈی چھاؤں میں قدم رکھا پشت سے ایک دلدوز چیخ سنائی دی۔ سادھو کے قدم رُکے نہیں وہ چلتا رہا۔ اب وہ گاؤں کے باہر آچکا تھا اور اُس کا اعصابی تناؤ بھی کم ہوگیا تھا۔ اُسے یقین تھا کہ اُس سامنے والی پگڈنڈی کے دامن وہ مندر ضرور ہوگا چند قدم طے کرتے ہی اُس کی نظر مندر پر پڑی۔ وہ ایک پرانا بوسیدہ مندر تھا جس کے ستون ڈھہ چکے تھے مورتی ٹوٹی پڑی تھی اور چاروں طرف تاراجی کا راج تھا۔

اُس نے سوچا اب اس مندر کے ایک گوشے میں مرگ چھالا بچھائے وہ سکون اور اطمینان سے اُس کی راہ دیکھتا رہے گا۔ وہ اس مسافر کی سی طمانیت محسوس کر رہا تھا جو ایک طویل مسافت کے بعد کسی گھنے درخت کے سایے میں پہنچ گیا ہو۔

اُس نے مرگ چھالا فرش پر بچھایا اور اس پر اطمینان سے آسن جما کر بیٹھ گیا۔ اب باہر درختوں کے پتّوں کی سرسراہٹ کے سوا وہاں کسی بھی قسم کی آواز سنائی نہیں دے رہی تھی۔

غالباً اُس ویران مندر میں ایک عرصے سے کسی ذی نفس کا گزر نہیں ہوا تھا۔ فرش پر دھول کی دبیز چادر بچھی تھی جس پر دروازے سے مرگ چھالا تک صرف اُس کے قدموں کے نشان دکھائی دے رہے تھے۔ وقت دبے پاؤں گزر رہا تھا۔ سادھو دروازے پر نظریں جمائے خاموش بیٹھا رہا۔ وہ اس حقیقت سے بہت پہلے آگاہ ہو چکا تھا کہ آنے والا لمحہ اپنے وقت پر ہی آتا ہے۔ خواہ مخواہ کی بے صبری سے ہونے والا واقعہ اپنے مقررہ وقت سے پہلے ظہور میں نہیں آتا اور نہ ہی کسی کے ڈرنے گھبرانے سے وہ پل بھر کے لئے ٹل سکتا ہے۔

بڑی دیر کے بعد باہر خشک پتّوں پر کسی قدموں کی چرچراہٹ سنائی دی۔ دوسرے ہی لمحے ایک خوبرو تنومند نوجوان ہاتھ میں چمکدار خنجر لئے دروازے میں کھڑا دکھائی دیا۔ نوجوان دروازے میں کھڑا اندر مندر کے اندھیرے میں آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر دیکھ رہا تھا۔

"بھرت! اندر آجاؤ میں یہاں اس کونے میں بیٹھا ہوں مجھے تیرا ہی انتظار تھا۔" مندر کے سنّاٹے میں سادھو کی آواز گونجی۔

نوجوان اپنا نام سن کر پہلے تو چکرایا، پھر سادھو پر اُس کی نظر پڑی اور وہ تیز تیز قدم اُٹھاتا سادھو کے سامنے آکر کھڑا ہوگیا۔ اُس کے چہرے پر اب بھی حیرت کے آثار تھے۔

سادھو کو اس کا نام کیونکر معلوم ہوا، آخر اُس نے کرخت آواز میں پوچھ ہی لیا۔

"تو کیسے جانتا ہے کہ میرا نام بھرت ہے؟"

وہ جانتا تھا کہ بھرت اُس سے یہ سوال ضرور پوچھے گا وہ دل ہی دل میں مسکرایا۔ وہ یہ بھی جانتا تھا کہ جواب میں اُسے بالکل خاموش رہنا ہے مگر اس سوال نے اُس کی یادوں کے پُرسکون تالاب میں ایک ہلچل سی مچا دی جس طرح وہ حال کے بطن میں چھپی مستقبل کی تصویر دیکھ لیتا ہے اسی طرح اب ماضی بھی ساکار ہو کر اُس کے سامنے آکھڑا ہوا۔

جب گھر میں بچّہ ہوا تھا تو اُسی نے اُس کا نام بھرت رکھا تھا مگر بچّے کی پیدائش کے چند روز بعد ہی اُس کی بیوی گھر اور خاندان کی پرواہ کئے بغیر بچّے کو چھوڑ کر کہیں چلی گئی۔ لڑکا بھی اُنگلیوں میں قدم رکھتے رکھتے گھر سے فرار ہوگیا۔ یوں گھر کا پورا شیرازہ بکھر گیا تب سے وہ اپنے بیٹے کی تلاش میں جنگل جنگل بھٹک رہا تھا۔ اُس نے مستقبل کی آنکھ سے بارہا اپنے بیٹے کی جگہ اسی خونخوار نوجوان کو اسی بوسیدہ مندر میں اسی حالت میں خنجر بکف دیکھا تھا۔ یہ منظر دیکھتے دیکھتے اُس کی رگوں میں برف جم چکی تھی۔

وہ انجانے میں اس گاؤں کے پاس سے کتنی ہی بار گزرا ہوگا مگر کبھی اُسے وہ مندر دکھائی نہیں دیا اور نہ ہی کبھی اس گاؤں میں داخل ہونے کی اُس کے دل میں کوئی خواہش جاگی تھی۔ وہ جانتا تھا کہ واقعات اپنے وقت پر ہی رُونما ہوتے ہیں۔ نہ ایک پل اِدھر نہ ایک پل اُدھر ـــــ جیسے ہر نقش پتھر پر کندہ کر دیا گیا ہو۔ اُس نے تصوّر میں اُس نوجوان کے ہاتھ میں چمکتا خنجر بھی دیکھا تھا۔ مگر ایک عجیب طاقت اُسے وہاں کھینچ لائی تھی وار کرنے والا اور وار سہنے والا دونوں وقت کے اس بیکراں جال میں کس قدر بے بس ہیں، بے بس ہیں اس لئے دونوں ہی بے قصور ہیں۔

سادھو کو خاموش دیکھ کر بھرت بولا۔

"تو جانتا ہے اس بستی پر میری حکمرانی ہے میرے عتاب سے لوگ کانپتے ہیں اور میری ذرا سی چاہت انہیں نہال کر دیتی ہے۔ تو شاید نہیں جانتا کہ میں یہاں کیوں آیا ہوں۔"

سادھو ایک بات جانتا تھا پچھلے کتنے ہی برسوں سے مستقبل کا ایک ایک راز اُس پر افشا ہو چکا تھا جب وہ اپنے اننت سفر پر گھر سے نکل رہا تھا تبھی یا اُس سے پہلے اُس وقت جب وہ اپنے بیٹے بھرت کا نام تجویز کر رہا تھا یا اُس سے بھی پہلے جب وہ خود پیدا ہوا تھا یا اُس سے بھی پہلے جب اُس کے باپ کا جنم ہوا تھا۔ یا اُس سے بھی پہلے جب پہلا انسان وجود میں آیا تھا وہ ہر منظر کو عجیب بے تعلقی سے دیکھتا آیا تھا جیسے کوئی ناٹک دیکھ رہا ہو ـــــ اُس کے بعد پانی کے بلبلوں کی طرح بے شمار انسانوں کی پیدائش اور اُن کی قسمتوں کی ناگزیریت کے ساتھ کھنچی ہوئی ایک ایک لکیر ـــــ زندگی کا ہر بھید اُس پر کھل چکا تھا۔ سب جو کچھ ہونے والا تھا اُس کی حقیقت صرف اتنی تھی کہ متواتر مستقبل کا تعاقب کرنے والا لمحۂ موجود ایک جست میں مستقبل کی حد عبور کرنے والا تھا۔ وقت کے بہاؤ میں لمحہ بھر کو ایک گرہ پڑنے والی تھی اور پھر سب کچھ پہلے کی طرح شانت اور پُرسکون ہو جانے والا تھا

"تجھ جیسے شخص کا زندہ رہنا بے حد خطرناک ہوگا۔" بھرت نے کہا۔ "میں تجھے قتل کرنے کے لئے آیا ہوں۔ تیری زبان سے موت بولتی ہے۔ تیرے الفاظ تباہی اور نحوست کا سندیسہ ہیں۔"

سادھو نے نہایت اطمینان سے کہا۔

"تو جو کچھ کہہ رہا ہے سچ ہے مگر یہ صرف یہی نہیں ہے لفظ کو واقعہ بنا دینے کا اختیار کسی کو نہیں۔ میرے الفاظ کسی واقعے کا علامیہ بن ہی نہیں سکتے تیرا یہ سوچنا

ظاہر ہے کہ میں جو کچھ بولتا ہوں اُسی کے مطابق ہوتا ہے حقیقت اس کے برعکس ہے دراصل جو ہونے والا ہوتا ہے وہ مجھے قبل از وقت دکھائی دے جاتا ہے اور میں محض لفظوں میں بیان کر دیتا ہوں میرا بولنا ناگزیر ہے۔ یہی میرا عذاب ہے۔"

مندر کی شکستہ دیوار سے دھوپ کی ایک کرن رینگ آئی اور فرش پر دھوپ کا بالشت بھر ٹکڑا گول ہو گیا۔ تاریکی کچھ کم ہوئی۔ سادھو کہہ رہا تھا اور سنو! اپنے اس عذاب کے کارن میں دوسروں کے مقابلے میں زیادہ بدنصیب ہوں کیونکہ اسی کے سبب میں امید اور خواب کی فریب خوردہ مسرتوں سے حظ نہیں اٹھا سکتا۔ مگر میں دوسروں کے مقابلے میں بے حد مطمئن ہوں۔ کیونکہ میں نے خواہشات کی نفی کر دی ہے۔ اس لئے دکھوں کی بھی نفی ہو چکی ہے جب لاگ ہی نہیں تو لگاؤ بھی نہیں اور جب لگاؤ نہیں تو دکھ بھی نہیں۔ میں جانتا ہوں تو مجھے قتل کرنے آیا ہے مگر میں موت سے قطعی خوف زدہ نہیں ہوں۔ حتیٰ کہ میرے دل میں تیرے تعلق سے بھی کوئی میل نہیں۔ اس دھوپ کے ٹکڑے کو غور سے دیکھ کیسا سنہرا رنگ ہے اس کا تھوڑی دیر میں یہ میری زندگی کے آخری لمحے کی طرح بے نور ہو جائے گا۔ کسی کا سورج ہوتے ہی بکھرے میرا وقت بھی آن پہنچا۔ البتہ میں تجھ سے یہ کہوں گا کہ تو جلدی سے اپنا کام ختم کر اور میری زندگی کے چند لمحے مجھ سے مستعار مانگنے کا میرا کوئی ارادہ نہیں ہے۔ نہ تیرے چاہنے سے یہ قتل مقررہ وقت سے قبل عمل میں آ سکتا ہے نہ میرے چاہنے سے ایک پل کے لئے ٹل سکتا ہے۔" سادھو بولتے بولتے رک گیا۔ اس کی نگاہیں بھرت پر گڑی تھیں۔ دیکھتے ہی دیکھتے بھرت کا چہرہ سیاہ، بے جان اور بے رونق ہو گیا۔ اس کی گردن کے گرد کالے ناگ کی کنڈلی جیسی پھانسی کی رسی کے نیل پڑنے لگے۔ سادھو نے بہت پہلے جب بھرت ابھی بچہ تھا اپنے ہاتھوں سے اس کے گلے میں سیاہ موتی باندھا تھا اگر نظر دیکھ اور اب اُسی گردن میں پھانسی کا پھندا دکھائی دے رہا تھا اور المیہ یہ کہ اس پھانسی کے سبب وہ خود بننے والا تھا۔ غصے سے بھرت مضطرب ہو گیا اور یہ جانتے ہوئے بھی کہ سب کچھ ناگزیر ہے اور جو کچھ ہو رہا ہے وہ پہلے ہی سے مقدر ہے اس کی آنکھوں کے کنارے بھیگنے لگے۔ تبھی اس نے کمال ضبط سے آنسوؤں پر قابو پا لیا اور انہیں پلکوں کے اندر ہی قید کر لیا۔

سادھو کی بات بھرت کی سمجھ میں نہیں آئی۔ اُس کا غصہ اب اپنی انتہا کو پہنچ چکا تھا۔ اُس کا چہرہ لال ہو گیا آنکھوں سے خون ٹپکنے لگا۔ دوسرے ہی لمحے اس کا خنجر والا ہاتھ سر سے بلند ہوا بجلی سی کوندی اور پھر خنجر آنکھیں موندے اطمینان سے بیٹھے اس سادھو کے سینے میں دستے تک پیوست ہو گیا سادھو کے سینے سے خون کا چشمہ اُبل پڑا۔ اور فرش پر بہتی خون کی لکیر اُس سنہرے دھوپ کے ٹکڑے کو مزید سنہرا بنانے لگی۔

غزلیں

بیداد گر تو قہر ہی ڈھاتے چلے گئے
ہم ہیں کہ اُن کی خیر مناتے چلے گئے
دن رات صبح و شام کا رکھا نہ کچھ فرق
تیرے قدم پہ سر کو جھکاتے چلے گئے
افسوس ہے کہ سمجھا نہ تو کسی طرح
تیرے فریب بندے سب آتے چلے گئے
تیرا گلہ کسی سے ہماری جو ہو گیا
ہم راستے میں آنکھیں بچھاتے چلے گئے
ہم ہیں کہ عمر بھر ہی لٹاتے رہے جان نثار
وہ ہیں کہ عمر بھر ہی ستاتے چلے گئے
دیوانہ کو نہ سمجھا کسی نے گنہگار
اک غم جو بھولتا اُس پہ لٹاتے چلے گئے

دیوانہ ردیگی

دیر و کعبہ ہی نہ قصر و بام و در اچھے لگے
خون میں لتھڑے ہوئے ہم کو شجر اچھے لگے
پیاس کی شدت مٹانے کے لئے گھنشیام کو
سوچتا ہوں آج بھی زہر دگر اچھے لگے
کیا کہیں کس سے کہیں کیونکر کہیں یہ ماجرا
موسمِ گل میں ہمیں تو جلتے گھر اچھے لگے
ہم کبھی بیٹھے پڑھے تھے جن کی چھاؤں میں
آج وہ اشجار بے برگ و ثمر اچھے لگے
اک زمانہ تھا ہمیں جب بستیوں سے پیار تھا
اس برس لیکن ہمیں سنسان گھر اچھے لگے
آج بادل کے برسنے کا عجب انداز تھا
شادماں چہروں کو بھی بس نوحہ گر اچھے لگے

دلیپ بادل

اب دُور تلک کوئی مکاں ہے نہ مکیں ہے
تا حدِ نظر آگ ہے اور سُرخ زمیں ہے
مانا کہ اسے لوٹ گیا دستِ تعصب
پھر بھی مری نظروں میں یہ فردوسِ بریں ہے
سرگرداں ہوں میں جیسے تجسس میں ازل سے
ہر حال میں جو میری رگِ جاں کے قریں ہے
یہ شوقِ طلب تو کوئی دیکھے کہ خدا سے
وہ مانگ رہا ہوں جو مقدر میں نہیں ہے
اللہ نے بخشی ہے مجھے تیری محبت
میں تجھ کو بھلا دوں یہ مرے بس میں نہیں ہے
میں سونپ چکا اپنے دل و جاں اسے بسمل
کیا غم ہے وہ میری امانت کا امیں ہے

بسمل نقشبندی

یہ تحریر ۲۳ سال پہلے لکھی گئی

بہ کوئے یار

بہ انداز محرمانہ ترز

مستقل کالم

فکر تونسوی

خوشتر گرامی کو بیوقوف بنانے کے مجرب نسخے

خوشتر گرامی میرے پرانے واقف کار ہیں۔ یہ پہلے بہت معمولی حیثیت کے آدمی تھے۔ اپنی محنت سے نہیں بلکہ قدرت کی ستم ظریفی سے ان کا کاروبار چل پڑا۔ اور دولت کی سواری تو اُتو ہوتی ہی ہے، لہٰذا ان کی بیوقوفی ان کے دولتمند ہونے میں خاصی معاون رہی۔ اور آج یہ ایک اچھے خاصے سرمایہ دار ہیں۔ چونکہ یہ خاندانی امیر نہیں ہیں اس لئے قدرتی طور پر انتہائی کنجوس اور بے حس ہیں۔ کسی کی ترقی ان کو ایک آنکھ نہیں بھاتی۔ یہی وجہ ہے کہ ان کے ہر دوست نے جب بھی ذرا سی ترقی کی، تو ان کی اُس سے نہ بنی۔ جہاں تک کوئی غریب وفادار رہے اُسے یہ زبانی زبانی دوست کہتے رہتے ہیں۔ اگر خدا نخواستہ ان کے کسی دوست کو کوئی مشکل پیش آجائے تو پھر یہ ایسی آنکھیں پھیرتے ہیں جیسے "کہ طوطا چشم" کی کہاوت بنی ہی اُن کے لئے ہو۔

مگر انھیں بیوقوف بنا کر آپ ہر قسم کا فائدہ اُٹھا سکتے ہیں۔ آئیے آپ کو کچھ ایسے مجرب نسخے بتا دیئے جائیں تاکہ ناظرین میں سے جو اصحاب خوشتر صاحب سے کوئی فائدہ اٹھانا چاہیں اُٹھا سکیں۔

آپ جب خوشتر صاحب کے دفتر میں جائیں تو کرسی پر بیٹھنے کے دو منٹ بعد گفتگو کا موضوع یوں شروع کیجئے۔

(۱) خوشتر صاحب آپ جس فونٹن پین سے لکھ رہے ہیں ذرا دکھایئے تو سہی۔ فونٹن پین کو اپنے ہاتھ میں لینے کے بعد اچھی طرح سے بغور دیکھئے اور کہیئے واہ واہ خوشتر صاحب تبھی آپ کے "تیر و نشتر" میں اتنا زور ہوتا ہے اور آپ کے پوسٹروں میں جان ہوتی ہے۔ یہ پین تو وہ ہے جو نپولین کے پاس تھا۔ وہ اس سے جوزفائن کو محبت بھرے خطوط لکھا کرتا تھا۔ لوگ تو سمجھتے ہیں کہ آپ پچھتر روپے ماہانہ پر پنڈت ہری چند اختر سے تیر و نشتر... سر گوشیاں، یہیں ملی معمہ کا نتیجہ وغیرہ لکھواتے ہیں۔ خدا کی قسم اس قلم سے تو آپ ایک نئی آسمانی کتاب لکھ سکتے ہیں۔ — اس کے بعد خوشتر صاحب پورے زور سے آواز دیں گے "حیدر، جاؤ ایک کوکا کولا لاؤ"۔ اور آپ فرمانا شروع کیجئے:۔

(۲) خوشتر صاحب ذرا ماچس تو دیجئے" آپ ماچس مانگیں گے تو وہ الماری سے ۵۵۵ کی سگریٹ کا ڈبہ نکال کر پیش کریں گے۔ اس پر آپ یہ کہہ اٹھیئے کہ حضور یہ سگریٹ تو اب دلی میں غیر ملکی سفیروں کو ہی مل سکتی ہے اور یا پھر آپ کے ہاں۔ اور ساتھ ہی یہ بھی کہہ دیجئے کہ آپ کونسے سفیروں سے کم ہیں۔ میں نے تو سُنا ہے کہ حکومت پاکستان یہ سوچ رہی ہے کہ غضنفر علی خاں تو بس اب تشریف لے جانے والے ہیں، اُن کے بعد آپ کو ہی ادھ پاکستان کا سفیر ہندوستان میں مقرر کر دے گی۔ کیونکہ آپ سے زیادہ پاکستان کے حقوق کی نگہداشت کون کر سکتا ہے"۔ اور ساتھ ہی یہ لکھ دیجئے قید

خدا کی قسم آپ کی دیا سلائی تو صندل کی لکڑی سے بنی ہے۔ جلاتے ہی صندل کی خوشبو آتی ہے: اتنے میں کوکا کولا آچکا ہوگا اور خوشتر صاحب الماری سے بسکٹوں کا ڈبہ نکال رہے ہوں گے۔ اور آپ اتنے میں یہ کہنا شروع کر دیجئے۔

(۳) خوشتر صاحب آپ کی کرسی تو تختِ طاؤس ہے۔ جیسے آپ ہلتے ہیں، ویسے ہی یہ حرکت کرتی ہے اور اس پر آپ نے جو سرخ رنگ کا غلاف چڑھا رکھا ہے، وہ تو اسے واقعی تختِ طاؤس سے تشبیہ دلا رہا ہے۔ اور ساتھ ہی یہ فرما دیجئے۔

(۴) قبلہ میز تو حافظ یوسف صاحب نے بھی بنوایا ہے مگر جو شان آپ کے میز کی ہے وہ حافظ صاحب کے میز کی کہاں۔ یہ ٹھیک ہے کہ وہ میز زیادہ قیمتی ہوگا، مگر معاف فرمائیے آخر وہ میز ہے تو لکڑی کا ہی نہ۔ اور ماشاءاللہ یہ میز گودریج کا ہے۔ سارے کا سارا لوہے کا ہے۔ جب آپ اس کے دراز کھولتے ہیں تو ایسا معلوم ہوتا ہے جیسے کوئی کافرادا پاؤں تھرکاتی ہوئی اسٹیج پر آرہی ہے۔ واہ خوشتر صاحب واہ۔ جتنا شعرانہ انداز آپ کا ہے، حافظ صاحب تو اس کی گرد کو بھی نہیں پہنچتے۔ دیکھئے۔

(۵) آپ کے ہاں گودریج کی پانچ الماریاں ہیں اور کس ڈھنگ سے اکٹھی ایک دوسری کے ساتھ قرینے سے رکھی گئی ہیں۔ اور اب تو آپ کا کمرہ جواہر لعل نہرو کے کمرے سے بھی زیادہ اہمیت رکھنے لگا ہے۔ الماریاں تو شاید دفتر "شمع" میں آپ سے زیادہ ہوں گی مگر صاحب آپکی الماریوں کا جو رنگ ہے وہ تو آج تک گودریج والوں نے کسی دوسری الماری پر لگایا ہی نہیں۔ اور پھر ان کے اندر جو صحیفے ہیں ان کا تو کہنا ہی کیا ہے۔ واہ واہ خوشتر صاحب واہ واہ۔

اتنے میں آپ کوکا کولا اور بسکٹ ختم کر چکے ہوں گے اور خوشتر صاحب زور سے آواز دے کر کہہ رہے ہوں گے" اوئے حیدر دے پیچے جلدی کر اور اندماء ریسٹورنٹ سے اس گئے، گلاب جامن اور قلاقند لے کر آ"۔ اور آپ موضوع بدلتے ہوئے کہئے۔

(۶) خوشتر صاحب میں ابھی ابھی ایک ایجنٹ اخبارات کے ہاں سے آرہا ہوں۔ وہاں کئی لوگ کہہ رہے تھے کہ شمع تو محض ایکٹرسوں کی تصاویر دیتا ہے، مگر بیسویں صدی ایسا رسالہ ہے کہ اس میں خوشتر صاحب کی اپنی تصویریں آتی ہیں۔ اور ظاہر ہے کہ خوشتر صاحب کی تصویر دیکھ کر کسی کا اخلاق نہیں بگڑتا، لہٰذا بیسویں رسالہ بڑا مہذب با اخلاق اور سنجیدہ ہے۔ اور پھر کہئے۔

(۷) آپ کے تیر و نشتر اللہ قسم مولانا ابوالکلام آزاد کے "الہلال" کے بعد اگر میں نے کبھی کسی کی تعریف سنی ہے تو آپ کے تیر و نشتر کی۔ جہاں جاتا ہوں سبھی لوگ تیر و نشتر کا ہی ذکر کر رہے ہوتے ہیں۔ پرسوں جگت نرائن وزیر تعلیم پنجاب کہہ رہے تھے " ابھی ہم تو خوشتر صاحب کے تیر و نشتر سے بہت گھبراتے ہیں" کل رات الیکشن کے سلسلے میں تقریر کرتے ہوئے چودھری برہم پرکاش چیف منسٹر دہلی کہہ رہے تھے کہ اور تو میں کسی سے نہیں گھبراتا مگر بیسویں صدی کے تیر و نشتر سے اس قدر ڈرتا ہوں کہ شاید کسی وقت استعفےٰ دے دوں۔ اس پر لوگوں نے بیسویں صدی زندہ باد، خوشتر گرامی پائندہ باد اور تیر و نشتر زندہ باد۔ کے نعرے لگائے۔ یہ سننے کے بعد خوشتر صاحب زور سے آواز دیں گے پنڈت جی ... یہ ان کے منیجر ہیں۔ ان کے آنے پر حکم دیا جائیگا کہ دیکھئے آپ کے نام رسالہ بیسویں صدی اعزازی جاری کر دیا جائے۔ اور آپ سلسلہ کلام کو جاری رکھتے ہوئے فرمائیے۔

(۸) حضور آپ کی "سرگوشیاں" واہ واہ قسم ہے بیسویں صدی کی اس کے پڑھنے سے ہزاروں نوجوان ندامت سے خود کشی کر گئے، ہزاروں نے مندروں، مسجدوں اور گوردواروں میں جانا شروع کر دیا۔ اور صاحب آپ کا جو طرز تحریر ہے اس کی تو گرد کو کوئی نہیں پہنچ سکتا۔ اتنے میں خوشتر صاحب پنڈت جی کو دوبارہ آواز دے چکے ہوں گے اور حکم کیا جا رہا ہوگا کہ انہیں ہر پرچہ ہر ماہ رجسٹری سے بھجوایا جایا کرے اور اتنے میں حیدر کھانے پینے کی چیزیں بھی لے آیا ہوگا۔ آپ کھاتے بھی جائیے اور ساتھ ساتھ کہتے بھی جائیے۔

(۹) یہ نالائق سرور کون ہے؟ شانِ ہند میں کبھی کبھی آپ پر لطیف طنز کرتا ہے۔ میرا تو خیال ہے آپ اس پر مقدمہ کیجئے۔ خدا کی قسم اس کی ضمانت نہ ہو سکے گی۔ جب آپ مقابلہ میں ہوں گے تو وکیل ٹھٹھک جائیں گے تمام ایڈیٹر کانپ جائینگے کوئی اس کی ضمانت دینے نہ جائے گا اور مقدمہ کا فیصلہ ہونے سے پہلے ہی اسے ہتھکڑیاں لگ جائیں گی اور جب تک فیصلہ نہ ہو تب تک ڈسٹرکٹ جیل میں رہیں گے۔ آپ جیسا ایماندار تو خدا نے آپ کے بعد پیدا ہی نہیں کیا۔ اور جس ڈھنگ سے آپ نے معمہ بازی شروع کی، بڑے سے بڑے سمگلر اور جوئے باز اور قمار باز اس قسم کی مثال پیش نہیں کر سکتے۔ خدا کی قسم میں جہاں بھی جاتا ہوں لوگ بیسویں صدی معموں کے گن گاتے ہیں۔ گو کل ایک صاحب کہہ رہے تھے کہ نہ جانے کیوں آپ نے اپنے پرچہ میں شمع معموں کے متعلق یہ کیسے غلط طور پر لکھ دیا، کہ شمع معموں میں آخری روز مقامی طور پر بیس بائیس ہزار روپیہ آتا ہے۔ (حالانکہ یہ حقیقت ہے کہ معمہ ۵۲ میں آخری دن مقامی طور پر ۲۹/۳۷۴۷ روپیہ آیا ہے)۔ اس پر خوشتر صاحب کو اختلاج قلب کا دورہ پڑے گا۔ اور آپ فوراً کہئے کہ خوشتر صاحب مگر بیسویں صدی اور شمع معمے کا مقابلہ ہی کیا۔ لوگ تو آپ ہی کی تعریف کرتے ہیں۔ کیا ہوا، روپیہ اگر زیادہ شمع کو آتا ہے۔ اور پھر خوشتر صاحب ان کا ایک لاکھ روپے کا انعام گیا، اور آپ کا بیس تیس ہزار۔ اس کا بھی تو فرق ہونا ہی ہوا۔ مگر اس کے باوجود لوگ آپ کی ایمانداری اور دیانتداری کی تعریف کرتے ہیں۔ اور پھر آپ کا معمہ بورڈ خدا کی قسم، ایشیا میں ایسا بورڈ نہیں ہے۔ معمہ بورڈ تو کیا،

جیسا بیسویں صدی کا سائن بورڈ ہے، ایسا بورڈ ایشیا بھر میں نہ مل سکے گا، چہ جائیکہ ایسا معمّہ بورڈ ہو۔ اتنے میں کہیں نہ کہیں سے خوشتر صاحب کو فون آئے گا اور ٹیلی فون کی گھنٹی بجے گی اور آپ فوراً کہیے۔

(۱۰) واہ واہ میں تو سمجھا تھا کہ کوئل کوک رہی ہے، مگر یہ تو آپ کے فون کی گھنٹی بجی ہے۔ خدا کی قسم میں حافظ صاحب سے بھی کئی بار ملا ہوں۔ اُن کے فون کی گھنٹی تو کیا چپراسی کو بلانے کی گھنٹی بھی عجیب و غریب آواز نکالتی ہے۔ خوشتر صاحب آپ کی ہر چیز نرالی ہے۔ اس کے بعد دائیں طرف پڑی ہوئی ایک مشین پر نظریں جما کر پوچھیے۔ اور جس قدر حیرت کے آثار آپ اپنے چہرے پر دکھا سکتے ہوں، دکھائیے، کہ حضور یہ کیا ہے؟ خوشتر صاحب آپ کو بتائیں گے کہ اس سے ٹکٹ چھپتے ہیں۔ اور ہم ستر ہزار ضمیمہ معمّہ کا چھاپتے ہیں۔ اور آپ کہیے۔

(۱۱) میں نے تو عمر بھر میں خوشتر صاحب یہ ٹکٹ چھاپنے کی مشین آپ کے ہاں ہی دیکھی ہے۔ اور بھولے پن سے کہیے کہ خوشتر صاحب پیسہ پیسہ یا آنہ آنہ کے ٹکٹ چھاپنے سے کیا بنتا ہوگا؟ اس سے سَو سَو کے نوٹ کیوں نہیں چھاپتے؟ اس پر خوشتر صاحب ایک پھیکا سا اونچا قہقہہ لگائیں گے۔ اور آپ کو سمجھائیں گے کہ اس مشین سے ٹکٹ چھاپنے کا کیا مطلب ہے۔ اور آپ کی سمجھ میں کچھ آئے نہ آئے آپ مشین کے پُرزوں کی تعریف کرتے جائیے اور کہیے کہ یہ ٹکٹ اس صفائی سے چھاپتی ہے کہ... گورنمنٹ کے پرنٹ شدہ ٹکٹ بھی اس کا مقابلہ نہیں کر سکتے۔ اس کے بعد ایک چھوٹی سی میز پر پڑی ہوئی مشین کی طرف اشارہ کیجیے کہ صاحب آپ نے یہ کیا چھپا رکھا ہے؟ اس مشین پر ایک سیاہ رنگ کا کپڑا پڑا ہوا ہوگا۔ اور خوشتر صاحب آپ سے کہیں گے کہ چونکہ معمّہ میں لاکھوں آدمی حصّہ لیتے ہیں (حالانکہ ہزاروں بھی مشکل ہوتے ہیں) اُن کو صحیح حل فوراً چھاپ کر بھجوانا ہوتا ہے۔ یہ مشین صحیح حل چھاپتی ہے۔ اور آپ اس پر بےساختہ کہیے۔

(۱۲) یہ بات ہے ع
وہ الگ باندھ کے رکھا ہے جو مال اچھا ہے
اور کہیے کہ خوشتر صاحب خدا کی قسم آپ کے حسنِ انتظام، آپ کی نفاست پسندی اور خوش ذوقی کو دیکھ کر دل باغ باغ ہو گیا۔ اور ساتھ ہی یہ کہہ دیجیے کہ حافظ صاحب سے ملنے جاتے ہیں تو بس وہ مطلب کی بات کرتے ہیں اور چائے کی پیالی پلا دیتے ہیں مگر آپ کے ہاں آکر تو دل اتنا خوش ہوا کہ بس کچھ نہ پوچھیے۔ جیسا سُنا تھا، ویسا ہی آپ کو پایا۔ میں پاکستان گیا تھا اور...

(۱۳) وہاں تقریباً سبھی سے لے کر مولانا سالک صاحب تک یہ کہہ رہے تھے کہ خوشتر گرامی ایسا مسلمانوں کا کوئی ہندو دوست و خیرخواہ نہیں ہو سکتا۔ دیکھیے نا اُن کا پچاس ہزار کے قریب نیازی صاحب کے ہاں جمع تھا۔ سات ہزار تو سالک صاحب کو دیدیے اور اُن کو لاہور بھجوا دیا۔ اور اُن کا مکان لے کر وہاں خضر دہلوی کو بٹھا کر بیسویں صدی کا دفتر بنا دیا۔ خوشتر گرامی لغات جسے بیسیوں ادیبوں نے لکھا ہے، کی اصلاح کے لئے ایک ہزار روپیہ سالک صاحب کو اور دیئے گئے لغات کی کتابت بھی لاہور میں سالک صاحب کے زیرِ اہتمام ہوگی، لہٰذا کاتبوں کو بھی روپیہ پیشگی دے دیا۔ دس بارہ ہزار روپیہ ظفر نیازی صاحب کو کمیشن کا دیدیا۔ اور جو پاکستانی دہلی جاتا ہے اس کے واپس آنے کا کرایہ اور تحفے تحائف خوشتر کے ذمّے ہوتے ہیں۔ خوشتر صاحب آپ اندازہ نہیں لگا سکتے کہ پاکستان میں جتنا آپ کا ذکر کیا جا رہا ہے اور تعریف ہو رہی ہے، اتنا ذکر تو آج کل وہاں مرحوم قائدِ اعظم کا بھی نہیں اور نہ اتنی تعریف آج کل وہاں گورنر جنرل کی ہے اور ساتھ ساتھ یہ بھی کہتے جائیے کہ خوشتر صاحب آپ کی فیاضی، دوستوں کی خدمت کے جو قصّے میں نے سُنے ہیں، مثلاً بیگم تاجور کو آپ ایک صد روپیہ ماہانہ دیتے ہیں۔ رفعت صاحب سہارنپور ہسپتال میں رہے تو اخراجات آپ بھجواتے رہے۔ اور اسی طرح ہزاروں دوستوں کی خدمت آپ کرتے ہیں۔ اور پھر خوشتر صاحب کی آنکھوں میں چمک اور دماغ میں روشنی آجائے گی۔ اور وہ خود آپ سے کہیں گے کہ میں آپ کا بھی غلام ہوں، کوئی خدمت ہو تو فرمائیے اور آپ جھٹ سے کہہ دیجیے کہ جناب وہ ذرا آجکل کچھ کام کاج ایسا ویسا ہی ہے۔ اگر آپ ایک صد روپے دیجیے تو بڑی مہربانی ہوگی۔ اس پر خوشتر صاحب زور سے آواز دیں گے، پنڈت جی! ذرا تحسین صاحب کو بھیجنا۔ اور کہو کہ چیک بُک ساتھ لیتے آویں۔ اور جب پنڈت جی آجائیں گے تو اُن کو نہایت لگاوٹانہ انداز میں کہیں گے۔ دیکھیے یہ لالہ دھرم چند جی ہیں ان کو ضرورت ہے۔ ایک صد کے چیک پر میں دستخط کر رہا ہوں۔ آپ دو چار پر معاوضہ مضمون لکھوا کر رسید لے لیجئے۔ اب آپ کو آئے ہوئے چار پانچ گھنٹے تو ہو ہی گئے ہوں گے۔ ایک صد کا چیک جیب میں ڈال کر کہیے خوشتر صاحب۔ آپ کی "ہل مین" کی بہت تعریف سُنی ہے۔ کبھی سیر تو کرائیے۔ اس پر خوشتر صاحب کہیں گے بس ایک گھنٹہ اور تشریف رکھیے۔ دفتر بند کر کے چلتے ہیں۔ آپ کو سیر بھی کراؤں گا۔ "گے لارڈ" میں بھی لے چلوں گا۔ اور اس کے ساتھ ہی زور سے پکاریں گے "او حیدر جلدی سے چائے لاؤ"۔ مگر آپ خاموش مت بیٹھیے کسی کی چغلی کھائیے۔ اگر آپ کو خوشتر کے مخالفوں کے نام آتے ہیں تو ایک ایک کا نام لے کر دو دو، چار چار، ننگی ننگی گالیاں دیتے جائیے۔ اگر نام نہیں آتے تو پھر سرور تونسوی کا قصّہ لے بیٹھیے اور کہیے کہ دیکھیے خوشتر صاحب یہ سردار دیوان سنگھ مفتون کو کیا سوجھی جو سرور کے کہنے پر ساتھ چلے گئے اور مظفر نگر کا مقدمہ خارج کرا آئے۔ خدا کی قسم جب تک سرور پر مقدمہ تھا، دہلی والوں کی جان چھوٹی ہوئی تھی۔ اب دیکھیے نا مقدمہ ختم ہوتے ہی اُس نے آپ کی نیند خراب کر رکھی ہے۔ آپ کا چہرہ بھی فکر سے اُتر گیا ہے۔ غرضیکہ آپ سرور کے خلاف جس قدر بول سکتے ہوں غلط سلط بولتے جائیے۔ اس سے آپ کو یہ فائدہ ہوگا۔

کی شام کو "مگے لارڈ" میں آپ کو دعوت اُڑانی ملے گی۔ اور اگر آپ پیتے بھی ہیں تو شراب بھی ملے گی اور پیسے بھی بچو دفتر کے بند ہونے تک اپنا فرض ادا کئے جائیے۔ اور جب خوشتر شام کو دفتر بند کر کے آپ کے ساتھ دفتر کے نیچے اپنی پل مین کے پاس آئیں تو آپ اُن کی پل مین پر نیلے رنگ کے کپڑے کا غلاف دیکھ کر بے ساختہ کہئے کہ آپ نے غالباً محمد عثمان ٹیلرز سے سلوایا ہے، ولایت کی کمپنیاں اس صفائی سے فرنچ لیدر بھی نہیں بنوا سکتی ہیں اور ساتھ ہی کہئے کہ اس پر بیس بائیس روپیہ لگ گیا ہوگا۔ اس پر خوشتر صاحب انتہائی اونچی آواز سے کہیں گے /۸۶ روپے کا تو صرف کپڑا ہی لگا ہے۔ پھر آپ کہئے کہ صاحب یہ ذرا بڑا کیوں بنایا گیا ہے تو خوشتر صاحب آپ سے کہیں گے کہ یہ غلاف میں نے "بلائی موتھ" کار کے لئے بنوایا تھا۔ پل مین کو فروخت کر کے اب میں بلائی موتھ لے رہا ہوں۔ اس پر آپ کہئے کہ واہ حضرت واہ۔ عاقبت اندیش ہو تو آپ جیسا ہو کہ بلائی موتھ آنے سے پہلے اس کا غلاف بنوا لیا ہے۔ یعنی اس کی حفاظت کا انتظام پہلے کر لیا ہے۔ تبھی تو آپ کی پل مین کبوتری کی طرح خوبصورت ہے۔ اور ساتھ ہی ذرا سرگوشی کے لہجے میں فرمائیے کہ خوشتر گرامی کی شان بھی یہی ہے۔ اگر حافظ صاحب کے ہاں بلائی موتھ ہے تو آپ اُن سے کیسے کم ہیں۔ یہ آپ نے بہت بعد میں سوچا۔ آپ کو تو بہت پہلے بلائی موتھ خرید کر بتا دینا چاہئے تھا کہ "شمع" ہی نہیں، بیسویں صدی بھی بلائی موتھ خرید سکتی ہے اور کہئے کہ چلو اچھا ہی ہوا کہ آپ اب خرید رہے ہیں۔ ایک تو نیا ماڈل ہوگا۔ اور آپ کہہ سکیں گے کہ حافظ صاحب میری بلائی موتھ نئی ہے۔ اور جب آپ خوشتر کے ساتھ پل مین میں بیٹھ کر نئی دہلی کی طرف روانہ ہوں تو کہئے خوشتر صاحب اماں ماشاءاللہ یہ گاڑی تو چلتے وقت ہلتی بھی نہیں۔ ایسا معلوم ہوتا ہے جیسے ہوائی جہاز میں بیٹھے ہوئے جا رہے ہیں۔ اتنے میں "مگے لارڈ" آ جائے گا اور کار سے اُترنے کے بعد کار ہی کو بغور دیکھئے

اور حیرت سے کہئے کہ صاحب اس کا تو پیرنٹ بھی لوہے کا ہے اور نِکل کیا ہوا ہے۔ واہ واہ خوشتر کی پل مین اور پھر "مگے لارڈ" تو مگے لارڈ والوں کا ہے۔ بیٹ آپ کا ہوگا اور روپیہ خوشتر گرامی کا۔ اپنے بیٹ اور خوشتر کے روپیہ کے تناسب سے جو دل چاہے کھائیے اور پیجئے۔ اور اگر آموں کا موسم ہے تو دورانِ دعوت میں کہہ دیجئے کہ فلاں صاحب کہہ رہے تھے کہ خوشتر صاحب دوستوں کو وہ آم کھلایا کرتے ہیں جو پنڈت جواہر لعل نہرو نے سہارنپور کے ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ کو فون پر شنگھم دسے کر چین کے وزیر اعظم چو-این-لائی کے لئے منگائے تھے۔ اور اتنا کہنے کے بعد آپ دوسرے دن دوپہر کے کھانے پر بُلا لئے جائیں گے۔ اس کے بعد یہ آپ کے اختیار میں ہے کہ آپ دوپہر کے کھانے میں کسی چیز کی تعریف کر کے دعوت کے اس سلسلہ کو جس قدر چاہیں طویل کریں۔

بابِ انتقاد

شعرِ شور انگیز (جلد اوّل)

مصنف :۔ شمس الرحمٰن فاروقی
ڈیمائی سائز۔ صفحات:۔ ۴۱۲
بہترین کتابت، اعلیٰ چھپائی،
دبیز کاغذ، مضبوط جلد ——
توجہ طلب گرد پوش۔
قیمت :۔ چھ سو روپے
ناشر:۔ ترقی اردو بیورو، نئی دہلی۔

شمس الرحمٰن فاروقی کی ہر تصنیف اُردو اَدَب میں اضافہ کی حیثیت سے وارد ہوتی رہی ہے۔ زیرِ نظر کتاب غزلیاتِ میر کا انتخاب اور مفصل مطالعہ سے متعلق ہے۔ جلد اوّل دیباچہ، غزلیات اور ردیف الف تک محدود ہیں۔ اس کتاب کے مقصود حسب ذیل ہیں :۔

(۱) میر کی غزلیات کا ایسا معیاری انتخاب جو دُنیا کی بہترین شاعری کے سامنے بے جھجک رکھا جا سکے اور جو میر کا نمائندہ انتخاب بھی ہو۔

(۲) اُردُو کے کلاسیکی غزل گویوں، بالخصوص میر کے حوالے سے کلاسیکی غزل کی شعریات کا دوبارہ حصول۔

(۳) مشرقی اور مغربی شعریات کی روشنی میں میر کے اشعار کا تجزیہ، تشریح، تعبیر اور محاکمہ۔

(۴) کلاسیکی اُردُو غزل، فارسی غزل، (علی الخصوص سبکِ ہندی کی غزل) کے تناظر میں میر کے مقام کا تعین۔

(۵) میر کی زبان کے بارے میں نکات کا حسبِ ضرورت بیان۔

فاضل مصنف نے میر کے انتخابات (جو بازار میں دستیاب یا نایاب ہیں) میں سے کسی کو اختیار کرنے کے بجائے اپنا انتخاب خود ترتیب دیا ہے۔ کیونکہ یونیورسٹیوں میں پڑھائے جانے والے انتخابات سے وہ مطمئن نہیں ہیں۔ آثر لکھنوی کے انتخاب (مزامیر) کو نسبتہً بہتر سمجھتے ہیں، حالانکہ اس میں تنقیدی بصیرت کے بجائے عقیدت سے زیادہ کام لیا گیا ہے۔ محمد حسن عسکری کا انتخاب جو "ساقی" کے ایک خاص نمبر کی شکل میں چھپا تھا وہ کہیں بھی دستیاب نہیں۔ فاروقی صاحب کا کہنا ہے کہ عسکری صاحب نے ایک مخصوص، اور ذرا محدود نقطۂ نظر سے کام لیتے ہوئے میر کے بہترین اشعار کی جگہ میر کی مکمل یا اگر مکمل نہیں تو نمائندہ تصویر پیش کرنے کی کوشش کی ہے۔ اور اس طرح کے بہت سے عمدہ اشعار کے ساتھ کم عمدہ اشعار بھی انتخاب میں آ گئے۔ لہٰذا اس انتخاب سے میر کے شاعرانہ مرتبہ کے باب میں صحیح رائے نہیں قائم ہو سکتی۔

فاروقی صاحب نے سردار جعفری صاحب کا ترتیب دیا ہُوا انتخاب میر اچھا قرار دیا ہے۔ اور جعفری صاحب کے دیباچہ کی تعریف کی ہے۔ مگر یہ انتخاب بھی اب دستیاب نہیں ہے۔ مگر فاضل مصنف نے سردار جعفری کے انتخاب میر کو بھی اپنے مقصد کے لئے ناکافی سمجھا۔ کیونکہ جعفری صاحب نے میر کے کئی رنگوں کو نظر انداز کر دیا اور بہت سے کمزور شعر شامل کر لئے۔

جناب فاروقی صاحب فرماتے ہیں کہ "میں میر کے کلام کو بقولِ ڈبلیو۔ بی۔ یے ٹس "مستوں اور مہاسوں کے ساتھ" "warts and all" (With warts and all) پیش کرنا چاہتا تھا۔ لیکن میں اُن اشعار کو نظر انداز کرنا چاہتا تھا جو موجودہ تصورِ غزل کے منافی ہیں اور جن میں وہ "متانت" یا "نفاست" "معصومیت" وغیرہ نہیں ہے جو کلاس روم والے میر کا طرّۂ امتیاز بتائی جاتی ہے۔ اگر شعر میری نظر میں اچھا یا اہم ہے، تو میں نے اُسے ضرور شامل کیا ہے۔ چاہے اسی کے ذریعے میر کی جو تصویر بنے وہ اُس سے مختلف ہو جس سے ہم نقادوں کی تحریروں اور پروفیسروں کے لکچروں میں دوچار ہوتے ہیں۔ یہ کتاب میں نے اس اُمید کے ساتھ بنائی ہے کہ اگر اسے یونیورسٹیوں میں بطورِ کلاس روم متن استعمال کیا جائے تو طالب علم میر کے پورے شعری مرتبے اور کردار سے واقف ہو سکیں۔ اور اساتذۂ و عُلمائے اَدَب کلاسیکی اَدَب پر نئی نظر ڈالنے کی ترغیب حاصل کر سکیں۔"

اس کتاب پر تفصیلی تبصرہ کے لئے شانِ ہند کے پچاسوں صفحات بھی کم رہیں گے۔ مختصراً ہم یہ بلاخطر کہہ سکتے ہیں کہ فاروقی صاحب نے میر کے متعلق جن پانچ نکاتی پروگرام کے تحت یہ کتاب ترتیب دی ہے، اُن میں وہ سو فیصد کامیاب رہے ہیں۔ یہ کتاب ہر ایک لائبریری، خصوصاً یونیورسٹیوں اور کالجوں کی لائبریریوں کے لئے ایک نعمت سے کم نہیں ہے اور میر کے شائقین کے لئے بھی اس کا مُطالعہ ضروری ہے۔ فاروقی صاحب کو خدا عمرِ دراز دے۔ انھوں نے یہ کتاب لکھ کر ثابت کر دیا ہے کہ انہیں ساہتیہ اکادمی کا ایوارڈ اُن کی خدمات کو ملحوظ رکھتے ہوئے دیا گیا ہے، نہ کہ بعض نا اہل اور سفارشی ایوارڈ یافتگان کی طرح۔

مَن کہ مکتوب الیہ

محترمی سرور صاحب، تسلیم!

دانش محل میں "دلی کے مشاعرے" سرسری طور پر دیکھی۔ اس قدر بہترین اور کارآمد تصنیف پر دلی مبارکباد قبول فرمائیے۔ آزادی کے بعد "اردو مشاعرے" کی یہ تاریخ حقیقتاً اردو ادب میں ایک ایسا اضافہ ہے جسے گزشتہ نصف صدی کی ایک بہترین تصنیف کہا جا سکتا ہے۔

آپ کا مداح
رحمانی
قیصر باغ، لکھنؤ۔

پیارے سرور بھائی آداب!

یہ خط آپ کو ملنے تک سال ۱۹۹۰ء کا آفتاب نظروں سے اوجھل ہو جائے گا، اور آنکھ کھلتے ہی نئے سال کی تر و تازہ سحر کی سنہری کرنیں آپ کی نظروں کے سامنے نمودار ہو کر آپ کا خیر مقدم کریں گی۔

سال ۱۹۹۰ء اپنے پیچھے بڑے ہولناک اور تلاطم خیز واقعات کی دل خراش اور لرزاں چکا دینے والی داستان چھوڑ گیا ہے۔ اگر یہ کہیں کہ پورا سال ہم نے کسی غیر مستحکم، کمزور اور ناپائیدار حکومت کے سائے تلے گزارا ہے، تو مبالغہ نہ ہوگا۔ اس سال باہمی نفرت، مذہبی جنون اور نااتفاقی کے جو بیج بوئے گئے ہیں، اس کے تاثرات ۱۹۹۱ء میں کیا رنگ دکھائیں گے، یہ ابھی دیکھنے کو باقی ہے، جس کا احساس کبھی کبھی میرے ذہن کے درد و کرب میں اضافہ کر کے جسم کے رونگٹے کھڑے کر دیتا ہے!

۱۹۹۰ء میں سیاستدانوں نے جو گھنیا کھیل کھیلا ہے، ان کی اس طرز روش سے میرے جیسے ان گنت لوگوں کو شدید مایوسی ہوئی ہے۔ ملک کے حکمرانوں اور رہنماؤں میں اب فکر و فراست اور عقل و دانش کی بے حد کمی ہے، جس سے ملک کی یک جہتی اور سلامتی کو خطرہ لاحق ہو گیا ہے۔ فرقہ وارانہ فسادات، انتہا پسندوں کی بڑھتی ہوئی سرگرمیاں اور... لاقانونی کا دور دورہ... یہ سب حادثات ملک کی سرزمین پر بدنما داغ چھوڑ گئے ہیں۔ مہا کوی رابندر ناتھ ٹیگور نے کہا تھا کہ "انسانیت کا ہماری تہذیب سے اٹھ جانا ایک بہت بڑا گناہ اور ناقابل تلافی" ہمیں سیاستدانوں کے رنگ ڈھنگ سے یقیناً مایوسی ہوا ہوں، لیکن عوام میں سیاسی شعور، بیداری اور منزل کی طرف بڑھتے ہوئے قدم یقیناً سب کے لئے قابل فخر بات ہے اور یہی بات میرے بجھتے ہوئے ذہن کو روشن کئے ہوئے ہے۔ کڑشدت کی سردی اور رات کی ظلمت کے بعد پھر بہار کا موسم اپنے دامن میں رنگا رنگ پھول اور شگوفے لائے گا۔ اسی امید و اثق کے ساتھ میں اپنے دوستوں کو نئے سال کی نئی سحر کے نمودار ہونے پر دلی مبارکباد دیتا ہوں اور آپ سب کی صحت و سلامتی کے لئے دعا گو ہوں!

نیاز مند
محمود دت

لندن
۷ فروری ۱۹۹۱ء

محترمی و مکرمی سرور صاحب

دسمبر کے پرچے میں آپ کے ایڈیٹوریل نوٹ خوب جاندار ہیں۔ دوردرشن ٹی وی پر نرودھ کی اشتہار بازی کے متعلق جو بے احتیاطی برتی جا رہی ہے، اس پر آپ کا کر دھ بھی خوب جاندار ہے اور جائز بھی (گو عنوان میں کنجرپن کا طمانچہ کچھ زیادہ ہی جاندار ہے۔ کم عمر لڑکے لڑکیوں کو غیر واجب اور غیر صحت مند اثرات سے محفوظ رکھنا ٹی وی اور سرکار کا فرض ہونا چاہیئے۔ مغرب کے کھلے ماحول میں بھی اس قسم کی اشتہار بازی احتیاط سے کی جاتی ہے۔ شام ہوتے ہی والدین چھوٹے بچوں کو کھلا پلا کر سلا دیتے ہیں اور ٹی وی اسکرین پر سیکس سے متعلق پروگرام شام کے بعد ہی دکھائے جاتے ہیں۔

بلکہ تفریح طلب اور تشریح طلب سیکسی موضوعات تو جبھی زیر بحث لائے جاتے ہیں جب رات کافی جوبن پہ آچکی ہو (ویسے تو سیکس کی ابتدائی تعلیم اسکول کے نصاب کا ضروری حصہ ہے)

ہر سوسائٹی اور ملک کی اپنی اپنی تہذیبی اور اخلاقی قدریں ہوتی ہیں جن کا احترام بہر طور ہونا چاہیئے۔ دوردرشن کو اس قسم کے احترام سے گریز ہے تو آپ کا کر دھ عین بجا ہے۔

مگر بے تحاشہ بڑھتی ہوئی آبادی کے پیش نظر نرودھ کا ورود بھی تو نہیں کیا جا سکتا۔ نرودھ کا پرچار صحت مند ڈھنگ سے

... بیٹا
... کا ...
... کر ہی نے کی ... دیر میں
... ہی سہی۔
... جیون لال شرما

محترم سرور تونسوی صاحب،
تسلیمات!
... کی مبارکباد قبول فرمائیں۔
... ایک عدد قطعہ بسلسلۂ قومی
... فرمائیں۔ والسلام۔

قطعہ

... کر دیوالی یاد سہرا
... تہوار مناتے ہیں بھارتی
... دودھ سوئیاں کی مٹھائی
... کے پیار کھاتے ہیں بھارتی

عروج فیضی جھانسوی

محترم سرور صاحب، تسلیمات!
... سے جناب اودے سرن ارمان
تصنیف "کرنوں کے پرچھے" منگوائی
... شان ہند میں اس کتاب کو
... مشتمل کتاب لکھا تھا۔
... (صفحہ ۲۲)۔
... یہ کتاب سوانحی خاکوں
... کر ایک بہترین کتاب ہے۔ آدمی
... ایک دھار دھارا ، نرک
... زندگی کے ہر پہلو کو سائنسی
... دکھایا گیا ہے۔ کتاب کو بار بار
... والا نئے وچار سامنے
... ارمان صاحب کی یہ ایک اور
...

... شان ہند میں آپ ... کلام کا ... اضافہ
فرمادیں تو بہت اچھا ... ہو گا
عنوان سے۔ ... یار کو ... اور زیادہ کوئیلا
سرور صاحب، اسٹاک میں کوئی اور
اچھی کتب یا سوانح حیات آئی ہوں، بستر

بہت ... خوشی ... اور ...
کرتا ہوں۔ کوئی خدمت ہو ...
تابعدار ہوں۔
آپ کا اپنا
ہری رام ...

چالیس سال کے طویل انتظار کے بعد
سرور تونسوی کی مایۂ ناز تصنیف منصۂ شہود پر

دلّی کے مشاعرے

جسے متفقہ طور پر آزادی کے بعد اردو مشاعروں کی تاریخی دستاویز قرار دیا گیا ہے۔

سنہ ۱۹۵۰ء سے سنہ ۱۹۸۴ء تک دہلی میں ہوئے مشہور پینتیس (۳۵) مشاعروں کی آنکھوں دیکھی اور کانوں سنی روداد۔

اس روداد میں آپ کم از کم ایک ہزار سے زائد مشاہیر شعراء کا ایسا منتخب کلام پائیں گے جس میں ہزارہا اشعار تیر و نشتر کا مقام رکھتے ہیں۔

گذشتہ چالیس سالوں میں جن سینکڑوں شعرائے کرام کا انتقال ہو چکا ہے، اُن کا کلام بلاغت نظام بھی آپ اس کتاب میں پڑھ سکیں گے۔

سینکڑوں ایسے ادبی لطائف جو ان مشاعروں میں شعرائے کرام نے سنائے، آپ پڑھیں گے تو داد دیئے بغیر نہ رہ سکیں گے۔

سامعین اور شعرائے کرام کی نوک جھونک، شعراء کی بدحواسیوں، شعراء کے حسد، پنڈت ہری چند اختر کی پھلجھڑیوں اور دیگر کئی شاعرانہ اٹکھیلیوں کی دلچسپ داستان۔

۵۶۰ صفحات، ڈیمائی سائز، جلد بہترین اور پختہ۔ کاغذ، چھپائی اور کتابت شان ہند پبلیکیشنز کی مشہور روایات کے مطابق۔

قیمت ایک صد پچاس روپے۔ شان ہند کے خریداروں کے لئے پچیس روپے کی رعایت۔ اپنے ہاں کے ہر کتب فروش سے طلب فرمایئے یا ہمیں لکھیئے۔

دفتر شانِ ہند، فلیٹ ۵ انصاری مارکیٹ، دریا گنج، نئی دہلی ۲

شانِ ہند

دہلی

جلد ۵۲ شمارہ ۳

چیف ایڈیٹر
سرور تونسوی

جوائنٹ ایڈیٹر
مطرب صحرائی

اشاعت کا
۵۲ واں سال

اس شمارے کی اہم جھلکیاں

یہ بھی کہا جاتا ہے کہ مسٹر اشتیاق عابدی، مسز راجیو گاندھی کی بھی گڑ ڈیک میں تھے اور انھیں ماڈرن ہنڈ کی ایڈیٹر شپ اسی سلسلے میں عطا ہوئی تھی۔

بلبل چہ گفت... سرور تونسوی

ایک مشاعرہ تو ۱۹۰۲ء میں ایسا منعقد ہوا کہ جس کی نظیر سارے ہندوستان میں نہیں ملے گی۔
(عظیم آباد کے یادگار مشاعرے)

دیوان سنگھ مفتون اکائی نہیں، فدائی ہسیکڑہ ہزارہ ہے بلکہ لاکھ ہے۔
(دیوان سنگھ مفتون) سعادت حسن منٹو

خاتم بہار نرسٹ انبالہ کا مستحسن اقدام۔
(ادارتی شذرہ)

کوکر بیٹا (ایک انکشاف) خوف کی نگری ... ہیں، (کہانیاں)

"ماہیا" دیپک قمر ___ حقیر آستانی، ... بسمل نقشبندی، ہربھجن سنگھ سانپالی، وجاہت علی ... جگر بستوی، امتیاز بے پوری، جمشید مسرور کی غزلیں ...

باب انتقاد، من کہ مکتوب الیہ، یہ کھڑکیاں بار ...
(مستقل کالم بدستور)

پرنٹر، پبلشر، پروپرائٹر: ودّیا پرکاش سرور تونسوی
طباعت: خواجہ پریس، جامع مسجد دہلی۔ مقام اشاعت: دفتر ماہنامہ "شانِ ہند" فلیٹ ۸ انصاری مارکیٹ، دریا گنج، نئی دہلی ۲۔۰۰۔۱۱۔

ہندو پرست ہوں نہ مسلماں پرست ہوں
دامن پرست ہوں نہ گریباں پرست ہوں
ہر ذرّۂ وطن سے ہے فیاض مجھ کو پیار
یعنی وطن پرست ہوں انساں پرست ہوں

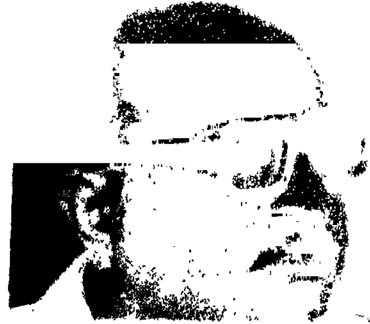
فیاض گوالیاری

قیمت فی شمارہ۔ پانچ روپے
قیمت سالانہ پچاس روپے
لائف ممبری ... روپے

ممالکِ غیر میں:۔
بذریعۂ سمندری ڈاک -/۱۰۰ روپے
بذریعۂ ہوائی ڈاک -/۲۰۰ روپے

غزل

ڈاکٹر حقیر آستانی مرحوم



طرب ہو، آشتی ہو، خود سری ہو
اور اُس پر جان لیوا برہمی ہو
تجھے محفوظ رکھیں جان و دِل سے
خدارا کہتے اگر اِس میں کمی ہو
کسی کو بے وجہ مسمار کر دیں
زیادہ گر نہیں، اِتنی تو پی ہو
وہ دِن آئے ضرور آئے خدایا
ہمیں بھی آپ کی طرح خوشی ہو
بہت ممکن ہے اِس دِل کو تڑپ کر
کسی نے دُور سے آواز دی ہو
حقیر اَب شام ہونے جا رہی ہے
تری خدمت گزاری کیا ابھی ہو؟

دلی اردو اکادمی میں سیاسی گھس پیٹھ

کیا اخبارات کے یہ بیانات وزیر اعظم مسٹر چندر شیکھر کی امیج خراب نہیں کرتے؟ کیا یہ وزیر اعظم کی سیاسی زندگی کو داغدار نہیں کرتے؟

روزنامہ قومی آواز "اشتیاق عابدی دہلی اردو اکادمی کے نئے سکریٹری" کے عنوان سے لکھتا ہے کہ:
"مسٹر چندر شیکھر کے وزیر اعظم بننے کے بعد مسٹر اشتیاق عابدی نے اردو اکادمی کے سکریٹری کے لئے تگ و دو شروع کر دی تھی۔ انتہائی باوثوق ذرائع کے مطابق اتر پردیش میں جنتادل (داس) کے لیڈر مسٹر لاری نے اس سلسلے میں نمایاں کردار ادا کیا۔ یہ مسٹر چندر شیکھر کے انتہائی قریبی بتلائے جاتے ہیں۔"
اس کا صاف مطلب یہ ہوا کہ [illegible]

[illegible] سفارش کے ذریعہ اُردو اکادمی کی سکریٹری شپ حاصل کر سکے۔ اپنی علمی، اَدبی یا اُردو پرستی کے بل بُوتے پر نہیں۔ حالانکہ اُردو اکادمی کی سکریٹری شپ ایسے شخص کو ہی دی جانی چاہیئے تھی جو اُردو کی بقاء و حیات کے ساتھ ساتھ اُردو کی ترقی کے گُر بھی جانتا ہو۔

یار لوگ باتیں بنانے میں تو آپ ہی اپنا جواب ہوتے ہیں لہٰذا یہ بھی کہا جاتا ہے کہ مسٹر اشتیاق عابدی مسٹر راجیو گاندھی کی بھی گُڈ بُک میں تھے اور انھیں ماڈرن بریڈ کی چیئرمین شپ اسی سلسلے میں عطا ہوئی تھی۔ اور اب چندر شیکھر جی کے وزیرِ اعظم بننے پر مسٹر لادی نے اپنی دوستی اور قریبی تعلّقات کی بنا پر مسٹر اشتیاق عابدی کی جھولی میں دِلّی اُردو اکادمی کی سکریٹری شپ ڈال دی۔

اشتیاق عابدی مسٹر راجیو گاندھی کی بھی گُڈ بک میں تھے اور انھیں ماڈرن بریڈ کی چیئرمین شپ اسی سلسلے میں عطا ہوئی تھی۔ اور اب چندر شیکھر جی کے وزیرِ اعظم بننے پر مسٹر لادی نے اپنی دوستی اور قریبی تعلّقات کی بنا پر مسٹر اشتیاق عابدی کی جھولی میں دِلّی اُردو اکادمی کی سکریٹری شپ ڈال دی۔

اس سے پہلے اخبارات میں آیا تھا کہ دِلّی کے لفٹننٹ گورنر جناب مارکنڈے سنگھ چونکہ وزیرِ اعظم چندر شیکھر صاحب کے کلاس فیلو اور دوست ہیں، اس لئے انھیں دِلّی کی گورنری عطا کی گئی ہے۔

کیا اخبارات کے یہ بیانات وزیرِ اعظم مسٹر چندر شیکھر کی امیج خراب نہیں کرتے ؟ کیا یہ وزیرِ اعظم کی سیاسی زندگی کو داغدار نہیں کرتے ؟ کیا مسٹر چندر شیکھر ایسا وزیرِ اعظم جو اپنی ایمانداری اور سیاسی دیانت داری کے لئے اپنی ناک پر مکھی نہیں بیٹھنے دیتا، اس قسم کی اخباری تحریروں پر خاموش رہ کر اپنی معلومات کی خود ہی تردید نہیں کر رہا ؟ حقیقت یہ ہے کہ مسٹر مارکنڈے سنگھ نے بطور لفٹننٹ گورنر اپنے پیش رؤں سے کسی طور بھی دِلّی کی کم خدمت نہیں کی۔ اور یہ بھی عین ممکن ہے کہ مسٹر اشتیاق عابدی اُردو اکادمی کو بہترین انداز میں سنبھال سکیں۔ مگر کسی سرکاری عہدے پر کسی شخص کی تقرری سیاسی طور پر وزیرِ اعظم کے ذاتی تعلقات یا سفارش انداز پر کی جائے تو عوام میں وزیرِ اعظم کی امیج کو بگاڑنے کی مُوجب ہوتی ہے۔ اور اس کے ساتھ ساتھ سرکاری عمل داری میں سیاسی دخل اندازی کو بڑھاوا دیتی ہے۔

پچھلے دنوں مسٹر راجیو گاندھی کی رہائش گاہ کے آس پاس ہریانہ پولیس کے دو کارندے مسٹر راجیو گاندھی کی نگرانی کرتے ہوئے گرفتار کئے گئے اور اس جاسوسی کانڈ کا نتیجہ یہ ہوا کہ مسٹر چندر شیکھر کی وزارت کو مستعفی ہونا پڑا اور جنتا دل (ایس) اور کانگریس (آئی) کے دوبارہ گٹھ جوڑ کے لئے کانگریس (آئی) کی طرف سے جو شرائط رکھی گئی تھیں، ان میں ایک شرط یہ بھی تھی کہ موجودہ لفٹننٹ گورنر مسٹر مارکنڈے سنگھ کو اس عہدے سے ہٹایا جائے۔

لہٰذا اس کی کیا ضمانت ہے کہ اگر ڈیڑھ ماہ انتخابات کے بعد کانگریس (آئی) اقتدار میں آتی ہے تو وہ مسٹر چندر شیکھر کے ذاتی دوست اور کلاس فیلو لفٹننٹ گورنر اور اُتر پردیش کے جنتا دل (ایس) کے لیڈر مسٹر لادی کی سفارش پر دِلّی اُردو اکادمی کے سکریٹری مسٹر اشتیاق عابدی کو سُبکدوش نہیں کریگی یا اگر بھارتیہ جنتا پارٹی اقتدار میں آتی ہے تو وہ اپنے حریف مسٹر چندر شیکھر کی ان تقرریوں کو برقرار رکھے گی۔ ؟

ہر سرکاری کارندہ حکومتِ وقت کا وفادار ہوتا ہے۔ اور اگر وہ ایسا نہیں کرتا تو پھر وہ یقینی طور پر سرکاری ذمّہ داریاں نبھانے کے قابل نہیں ہے۔ کیا ہمارے سیاسی لیڈر اس معمولی سے طریقِ کار سے بھی واقف نہیں ہیں کہ معمولی سے معمولی اور ذمّہ دار سرکاری آسامیوں پر ایسے اشخاص کی تقرری کرنے میں دلچسپی رکھتے ہیں جو اُن کے ذاتی طور پر وفادار ہوں۔

اگر یہی طریقِ کار جاری رہا تو سرکاری کارندے بھی سیاست کی دلدل میں بُری طرح پھنس جائیں گے۔ اور اس سے سرکاری کام کاج یقیناً متاثر ہوگا۔

ہم دِلی خواہش رکھتے ہیں کہ مسٹر اشتیاق عابدی اُردو اکادمی کو بہتر انداز سے ترقی و شہرت کی اُن راہوں پر گامزن رکھیں جو اُن کے پیش رو جناب نقوی صاحب متعین کر گئے ہیں۔ اور ہم یہ اپنا فرض سمجھتے ہیں کہ مسٹر اشتیاق عابدی کو ان حقائق سے بھی آگاہ کر دیں جن سے شاید وہ ناواقف ہیں۔ اور وہ

حقیقتیں یہ ہیں کہ :-

۱۔ ہندوستان میں جس قدر بھی اُردو اکادمیاں ہیں، ان سب میں کارکردگی کے لحاظ سے دلّی اُردو اکادمی اپنا جواب آپ ہے۔

۲۔ سابق سکریٹری جناب نقوی صاحب نے جس اعلیٰ انتظامی سُوجھ بُوجھ سے اکادمی کو ملک بھر میں مشہور کیا، اس کی تعریف اُتر پردیش کے سابق گورنر جناب محمد عثمان عارف نقشبندی اور دلّی کے گورنر نے فرمائی۔ جناب عارف نقشبندی نے تو یُو۔پی اُردو اکادمی کے منتظمین سے کہا تھا کہ وہ دہلی جا کر نقوی صاحب سے سیکھیں کہ اُردو اکادمی کو کس انداز سے کام کرنا چاہیئے۔

۳۔ دِلّی اُردو اکادمی ہمیشہ مذہبی تعصّب سے پاک رہی جس کا ثبوت یہ ہے کہ سنہ ۱۹۹۰ء کے ایوارڈز میں تین غیر مسلم حضرات اوّلین ایوارڈز میں شامل ہیں۔

اُمید ہے کہ آپ اپنے پیشرو کی متعین کی ہوئی راہوں پر گامزن رہنے کے ساتھ ساتھ ایسی نئی راہیں بھی تلاش کریں گے جن پر چلنے سے آپ اُردو اکادمی کی شہرت میں اضافہ اور اس کی کارکردگی کو مزید بہتر بنا کر یہ ثابت کر سکیں کہ اُتر پردیش کے جنتا دل (ایس) کے لیڈر مسٹر لالدی اور وزیر اعظم مسٹر چندر شیکھر نے آپ کا تقرر کر کے اُردو دشمنی نہیں کی ——

شامِ بہار ٹرسٹ انبالہ کا مُستحسن اِقدام

شامِ بہار ٹرسٹ، انبالہ نے اس سال اپنے سالانہ مشاعرہ کے موقع پر "ڈاکٹر اقبال اور سوامی رام تیرتھ" کے عنوان سے ایک سیمینار منعقد کرایا جس میں سامعین کی حاضری دُشمنانِ اُردو کی دھمکیوں کے باعث بے شک اُمید سے کم تھی۔ مگر سیمینار میں ڈاکٹر ہیرا لال چوپڑہ ڈی لِٹ اور سہارنپور کے ایک ہندی عالم نے جو مقالات پڑھے وہ اُن دُشمنانِ اُردو کے مُنہ پر زبردست طمانچے تھے جنھوں نے اس سیمینار اور شامِ بہار ٹرسٹ کے مشاعرہ کو ناکام کرنے کی کمینہ حرکات کیں۔ یہ سیمینار اپنے مقصد میں اتنا کامیاب تھا کہ شامِ بہار ٹرسٹ کے روحِ رواں جناب راجندر ملہوترہ کو اس مستحسن اِقدام پر اہلِ ذوق نے دِلی مُبارکباد دی۔

شامِ بہار ٹرسٹ انبالہ کے سالانہ مُشاعرہ کو برباد کرنے کے لئے دُشمنانِ اُردو نے جو حرکات کیں اُن کی تفصیل شبیر شاد کی زبانی سُنیئے :-

"ہریانہ اُردو اکادمی کے تعاوُن سے شامِ بہار ٹرسٹ انبالہ کا تیرھواں انڈو پاک مُشاعرہ یمنا نگر میں زیرِ صدارت پاکستانی سفیر عبدالستار مُنعقد ہُوا۔ مہمانِ خصوصی ہریانہ کے وزیر اعلیٰ چودھری حکم سنگھ نے شمع روشن کر کے مُشاعرہ کا افتتاح کیا۔

وزیر اعلیٰ ہریانہ اس موقعہ پر تقریر کرتے ہوئے پاکستانی و ہندوستانی شعراء کا خیر مقدم کیا اور اُردو کی خدمات کا اعتراف کرتے ہوئے کہا کہ اُردو زبان نے آزادی کے حصُول میں نمایاں رول ادا کیا۔ اُنھوں نے اس موقع پر شامِ بہار ٹرسٹ کے چیئرمین راجندر ملہوترا کو خصُوصی طور پر مُبارکباد دیتے ہوئے ٹرسٹ کے ۲۵ ہزار روپیہ دینے کا اعلان کیا۔ پاکستانی سفیر عبدالستار نے مشاعرے میں اپنی شرکت پر فخر محسُوس کرتے ہوئے کہا کہ پاکستانی شعراء اور پاکستان کے لئے جس خیر سگالی کا مظاہرہ ہریانہ میں ہے اُس کے لئے میں شکریہ ادا کرتا ہوں۔ اُنھوں نے کہا کہ شامِ بہار ٹرسٹ ہند پاک دوستی میں جو تعاوُن پیش کر رہا ہے وہ بھی قابلِ مُبارکباد ہے۔ ناظم مشاعرہ ڈاکٹر ملک زادہ منظور نے وزیر اعلیٰ ہریانہ اور پاکستانی سفیر کا شکریہ ادا کرتے ہوئے چودھری حکم سنگھ کو توجہ دلاتے ہوئے اس امر پر اظہارِ افسوس کیا کہ شامِ بہار ٹرسٹ روایتی طور پر اپنا مشاعرہ انبالہ کی سرزمین پر نہیں کر پائی۔ اُنھوں نے وزیر اعلیٰ کو بتایا کہ کچھ ناپسندیدہ حضرات نے گزشتہ سال یہ مشاعرہ نہیں ہونے دیا۔ اور اس سال تو اُن کے حوصلے اتنے بلند ہو گئے کہ اُنھوں نے مہمان شعراء کے گھیراؤ کی دھمکی دی جس کی وجہ سے مشاعرہ مجبوراً یمنا نگر میں منعقد کرنا پڑا۔ انھوں نے کہا کہ شعراء کا کام پیار اور محبت کا پیغام عام کرنا ہے اور اس پیغام پر پہرہ بٹھانے والے ملک دُشمن ہیں۔ ڈاکٹر ملک زادہ منظور نے کہا کہ ہمیں اُمید ہے کہ آئندہ سال یہ مُشاعرہ حسبِ روایت انبالہ میں مُنعقد ہوگا۔

واضح ہو کہ شامِ بہار ٹرسٹ، انبالہ کی سرزمین پر اُردو ادب کے فروغ کے لئے کوشاں ہے اور پچھلے تین سال سے باقاعدگی کے ساتھ بڑے پیمانے پر ہند پاک مُشاعرہ منعقد کرواتا ہے۔ جس میں ہندوستان اور پاکستان کے منتخب شعراء شرکت کرتے ہیں۔ گزشتہ دو سالوں سے فرقہ پرست تنظیموں سے وابستہ لوگ مشاعرہ کے خلاف آواز بلند کر رہے ہیں۔ گزشتہ سال اُنھوں نے مشاعرہ کے پنڈال میں آگ لگانے کی دھمکی دی تھی

جن کی وجہ سے مشاعرہ ملتوی کرنا پڑا تھا۔ اس سال بھارتیہ جنتا پارٹی کے انبالہ سے منتخب ممبر اسمبلی نے بھی اس مشاعرے کو بند کرنے کا مطالبہ کیا، جس سے اُن کی ذہنیت کا پتہ چلتا ہے۔ مشاعرے سے ایک روز پہلے کچھ لوگوں نے پاکستانی شعراء کے گھیراؤ کی دھمکی دی اور ڈپٹی کمشنر انبالہ نے مشاعرہ منسوخ کر دیا۔ اس مشاعرے میں پاکستانی شعراء و ادیب شرکت کے لئے پہنچے تھے یقیناً وہ اپنے ملک جا کر انبالہ میں مشاعرے کے نہ ہونے کا حالات کا ذکر بڑھا چڑھا کر پیش کریں گے اور اس طرح چند لوگوں کی وجہ سے ملک کو خواہ مخواہ رسوائی ہوگی۔ حالانکہ ہمارا ملک اور اس کی تہذیب میزبانی کے لئے تمام دنیا میں اپنی الگ پہچان بنائے ہوئے ہے۔

مشاعرے میں پاکستان سے جون ایلیا، زاہدہ حنا، شمشاد نازکی، ڈاکٹر شاہد الوری، اعجاز رحمانی، اُستاد رشید انجم، سرفراز عبد، احمد فاخر، سعادت سعید بدر، عارف لکھنوی، احسن سلیم، نازی عبدالرزاق۔ اور ہندوستان سے ڈاکٹر ملک زادہ منظور، افتخار امام، دیر دیوانہ، شبیر شاد، شمس تبریزی، ملک زادہ جاوید، تسنیم صدیقی، اعجاز پاپولر میرٹھی، ساحر خامی، سشر فتح پوری، کنور مہندر سنگھ بیدی سحر، ناشر نقوی، کشمیری لال ذاکر، میکش امروہوی کے علاوہ کینیڈا سے ولی عالم شاہین اور ڈنمارک سے شمشیر سنگھ شمشیر نے شرکت کی۔

مشاعرے میں ہندوستانی شعراء کو ہریانہ اُردو اکادمی کی جانب سے تحائف پاکستانی سفیر جناب عبدالستار کے ہاتھوں اور پاکستانی شعراء کو ہریانہ کے وزیر اعلیٰ چودھری حکم سنگھ کے ہاتھوں دیئے گئے۔



ماہیا

دیپک قمر

سُنتے ہوئے چل دی تھی
کیا جانے وہ کیا کہتا
کچھ بات نہ پوچھی تھی

باچھیں کیا کھلیں اُس کی
گھونگھٹ میں اچانک ہی
آنکھیں جو ملیں اُس کی

کیوں اچھا بُرا کہنا
سیکھا ہے فقیروں نے
ہر حال میں خوش رہنا

برسے نہ گھرے بادل
ساون کا ہے اندھا وہ
سوجھے ہے ہرا ہر پل

مت ہوا سے جھک جانا
سائے کا ہرا آنچل
چلنے پہ نہ رُک جانا

کر ٹھنڈا اسے اک دن
یہ آگ اگر سُلگی
پھونک کے بجھے اک دن

جو بول بُرا بولے
خود اپنے ہی ہاتھوں سے
اُٹھ اُٹھ کے وہ در کھولے

اچھا یا بُرا خود ہی
یہ پیار اچنبھا ہے
اپنی ہے دوا خود ہی

ہر بات نرالی ہے
خوشیاں ہیں دکھاوے کی
ہر غم بھی خیالی ہے

چُپ چاپ ڈبی جا ہیں
چوری سے چھپے ملنے
رستہ نہ کبھی تا ہیں



عظیم آباد کے یادگار مشاعرے

عطا کاکوی

مشاعرہ جس کو صحیح معنوں میں مطارحہ کہنا زیادہ موزوں ہوگا ہماری علمی اور ادبی تہذیب کا آئینہ دار رہا ہے۔ یوں تو علمی اور شعری مجلسیں ہر دور اور ہر زمانے میں ہوتی رہی ہیں مگر مصرعہ طرح دے کر شعراء کو طبع آزمائی کی دعوت دینا اور پھر ان کے کلام کی خوبیوں یا خامیوں پر نظر ڈالنا اور اس طرح اُردو زبان و ادب کی ترویج و ترقی میں ممد و معاون ہونا مشاعرہ کا خاص طرۂ امتیاز رہا ہے۔ مگر یہ اگلے وقتوں کی باتیں ہیں جب نقش جواں تھا اب نہ تو وہ مشاعرے ہیں اور نہ ان کی وہ اگلی صفتیں ہاں اب ایسی مجلسوں کو مشاعرہ نہ کہیں تو زیادہ مناسب ہوگا۔ اب مشاعروں میں نہ الفاظ کے دروبست پر نظر ہے نہ صحت محاورہ پر دھیان ہے اور نہ معنی آفرینی کی طرف توجہ ہے اور نہ ردیف و قافیہ کے باہمی ربط پر نگاہ ہے اب تو مشاعروں کو اس کی دھن ہے کہ لحن اور ترنم کے ساتھ کلام سنا دیا جائے اور سامعین اسے پر سر دُھنتے رہیں۔

خیر یہ باتیں تو غیر متعلق ہیں۔ ہمارا موضوع تو عظیم آباد کے یادگار مشاعرے ہیں۔ صفیر بلگرامی نے غلط نہیں کہا تھا کہ عظیم آباد دہلی اور لکھنؤ کے بعد اُردو کا تیسرا مرکز ہے اور اس کی تصدیق مولانا سلیمان ندوی نے بھی کی ہے مگر مجھے اختلاف یہ ہے کہ ترتیب غلط ہے۔ دہلی کے بعد لکھنؤ نہیں بلکہ عظیم آباد ہی دوسرا مرکز قرار پاتا ہے اور اس کے بعد لکھنؤ۔ اس وقت تفصیل میں جانے کا موقع نہیں۔ جب لکھنؤ میں کسی شعری مجلس کا ذکر کیا کسی ادبی انجمن کا نام و نشان بھی نہ تھا اور گھپ اندھیرا تھا اس وقت عظیم آباد میں علمی اور شعری انجمنوں میں جگنو میاں کی دُم چمکتی رہتی تھی جس کو دیکھ کر سب متحیر ہو جاتے تھے۔ لکھنؤ میں شعراء کے جگمگانے سے پہلے ہی پٹنہ میں فغاں آئے۔ ضیا استاد میر حسن آئے، شاہ گھسیٹا عشق آئے، فدا کے استاد اور راسخ آئے اور نہ جانے کتنے آئے اور یہیں پیوند خاک ہو گئے، لکھنؤ کی طرف آنکھ اٹھا کر بھی نہ دیکھا۔ دولت کی ریل پیل لکھنؤ میں آصف الدولہ کے عہد وزارت میں ہوئی۔ سونے چاندی کی نہریں بہنے لگیں، اس کے مقابلے میں عظیم آباد میں دولت و ثروت کی اتنی فراوانی تو نہ تھی مگر عالمگیر کے پوتے عظیم الشان نے اس صوبہ کو دہلی کا ہم پلّہ بنا دیا تھا۔ فارغ البالی تھی، امیرانہ ٹھاٹ تھے۔ عیش و نشاط کی محفلوں کے ساتھ ادبی اور شعری ذوق کی بھی سبیلیں جاری تھیں۔

اُردو کے قدیم تذکرے شاہد ہیں کہ یہاں اکثر و بیشتر چھوٹے اور بڑے پیمانے پر مشاعرے منعقد ہوتے رہے۔ ان سب مشاعروں کا جائزہ لینا نہ تو ممکن ہے اور نہ اس مختصر سی صحبت میں ان پر سرسری نظر ڈالی جا سکتی ہے۔ آج کی نشست میں صرف ایسے دو مشاعروں کا اور وہ بھی مختصر سا جائزہ پیش کروں گا۔ ایک مشاعرہ تو سنہ [illegible] میں ایسا منعقد ہوا جس کی نظیر سارے ہندوستان میں نہیں ملے گی۔ اور دوسرا مشاعرہ تو اس کے بیس بائیس سال بعد منعقد ہوا مگر اپنی نوعیت کا ایک معرکۃ الآرا کہا جا سکتا ہے۔

پہلا مشاعرہ بڑی شان و شکوہ سے منعقد ہوا۔

س کی نوعیت یہ ہے جیسا کہ اشتہارات سے معلوم ہوا کسی زلوی گمنام شاعر نے پٹنہ اور بہار کے شعرا کو یہ کھلا چیلنج دیا کہ یہ لوگ شاعری کیا جانیں یہاں میرے دیئے ہوئے مصرعوں پر غزلیں کہہ کر اپنی جولانی طبع کا جوہر دکھلائیں تو سمجھوں کہ شاعر ہیں۔

میرا خیال یہ ہے کہ اس گمنام و ہمی شاعر کا کوئی وجود خارجی نہ تھا۔ یہ محض بادشاہ نواب صاحب کی جودت طبع تھی وہ خود بھی شاعر تھے اور مشاعروں کے رسیا ان کے ذوقِ شاعری نے یہ گل کھلایا کہ بہار کے تمام اضلاع کے شعرا کو مجتمع ہونے کی دعوت دی اور ایک شاندار مشاعرہ پٹنہ میں منعقد ہوا جو مسلسل ایک ہفتہ تک گیا رہ بجے دن سے گیارہ بجے رات تک پورے جوش و خروش کے ساتھ چلتا رہا۔ اور کیسے نہ چلتا۔ بہاری شعراء اور خاص کر عظیم آباد کے اہلِ سخن کو چیلنج تھا۔ ان سے رنگ رنگ جیسے پہلو کی اور چھ طرحوں میں خوب خوب طبع آزمائیاں کیں۔ وہ چھ طرحیں یہ تھیں۔

(۱) ہمراہِ شبِ تار دو سر دو شمعِ سحری و شب
(۲) قد تا بقدم ہے ز لفِ سر سے پا تک
(۳) موت کا پیغام ہے اپنے لئے تاثیر کا
(۴) پُر نور صورتِ مہ و بیا روشن ہے آفتاب
(۵) جب ان کا چھپیں میری تربت بلند ہو فغاں ہو گی
(۶) ہم چھوڑ کے چلتے ہیں مُرغ سحر بانگ نہیں

[illegible] اکتوبر [illegible] کو مشاعرہ کی ابتدا ہوئی اور ایک ہفتہ تک وہ مطرحی مصرعوں پر شعرائے کرام نے اپنی جولانی طبع کے جوہر دکھلائے جن میں [illegible] اور گُنہ [illegible] کے [illegible] مشاعروں سے بھی [illegible] [illegible] باعث نواب صاحب نے اپنے [illegible] ہی سب کی خاطر [illegible] [illegible] [illegible] [illegible] عظیم آبادی [illegible] [illegible] گیاوی [illegible] عظیم آبادی [illegible] بہاری وغیرہ۔

[illegible] [illegible] اکتوبر [illegible]

میں ایک مختصر روداد شائع ہوئی۔ اسی رپورٹ کی بنیاد پر ڈاکٹر یوسف خورشیدی نے ایک کتابچہ کچھ اضافوں کے ساتھ مرتب کر کے شائع کیا۔ ضرورت ہے کہ جہاں تک ممکن ہو سکے ان ممتاز شعراء کا کلام یکجا کر کے شائع کر دیا جائے جو ان مخصوص طرحوں پر کہے گئے تاکہ اس یادگار مشاعرہ کی ایک مستقل یادگار باقی رہ جائے۔

ایک پُر لطف بات اس مشاعرہ کی یہ ہوئی کہ اس صحبت میں عظیم آباد کے ایک برگزیدہ نظم نگار فضل حق آزاد کہیں نظر نہیں آئے۔ یہ رپورٹ پائی جاتی ہے کہ افتتاحی جلسہ میں وہ مشاعرہ میں اس وقت پہونچے جب کہ شاد عظیم آبادی اپنا طویل قطعہ فنِ شاعری پڑھ رہے تھے۔ آزاد آئے، جلسہ کا رنگ دیکھا، شاد کو پڑھتے سُنا اور واپس چلے گئے۔ پھر کسی دن بھی شریک جلسہ نہ ہوئے۔ یہ بات سب کو معلوم ہے کہ اس دور میں شاد اور آزاد میں چشمک تھی بھلا آزاد کو یہ کب گوارا ہو سکتا تھا کہ شاد افتتاحی نظم پڑھیں اور وہ آزاد اس اعزاز کے مستحق نہ سمجھے جائیں یہ ہتک عزت ان کے لئے ناقابلِ برداشت تھی۔

ایک اور خصوصیت اس مشاعرہ کی یہ تھی کہ عبد الجلیل خان بانی کتب خانہ نے بھی ایک تقریر فنِ شاعری پر کی افسوس ہے کہ اس تقریر کی بھی کوئی نقل دستیاب نہیں ہے۔

یہ مشاعرہ جس کی مختصر کیفیات آپ نے سماعت فرمائی اپنی نوعیت کا واحد مشاعرہ تھا تا بخاب ایک اور مشاعرہ کی مختصر روداد دکھلا دوں۔ یہ پٹنہ سٹی میں نہیں بلکہ جدید پٹنہ بانکی پور کے ایک گھر پر منعقد ہوا۔ یہ پہلا عظیم الشان مشاعرہ تو نہ تھا پھر بھی اس کی [illegible] [illegible] تھا کہ اس میں بہار کے مقتدر اور ممتاز شعراء کے علاوہ بیرونِ بہار کے بھی شعراء کو دعوتِ سخن دی گئی تھی اور لکھنؤ اور دہلی کے اکثر شعراء شریک ہوئے جن میں سب سے ممتاز جناب سائل دہلوی [illegible]

شاد [illegible] [illegible] [illegible]

[illegible]

داغ دہلوی سے کلام سُنایا۔ یہ بدعت انہی کی دین ہے کہ اب مشاعرے میں غزلیں زیادہ تر ترنم سے پڑھی جاتی ہیں جیسے ہی سائل نے اپنا مطلع سنایا۔

سائل آیا نہ کہو معتقدِ شاد آیا
صاحبِ بابِ اثر طالبِ امداد آیا

فضل حق آزاد سامنے ہی بیٹھے تھے فرمایا کہ امداد کی جگہ آزاد بھی تو قافیہ ہو سکتا تھا اگر واجبی سمجھتے سائل نے ازراہِ انکسار فرمایا کہ چونکہ ان دونوں بزرگوں سے میرے دیرینہ مراسم تھے اس لئے ان کا ذکر کیا۔ خیر بات آئی گئی ہوئی۔ شاعر نے دو اشعار سنائے اور ایک شعر میں یہ مصرعہ بھی آگیا۔

اُنگلیاں اُٹھنے لگیں داغ کا داماد آیا

آزاد بھرے تو بیٹھے ہی تھے فوراً اعتراض کیا کہ جناب یہ محاورہ غلط استعمال کیجئے اس میں ذم کا پہلو ہے۔ یعنی برائی ظاہر ہوتی ہے نہ کہ اچھائی۔ سائل نے جواب دیا کہ میرے یہاں یعنی دلّی میں دونوں موقعوں پر بولتے ہیں گرم بحث شروع ہو گئی اور چونکہ یہ سماعت بھی تھی کہ فرہنگ اور لغات کی ورق گردانی بھی بر سرِ مشاعرہ ہوئی۔ غرض اس بات کا چرچہ مدت تک رہا اور یہ معرکتہ الآرا مشاعرہ آج بھی مشہور ہے۔

سُنا تھا کہ اس مشاعرہ کا ایک گلدستہ بھی شائع ہوا تھا افسوس کہ میری نظر سے نہیں گزرا اب یہ سب مشاعرے داستانِ پارینہ بن گئے [illegible] کے مشاعرہ کی آخری قسط میں آج غزل کے آخری شعر میں شاد نے ایک پیش گوئی کی تھی جو [illegible] ہوئی ہے

اجل کھلا دے گی سب کا تُو کسی بہانے چھپ چھپ کر
نہ ہم رہیں گے نہ تم رہو گے رہے گی یہ داستاں سب کی

اب فقط رہ جائے گی [illegible] [illegible] داستاں سدا [illegible] کہ کب تک یہ یاد رہے گی۔

ہر قسم کی [illegible] [illegible] [illegible] صاحب فرمائیے

دیوان سنگھ مفتون

سعادت حسن منٹو

لُغت میں مفتون کا مطلب "عاشق" بیان کیا گیا ہے۔ اب ذرا اس عاشقِ زار کا حلیہ ملاحظہ فرمائیے۔ ناٹا قد، بھدا جسم، اُبھری ہوئی توند، وزنی سر جس پر چھدرے کھچڑی بال جو کیس کہلانے کے ہرگز مستحق نہیں۔ اکٹھے کیے جائیں تو بمشکل کسی کنفرمڈ برہمن کی چوٹی بنے۔ گہرا سانولا رنگ، چھوٹی سی گیسی بنی داڑھی جو شاید کسی زمانے میں داڑھیوں کی لاج رکھتی ہو۔ آنکھیں بڑی چھوٹی مگر بلا کی تیز اور مضطرب۔

بحیثیت مجموعی یہ عاشقِ زار سردار۔ دیوان سنگھ مفتون ایڈیٹر ہفتہ وار "ریاست" دہلی کسی زمانے میں راجاؤں، مہاراجوں اور نوابوں کا دشمن، اُن کے راز فاش کرنے والا مداری، صحافت میں ایک نئے نظام، مگر بہت زوردار اندازِ تحریر کا مالک۔ دوستوں کا دوست بلکہ خادم، اور دشمنوں کا ظالم ترین دشمن۔ چیلن تائر کا اشتہار معلوم ہوتا ہے۔ فرق صرف اتنا ہے کہ اس اشتہار میں جو ٹائروں کی بنی ہوئی انسان نما شکل ہے، اُس کے جوڑوں میں درد نہیں ہوتا مگر دیوان سنگھ مفتون گٹھیا کا مارا ہے۔ اس کا بند بند اور جوڑ جوڑ درد کرتا ہے۔ آپ اس کے میز پر ہر وقت قلم دوات کے ساتھ کروشن سالٹ کی بوتل دیکھ سکتے ہیں۔ یہ قلمدان کا ایسا جزو بن کے رہ گئی ہے کہ بعض اوقات آپ کو ایسا معلوم ہوگا کہ دیوان سنگھ اپنا قلم روشنائی میں ڈبونے کے بدلے کروشن سالٹ میں ڈبوتا ہے اور اسی سے لکھتا ہے۔

جس طرح دیوان سنگھ مفتون کی کوئی کل سیدھی نہیں، اسی طرح اس کی تحریر کا کوئی جملہ سیدھا نہیں ہوتا۔ اَدب کا وہ جانے کب خون کر رہا ہے۔ لیکن صحافت میں اس کا وہی رتبہ ہے جو بسے سنگھ نل کے ایڈیٹر آنجہانی پی جی پارٹی میں کا تھا۔ بلکہ میں سمجھتا ہوں اُس سے بالشت بھر اونچا ہے۔

پارٹی میں صرف پولیس سے ٹکر لیتا رہا۔ دیوان سنگھ نے اپنی پہلوانی کے دم خم کئی اکھاڑوں میں دکھائے۔ بڑی بڑی ریاستوں سے پنجہ لڑایا۔ اکالیوں سے متصادم ہوا۔ ماسٹر تارا سنگھ اور سردار کھڑک سنگھ سے تلوار بازی کی۔ مسلم لیگ سے بھی کبھی لڑا۔ پولس کو تگنی کا ناچ نچایا۔ خواجہ گیسو دراز، حضرت حسن نظامی سے چشمکیں کیں۔ تیس سے کچھ اوپر مقدمے چلوائے اور ہر بار سرخرو رہا۔ لاکھوں بلکہ کروڑوں کمائے اور اُڑا ڈالے۔ مفلسی کے زمانے میں اگر کوئی دوست آیا تو چٹکیوں میں چار سو بیس کر کے روپیہ حاصل کیا اور اُس کی تواضع پر خرچ کر دیا۔ جیبیں لبالب بھری ہونے پر موٹر کی ہیڈ لائٹس میں ننگی عورتوں کا رقص دیکھا۔ اور اپنے دوستوں کو دکھایا۔ آپ کم پی — اپنے یاروں کو جی بھر کے پلائی۔

دیوان سنگھ مفتون اکائی نہیں، دہائی، سینکڑہ، ہزار ہے، دس ہزار ہے، بلکہ لاکھ ہے

وہ ایک عجائب گھر ہے جس میں سینکڑوں، بلکہ ہزاروں نادر دستاویزات مقفل پڑی ہیں۔ وہ ایک بینک ہے جس کے لیجروں میں کروڑوں کا حساب درج ہے۔ وہ اسکاٹ لینڈ یارڈ ہے، جس میں لاکھوں جرائم پیشہ انسانوں کے خفیہ حالات موجود ہیں۔

اگر وہ امریکہ میں ہوتا تو وہاں کا سب سے بڑا "گینگسٹر" ہوتا۔ کئی اخبار اُس کے تابع ہوتے۔ بڑے بڑے یہودی سرمایہ دار اس کے ایک اشارے پر ناچتے۔ وہ رابن ہُڈ کا بھی باپ ہوتا۔ مفلسوں کے لئے اس کی تجوریاں ہر وقت کھلی ہوتیں۔

آپ مفتوں کو دیکھئے گا تو اسے معمولی سا پڑھا لکھا ادھیڑ عمر کا سکھ سمجھیں گے۔ لیکن وہ بہت پڑھا لکھا ہے۔ ایک دن میں نے اُنھیں "ریاست" کے خوبصورت پیازی رنگ کے کارڈوں پر دستخط کرتے دیکھا۔ کارڈوں کی دو تین ڈھیریاں لگی تھیں۔ میں نے ایک کارڈ اُٹھا کر ٹائپ شدہ عبارت پڑھی۔ بیرونی ملک کی کسی فرم سے فہرست بھیجنے کی درخواست کی گئی تھی۔ سب کارڈ اسی مضمون کے تھے۔ مجھے بہت حیرت ہوئی کہ اتنی فہرستیں منگا کر سردار صاحب کیا کریں گے۔ میں نے پوچھا "مفتوں صاحب کیا آپ کوئی اسٹور کھولنے والے ہیں؟" سر کو سکھوں کے مخصوص انداز میں ایک طرف جھٹکا دے کر مفتوں خوب ہنسا۔ "نہیں منٹو صاحب میں یہ فہرستیں منگا رہا ہوں کہ مجھے ان کے مطالعہ کا شوق ہے۔"

میری حیرت میں اور اضافہ ہو گیا۔

"آپ مطالعہ فرمائیں گے۔ یعنی فہرستوں کا۔ حاصل کیا ہوگا؟"

"معلومات! میں اپنی معلومات میں اسی طرح اضافہ کیا کرتا ہوں۔"

"آپ کی ہر بات سب سے نرالی ہے۔"

"ڈنلپ کمپنی کیا بناتی ہے؟" ایک دم مجھ سے سوال کیا گیا۔

میں نے عجلت سے جواب دیا "ٹائر۔"

اس پر مجھے بتایا گیا کہ ڈنلپ کمپنی صرف ٹائر ٹیوب ہی نہیں بناتی، اور ہزاروں چیزیں بناتی ہے۔ صاف بال، ربڑ کے گدے تکیے، ربڑ اسپرنگ، نلکیاں، ہوز پائپ اور خدا معلوم کیا کیا۔ جب فہرستیں آتی ہیں تو وہ ہر ایک کا بغور مطالعہ کرتا ہے۔ اسی لئے میں نے کہا ہے کہ سردار دیوان سنگھ مفتوں بہت پڑھا لکھا آدمی ہے۔ وہ تمام فہرستیں پڑھتا ہے۔ جب بیکار ہو جاتی ہیں تو محلے کے بچوں میں تقسیم کر دیتا ہے کہ وہ تصویریں دیکھیں اور خوش ہوں۔ بچوں سے اُسے بہت پیار ہے۔

بیرونی ممالک کے کارخانوں کی فہرستیں پڑھ پڑھ کر وہ اپنے پرچے کے زوردار اداریے لکھتا ہے۔ "ناقابلِ فراموش" کا ناقابلِ فراموش کالم لکھتا ہے۔ سوالوں کے "ٹیڑھے" جواب دیتا ہے اور فصاحت و بلاغت کا ہر جگہ خون کرتا ہے۔

بہت بدخط ہے۔ جس طرح وہ آپ ٹیڑھا میڑھا ہے، اسی طرح اس کے قلم سے نکلے ہوئے حروف ٹیڑھے میڑھے ہوتے ہیں۔ مجھے حیرت ہے کاتب اس کا لکھا ہوا کیسے پڑھتا ہے۔ مجھے جب بھی اس کا خط آیا میں نے اندازاً اس کا مطلب نکالا۔ دوسری مرتبہ غور سے "ڈی سائفر" کر کے پڑھا تو معلوم ہوا کہ میں نے پہلی نظر میں جو مطلب اخذ کیا تھا، بالکل غلط تھا۔ تیسری دفعہ پڑھا تو حروف اپنی صحیح شکل اختیار کرنے لگے۔ چوتھے مرحلے پر بالآخر عبارت مکمل طور پر روشن ہوئی۔

دیوان سنگھ مفتوں بہت محتاط آدمی ہے۔ محاورہ ہے دودھ کا جلا چھاچھ پھونک پھونک کر پیتا ہے۔ چھاچھ کے علاوہ وہ پانی بھی پھونک پھونک کر پیتا ہے۔ کاتب کو ہدایت ہے کہ جب اس کی لکھی ہوئی سلپیں پیلے کاغذ پر منتقل ہو جائیں تو فوراً واپس کر دی جائیں۔ کتابت شدہ ٹکڑوں میں اغلاط لگانے کے بعد وہ میز پر پڑی ہوئی کالی صندوقچی کھولے گا اور اس میں تمام سلپیں ڈال کر اس کو مقفل کر دے گا۔ اور جب پرچہ چھپ کر آ جائے گا تو اپنی تحریروں کو تلف کر دے گا۔ معلوم نہیں یہ احتیاط کیوں برتی جاتی ہے۔

اس کی ساری ڈاک ایک تھیلے میں مقفل ہو کر آتی تھی۔ اُسے کھول کر وہ ایک ایک خط، ایک ایک اخبار باہر نکالے گا اور ترتیب وار میز پر رکھتا جائے گا۔ لفافہ کھول کر خط نکالنے کے بعد وہ لفافہ ردی کی ٹوکری میں نہیں پھینکتا، بلکہ خط کے ساتھ پن لگا کر نتھی کر دیتا ہے۔ اسی طرح وہ رسالوں اور اخباروں کے "ریپر" بھی ضائع نہیں کرتا۔ میں نے اس طرزِ عمل کے متعلق پوچھا تو جواب ملا "احتیاط ہر حالت میں اچھی ہوتی ہے۔ ہو سکتا ہے میں کسی اخبار یا رسالے کے متعلق مقدمہ دائر کرنا چاہوں۔ اب قانون یہ ہے کہ اگر لاہور کے کسی اخبار نے میرے خلاف لکھا ہے اور "ریپر" جس پر میرا نام اور پتہ موجود ہے، میں پیش نہیں کر سکتا تو مقدمہ صرف لاہور ہی میں چل سکتا ہے۔ بصورتِ دیگر یہ "ریپر" اس بات کا ثبوت ہوگا کہ میری بے عزتی یہاں دہلی میں ہوئی ہے جہاں مجھے یہ پرچہ ارسال کیا گیا ہے۔ اس لئے میں یہاں دہلی کی عدالت میں دعوے دائر کر سکتا ہوں۔"

دیوان سنگھ مفتوں پر جو آخری مقدمہ (غالباً تینتیسواں) چلا، بہت خطرناک تھا۔ وہ اور ایک بنگالی بلاک میکر جعلی نوٹ بنانے کے الزام میں ماخوذ تھے۔ میں ان دنوں بمبئی میں تھا۔ ایک دن مجھے "مسعود وکیل" کی معرفت ایک ٹائپ کیا ہوا خط ملا جس پر کوئی دستخط نہیں تھے۔ ٹائپ میں دیوان سنگھ مفتوں نے لکھا تھا۔ مجھ سے درخواست کی گئی تھی کہ میں گواہ کے طور پر پیش ہوں۔

عرصہ ہوا میں دہلی گیا تھا اور اُن کی خدمت میں حاضر ہوا تھا۔ میں دفتر پہنچا تو وہاں کوئی بھی نہیں تھا۔ میں ایک کرسی پر بیٹھ گیا اور کمرے کا جائزہ لینے لگا۔ بہت بڑا [illegible] جس کے دونوں طرف دریچوں پر پردے تھے۔ قلمدان کے پاس کروشن سالٹ کی دو بوتلیں تھیں۔ ایک کونے میں پردے کے پیچھے صوفہ نما چیز تھی جس پر غالباً دیوان صاحب استراحت فرماتے ہوں گے۔ سب الماریاں کھلی تھیں۔

میں نے یہ اور دوسری تفصیلات [illegible] میں ایک مضمون کی صورت میں شائع کی تھیں اور کہا تھا کہ اگر اس کمرے میں چھوٹا سا کیمرہ فٹ کیا

دیا جاتا جس میں کھود ہوتا تو یکرو کسی ریل کا بہت بڑا اڈہ دکھائی دیتا۔

دیوان صاحب نے یہ مضمون سنبھال کے رکھا ہُوا تھا۔ جب پولیس نے چھاپا مار کر اُس کمرے کی الماری سے ایک کتاب میں رکھے ہوئے سو سو کے چھ (غالباً) نوٹ نکالے اور سردار صاحب کی گرفتاری عمل میں آئی تو انھوں نے مجھے صفائی کے گواہوں میں رکھ لیا۔ اس مضمون سے اور میری گواہی سے یہ ثابت کرنا مطلوب تھا کہ اُن کے دفتر میں کوئی بھی شخص بے روک ٹوک آجا سکتا ہے۔

میرا خیال ہے نئی دہلی میں دیوان صاحب سے اپنی اس مُلاقات کے بارے میں بھی کچھ لکھ دوں کہ یہ خاصی دلچسپ تھی۔ دیر تک انتظار کرنے کے بعد جب وہ نہ آئے تو میں چلا گیا۔ شام کو آیا تو وہ دفتر میں موجود تھے۔ مجلس ٹائر کا اشتہار کرسی پر بیٹھا تھا۔ سر پر چھوٹی سی سفید پگڑی، قلم انگلیوں میں دبائے کچھ لکھ رہے تھے۔ چشمے کے شیشوں کے پیچھے آنکھیں ایک عجیب انداز میں اُوپر کر کے مجھے دیکھا اور یوں اُچھلے جیسے ربڑ کی ٹھوس گیند اچھلتی ہے۔ مجھ سے، "گُڈ گُڈ جیجا ں پالیں" یعنی بڑی گرمجوشی سے بغلگیر ہوئے اور کہا "مجھے معلوم ہوا تھا کہ آپ آئے تھے۔ میں ایک ضروری کام سے باہر گیا ہُوا تھا۔"

مجھے بیٹھنے کو کہا۔ بیٹے کے حالات پُوچھے۔ اِدھر اُدھر کی باتیں شروع کیں۔ مگر میں سوچ رہا تھا کہ وہ مجھ سے متوجہ تو ضرور ہیں، مگر ان کا دماغ کچھ اور سوچ رہا ہے۔ باتیں کرتے کرتے اُنھوں نے ٹیلیفون کا ریسیور اُٹھایا اور نمبر ملا کر دُوسرے سرے والے سے کہا۔ "میں سُندر لال بول رہا ہوں۔ نئی دہلی سے۔ لال... ہیں؟ — کہاں گئے؟ — اچھا..."

آپ کا دفتر پُرانی دلّی میں تھا اور یہ بھی ظاہر ہے کہ سُندر لال نہیں بول رہا تھا۔ دیوان سنگھ مفتون بول رہا تھا۔ دوران گفتگو میں آپ نے کئی مرتبہ اسی طرح مختلف نمبر ملائے اور مختلف ناموں سے لالہ ——— کے متعلق پُوچھا کہ وہ کہاں ہیں۔

معلوم نہیں کیا چار سو بیس تھی لیکن مجھے یقین تھا کہ اس لالے کی شامت آگئی ہے یا عنقریب آنے والی ہے۔

ٹیلیفون کے ذریعہ سے جب کچھ پتہ چلائے نہ چلا تو انہوں نے سولہویں مرتبہ مجھے بیئر کی دعوت دینے کے بعد اپنے خاص آدمی (غالباً سردار دریام سنگھ) کو آواز دے کر بُلایا، اُس کے کان میں ہولے سے کچھ کہا اور رُخصت کر دیا۔ پھر مجھ سے مخاطب ہوئے "ہاں منشی صاحب، تو بیئر منگواؤں آپ کے لئے۔"

میں نے جھنجلا کر کہا "سردار صاحب! زبانی جمع خرچ آپ نے آخر سیکھ ہی لیا دلّی والوں سے۔ منگوائیے۔ منگواتے کیوں نہیں۔" یہ سُن کر دیوان صاحب خوب کھل کر ہنسے اور اہالیانِ یُو پی کو بے نقط سُنانے لگے۔ انسانوں کی اس قسم سے ان کو خدا واسطے کا بیر ہے۔ چنانچہ جب بھی انھیں اپنے دفتر میں کسی ملازم کی ضرورت ہوتی ہے تو اشتہار میں یہ بات خاص طور پر لکھی ہوتی ہے کہ صرف پنجابی درخواست بھیجیں۔ لیکن عجیب بات ہے کہ آپ احسان بھیّا کو اپنا بہترین دوست تصور کرتے ہیں اُن کے دل میں یو پی کے اس باشندے کا بہت احترام ہے۔

ایک مرتبہ دیوان صاحب کو اپنی موٹر ایک تنگ بازار سے گزارنا تھی۔ موڑ مڑے تو سڑک کے عین بیچ کئی چارپائیاں بھی دکھائی دیں۔ آپ آگ بگولا ہو گئے۔ لگے دلّی والوں اور ان کے پشت پشت کو بے نقط سنانے۔ "کم بختو۔ تمہارے اسلاف تمہارے آبا و اجداد نے بھی اسی طرح چارپائیوں پر دن رات سو سو کر اپنی سلطنت کا بیڑہ غرق کیا تھا۔ اب تمہارے پاس کیا رہ گیا ہے جس کا بیڑہ غرق کرو گے۔ خدا تمہارا بیڑہ غرق کرے۔"

ایک لڑکے نے چارپائی اُٹھانے کی کوشش کی مگر اس سے نہ اُٹھی۔ دیوان صاحب موٹر سے نکلے اور چارپائی کو اُٹھا کر پھینک دیا۔ "برخوردار، تم سے نہ اُٹھتی۔ اپنی کمر یا دیکھو۔ تمہارے والدِ بزرگوار یقیناً تم سے بھی کہیں زیادہ نازک ہوں گے۔ اُن سے تو پہنچائے جاتے وقت لوٹا بھی نہ اُٹھایا جاتا ہوگا۔"

اس پر بہت سے لوگ جمع ہو گئے۔ انھوں نے کرخندار دوں کی زبان میں واہی تباہی بکنا شروع کیا۔ مگر دیوان صاحب نے جیسے کچھ سُنا ہی نہیں، موٹر میں آرام سے بیٹھے اور چلانا شروع کر دی۔

سردار صاحب کو پنجابی بہت پسند ہیں۔ شاید اس لئے کہ وہ ایک زمانے سے دہلی میں قیام پذیر ہیں۔ ورنہ یہ حقیقت اُن کی نظروں سے اوجھل نہیں کہ صرف پنجابی ہونا اچھے انسان کی دلیل نہیں وہ سینے پر ہاتھ رکھ کر یہ کبھی نہیں کہہ سکتے کہ اپنے دفتر کی مُلازمت کے سلسلے میں پنجابی کی قید لگا کر اُنہوں نے ہمیشہ فائدہ اُٹھایا۔ کیونکہ میں اچھی طرح جانتا ہوں کہ جتنا نقصان اُن کو پنجابیوں نے پہنچایا ہے اس کا عشر عشیر بھی یو پی کے رہنے والوں نے نہیں پہنچایا۔

اب میں اُن کے آخری اور خطرناک مقدمہ کی طرف لوٹتا ہوں۔ میں دہلی گیا۔ سردار صاحب ضمانت پر رہا تھے۔ معلوم ہُوا کہ اُن کو تنگ کرنے کے لئے اُن کے مقدمے کی سماعت دہلی سے بہت دور گوڑگانوہ کی ایک عدالت میں ہو رہی ہے۔ ہم وہاں موٹر میں گئے۔ وکیل نے مجھے سمجھا دیا تھا کہ مجھے کیا کہنا ہے۔ چنانچہ میری گواہی دس منٹ کے اندر اندر ختم ہو گئی۔

سردار صاحب کو اپنا تحریری بیان پیش کرنا تھا۔ جب سوالات میں نے تو آپ نے اس کے نوٹ لے لئے تھے۔ اب یہ چھوٹے ٹائپ میں غالباً چالیس پچاس صفحات پر پھیلا ہُوا تھا۔ میں نے اسے جستہ جستہ دیکھا اور میرا ذہن فرانس کے مشہور مصنف ایمیل زولا کے شہرۂ آفاق مضمون "J'accuse" کی طرف منتقل ہو گیا۔

دیوان سنگھ مفتون کا یہ بیان مُلزم کا صفائی کا بیان نہیں تھا۔ بلکہ فردِ جرم تھی حکومت اور اس کے کارندوں کے خلاف۔ آخر میں انھوں نے اپنے مقدمات کی فہرست لگا رکھی تھی۔ ہر صفحہ پر مختلف خانے بنا کر یہ واضح کیا گیا تھا کہ کونسا مقدمہ کہاں

چلا، کس کی ایما پر چلا، کس عدالت میں پیش ہُوا اور اس کا کیا فیصلہ ہُوا۔

غالباً بتیس مقدمے تھے۔ ان میں سے اکتیس میں وہ باعزت طور پر بری ہوئے تھے۔ صرف ایک مقدمہ تھا۔ بہت بڑا اور بہت مشہور مقدمہ (جو نواب بھوپال نے اُن پر چلایا تھا) جس میں اُن کو شاید صرف اس عرصہ کی سزائے قید دی گئی تھی جو اُنھوں نے حوالات میں گزارا تھا۔

سردار صاحب نے فاضل جج کے یہ الفاظ خاص طور پر اپنے بیان میں درج کئے ہوئے تھے "میں سردار دیوان سنگھ مفتون ایڈیٹر "ریاست" دہلی کی ہمت کی داد دیتا ہوں جو اپنے محدود ذرائع کے باوجود طویل عرصہ تک ایک شہزادے کا ڈٹ کر مقابلہ کرتا رہا۔"

نواب بھوپال سے سردار دیوان سنگھ مفتون واقعی بہت دلیری اور ثابت قدمی سے لڑا۔ لیکن اس جنگ میں اس کا دیوالہ پٹ گیا۔ جو جمع پونجی تھی سب پانی کی طرح بہہ گئی۔ کوئی اور ہوتا تو اس کی ہمیشہ ہمیشہ کے لئے کمر ٹوٹ جاتی، مگر مفتون نے حوصلہ نہ ہارا اور جوں توں اپنا پیارا پرچہ "ریاست" شائع کرتا رہا۔ اُس نے بڑے بڑے آدمیوں سے مقابلہ کیا اور فتح حاصل کی۔ لیکن اپنی زندگی میں ایک آدمی سے شکست بھی کھائی۔ کس سے؟ خواجہ حسن نظامی سے۔

سردار صاحب نے ایک دن زِچ ہو کر مجھ سے کہا "میں نے بڑی بڑی قطب صاحب کی لاٹوں کو جھکا دیا مگر یہ کمبخت حسن نظامی مجھ سے نہیں جھکایا جا سکا۔ جنٹو صاحب میں نے اس شخص کے خلاف اتنا لکھا ہے کہ اگر ریاست کے وہ تمام پرچے جن میں یہ مضامین چھپتے رہے ہیں اس پر رکھ دیئے جائیں تو اُن کے وزن ہی سے اس کا کچومر نکل جائے۔ لیکن اُلٹا میرا کچومر نکل گیا ہے حالانکہ میں نے اس کے خلاف اس قدر لکھا کہ میں چاہتا تھا وہ ہتک عزت کے قانون کو پکارے۔ کسی عدالت میں مقدمہ پیش ہو اور میں وہاں اُس کے ڈھول کا پول کھول کے رکھ دوں۔ مگر وہ بڑا کائیاں ہے۔ اس نے مجھے کبھی ایسا موقع نہیں دیا اور نہ دے گا۔"

یہ عجیب بات ہے کہ کبھی زمانے میں سردار دیوان سنگھ مفتون اور خواجہ حسن نظامی میں گاڑھی چھنتی تھی۔ معلوم نہیں کس بات پر وہ ایک دوسرے سے الگ ہوئے۔

میں پھر مقدمے کی طرف آتا ہوں۔ گوڑ گانواں کی عدالت نے ان کو غالباً دو دفعات کے ماتحت ۱۲، ۱۲ برس قید با مشقت کی دو سزائیں دیں۔ سردار صاحب نے گوڑ گانواں ہی میں کہا تھا کہ یہاں کا مجسٹریٹ مجھے کڑی سے کڑی سزا دے گا۔ چنانچہ ایسا ہی ہُوا لیکن اُنھوں نے مجھے تسلی دی تھی کہ متفکر ہونے کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔ ہائی کورٹ میں صاف بری ہو جاؤں گا یہ بھی صحیح ثابت ہُوا۔

ہائی کورٹ میں انھیں باعزت طور پر بری کر دیا گیا۔

سردار صاحب نے مجھ سے گوڑ گانواں میں کہا تھا کہ وہ کچھ عرصہ پہلے شملہ میں تھے۔ وہاں ایک پارٹی تھی جس میں اس زمانے کے چیف جسٹس سر ڈگلس ینگ بھی تھے۔ وہ اس کے خلاف بہت کچھ لکھ چکے تھے۔ سردار صاحب کو حیرت ہوئی جب سر ڈگلس نے اُن سے ملنے کی خواہش ظاہر کی۔ بہرحال ان دونوں کی ملاقات ہوئی اور چیف جسٹس نے اُن کے قلم کی توانائی کی بہت تعریف کی اور کہا "میں ایسے آدمیوں کا دوست ہوں۔ اگر کبھی تمہارے کام آ سکا، تو یقین مانناکہ میں تمہاری ضرور مدد کروں گا۔"

جہاں تک میں سمجھتا ہوں سر ڈگلس ینگ کے اس وعدے کو سردار دیوان سنگھ کی بریت میں کافی دخل ہونا چاہیئے۔ مقدمہ دیر تک چلتا رہا۔ دیوان صاحب جیل میں تھے۔ اس مقدمے کی رُوداد بڑی دلچسپ تھی۔ استغاثہ کی طرف سے یہ کہانی پیش کی گئی تھی کہ دیوان سنگھ نے کچھ جعلی نوٹ چلانے کی خاطر اپنے دوست جیون لال مٹو کو ایک لفافہ میں لاہور بھیجے تھے جو راستے ہی میں پولیس نے اپنے قبضہ میں لے لئے۔ لفافے میں ٹائپ کیا ہوا ایک خط بھی تھا۔ یہ ثابت کرنے کے لئے کہ یہ خط دیوان صاحب نے اپنے دفتر کے ٹائپ رائٹر پر تیار کیا تھا۔ عدالت میں اسے پیش بھی کیا گیا۔ جس میں حرف "او" اور "بی" کے پیٹ کثرتِ استعمال سے بھر گئے تھے۔

ہائی کورٹ میں جب پیش کردہ ٹائپ رائٹر کی تحریر کا نمونہ لیا گیا تو "او" اور "بی" کے پیٹ بالکل صاف تھے۔ اس کے علاوہ جب وکیل صفائی کی طرف سے یہ استفسار کیا گیا کہ لفافہ جو کہ بقول استغاثہ دیوان سنگھ مفتون نے جیون لال مٹو کو بھیجا، اس پر دہلی کے ڈاک خانے کی مہر ۱۱ جنوری کی تاریخ بتاتی ہے اور لاہور کے ڈاکخانے کی مہر ظاہر کرتی ہے کہ یہ لفافہ ۱۵ جنوری کو ڈیلیور ہُوا۔ گیارہ تاریخ کو چلا ہُوا لفافہ مکتوب الیہ کو زیادہ سے زیادہ ۱۲ تاریخ کی صبح کو مل جانا چاہیئے تھا۔ (تاریخیں غلط ہیں اصل تاریخیں مجھے یاد نہیں) تین دن یہ لفافہ کہاں بھٹکتا رہا۔

یہ سوال اُٹھنا تھا کہ ایک ہنگامہ برپا ہو گیا۔ استغاثہ اس کا کوئی معقول جواب نہ دے سکا اور آئیں بائیں شائیں کرتا رہا۔ یہ نکتہ ملزم کو شک کا فائدہ دینے کے لئے کافی تھا۔ چنانچہ دہلی میں (ان دنوں میں آل انڈیا ریڈیو میں ملازم تھا) اخباروں میں یہ خبر دیکھی کہ سردار دیوان سنگھ مفتون ایڈیٹر "ریاست" دہلی جعلی نوٹ بنانے کے مقدمہ میں صاف بری کر دیئے گئے ہیں۔ دوسرے دن صبح آٹھ نو بجے کے قریب حسن بلڈنگز نکلسن روڈ کے فلیٹ نمبر ۹ (میں یہاں رہتا تھا) کے دروازے پر دستک ہوئی۔ میری بیوی نے دروازہ کھولا۔ معلوم ہُوا کہ دیوان صاحب ہیں۔ میں نے دوڑ کر اُن کا استقبال کیا۔ اُنھوں نے مجھے بازوؤں میں لے لیا اور گھٹ گھٹ کر جپھیاں پائیں۔ پیشتر اس کے کہ میں اُنھیں مبارکباد دیتا، اُنھوں نے مجھ سے کہا "سُبحان اللہ، لطف آ گیا۔"

میں نے اُن سے پوچھا "کس بات کا؟"

~~آپ نے جواب دیا "میں نے جیل میں آپ~~ کی کتاب "دھوئیں" کے افسانے پڑھے۔ اُس کا انتساب خوب تھا۔ اخبار دین و دنیا کے نام جس نے میرے خلاف سب سے زیادہ گالیاں چھاپی ہیں۔" آپ

پھر دہلی آیا ہوں۔ میں نے سوچا سب سے پہلے جا کر منٹو صاحب کو داد دینی چاہیئے۔"

اس سے مجھ پر ثابت ہوا کہ فنِ لطیفہ اُن میں بدرجۂ اتم موجود ہے۔

ٹائپ رائٹر میں 'او' اور 'بی' کی کیز کیسے تبدیل ہوئیں۔ لفافہ اتنی دیر کے بعد کیوں ڈلیور ہوا۔ یہ ایک راز ہے جو سدا راز رہے گا۔ جب میں نے اُن سے اس بارے میں پوچھا، تو وہ یہ کہہ کر ٹال گئے: "منٹو صاحب، یہ ہاتھ کی صفائی ہے۔"

ہاتھ کی صفائی ہو یا پاؤں کی، استغاثہ کی طبیعت یقیناً صاف ہو گئی تھی۔ دیوان صاحب کو مجھ سے پیار ہے۔ مولانا چراغ حسن حسرت کا وہ احترام کرتے ہیں۔ ہم دونوں دہلی میں تھے۔ اُن کو جب بھی ضرورت ہوتی ہمیں ڈھونڈ نکالتے اور کبھی دُور دراز خاموش مقام پر لے جاتے۔ وہاں ہم سب بیٹھ کر پیتے، گپیں لڑاتے، پھر وہ ہم دونوں کو گھر چھوڑ جاتے۔ ایسی نشستوں میں کوئی سیاسی یا ادبی بات نہیں ہوتی تھی۔

ایک لطیفہ سنیئے جو انھوں نے خود مجھے سنایا۔ انتہائی مفلسی کے دن تھے کہ اُن کا ایک دوست آن وارد ہوا۔ پہلے تو وہ بہت سٹپٹائے کہ جیب میں ایک دھیلا بھی نہیں تھا، لیکن فوراً اُن کو ایک ترکیب سوجھی۔ بارہ لیمن کی بوتلیں منگوائیں۔ دو دوست کو پلائیں، دو خود پیں۔ باقی آٹھ غسلخانے میں خالی کر دیں اور نوکر سے کہا جاؤ یہ بارہ خالی بوتلیں بیچ آؤ۔ جنگ کا زمانہ تھا۔ گولی والی بوتلیں اچھے دام لے آئیں۔ چنانچہ دوست کو رات کا کھانا کھلانے کا مسئلہ حل ہو گیا۔ دوسرے تیسرے روز انھوں نے دوکاندار کو بارہ بوتلوں کی قیمت ادا کر دی۔

ایک زمانہ آیا کہ وہ آل انڈیا ریڈیو کے جانی دشمن ہو گئے۔ بس پھر کیا تھا۔ ہر پروگرام سنتے ایک رجسٹر تھا جس میں کئی خانے بنے تھے اس میں درج تھا کہ ریڈیو کے کس افسر کا کس گانے والی سے ٹانکا (یہ لفظ اُن کی خاص ایجاد ہے) ہے۔

اگر کوئی گانے والی کسی پروگرام میں شریک نہ ہو سکتی اور اس کی جگہ کسی اور گانے والی کو گوایا جاتا تو اُن کو فوراً معلوم ہو جاتا کس افسر کی مہربانی ہوئی ہے۔

بہت دیر تک وہ ذوالفقار بخاری کے خلاف لکھتے رہے۔ آخر جگل کشور (حال، احمد سلمان ڈپٹی ڈائریکٹر جنرل ریڈیو پاکستان) پر بل پڑے۔ جگل کشور پہلے کلکتہ میں تھے۔ دہلی تبدیل ہو کر آئے تو اُن کو وہاں کی ایک بنگالن نے محبت نامے بھیجنے شروع کر دیئے۔ جگل کو حیرت تھی کہ یہ خط میرے پاس نہیں پہنچتے، مفتون کو ملتے ہیں۔ یہ بھی غالباً ہاتھ کی صفائی تھی۔ بہرحال میں نے منت خوشامد کر کے جگل صاحب کی گلو خلاصی کرائی اور اُن سے درخواست کی کہ بنگالن کے خطوط دے دیجئے۔ آپ نے مسکرا کر کہا:-

"میں اتنا بے وقوف نہیں۔ اگر آپ کا دوست یہ خط پڑھنا چاہتا ہے تو میں نقل کرا کے اُس کو بھجوا دوں گا۔" میں نے زیادہ زور دینا مناسب نہ سمجھا۔

دہلی میں ایک شخص جو امرتسر کا یعنی میرا ہم شہر تھا سخت پریشانی کے عالم میں میرے پاس آیا۔ اُس کا چھوٹا بھائی ایک لڑکی کو بھگا کر دہلی لے آیا تھا۔ اُس کے وارنٹ گرفتاری جاری ہو چکے تھے۔ وہ اس معاملے کو سلجھانے کے لئے میری مدد چاہتا تھا۔ میں اُسے دیوان صاحب کے پاس لے گیا۔ انھوں نے سارا ماجرا سُن کر حکم دیا کہ اغوا کرنے والے اور مغویہ کو میرے پاس لاؤ۔ دوسرے دن دیوان صاحب سے ملاقات ہوئی تو انہوں نے مجھ سے کہا "وہ لوگ آ گئے تھے، میں نے سب ٹھیک کر دیا ہے"! ـــ سب ٹھیک کر ہی دیا ہوگا ورنہ وہ شخص میرے پاس دوبارہ ضرور آتا۔

دیوان سنگھ کی معلومات کے ذریعے بہت وسیع ہیں۔ پاکستان میں کسی کے فرشتے کو بھی معلوم نہیں تھا کہ قائد اعظم زیارت میں خطرناک طور پر علیل ہیں۔ لیکن "ریاست" میں اس مضمون کا ایک نوٹ گو بہت ہی دلآزار، دو ہفتے پہلے شائع ہو چکا تھا جس میں دیوان صاحب نے اپنے مخصوص ظالمانہ انداز میں لکھا تھا کہ:-

"قائد اعظم محمد علی جناح بسترِ مرگ پر ہیں لیکن میری دُعا ہے کہ وہ زندہ رہیں اور پاکستان کو تباہ و برباد ہوتا اپنی آنکھوں سے دیکھیں۔"

اب ریاستیں نہیں رہیں۔ راجے ہیں نہ مہاراجے جو اس کے دل پسند کھلونے تھے۔ مگر سردار دیوان سنگھ مفتون نے یقیناً اور کھلونے ڈھونڈ لئے ہوں گے۔ راجہ نہیں ہوگا، کوئی وزیر ہوگا ـــ مہارانی نہیں ہوگی تو کسی بہت بڑے سرمایہ دار کی کشتی کھینے والی دھرم پتنی ہوگی۔ مفتون کا جنون کیسے فارغ بیٹھ سکتا ہے۔

غزل

جس دل میں تری یاد اُجالوں کی طرح ہے
کیوں اُس کی سحر آج بھی شاموں کی طرح ہے
وہ بات جو ٹوٹے ہوئے رشتوں کی طرح ہے
احساس میں چبھتے ہوئے نشتروں کی طرح ہے
تم جو بھی کہو اُس کو، مگر میرے لئے تو
وہ شخص بھی پاکیزہ خیالوں کی طرح ہے
اخلاص و وفا ہو کہ بزرگوں سے عقیدت
اس قدر کی تہذیب میں جگنوؤں کی طرح ہے
رنج و غمِ فرقت میں سکوں ملنے لگا تھا
یہ درد تو بھرتے ہوئے زخموں کی طرح ہے
دیوار و در و بام پہ چھائی ہے اداسی
اب گھر کی فضا اُجڑے دیاروں کی طرح ہے
اس دَور میں اولاد سے اُمیدِ کفالت
سیلاب میں ڈوبی ہوئی فصلوں کی طرح ہے
وہ چاند جو مبہم بھی نمایاں بھی ہے اختر
وہ چاند تو مفلس کے ارادوں کی طرح ہے

اختر شاہجہانپوری

لوگ اُسے بلیک میلر، دغاباز، چور، اُچکا کہتے ہیں مگر وہ اپنے پہلو میں انسانیت نواز دل رکھتا ہے۔ پچھلے فسادات میں اس نے جتنے مسلمانوں کو خونخوار سکھوں اور ہندوؤں سے بچایا جتنی مسلمان عورتوں اور اُن کے بچوں کو پناہ دی اُن کے دل سے اُس کے لئے جو دُعائیں نکلی ہوں گی میرا خیال ہے کہ وہ اُس کی مغفرت کے لئے کافی ہیں۔

پچھلے دنوں میں سخت بیمار رہا تھا۔ میو ہسپتال کے "اے" وارڈ میں مجھ پر نیم بیہوشی اور بیہوشی دس پندرہ روز تک طاری رہی۔ میری بیوی اور بہن نے مجھے بتایا کہ اس عالم میں بار بار میں سردار دیوان سنگھ مفتوں کو یاد کرتا تھا۔ میں یہ سمجھتا تھا کہ دلّی میں ہوں۔ ریاست کا دفتر کچھ دُور ہے مگر وہاں ٹیلیفون کیا جا سکتا ہے میں اُن سے کہتا "جاؤ ٹیلیفون کرو اور دیوان صاحب سے کہو منٹو بُلا رہا ہے آپ کو۔ بہت ضروری کام ہے۔" وہ سمجھاتے تھے کہ تم لاہور میں ہو، لیکن میں بضد تھا کہ نہیں، دلّی میں ہوں۔ تم جاؤ اور دیوان صاحب کو ٹیلیفون کرو۔ وہ فوراً آجائیں گے۔"

گو اُن دنوں عالمِ برزخ میں تھا۔ ہونے نہ ہونے کے درمیان معلّق تھا۔ میرا دماغ دھند میں لپٹا ہوا تھا مگر مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ جہاں میرا بستر تھا اس سے کچھ دُور فاصلے پر ایک دروازہ تھا۔ اُس کے آگے ایک بہت بڑا ہال جس میں دو یوروپی بچے پنگ پانگ کھیلتے رہتے تھے۔ اس کو طے کر جائیے تو باہر (دروازہ سیمنٹ کا بنا ہوا) کھلا گیٹ آجاتا مگر افسوس کہ یہ ہر وقت بند رہتا تھا۔ یہی وجہ ہے کہ میں بار بار لوگوں سے درخواست کرتا کہ وہ ٹیلیفون کر کے سردار دیوان سنگھ مفتوں کو بُلا لیں مجھے کونسا ضروری کام تھا، اس کے متعلق مجھے کچھ معلوم نہیں۔ یہ عجیب بات ہے کہ میرے قریب قریب ماؤف دماغ میں صرف سردار دیوان صاحب کی یاد کیسے باقی رہی۔

غزلیں

[illegible]

بسمل نقشبندی

[illegible]

[illegible]

[illegible]

وجاہت علی سندیلوی

کوکربیٹا

ظہیر آفاق

بقول شیخ سلیم احمد "شاعری ادب کی اعلیٰ ترین صنف ہے، لیکن نہایت بدنام۔ جو بھی دو مصرعے موزوں کرنا جان گیا، وہ شاعر کے مرتبہ پر فائز ہونے کا دعویٰ کرنے لگتا ہے۔" اُن کے ان کلمات سے میں بے حد متفق ہوں اور اردو شاعری ان کے اس بیان سے بے حد خوش ہوئی ہے، لیکن بہت سے شاعر حضرات ناراض ہوئے ہیں اور اسی ناراضگی کے زیرِ اثر کچھ شاعروں نے مل کر ایک نئی تحریک کا آغاز کیا ہے اور یہ تحریک ایک نئی تحقیق کی روشنی میں آگے بڑھ رہی ہے۔

آزاد شاعری میں "ترائیلے" فرانس سے سمگل کیا ہوا تو خیر مشہور ہے اور "ہائی کو" جاپان سے اغوا کیا ہوا نابالغ تحقیق ہے۔ اور اب ہائی کو کے بعد آزاد شاعری میں ایک نئی صنف بہت سارے ہنگامے لئے منظرِ عام پر آ رہی ہے۔ "کوکربیٹا"

یہ ایک نیا انکشاف ہے۔ یہ ایک ایسا انکشاف ہے جس سے آزاد شاعری کی دنیا میں زبردست زلزلے اجاگر ہونے والے ہیں۔

اب دیکھنا یہ ہے کہ آزاد شاعری میں یہ نئی تحقیق کیا ہے۔؟

"کوکربیٹا" افریکن شاعری کی ایک نئی ہیئت ہے جو صرف ڈیڑھ مصرعہ پر مشتمل ہے۔ اس میں مفہوم ایک نئی انفرادیت لئے تیلیگرافک انداز میں نمایاں ہوتا ہے۔ یہ تحریک افریقہ سے ہوتی ہوئی فرانس پہنچی اور پھر فرانس سے ہوتی ہوئی پاکستان آئی۔ اور پھر کاچینشن نے اتنا زور پکڑا کہ ہندوستان کے آزاد شاعری کے فرشتے اس میدان میں کود کر اترے۔ اس سے پہلے پاکستان کے بہت سے آزاد طبع شاعر حضرات نے "ہائی کو" کی خوب پٹائی کی۔ اور پھر پاکستان کے ناقدین "ہائی کو" کے تفصیلی پوسٹ مارٹم میں مصروف ہو گئے۔ مقصد یہ رہا کہ آزاد شاعری میں نئی نئی ہیئتیں پیدا کرتے رہیں اور آزاد شاعری کے ناقدین کو ہمیشہ فعال رکھیں۔

"کوکربیٹا" کی تحقیق کچھ اس انداز سے ہوئی ہے

ترائیلے میں آٹھ مصرعے ہوتے ہیں۔
کوکربیٹا آٹھ الفاظ پر مشتمل ہے۔
ہائی کو میں تین مصرعے ہوتے ہیں۔
کوکربیٹا کی مقدار ڈیڑھ مصرعہ ہے۔
نظمِ معریٰ کا کوئی تصور نہیں ہوتا۔
کوکربیٹا کا کوئی قاعدہ نہیں ہوتا۔
سانیٹ میں قافیوں کی ترتیب اور بحر ایک مخصوص نظام کی پابند ہے
کوکربیٹا میں نہ قافیہ، نہ ترتیب نہ بحر اور نہ کوئی نظام۔

آزاد نظم کو انگریزی میں (Free Verse) کہتے ہیں۔ اور کوکربیٹا کو Polygamy Poem۔ کہتے ہیں۔ دراصل لفظ "کوکربیٹا" علمِ نباتات سے لیا گیا ہے۔ نباتات کے گلستاں میں "کوکربیٹا" ایک پھول کا نام ہے۔ اور اس پھول میں زردان اور زردگل دونوں پائے جاتے ہیں۔
اس پھول کے زردان اور زردگل میں کوئی ردِّ عمل نہیں ہوتا۔ اس پھول میں نہ مؤنث تاثرات ہوتے ہیں نہ مذکر۔ بیتھالوجی کے مدِ نظر اس پھول کی تعریف کچھ اس طرح سے ہوتی ہے:۔

اس پھول میں جنس کا کوئی احساس یا عمل نہیں ہوتا۔ یہ پھول کوئی زیرگی کے قابل نہیں ہوتا۔ لیکن اس پھول سے ہر قسم کی تتلیاں، مکھیاں، بھنورے وغیرہ اچھی طرح سرفراز ہوتے ہیں۔
لہٰذا اس فلسفہ کو مدِ نظر رکھتے ہوئے آزاد شاعری کے نوجوان دانشوروں نے "کوکربیٹا" کے نام سے آزاد شاعری کی ایک نئی صنف کو نوازا ہے۔ آزاد نظم میں مصرعہ کی لمبائی، چوڑائی کی کوئی حد نہیں ہوتی، کوکربیٹا میں واحد، جمع کی کوئی تفریق نہیں ہوتی۔ کوکربیٹا سے سب سے بڑا فائدہ یہ ہے کہ شاعری کی کسی بھی صنف پہ تنقید ہو سکتی ہے، لیکن کوکربیٹا ایک ایسی صنف ہے جس میں تنقید کو بالکل چانس ہی نہیں۔
"کوکربیٹا" ہر موضوع پر لکھے جا سکتے ہیں حسن کی تعریف، فطرت کی منظر کشی، زلف و رخسار کے نشیب و فراز، جام و مینا کی لطف اندوزی، موت و حیات کے تذکرے، شادی، بارات پہ اظہارِ مسرت، کسی کے انتقال پر قبرستان میں فی البدیہہ تلقین، عاشق و معشوق کے فلمیانہ رومانس۔ بہرحال ہر موضوع پر کوکربیٹا لکھے جا سکتے ہیں۔ اس کی سب سے بڑی خوبی یہ ہے کہ کلام بے اثر ثابت ہوتا ہے مگر کوکربیٹا لکھنے والے شاعروں کو اس کی پرواہ نہیں۔ کوکربیٹا لکھنے کے بعد خود شاعر کو اس کا اپنا مفہوم سمجھ میں نہیں آتا یہی اس کی سب سے بڑی شان ہے

"کوکربیٹا میں ——
تصور کو Concise کر سکتے ہیں۔
تخیل کو Precise کر سکتے ہیں۔
خیالات کو Scrutinise کر سکتے ہیں۔
شعور کو Epitomise کر سکتے ہیں۔
مفہوم کو Paraphrise کر سکتے ہیں۔
اور جذبات و احساسات کو Minimise کر سکتے ہیں۔
اتنی ساری سہولتیں شاعری کی کسی اور صنف کو میسر کہاں۔!
کوکربیٹا لکھنے والے شاعر حضرات کے تخلص بھی آزاد تخلص ہوتے ہیں۔ نمونے کے طور پر:۔
زہر زیبائی، جناز ذیلی، زنگ ادراقی، ترشیف بیفنوی، توہین دلیری، زآر تفصیلی وغیرہ۔
کوکربیٹا کی صنف تنقید کی پیروی نہیں کرتی۔ تنقید کو چاہیئے کہ کوکربیٹا کی شاہراہ اختیار کرے۔ نہ تذکیر و تانیث کا جھگڑا، نہ واحد جمع کا لحاظ، اور نہ ناجائز الفاظ کے بے معنی استعمال پہ بے بنیاد ہنگامے
بہرحال کوکربیٹا کی اس نئی صنف کے نگارخانوں میں، اس طرح کے خیر مضحکہ استعمال کو قدر کی نگاہوں سے دیکھا جاتا ہے۔
کوکربیٹا کے انکشاف کو سرفراز کرنے کے لئے، اس نئی تحریک کے تمام دانشوروں نے مل کر ایک آزاد میخانے میں بیٹھ کے یہ سوچنے کا ارادہ کیا ہے کہ پابند شاعری کا جنازہ کہاں سے نکالا جائے اور یہ جنازہ کن حضرات کے کندھوں پر رکھا جائے۔ اور اس پابند شاعری کا مدفن کہاں ہو چاہیئے۔ ہندوستان میں —— یا پاکستان میں ——؟ مدفن تو اکثر قبرستانوں میں ہی ہوا کرتا ہے۔ لہٰذا کیوں نہ اس کا مدفن ایک قبرستان میں ہو۔!

—— ——

تفصیلات ماہنامہ شان ہند دہلی
زیر فارم نمبر ۴ ۔ مطابق رول ۸
مقامِ اشاعت: فلیٹ ۸ انصاری مارکیٹ دریا گنج دہلی ۲
وقفہ اشاعت: ماہنامہ
پرنٹر کا نام: ودیا پرکاش سرور
قومیت: ہندوستانی
پتہ: فلیٹ ۸۔ انصاری مارکیٹ دریا گنج دہلی ۲
پبلشر کا نام: ودیا پرکاش سرور
قومیت: ہندوستانی۔
پتہ: فلیٹ ۸، انصاری مارکیٹ دریا گنج دہلی ۲
مالک کا نام: ودیا پرکاش سرور
قومیت: ہندوستانی
پتہ: فلیٹ ۸۔ انصاری مارکیٹ دریا گنج دہلی ۲
میں ودیا پرکاش سرور تونسوی اعلان کرتا ہوں کہ مندرجہ بالا تفاصیل میرے علم و یقین کے مطابق درست ہیں۔
ودیا پرکاش سرور تونسوی
یکم مارچ سنہ ۱۹۹۱ء

خوف کی نگری

اختر جمال

خوف کی نگری کا دن رات سے
بھی زیادہ اندھیرا تھا۔ دھوئیں کے مرغولے
بادلوں کی طرح آسمان میں تیر رہے تھے۔ ہر طرف
جاری ہواؤں کی آواز [illegible] تھی۔
ایک طرف چند لوگ کوشش کر رہے [illegible]
کاٹ رہے ہیں۔ یہ [illegible] زندگی اور [illegible]
کی علامت ہیں۔ مگر جب ہوا چلتی ہے تو ان کی
پتیاں سرگوشیاں کرتی ہیں۔ اس لئے [illegible]
نے [illegible] کو [illegible] کا حکم دیا ہے۔

ایک طرف [illegible] سمندر کے پاس کچھ
لوگ [illegible] اس کوشش سے کہ [illegible] کی سرگوشیاں
ختم کر دیں [illegible]
[illegible] کی سرگوشیوں کو ہمارے
کانوں تک پہنچا دے۔

سائنسدانوں کو [illegible] نے حکم دیا تھا
کہ وہ اپنی تمام صلاحیتیں [illegible] اور آواز روک
سکنے پر وقف کر دیں۔ اس لئے کہ حرکت اور آواز زندگی
کی مظہر ہیں۔ سائنسدانوں کی تمام کوششیں اس
بات کے لئے وقف ہو گئیں کہ خوف کی نگری میں
کوئی پتہ بھی نہ ہلے اور پانی کے [illegible] کی آواز
کے [illegible] معلوم ہو [illegible]
ہوا کی ہو، پانی کی ہو، وقت کی ہو، آواز ضرور
پیدا کرتی ہے۔ ذلت کے [illegible] انسانوں
کی [illegible] پر [illegible] جاتی ہے۔ [illegible]
روک دی جائیں تو بھی [illegible] نہیں
مٹائی جا سکتی۔ اور اگر [illegible]
تو ساری دنیا کے سمندر بھی اس کالک کو نہیں دھو
سکتے۔ خوف کی نگری کے رہنے والوں کے چہروں پر
خوف نے ایسی ہی کالک لگا دی تھی۔
پانی اگر ساکت ہو جائے تو سڑنے لگتا ہے۔ اسی
لئے کہ پانی کا بہنا تو وقت اور زندگی کا سفر ہے۔ [illegible]

[illegible] نے [illegible] کا دریا اس طرح منجمد کر دیا تھا کہ اس
کی نگری میں [illegible] نظر آتی تھی۔ [illegible]
[illegible] کے اندھیرے میں لوگ [illegible]
زندگی کو بسر کرنے پر مجبور تھے۔ [illegible] کا خیال تھا
کہ اس کے [illegible] پانی اور [illegible]
[illegible]
[illegible]

تاروں کو دیکھتا ہے اور خوف کی نگری کو اندھیرے کے لاف میں اس طرح بند کرنا چاہتا ہے کہ سورج کی رن اندر داخل نہ ہو سکے۔

زمین جس پر وہ بھاری بھاری لوہے کے جوتے رکھ کر چلتا ہے، اُسے حقیر معلوم ہوتی ہے۔ وہ زور زور سے پاؤں رکھتا ہے۔ ایسا کرتے ہوئے اُسے اپنی طاقت اور زمین کے عجز کا احساس ہوتا ہے۔ بچانا خوف بھی محسوس ہوتا ہے۔ اگر زمین بھی وقت، پانی اور ہوا کے ساتھ اُس کے خلاف سازش کرے تو کیا ہوگا؟ اس لئے وہ بھاری بھاری لوہے کے جوتے زمین پر مار کر اطمینان کر لیتا ہے کہ زمین اُس کے خلاف سر نہیں اٹھا سکتی۔

نوک دار جوتوں اور لوہے کی کیلوں سے دھرتی کا سینہ فگار ہے۔ وہ خاموش ہے مگر اندر اندر کوئی آگ سُلگ رہی ہے۔ دھرتی صابر ہے مگر صبر کی بھی کوئی حد ہوتی ہے۔ ایک دن لاوا اُگلنے ہی لگتی ہے۔!

لوگوں نے کالے دیو کی شکل نہیں دیکھی تھی۔ وہ ایک سیاہ نقاب ڈالے رہتا تھا جس میں سے اُس کی چھوٹی چھوٹی گول گول آنکھیں نظر آتی تھیں۔ نقاب میں ناک کے پاس دو بڑے چھید تھے جن سے ہوا اندر آتی اور اس کی دونوں مونچھیں انھیں سوراخوں میں سے باہر نکلی رہتی تھیں اور دو کالی رسیوں کی صورت میں دائیں بائیں پڑی رہتی تھیں۔ مگر جب اُسے غصہ اور جلال آتا تو ان کی جگہ دو لہراتے ہوئے سانپ بن کر پھن اٹھائے ہوئے نظر آتے۔

کالا دیو مسکراہٹ سے نا آشنا تھا مگر اُس کا گرجدار قہقہہ کبھی کبھی آدھی رات کو سنائی دیتا تھا اور خوف کی نگری کے باسی اس کا قہقہہ سُن کر گھروں کے دروازے بند کر لیتے۔ اُس کے قہقہے کی گونج پہاڑیوں میں بجلی کا کڑکا بن کر گونجتی۔ جب وہ کسی کو سرکشی پر سزا دیتا تو پھر قہقہہ لگاتا۔

سرکشی کا سب سے بڑا ثبوت آواز سمجھی جاتی تھی، اس لئے لوگ پانی کے بہنے، ہوا کے چلنے۔ اور درختوں کے سرگوشیاں کرنے سے خوفزدہ رہتے۔ اپنے اپنے بلوں میں خاموشی سے چوہوں کی طرح دبک جاتے تھے۔

کالے دیو کے مقرر کردہ محتسب اور محافظ ہی گھومنے پھرنے کے لئے آزاد تھے۔ اور ان کی وفاداری کا سب سے بڑا ثبوت یہ تھا کہ وہ اپنی انگلیاں دیو کی انگلیاں بنا چکے تھے۔ اس طرح کہ اُن کی انگلیاں دیو کے اشارے پر حرکت کرتی تھیں۔ بظاہر تو اُن کے ہاتھوں میں نظر آتی تھیں لیکن اُن کی قوتِ ارادی سے نہیں بلکہ دیو کے دماغ سے اُن کا رشتہ جڑا ہوا تھا۔ اس لئے سب وفاداروں کی انگلیاں دیو کی اپنی انگلیاں تھیں۔ جو انگلی اُس کے دماغ سے کام نہ کرتی اُسے وہ سرکش قرار دیتا اور وہ سزا پاتی۔

جب لوگ اپنا سر کالے دیو کے سامنے جھکا دیتے تو ان کے دماغ کا رشتہ فوراً دیو کے دماغ سے جڑ جاتا۔ اور پھر ایک منزل ایسی بھی آتی ہے کہ صرف انگلیاں ہی نہیں زبان، دل اور سارے وجود کو وہ جذب کر لیتا ہے۔ وہ لوگ دیو کے اپنے بن جاتے ہیں۔ دیو کے تخت و تاج کی نگرانی اُن کی اپنی بھلائی بن جاتی تھی اور دیو کے یہ محافظ خوف کی نگری کے محافظ کہلاتے تھے۔ وہ نگری کی حفاظت کا مطلب دیو کی حفاظت سمجھتے تھے۔ اس لئے کہ خوف کی نگری کالے دیو کے دم سے ہے۔ وہ نہ ہوگا تو خوف کی نگری بھی نہ ہوگی۔

اور ہر کام کرنے والے کے سر پر دیو نے اپنا ایک محافظ بٹھا رکھا تھا جو لوگوں کی کڑی نگرانی کرتا تھا۔ بہترین آدمی اُسے سمجھا جاتا جس کے دل کی دھڑکن خوف اور لرزے کے سبب مُردے کی سی ہوتی جیسے درندے سونگھ کر چھوڑ دیتے ہیں۔ دل و دماغ سے رشتہ توڑ کر کام کرنے والے کو ہی وفادار سمجھا جاتا تھا۔

خوف کی نگری میں بہت سے لوگوں کا یکجا ہو کر سانس لینا جرم تھا۔ سانس لینے کے بھی قواعد و ضوابط مقرر تھے۔ دیو کے مقرب اُس کے حضور ایسے سانس لیتے تھے کہ اُن پر مُردہ ہونے کا گمان ہوتا۔ گہرا سانس بھی سرکشی کی علامت تھی۔ رونا، تڑپنا، سسکنا بھی حرکت اور آواز کی نشانی ہیں، اس لئے یہ بھی بغاوت کی علامتیں سمجھی جاتی تھیں۔ پتھر کا بُت بن کر زندہ رہنا حبُّ الوطنی کی شرط تھی۔

کالے دیو کا ظلم اتنا بڑھ گیا تھا کہ لوگ سفید دیو کو یاد کرنے لگے تھے۔ سفید دیو کا زمانہ انھیں سُنہری زمانہ معلوم ہوتا تھا اور وہ سفید دیو کی غلامی سے آزادی حاصل کرنے پر پچھتاتے تھے، اس لئے کہ سفید دیو کی غلامی سے نکل کر انھوں نے ایک دن بھی چین کا سانس نہ لیا تھا۔ اُن میں سے ہر اب بس یہ خواب دیکھتا تھا کہ کسی طرح سے کالے دیو کی نگری سے چھٹکارا مل جائے تو وہ سفید دیو کی نگری میں جا کر بس جائے خواہ وہاں اُسے کتنا ہی ادنیٰ کام کرنا پڑے۔ وہ سفید دیو کی نگری کو اب جنت سمجھتے تھے اور یاد کرتے تھے کہ اس کا دورِ غلامی اُن کی زندگی کا بہترین زمانہ تھا۔ ہوا کتنی نشہ سی اور تیزی سے چلتی تھی۔ پتے سرسراتے۔ شاخیں جھومتیں، پھول مسکراتے۔ دل دھڑکتے، پانی کے بہنے کی آواز کے ساتھ ساتھ بانسری کی مدھر آواز دور دور جا کر جگاتی!

بس سفید دیو کی شرط یہ تھی کہ وہ سب اپنی زبانیں سفید دیو کے حوالے کر دیں۔ وہ اپنی زبانیں سفید دیو کو نہ دینا چاہتے تھے۔ اس لئے کہ زبان تو رُوح کی پکار ہے، محبت ہے، لفظ ہے، رنگ ہے، نقش ہے، زندگی ہے۔ اگر زبان نہ ہو تو رُوح گونگی ہو جاتی ہے۔ آدمی کی پہچان ختم ہو جاتی ہے۔ اپنی رُوحوں کو آزاد دیکھنے کے لئے انہوں نے طویل جدّ و جہد کے بعد سفید دیو کی غلامی سے آزادی حاصل کی تھی۔ مگر سفید دیو جاتے جاتے اُن پر وہ کالا دیو مسلط کر گیا تھا کہ جس کی تعلیم و تربیت اور پرورش اُس نے خود کی تھی اور اُس نے اپنے سارے گُر اس طرح سکھا گیا تھا کہ وہ سفید دیو سے زیادہ ظالم اور سنگدل بن گیا تھا۔ اُس نے زبانیں رکھنے کی اجازت دے دی تھی مگر اس شرط پر کہ اُن کی زبانیں اور انگلیاں اور اُن کے دل اُس کی مرضی کے تابع ہوں اور اس کی ذات کا حصہ بنے جائیں۔ کالا دیو جانتا تھا کہ سارا شور ہنگامہ اور حرکت انسان کی رُوح کی وجہ سے ہے اور رُوح کو مُردہ کرنے کے لئے ضمیر کو ختم کرنا ضروری ہے۔ اُس نے ایک گہرا تاریک کنواں بنوایا اور تمام باشندوں کو حکم دیا کہ وہ

اندھے کنوئیں میں اپنے اپنے ضمیر ڈال آئیں اور کنوئیں کے منہ پر اپنا پتھر بھی رکھ دیں۔ اس پتھر پر ڈالنے والا نام لکھا ہوگا اور ضمیر کنوئیں میں ڈالنے کے بعد رسید لے کر دیو کی برادری کا رکن بن جائے گا۔

کالے دیو کا خیال تھا کہ زبان اتنی خطرناک چیز نہیں ہے۔ ضمیر پتھروں کے بوجھ تلے دبے رہیں تو پھر زبان رکھنے میں کوئی حرج نہیں ہے۔ ضمیر پر پتھر رکھ کر لوگ وفاداری کا ثبوت اور حب الوطنی کی ضمانت دے چکے تھے۔

سفید دیو کی غلامی سے چھٹکارہ پاکر خوف کی نگری والوں نے جب بھی آئین بنایا کالے دیو نے آگ دکھا دی۔ اس کے قہر کی بجلی نے آئین کو جلا کر خاک کر دیا۔

سالہا سال بعد لوگوں نے اکٹھے ہو کر پھر ایک دفعہ اپنے لئے آئین بنایا۔ اس پر سب نے خوشی خوشی دستخط کئے۔

آئین تو ایک آئینہ ہوتا ہے جس میں قوم اپنا چہرہ دیکھتی ہے۔ کالے دیو کا چہرہ بھی پہچان لیں گے اس لئے وہ اس آئین کا دشمن بن گیا۔

خوف کی نگری کے لوگوں نے آئین کی روشنی میں اپنا چہرہ دیکھا تھا، اپنے آپ کو جانا تھا اور انھیں اپنی ذات پر اعتماد نصیب ہوا تھا۔ اور جب کسی کو اپنی ذات پر اعتماد ہو تو وہ دوسروں کی طرف نہیں دیکھتا۔ اس کا ہاتھ سوال نہیں بنتا۔ وہ بھیک کا دامن نہیں پکڑتا۔ کالے دیو نے جب دیکھا کہ آئین میں ضمیر کی آزادی کی ضمانت اور حفاظت کا ذکر ہے تو اس نے آئین کو عبرتناک سزا دینے کا فیصلہ کرلیا۔ اپنی ذات پر اعتماد کا مطلب ہے کہ وہ آئندہ کالے دیو کی ذات پر اعتماد نہیں کریں گے۔ کالا دیو آئین کو اپنا سب سے بڑا دشمن سمجھنے لگا۔ اس نے اب کے آئین کو قہر کی بجلی سے جلانے کے بجائے پھانسی کی سزا سنانے کا فیصلہ کیا تاکہ خوف کی نگری والوں کو دوبارہ آئین بنانے کی جرأت نہ ہو۔ آئین خوف کی ——— نگری والوں کی روح کا ترجمان تھا اور ان کی روح کو کالا دیو ہمیشہ کے لئے قید رکھنا چاہتا تھا۔ اور اس لئے اس نے پہلے ضمیر کو اندھے کنوئیں میں ڈال کر ان کی روحوں کو قیدی بنایا اور پھر آئین کو پھانسی کی سزا سنائی۔ دیو کے صلاح کاروں نے بھی اسے یہی رائے دی کہ آئین کی پھانسی خوف کی نگری کے مفاد میں ہے۔

ساری دنیا کے لوگ خوف کی نگری والوں سے اظہار ہمدردی کر رہے تھے۔ اس لئے کہ انھوں نے طویل جدوجہد اور محنت کے بعد آئین بنایا تھا۔ کالا دیو یہ سمجھتا تھا کہ آئین کا کاغذی پیرہن ایک بے حقیقت چیز ہے اور اس کی پھانسی تو ایک لفظ کی پھانسی ہے اور لفظوں کو تو پھانسی ملتی ہی آئی ہے۔ اس لئے کہ خوف کی نگری میں صرف ایک لفظ کی ضرورت ہے۔ وہ لفظ جو دیو کا حکم ہو۔ اور لوگوں کے لئے کیا بات اچھی ہے اور کیا بات بُری ہے، یہ وہ خود نہیں جان سکتے۔ یہ بات دیو ہی جان سکتا ہے۔ اچھی بات وہ ہے جو دیو اچھی سمجھتا ہے، بُری بات وہ ہے جو دیو بُری سمجھتا ہے۔ اس لئے انھیں آئین کی ضرورت ہی نہیں ہے۔ دیو کا ہر لفظ اُن کے لئے آئین ہے۔ ساری دُنیا کے لوگوں نے کالے دیو سے رحم کی اپیل کی کہ وہ آئین کی سزا منسوخ کر دے، اس لئے کہ آئین خوف کی نگری والوں کے جذبات، احساسات، خیالات، اور اُمنگوں کا ترجمان ہے۔ کالے دیو نے اُن کی اپیلوں کو خوف کی نگری کے معاملات میں مداخلت کہا اور کسی کی بات پر کان نہ دھرا۔

آئین کی پھانسی کے اعلان کے بعد کالے دیو کو ہر طرف سے سرگوشیوں کی آواز آ رہی تھی۔ اس لئے وہ ہوا پانی اور وقت، سب سے خوفزدہ تھا اور اپنے قدموں کے نیچے دبی ہوئی بے بس اور صابر دھرتی سے بھی خوف کھا رہا تھا۔

خوف کی نگری کے باشندے سفید دیو کو یاد کرتے تھے کہ اس نے صرف زبانیں چھینی تھیں، ضمیر کو اندھے کنوئیں میں ڈالنے اور اس پر پتھر رکھنے کا حکم نہ دیا تھا۔ اور اب اُن کی روح کالے دیو کی قید میں ہے اور آئین کی پھانسی کے بعد اُن کی روح پر غلامی کی ابدی مہر لگ جائے گی۔

وہ گہری تاریک رات تھی۔ چند دن کی بارش کے بعد زمین نرم ہو گئی تھی۔ قدموں کی آہستہ آہستہ چاپ سنائی دی۔ پھر چند سانسوں کی آواز آئی اور رسّی کی سرسراہٹ ہوئی۔ اور آئین کی لاش تختۂ دار پر جھولنے لگی اور کاغذی پیرہن بالکل ہی بے جان تھا۔

رات کی تاریکی میں ایک ٹھک کی آواز آئی اور پھر خاموشی.... آدھی رات کی خاموشی میں دیو کا قہقہہ سنائی دیا۔ ایسا لگتا تھا کہ وہ ہنستے ہنستے پاگل ہو جائے گا۔ قہقہے کی گڑگڑاہٹ سے لوگ جاگ گئے۔ ننھے بچے ماؤں سے لپٹ گئے۔ کتے اور گیدڑ زور زور سے بھونکنے لگے اور خوف کی نگری والوں نے گھروں کے اندر تالے ڈال لئے اور تالے ڈال کر اپنے گھروں میں بند ہو کر انھوں نے سوچا کہ وہ محفوظ ہیں!

صبح کی اذان کے بعد لوگ مساجد میں جانے لگے تو انھوں نے ایک دوسرے سے پوچھا کہ رات بھر ہوا بہت زیادہ سرگوشیاں کر رہی تھی، کیا وجہ تھی؟ کتے، بلیاں اور گیدڑ کیوں زور زور سے چلا رہے تھے؟ دیو کیوں قہقہے لگا رہا تھا؟ ایک عورت اپنے گلے میں کیمرہ ڈالے گھوم رہی تھی۔ وہ انھیں کسی ملک کی نامہ نگار معلوم ہوئی۔ وہ اُن کے پاس آئی اور پوچھا کہ رات کیا ہوا تھا؟ خوف کی نگری کے بے خبر لوگوں نے لاعلمی کا اظہار کیا اور کہا کہ وہ اپنے گھروں میں تالوں میں بند تھے۔ انھیں نہیں معلوم کہ رات کوئی غیرمعمولی واقعہ ہوا ہے۔ ہاں دیو کا قہقہہ ضرور سنائی دیا تھا۔

خوف کی نگری کی عورتیں اپنے سر کانوں تک لپیٹے رکھتی تھیں تاکہ ہوا سے اُن کے بالوں میں سرسراہٹ نہ ہو اور زلف کی بادِ صبا سے سرگوشی اُن پر مصیبت نہ لے آئے۔!

نامہ نگار خاتون کا سر اور بال اور کان کھلے ہوئے تھے۔ اُس کی روشن آنکھیں بے نقاب تھیں اُس کے بال سنہرے تھے اور اس کا لباس بھی سرخ تھا جو ایک بڑی سی قبا کی صورت میں اُس کے پیروں کو چھو رہا تھا۔ اُس کے گلے میں موتیوں کی ایک مالا تھی۔

نامہ نگار عورت نے حیران ہو کر کہا میں ساری نگری گھوم آئی ہوں۔ یہاں تو سب لاشوں کی طرح بے حس ہیں، بے حرکت، بے آواز! آخر وہ کون شخص تھا جو رات تختے پر بھی سانس لے رہا تھا اور اُس کی آخری سانسیں بھی سنائی دے رہی تھیں۔ وہ کون زندہ شخص

تھا۔ نامہ نگار کے سوال کا جواب کسی نے نہ دیا۔ سب زرد چہرے لئے خوف سے تھرتھر کانپ رہے تھے۔ اور ڈر رہے تھے کہ اُن کی کپکپاہٹ کو دیو سرکشی نہ سمجھ لے اور انھیں سرکشی کی سزا دے۔

نامہ نگار خاتون جھانک تیرگی اور پُر اسرار سناٹے میں گونگے لوگوں سے پریشان ہو کر ویرانے کی طرف نکل گئی۔

ویرانے میں اُسے ایک کنویں سے سسکنے اور رونے کی آواز سُنائی دی۔ سانس گھٹی گھٹی تھی جیسے کوئی بڑی تکلیف سے سانس لے رہا ہو۔ اگر عورت کے حواسِ خمسہ عام انسانوں کے مقابلے میں زیادہ تیز اور حسّاس نہ ہوتے تو وہ یہ آواز نہ سُن سکتی۔

عورت نے کنوئیں میں جھانکا تو دیکھا کہ اندھا کنواں تھا جس میں پتھروں کا ڈھیر تھا اور اُن میں سے ہر پتھر پر کالے حروف میں نام لکھے ہوئے تھے۔ اس نے سوچا کالے دیو کی نگری تو بیسویں صدی کے کسی ملک کے بجائے الف لیلیٰ کی پُراسرار دُنیا معلوم ہوتی ہے۔

"یہاں کوئی ہے؟" نامہ نگار نے کنوئیں کے اندر مُنہ ڈال کر پوچھا۔

کسی نے رُندھے ہوئے گلے سے کہا۔ "ہاں"

"تم کون ہو؟"

"مَیں خوف کی نگری کے باسیوں کا ضمیر ہوں۔ اُنہوں نے مجھے اندھے کنوئیں میں ڈال کر پتھر رکھ دیئے ہیں۔ ان پتھروں پر تم اُن کے نام پڑھ سکتی ہو۔"

سیاہ جلی حروف میں اس نے ان لوگوں کے نام پڑھنے کی کوشش کی جنھیں وہ جانتی نہ تھی۔

"تمہیں اس کنوئیں سے نکالنے کی مَیں کوئی تدبیر کرتی ہوں۔"

"آہ، ان پتھروں کے بوجھ سے میرا دم گھٹ رہا ہے۔ اگر کوئی ان پتھروں کو ہٹا دے تو میں باہر آ سکتا ہوں۔ آزاد ہو کر سانس لے سکتا ہوں۔ اگر میں آزاد ہو گیا تو میرے ساتھ ان کی روحیں بھی آزاد ہو جائیں گی۔

میری موت اُن کی روح کی موت ہو گی۔ مگر وہ یہ نہیں جانتے۔"

نامہ نگار نے ضمیر سے پوچھا۔ "رات تمہاری سانسیں سُنائی دے رہی تھیں۔ اور پھر مجھے ایسا محسوس ہوا کہ رات پچھلے پہر کسی نے دَم توڑ دیا۔ شکر ہے تم زندہ ہو۔"

ضمیر نے کہا "نہیں وہ دُوسرا شخص جو رات زندہ تھا، دَم توڑ چکا ہے، وہ آئین تھا اُسے رات کالے دیو نے پھانسی دے دی۔

خوف کی نگری کے لوگوں کو یہ بات صبح سویرے معلوم ہوئی مگر وہ خوف کے سبب خاموش ہیں۔"

ضمیر کی بے بسی اور آنسوؤں پر نامہ نگار کو رحم آیا۔ وہ بیچارہ پتھروں کے بوجھ تلے صرف آہ و زاری کر سکتا ہے۔ اس نے ضمیر سے پوچھا۔

"کیا اس نگری میں کوئی عدالت نہیں ہے؟"

ضمیر نے کہا "عدالت ہی نے آئین کو پھانسی کی سزا دی تھی۔"

نامہ نگار نے پوچھا۔ "اچھا کیا سب ججوں نے یہ فیصلہ کیا تھا؟"

ضمیر نے کہا "نہیں، اُن میں کچھ اختلافِ رائے ضرور تھا۔ اسی لئے تو میں زندہ ہوں۔"

ضروری اطلاع
جواب طلب اُمور کے لئے جوابی پوسٹ کارڈ یا لفافہ ضرور بھیجا کیجئے، ورنہ تعمیلِ حکم سے معذوری سمجھئے۔ (منیجر)

برف کی سِل

نسرین اعجاز

موت دوپہر کے قریب ہوئی تھی لیکن بعض رشتہ داروں کی آمد میں تاخیر کی وجہ سے اسے دوسرے دن دفن کرنے کا فیصلہ کیا گیا، اس فیصلہ پر کوئی اعتراض نہیں تھا، ویسے بھی جانے کی ایسی جلدی کیا تھی! اس لئے وہ چپ چاپ اس چارپائی پر پڑی رہی جس کے چاروں طرف رشتہ دار اور محلہ کی عورتیں جمع تھیں ان میں سے بعض رو رہی تھیں اور بعض رونے کی اداکاری کر رہی تھیں،

روتے روتے اچانک گہری خاموشی چھا جاتی پھر چند لمحوں بعد باتوں کا سلسلہ چل نکلتا، مختلف باتیں۔ گھروں کی سیاست، مہنگائی، بہو کی شوخیاں، بیٹیوں کی بے مروتیاں، ساس کا لالچ اور [illegible] کی بے اعتنائی وغیرہ۔ وہ عمر بھر ان جھگڑوں سے گزری تھی لیکن دوسروں سے یہ باتیں سن کر عجیب طرح کی بیزاری محسوس ہو رہی تھی ــــ باتوں کا سلسلہ، نہ ختم ہونے والا سلسلہ، وقفتاً کوئی نئی وارد ہوتی، روتے اور بین کرتے [illegible] کی ہمتی ٹوٹ جاتی، پھر دیر رونے، بین کرنے کی آوازیں پھر گہری خاموشی، گفتگو کا سلسلہ دوبارہ چل نکلتا ــــ یہ تماشا دوپہر سے ہو رہا تھا اور اب شام ہونے کو آئی تھی،

اس نے سوچا ــــ چلو ایک رات کا تو قصہ ہے کل تو دنیا سے نجات مل جاتی ہے۔

لیکن شام کو جب کسی نے گھر والوں کو مشورہ دیا کہ لاش کو محفوظ رکھنے کے لئے برف کی سلیں منگوالی جائیں تو اس کے کان کھڑے ہوئے [illegible] اور مشورہ دینے والے کو آڑے ہاتھوں لیتی، زندگی بھر اس کا غصہ سارے خاندان میں مشہور رہا تھا، لوگ اس کے سامنے سے ہٹ جاتے تھے اور کوئی اس کے فیصلے کے خلاف دم مارنے کی جرأت نہیں کرتا تھا لیکن اب یہ عالم تھا کہ وہ کروٹ بھی نہیں بدل سکتی تھی۔ سارا جسم، سردی [illegible] بس ایک احساس باقی تھا اور وہ سب کچھ محسوس کر سکتی تھی۔

تھوڑی دیر میں برف کی سلیں [illegible] کے چاروں طرف [illegible] پھر [illegible] ہو گئیں [illegible] انگلیاں [illegible] سے [illegible] چلی گئی۔

انگلیوں [illegible]

بچی کو [illegible] بھی سر جھکائے کسی گہری سوچ میں تھی۔

اس نے غور سے سوچا۔ دیکھو اُسے بھی [illegible] نہیں کرنا کہ یہ خلوص میرا کیا علاج کرے گی۔ بچی نے ماں کی اس بات کو محسوس نہیں کیا [illegible] اپنی سوچوں میں گم تھی۔ ماں کی اچانک موت نے اسے بے حال کر دیا تھا اس کے گھر میں اب اس کا کون تھا۔ اسے خیال آیا۔ اب کون مجھے [illegible] ایک ماں تھی کہ دو دن ذرا سی کو [illegible] بیچ دیتی تھی۔ میرے کھانے اور کھانے کا کیسے خیال رکھتی تھی۔ ہزار کر کر کے کھلاتی تھی ہر مسئلہ پر بڑھ چڑھ کر دیتی، اور چپکے چپکے تو کیسے کیسے ہو کر تی تھی، اسی لئے تو بھابھیاں جلتی تھیں کہ اس گھر میں میرا راج چلتا ہے، لیکن اب یہ راج ختم ہو گیا، سارا کھیل ہی ختم ہو گیا۔ اب ان کا جو جی چاہے کریں گی۔ اس نے سر اٹھا کر بڑی بھابھی کو دیکھا، جو کچھ فاصلے پر اداس بیٹھی تھی کیسی مکار بنی بیٹھی ہے، زندگی بھر میری ماں کی برائیاں کرتی رہی۔ وہ تو میری ماں کی بد جنگ تھی وہ اس نے ذرا کسر نہیں چھوڑی تھی۔ شروع میں تو وہ الگ ہو کر گھر جا بیٹھی تھی لیکن جب ماں نے [illegible] اور بھائی نے بھی کہہ دیا کہ جہاں [illegible] تو وہ [illegible] واپس آگئی لیکن اس نے کبھی ماں کو ماں نہیں کہا اور ہمیشہ نفرت سے دیکھتی رہی، اگرچہ بظاہر [illegible] بڑی [illegible] پھرتی ہے لیکن مجھے معلوم ہے اندر سے جلتی ہے [illegible] اور میرے بچوں [illegible] [illegible] [illegible] [illegible] [illegible] [illegible]

[illegible] آنسو روک نہیں رہے تھے۔ پاس بیٹھی ایک بوڑھی عورت نے اسے دلاسا دیا "بیٹی صبر کر" بڑی بھابھی نے اس کو گھور کر سر اٹھایا حرام زادی کیسے بلک بلک کر رو رہی ہے جیسے ماں اسی کی مر رہی ہے، اس کی بادشاہت جو ختم ہو گئی ہے۔ بھلا کیسے دندناتی پھرتی تھی اور مجھے کس کس طرح اس کو خوش کرنا پڑتی تھی اب دیکھوں گی کیسے آتی ہے اس گھر میں اور اس کے بچے کیسے چیزیں لوٹتے ہیں اور اس کا صاحب، یہ نہیں کھاتا، وہ نہیں کھاتا صاحب بہادر کو نہیں کھاتا تو ہم [illegible] لیکن یہ میاں بیوی ہی مجھے اچھے نہیں لگتے میری تعریف کرتا ہے لیکن ماں کا سامنا ہوتے ہی [illegible] لگتا ہے۔ بزدل کہیں کا" اور یہ عورت اس نے کیسا کیسا ظلم نہیں کیا مجھ پر، اب دیکھ لوں گی اب میں ہی اس گھر کی بڑی ہوں، اس کے ایک ایک [illegible] کو، اور اس بھتیجی کو کیسے رو رہی ہے اور یہ چھوٹی بھابھی، ہمیشہ مجھے کاٹنے کی فکر میں رہتی ہے، اسے بھی دیکھ لوں گی اب میں ہی تو اس گھر کی بڑی ہوں، ایک ایک سے نمٹ لوں گی، [illegible] جان تو چھوٹی ہے، لیکن یہ کم بخت چپ بھی نہیں ہوتی اب مجھے بھی [illegible] بہانے پڑیں گے اس نے زور سے ڈھاڑیں مار کر رونا شروع کر دیا۔

پاس بیٹھی ایک عورت نے اسے بھی دلاسہ دیا "صبر بیٹی صبر۔ اب تم ہی اس گھر کی بڑی ہو" اس نے اس کے گرم نرم لمس سے آنسو پونچھ لیا اور وہ دلاسہ دینے والی کے کندھے پر [illegible]

شادو [illegible] بیٹھی [illegible] بڑی بھابھی اور بڑی نند کی [illegible] تو وہ بھی زور سے [illegible] اور دل ہی دل میں [illegible] کرنے لگی۔ کم بخت چپ ہی نہیں ہوتی [illegible] بات نہیں یہ ہوشیاری کا وقت ہے [illegible] سارے [illegible] پانی پھیر دے گی اس نے کن انکھیوں سے بڑی بھابھی کی طرف دیکھا بڑی [illegible] والدہ ساس کی زندگی بھر تو [illegible] نہیں دیا، اور بڑی خوش خلقی سے [illegible]

[illegible] ساس [illegible] [illegible] [illegible] [illegible]

غزل

اُن کی ضد میری انا کچھ معاملہ ہو جائیگا
یہ محبت ہے کسی دن فیصلہ ہو جائے گا

بے نیازی آپ کی گر اس طرح بڑھتی رہی
دیکھئے اک روز کوئی حادثہ ہو جائے گا

اس طرح میری طرف بے تاب مت دیکھئے
پھر دلِ ناکام کو کچھ حوصلہ ہو جائے گا

ہم نہیں کرتے ہیں تعمیرِ نشیمن اس لئے
آئے دن برقِ تپاں کا سلسلہ ہو جائیگا

رہروانِ کاروانِ عشق ہوں اب ہوشیار
راہِ اُلفت میں کسی دن واقعہ ہو جائیگا

دشتِ وحشت میں بڑھے گا ناخنِ اگر
زندگی بھر کے لئے اک مشغلہ ہو جائے گا

لاکھ پردے میں رہو میری نظر سے اے جگر
حشر کے دن تو یقیناً سامنا ہو جائے گا

جگر بستوی

یہ بڑی خود اس سے بھی خفا ہوں گی، بہت نخرے سہہ لئے اس کے، اس کے چھٹے بد تمیز ہیں اور وہ اس کا لاٹ صاحب میاں، اسے کوئی چیز پسند ہی نہیں آتی۔ اب دیکھوں گی۔ اور یہ چھوٹی نند اسے تو میں دبا لوں گی۔ پہلے تو میں اسے اپنے ساتھ ملانے کی کوشش کروں گی، لیکن یہ بڑی منہ پھٹ جو منہ میں بکواس کر دیتی ہے۔ خیر یہ تو بعد کی بات ہے فی الحال تو مجھے یہ ظاہر کرنا ہے کہ ساس کی موت کا سب سے زیادہ غم مجھ ہی کو ہے، یہ سوچتے ہی اس نے ایک زوردار دھاڑ ماری اور زمین پر لوٹ پوٹ ہو گئی۔ ہائے امی۔ پیاری امی!! دو تین عورتیں اس کی طرف بڑھیں۔ بس بی صبر۔ بیٹی صبر۔ اور ان میں سے ایک نے سوچا

یہ تو اچھا تھا جو ساری رات یہی ہوتا رہے گا ابھی تو پوری رات پڑی ہے"

ذرا فاصلے پر بیٹھی ایک قریبی رشتہ دار نے لحاف ٹانگوں پر کھینچتے ہوئے کن انکھیوں سے وقت دیکھا اور سوچا کیا ہے وقت مری ہے ذرا سویرے مر جاتی تو شام تک جنازہ ہو جاتا اس رات بھر کی خواری سے تو بچ جاتے ہو

ایک اور قریبی رشتہ دار نے کوئلے کریدتے ہوئے سوچا" زندگی بھر بہوؤں کے لئے عذاب بنی رہی اور جاتے جاتے ہمیں عذاب میں ڈال گئیں، اب جاگو ساری رات اور مرو اس سردی میں "

ان سب سے الگ، ایک کونے میں سب سے چھوٹی بیٹی بس اندر ہی اندر رو رہی تھی اس کے کچھ سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ اچانک یہ کیا ہو گیا ہے بس ایک ہی احساس تھا کہ کسی نے اس کے سر سے آسمان کھینچ لیا ہے۔

وہ یہ سب دیکھ اور سن رہی تھی۔ لیکن کچھ کرنے، بولنے اور سمجھنے کا وقت گزر چکا تھا۔ برف کی سلوں میں وہ بھی برف کی سل بنی جا رہی تھی۔

" صبح کب ہو گی۔ پھر کب اس ٹھنڈک سے نجات ملے گی؟"

لیکن کسی نے اس کا سوال نہیں سنا، سب اپنے اپنے خیالوں، سوچوں اور منصوبوں کے دائروں میں ڈبکیاں کھا رہے تھے ؛

غزلیں

فراق و ہجر کا بادل بھی تو برسا نہیں اب تک
تمہارے وصل کا موسم مگر آیا نہیں اب تک
طوافِ نقش پا کرتی ہیں جانے منزلیں کتنی
ہماری گمرہی کو آپ نے سمجھا نہیں اب تک
یہ عالم ہے کہ جب سے دوستوں کا ساتھ چھوڑا ہے
کوئی پتھر ہماری سمت بھی آیا نہیں اب تک
جہادِ زندگی میں ہم نہ جانے کس لئے آئے
غنیموں کی صفوں پر تیر تو چھوڑا نہیں اب تک
خود اپنے ہی اب تک ٹھوکریں کھاتے ہیں راہوں میں
جگر کی رہبری میں کوئی بھی بھٹکا نہیں اب تک
تماشہ آتشِ غم کی جلا کر راکھ کر دے گی
بتا تیری چشمِ گریاں تو نے کیا دیکھا نہیں اب تک
چلو اختر نظامِ دہر کو اب بدل ڈالیں
ہمارے ساتھ چلنے سے جہاں بدلا نہیں اب تک

اختر شاہجہانپوری

کب بجی ذہن میں شہنائی مجھے یاد نہیں
کب خیالوں کی برات آئی مجھے یاد نہیں
میں تو منزل کی طرف پاؤں بڑھاتا ہی گیا
کب تلک ساتھ تھی تنہائی مجھے یاد نہیں
اتنا معلوم ہے کہ ڈوب گیا تھا دریا غم کا
کتنی پانی میں تھی گہرائی مجھے یاد نہیں
یاد اتنا ہے کہ لوٹا تھا کسی نے اک دن
کوئی دشمن تھا کہ وہ بھائی مجھے یاد نہیں
ہوش کھو بیٹھا تھا بس ایک جھلک میں میں تو
کس کی تصویر نظر آئی مجھے یاد نہیں
جس کی اک دید میں ہم خون بہا کر بیٹھا
برق وہ تھی کہ تھی انگڑائی مجھے یاد نہیں
اقبال ہاتھ میں تدبیر کا ذریعہ دے کر
میری تقدیر کہاں لائی مجھے یاد نہیں

اقبال نہ پوچھی

دل نہ دکھانے کی خاطر ہم خود کو ہی سمجھا لیتے ہیں
ایک مرض سے بچتے بچتے کتنے روگ لگا لیتے ہیں
بنجر آنکھوں والے ساتھی سپنے خواب بچا لیتے ہیں
مجھ سے بھی پہلے منڈی میں جا کر دام بنا لیتے ہیں
شورِ صدائے شکوہ دعا میں نغمہ ساز درد نہ چھیڑ دو
بارش میں جو اشک بہائیں اپنے اشک گنوا لیتے ہیں
شہر پناہ پہ آہٹ سن کر کار کنانِ خانہ ہمیشہ
اپنے گھر دھو لیتے ہیں اور دوتنے بچا لیتے ہیں
چشمۂ آبِ حیات کا جا کر سیکھا اپنی قبیلہ اکثر
پانی بھی لانے نہیں پاتے بازو بھی کٹوا لیتے ہیں
ہم وہ امین موسم گل ہیں لگتے ہیں تو فصل کھیتوں میں
شاخ قلم کرنے کی بجائے ہاتھ قلم کروا لیتے ہیں
خواب جو کل گرتے ہیں ہم پر جمشید نہیں کوئی پایا
اور جانے والے موسم کے پتے انہیں بچا لیتے ہیں

جمشید مسرور

بہ کوئے یار

مستقل کالم

سرور تونسوی

مولانا عبدالباقی

اب جن کو دیکھنے کو آنکھیں ترستیاں ہیں

ہفت روزہ "شانِ ہند"
۱۹۳۹ء میں ملتان (پاکستان) سے جاری کیا گیا۔ یہ ہفت روزہ بے باک اور مقصدی صحافت کے طفیل بہت جلد قبول عام حاصل کرنے میں کامیاب ہوا۔ چھ ماہ بعد ہی اسے محکمۂ اطلاعات پنجاب لاہور سے جو پہلا اشتہار برائے اشاعت موصول ہوا اس کے ریلیز آرڈر پر بطور ڈائریکٹر جناب عبدالباقی صاحب کے دستخط تھے۔

اشتہارات ہر اخبار کے لئے ریڑھ کی ہڈی سمجھے جاتے ہیں۔ لہٰذا میں نے بھی لاہور جا کر محکمۂ اطلاعات پنجاب کے ڈائریکٹر جناب عبدالباقی سے ملاقات کی اور شانِ ہند کو سرکاری اشتہارات کے لئے منظور فرمانے کے لئے شکریہ ادا کیا تو انہوں نے فرمایا کہ "شانِ ہند" کو بغیر کسی درخواست کے اپروڈ لسٹ پر اس لئے لیا گیا ہے کہ ایک بے باک اور سچائی کی راہ پر چلنے والے ہفت روزہ کی عوامی خدمات کا عملی اعتراف کیا جائے۔ موصوف نے سلسلۂ گفتگو جاری رکھتے ہوئے یہ بھی فرمایا کہ میں ذاتی طور پر شانِ ہند کو دلی کے مشہور ہفت روزہ "ریاست" کا ملتان ایڈیشن سمجھتا ہوں۔

باقی صاحب کے ان حوصلہ افزا الفاظ نے ہی مجھے یہ تحریک دی اور میرے اداریوں میں سردار دیوان سنگھ مفتون کی بے باکی، آغا شورش کاشمیری کی آتش نوائی، اور مولانا عبدالباقی کے مخصوص طرزِ تحریر کی جھلک دکھائی دینے لگی اور میں نے گزشتہ باون سال سے شانِ ہند کو اسی شعار پر گامزن رکھا ہے۔

"شانِ ہند" کی اشاعت کا آٹھواں سال تھا کہ تقسیم ملک کا سانحہ پیش آیا۔ میں پاکستان میں ہی رہنا چاہتا تھا، مگر حالات نے کچھ ایسا رخ اختیار کر لیا کہ میں نے ۱۲ اکتوبر ۱۹۴۷ء کو ملتان کو بادلِ ناخواستہ، نم آلود آنکھوں سے خیرباد کہا اور ۲۴ اکتوبر ۱۹۴۷ء کو دلی آ گیا۔

یہ تو اخبارات کے ذریعہ پتہ چل ہی چکا تھا کہ دو مسلمان ایسے ہیں جنہوں نے پاکستان سے ہندوستان ہجرت کی ہے۔ اور وہ تھے مولانا عبدالباقی اور جناب خان خانی کابلی۔ ماہنامہ "شمع" ان دنوں پھاٹک حبش خاں سے شائع ہوتا تھا اور "شمع" کے مالک جناب حافظ محمد یوسف صاحب دہلوی پنجاب سے آئے ہوئے شرنارتھیوں کو سر چھپانے کے لئے مسلمانوں کے متروکہ مکانات دلانے کی مقدور بھر کوشش کر رہے تھے۔ "ساز" "بیسویں صدی" کا دفتر حافظ صاحب نے دفتر شمع میں ہی قائم کرنے کی اجازت خوشتر گرامی کو دیدی

تھی۔ میں بھی مکان کی تلاش میں سرگرداں تھا۔ چنانچہ سردار دیوان سنگھ مفتوں کی ہدایت پر جناب حافظ محمد یوسف دہلوی کی خدمت میں حاضری دی اور اُن سے حرفِ مدعا بیان کیا تو حافظ صاحب نے فرمایا کہ شرقد صاحب آپ نے بہت دیر کر دی۔ اب تو مکان کا ملنا ناممکن ہے۔

دفتر شمع سے نیچے آکر تلک بازار میں مُڑنے ہی لگا تھا کہ جناب عبدالباقی صاحب نظر پڑے۔ خضوع و خشوع سے معانقہ فرمایا خیریت اور ترکِ وطن کے مختصر احالات سُننے سُنانے کے بعد فرمانے لگے "میں سامنے ہی رہتا ہوں۔ تم کہاں رہ رہے ہو؟" عرض کیا کہ ایک متروکہ جلے ہوئے مکان کی چار دیواری میں رہ رہا ہوں جس میں ایک کمرہ کی چھت کسی حد تک باقی ہے۔

سردار دیوان سنگھ مفتوں کی سفارش پر منشی عبدالقدیر صاحب نے چاندنی محل میں ایک متروکہ کھنڈر نما مکان اس کے مفرور مالک کسی حکیم صاحب سے کرایہ پر دلایا اور جناب کنور مہندر سنگھ بیدی سحر جو اُن دنوں دِلّی کے سٹی مجسٹریٹ تھے، نے کرم فرمایا اور ۱۹۴۸ء کے اوائل میں شانِ ہند کا اجراء ممکن ہو سکا۔

اب مولانا باقی صاحب سے ہفتہ عشرہ میں ملاقات رہتی اور شانِ ہند کی حیاتِ ثانیہ سے متعلق اُن سے صلاح مشورہ مجھے کئی مسائل کے حل کرنے میں مدد دیتا رہا۔

باقی صاحب مختلف انگریزی اخبارات میں مختلف موضوعات پر کالم نویسی کرتے تھے اور لطف یہ ہے کہ ہر اخبار میں مختلف فرضی نام سے۔ ہاں بیرونِ ملک اخبارات میں وہ اپنے اصلی نام سے ہی کالم لکھتے تھے۔ ملکی اور غیر ملکی اخبارات میں لکھنے سے انھیں اچھا خاصا معاوضہ ملتا تھا جس سے اُن کی مالی حالت لاہور کی سرکاری ملازمت کے مقابلے میں بہتر تھی۔

اُن دنوں دِلّی کے شعری ماحول پر دام پور کی ایک پٹھان نژاد خاتون شاہدہ بیگم نکہت کی حکمرانی تھی۔ یہ بلبلِ ہزار داستان محلہ رکاب گنج میں رہائش پذیر تھیں۔ چنانچہ آزاد ہندوستان میں جب پہلی بار الیکشن ہوا... تو بیگم صاحبہ مذکورہ نے کانگریس اُمیدوار حکیم خلیل الرحمٰن نار کے مقابلہ میں الیکشن لڑنے کا اعلان کیا۔ بیگم صاحبہ سے جناب بلونت سنگھ بیدی کے کمفین جان پہچان ہو چکی تھی۔ لہٰذا جب بیگم صاحبہ نے الیکشن لڑنے کے سلسلے میں اپنے بہی خواہوں سے صلاح و مشورہ کرنے کے لئے ایک میٹنگ اپنے دولت کدہ پر بُلائی تو ایڈیٹر شانِ ہند کو بھی مدعو فرمایا۔ اس میٹنگ میں مولانا عبدالباقی نے بیگم صاحبہ کے حق میں جو گفتگو فرمائی وہ غمازی کر رہی تھی کہ مولانا باقی بیگم صاحبہ سے مانوس ہو چکے ہیں۔

جناب کنور مہندر سنگھ بیدی سحر سے دِلّی کانگریس کمیٹی کے ارکان نے جن میں حضرت آتش لکھنوی بھی شامل تھے، گزارش کی کہ وہ کسی طرح شاہدہ بیگم نکہت کو حکیم خلیل الرحمٰن نار کے مقابلہ سے دست بردار کرا دیں، ورنہ کانگریسی اُمیدوار حکیم نار بیگم شاہدہ کی آتشِ رُخسار کی تمازت میں اپنی نار کی صفت گنوا بیٹھیں گے۔ لہٰذا کنور صاحب کی کوشش سے دِلّی کی کانگریس کمیٹی کی عزت رہ گئی۔ کیونکہ کنور صاحب کے فرمان کی تعمیل میں بیگم شاہدہ نے اپنا نام واپس لے لیا۔

بیگم شاہدہ نکہت کے ہاں جب کبھی جانا ہوا تو مولانا باقی سے اُن کے ہاں ملاقات ضرور ہوئی۔ چند دنوں کے بعد ہی باقی صاحب نے بیگم شاہدہ سے نکاحِ ثانی پڑھوالیا۔ اور بیگم شاہدہ کی محبت نے باقی صاحب کو اس قدر ہمت دی کہ انھوں نے دِلّی سے روزنامہ "پیامِ وطن" جاری کر دیا۔ منشی غلام محمد باقی صاحب کے دیرینہ مداحوں میں سے تھے۔ انھوں نے دِلّی کے چیف کمشنر سے کہہ کر احاطہ کالے خاں میں باقی صاحب کو گیارہ کمروں کا ایک بہت بڑا مکان الاٹ کرا دیا۔ یہ مکان ایسی جگہ واقع نہیں تھا کہ کسی روزنامہ کے دفتر کے لئے موزوں ہوتا۔ لہٰذا روزنامہ "پیامِ وطن" کا دفتر ترکمان گیٹ کے باہر آصف علی روڈ پر قائم کیا گیا اور مولانا باقی نے رہائش گیسٹ نظام الدین میں رکھی اور احاطہ کالے خاں والا مکان دفتر پیامِ وطن کے اسٹاف کی رہائش گاہ بن گیا۔

روزنامہ "پیامِ وطن" کے ادارتی فرائض باقی صاحب نے سنبھالے اور دیگر جملہ انتظامی اُمور بیگم شاہدہ نکہت نے نہایت اچھے انداز میں انجام دیے۔ "پیامِ وطن" چونکہ خالص وطن پرستانہ پالیسی کا ترجمان تھا، اس لئے مقبولیتِ عوام حاصل نہ کر سکا اور کچھ عرصہ بعد ہی اس کی اشاعت بند ہو گئی۔

باقی صاحب صوبہ بہار کے رہنے والے تھے اور ہندوستان کے پہلے راشٹرپتی جناب راجندر پرشاد صاحب سے اُن کے والد صاحب کے برادرانہ تعلقات تھے۔ چنانچہ راجندر بابو نے مولانا باقی کو ہمیشہ اپنا بھتیجہ سمجھا۔ بیگم شاہدہ سے شادی کرنے کے بعد جب باقی صاحب اپنی نئی بیوی کو راجن بابو کے ہاں سلام کرانے کو لے گئے تو راشٹرپتی راجن بابو نے اپنے رسم و رواج کے مطابق ایک سسر کی حیثیت سے شاہدہ بیگم کو نوازا۔

جناب رفیع احمد قدوائی صاحب، جناب گیانی ذیل سنگھ صاحب، اور دیگر کئی اکابرینِ ملک سے باقی صاحب کے گہرے تعلقات تھے۔ راشٹرپتی صاحب نے مولانا باقی کو کسی اسلامی ملک میں ہندوستان کا سفیر بنائے جانے کی پیشکش کی مگر رفیع احمد قدوائی نے باقی صاحب کو مشورہ دیا کہ اگر اپنے قلم کو زنگ آلود کرنا ہے تو بے شک سفارت قبول کر لو۔ چنانچہ باقی صاحب نے راجن بابو سے معافی کے ساتھ عرض کیا کہ وہ صحافت کے میدان میں ہی رہنا

چاہتے ہیں۔

اس دَوران مولانا باقی کی پہلی بیوی کا انتقال ہو چکا تھا۔ لہٰذا بخشی غلام محمد وزیر اعلیٰ جموں و کشمیر کے بُلاوے پر باقی صاحب کشمیر چلے گئے اور وہاں بخشی صاحب نے انھیں اس قدر نوازا کہ انھیں کسب معاش کی فکر دامن گیر نہ رہی۔

مگر صحافت کا چسکا اتنا لذیذ ہے کہ کوئی بھی صحافی اس نقصان دہ پیشہ سے زیادہ دیر دُور نہیں رہ سکتا، خواہ وہ کشمیر جنت نظیر میں آرام کی زندگی کیوں نہ گزار رہا ہو۔ لہٰذا کچھ ہی عرصہ بعد باقی صاحب معہ اہل و عیال دہلی لوٹ آئے اور ہفت روزہ "کاروانِ وطن" جاری کیا۔ یہ ہفت روزہ اپنی قسم کا ایک مکمل اخبار تھا اور اس نے سرکار اور عوام دونوں میں مقبولیت پائی۔

باقی صاحب نے اپنی زندگی میں کتنے بچّوں کو بلا تخصیص مذہب و ملت تعلیم دلائی۔ ویسے لفظ تعصب باقی صاحب کے ہاں ڈکشنری میں تھا ہی نہیں۔ باقی صاحب کے ہر مذہب و ملت کے اچھے لوگوں کے ساتھ گھریلو تعلقات تھے۔ اور چونکہ یہ انسان سے انسان کی نفرت اور بغض کے قائل نہ تھے، اس لئے کٹر مُلّا ان سے ناخوش تھے۔

باقی صاحب نے کئی بیواؤں کے وظائف مقرر کر رکھے تھے۔ ان بدنصیب بیواؤں میں اُن کے خاندان کی بھی کچھ خواتین تھیں اور ایسی بھی جن کا اُن سے کوئی رشتہ نہیں تھا۔ اور اس فریضہ میں بھی مذہب کی کوئی تخصیص نہیں تھی۔ باقی صاحب کو قلم پر اتنا قابو تھا کہ جس مذہب کی بابت آپ چاہیں اُن سے قلم برداشتہ یہ لکھوا لیجے کہ ہر مذہب نے انسانیت کو بڑے مقدم گردانا ہے اور مذہب ہر انسان کا ذاتی مسئلہ ہے اور مذہب کا سیاست یا تعصب سے کوئی واسطہ ہی نہیں ہے۔ اور انہی عقیدوں نے کٹر مُلّاؤں کو اُن کا دشمن بنا دیا تھا۔

راقم الحروف نے باقی صاحب کو ہمیشہ اپنے اُستاد کا درجہ دیا حالانکہ وہ اس نیازمند کو اپنا بہی خواہ اور دوست سمجھتے تھے۔ میں نے اُن سے بہت کچھ سیکھا۔ اکثر و بیشتر شانِ ہند کے اداریے اشاعت سے پہلے انھیں دکھائے اور اُن کے مُفید مشوروں سے اپنی ادبی خامیوں کو دُور کرنے کی کوشش کی۔

کتنے وزیروں کی تقاریر باقی صاحب نے لکھیں، کتنے نوآموز صحافیوں کو اداریے لکھنا سکھایا۔ اور کتنے فرضی قلمی ناموں سے ہر زبان کے مُلکی اور غیر مُلکی اخباروں میں کالم لکھے، یہ باقی صاحب کے سوا کوئی نہیں جانتا۔ کس کس کی مالی مدد کی، کس کس کو تعلیم کے زیور سے آراستہ کرایا، کس بیوہ کو ہر ماہ کتنا روپیہ دیا، یہ بھی وُہی جانتے تھے۔ ہر حال میں باقی صاحب کا چہرہ مُتبسم، مزاج میں شگفتگی، حاضر جوابی اور ہر موضوع پر گھنٹوں گفتگو کرنے کا ملکہ موجود تھا۔

سردار پٹیل بھی باقی صاحب سے خوش تھے۔ وہ جانتے تھے کہ آئی۔ اے۔ ایس کیڈر کے اس ہونہار اور بہترین صحافی کو کسی قسم کی مالی تنگی نہیں رہنی چاہئے۔ لہٰذا باقی صاحب کو مستقل طور پر ڈیڑھ ہزار روپیہ ملتا تھا۔

ایسا دیکھنے میں آیا ہے کہ قلم کے دھنی تقریر کے فن سے بہرہ اندوز نہیں ہوتے مگر باقی صاحب جس قدر بہتر لکھتے تھے، اُتنا ہی فن تقریر میں بھی اپنا جواب آپ تھے۔ مگر اُن کی تقاریر میں سیاسی دو غلاپن نہیں ہوتا تھا۔ وہ خالص ادبی، فنی، تنقیدی اور مذہبی ہر موضوع پر بے تکان بول سکتے تھے مگر سیاست کے گندے کھیل سے مُتعلق وہ زبان کو گنگ رکھنا ہی بہتر سمجھتے تھے۔

آپ کسی بھی لفظ کے معنی پُوچھئے، باقی صاحب بر جستہ اُس لفظ کے لغوی معنی ہی بتاتے، بلکہ اُس لفظ کا ماخذ کیا ہے اور کس زبان کا ہے، اس کی بھی تفصیل بتاتے۔ اس چلتی پھرتی لغات سے میں نے بیسیوں بار کئی الفاظ کے معنی پُوچھے اور ایک آدھ بار دیدہ و دانستہ ایسے الفاظ کے معنی دریافت کئے جن کی نسبت اپنی دانست میں یہ یقین تھا کہ باقی صاحب یا تو ڈکشنری سے دیکھ کر بتائیں گے یا کہیں گے کہ فلاں لُغات میں دیکھئے مگر صاحب باقی صاحب نے لفظ سُنتے ہی اُس کے معنی بتا دیئے اور یہ بھی بتایا کہ یہ فرانسیسی زبان کا لفظ ہے اور دوسرا فارسی کا۔

باقی صاحب غیر ضرر رساں صحافت، مُلکی مسائل پر بے لاگ تنقید اور قومی یکجہتی کے لئے جدوجہد میں جس انداز میں مُنہمک رہے اس کی مثال ملنا مشکل ہے کیونکہ وہ ایک خالص ہندوستانی کی حیثیت سے اپنے آپ کو پیش کرتا اس لئے مُعتدم سمجھتے تھے کہ ہندوستانی مُسلمانوں کے لئے ایک نظیر ثابت ہوسکیں کہ یہاں کا ہر مُسلمان وطن پرست ہے۔

باقی صاحب ہندوستان کو ترقی یافتہ ممالک کی صف میں نہ محض کھڑا دیکھنا چاہتے تھے بلکہ اسے ایک امتیازی شان کا حامل بنانے کی تمنّا اُن کے دِل میں تھی مگر زندگی نے وفا نہ کی اور مولانا باقی شبانہ روز کی محنت شاقہ کے باعث اپنی صحت کو برقرار نہ رکھ سکے اور بستر علالت پر دراز ہو کر ہمدرد کلینک میں داخل ہو گئے۔ اور اسی ہمدرد کلینک میں ہی وہ اللہ کو پیارے ہو گئے۔

رہے نام اللہ کا ——

بابِ انتقاد

"موجِ سحر" (مجموعۂ کلام)
ڈاکٹر انجنا سندھیر ایم-اے،
پی-ایچ-ڈی، احمد آباد، گجرات
ڈیمائی سائز - صفحات ۸۸
قیمت مجلد چالیس روپے

ڈاکٹر انجنا سندھیر ایک پنجابی الاصل ماہر ڈاکٹر ادب و طب ہونے کے علاوہ اردو کی مقبول و مستند شاعرہ ہیں۔ وہ یو-پی میں پیدا ہوئیں اور احمد آباد گجرات میں تعلیم حاصل کر کے وہیں اردو ہندی رسالہ جات کی ایڈیٹر رہ کر کالج میں پروفیسر ہیں اور ہندی، گجراتی، اردو پنجابی اور انگریزی میں مہارت رکھتی ہیں۔ والدچونکہ پاکستانی پنجاب سے نقل مکانی کر کے ہندوستان میں مستقل طور پر آ گئے اور بہ سلسلۂ ملازمت احمد آباد، گجرات میں رہنے لگے۔ لیکن تمام رشتہ داروں کے خطوط تو اردو زبان میں ہی آتے تھے اور والد کے انتقال کے بعد بھی یہ سلسلہ قائم رہا تو گھر میں خطوط کا جواب دینے کے لئے اس لڑکی نے اردو سیکھی اور اس میں ایسا انہماک پیدا کر لیا کہ شاعری بھی کرنے لگی۔ اور ماشاءاللہ چونکہ انگریزی، ہندی، گجراتی، پنجابی کے لوچ سے واقفیت رکھتی تھی، اردو میں بہت اچھے شعر کہنے لگی۔ مشاعروں میں بھی شرکت کرنے لگی، اور اچھی داد پانے لگی۔ کتاب زیرِ نظر اس شاعرہ کا پہلا مجموعہ ہے۔ شروع میں مشہور ادیب جناب راج بہادر گوڑ، پروفیسر شفیع اللہ چغتی اور پروفیسر گیلانی نے انجنا کی شاعری پر اپنے اپنے توصیفی خیالات کا اظہار کیا ہے۔

شاعرہ نے جا بجا حب الوطنی، فرقہ وارانہ ہم آہنگی اور حقیقی محبت کے جذبات کا اظہار کیا ہے۔ مختصراً نمونۂ کلام ملاحظہ ہو ؎

طلسمِ شب کو آ کر توڑتا ہے
اسے مکینِ سحر میں موڑتا ہے
مرا مذہب پیامِ امن و الفت
مرا مسلک دلوں کو جوڑتا ہے

نعتیہ اشعار سے کلام شروع ہوتا ہے ؎

میں بھی آنکھوں سے کبھی گنبدِ خضریٰ دیکھوں
آرزو ہے شہ بطحا کا میں روضہ دیکھوں
مجھ پہ بھی شاہِ دو عالم کی نظر ہو جائے
اوج پر اپنے مقدر کا ستارہ دیکھوں

غزلوں کا انتخاب ہے:-

زندگی زہر سہی زہر ہمیں پینا ہے
انجنا ہم کو تو اوروں کے لئے جینا ہے
ہم نے اس دیش کی دھرتی پہ جنم پایا ہے
ہم کو اس دیش میں مرنا ہے یہیں جینا ہے
ہم نے پہلے بھی لہو دے کے سجایا ہے اسے
اب بھی اس دیش کی رکشا کے لئے جینا ہے

ادھر سے گزری تو سب کا سلام کرتی چلوں
وہ مجھ سے روٹھ گئے ہیں سلام کرتی چلوں
جوان کا فرض ہے اس کی غرض نہیں مجھ کو
جو میرا فرض ہے میں احترام کرتی چلوں

ہم سے بچھڑے ہیں تری یاد کے منظر ایسے
اشک بھی سو کر گئے خواب بھی کم آتے ہیں
ظلم سہتے ہیں، ستم سہتے ہیں، غم سہتے ہیں
پھر بھی اے دوست ترے پاس چلا ہم آتے ہیں

رہِ الفت کی ہر دادی کو ہم پہچان لیتے ہیں
حیات و موت کیا ہے عشق میں ہم جان لیتے ہیں
اب اتنا تو شعور آیا ہے محبت کر کے اہلِ الفت میں
محبت کی ہر اک دھڑکن کو ہم پہچان لیتے ہیں

اُن کا انداز بہت لطف نما ہوتا ہے
حرفِ مطلب جو نگاہوں سے ادا ہوتا ہے
زر سے ہر چیز خریدی نہیں جاتی لوگو
دل کا سودا تو نگاہوں سے ادا ہوتا ہے

جب اکیلے میں تری یاد ستاتی ہے مجھے
ہر طرف تیری ہی صورت نظر آتی ہے مجھے
جاگتے رہتے ہیں سوتے نہیں آنکھوں کے چراغ
ایک آواز سی رہ رہ کے بلاتی ہے مجھے

بھولی سی وہ اب ہم پہ عنایت نہیں کرتے
اس بات کی ہم اُن سے شکایت نہیں کرتے
گر جاتے ہیں وہ لوگ زمانے کی نظر سے
وہ لوگ بزرگوں کی جو عزت نہیں کرتے
آ جاتے ہیں بچھڑے ہوئے نہ پنچھی یہ تالے
پکھ پنچھی کبھی الگ جماعت نہیں کرتے

اصلی ہندو پنجابی خاندان کی یو-پی میں پیدا ہونے والی، گجرات میں تعلیم حاصل کرنے والی، علم طب میں اعلیٰ پوزیشن کی مالک ایک لڑکی اردو میں شاعری کرے تو ہر اردو نواز کا فرض ہے کہ اس کی حوصلہ افزائی کرے اور خراجِ تحسین ادا کرے۔

ہیرا لال چوپڑہ

مَن کہ مکتوب الیہ

حنیف بھائی جان، تسلیم!

جنوری کے شمارے میں "عراق سے
ہمدردی" آپ کا اداریہ پڑھا ہے۔ آپ
ٹھیک کہہ رہے ہیں کہ ہندوستان کے غیر
مسلموں کو صدام حسین کی مخالفت کسی طور بھی
نہیں کرنی چاہیئے تھی۔ اپنے ملک کی فضا کو
پُرسکون رکھنے میں خود ہمارا ہی بھلا ہے۔ صدام
حسین نے دُنیا بھر کے سیاستدانوں کو مجبور
کر دیا ہے کہ فلسطین کے مسئلے پر سنجیدگی سے
غور کریں، بلکہ اسے مناسب ڈھنگ سے سلجھائیں۔
لیکن اس "مردِ مجاہد" نے امریکہ جیسے جابر ملک
کے ساتھ "پنگا" لے کر اپنے ملک کو تباہ و
برباد کروا لیا۔ اس سے پہلے کسی بھی جنگ
میں بموں کی اتنی زبردست بارش نہیں ہوئی
تھی۔ عراق کی بستی میں برسوں آگ سلگتی رہے گی۔
روس کے کمزور پڑ جانے کے بعد امریکہ کو کسی بھی
ملک سے کوئی خوف نہیں ہو رہا ہے۔ ابھی تک
صدام کو ٹھیک سے اندازہ بھی نہیں تھا کہ امریکہ
کے پاس کتنا جدید ہے جدید ٹیکنالوجی کی
طاقت اتنا ہے"

سیاست کے میدان میں بھی امریکہ
کا دل بالا ہے۔ کسی کو خرید لیا تو کسی کے
منہ بند کر دیئے۔ کسی کو دھمکایا، اُنہیں کو
ڈرا لیا۔ خود مسلم ممالک عراق کے دشمن ہو گئے
ہیں۔ اب ملک میں خانہ جنگی شروع ہو چکی ہے۔
اِدھر اپنے ملک میں جو خانہ جنگی چھڑی
ہوئی ہے، اُس کا کیا ہو گا؟ جنوری ہی میں
حسن خان سلیمانی کا ایک شعر کیا مناسب
لگ رہا ہے ۔

محترم سرور صاحب، تسلیم!

میرے ایک کرم فرما بھارت گئے تھے۔ وہاں سے وہ جو کتابیں لائے ہیں، اُن میں "یہ کوئے یار..." بھی ہے جسے میں نے پڑھا تو حیران رہ گیا کہ بھارت میں ایسی شگفتہ اُردو لکھنے والے غیر مسلم بھی موجود ہیں اور وہاں ایسی لاجواب کتابیں بھی اُردو میں شائع ہوتی ہیں جبکہ یہاں یہ کہا جاتا ہے کہ بھارت میں اُردو کو ختم کر دیا گیا ہے۔

یہ کوئے یار..." پڑھی تو ایسا لگا جیسے شیخ سعدی نے گلستان اُردو میں لکھدی ہے۔ دلی مبارکباد قبول فرمایئے ۔ نیازمند ۔

ندیم ۔ ماڈرن کوارٹرز، جہانگیر روڈ، کراچی ۔

سنبھلو پاگل ہوا نہ کر دے بگاڑ
اُٹھو گلشن کی دیکھ بھال کریں

ناسازِ طبیعت کا ذکر کرتے وقت میں
میر کا یہ شعر پڑھا کرتا تھا ۔

حالِ بد گفتنی نہیں اپنا
تم نے پوچھا تو مہربانی کی

پھر جمیل افغانی کا ایک شعر پسند آنے لگا ۔

دُکھتی رگوں سے آپ ہی واقف ہیں لیجئے
ہم کیا بتائیں درد کہاں ہے کہاں نہیں

اب لدھیانہ کے اندر پرتاپ نیر (مَن
کہ مکتوب الیہ) نے صحت کی غارت گری کا
ذکر جس عجیب انداز میں کیا ہے ۔ ایک
خوش خصال کی غزل کی طرح مصرعہ بے ربط
بے ساختہ ہو جاتا ہے۔

تو لو ۔

جو درد کیا ہوا کہ جو سہا نہیں سکا
(...شاکر)

ہمارے ملک میں ان دنوں بڑی بدنظمی
ہو رہی ہے ۔ ہمارے علاقے میں آج کل کا

ٹمپریچر ۷ ۔ ہے ۔ شمال کی جانب ۱۴
ہے جس کا مطلب یہ ہے کہ ماسکو سے بھی زیادہ
ٹھنڈ۔ چاروں طرف برف ہی برف ہے۔ ایک
علاقہ میں تاریں اُلجھ پڑی ہیں اور بجلی فیل
ہو گئی ہے۔ یہ بہت ہی اذیت ناک صورت
حال ہے۔ روشنی کے بغیر تو گزارہ ہو جاتا ہے
موم بتی آتش دان جلاتے ہیں، مگر ہیٹنگ کے بغیر
موجودگی میں جسم کو نیلا کر دینے والی سردی
روح فرسا ہی نہیں، جان لیوا بھی ہوتی ہے۔
(مگر یہ لوگ بہت جلد بجلی کو سنبھال لیتے
ہیں)

کل رات سے یہاں پانی کے پائپ
منجمد ہو گئے۔ جو کچھ گھر پانی کے بغیر گزارہ
کرنا پڑا۔ نیا سکرین لگا کر اگر کوئی پائپ
پھٹ گیا تو پورے گھر میں پانی ہی پانی ہو
جائیگا۔ ایمرجنسی میں جو کاریگر آتے ہیں،
چار چوگنا پیسے مانگ لیتے ہیں۔ ایک گھنٹہ
ٹھنڈ کا بھاؤ کون پوچھتا ہے۔

موٹر وے پر بُرا حال ہے۔ کار کا سفر
بہت ہی خطرناک ثابت ہو سکتا ہے۔ اسی

سب کے باوجود کوئی بھی کام بند نہیں ہوا۔ دفتر، دوکان، بینک، کارخانے سبھی کھلے ہوئے ہیں اور چل رہے ہیں۔ دیکھنے میں تو کام پر پہنچ نہ پانے کی معقول وجوہ ہیں کہ سخت برف باری ہو رہی ہے۔ کار خراب ہو گئی ہے۔ بسیں بند ہیں۔ سبھی لوگ بہت B نازک صورت حال کو جانتے اور سمجھتے ہیں، مگر پھر بھی یہ کوئی معقول وجہ نہیں ہے۔ کام پر پہنچنے کا انتظام اور اہتمام آپ کی اپنی ذمہ داری ہے۔

سرکار کی جانب سے ہدایت یہ ہے کہ سنبھل کے چلو، احتیاط برتو۔ موٹر کے بجائے ریل سے سفر کرو۔ وقت سے پہلے گھر سے نکلو۔ پاؤں جما کر چلو۔ بوڑھے اور بیمار لوگ امدادی اداروں سے فوراً رجوع کریں۔ پولیس ہر قسم کی مدد اور رہنمائی کے لئے ہر وقت موجود ہوتی ہے۔ (وغیرہ وغیرہ)

ہاں اتنا ضرور ہے کہ چھوٹے بچوں کے نرسری اور اسکول ضرور بند کر دیئے جاتے ہیں۔ بوڑھے اور بیمار لوگوں کی فوری مزاج پرسی کی جاتی ہے۔

دیکھا آپ نے۔ چھوٹے بچوں کی پرواہ کی جاتی ہے اور بڑوں کو محض احتیاط برتنے کی تلقین۔ بس یہی ہے یہاں کا فلسفۂ حیات! احتیاط برتنے کا مشورہ (محض مشورہ) ہی زندگی کی سیاست ہے۔ اور یہی اس کے نظم و نسق میں کلیدی حیثیت رکھتا ہے۔

ابھی ریڈیو پر خبر آ رہی ہے کہ سرکاری اہلکاروں نے سنٹرل لندن میں رہ رہے ۱۰۴۴ لوگوں کی ایک فہرست مرتب کی ہے۔ یہ وہ لوگ ہیں جن کا کوئی گھر بار نہیں ہے۔ اور جو شب زیرو "Sub Zero" والی راتیں ریلوے پلیٹ فارم یا کسی دوکان کے برآمدے میں تین بٹہ چار ہو کر گھٹنوں کو چھاتی میں دبائے کی ناکام کوشش میں گزار رہے ہیں جان میجر کی نئی سرکار نے فوری احکام جاری کئے ہیں کہ ان لوگوں کو ہسپتالوں میں ڈال لیا جائے، تاکہ جان لیوا سردی میں ٹھٹھر کر مر رہنے سے بچے رہیں۔

ظاہراً تو خوب نیک انتظام کیا ہے سرکار نے۔

مگر امدادی ادارے، سوشل ورکر ابھی نالاں ہیں۔ اُن کا کہنا ہے کہ بہت زیادہ سردی میں بہت زیادہ ٹھٹھرنے پر محفوظ جگہ پر پہنچا دیئے جانے میں کوئی خاص تک نہیں ہے جب سردی بہت زیادہ نہیں ہے اور کوئی بہت زیادہ نہیں ٹھٹھر رہا تو اُسے ریلوے پلیٹ فارم پر مرنے کے لئے چھوڑ دیا جائے۔

برطانیہ اپنے آپ کو صفِ اوّل کا ملک سمجھتا ہے۔ لندن اپنے آپ کو دُنیا کا دارُالخلافہ کہلانا چاہتا ہے۔ اور وہاں بھی ایسے لوگ موجود ہیں جو بے یار و مددگار پلیٹ فارم یا برآمدے میں پڑے بھوک اور ٹھنڈ سے بلک رہے ہیں۔ ع
شرم تم کو مگر نہیں آتی۔

جیون لال شرما
ہنسلو، لندن

شانِ ہند

جلد ۵۲ شمارہ ۴

چیف ایڈیٹر
سرور تونسوی

جوائنٹ ایڈیٹر
مطرب صحرائی

اِشاعت کا
۵۲ واں سال

پرنٹر، پبلشر، پروپرائٹر: وِدّیا پرکاش سَرور تونسوی
طباعت: خواجہ پریس، جامع مسجد دہلی۔ مقامِ اشاعت: دفتر ماہنامہ
"شانِ ہند" فلیٹ ۵ انصاری مارکیٹ، دریا گنج، نئی دہلی ۲-۱۱۰۰۰۔

اس شمارے کی اہم جھلکیاں

"آتشِ چنار" کو محض اس لئے ایوارڈ دیا گیا کہ جناب فاروق عبداللہ کی خوشنودی حاصل کی جا سکے، وگرنہ...... بلبل چہ گفت۔

غلطی کا عرفان اس وقت تک نہیں ہوتا جب تک کہ وہ بتائی نہیں جاتی: "حسنِ اصلاح" — زاہر علامی۔

میں نے ڈرائیور سے پوچھا "کیا معاملہ ہے؟"
"ٹرک زن حاملہ ہے۔"

"بچھڑے ہوئے لوگ" (ڈاکٹر اودے سِرن اِرمان)

"حفظِ ما تقدم" کہانی (اقبال باریکھ) "خوف کی نگری" کی دوسری قسط (اختر جمال)

"ماہیا" (دیپک قمر) "حاصلِ مطالعہ" (کمال گیاوی)

غزلیں۔ حقیر آستانی، سراج الدین سراج، نشتر اکبر آبادی۔

بابِ انتقاد، مَن کہ مکتوب الیہ
(مستقل کالم بدستور)

ہندو پرست ہوں نہ مسلماں پرست ہوں
دامن پرست ہوں نہ گریباں پرست ہوں
ہر ذرّۂ وطن سے ہے فیاض مجھ کو پیار
یعنی وطن پرست ہوں انساں پرست ہوں

فیاض گوالیاری

قیمت فی شمارہ۔ پانچ روپے
قیمت سالانہ پچاس روپے
لائف ممبری پانچ سو روپے

ممالکِ غیر میں:۔
بذریعۂ سمندری ڈاک -/۱۰۰ روپے
بذریعۂ ہوائی ڈاک -/۳۰۰ روپے

غزل

ڈاکٹر حقیر استانی مرحوم

تمہارے پاس تو رنگینیٔ قبا ہوگی
ہمارے حق میں خدا جانے کیا فضا ہوگی

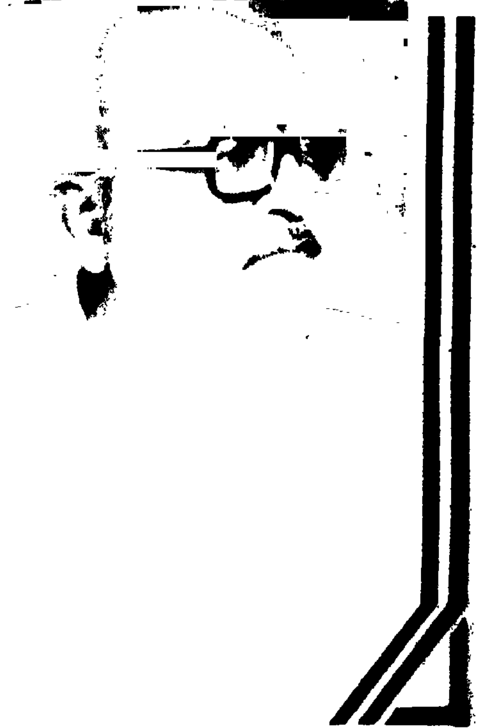
وفا ہماری نہ بھٹکے گی راستہ لیکن
وہ بے وفا ہے تو چلئے وہ بے وفا ہوگی

بڑھے گی چاروں طرف سے خرابیٔ طوفاں
جدھر بھی جائیں گے ہم منتظر قضا ہوگی

وہی انا کہ بہر طور لٹ ہی جاتی ہے
خدا گواہ کسی کا وہ آسرا ہوگی

پلٹ کے آئی ادھر یہ بڑی غنیمت تھی
پلٹ کے آئی جو تجھ تک تری صدا ہوگی

حقیر سوئے عدم چل دیے ہیں، ماتم کی
تمام دہر میں فرصت کسے بھلا ہوگی



اُردو ایوارڈز کے ناخداؤں کیلئے

ایک لمحۂ فکریہ

کچھ عرصہ سے اُردو ایوارڈز کی ایک نئی قسم "اجتماعی خدمات" ظہور پذیر ہوئی ہے۔

جب سے اُردو کتابوں یا اردو کے ادیبوں، شعرا اور نقادوں کو ایوارڈز دیئے جانے کا رواج شروع ہوا ہے، تب سے کر اب تک گنتی کے کچھ ہی ایوارڈز کے بارے میں کہا جا سکتا ہے کہ وہ پوری پوری ایمانداری، دیانتداری کے ساتھ "حق بہ حقدار رسید" کے مصداق دیئے گئے۔ وگرنہ عام طور پر یہی ہوتا رہا کہ ایوارڈز کا فیصلہ کرنے والے حضرات نے کسی سیاسی دباؤ کے تحت یا سفارشوں کے باعث اور یا پھر بھائی بھتیجہ واد سے متاثر ہوکر ایوارڈز کا فیصلہ کیا۔

کہتے ہیں کہ جب کسی کو "پنچ" مقرر کیا جاتا ہے تو قدرتی طور پر مجوزہ پنچ کے دل و دماغ میں صحیح فیصلہ کرنے کی قوت عود کر آتی

ہے اور وہ کچھ تو خدا کے ڈر سے اور کچھ انصاف کا ترازو ہاتھ میں ہونے کے باعث صحیح فیصلہ کرنے کی حتی کوشش کرتا ہے۔ جیسا کہ منشی پریم چند کے دو ایک افسانوں مثلاً پنچ پرمیشور وغیرہ میں اس کا بہترین مظاہرہ کیا گیا ہے۔

مگر اُردو ایوارڈز کا فیصلہ کرنے والے بعض اصحاب کے دل میں نہ تو خدا کا خوف ہی کچھ دکھائی دیتا ہے اور نہ ہی انصاف کا ترازو ہاتھ میں لیتے ہوئے اُن کے ہاتھ کانپتے ہیں اور وہ ایسے ایسے عجیب و غریب فیصلے کرتے ہیں کہ حق و انصاف دونوں سر پیٹ کر رہ جاتے ہیں۔

مگر اُردو ایوارڈز کا فیصلہ کرنے والے بعض اصحاب کے دل میں نہ تو خدا کا خوف ہی کچھ دکھائی دیتا ہے اور نہ ہی انصاف کا ترازو ہاتھ میں لیتے ہوئے اُن کے ہاتھ کانپتے ہیں۔ اور وہ ایسے ایسے عجیب و غریب فیصلے کرتے ہیں کہ حق و انصاف دونوں سر پیٹ کر رہ جاتے ہیں —

کچھ عرصہ سے اُردو ایوارڈز کی ایک قسم "اجتماعی خدمات" ظہور پذیر ہوئی ہے۔ اس "اجتماعی خدمات" کے تحت ایسے ایسے حضرات کو رقم خطیر عطا کی جاتی ہے جن کی اجتماعی تو کیا ادبی خدمات محض صفر کے برابر ہوتی ہیں۔ اگر تفصیل میں جایا جائے تو جن حضرات کو ناجائز نوازا گیا ہے وہ تو ناراض ہوں گے ہی، اس کے ساتھ جن پنچوں نے یہ فیصلہ کیا ہے وہ اور جان کے لاگو ہو جائیں گے۔

کچھ اُردو اکادمیوں نے یہ ڈھونگ رچا رکھا ہے کہ ملک بھر میں کچھ حضرات کو سوالنامہ بھجوا دیا جاتا ہے کہ اُن کی رائے میں اجتماعی خدمات کس ادیب یا شاعر کی قابلِ ایوارڈ ہیں۔ اور ہوتا یہ ہے کہ اکادمی کے ارکان جس کو بھی یہ ایوارڈ دینا چاہتے ہیں، اُس نام کے لئے سینکڑوں خطوط احباب سے منگوائے جاتے ہیں۔ اور اعلان یہ کیا جاتا ہے کہ سب سے زائد آرار اسی صاحب کے لئے موصول ہوئی ہیں، تاکہ ان پر کوئی حرف گیری نہ کر سکے۔

اس میں کوئی شک نہیں بعض فیصلے انتہائی بہترین اور حق و انصاف کی اعلیٰ مثال لئے ہوئے ہیں۔ مثال کے طور پر حکومت مدھیہ پردیش کا "اقبال سمّان ایوارڈ" اس سال جسٹس آنند نارائن مُلّا کو دیا گیا ہے جس سے ملک بھر کے ہر حصّے سے حکومت مدھیہ پردیش کو مبارکباد دی گئی ہے اور سراہا گیا ہے۔

"اجتماعی خدمات" کا فیصلہ کرنیوالوں کو چاہئیے تو یہ تھا کہ وہ ملک بھر کے ادیبوں، شاعروں اور نقادوں کو نظر میں رکھ کر فیصلہ کریں، مگر اس کا کوئی علاج نہیں کہ اُن کی کوتاہ بین نظریں آس پاس کے سفارشی گوشوں تک ہی دیکھنے کی عادی ہیں، خواہ کسی حقدار کا حق کیوں نہ مارا جائے۔ کیا آلِ احمد سرور، تارا چرن رستوگی، گوپی چند نارنگ، اختر الایمان وغیرہ ان حضرات کی نظروں میں کمتر ہیں جنھوں نے گوز صاحب اور تنویر علوی کے ناموں کا فیصلہ کیا ہے۔

غالب انسٹی ٹیوٹ، ایک ایسے وطن پرست کے باعث وجود میں آیا جسے ہم فخر الدین علی احمد کے نام سے جانتے ہیں اور اسی غالب انسٹی ٹیوٹ سے جو غالب کی یاد میں ایوارڈز دیے جاتے ہیں اگر اُن پر تفصیلی تبصرہ کیا جائے تو محترمہ بیگم عابدہ احمد یقیناً ناراض ہوں گی، جن کے بارے میں غالب ایوارڈ کا فیصلہ کرنے والے خود کہتے ہیں کہ بیگم صاحبہ یہ فرماتی ہیں کہ بھئی علی سردار جعفری یا کسی اور کو تو ضرور ایوارڈ دینا ہے، باقی آپ جس کو چاہیں ایوارڈز دے دیجئے۔ تو پھر ایسی حالت میں ایوارڈز کا صحیح فیصلہ کیسے ہو سکتا ہے۔ جناب حیات اللہ انصاری نے جب صحافت کا ایوارڈ (رقم کم ہونے کی وجہ سے) لینے سے انکار کر دیا تو یار لوگوں نے ایک ایسے اخبار نویس کو یہ ایوارڈ دے دیا جو ابھی صحافت کی دُنیا میں ایسا مقام حاصل نہیں کر سکے جس پر انھیں یہ ایوارڈ دیا جائے (ہم اپنے عزیز دوست رضوان احمد سے معذرت خواہ ہیں)۔ اسی غالب انسٹی ٹیوٹ نے جناب فکر تونسوی کی بجائے طنز و مزاح کا ایوارڈ کسی اور کو دیا تو ہم نے اس کے خلاف احتجاج کیا اور فکر تونسوی کو نظر انداز کرنے پر توجہ دلائی گئی تو اگلے سال فکر تونسوی کو یہ ایوارڈ دیا گیا۔

"بہ کوئے یار بہ اندازِ محرمانہ گزر" راقم الحروف کی تصنیف ہے اور جس کے بارے میں بلا خوفِ تردید کہا جا سکتا ہے کہ اس قبیل کی جملہ تصانیف "بہ کوئے یار..." سے کئی طرح سے کمزور ہیں، خواہ حضرت جوش ملیح آبادی کی "یادوں کی برات" ہی کیوں نہ ہو۔ مگر وہ محض اس لئے در خورِ اعتنا نہ سمجھی گئی کہ فکر تونسوی ایوارڈز کا فیصلہ کرنے والوں کا خوشہ چیں نہیں

ہے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ حکومتِ پنجاب نے "یہ کوئے یار" کو کنہیا لال کپور ایوارڈ سے نوازا۔ یو۔پی اُردو اکادمی نے بھی اس کتاب پر ڈیڑھ ہزار روپیہ کا غیر منصفانہ ایوارڈ دیا۔ حالانکہ اس قبیل کی ایسی کتابوں پر یہ ادارہ تین تین ہزار روپیہ کا ایوارڈ دے چکا ہے، جو "یہ کوئے یار ......" کی گرد کو بھی نہیں پہنچتی تھیں۔ اور یہ صرف اس لئے کہ یو۔پی اُردو اکادمی کے انعامی بورڈ کے اکثر ممبران شانِ ہند کے ایڈیٹر سے خوش نہیں تھے۔ بہار اُردو اکادمی اور مغربی بنگال اُردو اکادمی کی نسبت اگر خاموش ہی رہا جائے تو بہتر ہے۔ اِن دونوں اکادمیوں میں ماں بیٹیوں میں گم کرنے کا جو سلسلہ چل رہا ہے وہ تبصرہ کے لئے الگ موضوع چاہتا ہے۔

ساہتیہ اکادمی حکومتِ ہند کا ایک ایسا ادارہ ہے جس پر ملک کو فخر ہے۔ یہ ادارہ بقیہ ہندوستانی زبانوں کی تصانیف پر ٹھیک ٹھاک دیکھ بھال کر ایوارڈز کا فیصلہ کرتا ہے، مگر اُردو کے سلسلے میں جو فیصلے پچھلے سالوں میں کئے گئے ہیں وہ یقیناً حق و انصاف کے ترازو کے پلڑے برابر نہیں رکھ سکے۔ "آتشِ چنار" کو محض اس لئے ایوارڈ دیا گیا کہ جناب فاروق عبداللہ کی خوشنودی حاصل کی جا سکے۔ وگرنہ پنڈت جواہر لعل نہرو اور سردار پٹیل کے بارے میں جس کتاب میں زہر اُگلا گیا ہو اسے ایوارڈ کے قابل قرار دینا ملک پرستی نہیں، سیاست پرستی ہی ہو سکتا ہے۔

اس سال اُردو اکادمی دلّی نے تین غیر مسلموں کو اوّلین ایوارڈز سے نوازا ہے۔ اور یہ اس کی سیکولر شناخت کا نشان ہے۔ گو ڈاکٹر گوپی چند نارنگ کے ساتھ انصاف نہیں ہوا مگر پھر بھی اُردو اکادمی دلّی اس لئے مبارکباد کی مستحق ہے کہ اس نے اردو کو غیر مسلموں کی زبان سمجھا ہے۔

اُردو ایوارڈز کا فیصلہ کرنے والوں کی واقفیت کے لئے ہم مرحوم علامہ ڈاکٹر اقبال کے ایک فیصلہ کا ذکر ضروری سمجھتے ہیں۔ اور وہ یہ کہ غالباً ۱۹۳۸ء میں لاہور میں ایک اُردو مشاعرہ ہوا۔ اس مشاعرے میں بہترین کلام سُنانے والے شعرائے کرام کے لئے تین ایوارڈز کا اعلان کیا گیا اور ان انعامات کا فیصلہ کرنے کے لئے حضرتِ اقبال کو جج مقرر کیا گیا۔

مشاعرہ کے بعد ڈاکٹر سر اقبال نے اوّلین انعام کا حقدار جناب مہاراج بہادر برق دہلوی کو، دوسرا انعام کا حقدار جناب آزل کو اور تیسرے انعام کا حقدار منشی تلوک چند محرومؔ کو قرار دیا۔ کیونکہ ڈاکٹر اقبال کی نظر میں نہ کوئی ہندو شاعر تھا اور نہ کوئی مسلمان شاعر۔ اُن کی نظر میں صرف شعراء کا کلام تھا اور اُنھوں نے کلام کو ہی مدِ نظر رکھ کر فیصلہ کیا۔ حالانکہ بعض متعصب مسلم حضرات نے ڈاکٹر اقبال کو مسلم دشمن کہا، مگر اقبال تو اقبال تھا۔

کیا ہمارے وہ حضرات جن کو اُردو ایوارڈز کا "جج" مقرر کیا جاتا ہے، ڈاکٹر اقبال کی اس سلسلے میں پیروی نہیں کر سکتے۔

پروفیسر گوپی چند نارنگ کے اعزاز میں عشائیہ

پروفیسر اشتیاق عابدی کے مگرمچھ کے آنسو

حال ہی میں دلّی اُردو اکادمی نے پروفیسر گوپی چند نارنگ کو تنقید و تحقیق کے سلسلہ میں ایوارڈ دیا ہے۔ اس عزت افزائی پہ سردار شمشیر سنگھ شیر، جو ڈنمارک میں انڈین آرٹس پروموشن کونسل کے چیئرمین ہیں اور سیز سب رنگ ڈنمارک کے ڈائریکٹر ہیں، نے پروفیسر نارنگ کے اعزاز میں ایک پُر تکلف عشائیہ غالب اکیڈمی، بستی حضرت نظام الدین میں دیا۔ اس اَدبی محفل کی صدارت ڈاکٹر خلیق انجم جنرل سکریٹری انجمن ترقیٔ اُردو ہند، نے فرمائی۔ اور میٹرو پالیٹن کونسل کے سابق چیئرمین جناب پرشوتم گوئل نے مہمانِ خصوصی کی حیثیت سے شرکت فرمائی۔

دِلّی کی سرکردہ اَدبی شخصیتوں نے اس محفل میں شرکت اپنا فرض سمجھا اور مختلف سرکردہ دانشوروں نے پروفیسر نارنگ کو خراجِ عقیدت پیش کیا۔

جاپان کے سویاما نے جو آجکل اورینٹل کالج لاہور میں زیرِ تعلیم ہیں اور کچھ دنوں سے ہندوستان میں اسی غرض سے آئے ہوئے ہیں، اپنی مختصر سی تقریر میں ہندوستانی اور پاکستانی تنقید نگاروں اور محققین کے مُنہ پر اِس زور سے تھپّڑ مارا کہ یار لوگوں کو پسینہ آ گیا۔ مسٹر سویاما نے فرمایا کہ یہ لوگ میر کی شاعری کی خصوصیات گِنوائیں، چاہے دردؔ کی، اُس میں کوئی فرق نہیں ہوتا۔ آپ میرؔ کی جگہ دردؔ یا دردؔ کی جگہ میرؔ پڑھیں تو باقی عبارت ایک جیسی ہی ہوتی ہے۔ مگر آپ کو ٹھوس حقائق کا دُور دُور تک پتہ نہیں چلے گا۔ مگر ڈاکٹر گوپی چند نارنگ ایسے نکات سائنٹیفک انداز اور ثبوت کے ساتھ پیش کرتے ہیں کہ قاری میرؔ و دردؔ کی پہچان بآسانی کر سکتا ہے اور اپنے جوابی پیپر میں یہ حوالہ دے سکتا ہے کہ پروفیسر گوپی چند نے ایسا لکھا ہے۔

پروفیسر اشتیاق عابدی سکریٹری اردو اکادمی دلی نے فرمایا کہ ڈاکٹر گوپی چند کو یہ چھوٹا ایوارڈ دے کر اُن کے ساتھ ناانصافی کی گئی ہے۔ حالانکہ یہ اس سے بڑے ایوارڈ کے حقدار تھے۔ اور مجھے حیرت ہے کہ یہ ایوارڈ تین سال پہلے ان کو کیوں نہیں دیا گیا۔ عابدی صاحب نے یہ الفاظ کافی رقت انگیز انداز میں کہے۔ اور انہوں نے ایک منجھے ہوئے اداکار کی طرح اپنی ایکٹنگ سے پروفیسر نارنگ کو یہ یقین دلایا کہ اگلے سال اس سے بڑے ایوارڈ کے لئے آپ کی ایڈوانس بکنگ کر لی گئی ہے۔ حالانکہ جس کمیٹی میں نارنگ صاحب کو یہ ایوارڈ دیئے جانے کا فیصلہ کیا گیا تھا، اس میں پروفیسر اشتیاق عابدی موجود تھے اور انہوں نے ہی اس کی تصدیق کی تھی کہ نارنگ صاحب اسی ایوارڈ کے مستحق ہیں۔ پروفیسر گوپی چند نارنگ کے یارِ غار بلراج کومل بھی اس کمیٹی کے ممبر ہیں اور وہ اس کے عینی شاہد ہیں کہ عابدی صاحب نے اسی ایوارڈ کے لئے ہامی بھری تھی اور خود بلراج کومل صاحب نے بھی یہی مناسب سمجھا تھا کہ نارنگ صاحب کو یہی ایوارڈ دیا جائے۔

کینیڈا سے آئے ہوئے اشتیاق حسین صاحب، پاکستان کے ایک شاعر کے علاوہ محترم خسرو صاحب، ڈاکٹر ظہور قاسم صاحب، کنور مہندر سنگھ بیدی سحر، محمود ہاشمی، پروفیسر حنیف کیفی، پروفیسر ایس۔ آر قدوائی، جناب شارب ردولوی اور دیگر کئی حضرات نے نارنگ صاحب کو دل کی گہرائیوں سے مبارکباد پیش کی۔ جناب دلیپ بادل، متین امروہوی، وغیرہم نے منظوم خراجِ عقیدت پیش کیا۔

جناب شمشیر سنگھ شیر اور اُن کی سردارنی صاحبہ نے عشائیہ کا انتظام جس اعلیٰ انداز میں کیا، وہ نہ صرف قابلِ تعریف تھا، بلکہ مثالی بھی تھا۔

جناب ذہین نقوی نے نظامت کے فرائض حسبِ سابق اچھے انداز میں نبھائے۔

ادارہ شانِ ہند بھی تہِ دل سے پروفیسر نارنگ صاحب کو اس اعزاز پر، اور اگلے سال اس سے بڑے ایوارڈ کی ایڈوانس بکنگ پر مبارکباد پیش کرتا ہے اور دُعا کرتا ہے کہ ہندوستان میں اُردو کی بقا و حیات کی ضمانت کو خدا عمرِ طویل دے۔

مُبارکباد اور مُخلصانہ دُعا

بمبئی مرکنٹائل کوآپریٹیو بنک دریا گنج نئی دہلی نے پچھلے چار پانچ سالوں میں جو ترقی کی ہے وہ سب سید شمیم کاظم صاحب کی انتھک کوششوں، اُن کی خوش خلقی، قومی یکجہتی میں پختہ ایمان اور مذہبی تعصب سے کوسوں دُور ہونے کے علاوہ مالی طور پر کمزور مسلمانوں کی خدمت کا جذبہ، اور مُلکی معیشت کا استحکام ایسے نیک جذبات کا نتیجہ ہے۔

یہ ایک حقیقت ہے کہ غریب پسماندہ عوام کو بنکنگ کی سہولیات سے مستفید ہونے کا طریق کار یہی بمبئی مرکنٹائل بنک نے ذہن نشین کرایا ہے۔

اور آج یہ حالت ہے کہ جس قدر کھاتے اس بنک میں ہیں کسی دُوسرے بنک کی کسی ایک شاخ میں نہیں ہیں۔

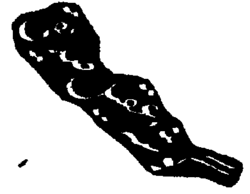
اس بنک کی یہ خصوصیت کہ ہر بنک کرمچاری اپنے کھاتہ داروں سے نہایت حلیمی، انسانیت اور اخلاق سے پیش آتا ہے دُوسرے بنکوں کے ملازمین کے لئے مشعلِ راہ کا کام دے سکتی ہے۔ اور یہ سب کچھ جناب سید شمیم کاظم صاحب کی ذاتی شرافت، حسنِ اخلاق اور ہر ایک کو خدا کا بندہ سمجھنے کے باعث ہے کہ بمبئی مرکنٹائل بنک کا ہر کارندہ اپنے سربراہ کے نقشِ قدم پر چل رہا ہے۔

حال ہی میں بمبئی مرکنٹائل کوآپریٹیو بنک لمیٹڈ کے بورڈ آف ڈائریکٹرز نے جناب جعفر بصری صاحب کو مینجنگ ڈائریکٹر اور جناب سید شمیم کاظم صاحب کو ڈپٹی مینجنگ ڈائریکٹر کی ذمہ داریاں سونپی ہیں۔

ہم جناب جعفر بصری صاحب اور جناب سید شمیم کاظم صاحب کو دِلی مُبارکباد پیش کرتے ہوئے اُمید کرتے ہیں کہ ہر دو ہستیاں اپنے فرائض کو بطریقِ احسن انجام دیتے ہوئے بمبئی مرکنٹائل کوآپریٹو بنک کو مزید ترقی کی راہوں پر گامزن کریں گی۔

ترقی پسند شاعر
دلیپ بادل کو صدمہ

اُردو کے ترقی پسند شاعر اور ادیب دلیپ بادل کے بڑے صاحبزادے خوشباش شہزادوت، جو حال ہی میں پیرس (فرانس) سے اعلیٰ تعلیم حاصل کر کے لوٹا تھا، اُسے نہایت پُراسرار انداز سے ۱۰ را پریل ۱۹۹۱ء کی شام کو قتل کر دیا گیا۔ مرحوم اُردو فارسی، بنگالی، ہندی، پنجابی کے علاوہ جاپانی، فرانسیسی اور جرمن زبانوں پر اچھی دسترس رکھتا تھا۔ اُس نے بیرونی ممالک انگلینڈ، جرمنی، فرانس، کینیڈا، سوئٹزرلینڈ اور امریکہ کی سیر و سیاحت بھی کی۔ مرحوم نے جامعہ ملیہ اسلامیہ اوکھلا دلی، جے۔ این۔ یو دہلی اور دلی یونیورسٹی سے تعلیم حاصل کی اور ہمیشہ اوّل پوزیشن حاصل کی۔ مرحوم کی عمر تیس برس تھی۔ سوگواروں میں اپنی ۲۷ سالہ بیوہ اور ایک پانچ سالہ دُختر چھوڑ گیا ہے۔



حُسنِ اصلاح

زار علامی

چودھری عبدالحمید شارق ادیب
فاضل ضلع مظفر گڑھ (پاکستان) کے رہنے والے تھے۔ ۱۹۸۹ء میں خدا کو پیارے ہو چکے ہیں۔ وہ اِس راز سے بخوبی واقف تھے کہ غلطی کا عرفان اُس وقت تک نہیں ہوتا جب تک کہ وہ بتائی نہیں جاتی۔ اسی لئے وہ عروض اور شعری معائب و محاسن سے متعلق نہایت پیچیدہ و اہم استفسارات کرتے رہتے تھے۔ میری ذات سے اُنھیں والہانہ محبت تھی۔ مجھ سے تمام عروض بذریعہ خط و کتابت پڑھا۔ جب بالغ النظر ہوئے تو دُنیا کو چھوڑ کر چل دیئے۔ اُنھیں کے اشعار مع اصلاح و توجیہہ دے رہا ہوں۔

شعرِ شارق

سانچے میں حادثات کے ڈھلنا پڑا مجھے
ہر ہر قدم پہ خود کو بدلنا پڑا مجھے

اصلاح:۔

سانچے میں ۔۔۔۔۔ علیٰ حال
مجبوریوں کے تحت بدلنا پڑا مجھے

توجیہہ:۔

اہلِ زباں "ہر ہر قدم" کے عوض "ایک ایک قدم" یا "قدم قدم" بولتے ہیں۔ "خود کو" حشو۔ بدلنے کی کوئی واضح وجہ موجود نہیں۔ "مجبوریوں کے تحت" کے ٹکڑے نے مضمون اُجاگر کر دیا۔ یعنی بدلنا تو نہیں چاہتا تھا مگر مجھے مجبوراً بدلنا پڑا۔ یہ مجبوریاں کسی بھی قسم کی ہو سکتی ہیں۔

شعرِ شارق

رحمت کو آگئی تھیں مری لغزشیں پسند
بے وجہ بار بار پھسلنا پڑا مجھے

اصلاح:۔

رحمت کو ۔۔۔۔۔ علیٰ حال
دانستہ بار بار پھسلنا پڑا مجھے

توجیہہ:۔

رحمت کو لغزشوں کا پسند آنا بھی تو پھسلنے کا ایک سبب ہوا۔ لہٰذا "بے وجہ" بے معنی۔ "دانستہ" نے شعر کو جامع کر دیا۔

شعرِ شارق

رنگ و بو کا رازِ سربستہ جہاں پہ کھل گیا
جب بھی سینہ چیر کے غنچے صدا دینے لگے

اصلاح:۔

کھل گئے سارے جہاں پر رازہائے رنگ و بو
زخم کھا کر جس گھڑی غنچے صدا دینے لگے

توجیہہ:۔

۱۔ "رازِ سربستہ" لوگ لکھتے ضرور ہیں، مگر میرے نزدیک یہ ترکیب مستحسن نہیں۔ راز ہمیشہ سربستہ ہی ہوتا ہے۔ یعنی وہ راز ہی نہیں جو سربستہ نہیں۔

۲۔ ترکیبی صورت میں ہائے مختفی کو ہائے مظہر بنانا خلافِ فصاحت۔

نوٹ:- ہائے مختفی ہمیشہ کلمات کے آخر میں مختفی ہوتی ہے اور یہ کبھی تلفظ میں نہیں آتی ہائے مختفی سے صرف ماقبل کی حرکت ہی اس کے اظہار کے لئے کافی ہوتی ہے اور ایسی ہائے مختفی سے پہلے فتح ہوتی ہے۔ بعض اوقات اس ہا کو ہائے مظہر بنالیا جاتا ہے۔ مگر ایسا صرف وہاں کیا جاتا ہے جہاں ترکیبی صورت واقع نہیں ہوتی۔

۳۔ "رنگ و بُو کا راز" کہنے کی بجائے "رازہائے رنگ و بُو" کہنا زیادہ مناسب ہے۔

۴۔ سینہ چیں شعر میں ارادے کا پہلو ہے۔ حالانکہ غنچے کے اس فعل میں ارادے کا کوئی دخل نہیں۔ اصلاح سے شعر بلیغ ہوگیا اور عیوب سے پاک بھی۔

رُباعی شارق:-

تحصیلِ ہنر کا جمع سامان کرلو
ہے زندگی مشکل اسے آسان کرلو
دم بھر میں چمک اٹھے گی بزمِ ہستی
افکار کی مشعل کو فروزاں کرلو

اِصلاح:-

تحصیلِ ہنر -- فی الحال

"ناروے کے بہترین افسانے" کی رسمِ اجراء

ڈاکٹر خورشید عالم

سفارت خانہ ناروے کے خوشنما سبزہ زار میں ہرچرن چاولہ کی مرتبہ کتاب "ناروے کے بہترین افسانے" کی رسمِ اجراء ناروے کے سفیرِ ہند ہز ایکسیلنسی یوہان گورڈر نے انجام دی۔ اس کتاب میں ناروے کے ممتاز افسانہ نگاروں کے سترہ بہترین افسانے نارویجین زبان سے اُردو میں پیش کئے گئے ہیں۔ ہندی اور پنجابی میں الگ الگ کتابوں کی صورت میں انھیں پورنیما چاولہ نے مرتب کیا ہے۔ اس اعتبار سے یہ ایک یادگار تقریب تھی کہ اس میں اُردو ہندی و پنجابی کے سرکردہ ادیبوں نے شرکت کی۔ پروفیسر گوپی چند نارنگ نے ہرچرن چاولہ کی مساعی کو سراہتے ہوئے کہا کہ دوسری زبانوں کے تراجم سے ہمارا اپنا ادب زیادہ دولت مند ہوتا ہے۔ ہرچرن چاولہ گیارہ سے زیادہ کتابوں کے مصنف ہیں، جن میں تین ناول اور چھ افسانوی مجموعے ہیں۔ اپنے تخلیقی سفر کے ساتھ ساتھ دوسری زبانوں کے ادب کو متعارف کرانا ایک ایسی توفیق ہے جو سب کو نصیب نہیں ہوتی۔ چاولہ نے نارویجین زبان میں بھی ہندوستانی ادب کو متعارف کرانے کے لئے ایک کتاب شائع کی ہے اور بشمول امرتا پریتم کے متعدد ہندوستانی ادیبوں کو ناروے بلوا کر انھیں نارویجین ادیبوں سے ملوانے کا اہتمام کیا ہے۔ پروفیسر نارنگ نے اس بات پر زور دیا کہ کہانی اور ناول کا ترجمہ اس لئے آسان ہے اور شاعری کا مشکل کیونکہ کہانی انسانیت کی آفاقی ساخت کو پیش کرتی ہے اور شاعری خصوصی ساخت کو۔ ہنرک ابسن کے ڈراموں سے ہم بخوبی واقف ہیں۔ چاہئے کہ نارویجین ناول پر بھی اس کے بعد توجہ کی جائے۔ ہندی، اردو، پنجابی میں ایک ساتھ تین کتابوں کی اشاعت کو پروفیسر نارنگ نے ایک اہم خدمت قرار دیا۔

ہندی مجموعے پر ساپتاہک ہندوستان کے اڈیٹر ہمانشو جوشی نے اظہارِ خیال کیا اور پنجابی مجموعے پر مشہور پنجابی افسانہ نگار ڈاکٹر مہیپ سنگھ نے جو پنجابی کتابوں کے ناشر بھی ہیں۔ اس موقع پر ہرچرن چاولہ اور پورنیما چاولہ نے بھی اظہارِ خیال کیا اور ان کوششوں کا ذکر کیا جو ان کتابوں کی تیاری کے سلسلے میں ان کو کرنا پڑیں۔ انھوں نے بتایا کہ دوسرے ملک کے ادب کو سمجھنا خاصا جوکھم کا کام ہے۔ اکثر ان کہانیوں کے کردار اپنے بنائے ہوئے کردار لگنے لگتے ہیں۔ ان کی خوشیوں اور دکھوں میں شرکت کا عمل گویا ان کو دوبارہ زندہ کرنے کا عمل ہے۔ انھوں نے سفیرِ کبیر کنول نین بخشی کی سرپرستی کا ذکر کیا جو اس وقت ناروے میں سفیر تھے اور اب عراق میں سفیر ہیں۔

جلسہ کی کارروائی تمل زبان کی ممتاز ادیبہ وسنتی نے چلائی اور اسے اعتبار و وقار بخشا۔

بچھڑے ہوئے لوگ

ڈاکٹر اودے سرن ارمان

میں ایک کباڑیا ہوں اور میرا مکان بستی کے باہر میونسپل چنگی کے قریب ہے۔ میرے گھر کے سامنے سڑک کی دوسری طرف خالی جگہ پر دو ڈیرے کچھ دنوں سے ایک دوسرے سے ذرا فاصلے پر نصب ہو گئے ہیں جس طرح اکثر نٹ، کنجڑ اور دوسرے خانہ بدوش جگہ جگہ ڈیرے ڈال کر کچھ وقت گزار کر پھر کسی دوسری جگہ چلے جاتے ہیں۔

میری بستی کے رہنے والے با عام رہ گیر ان دونوں ڈیروں کو دیکھتے ہوئے چلے جاتے ہیں اور کوئی بھی ان ڈیروں کے مقیموں سے نفرت کے مارے بات تک نہیں کرتا کیونکہ اسے وہ باعث شرم سمجھتے ہیں۔

ایک دن مجھے یونہی خیال آیا کہ ان ڈیروں میں رہنے والے بچھڑے لوگوں کے بارے میں کچھ معلومات حاصل کروں۔ چنانچہ میں بے دھڑک اُن ڈیروں کی طرف چل دیا۔

ایک ڈیرے میں ایک آدمی رسی بٹ رہا تھا اور اس کی بیوی بکرے کے سر کو درانتی سے پھاڑ پھاڑ کر ٹکڑے کر رہی تھی۔ اس کے تین بچے کنکروں سے کھیل رہے تھے۔ دوسرے ڈیرے میں ایک عورت چھوٹی مچھلیاں صاف کر رہی تھی اور اس کے چھ بچے کھیل کود میں مست تھے۔ میں نے رسی بٹنے والے شخص سے دونوں پریواروں کے بارے میں متعارف ہونے کی خواہش ظاہر کی۔ پہلے تو وہ کچھ مسکرایا مگر فوراً ہی انتہائی سنجیدگی کے ساتھ کہنا شروع کیا :-

"میرا نام امر اور سامنے والے کو سوکھا حکیم کہتے ہیں۔ وہ میرا سگا بھائی ہے اور مچھلی بن کر بازاروں میں بیچتا ہے۔ اُس کی بیوی بازار سے سستے داموں دھوتیاں خرید لاتی ہے جن کو امیر لوگ اپنی کاروں کی صفائی میں استعمال کرتے ہیں۔ اُن سے پتلی پتلی پٹیاں بنا کر اُن کی موٹے سوت کی طرح بٹائی کر لیتی ہے اور اُن کی دریاں بنا کر گاؤں میں بیچ آتی ہے، جنہیں غریب لوگ خرید لیتے ہیں۔ کارخانے کی بنی ہوئی دریوں کی طرح وہ خوبصورت تو نہیں ہوتی ہیں لیکن سستی اور مضبوط ضرور ہوتی ہیں۔ تین دن میں ایک دری بنا لیتی ہے۔ خالی بیٹھنے کا بھی تو زمانہ نہیں ہے۔ بیکار بیٹھے پڑے دل بھی نہیں لگتا ہے۔ اس کی مالی حالت مجھ سے اچھی ہے مگر میں بھی کسی کے آگے ہاتھ نہیں پھیلاتا ہوں۔ میں رسیاں بناتا ہوں جو کسانوں کے کام آتی ہیں۔ چارپائیوں کی ادوائن بھی بنتی ہے۔ میری بیوی ان رسیوں کو گاؤں میں گھوم پھر کر بیچ آتی ہے اور رات کو وہ میرے کام میں ہاتھ بٹاتی ہے۔"

"یہ کام تم اپنی بیوی ہی سے کیوں کرواتے ہو؟"

خفیف سی مسکراہٹ کے ساتھ کہنے لگا کہ "بکری کا کام مردوں کی نسبت عورتیں زیادہ کامیابی سے کر لیتی ہیں۔"

اُس نے ریمارک کستے ہوئے سلسلۂ کلام جاری رکھا "آپ دیکھتے نہیں شہروں میں بڑے بڑے مہذب گھروں کی لڑکیاں سیلز گرل بنی ہوئی ہیں؟ اسی طرح میری بیوی میری نسبت اچھی پھیری کر لیتی ہے۔ کیونکہ کسان لوگ دن بھر کام میں مصروف رہتے ہیں۔ گھر پر اکثر کم ملتے ہیں۔ بیوی گھر گھر عورتوں میں جا کر اپنی غریبی مجبوری ظاہر کر کے اُن کو کچھ نہ کچھ خریدنے پر راضی کر لیتی ہے۔ عورتیں نرم دل تو ہوتی ہی ہیں، جلدی پسیج جاتی ہیں۔ اس طرح ہم دونوں خاندان آرام سے گزارا کر رہے ہیں۔ کوئی بڑا شوق ہم لوگوں میں ہے نہیں۔"

یہ کہتے ہوئے وہ سن کی گتھی سلجھانے لگا میں نے اُس کے ڈیرے پر نظر ڈالی جو بہت گندہ اور پُرانا تھا۔ جہاں تہاں اُس پر پیوند لگے ہوئے تھے۔ پھر ایک نظر سوکھا سکھ کے ڈیرے پر ڈالی۔ یہی گت اُس کی تھی۔ ہلکا کپڑا ہونے کی وجہ سے اُس کی چھاؤں گھنی نہیں تھی اور گرمی کے مارے بُرا حال تھا۔ میں نے ماتھے کا پسینہ پونچھتے ہوئے اُس سے کہا۔

"اگر تم اپنے ڈیروں کو کسی پیڑ کے سائے میں لگایا کرو تو اس گرمی اور گھٹن سے تو بچ جاؤ!"

یہ سُن کر وہ مسکرایا جیسے کہ میرا مشورہ اُس کی نظر میں بچکانہ اور ناقص تھا۔ اُس نے مونچھوں کو سنبھالتے ہوئے کہا

"سیٹھ جی، زندگی میں پہلی بار آپ نے ہماری پریشانیوں کا احساس کیا ہے اور اس طرح ہمدردی کا اظہار کیا ہے۔ آپ جیسے لوگ اگر دیش کی باگ ڈور سنبھال لیں تو سچ مچ غریبی مٹ جائے۔ بدقسمتی سے حکومت اُن لوگوں کے ہاتھوں میں ہے جو ایئر کنڈیشنڈ کمروں میں رہتے ہیں۔ آپ کی محبت اور مشورہ کا شکریہ۔ کیا کبھی آپ نے سوچا ہے بھنگیوں کے محلے میں بدبو آتی ہے مگر وہ لوگ پریشانی محسوس نہیں کرتے اور خوش خوش وہیں رہتے ہیں۔ مذبح کے پاس سڑاند آتی ہے مگر اس کے آس پاس بھی لوگ بستے ہیں۔ مچھیروں کی بستی میں سڑاند آتی ہے، لیکن وہاں بھی لوگ رہتے ہیں۔ بھیڑوں کے باڑے کچی کھال چمڑی اور سینگ کے کارخانے میں کیا کم بدبو آتی ہے، مگر وہاں بھی لوگ کام کرتے ہیں۔ یہ سب احساس اور برداشت کا کھیل ہے۔ مستقل اس ماحول میں رہتے رہتے ہمیں گرمی سردی کی برداشت ہو گئی ہے۔ دیکھئے آپ پسینہ میں شرابور ہیں اور ہمارے ماتھے پر بُوند تک بھی نہیں ہے۔ پیڑوں کے نیچے ڈیرا لگانا ہمیں اس لئے پسند نہیں ہے کہ وہاں سے ڈیرے پر بندر بھی کود سکتے ہیں۔ طرح طرح کے کیڑے مکوڑے بھی گر سکتے ہیں۔ تیز ہوائیں چلنے پر شاخیں بھی ٹوٹ کر گر سکتی ہیں۔ پھل دار پیڑ ہو تو اس کے پھل بھی گر سکتے ہیں۔ اور انہیں توڑنے کی کوشش میں پھینکے گئے ڈھیلے پتھر بھی۔ چاندنی کا فائدہ بھی نہیں اُٹھا سکتے۔ بارش بند ہونے کے بہت دیر تک پیڑ کے پتّوں سے بوندیں ٹپکتی رہتی ہیں۔ میں دھوپ سے زیادہ سائے کو خطرناک سمجھتا ہوں۔ اُجالے سے زیادہ اندھیرے میں ظلم ہوتے ہیں۔ غیر آباد جگہ پر کچھ دنوں بسے، کمایا کھایا، پھر کہیں آگے جا پڑاؤ ڈالا۔ کوئی ہمیں اُٹھانے کی کوشش بھی نہیں کرتا کیونکہ بے ایمان کرایہ داروں کی طرح کسی کی جگہ پر قبضہ نہیں کرتے ہیں۔"

"برسات میں تو بہت پریشانی ہوتی ہوگی" میں نے ضمناً دریافت کیا۔

ٹانگ پر رینگ رہے چیونٹے کو پھونک سے گرا کر اُس نے کہا "برسات میں تو ہر غریب کو پریشانی ہوتی ہے لیکن اس موسم کا اپنا ایک لطف بھی ہے۔"

مختصر سا جواب دے کر وہ چپ ہوا تو میں نے پوچھا۔

"تم نے اس چیونٹے کو پھونک سے کیوں گرایا۔ انگلیوں سے پکڑ کر کیوں نہیں پھینک دیا؟"

زیرِ لب مسکراہٹ سے کہنے لگا۔

"پھونک سے اُسے کوئی تکلیف نہیں ہوئی، انگلیوں سے پکڑ کر پھینکنے پر وہ دباؤ سے مر بھی سکتا تھا۔ جیوؤں پر دیا کرنی چاہیئے۔"

میرے دل میں آیا کہ اس سے کہوں کہ تمہاری بیوی ابھی بکرے کا سر کاٹ چھانٹ رہی تھی۔ کیا وہ جیو نہیں تھا۔ مگر میں خاموش رہا۔ کیونکہ اُس نے میرے سوال کا صحیح جواب دے دیا تھا۔

"تم لوگ رات کو آرام سے سو لیتے ہو؟" میں نے اُن کی غیر محفوظ زندگی کے بارے میں معلومات کرنے کے خیال سے یہ سوال کیا۔ وہ چونکتے ہوئے بولا۔

"کیوں، سونے میں کیا پریشانی ہے۔ نہ کسی کا لینا نہ کسی کا دینا۔ سُکھ سے سونا سُکھ سے رہنا۔"

"لیکن دین کی فکر ہی تو سُکھ شانتی کی دشمن نہیں ہوتی ہے۔ اور بھی تو بہت سی باتیں ہیں۔ تم لوگ ہمیشہ غیر آباد جگہوں پر ڈیرا ڈالتے ہو۔۔۔۔"

اُس نے میرا سوال پورا ابھی نہیں ہونے دیا اور میرا مقصد سمجھ کر بول پڑا "سیٹھ جی، ہم ایسی جگہ جا کر پڑاؤ ڈالتے ہیں کہ اپنی حفاظت کی فکر ہی نہیں رہتی۔ آپ لوگوں سے زیادہ سرکار ہماری حفاظت کرتی ہے۔"

وہ اتنا کہہ کر بیڑی سُلگاتے ہوئے کہنے لگا "سیٹھ جی ہم ہمیشہ پولیس چوکی کے پاس بستے ہیں، یا میونسپل چنگی کے پاس۔ اِن دونوں جگہ رات جگا رہتا ہے۔"

اتنا کہہ کر اُس نے بیڑی کا لمبا کش مارا۔ اور میں اُن لوگوں کی ہوشیاری اور حقیقت کو سمجھ گیا۔ خانہ بدوش لوگوں کی زندگی علم سے کم، تجربے زیادہ معمور ہوتی ہے۔

"کیا تم لوگ کبھی اپنے ننھے مُنّے بچوں کے مستقبل کے بارے میں بھی کچھ سوچتے ہو؟" یہ میرا آخری سوال تھا۔

"ہم کل کی نہیں، آج کی فکر کرتے ہیں۔ جو کچھ ہم کر رہے ہیں، یہ بھی وہی کرنے لگیں گے۔ یا حالات کے مطابق جو اُن کے مزاج میں آئے گا۔ اپنا لیں گے۔ ہم نے بھی تو ایسا ہی کیا ہے۔ ہمارے پوروج راناپرتاپ سنگھ کے قلعے میں تلواریں، بر

برچھی بناتے تھے۔ جب ان کا راج پاٹ چھن چھن ہوگیا تو ہم لوگ بھی ادھر اُدھر بھاگ نکلے اور خانہ بدوشوں کی طرح بیل گاڑیوں پر ضروری سامان لئے گھومنے پھرنے لگے۔ مگر پیشہ وہی رہا۔ اتنی تبدیلی ضرور آگئی کہ ہم لوگ کسانوں کی ضرورت کے سامان بنانے لگے۔ مجھے وہ دھندہ مُشکل اور کم فائدہ کا لگا، اس لئے میں نے اُس کو چھوڑ دیا۔ سوکھا نے بھی چھوڑ دیا۔ وہ بھاؤ پرکاش کے ایک نسخہ کے مطابق چوُرن بنا بنا کر بیچنے لگا اور میں نے رسّی بنانے کا کام شروع کر دیا۔ رام بانس جنگل میں کافی ملتا ہے۔ مُفت کی چیز ہے۔ ذرا محنت کا کام ہے۔ اُسے کاٹ لاتا ہوں اور اس کی سن سے رسّی بنا لیتا ہوں۔ ہمارے ان دھندھوں میں کوئی خاص خرچہ نہیں ہوتا ہے۔ سرکار ہمارا کوئی خیال نہیں کرتی۔ ویسے جب ہمارا کوئی ٹھور ٹھکانہ ہی نہیں ہے تو سرکاری لون بھی کیسے ملے۔ قرض اسی کو ملتا ہے جس سے ادائیگی کی اُمید ہو۔ چنانچہ ہم غریب ہی بنے رہتے ہیں — ہم سب کی نظروں میں جنگلی اور پچھڑے ہوئے ہیں۔ پیٹ پالنے کے لئے کچھ بھی کر لیتے ہیں۔ کیسے بھی جی لیتے ہیں، کیسے بھی رہ لیتے ہیں۔ حقوق ہم لوگوں کو کوئی ہے ہی نہیں۔ دوسرے ہماری اوقات بھی نہیں کہ تفریح کے لئے کچھ خرچ کریں۔ گانے ہر وقت مُفت میں سُننے کو مل ہی جاتے ہیں۔ ہر گھر میں رکھا ٹی وی، ریڈیو ہو یا گلی میں لٹکتا ٹرانسسٹر۔ فلم کے ایڈورٹائزرس کی طرح بلند آواز ہی میں بجائے جاتے ہیں۔ کسی کو نہ تو کسی پڑھنے والے کی فکر ہے اور نہ ہی عبادت کے وقت کا لحاظ۔ انہیں نہ تو قانون روکتا ہے نہ سماج ٹوکتا ہے۔ جس طرح سچ کی تعریف کرنے والے بہت جھوٹ زیادہ بولتے ہیں، بالکل ویسے ہی شانتی کا ڈھنڈورا پیٹنے والے ہی زیادہ اشانتی پھیلاتے ہیں۔"

میں چپ چاپ یہ سب کچھ سُنتا رہا۔ امر کو یہ بھی خیال نہیں تھا کہ وہ ہندوستانی ذہنیت کے مطابق میرے سوال سے کہیں زیادہ جواب میں بول چکا تھا۔ میں نے بھی کچھ نہیں کہا کیونکہ اُسکی باتیں دلچسپ تھیں۔ دوسرے کسی دُکھیا کو اپنی کہانی سُنانے سے بھی راحت ملتی ہے۔ میں امر سے پھر ملنے کا وعدہ کر کے اپنے گھر واپس آتے ہوئے سوچتا رہا کہ ہم جن لوگوں کو پچھڑے ہوئے، غیر مہذب، جنگلی سمجھتے ہیں، اگر ان کو اچھی تعلیم ملے تو ان میں سے بہت سے ایسے لوگ بھی نکل سکتے ہیں جو دیش کی کایا پلٹ کر دیں۔ لیکن ادھر ابھی کسی کا دھیان ہی نہیں گیا ہے اور صحرا میں بیش قیمتی جڑی بوٹیوں کی طرح یہ لوگ جنم لیتے ہیں اور ختم ہو جاتے ہیں۔ اب تک ان خانہ بدوشوں کی بابت میرے دل میں جو شکوک تھے، وہ جاتے رہے۔ میری طرح اور لوگوں کو بھی خانہ بدوشوں کے بارے میں کئی شکوک ہوتے ہیں۔ ممکن ہے کچھ افراد ان میں غنڈے بدمعاش بھی ہوں جیسے ہر فرقہ میں اچھے بُرے ہر قسم کے افراد ہوتے ہیں۔ مگر امر اور سُوکھا حکیم کے ڈھنگ دیکھ کر یہ ظاہر ہوتا ہے کہ ہاتھ کی اُنگلیوں کی طرح سبھی لوگ یکساں نہیں ہو سکتے۔ بیوہ اور بے بس یہ سبھی انگشت نمائی کرتے ہیں۔ حاکم اور ظالم سے کوئی نہیں پوچھتا کہ ان کے مُنہ میں کتنے دانت ہیں۔ سرکاری چھاپے زیادہ تر بیوپاریوں کسانوں ہی کے گھر پڑتے ہیں۔ کوئی افسروں کے دروازے پر جا کر نہیں پوچھتا کہ تمہاری آمدنی کے مقابلہ اخراجات کئی گنا زیادہ کیسے ہیں۔ یہ سوچتے ہوئے اپنے مکان پر پہنچا تو دروازے پر ایک ٹرک کھڑا تھا۔ میں نے ڈرائیور سے پوچھا "کیا معاملہ ہے؟"

"ٹرک زن حاملہ ہے!"

میں عرصۂ دراز سے نمبر ۲ کا دھندہ کر رہا ہوں۔ ڈرائیور نے کوڈ ورڈ صحیح بتایا تھا۔ لہٰذا میں نے فوراً مکان کا پھاٹک کھول دیا اور ڈرائیور ٹرک کو صحن میں لے آیا۔ دھرم کانٹے سے ملی ہوئی پرچی ڈرائیور سے لینے کے بعد مال اُتروا لیا۔ ایسے دھندے میں پولیس کا ڈر ہوتا ہے مگر "سیّاں بھئے کوتوال تو ڈر کاہے کا۔" پولیس کا حصّہ ہر ماہ پہنچاتا رہتا ہوں۔ آج کے مال میں ریلوے کا مال زیادہ تھا اسی لئے ڈرائیور نے ٹرک کو زن حاملہ کہا تھا۔ اس میں مجھے نفع زیادہ تھا مگر جو کم بھی کم نہ تھا۔ آر۔ پی۔ ایف کا کرمچاری حساب لے کر چلا گیا۔ میں بچے ہوئے نوٹ جیب میں سرکاتے ہوئے سوچنے لگا۔ رشوت، ٹیکس کی چوری، نمبر دو کے دھندے، سبھی غیر قانونی ہیں لیکن اس دَور میں یہی فائدے کے دھندے ہیں۔ سرکاری کرمچاری سرکاری مال اونے پونے میں بیچ کر چلتا بنا۔ اس طرح محکمہ ریلوے کو گھاٹا نہیں ہوگا تو کیا ہوگا۔ آلوؤں کی بوریوں سے کھچا کھچ بھرے کولڈ اسٹورج کی طرح مسافروں سے بھری گاڑیاں روز آتی جاتی ہیں۔ مگر مال کی مار دھاڑ اور ٹکٹوں کی چوری کا یہ نتیجہ ہے کہ ریلوے ڈیپارٹمنٹ ہر سال گھاٹے میں جاتا ہے اور سرکار اس گھاٹے کو پورا کرنے کے لئے ہر سال ٹیکسوں میں اضافہ کرتی ہے۔ ہر محکمہ کا یہی حال ہے۔ بڑے لوگ مزے کر رہے ہیں اور چھوٹے بوجھ سے دب رہے ہیں۔ سوچتے سوچتے میرا سر بھاری ہوگیا۔ میں نے جھٹکا دے کر سر کو ہلکا کیا۔

"اکیلے چنے سے بھاڑ نہیں پھوٹتا ہے۔ ایک اچھا بھلا آدمی پورے دیش کو اچھا بھلا نہیں بنا سکتا۔" میرے دماغ میں یہ خیال آیا۔ میں نے ادھر اُدھر دیکھا۔ دور چوراہے پر گاندھی جی کا بُت دکھائی دیا اور اُسی وقت دماغ میں یہ خیال آیا کہ اس اکیلے شخص نے بھی تو پورے دیش کو بدل ڈالا تھا۔ انگریزی حکومت سے نجات دلا دی تھی۔ مگر اُن جیسا وطن پرست حق پرست اور قوم پرست بھی تو ہونا چاہیئے۔ اس دَور میں یہ صفات تو عنقا ہیں۔ ہر ایک خود غرض ہے اور دولت کمانے کی فکر کے علاوہ اور کچھ ارادہ ہی نہیں رہ گیا ہے۔

"حرام زادی میری تمام دن کی محنت کا مٹی میں ملا دیا۔" یہ چونکا دینے والے الفاظ جو ہی میں نے بلند آواز میں سُنے تو میرے خیالات کا تانتا ٹوٹا اور میں نے آواز کی سمت دیکھا تو اپنے ڈیرے میں سوکھا اپنی بیوی سے ہاتھا پائی کر رہا تھا۔ اس کا بھائی اور بیوی دروپدی چیر ہرن کے وقت پانڈوں کی طرح چپ چاپ یہ سب کچھ دیکھ رہے تھے۔ مجھ سے نہ رہا گیا اور میں نے بھاگ کر سوکھا کو پکڑ کر ایک طرف کھینچتے ہوئے کہا "عورت پر ہاتھ اُٹھانا بزدلی ہی نہیں بے وقوفی بھی ہے۔ اگر بیوی سے کچھ

مشکل ہو بھی جائے تو یونہی کہہ سن لیتے تم اپنا گھر بستی کو تماشا گاہ مت بناؤ۔ اور تم اور تمہاری بیوی بیٹھے بیٹھے گھر گھر دیکھتے رہے، سوکھا کو منع نہیں کر سکتے تھے کیا؟"

میری بات سن کر دونوں نے ایک سُر میں کہا۔ "کسی کے گھریلو معاملات میں دخل نہیں دینا چاہیئے۔" یہ سن کر مجھے بڑی حیرت ہوئی۔ میں اُن کے چہرے کو دیکھتا رہا۔ کیسے عجیب لوگ تھے ابھی میں سوکھا کو پکڑے ہوئے تھا تاکہ وہ پھر نہ بیوی کو پیٹنے لگے۔ سوکھا کی بیوی نے مجھے مخاطب کرتے ہوئے اپنے گالوں کو سہلاتے ہوئے کہا۔

"سیٹھ جی، تم جاؤ اپنا کام کرو۔ میں نے پٹنے کا کام کیا ہے سو پٹ رہی ہوں۔ غلطی پر سزا نہ دینا ظلم کو شہہ دینے جیسا ہوتا ہے۔ مجھے اپنے پٹنے کا کوئی افسوس نہیں ہے۔ میں نے کام ہی ایسا کیا ہے۔"

اتنا کہہ کر وہ چپ ہوگئی اور خاموش بیٹھ کر سلیقے سے کپڑے ٹھیک کرنے لگی۔ میں نے سوکھا کو چھوڑ دیا اور اُس کی بیوی کو بغور دیکھتے ہوئے سوچنے لگا کہ شاید اس کے پٹنے کا کوئی خاص راز ہو۔ چوٹوں کی ہاں ضرور ہے مگر عورت کا کیا پتہ کہاں اور کب ناک کٹا بیٹھے۔ اب عورتیں بھی تو آدمیوں کی دیکھا دیکھی موڈرن ہوتی جا رہی ہیں۔ میں نے نہ جانتے ہوئے سوکھا سے انتہائی نرمی سے کہا: "بھائی تمہیں تو اس طرح غصے میں کبھی نہیں دیکھا۔ آج تمہیں یہ کیا ہوگیا؟"

"بات یہ ہوئی سیٹھ جی، میں چوُرن بنا کر بیچتا ہوں۔ کل فروخت کرنے کے لئے چوُرن کوٹ چھان کر رکھا تھا۔ اس نے جلدی میں ڈبے سے بجائے بورا (شکر) اس میں ڈال دیا۔" یوں کہہ کر وہ خاموش ہوگیا۔

میں نے کہا "بھیا بورا اُوپر سے اتار لو۔ چوُرن کا کیا بگڑ گیا۔ اس طرح اس کا ذائقہ اور بھی اچھا ہو جائے گا۔"

"سیٹھ جی دوا میں ملاوٹ کرنا پاپ ہوتا ہے، یہ چوُرن رشی منیوں کے نسخہ پر بنایا گیا ہے۔ اس میں کسی بھی طرح کا اضافہ ٹھیک نہیں ہے۔ دوا میں ملاوٹ، حکیم کی ملاوٹ، اور یہ حرکت کسی حکیم کی شہرت کو بگاڑنے کا موجب ہوتی ہے۔ بھگوان کی بخشی ہوئی برکت جاتی رہتی ہے۔ دوسرے یہ کہ جو لوگ میرا چوُرن استعمال کرتے ہیں وہ ذائقہ میں فرق دیکھ کر ملاوٹ کے خیال سے اسے خریدنا بند کر دیں گے۔ اس سے میری ساکھ کو دھکا لگے گا۔ یہاں روزی روٹی ہی کا نہیں پیشے کی آبرو کا بھی تو سوال ہے۔ میں چھتریوں کے ونش سے ہوں۔ مجھے اپنے اخلاق پر حرف نہیں آنے دینا ہے۔ غریب کے پاس دولت تو ہوتی ہی نہیں، ایمان بھی نہ رہے تو وہ کس کے سہارے جئے گا۔ اب شام ہوگئی ہے۔ سب دکانیں بند ہوگئی ہوں گی۔ یہ دوائیں کہیں سے نہیں مل سکیں گی، ورنہ میں رات ہی رات میں پھر کوٹ چھان کر تیار کر لیتا۔"

سوکھا کو دلاسہ دیتے ہوئے میں نے کہا۔

"تمہیں میں ابھی سب دلا دوں گا۔ چلو میرے ساتھ۔"

یہ سن کر وہ خوش ہوگیا اور میرے ساتھ چل دیا۔ میں نے ایک بنیے والے کی دکان کھلوا کر پورا نسخہ دلا دیا۔ رات کے بارہ بجے تک تو میں نے اس کے ہاون دستے کی آواز سنی، پھر میں سوگیا۔ پتہ نہیں وہ کب تک کام کرتا رہا۔

دن نکلے پتہ چلا کہ بدایوں میں اُردو بھاشا کو اُتر پردیش کی دوسری سرکاری زبان قرار دینے کی مخالفت میں نکالے گئے جلوس نے ہندو مسلم فساد کا روپ دھار لیا۔ اور لاکھوں کروڑوں کا مالی نقصان ہی نہیں ہوا بلکہ کئی بے گناہوں کی جانیں بھی گئیں۔ سوکھا حکیم نے جب گھر میں اس فساد کے بارے میں ذکر کیا، اُس کی بیوی نے کہا۔

"اُردو ہندی کا کیا جھگڑا ہے — یہ دو بولیاں ہیں۔ ایک کو ہندو بولتا ہے، دوسری کو مسلمان بولتا ہے۔ کہیں بولیاں بھی جھگڑے کی بنا بنتی ہیں۔ ہر جانور، ہر پرندے کی بولی ایک دوسرے سے الگ ہے، مگر کسی کو بھی کسی دوسرے سے اس بنا پر جھگڑتے نہیں دیکھا۔ ہمیں تو سب کی بات سمجھ میں آتی ہے اور جیسے مسلمان بولتے ہیں، ویسے ہی ہندو بھی بولتے ہیں۔ چلو میں ہندی بول رہی ہوں کہ اللہ —" ان پڑھ بیوی جی نے بھولے پن سے کہا۔

"یہی ہندی ہے اور یہی اُردو ہے۔"

"تو پھر ہندو مسلمانوں میں فساد کا پاگل پن کیسے پیدا ہوا؟"

"تم اپنا کام کرو، بال کی کھال مت نکالو۔ یہ بھید تمہاری سمجھ میں نہیں آئے گا۔"

ابھی اس گھنٹہ پر بات چیت ہو رہی تھی کہ چوُرن لینے آئے ہوئے کسی گاہک نے کہا۔

"حکیم جی میرے بچے کے پیٹ میں درد ہے ہسپتال جا نہیں سکتا۔ بستی میں جھگڑا ہوگیا۔ جلدی سے چوُرن دے دو۔"

سوکھا نے ڈبہ کھولتے ہوئے پوچھا: "کیا ہوا بھئی! کچھ بتاؤ تو سہی۔"

"بستی میں آگ زنی اور لوٹ مار بھی ہوئی ہے۔ کچھ لوگوں کے مرنے کی بھی سماچار ہے۔ کسی ہندو کے آنگن میں چیل کے پنجوں سے چھوٹ کر کوئی تازہ ہڈی گر گئی تھی۔ اُس نے سمجھا کہ یہ کسی نے پھینکی ہے۔ بس یہی ہڈی جھگڑے کا کارن بن گئی۔ لوگ طیش میں بھرے بیٹھے ہی تھے۔ سوکھے بھوسے میں آگ لگتے دیر نہیں لگتی ہے۔ وہ تو خیر ہوگئی کہ پولیس مستعد تھی۔ فوراً آگئی۔ تمام بستی میں کرفیو لگ گیا ہے۔"

"کرفیو لگ گیا ہے؟" سوکھا نے پریشانی کے انداز میں پوچھا۔

"جی ہاں کرفیو لگ گیا۔ جھگڑے شانت کرنے کے لئے سرکار کے پاس یہی ایک ہتھیار ہے۔ بھگوان جانے پبلک بھی کس مٹی کی بنی ہوئی ہے کہ کرفیو میں اُٹھائے گئے دکھوں کو جلدی ہی بھول جاتی ہے۔ ذرا ذرا سی باتوں پر لوگ ایک دوسرے کو مارنے کاٹنے پر اُتر آتے ہیں اور یہ بھول جاتے ہیں کہ سب ایک ہی بھگوان کے بنائے ہوئے ہیں نہ انھیں مذہبی رہنماؤں کی تعلیم یاد رہتی ہے نہ دھرم گرنتھوں کے اُپدیش۔ محبت، بھائی چارہ

اور برداشت کا مادہ ختم ہوتا جا رہا ہے۔ پہلے زمانے میں کیا لوگ، بچے نہیں تھے۔ چند خود غرض راجہ یا نواب لوگوں کا خون بہاتے تھے، مگر پبلک پبلک سے نہیں لڑتی تھی۔ آج پرجا پرجا سے لڑتی ہے۔ پڑوسی پڑوسی کا قتل کرتا ہے، اس لئے اس خون خرابے کا انت بھی نہیں ہوگا۔"

وہ آدمی کے جا رہا تھا اور سوکھا حکیم چورن کی پڑیاں بناتے ہوئے سوچ رہا تھا کہ آج بازار بند ہونے کی وجہ سے اُس کا چورن نہیں بک سکے گا اور بچے بھوکے رہ جائیں گے۔ وہ تو روز کنواں کھودتا اور روز پانی پیتا تھا۔

جب چورن لے کر وہ شخص چلا گیا تو سوکھا کہنے لگا کہ پل بھر کو میرے دماغ میں آیا کہ میں اسی ایک گاہک سے دوپہر کے کھانے لائق روپے اینٹھ لوں، مگر ایک دم خیال آیا کہ کرفیو کے وقت میں تو سونے سے بھری جیبوں والے بھی بھوکے رہ جاتے ہیں۔ جب بازار ہی بند رہے گا تو آٹا دال خریدا کہاں سے جائے گا۔" چنانچہ وہ اپنے اصول سے نہیں گرا اور چورن کے صحیح پیسے ہی لئے۔

امر کا کنبہ چھوٹا تھا۔ دوسرے اس کی بیوی دیہات میں رسّی بیچنے سویرے جایا کرتی تھی اس لئے شام کو زیادہ کھانا بنا لیتی تھی تاکہ صبح سویرے بھی وہ کچھ کھا پی کر گھر سے نکلے۔ لہٰذا امر کے کنبے نے صبح کو رات کا بچا ہوا کھانا تھوڑا تھوڑا کھا لیا۔ مگر سوکھا حکیم کے بچوں کو کھانے کو کچھ بھی بچا ہوا نہیں تھا۔ اُن کو جلدی ہی بھوک ستانے لگی۔ بیوی اپنے بچوں کو راجا پرتاپ کی کہانیاں سنانے لگی۔ طرح طرح کی باتیں سنا سنا کر بہلاتی رہی مگر بھوک اُپدیش سے اور عشق سندیش سے شانت نہیں ہوتے۔ جب بچوں کا رونا بلکنا دیکھا نہیں گیا تو بیوی نے سوکھا سے کہا

"تم کہو تو امر سے کچھ لے آؤں۔ اُس کی بیوی دو وقت کا راشن ضرور رکھتی ہے۔"

"پریشانی کے وقت میں اپنوں سے مدد لی ہی جاتی ہے، لیکن یہ بھی تو دیکھنا چاہئے کہ پڑوسی یا اپنا واقعی مدد کرنے کی حالت میں ہے کہ نہیں

ایسے موقع پر بڑے بڑے جاہ و حشمت انسان منہ پھیر لیتے ہیں۔ وہ تم سے غریب ہے۔ اُس نے کوئی طعنہ مار دیا تو منہ لٹکائے آؤ گی۔"

"وہ اپنا ہے اور اپنے کی گالی کا بھی بُرا نہیں ماننا چاہئے۔ کبھی کبھی بچوں کی بھوک بجھانے کے لئے مونچھیں نیچی کرنی پڑ جاتی ہیں۔"

"کمشتری ایسا نہیں ہوتا ہے۔ بھوک ایک پریکشا ہے اور ایسے وقت میں ہمت اور صبر سے کام لینا چاہئے۔ وہ ہوتے ہوئے بھی کچھ نہ دینے کا بہانہ بنا سکتا ہے۔ میں چورن لے کر گاؤں میں جاتا ہوں اور وہاں سے کچھ نہ کچھ لے کر ہی لوٹوں گا۔ شام تک کا وقت جیسے تیسے کٹ ہی جائے گا۔ کوئی بھوک سے نہیں مرتا ہے۔"

"مگر گاؤں میں چورن لے گا کون؟ محنت کرنے والوں کا پیٹ خراب نہیں ہوتا ہے۔ انھیں وقت پر بھر پیٹ روٹی ملتی ہی نہیں۔ وہ چورن کیا لیں گے؟"

"تم ٹھیک کہتی ہو، مگر پھر بھی کچھ نہ کچھ ملے گا۔ چورن چٹخارے کے لئے بھی تو کھایا جاتا ہے آدمیوں سے زیادہ عورتیں کھاتی ہیں۔ جب سونا پیٹ میں تھا تو تم کتنا چورن کھاتی تھیں۔"

بیوی یہ سن کر گھونگھٹ میں مسکرائی —

اسی وقت بڑی لڑکی بولی" پاس ہی گنے کا کھیت ہے، وہاں سے دو دو گنے لے آتے ہیں اور انھیں چوس کر شام ہاتھ آ جائے گی۔"

یہ سن کر سوکھا مسکرایا اور بولا "یہاں گنے کے چھلکے پڑے دیکھ کر ہم پر گنے چوری کرنے کا الزام لگے گا۔ ہاں مجبوری اور بھوک کے باعث تم کھیت ہی میں جا کر دو دو گنے چوس آؤ۔ لیکن دھیان رہے دو سے زیادہ کوئی نہیں توڑے گا۔ چوری کر کے پیٹ نہیں بھرنا چاہئے۔"

"ٹھیک ہے، ہم وہیں جا کر کھا آئیں گے!" سب نے کہا مگر اسی وقت پولیس کی جیپ آتی دکھائی دی۔ سوکھا نے فوراً سب کو گھر ہی ٹھہر جانے کے لئے اشارہ کیا۔ سب بچے سہم گئے۔ جیپ گلی تک آ کر واپس چلی گئی۔

بچے فوراً چلنے کے لئے تیار ہو گئے تو میں نے سوکھا سے کہا کہ ذرا صبر کرو میں گھر سے ہو کر آتا ہوں۔ اس پر سوکھا نے بیوی بچوں سے کہا کہ ایسا کام مت کرو جس سے لوگ کہنے لگیں کہ سوکھا حکیم کے بچے چوری کرتے ہیں۔ حالانکہ کوئی بھی غلط کام چھپائے سے چھپتا نہیں ہے۔ دامن میں رکھے انگار کی طرح ظاہر ضرور ہو جاتا ہے۔"

میں کچھ روٹیاں لے کر سوکھا کے ہاں پہنچا اور سوکھا سے کہا۔" تم لوگ ہندو ہو، میں مسلمان ہوں، کیا تم مسلمان کی روٹیاں قبول کر سکتے ہو؟" یہ سن کر وہ مسکراتے ہوئے بولا۔

"سیٹھ جی، قدرت کسی بھی چیز پر ہندو یا مسلمان کی مہر لگا کر پیدا نہیں کرتی ہے۔ بھوجن اور بھوک کا ذات پات سے کوئی تعلق نہیں ہوتا ہے۔ آپ نے ہم پر اتنی مہربانی کی ہے۔" روٹیوں کی طرف ہاتھ بڑھاتے ہوئے سوکھا نے کہا۔

میں نے کہا کہ یہ کوئی مہربانی نہیں۔ ہمارے مذہب میں یہ حکم ہے کہ مسلمان کو بلا تفریق مذہب و ملت اپنے بھوکے پڑوسی کو کھانا کھلا کر ہی خود کھانا چاہئے۔ آج تمہارے یہاں چولہے سے دھواں نہیں اٹھا ہے۔ اس لئے میں نے اپنا فرض ادا کیا ہے۔

رات ہو گئی، مگر کسی کو خوف کے مارے نیند نہیں آ رہی تھی، ہر طرف شام ہی سے ہاؤ ہو دھائیں دھائیں کی آوازیں آ رہی تھی۔ سوکھا حکیم اور امر ایک جگہ بیٹھے تھے اور آپس میں کچھ باتیں کر رہے تھے کہ میں بھی اُن کی خیر خیریت دریافت کرنے جا پہنچا۔

سوکھا نے امر سے کہا۔ "اگر لوگ یونہی آپس میں لڑتے رہے تو اس دیش کا کیا ہوگا؟"

سوکھا حکیم نے جواب دیا" بربادی —! مہابھارت کا نتیجہ سامنے ہے۔ میل جول اور شانتی سے رہنا ترقی کے لئے ضروری ہے۔ انھیں دونوں چیزوں کی کمی ہوتی جا رہی ہے ....."

ابھی سوکھا حکیم کچھ اور کہنا چاہتا تھا کہ امر نے اُس کو چپ رہنے کا اشارہ کیا اور آبادی کی

طرف اشارہ کرتے ہوئے بولا "دیکھو چند گنڈے آپس میں جھگڑ رہے ہیں اور شہر کی طرف سے کچھ کھینچے چلے آرہے ہیں۔" سوکھا نے ٹارچ کی روشنی پھینکی تو پتہ چلا کہ وہ گنڈے کسی بچے کی لاش کی کھینچا تانی کر رہے ہیں۔ فوراً دونوں ادھر چل پڑے۔ کتوں کو بھگا کر لاش اٹھا لائے۔ یہ چھ، سات سال کی بچی کی لاش تھی۔ سوکھا بولا "یہ کس کی لڑکی ہو سکتی ہے؟" اس نے کہا "ابھی یہ بچی نہ ہندو ہے نہ مسلمان کوئی نشان ایسا نہیں ہے جو بتایا جا سکے کہ کس کی لڑکی ہے۔ ہاں میں اتنا تو کہہ سکتا ہوں کہ یہ ایک انسان کی بچی ہے، ہندوستان کی بیٹی ہے۔ ایسے معصوموں کا خون کرنے والے لوگ ضرور پتھر کا کلیجہ اور لوہے کا دل رکھتے ہوں گے۔

سوکھا نے آہستہ سے کہا "اگر یہ زندہ ہوتی تو ہم اس کو پال لیتے۔"

بات کاٹ کر جلدی سے اس کی بیوی بولی "پال پوس کر بھی کیا کرتے۔ اتنی سندر لڑکی تمہاری مانی بھی نہیں جاتی اور کوئی نہ کوئی تم سے لے جاتا۔ اوّل تو پولیس ہی تمہیں چین سے بیٹھنے نہیں دیتی۔ اب اس کو کہیں پھینک دو ورنہ مصیبت میں پڑ جاؤ گے۔"

"اس کی مٹی خراب کرنے کے لئے سڑک پر پھینک آنا ٹھیک رہے گا؟" سوکھا نے سوال کیا اور پھر کہا "پھاوڑا لاؤ اور اس کو جلدی سے گنے کے کھیت میں دفنا دو۔"

"یہی ٹھیک رہے گا" سوکھا کی بیوی نے کہا۔

دونوں اس کو دفن کر آئے۔ ساری رات طرح طرح کی باتوں میں گزر گئی۔ بچے تو تھوڑی دیر کے بعد سو گئے، لیکن بڑوں میں کوئی نہیں سویا۔ سوکھا تک ہتھیار لئے بیٹھے ہی رہے۔ غریب کو کوئی خوف نہیں ہوتا۔ وہ سکون سے سو لیتا ہے۔ امیر کو کئی ڈر ہوتے ہیں، وہ سو نہیں پاتا۔ لیکن ایسے ماحول میں کسی کو بھی نیند نہیں آتی ہے۔

دن نکلے سوکھا حکیم میرے کمرے میں داخل ہوا۔ ایک ڈبہ اس کے ہاتھوں میں تھا۔ وہ بڑے ادب سے سلام کرتے ہوئے بولا "میں ایک غریب خانہ بدوش بچھڑے ہوئے طبقے کا آدمی ہوں — یہ چھوٹی سی بھینٹ لایا ہوں۔ اُمید ہے آپ قبول کر لیں گے۔"

اُس نے ڈبہ میری طرف بڑھایا۔ وہ رومال سا تھا۔ میں نے ڈبہ تو ہاتھ میں لے لیا مگر اُس سے کہا "بھئی اس کی کیا ضرورت ہے۔ تم اتنے پیسوں سے کئی روز کی روزی کما سکتے تھے۔ یہاں بھی تو یہ رکھا ہی رہے گا۔"

اس کے رکھے رہنے سے بھی ہمیں خوشی ہوگی آج ہم یہاں سے جا رہے ہیں۔"

"تم یہاں سے جا رہے ہو؟"

"جی ہاں"

"حکیم جی ہمارے ہوتے ہوئے تم لوگوں کو کوئی تکلیف نہیں ہوگی۔ تم ایسے وقت میں کہیں مت جاؤ۔ تمہارے جانے سے مجھے دکھ ہوگا۔ لوگ کہیں گے کہ ایک مسلمان کے خوف سے دونوں ڈیرے اکھڑ گئے۔ جانا ہی ہے تو امن قائم ہونے کے بعد چلے جانا۔ جو لوگ ایک دوسرے پر بے وجہ ہتھیار اٹھاتے ہیں نہ اُن کا کوئی دھرم ہوتا ہے نہ ایمان، نہ وہ ہندو ہوتے ہیں نہ مسلمان۔"

"سیٹھ جی آپ بہت اچھے آدمی ہیں مگر ایسی بستی میں رہنے سے ہمارا جی اکھڑ گیا ہے جہاں عام لوگوں میں بھائی چارے کی کمی ہے۔ ان شہروں سے تو گاؤں اچھے۔ وہاں امن ہے، سکون ہے، میل ہے، مروّت ہے۔ نہ کبھی کوئی جھگڑا ہوتا ہے، نہ کبھی کرفیو لگتا ہے۔"

سوکھا حکیم نے اتنا کہہ کر ادب سے پھر سلام کیا اور فوراً ڈیرے میں چلا گیا۔ اس نے میری زبان سے کچھ سننا بھی گوارا نہ کیا — اُس نے چلتے چلتے اپنی بھاشا میں مجھے انیکوں دھرم گرنتھوں کے پاٹھ پڑھا دیے اور میں سوچتا رہا کہ کہیں ان لوگوں کو پچھڑا ہوا بتلانے والے تو پچھڑے ہوئے نہیں ہیں؟؟

حفظِ ماتقدّم

اقبال پاریکھ

وہ بستر کے برابر کھڑا اپنے ساتھی کو یکھ رہا تھا۔ اُس کا ساتھی درد کی شدت سے ہی بے آب کی مانند تڑپ رہا تھا۔ اُس سے تکلیف اور اذیت دیکھی نہیں گئی تو وہ بستر سے ٹ گیا۔ معاً بستر پر لیٹا ہوا نوجوان چلّا تھا "میری مدد کرو جیری! خدا کے لئے میری د کرو۔"

جیری بے بسی اور لاچاری سے اپنے دوست ودیکھنے لگا "میری سمجھ میں نہیں آرہا ٹونی ہ میں کیا کروں.... میں بھلا کر بھی کیا سکتا ہوں۔"

ٹونی ہاتھ پاؤں پٹخنے لگا۔ اس کا جسم پسینے میں شرابور ہو چکا تھا۔

"خدا کے لئے کسی ڈاکٹر کو فون کرو... اگر تم نے ڈاکٹر کو نہیں بلوایا تو میں مرجاؤں گا۔"

"کس ڈاکٹر کو فون کروں؟" جیری بالوں میں انگلیاں پھیرتے ہوئے بڑبڑایا۔ "آدھی رات کو اس اجنبی قصبے میں کسی ڈاکٹر کو کیسے بلوایا جاسکتا ہے؟ مجھے تو نہیں لگتا کہ ہماری استدعا پر کوئی ڈاکٹر اپنی نیند خراب کرے گا۔"

"کوشش کرو جیری! شاید کسی کو رحم آجائے۔" ٹونی نے تکیے میں منہ چھپایا اور ہچکیوں سے رونے لگا۔

جیری چند لمحے اپنے دوست کو دیکھتا رہا، پھر وہ میز پر رکھے ہوئے فون کی طرف بڑھا۔ اس نے فون کے نیچے سے مقامی ڈائریکٹری نکال لی۔ اُس نے پیلے صفحات میں ڈاکٹروں اور سرجنوں کے نمبر دیکھے اور پہلا نمبر ڈائل کرنے لگا۔

لاگونا نامی قصبے کے ڈاکٹر جانسن کی خوابگاہ میں ٹیلیفون کی گھنٹی گونجنے لگی۔ تیسری گھنٹی پر ڈاکٹر جانسن نے بڑبڑاتے ہوئے ہاتھ بڑھا کر فون کا ریسیور اٹھالیا۔ رات وہ ٹیلیفون کے جوابات دینے والی ایجنسی کو ہدایات دینا بھول گئے تھے کہ وہ چوبیس گھنٹے کے لئے ایمرجنسی ڈیوٹی پر جارہے ہیں اور کسی مقامی مریض کو نہیں دیکھ سکیں گے۔ اس غلطی کا خمیازہ انھیں بھگتنا پڑ رہا تھا۔ اُنھوں نے کمبل ہٹایا اور ریسیور کان سے لگا کر بولے "ہیلو!"

دوسری طرف سے کسی شخص نے گھبرائی ہوئی آواز میں کہا "ڈاکٹر فریڈ بول رہے ہیں؟"

جانسن نے حلق صاف کر کے کہا "جی نہیں، میں ڈاکٹر جانسن ہوں۔ ڈاکٹر فریڈ کی جگہ پریکٹس کر رہا ہوں۔ فرمائیے۔"

"آپ جلدی سے آجائیں...... میرا دوست بیمار ہے ڈاکٹر.... پلیز جلدی کیجئے۔ .... اس کی حالت نازک ہے...."

ڈاکٹر جانسن نے اس کی آواز سے اندازہ لگایا کہ کیس سیریس ہے۔ اُن کی

فون غائب ہوچکی تھی۔ "آپ کون بول رہے ہیں؟"
"آپ مجھے نہیں جانتے ڈاکٹر لیکن...!"
"کیا آپ ڈاکٹر فریڈ کے مریض ہیں؟ انھوں نے پہلے کبھی آپ کا علاج کیا تھا؟"
ایک لمحے کو خاموشی رہی، پھر وہی آواز سنائی دی۔ "جی ہاں ڈاکٹر صاحب۔ میں ڈاکٹر فریڈ کا مریض رہ چکا ہوں۔ میرا نام جیکسن ہے۔ مجھے اپنے دوست کو دکھانا ہے۔ اس کی حالت بہت نازک ہے۔ ازراہ کرم وقت ضائع نہ کیجئے۔ یہ زندگی اور موت کا مسئلہ ہے۔"
ڈاکٹر جانسن ہامی بھرتے ہوئے ہچکچا رہے تھے۔ وہ اسے ٹالنے کے لئے معقول بہانہ سوچ رہے تھے "مسئلہ کیا ہے؟"
"مجھے نہیں معلوم آپ معائنہ کرکے ہی کچھ بتا سکتے ہیں.... ویسے وہ پسینے میں شرابور ہورہا ہے.... اسے ناقابل برداشت تکلیف ہورہی ہے.... پلیز ڈاکٹر جلدی سے آجائیے.... اس کی حالت بہت نازک ہے۔"
"پتہ کیا ہے؟" دائیں کندھے اور کان کے درمیان ریسیور دبا کر ڈاکٹر جانسن نے پیڈ اور قلم سنبھال لیا۔
دوسری طرف سے انھیں پتہ بتا کر سلسلہ منقطع کر دیا گیا۔
ٹیمپل اسٹریٹ کے چھوٹے سے آراستہ مکان میں جیری نے ریسیور کریڈل پر رکھا اور اپنے سسکتے ہوئے دوست کے پاس پہنچ گیا۔ "ڈاکٹر تھوڑی دیر میں پہنچ رہا ہے ٹونی تم درد سے نجات پا جاؤ گے۔" ٹونی نے دانت بھینچ کر اثبات میں سر ہلایا۔
جیری کے چہرے پر قدرے ناگواری کے تاثرات نمودار ہوئے۔ "تم تھوڑی دیر صبر نہیں کر سکتے؟ مجھے ہول آرہا ہے۔ تمہاری حالت دیکھی نہیں جا رہی ہے۔"

ڈاکٹر جانسن سارے راستے بڑبڑاتے رہے۔ ایجنسی کو منقطع نہ کرنے پر خود کو کوستے رہے۔ مصیبت یہ تھی کہ وہ مکان ایک سنسان اور دور افتادہ علاقے میں تھا۔ رات گئے وہاں جانا خطرے سے خالی نہیں تھا۔
انہیں کار اسٹارٹ کرنے میں بڑی دقت پیش آتی تھی۔ وہ کئی دنوں سے کار کو گیراج بھجوانے پر غور کر رہے تھے مگر کام کی زیادتی کے سبب انھیں موقع نہیں مل رہا تھا۔ وہ دل ہی دل میں دعائیں مانگ رہے تھے کہ کار راستے میں جواب نہ دے جائے۔ اتنی رات گئے کسی مستری کو ڈھونڈنا جوئے شیر لانے کے مترادف تھا۔
ٹیمپل اسٹریٹ ایسٹ لائن کے علاقے میں تھی جہاں روشنی کا معقول انتظام نہیں تھا۔ مکانات کا سلسلہ شروع ہوا تو ڈاکٹر جانسن نے کار کی رفتار ہلکی کر لی۔ مکانات پر نمبر روشن تھے اور یہ بات اُن کے لئے اطمینان کا باعث تھی۔ مطلوبہ مکان کے سامنے انھوں نے کار کھڑی کی اور ڈاکٹروں کا مخصوص بیگ لے کر اُتر پڑے۔ چند لمحے گردو پیش کا جائزہ لیا اور مکان کی طرف تیز تیز قدم اُٹھاتے چل دیئے۔ مکان میں وہ مختصر سا زینہ چڑھنا ہی چاہتے تھے کہ اُن کی نظر مکان کے نمبر پر پڑی جو زینے سے متصل دیوار پر لکھا ہوا تھا۔ ۲۱۹ نمبر انھیں درکار نہیں تھا۔ فون کرنے والے نے ۲۱۷ نمبر بتایا تھا۔ پھر اُن کی نظر دوسری طرف پڑی، جہاں مطلوبہ نمبر موجود تھا۔ نمبر کے نیچے "عقب میں جائیے" لکھا ہوا تھا۔ ڈاکٹر جانسن نے بُرا سا منہ بنایا اور عقبی حصے میں جا پہنچے۔ وہاں کونے میں لکڑی کا زینہ ایستادہ تھا۔ وہ آہستہ آہستہ سیڑھیاں چڑھنے لگے۔ اوپر لوہے کا پلیٹ فارم سا بنا ہوا تھا۔ تین اطراف میں آہنی جنگلہ تھا اور چوتھی طرف المونیم اور شیشے کے سلائڈنگ دروازے تھے۔ ان دروازوں پر پردے پڑے ہوئے تھے جس سے اندرونی منظر دکھائی نہیں دے رہا تھا۔
ڈاکٹر جانسن نے آدھا زینہ طے کیا تھا کہ پردوں میں جنبش ہوئی اور ایک نوجوان کا چہرہ نظر آیا۔ چند لمحے بعد پردے ہٹ گئے اور دروازے کھل گئے۔ ڈاکٹر جانسن نے دہلیز میں کھڑے ہوئے نوجوان کو بغور دیکھا جو پھولدار قمیص اور سیاہ پتلون میں ملبوس تھا۔
"آپ ہی مسٹر جیکسن ہیں؟" ڈاکٹر جانسن نے پوچھا۔
"جی ہاں، تشریف لائیے۔"
ڈاکٹر جانسن جلدی سے کمرے میں داخل ہوگئے۔ انھوں نے محسوس کیا تھا کہ نوجوان کچھ نروس ہورہا ہے۔ "مریض کہاں ہے؟" انھوں نے پوچھا
نوجوان نے ایک بند کمرے کی طرف اشارہ کیا "اندر ہے"
ڈاکٹر جانسن نے جلدی سے دروازہ کھولا اور کمرے میں داخل ہوگئے۔ مریض پر نظر پڑتے ہی وہ اس کی طرف لپکے۔ ٹونی بستر پر پیٹ کے بل لیٹا ہوا تھا۔ اس نے کراہتے ہوئے ڈاکٹر کی طرف دیکھا اور آنکھیں بند کرلیں۔
ڈاکٹر جانسن کو مرض کی تشخیص میں دو سیکنڈ سے زیادہ نہیں لگے۔ وہ تیزی سے ہوئے اور پلٹ کر جیری کو دیکھنے لگے۔ اُن کے چہرے پر شدید غصے کے تاثرات تھے۔ "یہ نوجوان بیمار نہیں ہے مسٹر جیکسن! یہ تو..." ڈاکٹر جانسن کا جملہ اُدھورا رہ گیا۔ وہ پھٹی پھٹی آنکھوں سے جیری کے ہاتھ اعشاریہ چار پانچ کے پستول کو دیکھ رہے تھے۔
"تمہارا خیال غلط ہے ڈاکٹر!" نوجوان نے درشتی سے کہا۔ "میرا دوست واقعی بیمار ہے۔ اس کی بیماری ذرا مختلف ہے۔ اسے درد سے نجات کے لئے مارفین کے انجکشن کی ضرورت ہے۔ مارفین سے اس کو سکون مل جائے گا۔"
"دیکھو میاں، بات یہ ہے کہ..." ڈاکٹر نے آگے بڑھنا چاہا، مگر جیری نے پستول کے اشارے سے انھیں آگے بڑھنے اور جملہ مکمل کرنے سے روک دیا۔

"میں غیر ضروری باتوں کو پسند نہیں کرتا ڈاکٹر۔" جیری نے پستول سے بیگ کی طرف اشارہ کرتے کہا۔ "تمہیں صرف اتنا ہی کرنا ہے کہ بیگ کھولو اور مارفین کا انجکشن میرے دوست کو لگا دو، تاکہ اسے سکون مل سکے۔ آسان سی بات ہے نا؟"

ڈاکٹر جانسن بدتمیز نوجوان کو گھورتے ہوئے بولے۔ "مجھے افسوس ہے۔ میں ایسا نہیں کر سکتا۔"

"اچھی بات ہے۔" جیری نے مسکرا کر کہا۔ "تم انجکشن نہیں لگاتے تو نہ سہی یہ کام میں خود کر لوں گا۔ دو تین ماہ کمپاؤنڈر کے طور پر بھی کام کر چکا ہوں۔"

جیری بیگ کھولنے کے لئے جھکا تو ڈاکٹر جانسن اُسے روکنے کے لئے آگے بڑھے لیکن جیری نے کن انکھیوں سے دیکھ لیا اور فوراً ہی سیدھا ہو گیا۔ "شرافت سے کھڑے رہو ڈاکٹر ورنہ تمہارا حشر بھی ٹونی سے مختلف نہیں ہوگا میں تمہیں نقصان نہیں پہنچانا چاہتا مگر تم نے مجبور کیا تو گولی چلانے سے دریغ نہیں کروں گا۔"

ڈاکٹر جانسن نے اپنی جگہ سے حرکت نہیں کی۔ جیری سلسلۂ کلام جاری رکھتے ہوئے بولا۔ "تم یہاں مزے سے کرسی پر بیٹھ جاؤ، خاموشی سے تماشا دیکھو۔ میں ٹونی کو انجکشن لگاؤں گا اور ہم دونوں یہاں سے چلے جائیں گے۔ تمہیں کوئی گزند نہیں پہنچے گی۔"

"اگر میں نہ بیٹھوں تو کیا ہوگا؟" ڈاکٹر جانسن دل کڑا کر کے بولے۔

"میں پہلے ہی بتا چکا ہوں کہ گولی چلانے سے دریغ نہیں کروں گا..... مجھے افسوس ہے کہ ہمارے پاس ایسی کوئی چیز نہیں ہے، جس سے تمہاری تواضع کی جا سکے۔"

ڈاکٹر جانسن چند لمحے اُسے دیکھتے رہے پھر شانے اُچکا کر کرسی پر جا بیٹھے۔ وہ بے بسی اور لاچاری سے نوجوان کو بیگ کی طرف بڑھتا دیکھ رہے تھے۔ جیری نے بیگ کھولا، پلاسٹک کی سرنج اور شیشی کو تلاش کیا اور جانسن کی طرف رُخ کر کے بولا "مارفین کہاں رکھی ہے ڈاکٹر؟"

جانسن نے ہونٹوں پر زبان پھیر کر کہا۔ "وہ [illegible] خانے میں چمڑے کا جو بٹوا سا رکھا ہے۔ اس میں مارفین کا [illegible] ہے۔ مگر..... اگر تم نے [illegible] ہو تو تمہیں تلاش کرنے میں وقت [illegible] لگ جائے گی۔"

جیری [illegible] بڑبڑاتا ہوا بیگ کی طرف متوجہ ہو گیا۔ ٹونی نے پھر کراہنا شروع کر دیا تھا۔ اس نے [illegible] کر کہا "ذرا جلدی کرو جیری، درد کے مارے میرا دم نکلا جا رہا ہے!"

جیری نے مارفین کی تلاش تیز کر دی۔ "بس چند سیکنڈ کی بات ہے ٹونی۔ تمہیں بہت جلد درد سے نجات مل جائے گی۔" جیری نے پستول ٹونی کے برابر بستر پر رکھ دیا تاکہ آسانی سے مارفین تلاش کر سکے۔

"پھرتی دکھانے کی کوشش بے سود ہوگی ڈاکٹر۔ تمہیں پیروں پر پوری طرح کھڑے ہونے کی مہلت بھی نہیں ملے گی۔"

چند لمحے بعد جیری نے چھوٹی سی شیشی چمڑے کے بٹوے سے نکال لی۔ اس پر مارفین کا لیبل لگا ہوا تھا۔ اس نے اپنے دوست کی طرف رُخ کر کے کہا۔ "صبر کرو دوست، تمہاری دوا مل چکی ہے۔ ابھی تمہیں آرام آ جائے گا۔"

انجکشن تیار کر کے جیری نے ماہرانہ انداز میں ٹونی کے بازو میں لگا دیا۔ پھر دھیمی آواز میں بولا۔ "دس منٹ میں درد غائب ہونا شروع ہو جائے گا۔ کیا خیال ہے، کار تک چل سکو گے؟ یا پھر دو تین گھنٹے رُکنے کا پروگرام ہے؟"

ٹونی نے اثبات میں سر ہلا کر کہا "میرا خیال ہے میں کار تک پہنچ جاؤں گا۔ مجھے صرف پانچ منٹ آرام کرنے دو۔" اس نے بغور جیری کو دیکھا۔ "اپنے بارے میں تمہارا کیا خیال ہے؟ تمہاری طبیعت بھی بہتر دکھائی نہیں دیتی۔"

"ہاں میری حالت بھی بگڑتی جا رہی ہے۔ ڈاکٹر صحیح وقت پر پہنچا ہے۔" جیری نے ڈاکٹر جانسن پر نظر ڈالی اور سرنج میں مارفین بھر لی۔ پھر اس نے آستین اوپر کی اور سیدھے ہاتھ سے سرنج تھام کر اُلٹے ہاتھ میں انجکشن لگا لیا۔ مارفین کی خالی شیشی اس نے ایک طرف پھینک دی اور بٹوے سے مارفین کی تمام شیشیاں نکال کر جیب میں ڈال لیں۔ "ہم مارفین ساتھ لئے جا رہے ہیں۔ راستے میں اس کی ضرورت پڑ سکتی ہے۔" جیری نے رُخ اپنے ساتھی کی طرف کر لیا جو پلنگ سے اُٹھنے کی جدوجہد کر رہا تھا۔ "اب جلدی سے یہاں سے نکل چلو۔"

جیری نے پستول اٹھایا اور دیوارگیر الماری کے پاس پہنچ گیا۔ اس نے دروازہ کھولا اور نچلے خانے سے سوٹ کیس نکالا۔ پھر اس نے ایک جیکٹ ٹونی کی طرف اچھال دیا اور دوسرا خود پہننے لگا۔ اس کی نظریں مستقل ڈاکٹر جانسن پر لگی ہوئی تھیں۔ جیکٹ پہن کر اس نے سوٹ کیس اٹھایا اور ٹونی کی طرف بڑھا۔ "اگر تم چاہو تو میرا سہارا لے سکتے ہو، لیکن میرے پستول والے ہاتھ کو مت چھیڑنا۔"

ٹونی جیکٹ پہنے فرش پاؤں پر جانے کی کوشش کر رہا تھا۔ اس کی ٹانگیں کپکپا رہی تھیں۔ "ٹھیک ہے..... میں بغیر سہارے کے چل سکتا ہوں۔ بس ہمیں آہستگی سے چلنا پڑے گا۔"

"تم چلو تو....." جیری نے کہا۔ "میں تمہارے پیچھے آ رہا ہوں۔"

مفاً کسی خیال کے تحت جیری نے سوٹ کیس فرش پر رکھ دیا اور فون کی طرف بڑھا۔ اس نے ایک جھٹکے سے ٹیلیفون کا تار کھینچ کر اسے بیکار کر دیا۔ پھر ڈاکٹر جانسن کی طرف متوجہ ہوا۔ "بات یہ ہے ڈاکٹر کہ مجھے اور ٹونی کو میکسیکو بہت پسند ہے۔ ہم جلد از جلد وہاں پہنچ جانا چاہتے ہیں۔"

"تم لوگ میرے ساتھ کیا سلوک کرو گے؟" ڈاکٹر جانسن نے پوچھا

جیری ایک لمحے کو رُکا جیسے کچھ سوچ رہا ہو "تمہیں ہم یونہی چھوڑ کر جا رہے ہیں۔ ٹیلیفون میں نے بیکار کر دیا ہے، لہٰذا تم فوری طور پر پولیس سے رابطہ قائم نہیں کر سکو گے۔ اس کے بعد تم جو جی میں آئے کر لینا۔"

ڈاکٹر جانسن نے ایک گہرا سانس لیا اور بولے "شکریہ!"

جیری نے باہر ٹونی کو پکارا "ٹونی خیریت سے ہو نا؟ میری مدد کی ضرورت تو نہیں ہے؟"

باہر سے کوئی جواب نہیں ملا لیکن کسی کے سیڑھیاں اُترنے کی آواز سُنائی دے رہی تھی۔ قدموں کی آواز ایک لمحے کو رُکی اور پھر سُنائی دینے لگی۔

جیری کرُسی کے پیچھے پہنچ گیا اور ڈاکٹر جانسن کو رسّی سے باندھنے لگا۔ اچانک باہر دھماکا سا ہُوا۔ جیری رُک گیا "اُلّو کا پٹھا۔ میں نے کہہ دیا تھا کہ سیڑھیاں سنبھل کر اُترنا۔" اُس نے رسّی کو گرہ لگائی، سوٹ کیس اُٹھایا اور دوڑتا ہُوا خوابگاہ سے نکل گیا۔ سیڑھیاں اُترتے ہوئے اُس کا سر بُری طرح چکرا گیا اور آنکھوں تلے اندھیرا چھا گیا۔ اُس نے پلٹ کر مکان کی طرف دیکھا اور ہاتھ اُٹھا کر کھڑکی پر دو فائر داغ دیئے۔ پھر وہ لڑکھڑایا اور سیڑھیوں پر لڑھکتا ہُوا ٹونی کے ساکت جسم کے قریب جا پڑا۔

ڈاکٹر جانسن اور لاگونا پولیس کے لفٹننٹ ایمس ایمبولینس کی طرف دیکھ رہے تھے۔ جیری اور ٹونی کو اسٹریچرز پر ڈال کر اندر رکھا جا چُکا تھا۔

ایمس نے مُسکرا کر جانسن کی طرف دیکھا اور بولا "آپ نے ڈاکٹری کا پیشہ چھوڑ کر پولیس میں بھرتی ہونے کے بارے میں کبھی غور کیا ہے؟"

ڈاکٹر جانسن جواباً مُسکرا کر بولے "میرا خیال ہے ڈاکٹری کا پیشہ میرے لئے مُناسب ہے۔"

ایمس اپنی تجسّس کو نہیں دبا سکا اور پُوچھ بیٹھا "یہ سب کیسے ہُوا۔؟"

ڈاکٹر جانسن نے سگریٹ سُلگا کر ایک گہرا کش لیا۔ اور بولے "قصّہ دراصل یوں ہے کہ پچھلے مہینے کسی نے ڈاکٹر پیکارڈ کے دفتر کا تالا توڑ کر ساری مارفین چُرا لی تھی۔ پھر بل پورٹر پر حملا کیا گیا۔ وہ بیچارا ایک ڈاکٹر کو مارفین پہنچانے جا رہا تھا۔ منشیات کے عادی نوجوانوں نے پورٹر کے سر پر کوئی بھاری چیز رسید کی اور اُس کا مارفین کی شیشیوں سے بھرا ہُوا بیگ لے اُڑے۔ اسی طرح ڈاکٹروں سے مارفین لُوٹنے کے دو تین اور واقعات پیش آئے۔ اس صورتحال پر ہم نے اس علاقے کے ڈاکٹروں کی میٹنگ طلب کی، اور مارفین کے لئے ہونے والے حملوں پر غور کیا۔"

ایمس نے بیتابی سے کہا "کہتے رہیئے، مَیں سُن رہا ہُوں۔"

ڈاکٹر جانسن نے ایک اور گہرا کش لگا کر کہا "آپ تو جانتے ہی ہیں کہ ڈاکٹروں کو بعض اوقات آدھی رات کو بھی مریضوں کو دیکھنے کے لئے جانا پڑتا ہے۔ ظاہر ہے حملوں کے ڈر سے سسکتے ہوئے مریضوں کو نہیں چھوڑا جا سکتا۔ اس معاملے میں پولیس سے بھی مدد نہیں لی جا سکتی۔ وہ ہر ڈاکٹر کو محافظ فراہم کرنے سے رہی۔ میٹنگ میں مختلف تجاویز پیش کی گئیں۔ ہم نے اندازہ لگا لیا تھا کہ حملے منشیات کے عادی نوجوان کر رہے ہیں اور حربے بھی ایک سے استعمال کئے جا رہے ہیں۔ لہٰذا...."

ایمس اُن کی بات کاٹ کر بولا "گویا اب ڈاکٹر جرائم پر بھی تحقیق کر رہے ہیں۔!"

ڈاکٹر جانسن نے ایمس کو گھورتے ہوئے کہا۔ "تم لوگ سُست، کاہل اور لاپرواہ ہو گئے تو ایسا ہی کرنا پڑے گا۔ خیر، تو ہم سب نے مارفین کی شیشیوں سے لیبل اُتار دیئے اور اُن پر ایک خفیہ لفظ لکھ دیا تاکہ شناخت میں آسانی رہے۔ پھر ہم نے مارفین کے لیبل ایک اور دوا کی شیشیوں پر چپکا دیئے۔ ہمارا خیال تھا کہ اس طرح ہم صورتحال پر قابو پا لیں گے۔"

ایمس نے مُسکرا کر پُوچھا "وہ دوا کیا تھی؟"

"وہ دوا دیکھنے میں منشیات کے عادی لوگوں کو مارفین لگتی ہے...... دوا بہت طاقتور ہے اور بہت تیزی سے اثر کرتی ہے.... وہ دونوں نوجوان کل دوپہر تک شیرخوار بچوں کی طرح بے خبر سوتے رہیں گے۔ آپ چاہیں تو سہ پہر کو انھیں ہسپتال سے ہٹا لے جا سکتے ہیں...."

اپنے بچوں کو ان چھ مہلک بیماریوں سے بچائیے

۱۔ پولیو، ۲۔ ڈپتھیریا، ۳۔ ٹیٹنس، ۴۔ خسرہ، ۵۔ پرٹوسسٹ، ۶۔ تپ دق

بچوں کو ان سے محفوظ رکھنے کے لیے فوری ٹائم ٹیبل

عمر	علاج
پیدائش سے ۶ مہینے تک	بی۔ سی۔ جی
۶ ہفتے کے بچوں کے لیے	ڈی۔ پی۔ ٹی پولیو I
۱۰ ہفتے کے بچوں کے لیے	" " " پولیو II
۱۴ ہفتے کے بچوں کے لیے	" " " پولیو III
۹ مہینے کے بچوں کے لیے	میزلس
۱۶ مہینے سے ۲۴ مہینے تک کے بچوں کے لیے	ڈی۔ پی۔ ٹی پولیو بوسٹر
پانچ سال کے بچوں کے لیے	ڈی۔ ٹی
دس سال کے بچوں کے لیے	ٹی۔ ٹی
۱۶ سال والوں کے لیے	ٹی۔ ٹی
حاملہ ماؤوں کے لیے	ٹی۔ ٹی کے دو انجکشن ایک ایک مہینے کے وقفے پر

بچاؤ کی مفت سہولتیں دہلی انتظامیہ، ایم۔ سی۔ ڈی، این۔ ڈی۔ ایم۔ سی، سی۔ جی۔ ایچ۔ ایس، ای۔ ایس۔ ٹی اور رضاکار تنظیموں کے سبھی اسپتال، ڈسپنسری، فیملی ویلفیر سنٹر اور ہیلتھ سنٹر ہر بدھ کو صبح ۹ بجے سے ایک بجے تک مہیا ہوتی ہیں۔

لڑکا ہو یا لڑکی
ایک ہو یا دو، بس کافی ہیں

جاری کردہ، محکمہ اطلاعات و اشاعات، دہلی انتظامیہ

گذشتہ سے پیوستہ

خوف کی نگری

اختر جمال

نامہ نگار نے اپنا کیمرہ کنوئیں کے اندر جھکا کر تصویر کھینچی۔ سیاہ، جلی حروف میں نام پڑے جا رہے تھے۔ جتنا بڑا نام اور عہدہ تھا، اُتنا ہی بڑا اور بوجھل پتھر تھا۔ نامہ نگار نے سوچا کہ یہ تصویر وہ ساری دُنیا کو دکھائیگی۔ شاید خوف کی نگری والوں کے ضمیر پر دُنیا کے لوگوں کو ترس آجائے اور وہ اس نگری کے ضمیر کی مدد کریں اور اُسے کنوئیں سے باہر نکال کر زندگی، ہوا اور روشنی دے سکیں۔ اس نے سوچا یہ خوف کی نگری کا داخلی معاملہ قرار نہیں دیا جا سکتا۔ اگر خوف کی نگری والوں نے آخری پتھر بھی ڈال دیئے تو پھر ضمیر ہمیشہ کے لئے خاموش ہو جائے گا۔

ضمیر نے کہا "میں نے تمہیں انسانیت کے ناطے مدد کو پکارا تھا۔ آہ اس کون و مکاں میں کسی نے میری آواز تو سُنی —!

عورت نے کہا "کاش میں اِن پتھروں کو ہٹا سکتی!"

ضمیر نے کہا۔ "یہ بہت مشکل ہے۔ تم ایک نازک سی عورت ہو اور پتھر بھاری ہیں!"

عورت نے کہا" دراصل ہر شخص اپنا پتھر خود ہی اٹھا سکتا ہے۔ اپنے اپنے ضمیر کا بوجھ ہر شخص کو خود لے کر چلنا پڑتا ہے۔ اپنے ضمیر کو دھوکا دینا، اس کا مُنہ بند کرنا، اسے ہمیشہ کی نیند سُلانا، دیو کی خوشنودی حاصل کرنے کا ذریعہ ہے۔"

"آہ، وہ یہ نہیں جانتے کہ اگر ضمیر زمین پر کھڑا سانس لے رہا ہوتا تو خوف کی نگری میں کالا دیو آئین کو پھانسی نہ دے سکتا۔ خوف کی نگری میں دیو کی حکومت اور زندگی کا راز میری موت میں پوشیدہ ہے اور اس لئے یہ سب دیو کے اشارے پر مجھے موت کی نیند سُلانے کی تو محنت کر رہے ہیں۔ انسان کتنا بدنصیب کہ آپ اپنا دُشمن ہے۔"

ضمیر کی دُکھ بھری باتیں سُن کر عورت کو بہت دُکھ ہوا۔ اُس نے کہا" میں خوف کی نگری والوں سے جا کر کہوں گی کہ وہ اپنا اپنا پتھر اُٹھا لیں۔ میں تمہاری تصویر اُنہیں دکھاؤں گی۔ شاید انھیں اپنے آپ پر رحم آجائے۔ میں ان کی تصویریں کھینچوں گی، اگر اُنھوں نے اپنی تصویر پہچان لی تو وہ اپنا پتھر ضرور ہٹائیں گے۔ لیکن اگر وہ اپنی صورت نہ پہچان سکے تو پھر وہ اپنا پتھر نہ اُٹھا سکیں گے اور ہمیشہ کے لئے حرام موت کو گلے لگا لیں گے۔ موت حق کے لئے ہو تو وہ زندگی ہے۔ اور زندگی ظلم اور جھوٹ کے لئے ہو تو وہ موت ہے! حرام موت! اور یہ آدمی کے اپنے اعمال پر منحصر ہے کہ وہ اپنے آئین میں اللہ کا نور دیکھتا ہے یا شیطان کے چہرے کی سیاہی۔"

"آہ! ان کی آنکھوں اندر لوں پہلے

دبیز پردے ہیں کہ وہ نور دیکھ سکتے ہیں نہ سیاہی ۔ ! نور دیکھنے کے لئے آنسو بہانے والی آنکھ ہونا چاہئے اور سیاہی دیکھنے کے لئے سچ بولنے والی زبان ۔ وہ دونوں سے محروم ہیں ۔" ضمیر نے افسوس سے کہا ۔

"ہاں اپنے شیطان کو پہچان لینے والے اسے تسخیر کر لیتے ہیں ، مگر وہ جو اپنی صورت نہ پہچان سکیں ، وہ تو آنکھوں والے اندھے ہوتے ہیں ۔ مگر میں کوشش تو کروں ۔ ۔ ۔ ۔ شاید وہ تمہارا بوجھ اٹھالیں ۔"

عورت نے ضمیر کو تسلی دی تو اس نے کہا " تمہاری باتوں نے مجھے زندگی کی امید دے دی ہے ۔ تم خوف کی نگری والوں سے جاکر یہ پوچھو کہ انھوں نے آئین کی پھانسی پر احتجاج کیوں نہیں کیا ۔ اگر وہ سچ بولے تو پتھر ضرور اٹھانے آئیں گے ۔ ! "

نامہ نگار خاتون وہاں سے رخصت ہوئی تو اس نے سوچا سب سے پہلے خوف کی نگری کے صحافیوں کے پاس جانا چاہئے ۔

وہ ایک بڑے ہال میں داخل ہوئی جہاں ایک پریس کانفرنس ہو رہی تھی ۔ اس نے سنا تھا کہ کالا دیو بھی ان سے باتیں کرنے آرہا ہے ۔ اس نے سوچا کالے دیو کے آنے سے پہلے ہی میں انھیں ان کی تصویر دکھادوں ۔

نامہ نگار نے ہال میں بیٹھے ہوئے صحافیوں کی تصویر کھینچی اور ان سے پوچھا کہ آئین کی پھانسی پر آپ لوگوں نے احتجاج کیوں نہیں کیا ۔ آپ کا کوئی ردعمل ظاہر نہیں ہوا ۔ خوف کی نگری کا ایک پتہ تک نہ ہلا ۔ آخر کیوں ۔ ؟

ان سب نے اپنے اپنے ہونٹوں پر انگلیاں رکھ لیں ۔ نامہ نگار نے دیکھا کہ ان کی زبانیں بتیس دانتوں کے اندر سلی ہوئی ہیں اور دانت ایک دوسرے سے جڑے ہوئے ہیں ۔ اس طرح کہ وہ اپنا جبڑا کھولنے سے معذور ہیں ۔

نامہ نگار نے انہیں ان کی تصویر دکھائی ۔ ہال میں کرسیوں پر چوہے بیٹھے تھے اور کچھ چوہے ادھر ادھر پھر رہے تھے ۔ انھوں نے خفا ہو کر نامہ نگار عورت کو دیکھا ۔ اپنی تصویر نہیں پہچان سکے اور اس سے پوچھنے لگے " تم کس ملک کی نامہ نگار ہو ۔ ؟ ہمارے پاس نامہ نگاروں اور فوٹو گرافروں کی کمی نہیں ۔ ہم تمہارے محتاج نہیں ہیں ! "

" تم یہاں کیوں آئی ہو ؟ "

نامہ نگار عورت نے کہا " سنو تم خوف سے چوہے بن گئے ہو ۔ اگر وہ پتھر اٹھالو تو پھر سے انسان بن سکتے ہو ۔ ورنہ ابد تک تمہاری روحیں چوہوں کی صورت میں بلوں میں قید رہیں گی ۔ "

ان میں سے ایک نے اشارہ کیا کہ کالا دیو آنے والا ہے ۔ وہ اپنے اپنے قلم اور کاغذ نکال کر بیٹھ گئے

" اے لوگو ! اب بھی وقت ہے ۔ اپنے اپنے پتھر اٹھالو ۔ "

ان میں سے ایک شخص نے کہا " ہم پتھر نہیں اٹھا سکتے ۔ انگلیاں تو صرف دیو کے حکم سے حرکت کرتی ہیں ۔ اور جب وہ دیو آکر اپنی باتیں لکھنے کا حکم دے گا تو تم دیکھنا ہماری انگلیاں کیسے تیز تیز لکھیں گی ۔ "

نامہ نگار عورت نے کہا " سنو ، پتھر اٹھانے کا طریقہ بہت آسان ہے ۔ تمہیں کنوئیں تک جانے کی ضرورت بھی نہیں ہے ۔ پتھر اس طرح ہٹ سکتا ہے کہ تم خوف سے آزاد ہو جاؤ ۔ سچ بولو ــــ ! کالا دیو رازق نہیں ــــ سنو رازق تو خدا ہے ــــ پھر تم کالے دیو سے کیوں ڈرتے ہو ؟ "

ہوا کا ایک تیز جھونکا آیا تو وہ سب خوفزدہ ہو کر اپنے اپنے بلوں میں چھپ گئے ۔

وہ اس ہال سے نکل آئی ۔ ایک خوبصورت ریستوران میں داخل ہوئی تو اس نے چند مردوں اور عورتوں کو دیکھا ۔ ان میں سے ایک عورت بہت آراستہ و پیراستہ نظر آرہی تھی ۔ اس نے کیمرے کا رخ عورت کی جانب موڑا تو وہ مسکرانے لگی ۔ اس نے عورت کے پاس جاکر پوچھا " تم کون ہو ؟ "

عورت نے کہا " میں خوف کی نگری کی ملکۂ حسن ہوں ۔ " وہ ہنسنے لگی ۔ نامہ نگار بولی " تم پہلی عورت ہو جسے میں نے ہنستے ہوئے دیکھا ہے ۔ یہاں تو لوگ نہ ہنستے ہیں نہ روتے ہیں ۔ پتھر کا بت بنے رہتے ہیں ۔ "

وہ عورت خوش ہو کر بولی " ہاں ۔ میں اپنے متعلق اتنے تعریفی جملے سنتی ہوں کہ سدا خوش رہتی ہوں اور ہنستی رہتی ہوں ۔ خوف کی نگری کے سب دانشور ، فنکار ، ادیب ، وزیر ، چھوٹے بڑے میرا دم بھرتے ہیں ۔ کیا یہ ہنسنے اور خوش رہنے کی بات نہیں ہے ؟ "

" میں نے سنا تھا کہ یہاں ہنسنا اور رونا جرم ہے ۔ آہ و فریاد کرنا اور گہری سانس لینا سرکشی ہے ۔ کیا تمہارے علاوہ اور لوگ بھی ہنستے ہیں ؟ " نامہ نگار نے پوچھا

عورت نے کہا " ہاں ، وہ سب لوگ جو عقل کو لکڑی کے صندوق میں بند کر کے دریا میں بہا چکے ہیں ، وہ ہی ہنس سکتے ہیں ۔ جو لوگ دماغ رکھتے ہیں ، وہ ہنسی بھول گئے ہیں ۔ اور اس لئے اب یہ لوگ جلد سے جلد عقل کے بوجھ سے رہائی حاصل کرنا چاہتے ہیں ۔ "

نامہ نگار نے پوچھا " یہ کیسے ممکن ہے ۔ "

ملکۂ حسن مسکرا کر بولی " اپنے دماغوں کو لکڑی کے بکس میں رکھ کر دریا میں بہا دینے سے عقل سے نجات مل جائے گی تو وہ ہنس بول سکیں گے ۔ "

" دماغوں کو دریا میں بہا کر تم انسان تو نہیں کہلاؤ گے ۔ " نامہ نگار نے کہا ۔

عورت نے جواب دیا " ہمیں دماغوں کی نہیں ، زرمبادلہ کی ضرورت ہے ۔ جتنے دماغ دساور جائیں گے اتنا ہی زرمبادلہ آئے گا ۔ "

" یہ دماغ تم کن لوگوں کو بھیجتے ہو ؟ " نامہ نگار نے پوچھا ۔

عورت اسے سمجھانے لگی " یہ صندوق

بہہ کر مغربی کنارے پر جاتے ہیں۔ وہاں ہمارا مال کھول کر وہ اپنا تالا ڈال دیتے ہیں۔ اور صندوقوں پر اپنی مُہر لگا دیتے ہیں۔ اس طرح دماغوں پر ان کا قبضہ ہو جاتا ہے اور اس تجارت سے ہمیں بے انتہا زرِ مبادلہ مل رہا ہے۔"

نامہ نگار نے سوچا کہ خوف کی نگری کے عالیشان محل، باغات، سڑکیں، ہوٹل، یہ سب چمک دمک اسی زرِ مبادلہ کا نتیجہ ہے۔ ملکۂ حُسن نے اُس کو بتایا کہ ابھی ایک مشہور دانشور یہاں آنے والا ہے۔ تم اس مسئلہ پر اُس سے تبادلۂ خیال کر سکو گی۔ اتنے میں ایک بھاری بھرکم آدمی انھیں اپنی طرف آتا نظر آیا جب وہ دونوں گلے شکوے کر چکے تو نامہ نگار نے دانشور سے پُوچھا "جب سب دماغ باہر چلے جائیں گے تو خوف کی نگری کا کام کاج کیسے ہوگا۔؟"

دانشور نے کہا "دیو کے پاس جو دماغ ہے وہ ہمارے لئے کافی ہے۔ یہاں کسی اور دماغ کی ضرورت ہی نہیں۔ بیکار بڑے بڑے دماغ زنگ آلود ہو رہے ہیں۔ اچھا ہے باہر جا کر دُوسروں کے کام آتے ہیں اور زرِ مبادلہ بھیجتے ہیں۔"

"خوف کی نگری کے مسائل حل کرنے کے لئے کیا صرف زرِ مبادلہ کافی ہے؟"

دانشور نے غور سے اس کی طرف دیکھا پھر بولا "ہاں مسائل تو ہیں۔ لیکن دیکھو نا جتنی دولت بڑھے گی اتنی ہی خیرات بڑھے گی۔ ارتکازِ دولت کا یہ کتنا بڑا فائدہ ہوگا؟"

"مگر مہذب دُنیا میں لوگ خیرات نہیں حق چاہتے ہیں۔"

"حق تو صرف کالے دیو کا ہے۔ حکومت کرنے کا حق ہے۔ لوگوں کو صرف ظلم سہنے کا حق حاصل ہے۔ کیا ہمارے لئے یہ کافی نہیں ہے۔؟"

نامہ نگار نے تعجب سے دیکھا تو وہ بولا۔

"ہم دُنیا کی سب سے صابر قوم ہیں۔ دُنیا کی تاریخ میں اتنا جبر اور ظلم سہنے کی نظیر تمہیں کوئی دُوسری نہ ملے گی۔ پہلے ہم نے سفید دیو کا ظلم سہا اور اب کالے دیو کا ظلم سہہ رہے ہیں۔ ہم

پوچھو تو ہمارے دماغ ہمیں بہت تنگ کرتے تھے۔ اب ہم سوچ سے آزاد ہو کر جو چاہتے ہیں کر رہے ہیں"

نامہ نگار نے ملکۂ حُسن سے کہا۔ میں نے ہال میں داخل ہوتے وقت تمہاری جو تصویر کھینچی تھی، میں تمہیں دِکھاتی ہوں۔"

عورت خوش ہو گئی مگر پھر تصویر ہاتھ میں لے کر ناگواری سے بولی" تمہارا دماغ خراب ہے۔ یہ تم مجھے ایک لومڑی کی تصویر دکھا رہی ہو؟"

نامہ نگار نے کہا۔ "یہ لومڑی تمہارا باطن ہے۔ سستی شہرت اور جھوٹی خوشی کا مُردہ شکار لوگ تمہاری جھولی میں ڈال کر تمہیں بے وقوف اور تم رونے کے بجائے ہنستی رہتی ہو۔ کیا تم ایک لومڑی کی چالاکی سے ان سب کو اپنے دام میں نہیں اُلجھاتی ہو؟ یہ لومڑی تمہارے اندر چھپی بیٹھی ہے۔ تم اسے پہچان لو —— اور اپنا پتھر اُٹھا لو —— تمہارا ضمیر رو رہا ہے۔"

عورت نے دُکھ سے کہا" کاش ہم صرف ظاہر کے ساتھ رہ سکتے اور باطن کو بھی دریا میں بہا سکتے —!"

نامہ نگار بولی" باطن تو تمہارے ساتھ چپکا ہوا ہے۔ تمہارے جسم ختم ہونے کے بعد بھی باقی رہے گا۔"

"ملکۂ حُسن نے کہا:" مجھے اس کی باتوں سے ڈر لگ رہا ہے۔"

دانشور نے کہا "تم کیوں ڈرتی ہو، تم تو میری گُڑیا ہو۔ کہیں گُڑیا بھی ڈرتی ہے۔ تم تو میری گُڑیا ہو۔ اور گُڑیا تو بس ہنستی رہتی ہے۔"

عورت یہ سُن کر پھر ہنسنے لگی۔

نامہ نگار نے دانشور کی تصویر اُتار کر، اُس کے ہاتھ میں تھمائی۔ وہ غصّے سے بولا" تم نے مجھے اونٹ بنا دیا ہے۔"

نامہ نگار نے کہا" تمہاری مہار دیو کے ہاتھوں میں ہے۔ تم اپنی بے حیثیتی اور بے حیائی کی زندگی کی وجہ سے اونٹ سے آدمیت میں کم تر ہو۔ تم نے اپنی اُنگلیاں دیو کو دے دی ہیں اور اس

کے بدلے اعلیٰ معیارِ زندگی کی ضمانت لی ہے۔ اونٹ تو پانی کو اندوختہ کرتا ہے، تم وہ بدنصیب ہو جس کا اندوختہ آگ ہے۔ اب بھی وقت ہے، اپنا پتھر اُٹھا لو۔"

دانشور آگ بگولا ہو گیا" تم ضرور غیر ملکی ایجنٹ ہو۔ خوف کی نگری کی کوئی عورت تمہاری طرح کی نہیں ہو سکتی۔"

پھر نامہ نگار میدان میں آئی تو اُس نے ایک انبوہ دیکھا۔ انہیں تصویر اُتار کر دکھائی تو وہ سب ہجوم کے لوگ چیونٹیوں کی صُورت میں نظر آئے۔ انھوں نے غصّہ سے کہا" تم کوئی پاگل عورت تو نہیں ہو۔ تم نے اس میدان میں انسانوں کی جگہ چیونٹیوں کی تصویر بنا کر دی ہے۔

"اوہ، تم لوگ خوف اور بے بسی کے ہاتھوں ذلیل ہو کر اتنے سکڑ گئے ہو کہ چیونٹیوں کی مانند نظر آتے ہو۔ مگر چیونٹی ذہین اور محنتی مخلوق ہے۔ اس کا حوصلہ اور ارادہ تمہارے پاس نہیں ہے۔ صرف اس کا جسم ہی تم نے حاصل کیا ہے۔ اور کالا دیو تمہیں اپنے جوتوں سے روند ڈالے گا۔ اب بھی وقت ہے: جاؤ اندھے کنوئیں سے پتھر نکال لو۔"

ایک شخص نے کہا" ہم اب اندھے کنوئیں کی گہرائی سے وہ پتھر نہیں نکال سکتے۔ اب ہماری اُنگلیاں دیو کے حکم پر ہی حرکت کرتی ہیں۔"

نامہ نگار نے کہا" اے لوگو! پتھر نکالنا بہت آسان ہے۔ تم خوف سے آزاد ہو جاؤ۔" وہ سب خاموش کھڑے بے بسی سے ایک دوسرے کو دیکھ رہے تھے۔ نامہ نگار نے کہا" کاش تم چیونٹی کا جسم نہیں، اُس کی ہمت، ارادہ اور اتحاد کا جذبہ حاصل کر سکتے تو ننھے جسم کے باوجود بڑے رہتے۔ مگر تم نے آدمیت کھو دی اور ننھے ذرّے بن گئے ہو۔"

نامہ نگار وہاں سے آگے چلی اور ایک عدالت کے اندر گئی۔ اُس نے ایک کٹہرے میں کھڑے ہوئے لوگوں کو دیکھا۔ اُن کی تصویر کھینچی تو وہ سب اسے کانٹے نظر آئے۔ وہ سب [illegible]

اس کی جانب جھپٹے اور بولے "اس عورت کو پکڑ کر قید میں ڈالنا چاہیے۔ یہ ہمارے نیک فرزندوں کی توہین کر رہی ہے۔" نامہ نگار نے کہا "اے لوگو اب بھی وقت ہے۔ اپنے پتھر اٹھا لو۔ اپنی منھ نگوں سے جھوٹ اور فریب کی غلاظت دھو لو۔ کالے دیو کے خوف سے آزاد ہو جاؤ۔"

نامہ نگار ایک اعلیٰ تعلیم کی درسگاہ میں گئی۔ اس نے چند تصاویر اتاریں تو اسے علم و دانش کے اس وسیع میدان میں ہر طرف بیل ہی بیل نظر آئے۔ ایک تصویر میں بکریوں اور بھیڑوں کے ریوڑ کتابیں لیے آ رہے تھے۔"

پھر اس نے چند گدھے بھی دیکھے۔ اس نے سوچا یہاں بھی بھانت بھانت کے لوگ جمع ہیں۔ اس نے ان سے کہا "اے لوگو اب بھی وقت ہے۔ آدمی کی جون میں آجاؤ۔ اپنے پتھر اٹھا لو۔ بیل اور گائے علم نہیں سکھا سکتے۔"

وہاں سے آگے چلی تو ایک بڑی عمارت میں ایک اجتماع کے لئے لوگوں کو جاتے دیکھا۔ اسے معلوم ہوا کہ ایک کتاب کی تعارفی تقریب ہو رہی ہے۔ صحافی، ادیب، دانشور، شاعر اور فنکار جمع ہیں۔

اس نے ہال کی تصویر اتاری تو اسے کوّے، گدھ، لومڑیاں، چوہے اور سننے والوں کی بھیڑ میں بھیڑ بکریاں اور گائے بیل نظر آئے۔

نامہ نگار نے ان سے پوچھا "تمہاری نگری میں آئین کو پھانسی دے دی گئی۔ اور کالے دیو کی تیسری نسل تمہارے سر پر مسلط ہے۔ تم نے آئین کی پھانسی پر کوئی احتجاج نہیں کیا؟"

صاحب صدر نے غصے سے کہا "اے بے ادب تم کون ہو۔ تمہیں نہیں معلوم کہ ایک کتاب کی تعارفی تقریب ہو رہی ہے۔ مضامین پڑھے جا رہے ہیں۔ تم رنگ میں بھنگ ڈالنے کہاں سے آگئیں؟" ایک اور شخص بولا۔ "اس کا دماغ درست نہیں معلوم ہوتا۔ اس موقع پر آئین کی بات کر رہی ہے۔ ہم ایک ڈوک کے بارے میں مضامین لکھنے میں مصروف رہے۔ ہمیں نہیں معلوم کہ آئین کا کیا حشر ہوا۔ اور اس سے بھلا ہمارا کیا واسطہ۔"

ادارہ



ماہیا

دیپک قمر

برسا ہے ابھاری
برہن کا جیا تڑپے
چوٹیں ہیں بڑی کاری

مکھڑے کا بنا ہالہ
ہر کان میں گوری کے
چاندی کا بڑا بالا

یہ دوست کی بیٹی ہے
ابا تو گئے، مجھ سے
اب مانگے وہ عیدی ہے

کیا بات بناتے ہو
کہتے ہوئے اوروں کو
تم اپنی سناتے ہو

اب سال ہوئے سولہ
انگوں میں جوانی نے
سنگار کئے سولہ

یہ روپ اٹاری ہے
بس دیکھ کے خوش ہو لو
سپنوں کی سواری ہے

کیا کہنے ہیں رشتے کے
ہیں ایک جدا بھی ہیں
دو پہلو ہیں سکے کے

بادام، شگوفوں سے
بھر آئے ہیں موسم میں
تن من مرے پھولوں سے

حاصلِ مُطالعہ

کمال گیاوی

دانشور ــــ ایک ایسا انسان جس کی گرہ میں دانش کے سوا سب کچھ ہے۔ مثلاً جثہ، دھنسی ہوئی آنکھیں، پچکے ہوئے گال، بکھرے ہوئے بال، دانش کا نصفِ اوّل ماسکو سے مستعار، اور نصفِ ثانی خشکھائی کی پیداوار۔

اس کی بنیادی خوبی یہ ہے کہ وہ اپنے دماغ سے نہیں سوچتا، بلکہ مُہر بہ لب خیالات کا شبانہ روز پرچار کرتا ہے۔

فن کار ــــ نہ ادیب، نہ شاعر، نہ نقاد۔ محض فنکار یعنی اَدب و شعر کی بکھائی ــــ ــــ خودٗ غلط، املا غلط، انشا غلط ــــ

اسلامی اَدب ــــ میکدہ کی چوکھٹ پہ سجدۂ سہو ــــ بقول نعیم صدیقی، عرض کوثر نیازی اور نجم ماہر القادری ــــ

اشتمالی اَدب ــــ ہائے اینگلو امریکی بلاک وائے اینگلو امریکی بلاک۔ روس زندہ باد ــــ چین پائندہ باد ــــ اور کافی ہاؤس سے باہر تمام محنت کش بھائی بھائی ہیں۔ سب سے بڑی گالی، رجعت اور سب سے بڑی عزت پرولتاریت ــــ اس کے سوا جو کچھ ہے وہ متروکات سخن میں سے ہے ــــ!

محض اَدب ــــ اہل زباں یوں نہیں، یوں بولتے ہیں۔ حکیم غفرلہٗ فرماتے ہیں کہ قلعہ معلّیٰ کے کمی کبابی علامہ اقبالؒ سے زیادہ صاف اُردو لکھتے اور بولتے تھے ــــ

مساوات ــــ میکدے کی چار دیواری اور طوائف کے بالاخانے کے علاوہ میں نے اپنے گرد و پیش کہیں بھی مساوات نہیں دیکھی۔!

عظیم جھوٹ ــــ اس سے بڑا جھوٹ آج تک تصنیف نہیں ہو سکا کہ انسان بھائی بھائی ہیں ــــ

گفتنی ــــ دعوت بغیر کشش کے ابکائی ہے۔ تحریک بغیر مرکزیت کے دھواں ہے۔ جدوجہد بغیر استقلال کے بلبلہ ہے۔ عمل بغیر زندگی کے قہقہہ ہے اور قربانی بغیر روح کے استخوان ــــ!

ناگفتنی ــــ سیاست ایک آگ ہے جو پہلے خود بھڑکتی ہے، پھر بھڑکائی جاتی ہے۔!
(ابو الکلام)

فلسفہ ــــ دماغ کی ادھیڑ بن میں عقل کا دھواں سڑاند پیدا کرتا ہے ــــ

شاعری، ــــــ دل کی چیخ پکار جس میں جوانی ہو سکتی ہے۔

الفاظ، ــــــ خوبصورت چہروں کی طرح دھوکہ دے جاتے ہیں

عورت، ــــــ بظاہر ماں، بیٹی، بہن اور بیوی، لیکن حقیقتاً ایک دِلآویز کھلونا جس سے شاہ و گدا سب کھیلتے ہیں ــــــ نرم ہو تو صبا کا جھونکا، گرم ہو تو دوپہر کی لُو ــــــ مشرق میں مہد سے لے کر لحد تک تنفّسہ ــــــ مغرب میں الف تا ی کی سیر و سیاحت ــــــ،

تاریخ، ــــــ زمانے کے ایوان اور تاریخ کے محراب میں اب تک شکست خوردہ آوازیں گونج رہی ہیں۔
(جوش)

ماضی، ــــــ کبھی کبھار بچھڑے ہوئے رفیقوں کے پیار کی طرح سُلگ اٹھتا ہے ــــــ،

حال، ــــــ ہمی بینم کہ خونابش بخون است "

مُستقبل، ــــــ جس کی توقع میں زندگی بسر ہوتی ہے لیکن خود ماضی کے دھندلکوں میں کھو جاتا ہے۔

سُہانے، ــــــ منبر کا وعظ، اسٹیج کی گونج، اور دُور کے ڈھول ہمیشہ سہانے ہوتے ہیں ــــــ،

گوشت، ــــــ بڑے بڑے مصنف اس بارے میں متفق الرائے ہیں کہ انسان کے گوشت سے زیادہ کوئی شے بھی لذیذ نہیں ہے ــــــ،

مُصَنِّف، ــــــ ایک ادیب یا شاعر ہمیشہ اپنے قلم کی تحریر اور ہمسائے کی بیوی سے محبت کرتا ہے (چینی)

وعدے، ــــــ جس دَور میں سے ہم گزر رہے ہیں اس دَور میں وعدے پورے نہیں کئے جاتے بلکہ فتح کئے جاتے ہیں ــــــ،

ستارے، ــــــ آسمان کی عبادتیں ہیں ــــــ،

انتخاب، ــــــ قیدیوں کو جیلر منتخب کر دینے کا حق دے دیا جائے تو اس سے یہ ثابت نہیں ہوتا کہ وہ آزاد بھی ہیں۔،

عظمت، ــــــ چند عالمگیر سچائیاں آدمی کو بڑا بناتی ہیں ــــــ،

دو مذہب، ــــــ دُنیا میں صرف دو ہی مذہب ہیں۔ امیر اور غریب۔ اس کے علاوہ جو کچھ ہے وہ ذہنی مغالطے ہیں ــــــ،

موت، ــــــ غالباً جدائی ہی ایک مادی ہئیت کا نام ہے ــــــ،

قبریں، ــــــ دھرتی پر موت کی تحریریں

---

*

غزلیں

بے وفاؤں سے وفاؤں کا صلہ مانگے ہے
دلِ تو پاگل ہے اندھیروں سے ضیا مانگے ہے
معتبر کتنا رہا ہوگا بھلا اس کا خلوص
جو کہ دشمن کے لئے دل سے دُعا مانگے ہے
ایک تُو ہے کہ ہُوا آج خدا سے منکر
ایک وہ ہے کہ جو پتھر سے دُعا مانگے ہے
بات یہ وقت کی کہیئے کہ مقدر اُس کا
جو سزا دیتا تھا وہ آج سزا مانگے ہے
ہے اگر عزم تو خود ڈھونڈ لے منزل اپنی
کیوں کسی غیر سے منزل کا پتہ مانگے ہے
دل مچلتا ہے سراج اپنا مُسلسل لیکن
کچھ سمجھ میں نہیں آتا کہ یہ کیا مانگے ہے

سراج الدین سراج

عشق کی آگ میں جلنے کا صلہ دیکھا ہے
میں نے پلکوں کے چراغوں میں خدا دیکھا ہے
کیسے مانوں کہ مرے خون میں سُرخی کم تھی
پھول پتوں پہ ترا نام لکھا دیکھا ہے
دیکھ اس سمت بھی مظلوم جوانوں کا جلوس
کربلا تُو نے تو پیاسوں کا گلا دیکھا ہے
جم گئی ہیں مرے چہرے پہ نگاہیں سب کی
گھر کے لوگوں نے کوئی خواب بُرا دیکھا ہے
اے مِرے دَورِ پُر آشوب کی سنجیدہ غزل
جب بھی دیکھا ہے تجھے سب سے جُدا دیکھا ہے
بھیڑ میں چھوٹ گیا ہاتھ کسی کا نشتر
زخم پیشانی پہ رشتوں کا اُگا دیکھا ہے

نشتر اکبرآبادی



جب فلمی ستارے مدّاح بن گئے



اداکار سنیے دت اور اُن کے مہمان نورمحمدی ہوٹل کے کھانے سے لطف اندوز ہو رہے ہیں

فلمی ستارے جو ہر دم مداحوں میں گھرے رہتے ہیں، جب خود کسی کے مدّاح بن جائیں تو یہ حیرت کی بات ہے۔ لیکن اگر آپ نورمحمدی ہوٹل کی نلی نہاری کا ایک بار ذائقہ لے لیں تو پھر آپ کو تعجب نہیں ہوگا۔ یہ ہے ہی اتنی عمدہ، لذیذ اور صحت مند کہ پہلے ہی لقمے میں خواص و عوام کا دل موہ لیتی ہے۔ اسی لئے نورمحمدی ہوٹل کے مستقل گاہکوں میں بڑی بڑی ہستیاں، مشہور فلمی ستارے شامل ہیں۔ یہاں کی نلی، نہاری، بھیجہ، پائے، ماش کی دال اور دیگر کھانوں کے پیچھے ۶۰ سال کا تجربہ اور جناب عبدالحکیم مالک نورمحمدی ہوٹل اور ان کے فرزند خالد حکیم کی ذاتی نگرانی شامل ہے، جس نے اُسے ممتاز بنا دیا ہے، آپ یہاں تشریف لا کر شوق فرمائیں، اپنے احباب کے لئے گھر لے جائیں یا پارٹی کے لئے لے جائیں۔ آپ اور آپ کے مہمان ذائقہ کو کبھی فراموش نہ کر سکیں گے۔

نورمحمدی ہوٹل، وزیر بلڈنگ 181/183 ای۔ آر۔ روڈ، بھنڈی بازار، بمبئی ۴۰۰۰۰۳

فون ہوٹل: 8511008 فون دفتر: 8516115

بابِ انتقاد

آدمی درندہ ہے

(ڈاکٹر کیشو چند رسین حقیرؔ آستانی)

ڈیمائی سائز ۲۰۰ صفحات
ناشر: شریمتی راج رانی سین، اندھیری، بمبئی۔
تقسیم کار: شانِ ہند پبلی کیشنز دہلی ۲
قیمت: ۱۰۰ روپے

حقیرؔ آستانی کو، جو کل تک زندہ تھے، اس جاں بلب زبان اردو سے بڑی محبت تھی محبت تو معمولی لفظ ہوا، انھیں اس زبان سے والہانہ عشق تھا۔ معاشیات اور حساب کتاب کے آدمی تھے لیکن ادب اور شعر سے اُن کا یارانہ تھا۔ حقیرؔ آستانی اس نسل سے تعلق رکھتے تھے جیسے سیکولرزم جیسی مصنوعی، نمائشی اور فرمائشی چیزوں کی ضرورت نہیں تھی۔ "میرا پیغام محبت ہے جہاں تک پہنچے"، اس نسل کا پیغام ہی نہیں عمل، وصف اور وطیرہ تھا۔ زبان، مذہب اور علاقہ، یہ چیزیں بے سامان ہیں یہ بات اس نسل کے لوگوں کے دماغ میں آ ہی نہیں سکی۔ حالانکہ وہ سب کے سب کھلے دماغ کے لوگ تھے۔

حقیرؔ آستانی نے دُنیا دیکھی تھی۔ محاورتاً نہیں، عملاً۔ وہ جگہ جگہ گھومے۔ عالمی بنک کے مشیروں میں سے تھے ہر ملک کے حالات سے واقف تھے۔ "افکارِ گریزاں" اُن کا پہلا مجموعۂ کلام تھا۔ اسی مجموعۂ کلام میں اُن کا ایک شعر میری نظر سے گزرا ؎

ہم جا رہے ہیں سوئے عدم اپنے شوق سے
کب تک جئیں گے عمر کا احساں لئے ہوئے

شاعر نے بہت جلد بتادیا کہ یہ صرف شعر نہیں، پتھر کی لکیر بھی ہے۔ شاعر کا یہی موڈ زیرِ نظر کتاب پر حاوی ہے۔ "آدمی درندہ ہے" اسی دل گرفتہ اور غم زدہ شاعر کے مشاہدے کی تحریری دستاویز ہے۔ حقیرؔ آستانی یوں کسی محرومی اور مایوسی کے شکار نہیں تھے۔ زندگی نے انھیں ہر طرح کی راحتیں، گھر کی خوشیاں اور آسائشیں مہیا کی تھیں۔ وہ اُن سے متمتع بھی ہوئے لیکن ان آسائشوں نے ان کی بینائی کو متأثر نہیں کیا۔ انھوں نے آدمی کا ہر روپ دیکھا اور اُن کی آنکھیں نم ہو گئیں۔ یہی دیدۂ تر اس کتاب کے تلخ اور خشک موضوع کو تھوڑی سی نمی عطا کرتا ہے ورنہ (تصویری خاکوں کے ساتھ) اس کا پہلا باب مرثیہ ہے آدمی کی درندگی کا۔ اس باب کا آخری شعر ہے ؎

جیسے تیسے زندہ ہے
آدمی درندہ ہے

کتاب کے دوسرے باب میں (۱۰۹ سے ۲۰۰ تک) غزلیں ہیں اور ان غزلوں کا موڈ بھی اُس غزل کا موڈ نہیں ہے جو تغزل سے بھرپور ہوتی ہے۔ بلکہ ان غزلوں میں بھی یاسیت کا عنصر نمایاں ہے ؎

حیاتِ جاودانی تو کسی کو بھی نہیں ملتی
یہ ایسی بات ہے جس کو نگاہوں میں سدا رکھنا
غلط ہے ایک رحمت ہے حقیرؔ جاں بلب مجھو
کسی کی آرزو کرنا کسی کا آسرا رکھنا

یہ مجموعۂ کلام شاعر کی رحلت کے بعد شائع ہوا ہے لیکن اس بات کا پتہ دیتا ہے کہ شاعر اپنے آخری دنوں میں کیا سوچ رہا تھا۔ شاعر کو شاید معلوم نہ ہو کہ وہ کیوں ایسے شعر کہہ رہا ہے، لیکن اُس کا لاشعور ہی اُس سے اس قسم کے اشعار کہلوا رہا تھا ؎

خوشیاں یا غم ہوں لیکن انسان حقیر ہی رہتا ہے
قائم دائم ہو جائے، ہے اس کا یہاں مقدر کہاں

آگئے تو رہ لیں گے چل دیئے تو چل دیں گے
جو بھی اب حقیقت ہے جو بھی اب فسانہ ہے

زیست ناپائدار ہے اتنی
اس کو ہرگز نہ پائدار سمجھو

خود کو تو بھی حقیر دنیا میں
زندہ در گور بے قرار سمجھو

اُن کے شعر فنی خوبیوں سے مالامال ہوں یا نہ ہوں، اُن کے دلی جذبات سے بہرحال محروم نہیں ہیں۔ اور اگر شاعر اپنی بات کھل کر کہہ سکتا ہے تو یہ تأثر ہی شاعری کا حاصل ہے۔

"آدمی درندہ ہے" بہت ہی خوبصورت چھپی ہے۔ تصویری خاکے، کتابت، اجلا کاغذ، عمدہ سرورق، سب دیدنی ہیں اور بین السطور میں شاعر کی ذہنی اور قلبی کیفیات موجزن ہیں۔

یوسف ناظم

مَن کہ مکتوبُ الیہ

قابلِ احترام بھائی جان
آداب!

صبح کے آٹھ بجنے کو ہیں۔ دودھ کی بوتلیں اُٹھانے کے لئے دروازہ کھولا تو دہلیز پر ایک پارسل پڑا پایا۔ آپ کی ارسال کردہ چھ عدد کتابیں۔ بہت بہت شکریہ۔

پارسل کھولتے ہی "دِلّی کے مشاعرے" تو بیگم صاحبہ نے قابو کر لی ہے۔ "پہلے میں پڑھوں گی۔ ... میں نے بھی فراق کو دیکھا ہے۔"

"تو ٹھیک ہے۔ لیجئے" دلّی کے مشاعرے" آپ کے نام...."

بازی ہارنا تو ہماری بیوی نے سیکھا ہی نہیں ہے۔ "آپ یہ اللہ اکبر پڑھیے۔" یہ کہہ کر اکبرؔ الٰہ آبادی کی کتاب میرے ہاتھ میں تھما دی۔

سرورؔ صاحب! آپ نے بہت ہی شاندار کتاب مرتّب کر دی ہے۔ اُردو ادب میں ایک اہم اضافہ ہوا ہے۔ مشاعروں کے شائقین آپ کا احسان مانیں گے۔ مجھے لگتا ہے دوسرا ایڈیشن بہت جلد ہی نکالنا پڑے گا۔

میری ایک اُلجھن دور کروا دیجئے۔ وہ یہ کہ پتہ ہی نہیں چل رہا کہ آپ کی محبّت کا شکریہ کیسے ادا کروں۔ موزوں الفاظ اور مُناسب لہجہ؟ پتہ ہی نہیں چل رہا کیا کیسے لکھنا چاہیئے۔

زبان سے یا قلم سے کچھ کہے بغیر بھی بہت کچھ کہا جا سکتا ہے۔ مجھے لگتا ہے کہ آپ سمجھ چکے ہیں کہ میں کیا کہنے کے لئے تلملا رہا ہوں۔ چلو یہ بھی مشکل کشائی۔ بھائی ہو تو ایسا۔

بہت بہت شکریہ۔
نارنگ ساقی اور مُضطرب صحرائی کو سلامِ محبّت۔

آپ کا بھائی
جیون لال شرما
ہنسلو، لندن

بھوپال
۱۸ اپریل ۹۱ء

محبِّ مکرّم، آداب!

بیگم حقیر آستانی نے، کہ مجھ پر مہربان ہیں، عزیز مکرّم حقیر آستانی صاحب کی کتاب چند دن پہلے مجھے ڈاک سے بھیجی اور فون پر تبصرہ کی فرمائش کی۔ وہ فرمائش نہ بھی کرتیں تو کتاب خود مجھ سے کچھ نہ کچھ لکھوا لیتی۔

کتاب کا انتساب آپ کے نام ہے، اس لئے یہ تبصرہ بھی آپ ہی کے نام بھیج رہا ہوں۔ کیسا بھی ہو یعنی جیسا بھی ہے، حسنِ سلوک کا مستحق ہے۔

کم لکھا ہے لیکن اسے واقعی زیادہ سمجھئے۔ آپ ہی نے تو اُن سے ملایا تھا۔

—— یوسف ناظم

محترم سرورؔ صاحب، تسلیم!

"دِلّی کے مشاعرے" کی اشاعت پر دِلی مبارکباد قبول فرمائیے۔ سینکڑوں شعرائے کرام کے ہزاروں بہترین اشعار کا کلیکشن آپ نے جو اس کتاب میں یکجا کر دیا ہے، اس کی مثال واقعی اُردو دُنیا میں نہیں ملتی۔ اور اگر یہ کہا جائے کہ سینکڑوں شعرائے کرام جو اب اس دُنیائے فانی سے کوچ کر گئے ہیں اُن کا بہترین کلام اسی کتاب میں یکجا مل جاتا ہے حالانکہ ان مرحوم شعرائے کرام میں سے اکثر کے مجموعہ ہائے کلام نایاب، بلکہ ناپید ہیں۔ مثال کے طور پر مرحوم یگانہ چنگیزی کا کلام کسی مشاعرے کی رُوداد میں آج تک پڑھنے میں نہیں آیا مگر "دِلّی کے مشاعرے" میں یگانہ چنگیزی کا بھی وہ کلام موجود ہے جو اُنھوں نے کسی مشاعرے میں سُنایا۔

شعراء کی نوک جھونک اور برمحل فقرہ کشی اور سامعین کی طرف سے حاضر جوابی کے بیشمار دلچسپ واقعات نے کتاب کو اِس قدر دلچسپ بنا دیا ہے کہ قاری بار بار اُن سے لُطف اندوز ہوتے ہوئے بیساختہ کہہ اُٹھتا ہے کہ کتاب کی قیمت وصول ہو گئی۔

اس میں کوئی شک نہیں کہ اُردو زبان میں اس نہج کی کتاب آج تک شائع نہیں ہوئی۔ اور آزادی کے بعد ہی نہیں، بلکہ اس سے پہلے بھی اُردو مشاعروں کی تاریخ اس انداز میں نہیں لکھی گئی۔ جب بھی کوئی اسکالر اُردو مشاعروں پر تحقیق کرے گا تو اُسے لامحالہ "دِلّی کے مشاعرے" تلاش کرنا ہی ہو گی۔ کاش یہ کتاب پاکستان میں بھی دستیاب ہوتی تو یہاں کے ادیبوں اور قارئین

کو پتہ چلتا کہ اُردو کو زندہ رکھنے والی کتابیں کس قسم کی ہوتی ہیں۔

آپ نے ان مشاعروں میں پاکستانی شعراء کا جس ایمانداری سے محاسبہ کیا ہے اس کی داد ہر پاکستانی دے گا۔ کیونکہ آپ کا یہ تجزیہ اتنا جاندار ہے کہ جسے کوئی جھٹلا نہیں سکتا۔

جہاں آپ نے اُردو ادب پر یہ احسان کیا ہے وہاں یہ کام بھی کر دیجئے کہ "دِلّی کے مُشاعرے" کی دوسری جلد "کل ہند مُشاعرے" اور تیسری جلد "انڈو پاک مُشاعرے" بھی جلد از جلد شائع کر دیجئے۔

ایمان کی بات تو یہ ہے کہ ہر وہ شخص جو اُردو شاعری سے ذرا بھی لگاؤ رکھتا ہے اگر وہ "دِلّی کے مشاعرے" اپنی ذاتی لائبریری میں رکھے تو اسے پھر کسی بھی اُردو شاعر کا کلام پڑھنے کی ضرورت نہ رہے گی۔

جونہی آپ کی دوسری کتابیں شائع ہوں تو انھیں بلا توقف بھجوائیے۔

ہمیشہ آپ کا مدّاح
ابنِ شفقت کاظمی،
ڈیرہ غازی خان، پاکستان۔

بھائی سرور صاحب،

آداب و تسلیمات و نیاز!

پچھلے خط کے جواب کے انتظار میں تھا۔ خاص کر عزیزہ نورِ دیدہ سلمہا کے حالات معلوم کر کے بیحد تشویش ہوئی تھی۔ ظاہر ہے کہ اس واقعے نے ذہن پر ضرور اثر ڈالا ہوگا۔ نقصان مایہ الگ ہوں، لیکن اس وقت مُلک جس جنوں سے گزر رہا ہے یا گزارا جا رہا ہے، اس کے بارے میں کیا کہوں دل کڑھتا ہے کہ ہم واضح اور بدیہی مُلکی مفادات سے کیسے اور کس حد تک نگاہیں موڑ سکتے ہیں — ہنگامے کراتے ہیں، اخلاق و اصول و مفادات قومی سب کا خون کرتے ہیں اور بعض تو اس پر فخر بھی کرتے ہیں۔ ...

"بھاگ ان بردہ فروشوں سے کہاں کے بھائی!!" مُلک عظیم ہے اور اس امتحان سے ضرور کامیاب نکلے گا، لیکن تاریخ کے دامن سے اپنی نادانی، بے عقلی اور بربریت پر مبنی سیاست کے دھبّوں کو تو دھو نہ پائے گا — والیسی میں خیر و عافیت سے مُطلع کیجئے گا۔

"تاریخِ مشاعرہ" بھیجنے میں دیر ہو رہی ہے۔ کچھ تو ہمارے کرم فرما جناب گوپی چند نارنگ نے اسکو طاقِ نسیاں پر رکھ دیا تھا اور پھر کچھ وغیرہ چلے گئے تھے۔ خدا کرے تشریف لائے تو کسی طرح یہ مسودہ ملا۔

والسّلام

بندۂ خلوص
علی جوّاد زیدی
بمبئی۔

شانِ ہند

جلد ۵۲ شمارہ ۵

چیف ایڈیٹر
سرور تونسوی

جوائنٹ ایڈیٹر
مطلب صحرائی

اشاعت کا
۵۲ واں سال

پرنٹر، پبلشر، پروپرائٹر: وقار پرکاش سرور تونسوی
طباعت: خواجہ پریس جامع مسجد دہلی۔ مقامِ اشاعت: دفتر ماہنامہ
"شانِ ہند" فلیٹ ۵ انصاری مارکیٹ دریا گنج نئی دہلی ۱۱۰۰۰۲۔

اس شمارے کی اہم جھلکیاں

ہندو پرست ہوں نہ مسلماں پرست ہوں
دامن پرست ہوں نہ گریباں پرست ہوں
ہر ذرۂ وطن سے ہے فیاض مجھ کو پیار
یعنی وطن پرست ہوں انساں پرست ہوں

فیاض گوالیاری

[illegible]
قیمت فی شمارہ ـ پانچ روپے
قیمت سالانہ [illegible]
[illegible] ـ/۱۰۰ روپے
[illegible]

غزل

ڈاکٹر حقیر آستانی مرحوم



رختِ سفر کے ساتھ ہی عزمِ سفر بھی ہو
وہ اقتضائے دیدہ وہ ذوقِ نظر بھی ہو

کچھ تو گمانِ گردشِ شمس و قمر بھی ہو
طلبِ سحر کے ساتھ ہی تابِ سحر بھی ہو

ایسا تو کوئی راستہ سُوجھا نہیں ہمیں
جو دِل کو دردمند کرے بے خطر بھی ہو

لائیں کہاں سے ڈھونڈ کے ایسا مقام جو
ویرانہ بھی چمن بھی ہو غُربت بھی گھر بھی ہو

کیا کیا نہ ہم کلام کریں اُن سے جب بنے
لیکن نیاز و ناز کا اُن پر اثر بھی ہو

کس سے کرینگے بات یہ پھوڑیں گے سر کہاں
اِن بیکسوں کا مسکن دیوار و در بھی ہو

شکوہ جو کر رہے ہیں شبِ تار کا حقیرؔ
روزِ سیاہ کی ذرا اُن کو خبر بھی ہو

خدابخش لائبریری پٹنہ

پر صوبائی تعصب کے چھینٹے

ان مضامین میں سوائے ذاتی عناد اور موجودہ دور کے چند بہاری اردو دانشوروں کے گھٹیا پن کے مظاہرے کے اور کچھ بھی نہیں ہے۔

موقر [illegible] عظیم آباد
ایکسپریس [illegible] خدا بخش [illegible]
[illegible] ڈاکٹر عابد

رضا بیدار کے خلاف دس کالمی مضمون شائع
ہوا ہے جس میں یہ ثابت کرنے کی ناکام
کوشش کی گئی ہے کہ گزشتہ اٹھارہ سالوں
سے ڈاکٹر عابد رضا بیدار اس عظیم الشان
لائبریری کو برباد اور تباہ کر رہے ہیں۔

گزشتہ کئی سالوں [illegible]
[illegible] خدا بخش [illegible]
[illegible]
[illegible]
کالمی مضمون [illegible]

[illegible]
[illegible] رضوان احمد بہار کے بستیہ [illegible]
[illegible] ہیں۔ خدا نے انھیں [illegible]
[illegible] عطا فرمایا ہے اور کسی کے
[illegible] میں لکھنے کا سلیقہ بھی دیا ہے۔
[illegible] ہے کہ وہ گزشتہ سالہا سال سے
[illegible] عابد رضا بیدار کے خلاف اپنے اخبار کے
[illegible] ات سیاہ کر چکے ہیں مگر نہ تو ڈاکٹر عابد
[illegible] بیدار کے کانوں پر جوں رینگی اور نہ ہی
[illegible] مت نے اس کا کچھ اثر لیا۔ ایسا کیوں؟
[illegible] یہ نشان متعدد بار اُبھر کر ہمارے سامنے
[illegible] اور ہم نے مسٹر عابد رضا بیدار کے خلاف
[illegible] مضمون بغور پڑھا جو روزنامہ عظیم آباد
[illegible] پریس میں شائع ہوا۔ مگر خدا لگتی حقیقت
[illegible] ہے کہ ان مضامین میں سوائے ذاتی عناد کے
[illegible] وہ دور کے چند بہاری اردو دانشوروں
[illegible] کے مظاہرے کے سوا اور کچھ بھی
[illegible] ہے۔ اور ڈاکٹر عابد رضا بیدار کا اگر
[illegible] قصور ہے تو محض یہ کہ وہ یو۔پی کے باشندے
[illegible] اور بہار کے اردو دانشوروں کے ایک
[illegible] کے ایماء کے مطابق پٹنہ کے ایک علمی
[illegible] ادارے پر یو۔پی کا ایک باوقار اور پڑھا
[illegible] ڈائرکٹر کیوں تعینات ہے۔

[illegible] وجہ ہے کہ حکومت نے دس دس
[illegible] کالمی مضامین پر بھی توجہ نہ دی۔ اور نہ ہی
[illegible] عابد رضا بیدار نے ایسے مضامین سے
[illegible] ہو کر بہاری اردو دانشوروں کے
[illegible] طائفہ کی خوشامد کی۔

ہمیں باوثوق ذرائع سے علم ہے کہ مسٹر رضوان احمد نے اپنے
اداریوں اور مضامین پر ہی اکتفا نہیں کیا بلکہ بہار کے وزرائے اعلیٰ
محکمۂ تعلیم کے وزراء حتیٰ کہ گورنروں تک کو خدا بخش لائبریری
کی بربادی اور تاراجی کی فرضی داستانیں سُنائیں اور ڈاکٹر
عابد رضا بیدار کے خلاف ان الزامات کی فرد پیش کی جن کی
تفصیل اس دس کالمی مضمون میں دی گئی ہے۔

گورنروں تک کو خدا بخش لائبریری کی بربادی
اور تاراجی کی فرضی داستانیں سُنائیں۔ اور
ڈاکٹر عابد رضا بیدار کے خلاف ان الزامات
کی فرد پیش کی جن کی تفصیل اس دس کالمی
مضمون میں دی گئی ہے۔ مگر خدا نے ہمیشہ حق و
انصاف کا ساتھ دیا ہے اور ڈاکٹر عابد رضا
بیدار بدستور انتہائی خاموشی کے ساتھ اپنا
کام کیے جا رہے ہیں۔ اور انھوں نے اپنے خلاف
شائع ہونے والے مضامین کا کبھی جواب تک
نہیں دیا۔

"عظیم آباد ایکسپریس" میں پچھلے دنوں
جو دس کالمی مضمون اس ضمن میں شائع ہوا
ہے وہ محض بہار کے نئے گورنر جناب محمد شفیع
قریشی کو اس عظیم الشان لائبریری اور اس
کے ڈائرکٹر سے بدظن کرنے کی شاطرانہ چال ہے۔
مگر بہار کے نئے گورنر جناب محمد شفیع
قریشی سے غالباً مسٹر رضوان احمد اچھی طرح
سے واقف نہیں ہیں۔ جب قریشی صاحب
مرکزی حکومت میں ریلوے کے نائب وزیر تھے
اس وقت ریلوے کی ہڑتال کو قریشی صاحب
کی حکمتِ عملی اور بردباری نے جس طرح
ختم کیا تھا وہ اُن کی اعلیٰ انتظامی اور بیدار
مغزی کا اعلیٰ نمونہ تھا۔

جموں و کشمیر میں کانگریس (آئی) کے
صدر کی حیثیت سے قریشی صاحب نے کانگریس
کی شان کو جس طرح قائم رکھا ہے اُسے دشمن
بھی تسلیم کرتے ہیں۔

قریشی صاحب نے اپنی اعلیٰ
انتظامی قابلیت، قومی یکجہتی اور ملکی
سالمیت میں پختہ ایمان کے باعث ایک
منجھے ہوئے سیاسی قائد کی جو حیثیت بنائی ہے
اس کے پیشِ نظر موجودہ مرکزی حکومت نے انھیں
بہار ایسے فتنہ انگیز سیاسی ماحول رکھنے والے
صوبہ کا گورنر بنایا ہے تو کیا وہ مسٹر رضوان
احمد صاحب کے دس کالمی مضمون کی تہہ تک
نہیں پہنچ سکتے؟

ہم اپنے عزیز محترم مسٹر رضوان احمد
اور بہار کے اُن احساسِ کمتری میں مبتلا
اردو دانشوروں سے مؤدبانہ گزارش کرتے
ہیں کہ وہ خدا بخش لائبریری ایسے خالص
ادبی، علمی ادارے کو اپنی خود غرضی کا نشانہ
بنانے سے گریز کریں [illegible] اور بہاری
کی تخصیص کو بھی ختم کریں۔

اس ضمن میں یہ عرض کر دینا انتہائی
ضروری ہے کہ ڈاکٹر عابد رضا بیدار کو ہم نے
آج تک [illegible] ہے۔ نہ ہی بہاری آج

خدا بخش لائبریری نے گزشتہ اٹھارہ
سالوں میں جو علمی، ادبی کام کیا ہے اگر وہ کسی
کو جانتے بوجھتے نظر نہ آئے تو اس کا علاج
کسی کے پاس نہیں ہے۔ ہمیں باوثوق ذرائع
سے علم ہے کہ مسٹر رضوان احمد نے اپنے اداریوں
اور مضامین پر ہی اکتفا نہیں کیا بلکہ بہار کے
وزرائے اعلیٰ، محکمۂ تعلیم کے وزراء حتیٰ کہ

بھی اس سے کسی قسم کی مدد لینا ضروری ہے۔
یہاں تک کہ خدا بخش لائبریری کو ہم نے کچھ
عرصہ ہُوا اپنے قیام پٹنہ کے دوران دیکھا اور

ہُوا تعین تک لائبریری کے مختلف شعبوں
کے بارے میں پوچھ گچھ کی تو ہم نے ڈائریکٹر
صاحب سے باقاعدہ ملاقات کی اور

لائبریری کے کارکنان کی یہ خاطر
کہ ہم گویا ہیں۔



ماہیا

دیپک قمر

"سُلگتے الاؤ" کا ایک ورق

پھیری ہے نظر اُس نے
جوڑے ہے کبھی گھر کی
پھر لی نہ خبر اُس نے

بڑھتا ہے اناڑی ہے
وہ خود کو ہرائے گا
کہنے کو کھلاڑی ہے

تاروں بھرے میلے میں
ہر بات خوشی کی ہے
ملتی ہے اکیلے میں

کیا گنّے کی پوری ہے
چھلکوں میں چھپا ہے رس
مالی کی وہ مجبوری ہے

ہر گام ہُوا اب پیل
یہ آج یہیں تک تھا
رستے میں کھڑا ہے کل

ہر پھول اُداس سی ہے
ٹوٹے ہوئے دل والی
ہر بات اداس سی ہے

دنیا کا ارادہ ہے
اُوجھا ہی نہ پھنسے ہی
بکنے کو کنارا ہے

ہر روز کا سبب سی ہے
ہو کر بھی نہیں ہے کچھ
یہ بات عجب سی ہے

یہ روپ اکاری ہے
بس دیکھ کے خوش ہو لو
سپنوں کی سواری ہے

جی بھر کے دعائیں دوں
اُمید ہے وہ ملے گی
تجھ کی بلائیں لوں

بیکار رہتے ہیں
دھونے تو بہت لگیں
ٹیک ٹیک سے کچے ہیں

جذبات کے کدی ہے
کیا جائے گی ہر شے کو
یہ موت اکھڑی ہے

ارمان سب ہی ٹوٹیں
گر کوئی نہیں میں کا
وہ جانے کہاں سوئیں

معصوم شباں دیکھو
ہے عمر لڑکپن کی
بنتے ہیں جوان دیکھو

حُسنِ اصلاح

زار علامی

گزشتہ سے پیوستہ

رباعی شارق: ؎

تحصیلِ ہنر کا جمع سامان کرلو
یہ زندگی مشکل ہے آسان کرلو
دم بھر میں چمک اٹھے گی بزمِ ہستی
افکار کی شمعوں کو فروزاں کرلو

اصلاح:-

تحصیلِ ہنر ــ علیٰ حالہٖ
آئینۂ دانش کو نمایاں کرلو
دم بھر ...... علیٰ حالہٖ
افکار کی ...... علیٰ حالہٖ

توضیح:-

بشرطیکہ بعد ہنر کو ہنر نے کا ارادہ لازم نہیں، لہٰذا یہ مصرعہ زندگی کو بھی آسان ہو سکے گی [illegible] ساختہ [illegible] اظہار

[illegible] شبیہہ

رباعی شارق: ؎

واعظ کو بھی ناچ کوئی کرتا دیکھا
ظاہر میں ادب لوگوں کو بھٹکا دیکھا
جس شخص سے گزرا کام ہو لے شارق
اک ایک کو انگلیوں پہ گنوا دیکھا

اصلاح:-

[illegible] کی بزم کو کبھی پیار سے دیکھا
ہر شخص کو مصری کی طرح میٹھا دیکھا
جس وقت پڑا کام تو اے شارق
اک ایک کو آنکھیں سی چراتا دیکھا

توضیح:-

رباعی میں بے اعتبار زبان و بیاں کی کمزوریاں تھیں۔ تیسرے مصرعے میں کام پڑنے کی بات کہی گئی تھی۔ لہٰذا واعظ، ناچ اور [illegible] تینوں بے محل [illegible] مصرعے میں

[illegible] والدین کے [illegible]
[illegible]
[illegible] نہیں رہتی۔

رباعی شارق: ؎

[illegible]

اصلاح:-

[illegible]

توضیح:-

[illegible]

[illegible]
[illegible] میں اندر [illegible]
[illegible] واو کا سقوط مستحسن نہیں۔
[illegible] صورت میں حرف ساکن متحرک
[illegible] درست۔ مگر یہ نہیں ہوتا کہ حرف
[illegible] ساقط ہو جائے۔ لہٰذا اس قبیل کے
[illegible] کا آخری حرفِ ساکن ساقط کرنا ہرگز
[illegible] نہیں۔

شعرِ شارق:۔

خلش جو دل میں تھی ہر دم نہیں ہے
بہارِ غم کا وہ عالم نہیں ہے

اصلاح:۔

تڑپ جو دل میں ہے پیہم نہیں ہے
بہارِ غم ...... علیٰ حال

توجیہ:۔

دوسرے مصرعہ میں 'وہ' کی معنوی حیثیت [illegible] نہیں کیا گیا۔ اسی ضرورت کے پیشِ نظر قافیہ تبدیل کیا گیا اور 'خلش' کے عوض 'تڑپ' رکھا گیا۔ یہاں تڑپ ہی کا مقام ہے۔ مصرعِ [illegible] 'غم' کی جگہ ہے 'بہار' [illegible] [illegible] کیا ہے۔ اب مطلع کی شان کچھ اور ہی [illegible]۔

شعرِ شارق:۔

وہ درد وہ خلوص وہ انسانیت کہاں
شیرازہ حیات پریشاں ہے آج کل

اصلاح:۔

وہ درد ...... علیٰ حال...
انسان پر ستم ہی انسان ہے آج کل
یا
انسان دشمنِ [illegible] انسان ہے آج کل

توجیہ:۔

دونوں مصرعے باہم دست و گریباں نہ تھے عجیب دولخت۔ مصرعِ ثانی [illegible] کیا گیا ہے جو پسند ہو رکھ لیں۔

شعرِ شارق:۔

ممکن استعارے ہوں دلکش حسین تشبیہیں
نئے نویلے مضامین ہوں غزل کے لئے

اصلاح:۔

خرابِ کہنہ سے اب احتراز لازم ہے
نئے نویلے ...... علیٰ حال

توجیہ:۔

دل کش استعارے اور حسین تشبیہیں کلام میں خوبصورتی کا موجب تو ہو سکتے ہیں مگر نئے نویلے مضامین کے ضامن نہیں ہو سکتے۔ دوسرے مصرعے میں "ہوں" کے معنی پر غور کیجئے "چاہیئے" کے معنی دے رہا ہے۔ اصلاح میں اسی بات کا خیال رکھا گیا ہے۔

رُباعئ شارق:۔

بنیادِ محبت کی اٹھائی ہے مجھے
دیوار یہ نفرت کی گرائی ہے مجھے
ہر وقت جہاں تک شہادت کی تلاش
دل میں تری تصویر بنائی ہے مجھے

اصلاح:۔

بنیاد ...... علیٰ حال
دیوار کدورت کی ڈھائی ہے مجھے
قرباں رہِ عشق میں ہو جانے دو
اخلاص کی تو قبر بنائی ہے مجھے

توجیہ:۔

'اٹھانی' 'گرانی' میں ایطاء۔ رنگِ شہادت کی تلاش سے کیا مدعا حاصل ہو سکتا ہے۔ رباعی کے مصارع باہم دست و گریباں نہیں تھے۔

پہلا مقدمہ

مشیر الدین احمد

وہ میرا پہلا مقدمہ تھا۔ میری تقرری بطور سرکاری وکیل کے چند روز قبل ہی ہوئی تھی۔ شاید مجھے اناڑی سمجھتے ہوئے اس کیس کی پیروی کے لیے میرا انتخاب کیا گیا تھا کیونکہ مقدمے میں کسی قسم کی پیچیدگی کا امکان نہ تھا۔ ملزم نے دوران تفتیش پولیس کے روبرو اقبال جرم کر لیا تھا۔ [illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible] سے میں ہی [illegible]

[illegible] کو میں پھینک دیا تھا۔ وہ ایک روز [illegible] پکڑا گیا تھا۔ اور اس نے اپنے خلاف [illegible] کر دیا تھی۔ اس کا کہنا تھا کہ سبھی قتل [illegible] انجام دیے تھے۔ اس کو ایک ایک [illegible] اور یہ معلوم تھا اور یہ کہ اس کو کب کہاں [illegible] اور کس طرح سے موت کے گھاٹ اتارا گیا تھا [illegible] پاس اس کے خود اقراری اقبالی بیان کے سوا کوئی [illegible] تھا۔ اس کے گھر سے بھی کوئی ایسی چیز نہ ملی جس کے ذریعے اس کا تعلق ان جرائم سے قائم کیا جاسکتا تھا۔ صرف ایک بات اس کے خلاف جاتی تھی اور وہ یہ کہ ملزم کے پاس ان قتلوں پر چھپنے والی خبروں کی تراشوں کا [illegible] موجود تھا۔ اس نے ہر قتل کی فائل [illegible] رکھی تھی۔ جس میں اخباروں میں چھپنے والی خبروں کو چسپاں کیا گیا تھا۔ اس سے کم از کم یہ ثابت ہوتا تھا کہ ملزم کو ان قتلوں میں کسی وجہ سے غیر معمولی دلچسپی تھی وہ کرید کر اس طرح ڈھونڈ ڈھونڈ کر خبروں کو جمع کرتا ہے اور ان کو [illegible] کے تاریخ وار فائلوں میں لگاتا ہے۔

ملزم کے وکیل نے جیسے ملزم کی والدہ نے بیٹے کی [illegible] کے خلاف [illegible] مقدمے کی سماعت کے دوران عدالت کی توجہ اس امر کی جانب مبذول کروائی کہ ملزم کے خلاف شہادت [illegible] ایک طرف رہی، اس کا ایک شائبہ [illegible] کیا جاسکتا تھا اور سارے مقدمے کی بنیاد ملزم کے اقراری اقبالی بیان پر تھی۔ البتہ وہ یہ بات [illegible] تھا کہ اس خود اقراری بیان کے پیچھے کون سے محرکات کام کر رہے تھے۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ ملزم اس کے ساتھ تعاون کرنے سے انکار کرتا تھا۔ ملزم نے بھری عدالت میں وکیل کو برا بھلا کہا اور اسے اپنے مقدمے کی پیروی کرنے سے منع کر دیا۔ اس کی جگہ پر چونکہ ملزم کسی دوسرے وکیل کو مقرر کرنے سے انکاری تھا۔ اس لئے عدالت کی طرف سے سرکاری خرچ پر ایک وکیل اس کے لئے مہیا کیا گیا۔ اس نئے وکیل کا رویہ بالکل مختلف تھا۔ اس نے ملزم کی ہدایت کے مطابق اپنے مؤکل کا ان تمام قتلوں میں ملوث ہونا تسلیم کر لیا۔

مقدمے کی تیاری کے دوران مجھے اندازہ ہوا تھا کہ ملزم کو اپنی والدہ سے بالکل ہمدردی نہ تھی۔ وہ باقاعدگی کے ساتھ آتے رہتے تھے [illegible] ملزم نے نے اس سے کبھی [illegible] وہ اپنی ماں کو ایک نظر بھی دیکھنا پسند نہ کرتا تھا چنانچہ مقدمے کی سماعت کے دوران وہ اپنی ماں کی طرف پیٹھ پھیرے بیٹھا رہا۔ جب میں نے ملزم کے بیان پر جرح کرتے ہوئے اس سے پوچھا کہ کیا اس کی ماں عدالت میں موجود تھی تو اس نے جواب دیا کہ اس کی ماں کو مرے ہوئے عرصہ ہو چکا تھا۔

ملزم کی گواہی کے خاتمے پر میں نے اس کی ماں کو گواہوں کے کٹہرے میں آنے کو کہا۔ ملزم نے اس کی طرف دیکھے بغیر اس [illegible] کہ اپنی ماں ہونا تسلیم کرنے سے انکار کر دیا اس نے کہا کہ اس کی ماں اس کے لئے اسی روز مر گئی تھی، جس روز اس نے اس کی سہیلی روزے ماری کو جو گھر سے گئی تھی اور اس کے بچے کی ماں بننے والی تھی، اپنے گھر سے باہر نکال دیا تھا۔ اس کی ماں کا کہنا تھا کہ وہی روزی ماری اس کے بیٹے کی مشکلات اور اس کی نفسیاتی الجھنوں کا باعث تھی۔ چونکہ ماں اور بیٹا روزی ماری کے بارے میں جذبات سے عاری اور بے لاگ بیان دینے کے لئے تیار نہ تھے۔ اس لئے میں نے عدالت سے درخواست کی کہ روزے ماری کو گواہی دینے کے لئے بلایا جائے۔ مگر باوجود کوششوں کے پولیس روزے ماری کو تلاش نہ کر پائی۔ اس کے بارے میں آخری خبر یہ تھی کہ وہ ملک سے ہجرت کرکے امریکہ یا کینیڈا چلی گئی تھی۔

مقدمے کی اگلی پیشی میں ملزم کی ماں کو دوسری بار گواہی دینے کے لئے بلایا گیا۔ مگر ماں اور بیٹے کے درمیان پائی جانے والی الجھنیں سلجھنے کی بجائے مزید الجھتی چلی گئیں ماں کا کہنا تھا کہ وہ اپنے بیٹے سے بے پناہ محبت کرتی تھی اور اس کا دل گواہی دیتا تھا کہ اس کے بیٹے کا ان قتل کی وارداتوں کے ساتھ کوئی تعلق نہیں ہو سکتا۔ اس نے اپنے بیٹے کی پرورش ایسے رنگ میں کی تھی کہ وہ ایک چیونٹی تک کو گزند نہیں پہنچا سکتا۔ چہ جائیکہ انسانوں کو جان سے مارنا۔

چونکہ ملزم نے ماہر نفسیات سے تحلیل نفسی کے لئے موقع دینے سے انکار کر دیا تھا۔ اس لئے میری درخواست پر عدالت نے ایک ماہر نفسیات کو مقدمے کی سماعت کے دوران پورا وقت عدالت میں حاضر رہنے اور ملزم کی حرکات اور بیانات کا نفسیاتی نقطہ نظر سے مطالعہ کرنے پر مامور کیا تھا۔ ماہر نفسیات نے اپنی رپورٹ میں اس امر کا انکشاف کیا کہ ملزم اور اس کی ماں کے درمیان پائی جانے والی کشمکش ان جرائم کی [illegible] تھی۔ اس کا کہنا تھا کہ ہر عورت جسے ملزم قتل کرتا تھا۔ دراصل اس سے اس کا مقصد اپنی ماں کو جان سے مارنا ہوتا تھا۔ ملزم کو ماہر نفسیات نے اوسط درجے سے کہیں بڑھ کر ذہین ہونے کی سند دی تھی اور کہا کہ وہ مجوزہ قتلوں کا مکمل طور پر ذمہ دار تھا گویا قتل اس نے جانتے بوجھتے ہوئے اپنے ہوش و حواس کے ساتھ کئے تھے۔ اس لئے اسے قانون کی نظروں میں قابل سزا گردانا جاسکتا ہے۔

ملزم نے اپنی ماں کی ہر کوشش کو رد کر دیا۔ جس کے ذریعے اس کا قتل کی وارداتوں میں ملوث نہ ہونا ثابت ہو سکتا تھا جب پہلی عورت کا قتل عمل میں آیا تھا تو ملزم کی عمر بمشکل چودہ برس کی تھی۔ اس زمانے میں ابھی اس کی جنسی ہوس اتنی تیز نہ ہو سکی تھی کہ وہ اس کی تسکین کی خاطر قتل کرنے سے دریغ نہ کرتا۔ ایک دوسری واردات کے وقت اس کی ماں کی یادداشت کے مطابق اس کا بیٹا روزے ماری کے ہمراہ ملک سے باہر گیا ہوا تھا اس لئے وہ اس کا مرتکب نہیں ہو سکتا تھا۔ دو وارداتیں ایک ہی روز ملک کے دو دور ترین علاقوں میں وقوع پذیر ہوئی تھیں۔ اس طرح کی ایک واردات شمالی سرحد کے قریب اور دوسری جنوبی سرحد کے قریب ہوئی تھی۔ دونوں جگہوں پر ملزم کا ایک ہی روز موجود ہونا ناممکن امر تھا۔

ملزم کی [illegible] مگر میرے دل میں [illegible] شک کی چنگاری بار بار اس امر کے [illegible] تاثر قائم کرتا کہ ملزم نے اپنے [illegible] اقراری بیان کے ذریعے اپنا مجرم ہونا ثابت کر دیا تھا [illegible] تھا [illegible] اس کی وجہ [illegible] کی کوشش [illegible] پہنچ [illegible] تیا تھا اور میری نظروں [illegible] ہر حالت میں ملزم کا مجرم ثابت کرنا [illegible] انصاف کے تقاضوں کو [illegible] کرتا تھا۔ [illegible] اس کے پیچھے [illegible] کی تربیت [illegible] ثابت ہوتی۔ چونکہ اس مقدمے میں ایک [illegible] صورت حال پیدا ہو گئی۔ ملزم کا وکیل [illegible] مجرم ہونا ثابت [illegible] عدالت کے سامنے اس امر کے حق میں دلائل دے رہا تھا کہ ملزم [illegible] اقراری اقبالی بیان

[illegible] اس کوشش کا خاتمہ کر دیتے
[illegible] کر دینا چاہیے۔

واضح رہے کہ میرا طریقۂ کار سب سے حق میں بھی [illegible] پہلا موقع [illegible] تھا۔ وہ مقدمہ جو میرے کیریئر [illegible] تھا۔ آپ کے پیشہ کے لئے خاصا [illegible] افسران بالا [illegible] اتفاق [illegible] ہوئے۔ مگر قانونی طور پر وہ مجھ [illegible] مقدمے کی پیروی واپس نہ لے سکتے تھے۔ عدالت نے [illegible] دلائل کو رد کرتے ہوئے ملزم کا تمام [illegible] ثابت ہونا تسلیم کر لیا اور اسے ۲۳ بار عمر قید کا [illegible] فیصلے کے خلاف ملزم کی طرف سے عدالت عالیہ میں [illegible] کی گئی اور میرے محکمے نے میرے اصرار کے باوجود [illegible] اپیل کرنے کی اجازت نہ دی۔ اس طرح میں نے اپنے [illegible] کی ابتدا ایک شکست فاش کے ساتھ کی۔

ملزم اپنے وقت کا سفاک ترین قاتل قرار پایا۔ [illegible] جاتا تھا کہ اس سے زیادہ لوگ کسی دوسرے شخص نے [illegible] کی تھی۔ میری ملازمت اپنے معمول کے مطابق [illegible] تھی جس میں سرکاری وکیلوں کا واسطہ غنڈوں، [illegible] دھوکہ بازوں اور ہر قسم کے قانون توڑنے والوں [illegible] ساتھ پڑتا ہے۔ میں اپنی ملازمت پیشہ زندگی کی پہلی [illegible] کو تقریباً بھول چکا تھا جب ہمارے شہر میں [illegible] ایک قصائی اتفاق سے پولیس کے ہاتھ چڑھ [illegible] مشہور ہے کہ اتفاق کامیاب ترین سراغ رساں [illegible] ہے۔ قصائی کی گرفتاری کے سبب [illegible] ہو گئی۔ جب ٹریفک پولیس کے سپاہی نے [illegible] شراب پیے ہوئے تو [illegible] کار کے اندر جھانک کر دیکھا تو [illegible] کار کی پچھلی سیٹ پر [illegible] تھی۔

[illegible] کہ وہ پیشہ ور قصائی تھا اس نے [illegible]

[illegible] ہوا تھا۔

قتل کرنے والی [illegible] کی مرت

اس [illegible] کے بعد اس امر کا ثبوت [illegible] کہ قصائی نے [illegible] کے دوران [illegible] ان میں سات [illegible] جن کی گنتی ان تیئس [illegible] کے قتل کے [illegible] بار عمر قید کی سزا سنائی جا چکی تھی۔ قصائی پر مقدمہ چلا اور عدالت نے ثبوت اور شہادتوں کی روشنی میں اسے [illegible] بار عمر قید کی سزا کا مستحق قرار دیا۔ ہائی کورٹ میں اس فیصلے کے خلاف اپیل ہوئی مگر اس عدالت نے بھی سزا کو برقرار رکھا۔

چونکہ ایک ہی جرم کے لئے دو بار کسی کو سزا نہیں دی جا سکتی۔ اس لئے [illegible] نے اپنے محکمے پر زور دے کر پہلے ملزم کے کیس کو دوبارہ چلائے جانے کا فیصلہ کر دیا مگر محکمے نے کیس کی پیروی میری بجائے ایک دوسرے سرکاری وکیل کے سپرد کر دی۔ اس نے عدالت میں یہ سٹینڈ لیا کہ ان سات کیسوں کے لئے، جن کا اصل مجرم قصائی قرار پا چکا تھا، ملزم کو عمر قید کی سزا نہیں دی جا سکتی البتہ باقی کے تمام کیسوں میں اس کی سزا کو بحال رکھا جائے۔ عدالت نے اس سے اتفاق کیا اور اس کی سزا [illegible] بار عمر قید سے تخفیف کر کے سولہ بار عمر قید میں بدل دیا۔ میرے محکمے کے افسران [illegible] تک تو اس امر کی اجازت دیتے تھے [illegible] اس منطق پر کڑی تنقید کرتی [illegible] کیونکہ ملزم کے خلاف سوائے اس کے [illegible] اقبالی بیان کے کوئی ثبوت موجود نہ تھا۔ اب جب کہ یہ بات ثابت ہو گئی تھی کہ اس کا خود [illegible] اقبالی بیان سات قتلوں میں غلط تھا۔ اس کے بیان کی صحت پر اعتبار کیسے کیا جا سکتا تھا اس لئے اس کو [illegible] کا فائدہ [illegible] دینا چاہیے۔ مگر میری تنقید کو افسران بالا [illegible] [illegible] بیان کو [illegible]

زندگی [illegible]

کی صورت کی تحریک پیدا ہوئی اور قیدیوں [illegible] کی قسم کی ہو گئیں [illegible] [illegible] والوں کو قید خانے سے باہر [illegible] کام [illegible] لگی۔ وہ صبح سویرے کام پر جاتے اور [illegible] اکثر رات جیل میں بسر کرتے تھے۔ قیدیوں کو [illegible] ایک بار جیل خانے سے چھٹی دی جانے لگی جس کے خاتمے پر انہیں واپس آ کر اپنی باقی ماندہ سزا بھگتنی ہوتی تھی۔ پھر ایسے واقعات ہوئے کہ قیدیوں نے چھٹی کے دوران ڈاکہ زنی اور قتل کی وارداتیں کیں۔ [illegible] اخباروں میں ایسے واقعات کا بہت چرچا ہوا [illegible] میں ایسے قیدیوں کو چھٹی دینے پر تنقید کی جانے [illegible] جنسی لذت حاصل کرنے کے لئے عورتوں کی [illegible] سے [illegible] گریز کرتے تھے۔ جب [illegible] کی تعداد بڑھنے لگی تو جیل کے حکام نے قیدیوں کو [illegible] دینے میں سختی سے کام لینا شروع کیا [illegible] قید والوں کے لئے رعایت منسوخ کر دی گئی۔

پھر عمر قید والوں کو [illegible] کا مسئلہ زیر بحث آیا۔ [illegible] نے اس چیز کو اپنا مطمح نظر بنایا کہ عمر قید والے [illegible] چند سالوں کی قید کے بعد [illegible] دلوائی جائے [illegible] قیدیوں کو رہا کیا جانے لگا۔ مگر [illegible] سے زیادہ بار عمر قید کی سزا ہوتی [illegible] کہ [illegible] آزاد [illegible] کی جاتی تھیں [illegible] جاتے تھے۔

[illegible]

سنا [illegible]

کو از سر نو چھاننے کے سلسلے میں میری ہوئے تھے۔ اس کام کے لئے ضروری تھا کہ کوئی نیا پہلو مقدمے کا سامنے آئے۔ کوئی اہم گواہ مل جائے جس کی گواہی پہلے مقدمے میں پیش نہ کی جا سکتی تھی۔ میں نے نوجوان وکیلوں کو مشورہ دیا کہ وہ روز سے ماری کو تلاش کر کے اسے گواہی دینے پر آمادہ کریں۔

صحافیوں کی مدد سے کیس کو از سر نو اخبارات میں اچھالا گیا اور روز سے ماری کی تلاش شروع ہوئی۔ اتفاق ایسا تھا کہ روز سے ماری چند دن قبل لمبے زمانے تک غیر ممالک میں قیام کے بعد اپنے وطن لوٹی تھی۔ اسے علم نہ تھا کہ اس کا سابق دوست تیس برسوں سے جیل میں تھا۔ جس کے دوران اس کی ماں مر چکی تھی بغیر اس کے کہ ماں بیٹے کے درمیان صلح ہوئی۔

روز سے ماری کیس کو از سر نو عدالت کے سامنے لانے میں مدد دینے کے لئے تیار ہو گئی۔ اس سلسلے میں اس کی ڈائری لکھنے کی عادت بہت کارآمد ثابت ہوئی۔ اس نے بارہ برس کی عمر میں ڈائری لکھنی شروع کی تھی اور ساری عمر ہر دن کے اہم واقعات، مشاہدات اور اپنے جذبات کو قلم بند کرتی رہی تھی۔ اس کے پاس ساٹھ سالوں کی ڈائریاں موجود تھیں۔

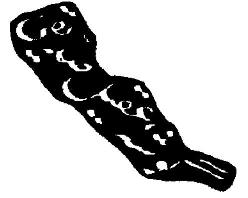
ملزم نے عدالت کے سامنے پہلی بار روز سے ماری کی زبانی سے سنا کہ وہ کیوں اس کی غیر حاضری میں اس کی ماں کے گھر سے چلی گئی تھی۔ اس کا سبب یہ نہ تھا کہ اس کی ماں نے اسے گھر سے نکال دیا تھا بلکہ روز سے ماری خود اس نتیجے پر پہنچی تھی کہ وہ اسے ویسی یک طرفہ محبت نہیں دے سکے گی جو اس کی ماں اسے دینے کو تیار رہتی تھی اور مدت تک چلی آ رہی تھی اور اس امر کا حقیقت سے کوئی بھی تعلق نہ تھا کہ وہ اس وقت حمل سے تھی۔ یہ بات محض اس کے اپنے دماغ کی اختراع تھی۔

روز سے ماری نے عدالت کو بتایا کہ اس کی دوستی ملزم کے ساتھ مدرسے کے دنوں سے چلی آ رہی تھی اور وہ ہر روز بلا ناغہ ایک دوسرے سے ملا کرتے تھے۔ اس سلسلے میں اس کی ڈائری میں ایک ایک روز کی مکمل تفصیل درج تھی۔ چنانچہ جب مختلف واقعوں اور تاریخوں کی پڑتال کی گئی تو ملزم کا اس کے ہمراہ ہونا ثابت ہوا۔ ایک قتل مثلاً ایک ایسے شخص کا تھا جب کہ ملزم روز سے ماری کے ہمراہ اس کے سفر پر گیا ہوا تھا۔ اور یہ بالکل ناممکن تھا کہ وہ بیک وقت اس کے ہمراہ پیرس کے محلے کارٹئیر لاطین کی سیر کر رہا ہو اور شمالی جرمنی میں ایک عورت کو موت کے گھاٹ اتار رہا ہو۔

ملزم کے لئے اب اس کے سوا کوئی چارہ نہ رہا کہ عدالت کے سامنے اپنے خود الزامی اقبالی بیان کی تردید کرے۔ مگر وہ اب بھی اس امر کی وضاحت کرنے کے لئے تیار نہ ہوا کہ اس نے ایسا بیان کیوں دیا تھا جس کے نتیجے میں اس کو اپنی زندگی کا ایک بڑا حصہ جیل میں گزارنا پڑا۔ سوا اس کے کہ ان وارداتوں کی خبروں کی فائلیں بنانا تو یہ کام اس نے ان کیسوں کی تفصیلات جاننے کے لئے کیا تھا تاکہ اس کا خود الزامی بیان زیادہ سے زیادہ ثقہ بن سکے۔

واضح رہے کہ اس مقدمے میں سرکاری وکیل کے فرائض میں نے اپنے ذمے لے رکھے تھے۔ میں نے عدالت کو ماہرِ نفسیات کا بیان یاد دلایا جو اس نے پہلے مقدمے میں ملزم کا عدالت میں مطالعہ کرنے کے بعد دیا تھا۔ اس نے کہا تھا کہ عورتوں کا قتل جس کا ارتکاب ملزم کرتا تھا دراصل اس کی ماں کے قتل کے مترادف تھا۔ میں نے کہا کہ ملزم اور اس کی ماں کے مابین پائی جانے والی محبت اور نفرت کی کیفیت سے یہ نتیجہ نکالا جا سکتا تھا۔ مگر روز سے ماری کی گواہی کی روشنی میں ایک اور نتیجہ نکالنا ضروری ہو گیا تھا۔ اور وہ یہ تھا کہ ہر روز جو ملزم جیل میں گزارتا تھا، اس کی ماں کے قتل کے مترادف تھا۔ ملزم نے اس کی محبت کو ایک کند چھری میں ڈھال دیا تھا جو اس کی ماں کی رگِ جاں پر دن رات چلتی رہی تھی۔ اگر ملزم کو سزا ملنی چاہئے تو اسی جرم کی پاداش میں۔ مگر بدقسمتی سے یہ جرم دنیا کے کسی فوجداری قانون کی کسی دفعہ کے تحت نہیں آتا۔

عدالت نے میری درخواست کو منظور کرتے ہوئے ملزم کو بری کر دیا۔ اس طرح میں نے اپنی پیشہ ورانہ زندگی کا پہلا مقدمہ جو میرا آخری مقدمہ ثابت ہوا کیونکہ مجھے اسی ماہ پنشن مل گئی۔ بالآخر تیس برس کے وقفے کے بعد جیتا۔



علّامہ اِقبال اور سوامی رام تیرتھ

ڈاکٹر ہیرالال چوپڑہ

پہلی جنگ عظیم (۱۹۱۴ء تا ۱۹۱۸ء) کے زمانے میں پنجاب کا ہر شخص جنگ کی بروں کے جاننے کا بہت مُشتاق تھا یہاں تک نہ اس زمانے کی درسگاہوں میں اکثر اوقات صبح کے اجتماع کے بعد اکثر اساتذہ طلباء سے ہا کرتے تھے کہ تم حکومت برطانیہ کی فتح کے لئے رگاہ ایزدی میں دل سے دُعا کرو۔ اور اُسی مانے میں اُردُو اخبارات کے مطالعہ کا بھی شوق یدا ہوا جن سے ان خبروں کے بارے میں واقفیت ماصل ہوتی تھی۔ اخبارات کے مطالعہ کے ساتھ سائل و جرائد کے بھی مُطالعہ کا شوق پیدا ہُوا۔ اور اکثر اُن میں ادبی مضامین و منظومات بھی ہوتے تھے۔ اُس وقت ڈاکٹر شیخ محمد اقبال کی شاعری کا پنجاب میں بہت چرچا تھا۔ ہم سکولوں کے طلباء جب بھی ڈاکٹر اقبال کی کوئی نظم لاہور کے کسی اخبار یا رسالے میں دیکھتے تو اُسے نقل کر کے اپنے پاس محفوظ کرلیتے۔

اُنہی دنوں حکومت پنجاب نے ایک اِنعامی مشاعرے کا اعلان کیا اور رائے بہادر گنج بہاری مقابر اُس مشاعرہ کی منتظمہ کمیٹی کے سربراہ تھے۔ مشاعرہ ۱۹۱۷ء میں لاہور کے برکت علی محمڈن ہال میں ہُوا تھا اور ڈاکٹر اقبال اس کے جج مقرر کئے گئے تھے۔ اس مشاعرہ میں پنجاب کے علاوہ دیگر صوبجات سے بھی شعرا شریک ہوئے تھے اور آخر میں فیصلہ کرتے ہوئے ڈاکٹر اقبال نے اعلان کیا کہ اوّل انعام دہلی کے مُنشی مہاراج بہادر برق کو، دوسرا انعام عبدالمجید ازل تلمیذ داغ کو اور تیسرا انعام کلور کوٹ ضلع میانوالی کے مُنشی تلوک چند محرُوم کو دیا جاتا ہے۔ اس فیصلے سے ہی علاّمہ کی غیر فرقہ واریت عیاں ہوتی ہے کہ اُنھوں نے تین میں سے دو اِنعام ہندو شعرا کو دِلے اور پُورے انصاف سے کام لیا۔

جنگ ختم ہونے کے بعد ۱۹۱۸ء میں ایک مشاعرہ بریڈلا ہال میں زیر صدارت اُس وقت کے لفٹننٹ گورنر سر مائیکل اوڈوائر کے ہُوا جس میں علامہ نے فی البدیہہ فارسی کے چند اشعار پڑھے جن سے مترشح ہوتا ہے کہ علاّمہ اقبال ہندوستان کی رُوحانیت کے بہت قائل تھے اور ہر معاملہ کو رُوحانی نقطۂ نظر سے دیکھتے جو ہندوستان کی رُوحانیت پر بجا طور پر نازاں تھے۔ وہ اشعار" تقسیم ازل" کے نام سے موسُوم تھے اور علاّمہ کے کسی مجمُوعہ میں شامل نہیں کئے گئے۔ مَیں خود چونکہ متذکرہ بالا دونوں مشاعروں میں سامعین میں سے تھا اسلئے مشاعرۂ دوم میں پڑھے گئے اشعار کو ازبر کر لیا تھا۔ وہ فی البدیہہ اشعار تھے ؎

"تقسیمِ ازل"

بیچ می دانی کہ صورت بند ہستی با فرانس
فکرِ رنگین و دلِ گرم و شرابِ ناب داد
مُلک تدبیر و تجارت را بہ انگلستان سپرد
جرمنی را چشمِ حیران و دلِ بیتاب داد
روس را سرمایۂ جمعیتِ ملت ربود
قہرِ او کوہِ گراں را لرزۂ سیماب داد
تا بہ انگیزد نوائے حُرّیت از سازِ دہر
صدرِ جمہوریۂ امریکہ را مضراب داد
ہر کسے در خوردِ فطرت از جنابِ او ببرد
بہرِ ما چیزے نبود و خویش را با ما سپرد

- - - - - - -

یعنی قسامِ ازل نے فرانس کی قسمت میں عیش و عشرت، انگلستان کے لئے ممالک کی حکومت اور تجارت جرمنی کو جنگ ہار جانے سے حیرانی و پریشانی، رُوس کو کئی ممالک کو اپنی حدود میں شامل کرنے اور دبدبہ بٹھانے اور امریکہ کے صدر ولسن کو آزادی کی ستار پر مضراب سے راگ گانے کا کام سپرد کیا۔ جب تمام ممالک اپنی فطرت کے مطابق بارگاہِ ایزدی سے انعامات لے گئے اور آخر میں ہندوستان کے لئے جب اللہ تعالیٰ کے پاس کچھ باقی نہ بچا تو اُس نے اپنے آپ کو ہندوستان کے سپرد کر دیا۔ یعنی دیگر ممالک کو محسوس اشیاء دے کر اللہ نے مطمئن کیا تو ہندوستان کو روحانیت بخشی تاکہ یہاں دین و ایمان کو فروغ حاصل ہو اور الٰہیات کے حصول کے لئے لوگ ہندوستان کی طرف دیکھیں۔

"بانگِ درا" ۱۹۲۴ء کے قریب شائع ہوئی تو اس نے بہت حد تک علامہ کے کلام کے گزشتہ ذخیرے کو مہیا کر دیا۔ لیکن پھر بھی ایسی کئی منظومات تھیں جو رسائل و جرائد میں تو شائع ہوئی تھیں لیکن بانگِ درا میں وہ جگہ نہ پا سکیں۔ یا کئی نظموں کے کچھ اشعار حذف کر دیئے گئے تھے۔

انہی رسائل میں ۱۹۰۷ء کے "مخزن" کے کسی شمارے میں جب میں نے سوامی رام تیرتھ کی وفات پر علامہ کی چھ اشعار پر مشتمل نظم پڑھی تو دل میں خیال آیا کہ دریافت کروں کہ یہ سوامی رام تیرتھ کون تھے، جن کے متعلق ڈاکٹر اقبال نے کیمبرج سے نظم لکھ کر بغرضِ اشاعت ارسال کی تھی۔ میرے والدِ محترم ڈاکٹر دولت رام چوپڑہ اگرچہ ڈاکٹر تھے، ہندوستان اور امریکہ سے طبابت کی کئی ڈگریوں کے حامل تھے اور ہندوستانی فوج میں ڈاکٹری کے پیشے پر متعین تھے اور ریٹائر ہو کر اپنے وطنِ مالوف حافظ آباد ضلع گوجرانوالہ میں پرائیویٹ میڈیکل پریکٹس کرتے تھے۔ وہ اچھے اُردو کے شاعر بھی تھے اور مندرجہ بالا دونوں مشاعروں میں میں اِنہی کے ساتھ شامل ہوا تھا۔ اُن کی نظمیں بھی اکثر اخبارات و جرائد میں شائع ہوتی تھیں اور طبی مضامین انگریزی میں امریکہ کے کئی رسائل میں شائع ہو چکے تھے۔ اُن سے جب میں نے پوچھا کہ یہ سوامی رام تیرتھ کون تھے تو وہ اُٹھے اور اندر سے جا کر ایک پرانی ٹیلیگرام لے آئے جو ہمارے گاؤں کے گوسائیں چندر بھان کے نام تھی اور جس میں لکھا تھا کہ گوسائیں تیرتھ رام وفات پا گئے ہیں۔ یہ تار گوسائیں چندر بھان والدِ محترم کے پاس لائے تھے کہ وہ پڑھ دیں کہ کیا لکھا ہے۔ کیونکہ ۱۹۰۶ء میں ہمارے گاؤں میں انگریزی خواندہ لوگ بہت کم تھے۔ لہٰذا وہ تار کی خبر سُن کر والدِ محترم کے پاس ہی وہ تار چھوڑ گئے تھے۔ والدِ محترم نے فرمایا کہ گوسائیں تیرتھ رام گوجرانوالہ کے نزدیک ایک گاؤں مُرالیوالہ کے رہنے والے تھے۔ اُنھوں نے ایم۔ اے تک تعلیم حاصل کی تھی اور وہ لاہور کے مشن کالج میں ریاضی کے پروفیسر تھے اور بعد میں سادھو بن کر اُنہوں نے جاپان، امریکا، مصر وغیرہ کا چکر لگایا تھا اور ہمارے گاؤں کے گوسائیں اُن کے رشتہ داروں میں سے تھے۔ نیز تیرتھ رام نے گوجرانوالہ کے جس مشن اسکول سے ۱۸۸۸ء میں انٹرنس کا امتحان پاس کیا تھا، والدِ محترم نے اُسی اسکول سے ۱۸۹۷ء میں وہی انٹرنس کا امتحان پاس کیا تھا۔ تیرتھ رام پروفیسر ہوتے ہوئے رُوحانیت کی طرف بہت مائل تھے اور اُردو میں ایک رسالہ "الف" بھی شائع کرتے تھے جس میں سنسکرت، فارسی، اُردو، ہندی اور پنجابی کے ویدانت اور تصوف کے متعلق حوالہ جات سے رُوحانیت، انسانی ہم آہنگی، محبت اور غیر فرقہ واریت کی تبلیغ کی جاتی تھی۔ اُن کے انتقال سے ہندوستان کو بہت نقصان ہوا۔ کیونکہ اُنھوں نے اپنی ۳۳ سالہ مختصر سی زندگی میں جاپان، امریکہ، مصر اور اپنے ملک کے کئی مقامات پر ہندوستانی تہذیب و کلچر اور رُوحانیت پر لیکچر دیئے تھے۔

اسی اثنا میں میرے ایک خالہ زاد بھائی لالہ بجناتھ کپور ہمارے گاؤں حافظ آباد کے ہی رہنے والے، امریکہ میں انجینئرنگ کی تعلیم حاصل کرنے کے لئے گئے اور وہاں سنہ ۱۹۱۱ء سے سنہ ۱۹۱۹ء تک رہے۔ وہاں پر وہ لالہ لاجپت رائے، لالہ ہردیال، شریمتی سروجنی نائیڈو وغیرہ ہندوستان کے سیاسی لیڈروں کی بھی قربت سے فیضیاب ہوتے رہے اور اُن کے خطوط میں اکثر ذکر ہوتا تھا کہ امریکہ کے لوگ سوامی رام تیرتھ کی تقاریر اور اُن کے طرزِ زندگی کو بہت یاد کرتے ہیں۔ واپسی پر وہ ۱۹۲۰ء میں ٹاٹا کمپنی جمشید پور میں انجینئر ہو گئے اور بہار، اڑیسہ کی اُس زمانے کی کونسل کے بھی ممبر نامزد کئے گئے۔ جب لارڈ سنہا وہاں کے گورنر تھے۔ چنانچہ اُنھوں نے واپس لوٹ کر سوامی رام تیرتھ کے امریکہ میں قیام کے دَوران کے کئی واقعات بتائے جو اُنھوں نے امریکنوں سے سُنے

تھے۔ دل میں سوامی رام تیرتھ کی سوانح عمری پڑھنے کا شوق پیدا ہوا تو چار یا پانچ آنے کی اردو میں سوانح عمری خرید کر پڑھی تو دل کو بڑی تسلی بھی ملی اور زندگی میں کسی نصب العین کو پانے کے مصمم ارادے کی تلقین بھی۔

میں نے انٹرمیڈیٹ سائنس کے مضامین کے ساتھ پاس کیا تھا۔ اور میرا ارادہ بھی انجینئر بننے کا تھا۔ لہٰذا میں جمشید پور ٹاٹا کمپنی میں بطور اپرنٹس (apprentice) بھرتی ہو کر کام سیکھنے لگا اور برادرم لالہ بیجناتھ کے گھر میں رہنے کی وجہ سے اکثر سوامی رام کی زندگی کے حالات سن کر محظوظ ہوتا رہا۔ وہاں سے میں نے پٹس برگ یونیورسٹی امریکہ میں انجینئرنگ کے لئے داخلہ بھی لے لیا تھا کہ وہاں جاکر کورس مکمل کرلوں گا۔ لیکن قسمت میں کچھ اور ہی لکھا تھا۔ جمشید پور میں مجھے ٹائیفائیڈ ہوگیا اور کلکتہ سے ڈاکٹر مجھے دیکھنے کے لئے آیا کرتا تھا۔ کیونکہ اُس وقت جمشید پور جنگل میں ایک معمولی گاؤں کی حیثیت رکھتا تھا۔ یہاں تک کہ رات کو کوئی باہر نہیں نکل سکتا تھا کیونکہ اکثر وہاں شیر گھوما کرتے تھے۔ کلکتہ سے پہلی مرتبہ میں ٹاٹا نگر میں گیا تو اسٹیشن ماسٹر نے رات کے وقت مجھ کو ایک کمرے میں بند کردیا تھا اور جمشید پور جانے سے روک دیا تھا کیونکہ اکثر راستے میں شیر ہوا کرتے تھے۔ نیز رات کو کوئی آنے جانے کا وسیلہ بھی نہ تھا میرے والدین کو جب میری بیماری کا علم ہوا تو انھوں نے تقاضا کیا کہ تندرست ہونے کے بعد میں واپس گھر آجاؤں اور امریکہ کا ارادہ ترک کردوں۔ کیونکہ والدِ محترم اپنے علاقہ میں بہت زیادہ عزت و احترام نیز جائداد کے مالک تھے اور ہزاروں روپے ماہوار کی آمدنی تھی۔ اُنھوں نے میرے امریکہ کے ارادے کو منسوخ کردیا اور میں واپس حافظ آباد چلا گیا۔

جمشید پور میں حسنِ اتفاق سے مجھے سوامی وویکانند کے ایک گورو بھائی سوامی ابھیدانند کے کچھ لیکچر سننے کی خوش نصیبی حاصل ہوئی۔ یہ سوامی جی امریکہ میں رہ کر ویدانت کا پرچار کرتے رہے تھے۔ اُن کے لیکچروں سے میں کافی متاثر ہوا تھا اور واپس گاؤں پہنچنے پر میں اکثر گیتا اور اُپنشد پڑھا کرتا تھا۔ کیونکہ بی۔ اے میں داخل ہونے کے لئے ابھی چھ سات ماہ کا وقفہ تھا۔ والدِ محترم نے جب دیکھا کہ میں سنسکرت کی دینی کتابوں میں منہمک رہتا ہوں تو اُنھوں نے مشورہ دیا کہ اگر مذہب کے متعلق اور بالخصوص ویدانت اور تصوّف کے متعلق مجھے مطالعہ کا شوق ہے تو میں رُومی، حافظ، جامی، نظامی اور سعدی کے فارسی اشعار کا مطالعہ کروں۔ اور اُنھوں نے اُن کی کتب جو اُن کے پاس تھیں مجھے مطالعہ کے لئے دیں اور میں اُن میں پوری طرح سے غرق ہوگیا۔ یہاں تک کہ جب بی۔ اے میں داخلے کا وقت آیا تو میں نے اپنے بی۔ اے کے لئے انگریزی کے علاوہ جن دو مضامین کو لینا تھا میں نے دونوں ہی ایسے مضامین لئے جو پہلے کبھی امتحان کے لئے کبھی نہیں پڑھے تھے۔ ایک اکنامکس (اقتصادیات) یہ تو اس زمانے میں شروع ہی بی۔ اے سے ہوتا تھا اور دوسرا مضمون فارسی لے لیا۔ چنانچہ جب کالج میں پہلے ہی سہ ماہی امتحان میں فارسی میں میرے تمام ہم جماعتوں سے زیادہ نمبر آئے تو میرے کچھ ہم جماعتوں نے پروفیسر صاحب سے شکوہ کیا کہ یہ کیسے ہوسکتا ہے کہ ہم شروع سے فارسی پڑھتے چلے آرہے ہیں اور اس شخص نے پہلی مرتبہ بی۔ اے میں فارسی کا مضمون لیا تو یہ کیسے اوّل آسکتا ہے۔ میرے پروفیسر نے میرا پرچہ اُن کے حوالے کردیا کہ جاؤ تم خود اُسے دیکھو کہ یہ اس قابل ہے کہ نہیں۔ دوسرے دن آکر اُنھوں نے پرچہ واپس کرتے ہوئے مجھ سے اور پروفیسر سے معذرت چاہی کہ وہ غلطی پر تھے۔ یہ پرچہ واقعی ان نمبروں کا جائز طور پر مستحق ہے۔ اور یہ سب ہوا اسی لئے کہ اس دوران سوامی رام تیرتھ کی تعلیمات کے زیرِ اثر میں نے نہایت دل لگی سے اپنے مطالعات میں مصروف رہتا تھا اور پوری یکسوئی میسر آچکی تھی۔ یہاں تک کہ بی۔ اے میں دو سال تک میں انگریزی میں آنرز مضمون کی تیاری کرتا رہا اور امتحانی فارم میں بھی میں نے آنرز کے لئے انگریزی ہی لکھا لیکن میرے پرنسپل نے میرے فارسی کے پروفیسر کے کہنے پر انگریزی کاٹ کر آنرز کے لئے فارسی لکھ دیا، کیونکہ پروفیسر کا یہ کہنا تھا کہ اگر یہ طالب علم فارسی آنرز نہیں لے گا تو کسی اور کے کامیاب ہونے کی اُمید نہیں۔ لہٰذا اس مختصر سے عرصے میں میں نے فارسی آنرز کی تیاری کی اور خوب دل لگی سے کام کیا اور کامیاب ہوگیا۔ بی۔ اے میں کامیاب ہونے کے بعد اپنے والدِ محترم کے اصرار کے تحت نہ چاہتے ہوئے بھی لا کالج میں وکالت کے مطالعہ کے لئے داخل ہوگیا۔ لیکن آنرز کا نتیجہ چونکہ بی۔ اے کے نتیجے کے ایک دو ماہ بعد ہی شائع ہوتا تھا اور جب آنرز کا نتیجہ نکلا تو فارسی آنرز میں میں پنجاب بھر میں اوّل آیا اور ہمارے کالج سے کسی اور طالب علم کی کسی بھی مضمون میں سوائے میرے آنرز نہیں آئی تھی، مجھے ساٹھ روپے ماہوار وظیفہ کا بھی اعلان ہوگیا۔ میرا تو شروع سے ارادہ ایم۔ اے فارسی میں داخلہ لینے کا تھا لیکن گھر والوں کے اصرار کے تحت لا کالج میں داخلہ لے لیا تھا۔ اب گھر والوں سے پوچھے بغیر ہی، جبکہ ساٹھ روپے ماہوار وظیفہ کا میں حقدار تھا، اور اس وقت تمام فیس وغیرہ کو شامل کرکے پندرہ بیس روپے ماہوار سے زیادہ خرچ نہیں ہوتا تھا۔ تو میں نے مصمم ارادہ کرلیا کہ میں ایم۔ اے فارسی میں داخلہ لوں گا۔ چنانچہ اس مقصد کو لے کر میں علامہ اقبال کی خدمت میں حاضر ہوا۔ اُنھوں نے میرے عزم کو سراہا اور اتفاق کی بات کہ

یونیورسٹی کے فارسی کے پروفیسر اعلیٰ محمد اقبال بھی وہیں تشریف لے آئے۔ جب اُن سے گزارش کی گئی کہ مجھے ایم۔ اے فارسی میں داخل کر لیا جائے تو آپ نے فرمایا کہ اب تو صرف سات ماہ ہی ایم۔ اے کے امتحان میں رہ گئے ہیں۔ یہ کیسے ہو سکتا ہے۔ جب میں نے وضاحت کی کہ میں دو سال میں ایم۔ اے کرنا چاہتا ہوں کیونکہ وظیفہ تو مجھے دو سالوں تک ملے گا تو اُنھوں نے منظور فرمایا اور گھر والوں کی ناراضگی کے باوجود میں نے لا کالج چھوڑ دیا۔ اور ینٹل کالج میں ایم۔ اے فارسی میں داخلہ لے لیا۔ اس وجہ سے گرمی کی تین ماہ کی تعطیلات میں میں لاہور کالج ہوسٹل ہی میں رہا اور گھر نہیں گیا۔ اور اس دوران گھر والوں کی خفگی بھی کچھ بڑھ گئی اور آخر ایم۔ اے کے امتحان کے بعد ہی گھر گیا جہاں گھر والے اگرچہ خاموش رہ کر اپنی ناپسندیدگی کا اظہار کرتے تھے۔ بالآخر ایم۔ اے کا نتیجہ نکلا تو معلوم ہوا کہ میں ایم۔ اے میں صرف کامیاب ہی نہیں ہوا بلکہ ایم۔ اے فارسی کی تاریخ میں پہلی مرتبہ میں نے فرسٹ ڈویژن حاصل کی ہے اور یونیورسٹی کے تمام ریکارڈوں کو مات کر دیا ہے۔ اور نتیجے کی اطلاع دینے والی تار کے ساتھ ایک دوسری تار مجھے لاہور سناتن دھرم کالج سے موصول ہوئی جہاں سے میں نے بی اے آنرز کیا تھا، کہ مجھے کالج میں فارسی کا پروفیسر تعینات کر دیا گیا ہے اور میں کسی دوسری جگہ کوشش نہیں کروں۔ جب ان حالات کی گھر والوں کو خبر ہوئی تو وہ بھی خوش ہوئے اور مجھ سے یہ کہا کہ واقعی تم ٹھیک راستے پر تھے۔ اور اس تمام کامیابی کا موجب سوامی رام کی کتب کا مطالعہ تھا۔

اس درمیان میں میں اکثر علامہ کی خدمت میں حاضر ہوا کرتا تھا اور ۱۹۲۴ء میں جب "بانگ درا" شائع ہوئی تھی تو میں نے اس کی ایک جلد خریدی اور دیکھا کہ سوامی رام تیرتھ پر لکھی جانے والی نظم کا آخری شعر اس میں نہیں شائع کیا گیا کیونکہ پہلے تو مکمل نظم چھ اشعار پر مشتمل اس طرح تھی ؎

ہم بغل دریا سے ہے اے قطرۂ بے تاب تو
پہلے گوہر تھا بنا اب گوہرِ نایاب تو

آہ کھولا کس ادا سے تو نے رازِ رنگ و بو
میں ابھی تک ہوں اسیرِ امتیازِ رنگ و بو

مٹ کے غوغا زندگی کا شورشِ محشر بنا
یہ شرارہ بجھ کے آتش خانۂ آذر بنا

نفیِ ہستی اک کرشمہ ہے دلِ آگاہ کا
'لا' کے دریا میں نہاں موتی ہے 'الا اللہ' کا

توڑ دیتا ہے بتِ ہستی کو ابراہیمِ عشق
ہوش کی دارو ہے گویا مستیِ تسنیمِ عشق

کیا کہوں زندوں سے میں اُس تشنۂ دستور کی
دار کو سمجھے ہوئے ہیں جو سزا منصور کی

- - - - - - -

'بانگ درا' میں آخری شعر شائع نہیں ہے۔ تو میں نے علامہ کی خدمت میں حاضر ہو کر عرض کی کہ یہ آخری شعر کیوں حذف کر دیا گیا ہے تو فرمانے لگے کہ "شکوہ" "گالیتری" جیسی منظومات لکھنے پر ملّا لوگ مجھ پر کفر کا فتویٰ صادر کر رہے ہیں اور اگر میں ایک غیر مسلم کو "تشنۂ دستور" کہوں، تو وہ مجھے کہاں بخشیں گے۔ اس لئے اس خرافات کو مدِ نظر رکھتے ہوئے میں نے اس شعر کو حذف کر دیا ہے۔ ویسے سوامی رام کی عزت و عظمت میرے دل میں بدستور حسبِ سابق قائم ہے۔

یہ ایک حقیقت ہے کہ سوامی رام نے اپنی مختصر سی زندگی میں اپنی حقیقت کو اچھی طرح سے پہچان لیا تھا اور ان کی نگاہ میں کائنات کا ہر ذرہ خالق کا ہی آئینہ دار رہے اور اقبال اس حقیقت کو جاننے کے لئے عمر بھر کوشاں رہے۔ اسی لئے تو علامہ نے سوامی رام کی وفات پر جو تعزیتی قطعہ لکھا اس میں اس کا اعتراف کیا کہ وہ اس حقیقت کو جاننے کے متمنی ہیں جسے سوامی رام نے پا لیا تبھی تو علامہ فرماتے ہیں ؎

آہ کھولا کس ادا سے تو نے رازِ رنگ و بو
میں ابھی تک ہوں اسیرِ امتیازِ رنگ و بو

اور یہ واضح حقیقت ہے کہ دونوں کے مرنے کے وقت کے ارشادات ان دونوں کی قلبی حالت کو واضح کرتے ہیں۔ سوامی رام تیرتھ نے مرنے سے چند منٹ پہلے جو مضمون لکھا اس میں انھوں نے اپنی حقیقت کو کھلے الفاظ میں واضح کیا کہ "میں کون ہوں"۔ لکھتے ہیں:-

"او موت! بیشک اُڑا دے اس ایک جسم کو میرے اور اجسام ہی مجھے کم نہیں۔ صرف چاند کی کرنیں چاندی کی تاریں پہن کر چین سے کاٹ سکتا ہوں۔ پہاڑی ندی نالوں کے بھیس میں گیت گاتا پھروں گا۔ بحرِ مواج کے لباس میں لہراتا پھروں گا۔ میں ہی بادِ خوش خرام نسیمِ مستانہ گام ہوں۔ میری یہ صورتِ سیلانی ہر وقت روانی میں رہتی ہے۔ اس روپ میں پہاڑوں سے اُترا، مرجھاتے پودوں کو تازہ کیا۔ گلوں کو ہنسایا۔ بلبل کو رلایا۔ دروازوں کو کھٹکھٹایا۔ سوتوں کو جگایا۔ کسی کا آنسو پونچھا کسی کا گھونگھٹ اُڑایا۔ اس کو چھیڑ، اس کو چھیڑ، تجھ کو چھیڑ، وہ گیا۔ وہ گیا۔ نہ کچھ ساتھ رکھا، نہ کسی کے ہاتھ آیا۔ اوم تت ست۔"

اور علامہ اقبال نے مرتے وقت اہل خانہ سے یہ خواہش کی تھی کہ کوئی اُن کے لئے پنجاب کے مشہور شاعر بلھے شاہ کی یہ کافی اُن کو سنا دے "بلھیا کی جاناں میں کون؟" یعنی وہ اس آخری وقت میں بھی یہ جاننا چاہتے تھے کہ "میں کون ہوں" کیونکہ عمر بھر باوجود کوشش کے وہ اپنی خودی کو نہیں جان سکے

اور اسی آرزو کو مرتے وقت ساتھ لے گئے کہ کاش کہ میں جان سکوں کہ میں کون ہوں اور کیا ہوں۔ اسی لئے تو وہ زندگی بھر اسرارِ خودی کو سمجھنے کی کوشش کرتے رہے لیکن نہ سمجھ سکے اور اسی پہ مطمئن تھے کہ اُن کے اندر اپنے آپ کو جاننے کی خواہش تو زندہ ہے جبھی تو انھوں نے حسرت بھری آواز میں فرمایا تھا ؎

سرودِ رفتہ باز آید کہ ناید
نسیمے از حجاز آید کہ ناید
سر آمد روزگارِ ایں فقیرے
دگر دانائے راز آید کہ ناید

یعنی زندگی ختم ہو گئی اور زندگی بھر کی اپنے آپ کو پہچاننے کی تمنا بھی مٹ گئی کیونکہ وہی تو سرمایۂ حیات ہے اگر انسان یہ جان لے کر "مَیں کون ہوں" اور بلھے شاہ کی کافی کی مدد سے وہ اس حسرت کا اعادہ کرنا چاہتے تھے کہ کاش کہ مَیں جان سکتا کہ مَیں کون ہوں۔ یعنی میری زندگی کا اس جسم میں مخلوق ہونے کا مقصد کیا ہے اور کیا مَیں اُس کو جاننے میں کامیاب ہُوا بھی کہ نہیں۔ یہی سرمایۂ حیات ہے۔ سوامی رام نے اس کو جان لیا اور علامہ اس کو جاننے کے لئے عمر بھر کوشاں رہے۔ ۱۹۲۶ء کی بات ہے کہ علامہ اُس زمانے کی پنجاب لیجسلیٹو اسمبلی کی ممبری کے لئے لاہور سے انتخاب لڑ رہے تھے تو مَیں کئی دوستوں کو ہمراہ لیکر اُن کے انتخاب کے جلسوں میں جایا کرتا تھا اور ہم وہاں اُن کی حمایت میں نعرے لگایا کرتے تھے۔ ایک مرتبہ دہلی دروازے کے نزدیک رات کے وقت ایک جلسے میں جا کر مَیں نے اسٹیج سے تقریر شروع کر دی کہ اے مسلمانو! کتنے خوش نصیب ہو تم کہ علامہ جیسی برگزیدہ ہستی نے تم لوگوں کی کونسل میں نمائندگی کرنے کے فرض کو سنبھال لیا ہے۔ اب تم لوگوں کا یہ فرض ہے کہ یا تو اُن کے مدِ مقابل کو دستبردار ہونے کے لئے مجبور کر دو اور اگر وہ اپنی ضد پر قائم رہے تو علامہ کو اتنے زیادہ ووٹ دو کہ اُس کی ضمانت ضبط ہو جائے اگر ہندوؤں میں کوئی ایسی شخصیت مقابلے کے میدان میں ہوتی تو ہم اُسے دستبردار ہونے کے لئے مجبور کر دیتے۔ تم کو اس بات پر فخر کرنا چاہئے کہ علامہ جیسے جیّد عالم، شاعر، فلسفی نے تمہاری نمائندگی کے فریضے کو منظور فرمایا ہے۔

مَیں اسٹیج سے نیچے اُترا تو علامہ نے میری پیٹھ ٹھونکی اور خود اسٹیج پر تشریف لائے اور فرمایا ؎

زاہدِ تنگ نظر نے مجھے کافر جانا
اور کافر یہ سمجھتا ہے مسلمان ہوں مَیں
رند کہتا ہے ولی مجھکو ولی رند مجھے
سن کے ان دونوں کی تقریر کہ حیراں ہوں مَیں
دیکھ اے چشمِ عدو مجھ کو حقارت سے نہ دیکھ
جس پہ خالق کو بھی ہو ناز وہ انساں ہوں مَیں

علامہ فرمانے لگے یہ لڑکا سوامی رام تیرتھ کی تعلیمات کا معتقد ہے اسی لئے یہ میرے حق میں بول رہا تھا کیونکہ سوامی رام نبی نوعِ انسان کے رہنما تھے اور باہمی محبت و ہم آہنگی اور انسانی خدمت کے مُدعی تھے۔

اس کے بعد تو دورانِ ایم۔اے اکثر اوقات علامہ کے قدموں میں بیٹھنے کا شرف حاصل ہُوا۔ اُوپر مَیں نے عرض کیا ہے کہ میری ایم۔اے میں فرسٹ کلاس، پنجاب یونیورسٹی کی پچاس سالہ تاریخ میں فارسی میں پہلی مرتبہ آئی تھی۔ لیکن ابھی جب نتیجے کا اعلان نہیں ہُوا تھا اور بورڈ کی میٹنگ ہوئی اور اُمیدواروں کے نتائج سامنے آئے تو دیکھا گیا کہ فرسٹ کلاس اور پہلی مرتبہ ایک غیر مسلم کو یہ اعزاز حاصل ہو رہا ہے۔ کیونکہ اُس زمانے میں ایم۔اے کے پرچوں پہ یونیورسٹی خفیہ رول نمبر درج کرتی تھی اور امیدوار کو یہ معلوم نہیں ہوتا تھا کہ اُس کا رول نمبر کیا ہے اور کسی ممتحن کے پاس سفارش کے لئے بھی نہیں جا سکتا تھا۔ اور نہ ہی ممتحن کو یہ علم تھا کہ وہ جو پرچہ دیکھ رہا ہے وہ کس کا ہے کیونکہ اس پہ دُوسرا خفیہ نقل نمبر درج ہے۔ بعد میں بورڈ میں جب اصلی رول نمبروں کے ساتھ رزلٹ سامنے آیا تو دو ایک مسلمان پروفیسروں نے اعتراض کیا کہ ایک غیر مسلم کو یہ اعزاز نہیں ملنا چاہیئے۔ علامہ چونکہ بورڈ کے صدر تھے انھوں نے کہا کہ میرا ایک ہی سوال ہے۔ ممتحن آپ ہیں۔ پرچے آپ نے دیکھے ہیں۔ مجھے یہ بتائیں کہ یہ نمبر آپ نے انصاف سے دیئے ہیں یا نہیں۔ انہوں نے کہا کہ ہم کو مطلقاً یہ معلوم نہ تھا کہ پرچہ کس کا ہے۔ ہم نے پرچوں میں لکھے جوابات کو نظر میں رکھتے ہوئے جتنے نمبروں کے وہ مستحق تھے دیئے ہیں۔ تو علامہ فرمانے لگے کہ اگر ایسی صورت میں ایک بھی نمبر کم و بیش کیا گیا تو وہ صدارت سے مستعفی ہو کر اس واقعہ کو اخبارات میں دے دیں گے۔ یہ وہی سال تھا جب علامہ آل انڈیا مسلم لیگ کے لکھنؤ میں صدر ہوئے تھے اور آپ نے وہ مقالہ پڑھا تھا جسے پاکستان کی بُنیاد کہا جاتا ہے۔ اور اس واقعہ سے اُن کی غیر فرقہ واریت بالکل واضح ہے۔ اس واقعہ کی مجھے بھی کہاں خبر ہوئی تھی۔ دُوسرے سال بطور ڈگری لیکچرار منتخب ہونے کے بعد مَیں نے اسی بورڈ کی ممبری کے لئے ایک بہت اہم پروفیسر (جن کا نام لینا واجب نہیں) کو شکست دی اور ممبر ہو گیا۔ پہلی ہی میٹنگ میں شامل ہونے کے لئے گیا تو علامہ فرمانے لگے "تُو خوردار بدلہ چکا لیا؟" مَیں حیران کہ یہ کیا معاملہ ہے۔ لہٰذا میرے دریافت کرنے پر آپ نے سارا واقعہ بیان فرمایا اور مجھے معلوم ہُوا کہ یہی پروفیسر تھے جو میری فرسٹ کلاس کو رد کرنے کے خواہاں تھے۔ لیکن یہ علامہ کی انصاف پسندی اور غیر فرقہ واریت تھی کہ میری فرسٹ کلاس برقرار رہی۔

یہ حقیقت بھی سب پر واضح ہے کہ سوامی رام تیرتھ ۱۸۹۵ء میں ایم۔اے پاس کرنے کے بعد سیالکوٹ کے کسی مشن ادارۂ تعلیم میں سیکنڈ ماسٹر مقرر ہو کر گئے

تھے جہاں سے اُسی سال علامہ نے ایف۔ اے پاس کیا تھا اور وہ لاہور گورنمنٹ کالج میں بی اے میں جا کر داخل ہوئے تھے۔ اسی دوران گرمی کی اور دیگر تعطیلات میں جب علامہ اپنے وطن سیالکوٹ تشریف لاتے تو لوگوں سے سُنتے کہ مِشن اسکول کے سیکنڈ ماسٹر تیرتھ رام اپنے لیکچروں سے جو وہ اکثر وہاں کی ہندو مسلم مجالس کے زیرِ اہتمام دیتے تھے، عوام کو بالکل مبہوت کر دیتے تھے۔ اور اُردُو، فارسی، پنجابی، ہندی، سنسکرت کے حوالہ جات سے ایسا جادُو کرتے تھے جو لاجواب ہوتا تھا۔ علامہ بھی گاہے گاہے اُن لیکچروں سے مُستفیض ہوتے تھے۔ کچھ مہینوں بعد ماسٹر تیرتھ رام لاہور مشن کالج میں پروفیسر ہو گئے۔ وہاں اکثر علامہ اُن کے خیالات سے محظوظ ہوتے تھے نیز اُن کے جاری کردہ اُردو رسالے "الف" کو بھی پڑھ کر مُتاثر ہوتے تھے۔

۱۸۹۹ء میں تیرتھ رام نے پروفیسری سے استعفا دے دیا اور سادھو بن کر سوامی رام تیرتھ ہو گئے اور علامہ اقبال اسی سال ایم۔ اے پاس کر کے گورنمنٹ کالج لاہور میں فلسفہ کے پروفیسر مقرر ہو گئے اور دونوں ایک دوسرے کی صحبتوں سے اکثر فیضیاب ہوتے رہے۔

حُسنِ اتفاق سے لاہور میں ۱۹۳۲ء میں اپنے ایک طالب علم سے مجھے مثنوی مولانا روم کی وہ جلد میسر آ گئی جو سوامی رام تیرتھ نے اپنے مطالعہ کے لئے خرید کر جلد کرائی تھی اس پر سوامی رام نے اپنا نام "رام بادشاہ" لکھا ہوا تھا اور ساتھ ہی دوسرا نام علامہ اقبال کا تھا جو انہوں نے شیخ محمد اقبال لکھا ہوا تھا اور سن ۱۸۹۹ء درج تھا۔ یعنی سوامی رام اور علامہ اقبال نے مل کر مثنوی مولانا روم کا ۱۸۹۹ء میں مطالعہ کیا تھا۔ اس پر دونوں کے ہاتھوں کے جابجا نوٹ بھی درج تھے۔ اس کا مطلب ہے کہ دونوں، رُوحانیت کے سفر میں ایک دوسرے کے ساتھی تھے۔ جب میں نے وہ کتاب علامہ کو دکھائی تو انہوں نے تصدیق فرمائی کہ دونوں نے مل کر اسی جلد سے مثنوی کا مُطالعہ کیا تھا۔ بدقسمتی سے تقسیم مُلک کے وقت باقی سامان کے ساتھ وہ کتاب ملتان ہی میں لوٹ کا نشانہ بن گئی۔

اگست ۱۹۰۲ء سے دسمبر ۱۹۰۴ء تک سوامی رام تیرتھ جاپان، امریکہ، مصر وغیرہ ممالک کے دورے پر تھے اور ہندوستان کی آزادی، رُوحانیت اور ثقافت کے مُتعلق وہاں لیکچر دیتے رہے۔ اسی دوران علامہ لاہور گورنمنٹ کالج میں پروفیسر تھے اور مشہور انقلابی لالہ ہردیال اسی کالج میں ایم۔ اے کے طالب علم تھے۔ علامہ نے دیکھا کہ لاہور کی ینگ مین کرسچین ایسوسی ایشن (Y.M.C.A) ظاہرا عوام کی مدد کی آڑ میں لوگوں کو عیسائی بنا رہی ہے جن میں ہندو، مسلمان، سکھ سب شامل تھے تو علامہ کی صدارت میں ایک "ینگ مین انڈین ایسوسی ایشن" ۱۹۰۳ء میں قائم کی گئی اور لوگوں کو عیسائیت سے بچانے کا کام کرنے لگی۔ اس میں جوگندر سنگھ، شیخ عبدُالقادر، ذوالفقار علی خان قزلباش شامل ہو گئے جو بعد میں سب بشمول علامہ "سر" ہو گئے۔ اور لالہ ہردیال اُس کے سیکریٹری مُقرر ہوئے جو بعد میں عظیم انقلابی ہوئے۔ فروری ۱۹۰۴ء میں اس کا پہلا سالانہ جلسہ ہونے والا تھا تو اس میں ایک خاص مقالہ پیش کرنے کے لئے علامہ نے سوامی رام کو امریکہ میں خط لکھا کہ وہ کوئی اپنا مقالہ یا لیکچر ارسال فرمائیں۔ اور سوامی جی نے اپنا لیکچر "ہندوستان کے مسائل"

Problems of India

ارسال کیا جو اُس سالانہ جلسے میں پڑھے جانے کے لئے تھا۔ لالہ ہردیال نے صدرِ انجمن علامہ سے بھی تقاضہ کیا کہ وہ بھی کوئی اپنا مقالہ لکھیں جو اُس دن خطبۂ صدارت کے طور پر پڑھا جا سکے۔ لہٰذا علامہ نے عین اُسی دِن اپنی ایک مختصر سی نظم لکھی اور اُس جلسے میں پڑھی۔ یہ وہی نظم ہے جو "ہندوستان ہمارا" کے نام سے معرُوف ہے اور ہندوستان کا نغمۂ آزادی اور قومی گیت تصوّر کیا جاتا ہے۔ اس کے مُتعلق خود علامہ نے اور سر عبدُالقادر نے بندہ کو بتایا تھا کہ وہ ہند کا قومی ترانہ سوامی رام تیرتھ کے لیکچر کو ہی ملحُوظِ خاطر رکھتے ہوئے معرضِ وجود میں آیا تھا۔ اور جب سوامی رام تیرتھ کی وفات ۱۷ر اکتوبر ۱۹۰۶ء کو گنگا میں ہوئی تو علامہ انگلستان میں تشریف رکھتے تھے اور وہیں سے سوامی رام کے متعلق تعزیتی نظم لکھ کر "مخزن" لاہور کو بغرضِ اشاعت ارسال کی تھی جو مقبُولِ عام ہوئی۔ ۱۹۳۰ء میں مَیں نے لاہور میں سوامی رام تیرتھ اسٹڈی سرکل جاری کیا تھا۔ اس پر اکثر علامہ نے تعریفی کلمات ارشاد فرمائے تھے۔ لیکن چونکہ اُس میں اُن کے فرزندِ اکبر آفتاب اقبال جن کی والدہ سے اُن کے تعلقات کچھ کشیدہ تھے، وہ آیا کرتے تھے جن کو سوامی رام تیرتھ کے بڑے لڑکے مدن موہن جن سے اُن کی شناسائی تھی، وہ لایا کرتے تھے تو علامہ خود اسٹڈی سرکل میں تشریف نہیں لائے، اور دُوسرے اُن کی اپنی صحت بھی اجازت نہیں دیتی تھی۔ لیکن وہ ہمیشہ اسٹڈی سرکل کی تعریف کرتے رہے۔

نومبر ۱۹۳۲ء میں مَیں اور سوامی رام تیرتھ کے بڑے لڑکے مدن موہن علامہ کی خدمت میں حاضر ہوئے تھے۔ کیونکہ میری شادی ۱۱ر دسمبر ۱۹۳۲ء کو گجرات کے ایک اعلیٰ کھتہ خاندان میں ہونا قرار پائی تھی تو اس کا دعوت نامہ لے کر حاضر ہوئے تھے۔ علامہ نے کارڈ کو مُلاحظہ فرمایا اور اُس پر پڑھا کہ شادی گجرات میں ہونے والی ہے تو فرمایا کہ میں دل سے دُعا کرتا ہوں کہ یہ شادی کامیاب ہو۔

اگرچہ یہ گجرات میں ہے میں نے دریافت کرنے پر کہ گجرات میں کیا عیب ہے کیونکہ میرے ساتھی مدن موہن بھی تو گجرات میں ہی پیدا ہوئے ہیں۔ اس میں کیا برائی ہے۔ انہوں نے صرف نیک دعائیں دیں اور اپنی بیماری کی وجہ سے معذرت چاہی۔ بعد میں معلوم ہوا کہ چونکہ علامہ کی اپنی پہلی شادی گجرات میں ہوئی تھی اور اس بیوی سے اُن کے تعلقات اچھے نہیں تھے۔ اور اُنھیں کے بطن سے آفتاب اقبال پیدا ہوئے تھے۔ اسی لئے علامہ نے مجھے صرف اپنی نیک دعاؤں سے ہی نوازا۔ اور خدا کے فضل سے اُن کی دعائیں کارگر اور بااثر ثابت ہوئیں اور میری بیوی کے میرے ساتھ ۵۳ سال نہایت پیار محبت ہم آہنگی، امن اور قرار کے ساتھ گزرے اور کبھی ایک پل کے لئے بھی کسی تفرقہ یا خانگی بدامنی سے دوچار نہیں ہونا پڑا۔ یہ سب علامہ کی نیک دعاؤں کا ہی اثر تھا۔

یہ ایک واضح حقیقت ہے کہ علامہ کو جو تصوف کا شوق و شغف پیدا ہوا وہ صرف سوامی رام تیرتھ کی قربت کی وجہ سے ہی تھا۔ چنانچہ علامہ نے کیمبرج سے پی۔ ایچ۔ ڈی (PhD) کی ڈگری کا موضوع جو کہ Development of Metaphysics in Persia تھا۔ اسی اثر کے تحت منتخب کیا تھا اور وہ بنی نوعِ انسان کی بہتری، بہبودی اور خدمت کے لئے کوشاں رہے۔ "بانگِ درا" سے قبل علامہ کی فارسی کی دو مثنویاں 'اسرارِ خودی' اور 'رموزِ بیخودی' اور تیسری کتاب 'پیامِ مشرق'، یہ تینوں تصوف اور ویدانت کے مسائل پر مبنی تھیں اور شائع ہو چکی تھیں۔ چونکہ تصوف کا اہم ترین مسئلہ خودشناسی ہے اور سوامی رام تیرتھ کے ارشادات میں بھی جا بجا اسی مسئلے کے حل کی جستجو ہے تو علامہ نے سوامی رام کے ادھورے کام کو پایۂ تکمیل تک پہنچایا اور وہ مثنویاں لکھیں جن کے عنصر ممالک میں بھی چھپ چکے ہیں۔ ان میں جو پیغام دیا گیا ہے وہ زیادہ تر ہندوستان کی روحانیت پر مبنی ہے۔ ہندوستان سے علامہ کو بے حد لگاؤ تھا اور یہاں کی تاریخ، دین و ایمان، فلسفہ اور ثقافت کے وہ سرتاپا گرویدہ تھے تبھی تو رام، نانک، گایتری، ہمالہ، گوتم بدھ اور سوامی رام تیرتھ وغیرہ کو اپنی تخلیقات میں جگہ دیتے رہے اور اس کے ہمہ گیر فلسفے کا نعرہ بلند کرتے رہے۔ اب چونکہ اس کا بیج اُن کے خیالات میں بونے والے سوامی رام تیرتھ تھے۔ پروردگار سے یہی دعا ہے کہ وہ ان دونوں بزرگوں کی تعلیمات کو فروغ بخشے اور بنی نوعِ انسان کو باہمی محبت اور ہم آہنگی کی طرف مائل کرتے ہوئے یہ ماننے پر مجبور کرے کہ "اَلخلقُ عیالُ اللہ" اور "وسودھیو کٹمبکم" سب ایک ہی ہیں ؎

بنی آدم اعضائے یک دیگر اند
کہ از آفرینش ز یک جوہر اند
چو عضوے بدرد آورد روزگار
دگر عضوہا را نماند قرار
تو کز محنتِ دیگراں بے غمی
نشاید کہ نامت نہند آدمی

اقبال میں بھی رام ہیں اور رام دُنیا کے ذرّے ذرّے میں سمائے ہوئے ہیں۔ کاش کہ ہم اس حقیقت کو دیکھتے ہوئے سیدھے راستے پر چلنے کا عزم کریں اور کامیاب ہوں۔ یہ خوش قسمتی ہے کہ انبالہ کے ادارہ شام بہار ٹرسٹ نے جناب راجیندر ملہوترہ کی نیک اور پاک قیادت میں یہ سمینار "علامہ اقبال اور سوامی رام تیرتھ" کے موضوع پر منعقد کر کے بروقت یہ واضح کر دیا ہے کہ ابھی موجودہ حالات خواہ کتنے ہی خراب کیوں نہ ہوں، اُن کا کامیابی سے مقابلہ کرنے کے لئے ایسے افراد کی کمی نہیں جو بنی نوعِ انسان میں صحیح ہم آہنگی پیدا کرنے کے لئے قرآن کے ارشاد "لا نفرق بین" اور رگ وید کے "لوکا سمستا سکھینو بھونتو" اور گرنتھ صاحب کے "نانک نام چڑھدی کلا تیرے بھانے سربت دا بھلا" کے قائل ہیں اور ہر طرح سے محبت اور باہمی رواداری اور ہم آہنگی کو فروغ دینے کے لئے کمربستہ ہیں اور کسی قسم کی مغائرت خواہ وہ دین، ملک، زبان، نسل یا کسی بھی بنا پر ہو، نہیں چاہتے تاکہ انسان کو انسان اور اللہ تعالیٰ کی آفرینش کا بہترین نمونہ سمجھتے ہوئے اُسے تنگ دائروں سے اوپر اُٹھایا جا سکے۔ اور سب کو یکساں سمجھا جائے۔ آج جب ہم مہذب دُنیا پر نظر ڈالتے ہیں تو دیکھتے ہیں کہ "خودی" کو سامنے رکھتے ہوئے انسان کس طرح دین و دُنیا، ایمان اور انسانیت کے اُصولوں کو فراموش کر کے خود غرضیوں کی پیاس بجھانے کے لئے اپنے بھائی باپ وغیرہ کو بھی قتل کرنے سے گریز نہیں کرتا تو اس وقت یہ محسوس ہوتا ہے کہ سوامی رام تیرتھ اور علامہ اقبال کی زندگیوں اور اُن کی تعلیمات کی تبلیغ و اشاعت کی کس قدر اہم ضرورت ہے کیونکہ علامہ اقبال نے سوامی رام کے سلسلے میں ہی تو کہا تھا ؎

نفیِ ہستی اک کرشمہ ہے دلِ آگاہ کا
'لا' کے دریا میں نہاں موتی ہے اِلّا اللہ کا

خوشی کی بات ہے کہ شام بہار ٹرسٹ انبالہ نے اس اہم اور موزوں موقع کو دیکھتے ہوئے اس سیمینار کا اہتمام کیا ہے تاکہ گم کردہ راہ دُنیا کو معلوم ہو کہ آج کے اس لاعلاج سمجھے جانے والے مرض کا علاج اِن دونوں بزرگوں کی تعلیمات کو عمل میں لانے سے ممکن ہے۔ اور انسان کو اس طرف مائل ہونا چاہئے تاکہ دُنیا میں امن، فرقہ وارانہ ہم آہنگی، ہمہ گیر محبت، یکسانیت اور خدمتِ نوعِ بشر کا جذبہ قائم ہو سکے۔ ٹرسٹ کو مبارکباد عرض کرتے ہوئے آپ سب حاضرین کا بھی شکریہ ہے کہ آپ نے اس نیک کام کو سرانجام دینے میں مدد کی۔

آج کے زمانے میں ایسے اداروں کی اور بالخصوص ایسے فعال اداروں کی افادیت اور اہمیت بہت زیادہ ہے اور اس کی جتنی بھی سرپرستی کی جائے مناسب ہے۔ خدا اس نیک ادارے کو اپنے نیک ارادوں میں کامیابی عطا کرے اور اسے ہمیشہ ترقی کی منزلوں کی طرف لے جائے۔ آمین!

ذرہ ذرہ بوئے الفت سے ختن بن جائیگا
بن کے جب نکلیں گے پھولوں کا چمن بن جائے گا
گھر نکھر جائے گا شکلیں سیاہی ہو جائیں گی
خشک کلیاں چاند کلیوں سے بھری ہو جائیں گی

(یہ مقالہ ۱۱ مارچ ۱۹۹۰ء کو انبالہ چھاؤنی میں پڑھا گیا)

موذی

خالدہ شاہ

ایک بات میں پہلے ہی کہہ دینا چاہتا ہوں کہ میں ایک سپاہی ہوں — سزا فرساں درجہ دوم... شعبۂ قتل... بچپن میں میرا خیال تھا کہ شعبۂ قتل والوں کا کام قتل کرنا ہوتا ہے اور میں کافی عرصہ تک یہی سمجھتا رہا۔ شاید اسی لئے میں اس شعبہ میں آگیا ہوں۔ یہ کہنا ذرا مشکل ہے کہ خود آیا ہوں یا لایا گیا ہوں۔

بعض لوگ کہتے ہیں کہ اس کام میں بڑا بکھیڑا اور [illegible] ہوتا ہے۔ اگر آپ کا بھی یہی خیال ہے [illegible]

انسانوں کی طرح ہوتا ہے۔ اس کے بھی ویسے ہی جذبات ہوتے ہیں جیسے عام آدمیوں کے۔ وہ محبت بھی کرتا ہے اور نفرت بھی۔ اسے غصہ بھی آتا ہے اور وہ خوف بھی کھاتا ہے۔ الغرض اس میں تمام بشری کمزوریاں پائی جاتی ہیں۔ یہ تمہید میں نے اس لئے باندھی ہے کہ آپ کو میری بات سمجھنے میں کوئی دقت پیش نہ آسکے۔

گزشتہ سال جب میری بیوی چند ماہ جینے کی رفاقت کے بعد مجھے چھوڑ کر عدم کو سدھار گئی تو مجھے یہ زندگی زہر معلوم ہونے لگی میرا جی چاہا کہ [illegible] کسی ٹرین کے سامنے [illegible] اپنی پیاری بیوی کا سوگ مناتا رہا۔ میں نے اپنی [illegible] کام کی پرواہ کرنا چھوڑ دی۔ [illegible]

خارج [illegible] ہوتی ہو۔ لیکن [illegible] مرہم ہے۔ [illegible] کام بھول گیا [illegible] کے ساتھ [illegible] مجھے ایک نئی محبت [illegible] وہ میری [illegible]

اُسے اپنا نام بتا چکا تھا اور وہ مجھے اپنا نام بتا چکی تھی۔

ہماری پہلی ملاقات ہوٹل میں ہوئی تھی۔

میں اپنی ڈیوٹی ختم کرنے کے بعد ایک کپ کافی پینے کے لئے وہاں گیا تھا۔ اس وقت گلوریا اسٹیج پر اپنے فن کا مظاہرہ کر رہی تھی۔ وہ خوبصورت نہیں تھی۔ اُس کی آنکھیں سبز تھیں اور غور سے دیکھنے پر پتہ چلتا تھا کہ دونوں آنکھوں کے زاویے کچھ نہیں تھے۔ اُس کے جبڑے کی ہڈیاں نمایاں طور پر اُبھری ہوئی تھیں لیکن مجموعی طور پر وہ خاصی پُرکشش لگتی تھی۔

میں نے جب پہلی بار اُس کی طرف دیکھا تو میرے دل میں اُس کے لئے عجیب سی کشش پیدا ہوئی۔ اس کی وجہ اس کے چہرے کا ایک خاص تأثر تھا۔ جس نے مجھے اپنی طرف متوجہ کر لیا تھا۔ گانا ختم کرنے کے بعد وہ میرے قریب رکھے ہوئے اسٹول پر آ کر بیٹھ گئی۔ تب ہی میرے دل میں اُس سے بات کرنے کی خواہش پیدا ہوئی۔

میں نے ہلکی سی مسکراہٹ کے ساتھ کہا۔ "میرا خیال ہے کہ اس طرح تم زیادہ دور نہیں جا سکو گی۔"

اُس کی سبز آنکھوں میں اُلجھن اُبھر آئی۔ بولی "میں تمہارا مطلب نہیں سمجھی۔"

"تمہارے گانے کا انداز پُرانا ہے۔" میں نے کہا۔ "آج کل پاپ میوزک زیادہ پسند کی جا رہی ہے۔"

"میں گانے کو اپنا کیریئر نہیں بنانا چاہتی۔ اور دُوسری بات یہ ہے کہ مجھے کرمنگانا اور مٹکنا پسند نہیں ہے۔ بڑی عامیانہ سی حرکت لگتی ہے۔"

"جہاں تک میرا تعلق ہے" میں نے کہا۔ "مجھے تمہارا انداز بہت پسند آیا ہے۔"

اُس کے ہونٹوں پر مسکراہٹ نمودار ہو گئی۔ "حوصلہ افزائی کا شکریہ!"

اُس کے بالوں کی خوشبو مجھ پر جادُو کر گئی۔ میں نے کہا۔ "مجھے واقعی تمہارا اسٹائل پسند آیا ہے۔"

اس نے ایک بار پھر میرا شکریہ ادا کیا اور کافی پینے کے بعد اُٹھ گئی۔

وہ مسافرانہ قسم کی بات چیت تھی ہم دونوں میں سے کسی نے بھی ایک دوسرے کا تعارف حاصل کرنے کی کوشش نہیں کی تھی۔ لیکن گلوریا کے جانے کے بعد میں نے محسوس کیا کہ میری نبض کی رفتار قدرے تیز ہو گئی ہے۔ یہ اس بات کی یقینی علامت تھی کہ میں دوبارہ وہاں جاؤں گا۔

اگلی شام میں دوبارہ وہاں موجود تھا۔ لیکن گلوریا کے چہرے پر پہچان کے کوئی آثار نمودار نہیں ہوئے۔ وہ گانا ختم کرنے کے بعد فوراً رخصت ہو گئی۔ البتہ تیسری شام وہ کافی پینے کے لئے کاؤنٹر پر آ کر بیٹھ گئی میرا خیال تھا کہ وہ مجھے بھول چکی ہو گی۔ لیکن جب اُس نے مسکرا کر میری طرف دیکھا تو مجھے خاصی حیرت ہوئی اور خوشی بھی۔

"معلوم ہوتا ہے کہ تمہیں میرا اسٹائل واقعی پسند آیا ہے۔" اُس نے کہا۔

"اس کا مطلب ہے کہ پرسوں تمہیں میری بات پر یقین نہیں آیا تھا؟" میں نے کہا۔

فنکار کو اتنی جلدی تعریف پر یقین نہیں کرنا چاہئے۔ اُس نے کہا "عموماً لوگ عادتاً تعریف کر دیتے ہیں۔ کیونکہ اس کے سوا وہ کچھ بھی نہیں کہہ سکتے۔ اس لئے میں تعریف سے زیادہ متأثر نہیں ہوتی۔ میرا مطلب ہے کہ غلط فہمی کا شکار نہیں ہوتی۔"

"خوب! انسان کو حقیقت پسند ہونا چاہئے۔ بہرحال تمہاری آواز نے مجھے واقعی متأثر کیا ہے۔ تب میں نے سوچا کہ اب تعارف کرانا ضروری ہو گیا ہے۔ مجھے جم گوملر کہتے ہیں!"

اُس نے فوراً میری طرف ہاتھ بڑھایا بولی "بہت خوشی ہوئی کہ تم نے مجھے تعارف کے قابل سمجھا۔" اُس کی گرفت میں مضبوطی اور گرمجوشی پائی جاتی تھی "میں گلوریا بروڈ ہوں۔"

"ویسے میں جم کہلوانا زیادہ پسند کروں گا۔" میں نے کہا۔

اُس نے تعریفی نظروں سے میری طرف دیکھا اور بولی "اور میں صرف گلوریا۔"

اور یوں ہم دوست بن گئے۔ چھٹی کے بعد میں گلوریا کو ساتھ لیتا اور ہم آخری شو دیکھنے چلے جاتے۔ یا کار میں لمبی ڈرائیو پر نکل جاتے۔ یا کسی اچھے سے ہوٹل میں کھانا کھاتے اور خوب باتیں کرتے۔ وہ نہ بہت زیادہ باتیں کرتی تھی اور نہ بہت کم۔

بالآخر مجھے یقین ہو گیا کہ گلوریا میری زندگی کی بہترین ساتھی ثابت ہو گی۔ میں اسے واقعی چاہنے لگا تھا۔ میں نے محسوس کیا کہ وہ بھی میرے بارے میں ویسے ہی جذبات رکھتی ہے۔ میں نے یہ بھی محسوس کیا کہ وہ ایک دُکھی عورت ہے۔ بعض اوقات وہ اچانک ہی بے چین ہو جاتی تھی جیسے کوئی بہت ہی تلخ یاد اُس کے شعور میں اُبھر آئی ہو۔

ایک شام میں نے اُسے اپنے بارے میں کھل کر سب کچھ بتا دیا۔ اپنی شادی کے بارے میں اور سوسن کی خودکشی کے بارے میں بھی۔ اس کے علاوہ وہ تمام باتیں بھی بتا دیں جن کی وجہ سے وہ خودکشی پر مجبور ہو گئی تھی۔

گلوریا نے اپنے ہونٹ بھینچ لئے اور اس کے چہرے کی رنگت عجیب سی ہو گئی۔

"اوہ میرے خدا!" بالآخر اُس نے کہا "کتنی افسوسناک کہانی ہے۔"

"میں سوسن سے بہت زیادہ محبت کرتا تھا۔" میں نے کہا "میرا خیال تھا کہ میں کسی دُوسری عورت سے اتنی محبت نہیں کر سکوں گا۔ میرا خیال غلط نکلا۔ تمہاری محبت نے میرے دل میں ایک بار پھر زندہ رہنے کی اُمنگ پیدا کر دی ہے۔ مجھے تمہاری ضرورت ہے گلوریا! میں تم سے شادی کرنا چاہتا ہوں۔"

اس نے دُوسری طرف منہ کر لیا اور ہونٹ کاٹنے لگی۔

"پلیز جم! مجھ سے یہ سوال نہیں کرو۔ میں تمہاری یہ خواہش پُوری نہیں کر سکتی۔"

"لیکن میں تم سے محبت کرتا ہوں۔"

اُس کی آنکھیں نمناک ہو گئیں "م.... میں جانتی ہوں جم! لیکن پلیز..... کیا ہم اسی طرح، دوستوں کی طرح ایک دوسرے کا ساتھ نہیں دے سکتے؟"

"تمہارا مطلب ہے کہ تمہارے دل میں میرے لئے اس سے زیادہ چاہت نہیں ہے۔"

اُس نے کپکپاتی آواز میں کہا "تم اچھی طرح جانتے ہو کہ میں تمہیں دل و جان سے چاہتی ہوں۔"

"گلوریا" میں نے کہا، تم مجھ سے کچھ چھپا رہی ہو۔"

"جم! میں تھک چکی ہوں۔ پلیز میرے ساتھ اچھی اچھی باتیں کرو۔"

میں نے اُس کا ہاتھ تھام لیا اور ٹٹولتی ہوئی نظروں سے اس کے چہرے کا جائزہ لیا۔ اُس کی اُنگلیاں برف کی مانند ٹھنڈی تھیں۔

"گلوریا! کیا بات ہے؟"

وہ کچھ دیر ذہنی کشمکش سے اپنے ہونٹوں پہ مسکراہٹ لاکر بولی۔ "جم! مجھے گھر چھوڑ آؤ۔ میں..... آرام کرنا چاہتی ہوں۔"

میں نے اپنی بات پر زیادہ زور نہیں دیا کیونکہ وہ اچانک ہی پریشان نظر آنے لگی تھی۔ اُس کی سانسوں کی آمد و رفت سے ظاہر ہوتا تھا کہ اُسے اپنے جوش پر قابو پانے میں بڑی دقت پیش آ رہی ہے۔ میں نے اِس موضوع کو آئندہ کے لئے اُٹھا رکھا اور اُسے گھر چھوڑ آیا۔

لیکن اس کے بعد میں نے جب بھی اس موضوع کو چھیڑنے کی کوشش کی، وہ پریشان ہو گئی۔ اُس نے واضح الفاظ میں کہہ دیا کہ وہ میری خاطر جان کی بازی بھی لگا سکتی ہے، لیکن شادی نہیں کر سکتی۔

جب کسی چیز پر پردہ ڈال کر اُسے انسان کے سامنے رکھ دیا جائے تو وہ اس کی حقیقت جاننے کے لئے بے چین ہو جاتا ہے۔ میری بھی کچھ ایسی ہی حالت تھی۔ میں گلوریا کو تکلیف بھی نہیں پہنچانا چاہتا تھا اور حقیقت بھی جاننا چاہتا تھا۔

ایک روز کیپٹن کین نے مجھے اوور ٹائم کے لئے روک لیا کیونکہ رات کی ڈیوٹی والا آفیسر اچانک غیر حاضر ہو گیا تھا۔ میں رُک گیا ویسے بھی اس روز گلوریا سے ملاقات کا پروگرام نہیں تھا۔ کیپٹن کین نیا آیا تھا اور بہت با اصول آدمی تھا۔ اس لئے میں اُسے بلاوجہ ناراض نہیں کرنا چاہتا تھا۔

کچھ دیر بعد گلوریا کا فون آ گیا۔ اُس کی آواز میں گھبراہٹ پائی جاتی تھی۔ اُس نے بغیر تمہید کے کہا "جم! جلدی سے یہاں آ جاؤ۔ میرے اپارٹمنٹ میں۔ بہت ضروری کام ہے۔"

"لیکن میں تو اس وقت ڈیوٹی پر ہوں!"

میں نے کہا۔ "بات کیا ہے؟"

"میں فون پر کچھ نہیں بتا سکتی۔" خوف کی وجہ سے آواز کپکپا رہی تھی۔ "جلدی سے آ جاؤ، جلدی۔"

اس کے ساتھ ہی رابطہ منقطع ہو گیا۔

اس کا اپارٹمنٹ زیادہ دُور نہیں تھا۔ میں اپنی کار میں تین منٹ کے اندر وہاں پہنچ گیا۔

گلوریا کا چہرہ چاک کی مانند سفید ہو رہا تھا اور اس کی حالت کسی نیم بے ہوش انسان کی سی تھی۔ میں نے اُسے تسلی دیتے ہوئے کہا "ڈارلنگ! کیا بات ہے؟"

اُس نے کچھ کہنے کی کوشش کی مگر اُس کے ہونٹ کپکپا کر رہ گئے۔ وہ خوفزدہ نظروں سے خواب گاہ کے اَدھ کھلے دروازے کی طرف دیکھ رہی تھی "وہ..... کمرے میں" اُس نے بمشکل کہا۔

میں اُسے چھوڑ کر خواب گاہ میں داخل ہو گیا۔ ایک شخص پلنگ کی پائینتی کی طرف اوندھے منہ فرش پر پڑا تھا۔ وہ ایک دُبلا پتلا شخص تھا۔ میں نے قریب جا کر اُس کا جائزہ لیا۔ اُس کے نقوش تیکھے، عمر پینتیس چالیس سال کے درمیان اور قد چھوٹا تھا۔ اُس نے سیل میں خریدا ہُوا سُوٹ پہن رکھا تھا۔ میں نے اس کی نبض دیکھی اور گلوریا کے پاس جا کر پُوچھا کہ معاملہ کیا ہے؟

"اوہ جم! میرا اسے قتل کرنے کا کوئی ارادہ نہیں تھا۔ یہ..... یہ محض ایک حادثہ ہے۔"

"مجھے تمہاری بات پر کوئی شک نہیں ہے ڈارلنگ! میں نے اُس کا کندھا تھپتھپایا۔ "اطمینان سے ساری بات بتاؤ۔"

گلوریا کی کپکپاہٹ بند ہو گئی۔ اُس نے گہرا سانس لیا اور صوفہ پر بیٹھ کر بولی "جم! میں نشہ کرتی ہوں۔"

یہ سُن کر مجھے سخت دھچکا لگا۔ اُس کے بارے میں جو خوبصورت خیالات و تصوّرات میرے دل میں موجود تھے، وہ چُور چُور ہو گئے۔ یہ بات بھی سمجھ میں آ گئی کہ وہ شادی سے کیوں خوفزدہ تھی۔

"اوہ، میرے مالک۔ نہیں!"

"جم میں تھک چکی تھی۔ زندگی سے بیزار ہو چکی تھی۔ کوئی دُکھ بانٹنے والا نہیں تھا۔ میرا خیال تھا کہ نشہ سے تنہائیاں اور اُداسیاں کم ہو جائیں گی۔ میں نے یہ بھی سوچا تھا کہ نشے کو اپنے اُوپر مسلّط نہیں ہونے دُوں گی۔ لیکن مجھے پتہ ہی نہیں چلا کہ میں کب اس خطرناک چیز کی اسیر ہو گئی۔ میں تمہیں سب کچھ بتا دینا چاہتی تھی۔ لیکن جب تم نے سوسن کے بارے میں بتایا تو میری ہمت نہیں پڑی۔"

وہ بول رہی تھی لیکن میری توجہ کہیں اور تھی۔ میرے منہ کا ذائقہ تلخ ہو گیا تھا۔

"یہ شخص کون تھا؟"

"یہ شخص مجھے ہیروئن سپلائی کرتا تھا۔ اس سے پہلے اس نے کبھی مجھ پہ بُری نظر نہیں ڈالی تھی۔ لیکن آج نہ جانے اسے کیا ہو گیا

تھا۔ جب میں باکس سے پیسے نکالنے کے لئے خواب گاہ میں پہنچی تو میرے پیچھے وہاں پہنچ گیا۔ اس نے نہایت بے ہودہ انداز میں کہا کہ اگر میں اس کی محبت قبول کروں تو وہ مجھے ٹم ریٹا میں ہیروئن سپلائی کر دیا کرے گا۔ میں نے اس کے منہ پر تھپڑ مار دیا لیکن وہ باز نہیں آیا۔ میں نے اسے زور سے دھکا دیا۔ وہ اپنا توازن قائم نہ رکھ سکا۔ اس کا سر ڈریسنگ ٹیبل سے ٹکرایا اور... " وہ ایک دم کھڑی ہو گئی۔ " یقین کرو جم! میں نے صرف اپنے دفاع میں اسے دھکا دیا تھا۔ میں اس کی جان لینے کا کوئی ارادہ نہیں رکھتی تھی۔"

" ڈارلنگ! مجھے تمہارے بیان پر کوئی شک نہیں ہے۔ تم یہیں بیٹھو اور اپنے ذہن پر کوئی بوجھ نہیں ڈالو۔ سب ٹھیک ہو جائے گا۔"

وہ صوفے پر بیٹھ گئی اور دونوں ہاتھوں میں منہ چھپا کر رونے لگی۔

میں دوبارہ خواب گاہ میں گیا اور شعلہ بار نظروں سے فرش پر پڑے ہوئے شخص کو گھورنے لگا۔ وہ اُن لوگوں میں سے تھا جو نئی نسلوں کو تباہ کر رہے تھے۔ جو زہر بیچ رہے تھے۔ نوجوانوں کو قتل کر رہے تھے۔ ایسے لوگوں کو زندہ رہنے کا کوئی حق نہیں تھا۔

چند ساعتوں بعد جب میں واپس آیا تو گلوریا اسی طرح صوفے پر بیٹھی سسکیاں لے رہی تھی۔

" فکر نہیں کرو ڈارلنگ!" میں نے اُسے تسلی دی۔" ہر شخص تمہاری بات پر یقین کرے گا کہ تم نے اپنے دفاع میں اسے دھکا دیا تھا۔ اب اس خیال کو اپنے ذہن سے نکال دو۔"

" ہو سکتا ہے کہ وہ میری بات پر یقین نہ کریں۔"

" انھیں یقین کرنا ہی پڑے گا۔ پہلی بات تو یہ ہے کہ تمہاری اس شخص سے کوئی دشمنی نہیں تھی۔ دوم یہ کہ اُس نے تمہارے گھر میں تم پر مجرمانہ حملہ کرنے کی کوشش کی تھی۔ میں پولیس اسٹیشن فون کرتا ہوں اور جب موقعے کی کارروائی مکمل ہو جائے گی تو میں تمہیں اپنے ساتھ پولیس اسٹیشن لے جا کر تمہارا بیان ریکارڈ کروا دوں گا۔ میں کیپٹن کین سے کہوں گا کہ وہ ذاتی طور پر تمہارا بیان لے۔"

میرے فون کرنے کے چند منٹ بعد ایک اسکواڈ کار موقع پر پہنچ گئی اور انہوں نے ضابطہ کی کارروائی شروع کر دی۔ کچھ دیر بعد میں گلوریا کو ساتھ لے کر ہیڈ کوارٹر پہنچ گیا اور کیپٹن کین کو ساری صورتِ حال سمجھا دی۔ یہ بھی بتا دیا کہ میرے گلوریا کے ساتھ کیا تعلقات ہیں۔ اُس نے پوری توجہ کے ساتھ میری بات سنی اور ایک آفیسر کو بُلا کر اپنے سامنے گلوریا کا بیان ریکارڈ کروایا۔ اس نے گلوریا کو اس یقین دہانی کے ساتھ عورتوں کی حوالات میں بھجوا دیا کہ کل تک اس کی ضمانت ہو جائیگی۔

یہ کارروائی مکمل ہونے کے بعد میں نے کیپٹن سے چھٹی لی اور اپنے اپارٹمنٹ میں پہنچ کر اسکاچ کی بوتل نکال لی کیونکہ میں بے خود ہو جانا چاہتا۔ ابتدائی چند جام پی کر میرے جسم میں گرمی پیدا ہوئی اور پھر مدہوشی طاری ہونے لگی۔

تب ہی اطلاعی گھنٹی کی آواز سنائی دی۔ میں بوتل ہاتھ میں پکڑے جھومتا ہوا باہر پہنچ گیا۔ دروازے کے سامنے کیپٹن کین کھڑا تھا۔

" گولڈر، کیا تم نشے میں ہو؟" اُس نے پُوچھا۔

" نن..... نہیں تو۔" میں نے کہا۔" میں تمہاری بات سمجھ رہا ہوں۔ اندر آجاؤ۔"

وہ بغور میرا جائزہ لیتا ہوا اندر پہنچ گیا۔ میں نے بوتل الماری میں رکھ دی اور سنجیدہ نظر آنے کی کوشش کرنے لگا۔

" تم نے ضرورت سے زیادہ شراب پی رکھی ہے۔ کیا اس کی کوئی خاص وجہ ہے؟"

میری کھوپڑی میں گھنٹی بجنے لگی۔" میں تمہارا مطلب نہیں سمجھا۔"

وہ سر ہلاتے ہوئے بولا۔" تم بخوبی میرا مطلب سمجھ رہے ہو۔ لیکن فی الحال ہم اس موضوع کو یہیں چھوڑتے ہیں۔" وہ آرام کرسی پر بیٹھ گیا۔" میں تمہاری بیوی کے بارے میں تم سے کچھ باتیں کرنا چاہتا ہوں۔"

مجھے اپنے حلق میں کچھ اٹکتا ہوا محسوس ہوا۔" سوسن کا کیا ذکر آ گیا؟"

" اُس نے خود کشی کی تھی؟"

" یہ سب کچھ ریکارڈ پر موجود ہے۔"

" میں ریکارڈ کی بات نہیں کر رہا ہوں تمہارے منہ سے سُننا چاہتا ہوں۔"

" کیپٹن، یہ پُرانی بات ہو چکی ہے۔"

" گولڈر!" کیپٹن نے سختی سے کہا" سوال کا جواب دو۔"

میں صوفے پر ڈھیر ہو گیا۔ شراب کا سارا نشہ ہوا ہو گیا۔" ہاں۔ سوسن نے خودکشی کی تھی۔"

" کس طرح؟"

" اُس نے اپنی کلائیاں کاٹ ڈالی تھیں۔"

" کیوں؟"

مجھے متلی سی ہونے لگی" وہ نشہ کرتی تھی۔" میں نے ہولے سے کہا۔" مجھے اکثر رات کی ڈیوٹی کرنا پڑتی تھی جس کی وجہ سے وہ تنہائی اور بوریت محسوس کرتی تھی۔ اُس نے غلط قسم کی محفلوں میں جانا شروع کر دیا تھا۔ ابتدا میں اُس نے محض تفریح کے طور پر نشہ کرنا شروع کیا تھا۔ لیکن رفتہ رفتہ وہ اس کی عادی ہو گئی۔ جب مجھے پتہ چلا تو بات بہت آگے بڑھ چکی تھی۔ میں نے اس کا علاج کرانے کی کوشش کی لیکن اسے یقین نہیں تھا کہ وہ صحت یاب ہو سکے گی۔ بالآخر اُس نے مایوس ہو کر خودکشی کر لی۔"

کیپٹن کین کچھ دیر مجھے گھورتا رہا پھر بولا۔" پہلے تمہاری بیوی اور.... اب تمہاری منگیتر....."

" کیا؟"

" کیا اسی وجہ سے تم نے یہ حرکت کی

ہے ؟"

میری کھوپڑی میں بجنے والی گھنٹی کی آواز تیز ہو گئی۔ میں نے اپنے جبڑے کو لکڑی کی طرح سخت کر لیا اور کہا۔ "میں ابھی تک تمہاری بات نہیں سمجھا۔"

کیپٹن نے میری بات کو نظر انداز کر دیا بلکہ یوں ظاہر کیا جیسے اُس نے کچھ سُنا ہی نہیں۔ اُٹھتے ہوئے بولا۔ گونزا میرے ساتھ جانے کے لئے تیار ہو جاؤ۔ تم زیرِ حراست ہو۔"

"زیرِ حراست"

"ہاں۔ قتل کے الزام میں" کیپٹن کین سنجیدگی سے بولا۔ جب تم نے پہلی بار سیروٹن سلائٹر کا معائنہ کیا تھا تو وہ زندہ تھا۔ ہو سکتا ہے کہ تمہیں اس بات کا اس وقت اندازہ نہ ہُوا ہو لیکن جب گلوریا کی کہانی سُن کر تم دوبارہ ... خواب گاہ میں گئے تو اس وقت وہ سلائٹر ہوش میں آ رہا تھا یا اُٹھ کر بیٹھ گیا تھا۔ تم چونکہ اس قسم کا گھناؤنا کاروبار کرنے والوں سے نفرت کرتے ہو' اس لئے تم نے اسے ٹھوکریں مار مار کر ہلاک کر دیا۔ یہی وجہ ہے کہ یہاں آ کر تمہیں جھوٹ کا سہارا لینا پڑا۔ کیونکہ بعد میں تمہیں احساس ہُوا ہو گا کہ گلوریا پر قتلِ عمد کا کیس بن سکتا ہے۔ وکیلِ استغاثہ کے لئے یہ موقف اختیار کرنا کچھ مشکل نہیں ہو گا کہ گلوریا ترغیب دے کر اس شخص کو اندر لے گئی تھی اور کسی چیز سے پے در پے وار کر کے اُسے ہلاک کر دیا ہو گا۔"

"میڈیکل ایگزامنر نے جو ابتدائی رپورٹ دی ہے اُس کے مطابق مقتول کی کنپٹی پر ایک چوٹ کا نشان نہیں' کئی چوٹوں کے نشانات پائے گئے ہیں۔ یہ نشانات گلوریا کے اس بیان کی تائید نہیں کرتے کہ مقتول کا سر ڈریسنگ ٹیبل سے ٹکرا گیا تھا۔ اس کے علاوہ مقتول کے سر میں سیاہ پالش لگی ہوئی پائی گئی ہے جو یقیناً تمہارے بوٹوں سے لگی ہے۔"

مجھے یوں محسوس ہو رہا تھا جیسے اچانک کسی نے غبارے میں سوئی چبھو دی ہو۔ تاہم میں کسی قدر مطمئن بھی تھا کیونکہ گلوریا ایک بڑی مصیبت سے بچ گئی تھی اور ایک موذی ختم ہو گیا تھا۔

غزلیں

آج ہم اُن کو محبت کا خُدا کہتے ہیں
دیکھیں اس جذبۂ صادق کو وہ کیا کہتے ہیں
ربط باہم کو محبت کا ابھی نام نہ دو
لوگ اس دَور میں اُلفت کو بُرا کہتے ہیں
عقل والے تو سمجھتے ہیں کہ زخمی ہے بدن
عشق والے اسے مجنوں کی قبا کہتے ہیں
ہم سے تو بیار کا برتاؤ کبھی یاں نہ کرے
بے وفائی کو بھی تو ہی ہم تو ادا کہتے ہیں
عشق کرنے کا سلیقہ بھی نہ آیا ہم کو
ہم نے تسلیم کیا آپ بجا کہتے ہیں
وہ کہتا ہے قیامت کا جہاں ہے اے دوست
ہم اسے تیرے بچھڑنے کی ادا کہتے ہیں
دردؔ کے درد کو سمجھیں گے وہی لوگ کہ جو
جام کو بھی غم کے بادہ کو دوا کہتے ہیں

بیرم سو شیل دردؔ

میں کیا تھا کبھی آج ہوں کیا یاد نہیں ہے
جب سے تجھے دیکھا ہے خُدا یاد نہیں ہے
وہ کونسا انداز ترا یاد نہیں ہے
اک ظلم ترا عہدِ وفا یاد نہیں ہے
جاؤں تو کہاں جاؤں میں یا رد کس کی خبر لوں
خود اپنے ہی گھر کا تو پتہ یاد نہیں ہے
کیا جانئے پھر کیا فیصلہ دربار میں اُنکے
مجرم تو بنا ہوں میں خطا یاد نہیں ہے
ہم تو یہاں بیٹھے تھے محبت کے واسطے
اے دوست تجھے اتنا بھی کیا یاد نہیں ہے
اندازِ تغافل تو ذرا دیکھیے یہ کوئی
منزل پہ پہنچ کر بھی پتہ یاد نہیں ہے
اپنی تو سدا صحرا میں ہی زندگی جوہرؔ
گزری ہو کبھی بادِ صبا یاد نہیں ہے

ایوب جوہرؔ

ایسی حسین رات کے پہلو میں کچھ نہ تھا
تیرے بغیر پھولوں کی خوشبو میں کچھ نہ تھا
ہے موت پر تمام یہ انجامِ زندگی
سب تو نے تھے اور ترازو میں کچھ نہ تھا
ہمت کے بال و پر تھے تجسس کا حوصلہ
جادو تھا نظر ان کی بانہوں میں کچھ نہ تھا
ذہنوں کی تیرگی کو کھنگالنے کا شوق تھا
ویسے بری نگاہ کے جگنو میں کچھ نہ تھا
اعتماد سے بیچ تھی نہ احساس کی ردا
بس خامشی تھی اور بری خو میں کچھ نہ تھا
ارض و سما کے رُخ پہ کسی کائنات میں
دو جلوہ گر تھا اور ہر اک سُو میں کچھ نہ تھا
کوثرؔ بتا بھی دیجیے تجربات زندگی
جُز دردِ کائنات کے گیسو میں کچھ نہ تھا

محمد ابراہیم کوثرؔ



جب فلمی ستارے مدّاح بن گئے



● اداکار سنجے دت اور اُن کے مہمان نور محمدی ہوٹل کے کھانے سے لطف اندوز ہو رہے ہیں

فلمی ستارے جو ہر دم مدّاحوں میں گھرے رہتے ہیں، جب خود کسی کے مدّاح بن جائیں تو یہ حیرت کی بات ہے۔ لیکن اگر آپ نور محمدی ہوٹل کی نلی نہاری کا ایک بار ذائقہ لیں تو پھر آپ کو تعجب نہیں ہوگا۔ یہ ہے ہی اتنی عمدہ، لذیذ اور صحت مند کہ پہلے ہی لقمے میں خواص و عوام کا دل موہ لیتی ہے۔ اسی لئے نور محمدی ہوٹل کے مستقل گاہکوں میں بڑی بڑی ہستیاں، مشہور فلمی ستارے شامل ہیں۔ یہاں کی نلی، نہاری، بھیجہ، پائے، ماش کی دال اور دیگر کھانوں کے پیچھے ۶۰ سال کا تجربہ اور جناب عبدالحکیم مالک نور محمدی ہوٹل اور اُن کے فرزند خالد حکیم کی ذاتی نگرانی شامل ہے، جس نے اسے ممتاز بنایا ہے، آپ یہاں تشریف لا کر شوق فرمائیں، اپنے احباب کے لئے گھر لے جائیں یا پارٹی کے لئے لے جائیں۔ آپ اور آپ کے مہمان ذائقہ کو کبھی فراموش نہ کر سکیں گے۔

نور محمدّی ہوٹل، وزیر بلڈنگ 181/183 ای۔آر۔ روڈ، بھنڈی بازار، بمبئی ۳-۰۰۰۰۳

فون ہوٹل: 8511008 فون دفتر: 8516115

سُرخ و سِیاہ حاشیے

جیون لال شرما لندن

ہوائے نفس کا طوفان ہے بحرِ زندگانی میں
(اکبر الٰہ آبادی)

دیارِ مغرب میں آبادی بڑھنے کا کوئی خطرہ نہیں ہے۔ کئی ملکوں میں تو آبادی کم ہوتی جا رہی ہے (مثلاً آسٹریا، بلجیم، جرمنی) پھر بھی نرودھ کا پرچار مغرب میں بھی ہوتا ہے، اور خوب زوروں سے ہوتا ہے۔ مائیں فکرمند رہتی ہیں اور سرکاریں بھی۔ گو ایسی فکرمندی کا صرف دو اربعہ محض مشاورتی قسم کا ہے۔

ماں اپنی کنیا کو بڑی فکرمند ہو کر مشورہ دیتی ہے "بیٹی احتیاط برتو" یعنی نرودھ برتو۔

ع۔ عشق بازی کو ہے سلیقہ شرط۔
(داغ دہلوی)

(نرودھ کو یہاں کونڈم Condom کہتے ہیں۔ بہتر ہوگا کہ اردو میں اسے کنڈم لکھا پڑھا جائے ——— کنڈم مترنم محسوس ہوتا ہے اور استعمال کے فوراً بعد پھینک دیئے جانے کی مناسبت سے بامعنی بھی لگتا ہے۔)

سرکار کنڈم کے پرچار پر لاکھوں پونڈ کی اشتہار بازی کرتی ہے۔ ماں کو بے موقعہ حمل کا ڈر لگا رہتا ہے اور سرکار کو ایڈز کی بیماری پھیلنے پھیلانے کا خدشہ۔

ایک سرکاری اشتہار میں مشورے کی شائستگی اور ادبیت کا انداز ملاحظہ ہو۔

"Dress for The occasion"
موقعہ محل کی مناسبت سے ملبوس ہو رہنا ہی مفید رہے گا۔"

"ماں" اور "سرکار" کے ساتھ ساتھ "کنیا" خود بھی فکرمند رہنے لگی ہے اور "کنہیا" کی غیر ذمہ دار طبیعت پر بھروسہ کرنا ترک کرنے لگی ہے۔

مبادا کہہ دے کہ Sorry کستوری میں لانا بھول گیا۔۔۔"

اور پھر بھولے ہوئے سانسوں کی دنیا میں کنیا اور کنہیا دونوں ہی برہنہ سر دخل اور داخلے کی بھول کر بیٹھیں گے۔ ع

ہم نے دونوں کو دمِ سحر کہ غافل دیکھا (داغ)

لہٰذا بھول کے پھول کا بوجھ پہلے ۹ مہینے اور پھر پورے بچپنے تک اٹھائے رکھنے کی بجائے کنیاؤں نے خود ہی کنڈم کا سایہ بھر بوجھ اٹھانا شروع کر دیا ہے۔

اب ترقی پسند (یا بیدار مغز؟) لڑکیوں کے ہینڈ بیگ میں لپ اسٹک، رومال، آئینہ اور بس پاس کے ساتھ ساتھ کنڈم کا پیکٹ بھی رہنے لگا ہے۔

ترقی پسندوں میں ایک فارورڈ بلاک بھی ہوتا ہے اور اب تو زمانہ ہے بھی چاند ستاروں پر بستیاں بسانے کا۔ اس فارورڈ بلاک کی فارورڈ ترین دوشیزاؤں نے کنڈم کو کانوں کے جھمکے بنا لیا ہے جو ظاہراً تو کانوں کے

سُرخیاں سہلا رہے ہوتے ہیں اور اصلاً ترغیب گناہ کا دعوت نامہ بنے رہتے ہیں۔ لذت آفریں ترغیب کے ساتھ ساتھ "احتیاط" کی ترکیب بھی پیش خدمت ہے۔ ع

فردِ عصیاں کی سیاہی بھی ہے پانی پانی

(رتن پنڈوروی)

(ایسی فارورڈ ترین حسینائیں انتہائی مخصوص کلبوں اور ناچ گھروں میں ہی پائی جاتی ہیں۔ جہاں پر دخل اور داخلے کے لئے محض ایک ہی چیز درکار ہوتی ہے۔ وہ یہ کہ بٹوا موٹا ہو)

بدل جائے گا معیارِ شرافت چشمِ دُنیا میں

(اکبر الٰہ آبادی)

انگلینڈ، ہالینڈ، سویڈن، ڈنمارک.. تو اپنے آپ کو خوب ترقی پسند خیال کرتے ہیں، جبکہ آئرلینڈ، پرتگال، اسپین کو پچھڑے ہوئے سمجھا جاتا ہے۔ ان مُلکوں کے لوگ کٹر قسم کے کیتھولک ہیں جو اپنی تہذیبی، معاشرتی اور اخلاقی اقدار پر خوب نازاں ہیں۔

اب ان سب یوروپی ملکوں کے نظریاتی اور اخلاقی فاصلے کم ہوتے جا رہے ہیں۔ ایک تو ایڈز کی روز بروز پھیلتی ہوئی بیماری، اور دوسرے یورپی ملکوں کا روز بروز بڑھ رہا اقتصادی اور سیاسی اشتراک۔ ای۔ای۔سی کی یوروپی پارلیمنٹ کے تحت مُلکی اختلافات کم سے کم ہوتے جا رہے ہیں۔

لہٰذا کیتھولک اسپین میں بھی بلاضرورت حمل اور نامُراد ایڈز کو روکنے کے ۰۔۲ بلین پسیٹہ کی ایک مُہم شروع ہو چکی ہے جس کے تحت ۱۵ لاکھ کنڈوم نین ایجرز میں قطعی مُفت تقسیم کئے گئے ہیں۔ ایک POP گرُوپ کی خدمات حاصل کی گئی ہیں جو گا بجا کر سرکاری مُہم کی پبلسٹی کرے گا (اس گرُوپ کا نام بھی کیسا معقول یا نامعقول سا نظر آتا ہے۔۔۔ Semen up سیمن اپ، جی نہیں۔ آپ سیمن اپ یا کمس اپ کنفیوز کر رہے ہیں۔ اب سیمن اپ تو ایک نام ہے۔ اس کا اُردو مُتبادل کیا ہو سکتا ہے؟ چلئے آپ "قطرۂ سیماب" کہہ لیجئے۔

اسپین میں بے موقعہ اور بلا احتیاط "قطرۂ سیماب" کا اسکینڈل کہ تیس ہزار سے زائد ٹین ایج بچیاں ہر برس حاملہ ہو رہی ہیں۔ مزید برآں ایڈز کی نامُراد بیماری کی تشخیص اور علاج پر سرکار کا

۲۰۰۰۰۰۰۰۰۰ (۱۰ صفریں)

پسیٹہ سالانہ خرچہ اُٹھ جاتا ہے۔

یہ تو ہُوا سرکاری نظریہ، جبکہ چرچ کی طرزِ فکر اسکے بالکل برعکس ہے۔ کیتھولک چرچ کے معتبر سربراہ سرکاری طور طریقوں سے بہت ناخوش ہیں بلکہ خوب کڑھ رہے ہیں۔ اُن کا خیال ہے کہ اخلاقی قدروں اور مذہبی تعلیم کو ترک کرنے کا نتیجہ ہے کہ ایسی خطرناک صورتِ حال پیدا ہو رہی ہے۔

ع برگشتگی عقل نے کیا ناچ نچایا
خوشبو کے تصوّر میں ہم آلام سے کھیلے

(رتن پنڈوروی)

"اوّلیں شبِ گُلشن کس قدر سُہانی تھی۔"

(ناصر کاظمی)

شادی کے بعد کی جو پہلی رات ہے اُسے سُہاگ رات کہتے ہیں نا؟ مشرقی معاشرے میں۔ سُہاگ کی سوچتے ہی خاوند کو اعلیٰ و ارفع مسند پہ بٹھانا پڑے گا۔ بیوی خاوند کی آرتی اُتارے گی۔ اُس کا برت رکھے گی۔ مغربی معاشرے میں ایسا کوئی بندوبست نہیں ہے۔ شادی کوئی جنم جنمانتر کا بندھن نہیں ہے جو اگنی کی گواہی لے کر، وہ اور وہ دھواں کے دُوسرے کے آگے پیچھے ہو کر پھیروں کی شکل میں گٹھ جوڑ کرتے ہیں۔۔۔

شادی اور سُہاگ کے ایسے اہتمام کو پاکیزگیٔ خیال کی اُپج کہئے یا پسماندہ رُجحان کی پیداوار، مغربی طرزِ فکر میں یہ دونوں ہی صورتوں میں موجُود نہیں ہے۔ یہاں پر شادی تقدیر کا لکھا ہوا سنجوگ (یا عُمر بھر کا روگ؟) نہیں ہے، بلکہ نجی منظوری سے قرار پایا ہوا ایک Contract ہے اور ایسے مُعاہدے پر پُورا اُترنے کے لئے برائیڈ اور گرُوم محض ایک قسم کھاتے ہیں۔ آئی ڈُو (I do)

شادی کے بعد کی رات اگر سُہاگ رات ہے تو یہ بھی ہوگا کہ اِک چاند چھُپا ہے گھونگھٹ میں، اِک چاند کے سر پر سہرا ہے۔ کیا چھُپنا اور کِس کا چھُپنا؟ دیارِ مغرب میں تو شادی کے بعد کی جو رات ہے اُسے پہلی رات بھی یقین سے نہیں کہہ سکتے۔ کیونکہ یہ پانچویں یا پچاسویں بھی ہو سکتی ہے۔

مغربی سوچ پر ڈاکٹر سگمنڈ فرائڈ کے انقلابی خیالات کا بھرپور اور واضح اثر ہے۔ ڈاکٹر موصُوف کے مُطابق جنسی جذبہ ایک بہت ہی طاقتور محرّک ہے اور کہ اِنسان کے تمام تر افکار و افعال لذّت پسندی سے جنم لیتے ہیں۔ لہٰذا شادی کی رسم لذّت اندوزی پر مبنی ہے۔ مرد اور عورت کا مِلاپ جنسی خواہشات کی آسودگی کے لئے ہوتا ہے۔ اِس حقیقت کی سماجی قبولیت ہی کا نام شادی ہے جبکہ ع

"دونوں جانب تھا رگوں میں جوشِ خونِ فتنہ زا"

(اکبر الٰہ آبادی)

اور جب جوشِ خُونِ فتنہ زا کو رام کرنے کے لئے شادی کے ضابطے میں ڈال دیا جائے تو ایک شیریں مُلاقات کا باقاعدہ اہتمام خوب چاؤ سے کیا جاتا ہے۔۔۔ اِسی مخصوص مُلاقات کو 'ہنی مُون' کہتے ہیں۔ جب شہد کی سی لذّت میسّر آئے اور چاندنی کی سی کیف آور آسُودگی۔

گو یہاں کا کیتھولک چرچ فرائڈ کے فلسفہ کا قطعی قائل نہیں ہے۔ چرچ کے سربراہ یقین کرتے ہیں کہ عورت مرد کے مابین ایک محکم رِشتہ قدرت نے قائم کر رکھا ہے جس

کی سماجی صورت شادی ہے۔ اور کہ ہنی مُون محض جنسی آسودگی اور لذت گیری ہی نہیں بلکہ نسلِ انسانی کی بقاء کے لئے ایک ضروری وظیفہ ہے۔

ابھی حال ہی میں چرچ کے چودھریوں کے لئے ایک اور قضیہ شروع ہو گیا ہے ـــــ انسانی اضافے اور توارُث کے لئے 'شادی' شہنائی تو کیا ہسبینڈ (Husband) اور ہنی مُون کی بھی چنداں ضرورت نہیں رہی۔

تازہ ترین (مارچ ۱۹۹۱ء) "ترقی" یہ ہے کہ ایک برطانوی عورت دُنیا کی پہلی کنواری اور کوری ماں بننے لگی ہے۔ برٹش پریگنینسی ایڈوائزری سروس (British Pregnancy Advisory Service) بی۔ پی۔ اے۔ ایس۔ کے زیرِ اہتمام یہ محترمہ جنسی عمل کے بغیر ہی مصنوعی طریقہ سے حمل کے مراحل طے کرکے کوری کنواری ماں بننے کی توقع رکھتی ہے۔ (مزید دو کوری کنواریاں بھی لائن میں لگ چکی ہیں)

؎ مُرغیاں کب نکاح کرتی ہیں
پھر تو انڈا حرام ہے پیارے

اتنی دُور تک تو فرائڈ نے بھی نہیں سوچا ہوگا۔ حضرت نے ضرور قبر میں کروٹ بدل لی ہوگی۔

چوری چھپے کا گُڑ تو قریب قریب ہر معاشرے میں بہت سی کنواریاں کھا ہی لیتی ہے مگر ایسی چوریوں کو غیر اخلاقی اور غیر تہذیبی قرار دیا جاتا ہے۔ مغربی معاشرے میں صورتِ حال قطعی مختلف ہے۔ یہ "چھوٹی موٹی چوریاں" اخلاق اور مذہب اور تہذیب کے دائروں سے کب کی نکل چکی ہیں۔ مگر اب جو ہونے لگا ہے وہ تو فطرت کے خلاف ہے۔

اس غیر فطری عمل کو غیر قانونی بنانے کی مانگ ہو رہی ہے۔ مگر وزیرِ صحت ورجینیا باٹملے نے ایسا کرنے سے صاف انکار کر دیا ہے۔ اُن کا کہنا ہے کہ محض ضروری ہدایات جاری کی جائیں گی جیسے بن باپ کے بچّے کی پرورش کو ضرور دھیان میں رکھا جائے وغیرہ وغیرہ۔

تو کیا وہ وقت نزدیک ہی ہے جبکہ مرد کی صحبت کو ناپسند کرنے والی کوئی کنواری لڑکی ایک عدد بچّے کو بانہوں میں لینے کے لئے بیقرار ہو اُٹھے گویا "رُک رہی ہیں بہار کی سانسیں" تو بس کسی سپرم بنک (Sperm Bank) سے رجوع کرے اور لکھوادے اپنا آرڈر کہ بھئی چند قطرے "سیماب" کے لادو۔ انجکشن لے لیا اور ہو گئی ورجن برتھ (Virgin Birth) آجائے گا دِل بہلاوے کے لئے ایک عدد کھلونا۔ تو کیا زیست میں زندگی ایسے بھی گزرا کرے گی کہ ؎

"اُسے کسی کے سہارے کی آرزو بھی نہیں"
(ساحر لدھیانوی)

خیر وقت ہی بتائے گا کہ کنواری کس کروٹ لیتی ہے۔ ابھی تک تو مرد سے رشتہ قائم کرنے کا دستور باقی ہے۔

رشتہ بہشت میں قرار پایا یا قرارداد زمین پر لکھی گئی۔ گوری گھونگھٹ میں تھی یا ہیں اور ہنی گاؤن میں، مقصد نسلِ انسانی کی بقا سمجھا گیا، کہ محض جنسی خواہشات کی آسودگی ـــــ اُس کیف آگیں رات کی ایک صورت تو قطعی مربُوط اور عالمگیر حیثیت رکھتی ہے۔ وہ یہ کہ ہنی مُون کے دَوران (بقولِ شاعر) عشق کی نبضِ تیز میں بجلیاں ضرور دوڑتی ہیں اور کہ ؎

"آنکھوں میں رہ گئے یار تھا آنکھیں تھیں روبرو"
(جوش ملیح آبادی)

نہیں صاحب نہیں! ایسی شاعرانہ سُپردگی کا احساس عام لونڈوں میں کہاں۔

ایک حالیہ سروے ([illegible]) میں جرمن ماہرِ نفسیات اس نتیجے پر پہنچے ہیں کہ ۳۴ فیصدی گروم ہنی مُون کے دوران ذہنی اضطرابی کیفیت میں مبتلا رہتے ہیں۔ آنکھوں میں بھلے ہی رُوئے یار ہو، پر خود آنکھیں بار بار دروازے کی طرف اُٹھ جاتی ہیں اور سلسلۂ بوس و کنار توڑ کر گروم میاں اُٹھ کھڑے ہوتے ہیں۔ یہ تسلّی کرنے کے لئے کہ کواڑ کی کنڈی ٹھیک سے لگی ہوئی ہے۔

جنسی بیباکیوں، بے پرہیزیوں اور عین آزادیوں میں شب و روز گزارنے والے لوگ بھی خلوت کے خواہاں ہو سکتے ہیں؟ ۔ ع

اس وقت کوئی غیر نہیں آپ ہیں یا ہم
(بیخود دہلوی)

پھر بھی نہ جانے کس غیر یا کیا غیر کا ڈر ہے جو ستائے جا رہا ہے؟؟

سروے کے مطابق ہنی مُون کے اضطراب کی دوسری تشخیص یہ ہے کہ دُولہوں کی ایک بہت بڑی تعداد نبضِ تیز میں دوڑ رہی بجلیوں سے اس قدر ذہنی اِنتشار میں مبتلا ہوئی کہ طبیعت میں مناسب ٹھہراؤ لانے کے لئے "ٹھرّے" کا سہارا لینا پڑا۔ ایسے دُولہوں کی تعداد ۱۹ فیصدی نکلی۔ اتنے سارے دُولہے راجہ ہنی مُون کے کمرے میں داخل ہوئے تو یوں ع

میں اِنتہائے شوق میں گھبرا کے پی گیا
(جگر مرادآبادی)

سروے کا ایک اور سنسنی خیز انکشاف بھی ملاحظہ ہو۔ ۲ فیصدی 'مٹھو' ایسے بھی نکلے جو نبضِ تیز کو کسی بھی طور رام نہ کر سکے۔ سگریٹ لانے کا بہانہ کرکے کمرے سے باہر نکلے اور لوٹ کر نہیں آئے۔ اوّلیں شب گلشن کو سہانا ہونا تھا، کمبخت سُونا کر گئے۔ ع

اُٹھا مرے پہلو سے وہ مہر شناسائی
اک روز تو ایسا بھی آغازِ سحر ہوتا
(عالمتاب تشنہ)

بابِ انتقاد

عبدالرحیم خانخاناں

شیخ سلیم احمد

۱۸۳ صفحات ڈیمائی سائز

قیمت: ۸۰ روپے

ملنے کا پتہ: دفتر شانِ ہند ۔ نئی دہلی۔

اس کتاب میں عبدالرحیم خانخاناں کی سوانح عمری، حالاتِ زندگی، اُن کی مُہمات، سیرت و شخصیت، علم و ادب، ادب نوازی، تصوّف، تعمیرات، شیخ احمد سرہندی سے اور شاہزادوں کے ساتھ تعلقات اور اُن کی ہندی شاعری پر روشنی ڈالی گئی ہے۔

شروع میں تعارف ہے۔ آخر میں کتابیات ہے۔ رحیم کے دوہوں کا نمائندہ انتخاب ہے۔ سب کچھ مصنف کا ہی ہے۔ ۱۶۔ تصاویر ہیں۔

مصنف بات اس زمانے سے شروع کرتے ہیں جب مسلمان سپاہی ہندو آقا کے لئے اور ہندو سپاہی مسلمان سپہ سالار کے لئے لڑتے تھے۔ وحدت الوجود اور وحدانیت کے نظریات اس سماج کی متحرک قوت تھے۔ مذہبی رواداری تھی۔ شیخ صاحب پھر کہتے ہیں کہ حضرت شیخ احمد سرہندی کے منظرِ عام پر آنے سے یہ بساط اُلٹ جاتی ہے اور دُوسری بساط بچھتی ہے جس پر مذہب کا رنگ غالب تھا۔ مجدد الف ثانی کی آمد کے ساتھ ہندوستان میں اسلام کے احیاء کا آغاز ہوتا ہے اور بُنیاد پرستی اور کٹر مذہبیت کا دَور شروع ہوتا ہے۔ مجدد عبدالرحیم کے ہم عصر تھے خانخاناں کی ہندی شاعری کے معاملہ کو خاصا متنازع بتاتے ہوئے مصنف اس نتیجے پر پہنچتے ہیں کہ موجودہ ہندی کلام بیشتر خانخاناں ہی کا ہے۔

اکبر کے دربار کا ذکر ہے جہاں شیخ عبدُ النبی اور عبدُاللہ سُلطان پوری مذہبی بحثوں میں سُنّی نقطۂ نگاہ پیش کرتے تھے۔ عوام پر ان کا اتنا اثر تھا کہ ان سے بادشاہ تک خوف کھاتا تھا۔ آخر میں اکبر ایسے علماء سے بدظن ہو گئے اور اُنھیں موقع ملا کر وسیع اور آزادانہ حکومت قائم کریں۔

بیرم خاں کی زندگی کے حالات، اس کی شادی اور خانخاناں کی پیدائش کا ذکر ہے۔ ہیموُ بقال سے جنگ کی بات ہے۔ خانخاناں کے مرتبے کا ذکر ہے۔ دربار میں ریشہ دوانیوں اور شاہزادوں سے خانخاناں کے تعلقات کا حال ہے۔ تمام خوبیاں اور خامیاں بتائی گئی ہیں۔ خانخاناں کی زندگی میں اُتار چڑھاؤ کی بات بھی کھُل کر بیان کی گئی ہے۔

آخر میں سب سے اہم اور ضروری حصّہ رحیم کی ہندی شاعری کا ہے جس میں اُن کی شاعری کی تمام اصناف کا بھرپُور جائزہ لیا گیا ہے۔ ہندی زبان کے ارتقاء کی تاریخ بیان کی گئی ہے اور رحیم کے کلام کی قدر و قیمت متعین کی گئی ہے۔ یہ بات بہت وقیع ہے۔

غرض مصنف نے کوشش کی ہے کہ خانخاناں کی ایک مکمل دستاویز بنا دی جائے اور مصنف کامیاب ہیں۔ خانخاناں کے سبھی پہلوؤں کا احاطہ کیا گیا ہے۔

مصنف نے مجدد الف ثانی کا ایک خط صفحہ ۱۴۰، پر درج کیا ہے۔ یہ خط اقتباس ہے ورنہ اصل خط جو مکتوبات امام ربانی فارسی میں چھپا ہُوا ہے طویل ہے۔ پورے خط کو پڑھنے سے پتہ چلتا ہے کہ مجدد الف ثانی کے اندر غیر مسلموں سے نفرت اور حقارت کا دریا ٹھاٹیں مار رہا تھا۔

مصنف کو شاید علم ہو کہ بدایونی، فرشتہ اور یہاں تک کہ خسرو بھی ہندوؤں کو کافر، جہنمی اور بُرے الفاظ سے یاد کرتے رہے اور شیخ سعدی نے تو بوستاں کا آٹھواں باب ایسی نظریہ سے لکھا جو سراسر بُہتان ہے۔

ہیمو کو ہیمو بقال لکھا گیا ہے جو صریحاً غلط ہے۔ بقال کے معنی ہیں سبزی فروش یا کونجڑا۔ ہیمو جرنیل تھا اور آج بھی اسے شجاع اور زبردست جرنیل مانا جاتا ہے۔ ہیمو کو بنیا بھی کہا گیا ہے جب کہ بنیا کوئی لفظ نہیں۔ اسی بنا پر بنیا بقال مستعمل ہے جو صریحاً اور سراسر غلط ہے۔

"گلستان" کے شمارہ جنوری تا مارچ ۱۹۸۵ء میں محمد شمس الدین، خانخاناں کا سور ساگر مرتب کرنے اور گیتا کا سنسکرت اور ہندی میں ترجمہ کرنے کا ذکر کرتے ہیں۔ شاید مصنف اس پر روشنی ڈالیں۔ میرے پاس بیلجیم کے ایک اسکالر کی گیتا کے تراجم پر انگریزی میں ضخیم کتاب ہے۔ اس میں خانخاناں کے گیتا کے ترجمے کا کوئی ذکر نہیں۔ میں نے گیتا کے تراجم حاصل کرنے میں محنت کی ہے۔ دو صد کے قریب جمع بھی کئے ہیں لیکن ایسی گیتا نوٹس میں نہیں آئی جس کا ترجمہ خانخاناں سے منسوب ہو۔

رام لعل نابھوی

مَن کہ مکتوب الیہ

محبّی ! سلام و نیاز !
مزاجِ والا ؟
ایک عرصہ سے آپ کی طرف سے کوئی نامہ و پیام نہیں — "شانِ ہند" بھی کبھی دیکھنے میں نہیں آیا۔
خدا کرے کہ آپ تندرست و توانا ہوں۔
سُنا ہے آپ کی کوئی نئی کتاب آئی ہے۔
" مہا بھارت" چھپنے کی غالبًا کوئی صُورت پیدا نہیں ہو سکی ؟
اور حال احوال کیسے ہیں ؟

مخلص
خاکپد

برادر محترم، تسلیم !
آپ کے خط مورخہ ۳ مئی کا جواب آج ایک ماہ بعد لکھ رہا ہوں۔ اُس زمانے میں بمبئی سے اور پھر ہندوستان سے باہر چلا گیا تھا۔ کل شام کو کراچی سے تین ہفتے بعد واپس آیا ہوں۔
اُردو اکیڈمی کے انعامات میں کسی قسم کی جانب داری نہیں برتی جاتی۔ ہمارا اُصول یہ ہے جس پر میں سختی سے کاربند ہوں کہ جو کتابیں انعام کے لئے آتی ہیں وہ اصناف کے اعتبار سے مختلف کمیٹیوں میں تقسیم کر دی جاتی ہیں۔ اور کمیٹی کے اراکین کی رائے کا اس حد تک احترام کیا جاتا ہے کہ اُردو اکیڈمی یا حکومت کو اس میں کوئی تبدیلی کرنے کی اجازت نہیں ہے۔ اُردو اکیڈمی اپنی رائے کا استعمال صرف اس وقت کرتی ہے جب دو کتابیں یا دو ادیبوں کو برابر نمبر مل جائیں۔
اس سال ہم نے یہ بھی فیصلہ کیا ہے کہ انعام کے اعلان کے ساتھ کمیٹی کے اراکین کے نام بھی شائع کر دیئے جائیں۔ کمیٹی کے اراکین اپنے فن اور صنف کے مُستند نام ہوتے ہیں۔ اس معاملہ میں کسی قسم کے مذہبی امتیاز کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔
جہاں تک مجھے یاد ہے اور غالبًا آپ کو بھی ۔ ہوگا کہ گزشتہ سال مرحوم ڈاکٹر حقیر آستانی کو شاعری پر انعام دیا گیا تھا۔
"اقبال شناسی" کی مانگ پاکستان میں بھی ہے۔ آپ وہ کتاب شائع کر سکتے ہیں مجھے خوشی ہوگی کہ کتاب کا نیا ایڈیشن آپ کے یہاں شائع ہو رہا ہے۔ کتاب کی چند جلدیں میرے ریکارڈ کے لئے بھیج دیجئے گا۔ شرائط کچھ بھی نہیں ہیں۔ جی چاہے تو کتاب کی اشاعت کے بعد یک مُشت رقم بصورتِ دیگر دس اور پندرہ فیصد کے اعتبار سے جو آپ آسانی سے دے سکیں وہ مجھے منظور ہوگا۔
اُمید ہے کہ آپ خیریت سے ہوں گے۔
میں آپ کی تحریریں شوق سے پڑھتا ہوں۔
خدا آپ کی عمر دراز کرے۔
آپ کا
سردار جعفری

محبّ محترم، تسلیم !
"دلّی کے مشاعرے" کو دلچسپی سے پڑھنے والے حضرات دل جمعی کے لئے پڑھا کریں، مگر ہم تو اسے تاریخی دستاویز کا درجہ دیتے ہیں۔
کئی شعراء سے از سرِ نو ملاقات ہوئی، اور کئی سخنوروں کا نا پید کلام از سرِ نو پیدا ہو گیا۔
برواں چنیں کنند۔ شاد باشید۔
گھر میں پرنام کہیئے۔

کالی داس گپتا رضا
بمبئی

آبروئے صحافت' سرور صاحب !
بخشیں، کامیابیاں اور کامرانیاں
"خوشتر گرامی کو بیوقوف بنانے کے مجرب نسخے" پڑھ کر مزا آگیا۔ یوں بھی خوشتر مرحوم خود نہیں لکھتے تھے۔ تیر و نشتر کے لئے اور حضرات ہی لکھا کرتے تھے۔ ایک زمانے میں انھوں نے مجھ سے بھی کام لیا مگر ایک حضرت مجھ سے کم پیسوں پر تیار ہو گئے تو میں نے لکھنے سے صاف انکار کر دیا۔ اس کا حشر یہ ہوا کہ انھیں بیسویں صدی کو فروخت کرنا پڑا۔
محترم زار علامی نے حُسنِ اصلاح میں جو نکات بیان کئے ہیں واقعی اُن سے انحراف کی کوئی گنجائش نظر نہیں آتی۔ البتہ علامہ صاحب نے اپنے ایک شعر کے بارے میں یوں اصلاح فرمائی ہے:-
شعرِ زار ؎

عشق کی راہ میں اے زار سنبھل کر چلنا
منہ کی کھاتے ہیں یہاں دوڑ کے چلنے والے

اصلاح:

راہِ اُلفت میں ذرا دیکھ کے چلنا اے زار
منہ کے بل کب نہ گرے دوڑ کے چلنے والے

میں نہایت اُردو کا ادنیٰ سا طالب علم ہوں چنانچہ محترم زار صاحب سے معافی کے ساتھ یہ کہنا چاہوں گا ع

عشق کی راہ سے اب زار سنبھل کر چلنے
منہ کے بل کب نہ گرے دوڑ کے چلنے والے

میری غزل کا مطلع غلط چھپ گیا ع
"خون میں تھڑے ہوئے ہم کو گھرا تھے گئے"
(گھر نہیں)

مقطع بھی غلط چھپ گیا ع
"شادماں چہرے نہیں بس نوحہ گر اچھے لگے"
(چہروں کو بھی نہیں)

"میرے خواجہ تاش" (ساحر ہوشیارپوری) کم جملوں میں اتنا کچھ کہہ دیا ہے کہ جس کا کوئی جواب نہیں۔

دیپک قمر کا (ماہیا) بہت پسند آیا مگر اُن کا یہ دوہا
"اُلٹی ہو کر ہو سیدھی"
میرے اپنے خیال میں "اُلٹی ہو کر یا سیدھی" ہونا چاہیے۔
"ہو" کی تکرار کھٹکتی ہے۔
مجموعی طور پر آپ کی محنت اور کاوش کی صمیم قلب سے داد دیتا ہوں۔

نیاز آگیں
دلیپ بادل

جناب سرور تونسوی صاحب
آداب و تسلیمات!
۱۳ اپریل کا تحریر شدہ خط ملا۔ اور کتاب "دلی کے مشاعرے" بھی۔ جس کے لئے مشکور ہوں۔ بلا شبہ یہ کتاب اپنی مثال آپ ہے۔ آپ کی محنت شاقہ اور انتاد طبع کی داد دیتا ہوں۔

ابھی تک ماہِ فروری اور ماہ مارچ کے پرچے موصول ہوئے ہیں۔ آپ کی صحت تو اچھی ہوگی۔ پچھلے دنوں چناؤ کے سلسلے میں بہت مصروفیت رہی۔

میں دوستوں کی ایما پر اپنی پرانی پارٹی کانگریس میں شامل ہو گیا ہوں چناؤ کے نتائج بہت جلد سامنے آجائیں گے۔ کاش اچھے ایماندار لوگ دیش کی باگ ڈور سنبھالیں۔

آپ کا اپنا
دلارام شباب

ساہتکار سمان

پنجاب سرکار نے اُردو کے مقبول شاعر جناب جگر جالندھری کا ۱۹۹۰ء کے شرومنی ساہتکار ایوارڈ کے لئے انتخاب کیا ہے۔ یہ ایوارڈ جو ۲۱۰۰۰ (اکیس ہزار روپے) نقد، ایک طلائی تمغہ، ایک شال اور ایک ... پر مشتمل ہے، صوبے کا سب سے بڑا ادبی اعزاز ہے۔ ادارہ جناب جگر جالندھری کو مبارکباد پیش کرتا ہے۔

شانِ ہند دہلی

جلد ۵۲ شمارہ ۶

چیف ایڈیٹر
سرور تونسوی

جوائنٹ ایڈیٹر
مُطرب صحرائی

ٹیلی فون نمبر ۳۲۷۵۶۰۲

اِشاعت کا
۵۲ واں سال

اِس شُمارے کی اہم جھلکیاں

بی۔ جے۔ پی کابینہ جب گیروے کپڑے پہن کر ایودھیا تیجے سری رام" کے نعرے لگاتی ہوئی گئی تو راقم کو تشویش نہیں ہوئی، یک گونہ اطمینان ہوا۔
"اب کیا کریں" سید حامد ۔۔

جس وقت کلام پاک کے خلاف ایک بدبخت نے کلکتہ ہائی کورٹ میں ایک رٹ دائر کی کہ اسے ضبط کر لیا جائے ...

"راجیو گاندھی ۔۔ یادیں اور تأثرات" ڈاکٹر ہاشم قدوائی
"دھنِ اصلاح" زار علامی ۔ "ترقیٔ اردو بیورو" ہیرا لال چوپڑہ۔ (تحقیق و تنقید) ۔۔۔ "خوف کی نگری" اختر جہاں "بدحواس ربت" روشن آرا نزہت۔ "مسکراہٹ جو لبوں پر مرجھا گئی" حسنین کاظمی۔ "وقت کا فیصلہ" شبیہ عباس حاجروی (کہانیاں)
حنیف آستانی، ساحل احمد، ایوب جوہر، مظفر صدیقی، دیپک قمر، پریم سوشیل درد کی غزلیں۔
شکیل گیاوی، محمد علی تاج اور اختر اندوری کی راجیو گاندھی پر نظمیں۔
"باب انتقاد" "من کہ مکتوب الیہ" مستقل کالم بدستور۔

پرنٹر، پبلشر، پروپرائٹر: وِدّیا پرکاش سرور تونسوی
طباعت: خواجہ پریس، جامع مسجد دہلی۔ مقامِ اشاعت: دفتر ماہنامہ "شانِ ہند" فلیٹ ۵ انصاری مارکیٹ، دریا گنج، نئی دہلی ۲۔۱۱۰۰۰۔

ہندو پرست ہوں نہ مسلماں پرست ہوں
دامن پرست ہوں نہ گریباں پرست ہوں
ہر ذرّۂ وطن سے ہے فیّاض مجھ کو پیار
یعنی وطن پرست ہوں انساں پرست ہوں

فیاض گوالیاری

قیمت فی شمارہ ۔ پانچ روپے
قیمت سالانہ پچاس روپے
لائف ممبری پانچ سو روپے

ممالکِ غیر میں:۔
بذریعۂ سمندری ڈاک ۔/۱۰۰ روپے
بذریعۂ ہوائی ڈاک ۔/۳۰۰ روپے

غزل

ڈاکٹر حقیر آستانی مرحوم



آج تھا جو، کل نہیں تھا وقت اِسی کا نام ہے
جس کسی کو دیکھیے وہ شخص تشنہ کام ہے

بِن کسی مطلب تو کوئی یاد کم ہی آئے گا
یاد اُس کی آرہی تھی اُس سے کوئی کام ہے؟

چلتے چلیے، چلتے چلیے، ہے یہی تو زندگی!
جس کو سب کہتے ہیں منزل بس اسی کا نام ہے

کوئی بھی منزل نہیں سب راستے ہیں راستے
دُوسرے ناموں کی طرح یہ فقط اِک نام ہے

منزلیں ہیں اَن گِنت کِس کِس کی باتیں کیجیے
منزلیں ہیں آگے پیچھے یہ تو کوئی دام ہے

جیتے جی تو چین مِل پاتا نہیں انسان کو
منزلوں پر چین ہوگا یہ خیالِ خام ہے

کام تھا تو ہر گھڑی شعلہ بداماں تھے حقیرؔ
آج کل بے کار ہیں، آرام ہی آرام ہے

جناب سرور تونسوی علیل ہیں، اس لئے اداریہ نہ لکھ سکے۔ محترم سید حامد صاحب سابق وائس چانسلر مسلم یونیورسٹی علی گڑھ کے زریں خیالات پیشِ خدمت ہیں۔

—— مُضطرب صحرائی

اب کیا کریں؟

گو سنبھلنے اور پریشانیوں سے نکلنے کے دو ہی طریقے ہیں۔ یا تو شکایت پیشہ بن جاؤ، یا بے حسی کا لبادہ اوڑھ لو۔۔۔!

ہندوستان کے سامنے اس وقت بہت سے مسائل ہیں۔ ایک سے ایک زیادہ جٹل۔ فرقوں اور طبقوں کے درمیان باہمی عداوت، وبائی شکل میں جنسا، زور زبردستی، تشدد، دہشت گردی،

اور لوٹ کر ہندوستان سے الگ ہو جانے کی کوشش، زرمبادلہ یا فارن ایکسچینج کی تشویشناک حد تک کمی، اقتصادی بدحالی اور بے ایمانی۔

لیکن ہندوستان ان مسئلوں سے باخبر ہے اور ان کے سادھان کے لئے سرگرم عمل ہے۔ انتہائی

خطرے کو دور کرنے کے لئے اس نے صحیح و شافی قدم اٹھائے ہیں۔ اس کے وزیر مالیات شری من موہن سنگھ نے پورے اعتماد کے ساتھ کہا ہے کہ موجودہ دشواریوں سے نپٹنے کے لئے جو قدم اٹھائے جا رہے ہیں وہ ہندوستان کی

معیشت کو جانماز، بُخ دُم اور جیش رفت پیشہ بنا ڈیں گے۔ خدا کرے کہ ایسا ہی ہو۔ زندگی کی یہ علامت بھی ہے اور آزمائش بھی کہ مُصیبت کو موقع، بدحالی کو مہمیز اور عسرت کو عشرت میں بدل دیا جائے۔ جنوبی ہند کے برہمن اس وصف کا ثبوت دے چکے ہیں۔ وہاں کے نابرہمن سیکڑوں سال بلکہ ہزاروں سال کے ظلموں کا بدلہ لینے کے لئے جب اُٹھ کھڑے ہوئے اور نوکریوں پر برہمنوں کا جو اجارہ تھا اُسے چکنا چور کر دیا اور نوکریوں کے دروازے اُن کی موجودہ نسل پر بند کر دیے تو انھوں نے نہ آہ بھری، نہ نالہ کھینچا، نہ فریاد کی، نہ ہتھیار ڈالے۔ بلکہ کمر کس لی اور صنعت و حرفت میں بڑے پیمانے پر لگ گئے۔ صنعت و حرفت کسی کی ذین نہیں ہے۔ جو سرمایہ لگائے گا اور ہوشیاری کے ساتھ محنت کرے گا، وہ اس کے پھل کھائے گا۔

اسی ہندوستان میں مسلمان بستے ہیں۔ ایک بہت بڑی اقلیت کی شکل میں۔ ان کی حالت دن بدن بگڑتی جا رہی ہے لیکن وہ یا تو شکایت کرتے ہیں یا نالہ و فریاد، یا دَم سادھ لیتے ہیں بے چین اور بے سُدھ ہو کر بیٹھ جاتے ہیں۔ گو سنبھلنے اور پریشانیوں سے نکلنے کے دو ہی طریقے ہیں۔ یا تو شکایت پیشہ بن جاؤ یا بے حسی کا لبادہ اوڑھ لو۔ عمل نام کی کوئی شے ان کے دفتر میں ہے ہی نہیں۔ اُن کی حالت، سوجھ بوجھ اور اُفتادِ طبع کا اندازہ بعض ان خطوط سے کیا جا سکتا ہے جو اُردو اخباروں میں چھپتے ہیں۔ اُن باتوں کی طرف جو قوموں کی زندگی میں اہم ہوتی ہیں، اُن کا دھیان سرے سے جاتا ہی نہیں۔ اگر ان مُراسلوں میں کسی مضمون پر تبصرہ ہوتا ہے تو وہ نفسِ مضمون کا ادراک کرنے کے بجائے مضمون نگار کی زبان پکڑ لیتے ہیں، یا اس کی نیت پر حملہ کر بیٹھتے ہیں۔ نتیجہ میں مضمون خبط ہو جاتا ہے۔ اور اگر وہ جواب دیتا ہے تو ایک لاحاصل بحث کا سلسلہ شروع ہو جاتا ہے۔ غرض مضمون نگار جو کچھ کہنا چاہتا تھا وہ نہیں کہہ پاتا اور ہم جس حال میں، جس سطحِ فکر پر تھے، وہیں رہ جاتے ہیں۔

> اسی ہندوستان میں مسلمان بستے ہیں ایک بہت بڑی اقلیت کی شکل میں۔ اُن کی حالت دن بدن بگڑتی جارہی ہے لیکن وہ یا تو شکایت کرتے ہیں یا نالہ و فریاد، یا دَم سادھ لیتے ہیں بے چین اور بے سُدھ ہو کر بیٹھ جاتے ہیں۔

راقم کا رُوئے سخن اُن حالات کی طرف ہے جو تازہ چُناؤ سے پیدا ہوئے ہیں۔ یہ حالات ہندوستانی مسلمانوں کے لئے موافق نہیں ہیں۔ اس کی ایک موٹی سی نشانی یہ ہے کہ آبادی کو دیکھتے ہوئے جتنے ہندوستانی مسلمانوں کو الیکشن جیت کر آنا تھا، ان کے آدھے بھی کامیاب نہ ہو پائے۔ سرکاری نوکریوں میں اُن کا تناسُب اپنے حق کے چوتھائی سے بھی کم ہے۔ مُلک کے انتظام میں شریک ہونے کی یہی دو راہیں ہیں:

(۱) لوک سبھا اور ودھان سبھاؤں میں، یعنی مرکزی اور ریاستی قانون ساز مجلسوں میں معقول اور مؤثر شرکت اور . .

(۲) مُلازمتوں یا خدمتوں میں مُناسب نُمائندگی۔

دُوسری راہ کو ہم نے بے خبری اور بے عملی کے ہاتھوں کھویا۔ پہلی بے تنظیمی، بے دانشی اور خود غرض، بے بصر اور بے اثر رہنماؤں کے سائے میں ہم گنوا بیٹھے۔ ہم سے اتنا بھی نہ ہو سکا کہ ایک جگہ سے ایک معقول اُمیدوار کھڑا کرتے۔ کئی کئی اُمیدوار کھڑے کئے اور شکست کھائی۔ راقم کی نظر اس وقت انتخاب کے تین حلقوں پر ہے۔ تینوں اُتّر پردیش میں واقع ہیں۔ بہرائچ کے علاقے سے ڈاکٹر اخلاق الرحمٰن قدوائی چانسلر علی گڑھ مُسلم یونیورسٹی کھڑے ہوئے (ہم اس وقت اس بحث میں نہیں پڑیں گے کہ ایسا کرنا مسلم یونیورسٹی کے چانسلر کے شایانِ شان تھا بھی کہ نہیں) اسی حلقے کو عارف محمد خاں صاحب نے منتخب کیا کہ پہلے دو بار وہ اِس سے جیت چکے تھے۔ ووٹ بٹ گئے اور بھاجپا کا اُمیدوار ہمارے ان دو بلند قامتوں کو پراجیت کر کے ایوان میں داخل ہو گیا۔ ضلع بستی کے ڈومریا گنج حلقے سے محسنہ قدوائی صاحبہ اور سیما مُصطفےٰ صاحبہ نے اپنی باہمی نبرد آزمائی کے ذریعے دُوسروں کے لئے راہ صاف کر دی۔ بلند شہر ضلع سے تین مُسلمان اُمیدوار کھڑے ہوئے اور کوئی بیٹھنے پر راضی نہ ہُوا۔ مُمتاز محمد خاں — عرفان اللہ خاں — اور سرفراز خاں صاحبان۔ چنانچہ تینوں ہارے اور ماتھے پر خانہ جنگی کا کلنک الگ لگا لائے۔ تینوں حلقوں سے پہلے مُسلمان چُن کر آیا کرتے تھے۔

چناؤ میں مسلمانوں کی بدحالی اور بے ثمری کی ایک وجہ اور بھی ہے (اور اس کی اہمیت چُناؤ کے حدُود سے کہیں آگے تک جاتی ہے) انھوں نے بڑے اس سرمائے کو ضائع کر دیا جو عبارت ہے اکثریت کی طرف سے خیر اندیشی سے۔ اس بات سے بھی ہم اس وقت گزر جائیں گے کہ اس اہم پُونجی سے مُسلمانوں نے کس حد تک اپنے آپ کو محرُوم کیا، اور اس کو برباد کرنے میں ہندوؤں کا کتنا ہاتھ ہے، کہ یہ مسئلہ تفصیل چاہتا ہے۔ لیکن اس محرُومی اور ناداری

کو حاصل کرنے کے لئے جتنی مسلمانوں نے ضرور کئے۔ ذمہ داری میں کس کا حصہ کتنا ہے، اس کی تحقیق آگے چل کر مؤرخ کریں گے۔ راقم دو ایک مثالیں دے کر آگے بڑھ جائے گا۔ ہمیں شکایت ہے اور بجا طور پر شکایت ہے کہ سادھوی رتمبھرا اور شریمتی اُما بھارتی کی تقریروں کے کیسٹوں نے ہندوستان کے ایک سرے سے دوسرے سرے تک آگ لگا دی جس کا ایندھن مسلمانوں کو بننا تھا، لیکن اُن سے پہلے جن کیسٹوں کو ہم نے ہاتھوں ہاتھ لیا اور گوشِ دل سے سُنا، وہ کیا کم اشتعال انگیز تھے۔ اشتعال انگیزی کا یہ آگ لگانے والا اور باہمی خیر اندیشی کو بھسم کرنے والا سلسلہ شاید پہلی بار منظرِ عام پر اعظم گڑھ کے ایک مقرر کی تقریروں سے شروع ہوا۔ اُن کی زبان کی آگ تو بالآخر خود وشوناتھ پرتاپ سنگھ صاحب نے انھیں ایوانِ بالا میں لے کر بجھا دی۔ لیکن اُن کے نقشِ قدم پر چلنے والی دو ہندو خواتین نے جو فتنہ و فساد پھیلانے میں اُن سے بہت آگے بڑھ گئیں ہندوستان کی زمین کو مسلمانوں کے لئے تنگ کر دیا۔ یہاں ایک شخص کی عداوت زبان پر آئی تھی، وہاں یہ کام زبردست تنظیم کے ساتھ کیا گیا۔ نفرت پھیلانے، جذبات کو بھڑکانے ــ بھلمنساہت، شرافت اور خوش ہمسائگی کو تباہ کرنے کا کام خطیبوں نے بھی کیا اور خطیباؤں نے بھی۔ سوچئے کہ نقصان کس کا ہوا۔ نقصان کا حساب نہ معلوم کب تک چکانا پڑے گا۔

بمبئی میں شری بال ٹھاکرے نے شیو سینا قائم کی جو "غیر ملکی" کے خلاف تھی۔ لیکن مخالفت کی تان بالآخر مسلمانوں پر ٹوٹی۔ ہمارے جامع مسجد کے امام صاحب نے اس کے جواب میں "آدم سینا" بنانے کا اعلان کیا۔ آدم سینا اعلان سے آگے نہیں بڑھی (اور یہ اچھا ہی ہوا) لیکن اُن کے اعلان نے ہندوستان بھر کے ہندوؤں کو مسلمانوں کے عزائم کی طرف سے بے حد بدگمان کر دیا۔ اور جنگ کے لئے آمادہ۔

اگر اپنے دوسرے رہنماؤں کی بے بصری اور غیر ذمہ داری کا تذکرہ کیا جائے تو بات آگے بڑھ جائے گی۔ کہنا یہ ہے کہ ہمیں اس بات پر کفِ افسوس نہ ملنا چاہئے کہ مسلمانوں نے کسی فتوے کے تحت جنتا دل کو بھی بڑی تعداد میں ووٹ دے دیئے اور اس سے بھارتیہ جنتا پارٹی کی بن آئی۔ اور کانگریس کو تھوڑا اکثریت نہیں مل پائی ـــــ! کانگریس ہو یا کوئی دوسری پارٹی، مسلمانوں نے اس کے حق میں خطِ غلامی تو لکھا نہیں ہے۔ ایک عام چناؤ سے دُنیا کا خاتمہ تو نہیں ہوتا۔ مسلمانوں کو چاہئے کہ بیٹھ کر ٹھنڈے دل سے نفع نقصان کا جائزہ لیں۔ پارٹیوں کے طرزِ عمل اور ان کے سربراہوں کی نیت کو پرکھیں۔ یہ بھی سوچیں کہ ان کا فطری الحاق کن طبقوں کے ساتھ ہونا چاہیئے۔

سیاسی پارٹیوں کو دوست اور دشمن کے خانے میں رکھ دینا، ایک کے آگے سر جھکانا اور دوسرے کو پیٹھ دکھانا ہوش مندی اور مصلحت کے خلاف ہے۔ راقم کی اپنی رائے یہ ہے کہ مسلمانوں کو ترقی پسند سیکولر اور پیش رفت آمادہ اور مظلوم دوست سیاسی پارٹیوں کی طرف ایک موٹے اصول کے طور پر تعاون کا ہاتھ بڑھانا چاہیئے لیکن وہ یہ بھی کہنا چاہتے ہیں کہ انھیں ہندو انتہا پسند پارٹی بھاجپا سے بھی بات کرنی چاہیئے۔ اور اپنی صورتِ حالات اور اپنی طرزِ فکر اور اپنے رُخ سے آگاہ کرنا چاہیئے۔ سُلجھے ہوئے اور قائل کرنے کے انداز میں۔

یو پی کابینہ جب گیروے کپڑے پہن کر ایودھیا جے سری رام کے نعرے لگاتی ہوئی گئی تو راقم کو تشویش نہیں ہوئی بلکہ گونہ اطمینان ہوا کہ ہاتھی کے دکھانے والے دانت ہیں۔ اُن کی نمائش وہ اپنے بھکتوں (ووٹروں) کی تالیفِ قلوب کے لئے کر رہا ہے۔ کانگریس کوئی ٹکسال نہیں ہے کہ اس کے باہر ساری پارٹیاں بدرنگ بھی جائیں۔ جسے ہم دشمن سمجھتے ہیں، اُسے دشمنی میں پختہ کرنے کے بجائے کیا ہوشمندی کا تقاضا یہ نہیں ہے کہ اس کی غلط فہمیاں دور کی جائیں اور اس کو اگر دوست بنانے کی کوششیں ناکام ہوتی ہیں تو بھی اس کی دشمنی کی دھار کو قریب جا کر کند ضرور کیا جائے۔

بعض لوگ بہت ملول نظر آتے ہیں کہ چناؤ میں مسلمانوں کی عاقبت فراموشی نے انہیں کہیں کا نہ رکھا۔ کانگریس کے معتقد کہہ رہے ہیں کہ کانگریس کا ساتھ چھوڑ کر مسلمانوں نے اپنی عاقبت خراب کر لی۔ وہ بکھر گئے۔ بے وزن ہو گئے۔ اس بات پر زیادہ ملال کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔ ایسا اونچ نیچ تو ہوتے ہی رہتے ہیں۔ پہلے ہمیں ان نام نہاد رہنماؤں سے بھی بات کرنی چاہیئے جنھوں نے ہماری راہ گم کی۔ اپنی ذاتی اغراض اور انا کی خاطر جنھوں نے ہم سے ہر موڑ پر غلط قدم اُٹھوائے۔ اس میں بابری مسجد ایکشن کمیٹیوں کے بیشتر سربراہ بھی شامل ہیں۔ اور وہ لوگ بھی جو اپنی انا کی تسکین اور اپنی شخصیت کی توسیع کے لئے پارٹیاں بناتے ہیں اور حسبِ مصلحت اُن کو دفن بھی کر دیتے ہیں۔ اور جن لوگوں نے فرقوں کو ایک دوسرے کے خلاف بھڑکایا ہے، وہ لوگ جو سمجھتے ہیں کہ ملت اُن کے ہاتھوں میں کھلونے کی حیثیت رکھتی ہے۔ وہ اس سے کھیلتے رہتے ہیں، اتنی ہی ذمہ داری کے ساتھ جیسے بچے کھلونوں سے کھیلتے ہیں۔ وہ اسے توڑ بھی دیتے ہیں۔ اگر ہم نے اپنے رہنماؤں سے احتساب نہیں کیا، تو ہمیں ہمیشہ اسی قسم کے رہنما ملتے رہیں گے۔

تنظیم کے بغیر کوئی اجتماعی کام نہ کبھی ہوا ہے اور نہ اب ہو سکتا ہے۔ اس وقت ہم لوگ ہر اُس کام کو جس کا فائدہ ہماری ذات تک محدود نہیں ہے بیکار کا دردِ سر اور بیگار سمجھتے ہیں۔ ہم کسی اجتماعی کام کے لئے بہت مشکل سے تیار ہوتے ہیں۔ ہمیں اجتماعی کام کے لئے تیار ہونا پڑے گا۔ اگر ہم نے اجتماعی کام کی مدد روپے اور وقت سے نہ کی تو کون کرے گا! ہم اگر یہ کر لیں تو پھر نہ چناؤ کے نتائج سے گھبرانے کی ضرورت ہے، نہ اپنے رہنماؤں کی حیرت انگیز خود غرضی اور ملت فراموشی سے۔ جہالت اور انتشار دور کرنے میں لگ جایئے، سیاست خود بخود آپ سے حلقہ بگوش ہو جائے گی۔ جو لوگ ہوش و گوش اور بھلے بُرے کی تمیز رکھتے ہیں دُنیا اُن کی قدر کرتی ہے اور انھیں سبز باغ دکھانے یا نظرانداز کرنے کی جرأت نہیں کرتی۔

— —

راجیو گاندھی

یادیں اور تأثرات

ڈاکٹر ہاشم قدوائی

عظیم المرتبت رہنما راجیو گاندھی سے، جن کی بیش بہا جان فسطائی قوتوں کی سازش سے ملک کے اتحاد و سالمیت و مذہبی رواداری اور سیکولرزم اور جمہوریت کی بقا کے جرم میں بربریت اور سفاکیت کا نشانہ بنی ہے، راقم الحروف کا گہرا اور قریبی رابطہ تقریباً سات سال کا رہا۔ اس مدت میں ان سے درجنوں ملاقاتیں رہیں۔ مختلف ملکی اور ملی مسئلوں پر ان سے خط و کتابت رہی اور اس محبوب و مدبر رہنما نے ہمیشہ بڑی توجہ سے راقم الحروف کی باتوں کو سنا اور خطوں اور مراسلوں کا پابندی سے جواب دیا۔ ہر ملاقات میں انھوں نے ہمیشہ مسکراتے ہوئے استقبال کیا۔ کیا معلوم تھا کہ ۲۱ مئی کی رات کو یہ مسکراتا ہوا چہرہ ہمیشہ ہمیشہ کے لئے جدا ہو جائے گا اور کبھی بھی نہ دیکھنے کو ملے گا۔

راجیو جی جس زمانے میں وزیر اعظم رہے اور جس زمانے میں وہ اس عہدے پر نہیں رہے، مشہور قومی رہنما رفیع احمد قدوائی صاحب (جن سے راقم الحروف کا بڑا گہرا اور قریبی تعلق تھا) کی طرح اسی بشاشت سے روزانہ سینکڑوں لوگوں سے ملتے رہے۔ کبھی ان کے چہرے پر شکن نہیں دیکھی۔ لوگ ہر قسم کے کام لے کر آتے تھے اور وہ ان کی میٹھی زبان سے مطمئن ہو کر جاتے تھے۔

جس وقت کلام پاک کے خلاف ایک بدبخت نے کلکتہ ہائی کورٹ میں ایک رٹ دائر کی کہ اسے ضبط کر لیا جائے اور مسلم کانگریسی ممبرانِ پارلیمنٹ کے ساتھ راقم الحروف راجیو گاندھی صاحب سے ملا تو انھوں نے ہم لوگوں کے احساسات کی پوری تائید کی اور بتایا کہ وہ خود مرکزی حکومت کے سالیسٹر جنرل کو کلکتہ بھیج رہے ہیں اور مغربی بنگال کے وزیر اعلیٰ سے وہ اس بارے میں بات کر چکے ہیں۔ اور غالباً دوسرے ہی دن یہ رٹ خارج کر دی گئی۔

اسی طرح ایک ملاقات میں مسلم مسائل خاص کر سرکاری ملازمتوں اور پبلک سیکٹر میں مسلمانوں کو معقول حصہ نہ دیے جانے کی شکایت اور اردو کو یو۔ پی اور دوسری ریاستوں کی دوسری سرکاری زبان بنانے کے مطالبے پر انھوں نے کھل کر یقین دلایا کہ وہ ان تمام مسئلوں کو حل کر کے مسلمانوں کی بے چینی اور بے اطمینانی کو دور کرنا چاہتے ہیں۔ اور اس سلسلے میں انھوں نے وزیر اعلیٰ کے پندرہ نکاتی پروگرام کی پیش رفت کا خاص طور سے ذکر کیا، اور راقم الحروف سے یہ بھی کہا کہ سب سے زیادہ ضرورت اس کے دیکھنے کی ہے کہ عملی سطح پر کہاں تک اس پروگرام پر عمل ہو رہا ہے۔ اسی طرح فسادات کے بارے میں بھی ان سے متعدد بار گفتگو ہوئی اور انھوں نے ان فسادات پر نہ صرف گہری تشویش کا اظہار کیا بلکہ انتظامی مشینری کے ناکارہ پن کا بھی اعتراف کیا۔ اور اس کا بھی کہ اگر صحیح ذہن والے لوگ ایڈمنسٹریشن میں ہوں اور ان پر ریاستی حکومتوں کا مؤثر کنٹرول ہو تو وہ زیادتیاں اور مظالم نہ ہوں جن کی عام طور سے شکایت رہتی ہے۔

چنانچہ نومبر میں جب آندھرا اور کرناٹک میں فساد ہوئے تو انھوں نے ان دونوں ریاستوں کے وزرائے اعلیٰ کو مستعفی ہونے پر مجبور کیا، اس بنیاد پر کہ ریاست میں امن و امان قائم رکھنا وزیر اعلیٰ کی ذمہ داری ہے ــــــ! اگر وہ زندہ رہ جاتے تو کانگریس الیکشن مینی فیسٹو میں فسادات کے سدِ باب کیلئے جن اقدامات کا وعدہ کیا گیا ہے، انھیں وہ پہلی فرصت میں عملی جامہ پہنانے۔

اُن کی وزارتِ عظمیٰ کے دوران ایک سازش یا منصوبہ بنایا گیا کہ مسلم یونیورسٹی کے اقلیتی کردار کو، جسے مسز اندرا گاندھی نے تسلیم کر لیا تھا، عملاً ختم کر دیا جائے اور کورٹ کو، جو یونیورسٹی کی سپریم گورننگ باڈی ہے، معطل بنا دیا جائے۔ اس سازش میں مرکزی محکمۂ تعلیمات کے بڑے افسر اور بعد وکریٹ وائس چانسلر شامل تھے۔ لیکن جب راجیو جی کو اس بارے میں راقم الستطور نے بتایا تو جولائی ۱۹۸۹ء میں ۲۳ مہینے کے بعد کورٹ کی میٹنگ ہوئی اور اس میں انتخابات ہوئے جس میں اقلیتی کردار کے مخالفوں کو زبردست زک اٹھانی پڑی۔

راجیو جی بڑے معاملہ فہم تھے۔ منٹوں میں وہ معاملے کی تہہ تک پہنچ جاتے تھے۔ راجیہ سبھا میں متعدد بار ایسا ہوا کہ انھوں نے اپوزیشن لیڈروں کے حملوں اور اعتراضات کا جواب بڑے مسکت انداز میں دیا۔ حاضر جوابی میں وہ اپنا جواب نہیں رکھتے تھے اور راجیہ سبھا میں متعدد بار انھوں نے برجستہ جواب سے اپنے معترضین کو لاجواب کر دیا۔ جس مسئلے پر بھی وہ بولتے تھے، پوری تیاری کے ساتھ بولتے تھے۔ اور تقریر کے دوران جب دوسری پارٹیوں کے ممبر انھیں ٹوکتے تھے تو وہ اُن کو دنداں شکن جواب دیتے تھے۔

جب سپریم کورٹ نے شاہ بانو کیس کے بارے میں فیصلہ دیا تو مسلمان بہت مضطرب ہوئے اور جولائی ۱۹۸۵ء میں جب مانسون سیشن شروع ہوا اور جناب بنات والا صاحب نے اس مضمون کا بل پیش کیا کہ مسلمانوں کو ضابطۂ فوجداری کی متعلقہ دفعہ سے مستثنیٰ کر دیا جائے تو راجیو جی نے کانگریس کے مسلم ممبران پارلیمنٹ کو فرداً فرداً بلایا۔ اور نوٹلے وار صاحب نے ہر ممبر سے اُس کی رائے شاہ بانو کیس کے فیصلے، مسلم پرسنل لا اور بنات والا کے بل کے بارے میں دریافت کی۔ اور ممبروں کا تقریباً اس پر اجماع تھا کہ حکومت شریعتِ مطہرہ کے اصولوں پر مبنی ایک بل پارلیمنٹ میں لائے۔ دوسرے دن مسز نجمہ ہبت اللہ کی قیادت میں ۲۲ مسلم کانگریس ممبران پارلیمنٹ اس بارے میں راجیو جی سے ملے اور ان سے یہی مطالبہ دوہرایا۔ راجیو جی نے ہم لوگوں سے ایک ڈرافٹ پیش کرنے کو کہا تاکہ وزارتِ قانون اس کا پوری طرح سے مطالعہ کرے اور اس کے بعد قانون کا مسودہ بنائے۔ مسلم پرسنل لا بورڈ نے بھی اس قسم کا ڈرافٹ راجیو جی کے سامنے پیش کیا۔ بورڈ کے ذمہ دار حضرات ــــــ کی قیادت میں راجیو جی سے ملے اور ان سے بڑی ہی مفصل گفتگو رہی۔ بالآخر مئی ۱۹۸۶ء میں پارلیمنٹ سے مسلم مطلقہ خواتین بل پاس ہوا۔ راجیو جی نے بڑی پامردی اور استقامت سے اس بل کو پاس کرایا اور زبردست مخالفت کے باوجود اپنے موقف پر اٹل رہے۔ کانگریس پارلیمنٹری پارٹی ان کی اس موضوع پر بڑی ہی جامع اور مدلل تقریر ہوئی جس میں انھوں نے کہا کہ اسلام نے عورتوں کو انتہائی منصفانہ پوزیشن عطا کی ہے۔ انھوں نے اس فسطائی تجویز کو مسترد کر دیا کہ ایک مشترکہ یا یکساں سِول کوڈ نافذ کیا جائے۔ انھوں نے کہا کہ یہ ہمارے ملک کی قیمتی روایتوں اور عظیم مشترک کلچر کے بالکل منافی ہوگا۔ ہمارے ملک کا امتیازی طُرّہ یہ رہا ہے کہ یہ مختلف مذہبوں اور تہذیبوں کا گہوارہ رہا ہے اور یہ سب تہذیبیں اور مذاہب برابر پھلتے پھولتے رہے۔ راجیو گاندھی نے گاندھی جی کے راستے پر چل کر مسلمانوں کے اس خالص مذہبی مسئلے کو کانگریس اور پارلیمنٹ سے منظور کرایا۔ لیکن اس کے باوجود یہ بے بصیرتی کی انتہا ہے کہ مسلمانوں کا مسیحا ایک دوسری سیاسی شخصیت کو ٹھہرایا جائے۔

راقم الستطور کے مراسلے مختلف ملکی، ملی اور سیاسی مسئلوں پر انگریزی اخباروں میں شائع ہوتے رہتے تھے اور ان مراسلوں کے تراشے بڑی پابندی سے میں راجیو جی کی خدمت میں مع اپنے مختصر خط کے بھیجا کرتا تھا۔ وہ بڑی پابندی سے اس کی رسید اور بسا اوقات اس پر اپنی رائے کا اظہار کر کے راقم الستطور کو بھیجتے تھے۔

کانگریس کے تنظیمی امور کے بارے میں راقم الستطور نے زبانی بھی گفتگو کی اور کچھ تجویزیں بھی اُن کی خدمت میں بھیجیں۔ اس پر انھوں نے بڑی سنجیدگی سے غور کیا اور بعض تجویزوں سے اتفاق کیا۔

وزارتِ عظمیٰ کے زمانے میں بھی اور وزارتِ عظمیٰ کے بعد بھی وہ رمضان المبارک میں دعوتِ افطار کا اہتمام کرتے تھے اور مسلمانوں کا استقبال اپنی دلکش اور مخصوص مسکراہٹ سے کرتے تھے۔

اُن کا بڑا ہی درد مند دل تھا۔ کسی کو وہ تکلیف میں نہیں دیکھ سکتے تھے۔ کانگریس پارٹی کے کارکنوں کی مصیبتوں اور دکھوں کو وہ خوب سمجھتے تھے اور اُن کی امکانی مدد کرتے تھے۔ راقم الستطور کو اس کا بخوبی علم ہے کہ انھوں نے کس طرح پریشان حال کانگریس کارکنوں کی مدد کی۔ پچھلی گرمی میں ایک کانگریسی کارکن کی بیوی کو کینسر ہو گیا تھا۔ میں نے اس بارے میں راجیو جی کو لکھا اور انھوں نے ایک معقول رقم کا ڈرافٹ علاج کی غرض سے بھجوا دیا۔

وہ رواداری، وضع داری، بیش بہا گنگا جمنی کلچر، شائستگی، شرافت، بے خوفی اور دلیری کا مجسمہ تھے۔ انھوں نے اپنے جلیل المرتبت نانا پنڈت جواہر لال نہرو اور عظیم قائد اپنی ماں شریمتی اندرا گاندھی کی روایتوں اور طور طریقوں کو اپنا لیا تھا۔ اُن کی زندگی کا ایک ایک لمحہ ملک اور قوم کی خدمت کے لئے وقف تھا۔ وہ رات دن اسی اُدھیڑ بُن میں رہتے تھے کہ ملک ترقی کر کے آگے بڑھے۔ اس کی مفلسی اور نکبت دور ہو۔ وہ معاشی اور صنعتی اعتبار سے مضبوط ہو، جمہوریت اور سیکولرازم مستحکم سے مستحکم تر ہو اور سیاسی طور

ے مستحکم ہو۔ وہ ان تمام قوتوں، جو ملک کو ذات
ت اور فرقہ وارانہ فسطائیت یا علاقائیت کے نام
پارہ پارہ کرنا چاہتی تھیں، کے خلاف پوری قوت
ے آخر دم تک نبرد آزما رہے۔ وہ سامراجی طاقتوں

کے زبردست مخالف تھے اور بالآخر انہی طاقتوں
کی سازش سے ان کی جان گئی۔ وہ اپنے عدیم المثال
اور تاریخ ساز کارناموں سے زندۂ جاوید ہیں گے
گو ملک کی بدقسمتی تھی کہ ابھی وہ پورے ۴۷ سال کے

بھی نہ تھے کہ ملک ان کی مدبرانہ قیادت سے محروم
ہو گیا۔

مراسلات صاف اور خوشخط لکھیں۔

راجیو گاندھی کے قتل سے متاثر ہو کر

شکیل گیاوی

اکیس مئی ۱۹۹۱ء

کتنی درد انگیز وہ اکیس مئی کی رات تھی
آنسوؤں کی کوچہ و بازار میں برسات تھی
پیکر آفات تھی یا شورش ظلمات تھی
ہر خبر مسموم، زہر آلود ہر اک بات تھی
اشک ابلے پڑتے تھے پُرسوز شہنائی کے بعد
پاؤں جیسے بھیگ جائیں آبلہ پائی کے بعد
لے رہا تھا موسم رنگیں ابھی انگڑائیاں
راز تھیں بحر سیاست کی ابھی گہرائیاں
دفعتاً تیری جدائی دے گئی تنہائیاں
زہر میں ڈوبی ہوئی یہ موت کی شہنائیاں
کان سنتے ہیں مگر دل کو یقیں آتا نہیں
دیر تک پانی میں سبزہ جیسے مُرجھاتا نہیں
کانگرس کے راہبر اور ہند کے جاہ و جلال
خاندان نہرو کے روشن چراغ باکمال
کیا بتائیں کتنا ہے تیری جدائی کا ملال
دے رہا ہوں خود جواب اور کر رہا ہوں خود سوال
مدتوں گونجے گی ہر محفل میں تیری ہی صدا
تو جدا ہو کے بھی ہم سے ہو نہیں سکتا جدا

محمد علی مرج

ایک نظم

یہ دمکتی ہوئی صبحیں
یہ مچلتی شامیں
یہ مہکتی راتیں
کبھی سایہ تو کبھی دھوپ لٹاتے ہوئے دن
یہ بہتے ہوئے دریا
یہ چمن زار
یہ برفیلے پہاڑ
کھیت، کھلیان
یہ چڑیا ہے
یہ بازاروں کا حسن
کس کو بھائے
کہ کس سے
بتائے کس کو
عرصۂ دہر میں
انساں کا مقدم ہے وجود

حُسنِ اِصلاح

ڈاکٹر زارؔ علامی

بلبیر چند ارشدؔ جلال آبادی ،

بیناگر پیپر مل میں ایک ذمہ دار عہدے پر کام کر رہے ہیں۔ شعر بچپن سے کہتے ہیں۔ اُردو زبان سے والہانہ لگاؤ ہے۔ ادیب فاضل ہیں۔ صنائع و بدائع پر خاص نظر رکھتے ہیں۔ دو شعری مجموعے زیورِ طباعت سے آراستہ ہو کر منظرِ عام پر آ چکے ہیں۔ کئی نظمیں روسی زبان میں ترجمہ ہو چکی ہیں۔ عمر تقریباً ۵۲ برس۔ وضع دار اور خلیق انسان ہیں۔ بیناگر آرٹ ایسوسی ایشن ان کے اعزاز میں ارشد نائٹ کا اہتمام کر چکی ہے جو نہایت کامیاب تقریب تھی۔ ارشد بیناگر کے نہایت ہردلعزیز شاعر ہیں۔ میری ذات سے والہانہ محبت رکھتے ہیں۔

شعرِ ارشدؔ ؎

شمع کی آغوش میں خاموش پروانہ ہُوا

جس کا عنواں عاشقی تھا ختم افسانہ ہُوا

اصلاحِ زارؔ ؎

شمع کے آغوش ..... علی حال

دھوم تھی جس کی بہت وہ ختم افسانہ ہُوا

توجیہ:-

"آغوش" کو مذکر ہی لکھنا چاہیئے۔ "خاموش" کے پیشِ نظر یہی مناسب تھا کہ دوسرے مصرعے میں "دھوم" رکھا جائے۔ شعریت کا تقاضا بھی یہی تھا۔

- - - - - -

شعرِ ارشدؔ ؎

اپنے گیتوں میں مرا نام لیا ہے تم نے

یوں بھی اکثر مجھے بدنام کیا ہے تم نے

اصلاحِ زارؔ ؎

اپنے گیتوں میں ..... تُو نے

شکریہ یوں تو مجھے یاد کیا ہے تُو نے

توجیہ:-

گیت وہ صنف ہے جس کا روح سے براہِ راست تعلق ہے۔ اس کی تخلیق میں جذبات کارفرما ہوتے ہیں۔ اگر کوئی محبوب اپنے گیتوں میں اپنے چاہنے والے کا نام لیتا ہے تو عاشق اُس پر ہمیشہ فخر کرتا ہے۔ فرطِ محبت کے سبب وہ "بدنامی" کی بات سوچ بھی نہیں سکتا۔ اگر کوئی عاشق ایسا سمجھتا ہے تو محبوب کے جذبات کی توہین کرتا ہے۔ ردیف "تم نے" کی بجائے "تُو نے" زیادہ مناسب ہے۔ اس لئے کہ اس میں موسیقیت زیادہ کارفرما ہے۔ تم اور تُو میں یہ موسیقیت کا فرق 'تُو' میں حرفِ علت 'و' کے آنے کے سبب ہُوا۔ 'تم' میں "ت" اور "م" دونوں حروف حروفِ صحیح ہیں۔

- - - - - -

شعرِ ارشدؔ ؎

تو ذکر عہدِ وفا چھوڑ کے تنہا مجھ کو

جو کیا تم نے بہت خوب کیا ہے تم نے

اصلاحِ زارؔ:-

تو نے کر . . . . . علیٰ حال

اے ستم کیش بہت خوب کیا ہے تو نے

توجیہ:-

دوسرے مصرعے میں زمانوں کا فرق بھی تھا اور تکرار بھی۔

- - - - - - -

شعرِ ارشد:-

جسے کسی کی محبت کا کچھ بھی پاس نہیں

زمانہ سانپ ہے وہ مطلبی حساس نہیں

اصلاحِ زار:-

جسے . . . علیٰ حال

زمانہ سانپ ہے وہ قابلِ سپاس نہیں

توجیہ:-

دوسرے مصرعے میں زوائد و حشویں کے علاوہ "حساس" استعمال غلط ہے۔ صحیح لفظ "حسّاس" مع تشدید ہے۔ اصلاح سے قوافی میں صنعتِ تجنیسِ زائد کے سبب مطلع کی شان ہی کچھ اور ہو گئی ہے۔

- - - - - - -

شعرِ ارشد:-

عروس وقت کے گیسو بھی ہم سنوار دیں گے

ابھی حیات کا ماحول ہم کو راس نہیں

اصلاحِ زار:-

عروس . . . . . علیٰ حال

ابھی زمانے کا ماحول ہم کو راس نہیں

توجیہ:

"وقت" کی مناسبت سے "زمانہ" ہی مناسب تھا۔

- - - - - - -

شعرِ ارشد:-

دل میں جب یاد تری آئی تو پیہم آئی

اشک آئے فوراً آنکھ میں پیہم آئے

اصلاحِ زار:-

دل میں جب یاد تری آئی تو آتی ہی گئی

- - - - - - علیٰ حال

توجیہ:-

"پیہم" کی تکرار موجبِ کراہت۔

- - - - - - -

شعرِ ارشد:-

اپنا بنا کے ترکِ محبت نہ کیجئے

برباد زندگانی کی جنت نہ کیجئے

اصلاحِ زار:-

اپنا . . . . . . علیٰ حال

برباد میری زیست کی جنت نہ کیجئے

توجیہ:-

شعر میں کئی کمزوریاں تھیں۔ "زندگانی" کی "یائے" ساقط کرنا اچھا نہیں۔ شعر سے یہ پتہ نہیں چلتا کہ کس کی زندگانی کی بات ہو رہی ہے اور کسے اپنایا جا رہا ہے۔ اصلاح سے شعر میں کسی قسم کا الجھاؤ نہیں رہا۔

- - - - - - -

شعرِ ارشد:-

یا کسی بدمست کی کاکل ہے بل کھائی ہوئی

یا ہماری ہی فغاں ہے یہ گھٹا برسات کی

اصلاحِ زار:-

یا کسی . . . . . . علیٰ حال

یا ہماری آہِ پُرنم ہے گھٹا برسات کی

توجیہ:-

"گھٹا" کا وجود قائم کرنے کے لئے "دھواں" ضروری تھا۔ اصلاح سے زوائد بھی نکل گئے۔ "آہِ پُرنم" سے "برسات کی گھٹا" کے جواز کی صورت بھی نکلتی ہے۔

- - - - - - - -

شعرِ ارشد:-

ان آنسوؤں کا بھی لذت شناس ہوں یارو

بجھائی جا نہ سکے گی وہ پیاس ہوں یارو

اصلاحِ زار:-

کہ ایک اشک کا لذت شناس ہوں یارو

مگر جو بجھ نہ سکے گی وہ پیاس ہوں یارو

توجیہ:-

"ان اشکوں" کی کوئی وضاحت نہیں۔

- - - - - - -

شعرِ ارشد:-

جگہ جگہ پہ ہیں پیوند نامرادی کے

میں اپنے دور کا ایسا لباس ہوں یارو

اصلاحِ زار:-

گلی گلی میں ہیں پیوند نامرادی کے

میں اس زمانے کا ایسا لباس ہوں یارو

توجیہ:-

"کہاں کہاں" "وہاں وہاں" "جگہ جگہ" اس قسم کے الفاظ کے بعد "پہ" نہیں لانا چاہئے۔ "اس زمانے" سے شعر بلند ہو گیا۔

- - - - - - - -

شعرِ ارشد:-

یہ میری خوبیٔ تقدیر و خوش نصیبی ہے

تمہارے دل کے اگر آس پاس ہوں یارو

اصلاحِ زار:-

یہ میری خوبیٔ تقدیر کا کرشمہ ہے

کسی کے دل کے اگر آس پاس ہوں یارو

توجیہ:-

خوبیٔ تقدیر اور خوش نصیبی ایک ہی چیز ہے لہٰذا ایک حشو۔

گزشتہ سے پیوستہ

خوف کی نگری

اختر جمال

نامہ نگار بولی "اے لوگو، اب بھی وقت ہے اپنے اپنے پتھر اُٹھالو خوف سے آزاد ہو جاؤ۔ سنو، ضمیر اندھے کنویں میں ڈال کر کیا تم اہلِ قلم کہلاتے ہیں؟"

اس نے محفل سے باہر آکر ایک شخص سے پوچھا "کیا تمہارے ہاں چڑیاں طوطے، مینائیں، فاختائیں اور بلبلیں نہیں ہیں؟"

ایک آدمی بولا "سب خوف کی نگری چھوڑ کر چلی گئیں۔ انھیں یہاں کی فضا میں سانس لینا راس نہیں آتا۔ جو نہ جا سکیں وہ قید ہیں۔"

"تمہاری محفلوں میں کوّے، گدھ، چوہے، لومڑیاں اور گائے بیل ہی نظر آرہے ہیں۔ تم نے قلم کی حرمت کھودی ہے۔"

جب وہ اور آگے گئی تو اسے ایک سیاسی جلسہ نظر آیا۔ ایک شخص نے بتایا کہ کالے دیو کی اجازت لے کر کچھ لوگ ایک جگہ جمع ہوئے ہیں۔ اُس کی اجازت کے بغیر لوگ یکجا نہیں ہو سکتے ـــــ"

نامہ نگار نے وہاں جاکر تصاویر اُتاریں تو اُن سے تصاویر میں گیدڑ، خرگوش تھے اور اسٹیج پر ایک اودبلاؤ کھڑا نظر آیا۔ مجمع میں بھیڑ بکریاں اور بیل گھوڑے گدھے سب ہی شامل تھے۔ لومڑیاں اسٹیج پر انتظام کر رہی تھیں۔ نامہ نگار نے کہا "لوگو، یہ تصویر دیکھو۔"

اُن میں ایک شخص چلّا کر بولا "یہ اجنبی عورت ہمارے اسٹیج پر آکر جانوروں کی تصویریں دکھا رہی ہے۔ یہ کس کی اجازت لے کر آئی ہے۔"

نامہ نگار نے کہا۔ "سُنو یہ تمہاری تصویریں ہیں" اُنھوں نے اُسے مارنے کے لئے ہاتھوں میں پتھر اُٹھالئے۔ وہ پتھر اُن کے پاس پہلے سے تھے۔ وہ کسی موقعہ پر جلسہ گاہ میں سے ایک ذاکر کو مارنے کے لئے لائے تھے۔ دریوں کے فرش پر اُنھیں پتھر نہ مل سکتے تھے۔

نامہ نگار کے چاروں طرف سے پتھر گزر گئے مگر اُس کے جسم کو کوئی پتھر چھو نہ سکا۔

وہ آگے چلی تو سُنا کہ اعلیٰ حکام کی ایک دعوت ہے۔ وہاں جاکر اُس نے تصاویر اتاریں تو جونکیں نظر آئیں۔ جونکیں خون پی پی کر سست اور موٹی ہو گئی تھیں۔

نامہ نگار نے اُن کو تصویر دکھا کر کہا "تم دھرتی ماں کا خون پی رہے ہو۔"

ایک شخص نے گردن اکڑا کر کہا۔ "یہ کون عورت ہے؟ کس گریڈ کی ہے؟ اسے یہ نہیں معلوم کہ یہ براہِ راست ہم سے مخاطب نہیں ہو سکتی۔ اگر اسے کچھ کہنا ہے تو اپنی درخواست صحیح ضابطے کے تحت روانہ کرے۔

تب نامہ نگار کو معلوم ہوا کہ ان جونکوں سے براہ راست بات کرنا ضابطہ کی خلاف ورزی ہے۔ یہ بہت اعلیٰ مراتب کے لوگ ہیں۔ اس لئے کہ

انھوں نے دھرتی ماں کا خون پیا ہے اور اتنا پیا ہے کہ اب ان کی دھرتی کی رگیں خشک ہو گئی ہیں اور ان کے پیٹ میں دکھ بیماری، بھوک کا بسیرا ہے۔ یہاں لوگوں کی آنکھیں بکتی ہیں، دل و دماغ اور آنکھیں سارا وجود کالے دیو کا ہے۔ اس کی خوشنودی حاصل کرکے اب یہ اس منزل میں ہیں جہاں ان کی سوچ، نظر، خیال اور تمنا وہی ہے جو کالے دیو کی ہے۔ اور کالا دیو آئین کی پھانسی کے بعد فوراً ہی ان کی ضیافت میں شریک ہونے آیا ہے اور انھیں اس نے ہدایات دی ہیں کہ ساری دنیا کو آئین کی پھانسی کی اطلاع کس طریقے سے دینا چاہیئے۔ اب ضیافت ختم ہو چکی ہے۔ کالا دیو جا چکا ہے اور یہ سب بھی رخصت ہونے والے ہیں۔ مگر وہ چند لوگ جو سیر نہیں ہوئے اور جن کی اشتہا لاعلاج ہے۔ اب تک کرسیوں پر بیٹھے ہیں۔

ایک شخص نے کہا "یہ معلوم کرو کہ اس عورت کو اندر کس نے آنے دیا۔"

ایک شخص اس کے آگے جھک کر بولا "حضور ہم سمجھے دعوت کی تصویر لینے کے لئے اسے بلایا تھا"

"دعوت کی تصویر لینے سرکاری فوٹوگرافر آتا ہے۔ وہ تصویر لے کر جا چکا ہے۔ آج رات وہ تصویر ٹی۔وی پر دکھائی جائے گی۔"

دوبارہ میز لگائی گئی۔ وہ سب لوگ جن کی اشتہا لاعلاج تھی پھر کھانے بیٹھ گئے۔

ایک شخص نے کہا "تمہارا یہ کیمرہ تو بڑا عجیب ہے۔ اگر تم یہ مجھے دیدو تو تمہیں کوئی سزا نہیں ملے گی۔"

نامہ نگار نے ان کو کھاتے ہوئے دیکھ کر ایک تصویر اتاری تو میز پر ڈشوں کے بجائے غلاظت کے ڈھیر تھے جن کو بڑی بڑی تھوتھنیوں والے سور چاٹ رہے تھے۔ وہ شخص غصے سے میز پر سے اٹھا اور بولا "تو نے بغیر اجازت تصویر کیوں اتاری ہے؟"

نامہ نگار نے تصویر ان سب کو دکھائی اور بولی "تم رشوت خور لوگ ہو۔ تمہارے پیٹ سب سے بھاری ہیں۔"

ایک شخص نے کہا "اب اس عورت کو سزا دینی ہوگی۔ پولیس کو اطلاع دی جائے۔"

نامہ نگار بولی "اے لوگو تمہارے وزنی پیٹ قیامت کے دن تمہاری گردنوں میں طوق بن جائیں گے۔ اب بھی وقت ہے۔"

ماتحت حکام اور سب اہلکاروں کی بھوک بڑھتی ہی جاتی تھی، کالے دیو کا بچا کھچا کھا کر سیر ہوئے تھے، غصے کے مارے کھڑے ہو گئے۔

نامہ نگار نے کہا "تمہارے قانون مجھ پر لاگو نہیں ہوتے۔ تمہاری حراست سے میں نہیں ڈرتی۔ اگر تم نے میرے خلاف زبان کھولی تو تمہارے باطن کی تصویر خود تمہاری سزا کا جیتا جاگتا ثبوت موجود ہے۔" وہ سہم کر خاموش کھڑے رہ گئے۔

نامہ نگار وہاں سے رخصت ہو کر سوچنے لگی کہ سب لوگوں کی تصاویر اتار چکی ہے۔ اب ایک کالا دیو ہی باقی رہ گیا ہے۔ اس کی تصویر اتار کر اس کی حقیقت پر سے بھی پردہ اٹھانا چاہیئے۔ اور کالے دیو کی تصویر دکھا کر ہی لوگوں کو خوف سے نجات دلائی جا سکتی ہے۔ لیکن دیو کے لاکھوں محافظ تصویر کھینچنے میں حائل تھے۔ قدم قدم پر پہرہ تھا۔ اس نے سوچا سب کی دہشت جس کے دل میں ہے وہ کالا دیو آخر کیا چیز ہے۔ اس کی اصلیت جاننے کو وہ بیتاب تھی۔ پھر اس نے سوچا کہ وہ کالا دیو جس سے سب ڈرتے ہیں، کس سے ڈرتا ہے جو اتنے پہروں میں رہتا ہے اور جسے اتنے محافظوں کی ضرورت ہے۔ اس نے سوچا ظالم کو بھی مظلوم کا خوف ہوتا ہے۔؟

ایک دن اسے معلوم ہوا کہ کالے دیو کے محل میں ایک بڑی ضیافت ہو رہی ہے۔ اس ضیافت میں شریک ہونے کے لئے خوف کی نگری کے لوگ دور دراز سے آئے ہیں۔ سنا تھا کہ وہ لوگ جو آئین کی پھانسی پر اتنے خاموش رہے کہ انہوں نے خوف کی نگری کے کسی بچے کو بھی نہ ہلنے دیا، ان سب کو اعلیٰ کارگزاری دکھانے پر کالا دیو تمغے دے گا۔ انہوں نے خوف کی نگری والوں کو بے حسی کی بیڑیاں تقسیم کرکے مکمل خاموشی اور امن و امان قائم رکھا تھا۔ ایک شخص نے نامہ نگار کو دعوت نامہ دیا اور کہا وہ فوٹوگرافر کی حیثیت سے شریک محفل ہو سکتی ہے۔

نامہ نگار سوچتی رہی کہ دیو، اندھے شیر، بھیڑیا، تیندوا یا کوئی ایسا جنگلی جانور ہو گا جو آج تک کسی نے نہیں دیکھا۔ جب ہی خوف کی نگری کا بچہ بچہ اس کے خوف سے لرزتا ہے۔

اس ضیافت سے پہلے کالے دیو نے سفید دیو کے مخبروں کو بلایا تھا۔ وہ اسے یہ بات بتا گئے تھے کہ سفید دیو کی حکومت کا راز چار لفظوں میں پوشیدہ تھا "لڑاؤ اور حکومت کرو"۔ اگر وہ بھی اسی اصول پر چلتا رہا تو اس کی حکومت کو قیامت تک کوئی خطرہ نہیں ہے۔ خوف کی نگری والوں نے ضمیر اندھے کنوئیں میں ڈال دیئے ہیں، دماغ دریا میں بہا دیئے ہیں۔ ابھی وہ اپنے دائیں اور بائیں ہاتھ کے مالک ہیں۔ اگر دایاں اور بایاں ہاتھ ایک دوسرے سے لڑنے میں مصروف رہیں تو ان کے وجود کے خاتمے کی بہترین صورت ہے۔ دائیں اور بائیں ہاتھ کی طاقت سے ہی انھیں خودکشی پر آمادہ کیا جا سکتا ہے اور اس صورت میں کالے دیو کی بدنامی بھی نہیں ہوگی۔ مہذب دنیا کے لوگ خوف کی نگری والوں کی اجتماعی خودکشی کی خبر کو ان کی اپنی حماقت سے تعبیر کریں گے اور دیو کی بستی خوب پھلے پھولے گی اور حکمرانی کرتی رہے گی۔ لیکن اگر انہوں نے اپنی گردن چھوڑ کر دیو کی گردن پکڑ لی تو یہ آئین کو پھر سے زندگی بخش دیں گے۔ اس لئے انھیں یہ باور کراؤ کہ خودکشی نجات کا راستہ ہے۔ انہیں یہ نہ معلوم ہونے دو کہ دونوں ہاتھ ایک دوسرے کی طاقت ہیں۔ ان کے دکھ درد اور مسائل ایک ہیں اور ان کی نجات ایک دوسرے کی مدد سے ہے۔ انھیں یہ باور کراؤ کہ دائیں ہاتھ کی نجات بائیں ہاتھ کو ختم کرنے میں ہے اور بائیں ہاتھ کو یہ بتاؤ کہ دایاں ہاتھ ایک خطرہ ہے۔ اگر وہ نہ ہوگا تو بایاں ہاتھ

تنہا ٹکراؤ کر سکتا ہے۔ سفید دیو کے مشیروں کی بات کالے دیو نے گرہ میں باندھ لی۔ کالے دیو کا دماغ سفید دیو کے دماغ سے اس طرح جڑا ہوا تھا کہ کالے دیو کی انگلیاں سفید دیو کی انگلیاں بن گئی تھیں اور وہ اس کا سچا جانشین بننے کے لیے محنت کر رہا تھا۔ سفید دیو کے مشیروں نے کالے دیو کو یہ بھی بتایا تھا کہ اب سفید دیو کھلم کھلا کالے دیو کی مدد نہیں کرے گا۔ اب تمام مدد چور دروازے سے ہی ہوگی۔ اس لیے کہ آئین کی پھانسی اور خوف کی نگری کے شہر کی اندھی کوٹھڑیوں میں قید بھیڑ بکریاں زور لگانے سے احتجاج کر چکے ہیں اور وہ اپنی دھرتی کے جانوروں کو بھی مطمئن دیکھنا چاہتا ہے۔ اس لیے اب وہ ڈنکے کی چوٹ اس کے سب کالے کارناموں کو اجاگر کر کے نہیں رکھ سکتا۔

کالا دیو سفید دیو کی مجبوریاں سمجھتا تھا۔ اس لیے وہ چور دروازے سے مدد پر راضی اور خوش تھا۔

کالے دیو نے سفید دیو کے مشیروں کے جانے کے بعد اپنے علاقے کے کالے بیل، بھیڑ بکریوں اور دیگر مویشیوں کو اپنے محل میں طلب کیا تا کہ وہ انھیں یاد کرا سکے کہ آئین کی موت ہی ان سب کا بھلا تھا اور دیو کی ہستی ہی ان کے حقوق کی سب سے بڑی ضمانت ہے۔ اس نے سوچا سفید دیو کی طرح وہ بھی اپنے ملک کی بھیڑ بکریوں اور کالے بیلوں کی خوشنودی حاصل کر سکتا ہے اور انھیں اپنے ساتھ چائے کی پیالی پینے کی عزت بخش سکتا ہے۔

نامہ نگار خاتون محل میں پہنچی تو اسے کالے دیو کے محل کے باہر مویشیوں کی لمبی قطاریں نظر آئیں۔ دعوتی رقعہ دکھا کر جب وہ محل میں آئی تو وہاں موجود لوگوں کو پہچان گئی۔ اس لیے کہ وہ ان سب چیلوں، کوؤں، گدھوں اور گدھوں اور کالے بیلوں کی تصاویر اتار چکی تھی۔ وہ خاموشی سے تماشا دیکھنے لگی۔ دیو ضیافت میں سب کے آنے کے بعد پہنچا۔ وہ سب اٹھ کر کھڑے ہو گئے۔ نامہ نگار پہلے ہی سے ایک طرف کھڑی تھی۔ اس نے عمر رسیدہ کے دوران ہر طرف گھوم پھر کر تصاویر اتاری ہیں۔

خوف کی نگری کے باسیوں نے دیکھ لیا تھا تحریر تھا کہ آئندہ اس کے تخت سے نکلا ہوا ہر لفظ آئین ہوگا۔ کالے دیو نے ضیافت کے دوران یہ اعلان کیا کہ وہ گدھوں اور ذیل ریشمی گایوں اور بیلوں اور بھیڑ بکریوں کی مدد کو ایک بڑی رقم عطیے کے طور پر دے گا تا کہ ان کو بہتر چارہ حاصل ہو سکے۔

نامہ نگار جب ان کی تصاویر اتار رہی تھی تو اسے ان سب کی آنکھوں میں خوف نظر آیا۔ وہ سب خاموش کھڑے تھے بس خوف چھایا ہوا تھا اور تب کالے دیو کے ایک منظور نظر سیاہ چیل نے دیو کی شان میں ایک قصیدہ پڑھا جس میں کہا گیا تھا کہ اس کا تخت و تاج قیامت تک قائم رہے گا!

نامہ نگار نے موقع پا کر کالے دیو کی تصویر اتاری۔ تصویر دیکھ کر حیران رہ گئی کہ کالے دیو کی آنکھوں میں بھی خوف تھا۔ وہ اس کے چہرے سے خوف زدہ نظر آ رہا تھا۔ پھر جب اس نے اس کی تصویر اتاری تو اسے معلوم ہوا کہ کالا دیو خوف کی نگری کا سب سے ڈرپوک وجود تھا۔ اس کی ذات سے خوف کا شعلہ نظر آتا۔ خوف اور اندھیرا اس کے وجود سے پھوٹ کر ساری نگری میں پھیل رہا تھا۔

نامہ نگار نے کالے دیو کی تصویر لوگوں کو دکھائی اور بولی "اے لوگو! تمھارے خوف نے اسے کالا دیو بنا رکھا ہے ورنہ وہ تو ایک خوف زدہ چوہا ہے۔" لوگوں نے تصویر دیکھی تو وہ حیران رہ گئے۔ تصویر میں ایک چوہا بیٹھا تھا اور الجھنات سجائے کھڑا تھا۔

سالہا سال کے ظلم، جبر اور خوف کے باعث وہ مفلوج ہو گئے تھے۔ انھوں نے بے بسی سے اپنے دائیں اور بائیں ہاتھ کو دیکھا۔ ان کی قوت ارادی کمزور ہو چکی تھی۔ وہ دیو کے حکم پر ہی عمل کر سکتے تھے۔

نامہ نگار نے ان سے کہا "اے لوگو! اگر تمھارے دائیں اور بائیں ہاتھ آپس میں لڑنے کے بجائے دیو کی گردن پکڑ لیں تو تم اپنی تقدیر کے مالک بن جاؤ گے۔ خوف کی نگری ختم ہو جائے گی۔ تمھاری دھرتی کا خون چوسنے والا دیو بھی ختم ہو جائے گا۔ اپنے دونوں ہاتھ اپنے ہی دشمن کے ہاتھ مت بکنے دو۔ اپنی طاقت کا راستہ مت روکو۔"

کالے دیو نے غصے سے چلا کر کہا "میں سرکش کا کیا علاج ہے، جانتا ہوں۔"

"تم میرا قلم نہیں چھین سکتے۔" نامہ نگار جانتی تھی کہ دیو کا سر تلوار سے نہیں قلم سے ہی کاٹا جا سکتا ہے اس لیے وہ قلم سے خوف کاٹتی ہے۔

کالے دیو نے کہا "اے عورت، تو اپنا قلم مجھے دے دیتی ہے تو ٹھیک ہے ورنہ تمھاری انگلی ہی کاٹ دی جائے گی۔ مجھے معلوم ہے یہاں موجود سب مویشی لوگ میرے ہاتھ کی انگلیاں ہیں۔ تو تم مجھ سے کیسے لڑ سکتی ہو۔ یہ پیچ سکتی ہے۔ اندھیرا تمھیں بھی ختم کر دے گا۔ اجالا تمھارا سب سے بڑا دشمن ہے۔ وہ تمھیں سیاہی دکھاتا ہے۔ اندھیرا پھیلا ہے کہ اس میں رنگ سیاہ ہو جاتے ہیں۔"

کالے دیو نے اپنے ایک مشیر کو اشارہ کیا۔ اس کا مشیر نامہ نگار کے قریب آیا اور بولا "تم اپنا قلم دے دو ورنہ تمھارا سر قلم کر دیا جائے گا۔"

نامہ نگار نے قلم کو سینے سے لگا لیا اور بولی "میرا وجود تو قلم ہی ہے۔ میرا یہ قلم سلسلہ کا سلسلہ ہو گیا ہے اور تم قلم کو کیسے ختم کر سکتے ہو۔ قلم کی تحریر دیمک کی طرح ہے۔ اس کی بڑی طاقت ہے۔ اس کا راستہ روک سکتے ہو؟"

نامہ نگار نے پھر لوگوں کی طرف دیکھا اور کہا "لوگو اب بھی وقت ہے۔ اپنے اپنے ہتھیار اٹھاؤ اور خوف سے آزاد ہو جاؤ!"

کالے دیو کے محافظ گھبرا کے آگے بڑھے۔ کیمرے کی شکل قلم سے مشابہ تھی اور دیو اس سے خوف کھا رہا تھا۔ اس کے ایک محافظ نے کہا "یہ کیمرہ بھی ہے اور قلم بھی ہے۔ یہ کوئی خوفناک ہتھیار ہے اور کسی دوسری جگہ کا ہے۔" اس نے کیمرہ چھیننے کو ہاتھ بڑھایا تو روشنی میں اس کا ہاتھ موم کی طرح پگھلنے لگا۔

نامہ نگار نے دیکھا کہ وہ سب لوگ صرف اندھیرے کے غلام ہیں۔ روشنی کا سامنا کرتے ہی موم کی طرح پگھل کر بے حقیقت ہو جاتے ہیں۔

اس لئے کہ اُن کا ہاتھ کالے دیو کے دماغ سے پیوستہ جو نہ ہے اور کالا دیو اسی لئے اُجالے کا دُشمن ہے کہ اُجالے میں اُس کا وجود بے حقیقت ہو جائیگا یہ دیکھ کر لوگ حیران اور تمام محافظ خوفزدہ ہو گئے کہ ایک محافظ کا ہاتھ سیال مادّہ کی طرح بہہ رہا تھا۔ دیو کے اندر کا خوف جو اُس کے وجود کے اندر ایسا محفوظ تھا جیسے کنویں میں پانی، اچانک اُس کی آنکھوں کے راستے نکلنے لگا اور اُس پر کپکپاہٹ طاری ہو گئی۔

کالے دیو نے کہا: "یہ کسی اور ہی نگری کی ایجنٹ معلوم ہوتی ہے اور لوگوں کو بغاوت پر اکسا رہی ہے۔ مذہب کے ٹھیکیداروں کو بلایا جائے۔ وہ اس کی سزا تجویز کریں گے۔"

سب نے دیو کی رائے کی سر جھکا کر تائید کی اور تھوڑا ہی مذہب کے ٹھیکیدار آئے۔ اُن کا تعلق ہر مذہب اور فرقے سے تھا۔ اُنھوں نے بیشمار تختیاں اپنے سینوں پر لگا رکھی تھیں اور ہر تختی پر لکھا تھا:

"ہم ہی راستی پر ہیں۔"

اُن کے ہاتھوں میں رنگ برنگی تسبیحیں اور مالائیں تھیں اور اُن کی اُنگلیاں کھٹ کھٹ کی آواز پیدا کر رہی تھیں۔

دیو نے کہا: "یہ خدا کی یاد میں معروف رہنے والے عابد زاہد ہیں۔ ان کا فیصلہ صحیح ہوگا۔"

نامہ نگار بولی "خدا کی یاد میں معروف رہنے والے کالے دیو کے حکم پر قطار بنائے کیسے دوڑے آرہے ہیں۔ ان کی اُنگلیاں بھی کالے دیو کی ہیں۔"

اُس نے اُن کی تصویر کھینچی اور لوگوں کو دکھائی۔ تصویر میں ایک قطار میں اژدہے آرہے تھے جن کے منہ سے آگ نکل رہی تھی۔ نامہ نگار نے کہا "اے لوگو یہ جہنم کی آگ ہے۔" وہ سب بولے یہ ایک ناقص العقل مخلوق ہے۔ خوف کی نگری والوں کو اُن کی تصاویر دکھا رہی ہے اور دعویٰ کرتی ہے کہ اس کا قلم نما کیمرہ ظاہر کی نہیں باطن کی تصویر کھینچتا ہے۔ یہ کسی خطرناک گروہ کی سرغنہ معلوم ہوتی ہے۔ اس کا کیمرہ اتنا خطرناک ہتھیار ہے کہ محافظ کا ہاتھ غائب ہو گیا۔ اس سے یہ کیمرہ چھین لینا چاہیئے۔"

عورت نے اُن کی طرف دیکھ کر کہا" اگر تم لے سکتے ہو تو لے لو۔"

اُن میں سے کسی کی ہمت نہ پڑی کہ اس کے قریب جائے، اور اپنا ہاتھ گنوائے۔

نامہ نگار نے اُن سے کہا "اے لوگو! تمہارے پیکر اپنے بوجھ کے سبب اندھے کنوئیں کی انتہائی پستی میں ہیں۔ اب بھی وقت ہے۔ تم کالے دیو کے ظلم کے ساتھی بن کر دھرتی والوں پر ظلم نہ کرو۔ تم اللہ کا نام لیتے ہو اور دیو کی اُنگلیاں بن گئے ہو۔"

ایک شخص نے اپنے سینے پر لگی ہوئی تختی پر ہاتھ رکھ کر کہا" دیو کا حکم ہمارا ایمان ہے، دیو اللہ کا نائب ہے۔"

نامہ نگار نے کہا " آہ! کالے دیو نے تمہارا ایمان بھی ختم کر دیا ہے۔ خوف اور ایمان ایک سینے میں نہیں رہ سکتے۔ ایمان آگہی کا نور ہے اور خوف جہالت اور گمراہی کا اندھیرا ہے۔"

ایک اور تختی والا بولا" کالے دیو کو خدا نے ہمارے رزق کا وسیلہ بنایا ہے۔ حاکم کی اطاعت فرض کی ہے۔"

عورت نے کہا" ظلم کرنے والے حاکم کی اطاعت فرض نہیں ہے، اس کے سامنے تو کلمۂ حق کہنا جہاد ہے۔"

ایک اور شخص نے کہا" یہ لوگوں کو بغاوت پر اکسا رہی ہے۔"

عورت نے کہا" افسوس، تم ہی وہ لوگ ہو جن کے خلاف روزِ قیامت کتاب فریاد کرے گی اور دین فریاد کرے گا۔ تم اللہ کا نام لے کر ظلم کی حمایت کرتے ہو۔"

سب اژدہے پھنکارتے ہوئے عورت کی جانب بڑھے۔ اُس نے کہا "مجھے کوئی آگ نہیں جلا سکتی۔ میں ناری نہیں، نوری ہوں۔"

کالے دیو نے کہا" اس کی بابت تحقیقات کرو، یہ کس کے ملک سے تعلق رکھتی ہے اور ہمارے داخلی معاملات میں کس کے اشارے پر حصّہ لے رہی ہے۔ اس کا کیمرہ ثابت کرتا ہے کہ اس کا تعلق خوف کی نگری سے ہرگز نہیں ہے۔"

نامہ نگار نے کہا" سنو میں نامہ نگار نہیں ہوں، نامہ بر ہوں۔ اور آئین کی پھانسی کو تم خوف کی نگری کا ذاتی معاملہ نہیں کہہ سکتے۔ جب خوف کی نگری والوں کے ضمیر نے اندھے کنوئیں میں تڑپ کر فریاد کی تو اقوامِ عالم کا ضمیر اُن کی مدد کو نہ آسکا، اس لئے کہ وہ اقوامِ متحدہ کی بڑی سی عمارت میں قید تھا۔ اس کی خاموشی دیکھ کر ضمیرِ کائنات میں ہلچل مچ گئی اور مجھے یہاں آنے کا حکم ملا۔ میں ضمیرِ کائنات کا ایک حصّہ ہوں۔ اس لئے میرا خوف کی نگری والوں سے ایک رشتہ ہے۔ ساری کائنات میں ایک رشتہ ہے۔ اللہ کی ساری مخلوق ایک کنبہ ہے۔ ایک وحدت ہے۔"

ایک بڑی سی تختی والے نے کہا" یہ ضمیرِ کائنات کی بات جھوٹ ہے۔"

عورت نے کہا" کیا تم اس حقیقت سے انکار کرتے ہو کہ خدا سارے عالموں کا رب ہے، اور نبیؐ سارے عالموں کے لئے رحمت ہیں؟"

ایک اور تختی والا شخص بولا" خوف کی نگری میں رحم، رحمت، انصاف، محبت، یہ سب لفظ گناہ ہیں۔ یہاں خوف اور دہشت سب سے بڑی قدر ہیں۔ اور دیو کے جلال کی قسم تو گمراہ ہے۔"

عورت نے کہا" کیا تم غور نہیں کرتے کہ خدا اپنی مہربانی اور رحمت کی صفت بیان کرکے پھر کام کرتا ہے۔"

ایک اور شخص بولا" یہ غور و فکر اور آگہی کا زہر پھیلا رہی ہے۔"

عورت نے کہا" سنو، خدا نے آخری نبی بھیج کر اپنا دین مکمل کر دیا اور اُس نے عقل و آگہی کا نور سب کے لئے عام کر دیا۔ تمہیں سوچنے اور غور کرنے کی دعوت دی۔ تم

آگہی کے ذریعہ اپنے رب تک پہنچ سکتے ہو، اپنے آپ کو جان سکتے ہو۔!"

ایک شخص نے کہا "دیو سب کچھ جانتا ہے۔ اور ہم دیو کو جانتے ہیں۔ ہمارے لئے یہی کافی ہے۔"

عورت نے کہا "عقل کا نور سوچنے اور غور کرنے کے لئے ملا ہے۔ زمین، ہوا، پانی، وقت اور تمہاری اپنی ذات؟ کیا تم اب بھی ضمیر کائنات سے انکار کرتے ہو؟"

پھر نامہ نگار نے کالے دیو کی وہ تصویر جو اس نے لوگوں کو دکھائی تھی دیو کے سامنے رکھ دی اور بولی "تم بھی اپنی تصویر دیکھو!" دیو نے جیسے ہی اپنی تصویر دیکھی اس کا ظاہر باطن سب کی نظر میں ایک ہو گیا اور لوگوں نے دیکھا کہ ایک خوفزدہ خچر دولتیاں چلا رہا ہے اور اژدہے پھنکارتے ہوئے آگے بڑھے۔ ان کے گلے میں لٹکی ہوئی گھنٹیوں سے شعلے بھڑکنے لگے۔

"اے لوگو، اب بھی وقت ہے، اپنے اپنے پتھر اٹھا لو۔" لوگوں نے اپنے دائیں اور بائیں ہاتھ کو ایک ساتھ اٹھایا، اپنا جھکا ہوا سر اونچا کیا اور خچر کی طرف بڑھے کہ اسے پکڑ کر انجام تک پہنچائیں۔

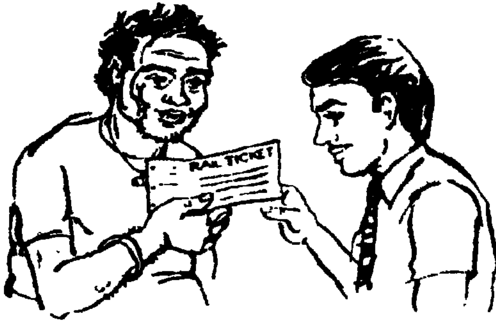
اس لمحہ ان سب نے اپنی اپنی روحوں کو دیکھا۔ ان کے گہرے زخم، دکھ اور اذیت دیکھ کر وہ اپنی روحوں سے شرمسار تھے۔ ان کی روحیں آزاد ہو کر خوش تھیں۔ جب انھوں نے دونوں ہاتھ اٹھائے دیو کی جانب بڑھے تو اسی لمحہ روحیں دیو کی قید سے آزاد ہو گئیں۔ وہ کالے دیو کی غلامی میں برسوں سے آنسو بہا رہی تھیں۔ اور ان کے آنسو دیکھ کر دیو آدھی رات کو قہقہے لگاتا تھا۔

اژدہوں کے منہ سے نکلنے والی آگ نے دیو اور اژدہوں اور ان سب لوگوں کو اپنی لپیٹ میں لیا جنھوں نے اپنے وجود کو کالے دیو کے وجود کا حصہ بنا لیا تھا۔

خوف کی نگری والوں نے ان سب کو اپنی ہی آگ میں تڑپتے جلتے اور مرتے دیکھا۔ ان کے سامنے کالے دیو کا عبرتناک انجام ظلم کی تاریخ اور حکومت کا خاتمہ تھا۔ جب وہ سب سر اٹھا کر کھڑے ہوئے اور خوف کا خاتمہ کر چکے تو خوف کی نگری بھی ختم ہو گئی۔ اس لئے کہ کالے دیو کی حکمت نے اسے خوف کی نگری بنا رکھا تھا۔ اب ان کی نگری ان کی اپنی نگری تھی۔ اور وہ اپنی روحوں کے آپ مالک تھے۔ ان کا ضمیر پتھروں کے بوجھ سے آزاد ہو کر زندگی اور روشنی سے جگمگا رہا تھا۔ اس کے زخم مہک رہے تھے۔ ان زخموں کا مرہم وقت کے پاس ہے اور وقت کالے دیو کا غلام نہیں، خدا کا حکم ہے۔

آگ کا موجیں مارتا سمندر آگے بڑھ رہا تھا اور وہ ان سب کو اپنی لپیٹ میں لے رہا تھا جن کے دلوں میں خوف، وحشت، نفرت اور ہوس کا زنگ تھا۔ جنھوں نے اپنے دل کے آئینوں کو زنگ سے صاف کر لیا، انھوں نے آگ کو تسخیر کر لیا۔ انھوں نے بسم اللہ۔۔ کہہ کر قدم آگے بڑھایا تو ساری آگ پھول بن گئی۔

انھوں نے چاروں طرف نامہ نگار خاتون کو تلاش کیا تو اسے کہیں نہیں پایا۔ انھیں صرف ایک روشنی کی لکیر نظر آئی جو زمین سے آسمان تک جا رہی تھی۔ ———

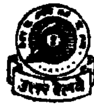




ٹکٹ پانے کی جلدی میں جلسازی
کے چکر میں مت پھنسیئے !



غیر قانونی فروخت اور خرید پر
۵۰۰ روپیہ جرمانا یا تین ماہ کی قید
یا دونوں بھی ہو سکتی ہیں !
ناجائز طریقے سے ٹکٹ خرید کر
اتنی بھاری قیمت نہ چکائیں !
ریلوے ریزرویشن دفتروں
یا مجوزہ ایجنٹ سے ہی ٹکٹ خریدیں !





اُتر ریلوے
آپ کی خدمت میں

بدحواس ریت

روشن آرا نزہت

گرم ، گرم دھوپ سے جلتی ، بھوری بھوری ریت ہوا کے جھونکوں کے ساتھ ساتھ اُڑ رہی تھی۔ حیات نے کرائے کے مکان کی کھڑکی بند کر دی کہ کہیں اُڑتی بدحواس ریت اس کے کمرے میں نہ آ گھسے اور اس کی مالکن اس سے ناراض ہو کر اسے گھر سے نہ نکال دے پھر وہ جائے گا کہاں — جہاں اس کا کوئی اپنا ٹھکانہ پرایا۔

جب کبھی وہ مسز حمید کے نام کی تختی مکان کے باہر پڑھتا ہوا اپنے کرائے کے مکان میں داخل ہوتا تو اسے نہ جانے کیوں یاد آ جاتا اسے بھی اپنا گھر بنانے کے لئے تگ و دو کرنی چاہیئے۔ شاید وہ بھی اپنا گھر بنا سکے! بس تو وہ خیال ایک لمحے کے لئے آتا تھا اور کمرے کی چھت کے نیچے جاتے ہی نہ جانے اس انسان کی کن تہوں میں اُتر کر کہاں چلا جاتا تھا۔ مگر پھر وہ سوچنے لگتا، جس طرح دودھ گھی، چینی، گندم پیسوں سے خرید کر استعمال کئے جا سکتے ہیں اسی طرح تو گھر ہے۔ پھر اسے کیا فرصت کہ وہ اپنے مکان کے لئے اپنی تنخواہ جو اس کے دال پانی کے لئے بھی ناکافی ہے — اپنی ضرورتیں کم کر کے جمع کرتا ہے۔ اور ایک دن اینٹ گارے کا مکان بنا کر کھڑا کر دے! کون جانے موت کب آ جائے اور اس کا مکان اس کے جنے سے ہی پرایا ہو جائے کیا یہ بہتر نہیں کہ وہ مکان ہی نہ بنائے — مگر وہ جو مکان بنانے کی چاہ اس کے بھیتر کے نہ جانے کس کونے میں پل رہی تھی اسے تنگ کر رہی تھی، وہ اسے کیا کرے؟

"تم شادی کب کر رہے ہو حیات؟"

اس کی مالکن نے اگر جیسے اس کو طعنہ دیا۔ اس نے سر جھکا لیا۔ وہ یہ سوال کئی دفعہ کر چکی تھیں اور وہ جواب بھی دے چکا تھا۔

وہ جانتا تھا کہ ان کا یہ سوال کرنے کا مقصد کیا ہے —؟

وہی ہوا اس کی خاموشی نے انہیں غصہ دلا دیا۔ اونچی آواز سے بولیں۔ "کر لو تو اچھا ہے یہ تمہارے لئے مفید رہے گا۔ میں بھی کرایہ داروں کا خیال کرتی ہوں آخر ان کی جوان لڑکیاں ہیں۔ اور تم ہو کنوارے —!"

"مسز حمید — میں شادی کر تو لوں گا مگر ابھی میری ترقی نہیں ہوئی ہے۔" اس نے جواب دیا۔

"ترقی تو تمہاری ساری عمر نہ ہو گی۔ سالا سر سفید ہوتا جا رہا ہے۔ گالوں کے گرد جھریاں پڑنے لگیں ہیں۔ میرا خیال ہے تم اب بڑھاپے [illegible] کرنے سے تو رہے —"

"جی! آپ ٹھیک کہتی ہیں۔ مگر [illegible] ہے —"

مجبوری ہے۔ مجبوری کا [illegible] — [illegible] مسکن کر میرے کان پک چلے — تم جانتے ہو میں اب برداشت کرنے کے موڈ میں نہیں۔ تمہاری شرافت کو دیکھتے ہوئے میں نے یہ مکان عارضی کرایہ پر دیا تھا اور تمہیں یہاں تین برس ہو رہے ہیں —

وہ جا چکی تھی اور حیات کے کانوں میں اب بھی ان کی کرخت آواز گونج رہی تھی اس رات اسے ٹھیک سے نیند نہیں آئی تھی مگر صبح کو پھر وہی دفتر — ٹائپ کی آوازوں میں کھونے ہوئے اس کے درمیان

نہ جانے کہاں گم ہوتی ہوئی اُمنڈ رہیں، خواہشیں ..... شام کو پھر وہ بی دوسری شفٹ میں کام ۔ کام کے باوجود کم آمدنی کا خوف، خوف میں اپنا چھلاوہ انسانؔ جو ہر رات پلنگ پر پڑ کر ہزاروں ارادے کرتا تھا، اور صبح سائیکل پر سوار ہوتے ہی اسے اُڑتی دھوئیں میں اپنا مستقبل بھی اُڑتا ہوا محسوس ہوتا تھا۔ اور آگے اور آگے!

چند روز وہ پیسے جمع کرتا کہ مکان بنانے لگا مگر اگلے ماہ کے آخر میں اپنے لئے کوئی بے حد ضروری چیز خرید لیتا۔ اور جب سارے پیسے ختم ہو جاتے تو وہ شکر کرتا کہ اس کے بیوی بچے نہ تھے۔ ورنہ وہ اپنی یہ سب ضروریات کیسے پوری کرتا ۔ یہ اسے اس وقت مسرت کا احساس ہوتا ۔ اور پھر وہ اپنی خوشی منانے کسی چھوٹے موٹے ہوٹل میں چلا جاتا۔ اونچی آواز میں بجتے ہوئے ریڈیو یا ٹی وی پر آتی ہوئی تصویروں سے جی بہلانے لگتا اور چائے کے دو ایک کپوں کے علاوہ بیچ کے دو چار کباب کھا جاتا۔ اور جب وہ گھر جانے کا خیال کرتا تو اس کے پیروں تلے سے زمین نکل جاتی اس کرائے کے مکان میں ۔ جہاں وہ رہتا تھا ۔ وہاں تو اس کا کوئی انتظار کرنے والا بھی نہیں اس وقت وہ جی ہی جی میں اپنے سلئے سپنوں کا ایک چھوٹا محل تعمیر کر لیتا۔ اور اس محل میں اپنے بیوی بچوں کو لے آتا۔ تب وہ ہوٹل سے نکل کر بہت تیزی سے اپنے کرائے کے مکان کی طرف لپکتا جیسے واقعی، وہ اپنے محل کی جانب بڑھ رہا ہے اور وہاں کوئی اس کی اپنی بیوی شدتِ جذبات سے اس کا انتظار کر رہی ہے ۔ اور اس کا دو سالہ بچہ باہر دروازے کی چوکھٹ پر کھڑا وہ تکتا ۔ ابو کے آنے کی خبر ماں کو دینے کے لئے اندر بھاگ گیا ہے ۔

لیکن وہ پرچھائیاں ہوتیں ۔ اس کے اپنے سائے سے بنی ہوئی ۔ وہ تو پھر سے مسز حمید کے گھرانے کے سامنے کھڑا ہوتا ۔ سامنے ان کے نام کی تختی ہوتی اور وہ نیم تاریکی میں اپنے چھوٹے سے تالے میں کنجی گھماتا ہوتا ۔ اور پھر اسی کمرے کی چھت ۔ اور اس کی بکھری ہوئی خواہشیں ۔

ایک دن اس نے اپنا گھر بنانے کی چاہ کو خود ہی دفن کر دیا ۔ اس پر منزل ہی ڈال دیا تو اسے حیرت سی ہوئی کیونکہ اب اسے احساس ہو رہا تھا کہ وہ کسی بوجھ سے آزاد ہو گیا ہے اور یہ سارا جہاں اس کا ہے ۔ صرف اس کا ۔ اسے وہ اچھوتا خیال بہت اچھا لگا وہ کئی دن تک اسی میں گم رہا ۔

مگر ایک دن اس کی غیر موجودگی میں مسز حمید نے اس کا سامان باہر نکال کر رکھ دیا اور مکان میں اس تالے کے بجائے اپنا تالا ڈال دیا ۔ وہ آیا تو کتنی دیر تک آزردہ اور مایوس دروازے کے سامنے کھڑا رہا ۔ پھر اس نے اپنا سا سامان سائیکل پر لادا ۔ جو نہیں آ سکا وہ اس نے وہیں چھوڑا ۔ اور چل پڑا ۔ چلتا گیا ۔ نہ جانے کہاں جانا تھا اس نے ۔ یہ تو اسے خود بھی معلوم نہ تھا ۔ حالانکہ سارا جہاں اس کا تھا ۔ سارا ملک اس کا تھا ۔ سبھی لوگ اس کے اپنے لوگ تھے ۔ مگر وہ چلا جا رہا تھا ۔ بدحواس ریت کی طرح ۔ جو ہوا کے ساتھ ساتھ اُڑتی رہتی ہے ۔

ہندوستان کے عظیم رہنما
مرحوم راجیو گاندھی کی نذر

اے اہنسا کے پجاری اے پرستارِ وفا
شمعِ اخلاق و محبت کی جلانے والے
درسِ محبت رہے تری موت زمانے کے لئے
امن کے گیت زمانے کو سنانے والے

تو نے نہرو کے اصولوں پہ دکھایا چل کر
بات بگڑی ہوئی جو تھی وہ بنائی تو نے
سر ترنگے کا کیا تو نے جہاں میں اونچا
عظمتِ ہند زمانے میں بڑھائی تو نے

کس کو معلوم تھا آئیگی ستم کی آندھی
تیری دھرتی پہ تری خاک بکھر جائے گی
غمِ جدائی کا تری خون رُلا دیگا ہمیں
زندگی درد کے ساغر میں اُتر جائے گی

کر دیا تو نے جلانے سے جگر کو چھلنی
گھاٹ کاشی کے، تو جمنا کے کنارے روئے
تاج نے تیری جدائی میں بہائے آنسو
اور گنگا کے مچلتے ہوئے دھارے روئے

اے وطن گلشن نے لہو جو لیا ہے تیرا
غنچے غنچے میں ترے خون کی رعنائی ہے
حشر تک دیتی رہے گی وہ بہار و کیف پیام
جو رنگِ گل بھی ترے خون سے گرمائی ہے

جا بجا سرخی ترے خون کی آئے گی نظر
جب کبھی ہاتھ میں تاریخِ وطن آئے گی
اشک بے ساختہ آنکھوں سے نکل جائیں گے
یاد نکلے ہوئے کانٹے کی چبھن آئے گی

ذکر ہوگا کبھی کلیوں کی زباں پر تیرا
لالہ و گل کبھی چھیڑیں گے فسانے تیرے
کر نہیں سکتی فراموش بہاریں تجھ کو
صدیوں گونجیں گے گلستاں میں ترانے تیرے

اثر اندوری

مسکراہٹ ۔ جو لبوں پر مرجھا گئی

حسنین کاظمی

اس کی آنکھوں میں گہرے سمندروں کے راز پوشیدہ تھے اور اس کے گیسو اس طرح لہرا رہے تھے، جیسے ایک اندھیری رات ٹوٹ ٹوٹ کر بکھر گئی ہو اور ہنستے وقت ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے موسم بہار میں غنچے چٹک رہے ہوں اور جب باتیں کرتی تو ایسا محسوس ہوتا جیسے نسیم سحری نے کسی گیت کی تان چھیڑ دی ہے اس کے چہرے کے خطوط اور اس کا سارا جسم اتنا خوبصورت اور حسین تھا جیسے کسی ماہر سنگتراش نے کوئی مجسمہ بنایا ہو نہایت ہی سڈول، خوبصورت اور دیدہ زیب۔

شہرہ اپنی تمام رعنائیوں اور حسن و جمال کے ساتھ میری زندگی میں داخل ہو گئی تھی۔ پہلی بار جب میں نے اسے دیکھا تو مجھے ایسا محسوس ہوا جیسے میرے اندر کوئی چیز تڑپ رہی ہے مضطرب ہے۔ اضطراب کی مبہم سی کیفیت میرے جسم میں پھیل اور رگوں میں پھیل گئی۔ میرا دل تڑپنے لگا اور مجھے اس بات کا اعتراف ہے کہ مجھے اتنی بھی خبر نہ رہی۔ چند لمحے اسی طرح سکوت طاری رہا تھی میں گزر گئے۔ میں ٹکٹکی باندھے اس کے چہرے کو دیکھ رہا تھا میں بالکل کھویا ہوا تھا۔ دنیا و مافیہا سے بے خبر۔ صرف اسی کو دیکھے جا رہا تھا۔ جیسے مجھ پر کسی نے جادو کر دیا ہو۔

اگر شہرہ کی آواز مجھے نہ چونکا دیتی تو شاید میں اسی طرح کھویا رہتا اسے دیکھتا رہتا اور نہ جانے کب تک بیخودی کی کیفیت میرے اوپر طاری رہتی شہرہ نے کہا۔

"میں نے تو سوچا بھی نہ تھا کہ تم اتنے خوبصورت جوان ہو گئے ہو گے۔"

میں نے اپنے احساسات پر قابو پاتے ہوئے جواب دیا۔ "لیکن میں اتنا خوبصورت بھی نہیں ہوں چالیس سال کے لگ بھگ ہوں گا۔"

وہ مسکرادی اور میرے حلق کا شعلہ جیسے اور بھڑک گیا ہو۔ اس کی آنکھوں میں ایک اتھاہ درد شبنم کی صورت چمک رہی تھی۔ آہستہ سے بولی۔

"تو پھر تمہاری زندگی بہت اچھی طرح گزری ہوگی۔"

اس کا انداز بیان طعنوں کے تیر و نشتر سے سجا ہوا تھا۔ ایک لمحہ کے لئے میں نے سوچا کہ کہہ دوں "میں نے زندگی میں کوئی خوشی نہیں دیکھی۔"

لیکن ..... میں کچھ بھی نہ کہہ سکا خاموش رہا اور میں نے یہی بہتر سمجھا کہ وہ اسی بھلاوے میں رہے کہ میں نے اپنی زندگی بڑے ناز و نعم کے ساتھ گزاری ہے۔ اسے یہ بات بتانے سے کیا حاصل ہوتا کہ "میری ساری زندگی غم اور تنہائیوں کے بھیانک اندھیروں میں گزری ہے اور میری زندگی کی اس طولانی سیاہ رات میں کبھی روشنی کی ایک کرن بھی نہیں دکھائی دی۔"

لیکن شاید شہرہ نے ان تمام باتوں کو میری آنکھوں اور لگاہوں میں دیکھ لیا تھا۔ اس کی نقرئی آواز میرے کانوں میں گونجی۔

"کوئی بھی ...... کسی وقت بھی ...... اپنی مراد کو نہیں پہنچتا۔ آج تک کسی کی آرزو کبھی پوری نہیں ہوئی" اور پھر ذرا سے سکوت کے بعد بولی:

"میں ہمیشہ یہی سوچتی تھی کہ تم ایک بڑی بہت سی

تم نصیب انسان ہو، جب کبھی بھی تمہارے سازوں کے گیتوں کی تانیں میرے کانوں کے پردوں کو مرتعش کرتیں تو دل ہی دل میں مجھے تم پر اور تمہاری زندگی پر رشک آتا۔ لیکن اب

"...... تمہاری آنکھوں میں ...... !"

وہ کہتے کہتے خاموش ہو گئی۔ لیکن میں سمجھ گیا تھا کہ وہ کیا کہنا چاہتی تھی۔ اس کے باقی الفاظ میں نے اس کی نگاہوں میں پڑھے۔

"..... تو خوش نصیبی کی جھلک تک بھی نہیں۔"

اس کے باوجود میں چاہتا تھا کہ یہ کلمات اُسی کی زبان سے سنوں، میں نے اس سے پوچھا، "میری آنکھوں میں تمہیں کیا نظر آیا؟"

وہ بات کو ٹالنا چاہتی تھی، لیکن میں نے بڑی منت سماجت سے پوچھا، "کچھ تو بتاؤ۔"

بولی — "جانتے ہو — مجھے تمہاری آنکھوں کی گہرائیوں میں بہت ہی پرانے غم کا غبار چھایا نظر آتا ہے چھپانے کی کوشش نہ کرو۔ تمہاری آنکھوں کی گہرائیوں میں غم واندوہ کے بادل منڈلاتے ہیں ...... ہاں لیکن انہیں کوئی دیکھنے والی نظر ہو تاکہ گہرائیوں میں تمہارے غم خانے کی جھلک دیکھ سکے۔"

اور پھر جلدی سے بات کا رُخ بدلتے ہوئے بولی۔

"ہاں سچ سچ۔ کیا آج رات اپنا وائلن نہیں بجاؤ گے؟"

"نہیں۔"

"افسوس۔ میرا جی چاہتا تھا کہ تمہیں نزدیک سے وائلن بجاتے دیکھوں۔ میں چاہتی تھی کہ کوئی نغمہ تمہارے وائلن سے تڑپ کر نکل کر فضاؤں میں بکھر جائے اور میں سن سکوں۔"

پھر مجھے نہیں معلوم کہ کیا ہوا ...... ایسا محسوس ہوا جیسے کسی دوسرے شخص نے میری طرف سے اور میری زبان میں کہا ہو۔

"میں تنہا رہتا ہوں۔ جب تمہارا جی چاہے چلی آنا سن لینا۔"

بالکل جیسے کوئی بچہ ایک گڑیا کو پا کر خوش ہو جاتا ہے وہ بھی بالکل ویسے ہی خوش ہو گئی۔

"ضرور آؤں گی، ضرور ......"

ہمارا میزبان، جس نے ہم دونوں کی ملاقات کروائی تھی، ہماری طرف آ رہا تھا۔ میں نے جلدی جلدی اپنے ٹیلیفون کا نمبر لکھ کر اُسے دے دیا۔ اتنے وقت میں یہی کافی تھا۔ شہرہ نے مجھے کچھ اس طرح دیکھا کہ اُس کی جاذب نگاہیں میرے دل کی گہرائیوں میں اترتی چلی گئیں اُس نے آہستہ سے کہا۔ "میرا انتظار کرنا۔"

یہ انتظار کچھ زیادہ طولانی نہیں تھا۔ دوسرے دن صبح کے دس بجے تھے کہ ٹیلیفون کی گھنٹی بجی ———!

میں نے ریسیور اٹھایا۔ وہی تھی۔ پہلے ذرا رات کی دعوت کا ذکر کرتی رہی اور پھر — رات کی باتوں کے روکھے پھیکے انداز کو بدلتے ہوئے ذرا اپنائیت کے انداز میں پوچھنے لگی۔

"رات کو تو بڑی میٹھی اور گہری نیند سوئے ہو گے؟"

میں نے سچ سچ کہہ دیا۔ "نہیں۔ بالکل نہیں صبح تک جاگتا رہا ایک لمحے کو بھی آنکھ نہ لگ سکی۔"

اُس کے قہقہوں سے میرے کانوں کے پردے پھٹے جا رہے تھے۔

"پھر تو بڑی بھیانک رات گزری ہو گی۔"

"نہیں تو .... اتفاق سے بڑی اچھی اور خوبصورت رات تھی۔"

"صبح تک کیا کرتے رہے؟"

"کچھ بھی نہیں — بس سوچتا رہا۔"

"سوچتے رہے؟"

"ہاں۔"

"کیا سوچتے رہے؟"

میں خاموش رہا۔ آخرکار اُس نے میرے اوپر ضرب لگا ہی دی میں گومگو کے عالم میں تھا اور جب یہ خاموشی طولانی ہو گئی تو اُس نے اپنے سوال کو پھر دُہرایا میں پوچھ رہی تھی کس کے متعلق سوچتے رہے ہو؟"

میری سمجھ میں کچھ بھی نہ آتا تھا کہ اسے کیا جواب دوں۔ عجب "مخمصے" میں تھا۔ حقیقت یہ ہے کہ میں ساری رات اُس کے متعلق سوچتا رہا تھا لیکن میری سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ اُسے کس طرح یہ بات بتاؤں۔ کیا یہ صحیح تھا کہ صرف ایک ملاقات کے بعد اتنی عاجزی سے اپنے عشق کا اعتراف کر لوں اور اپنے غرور کو توڑ ڈالوں؟"

شہرہ میرے جواب کے انتظار میں تھی۔ میں جانتا تھا کہ وہ مجھ سے اعتراف کرانا چاہتی تھی اور شاید اس وقت اُس کے ہونٹوں پر خوبصورت بنفشہ کے پھولوں پر ایک شرارت آمیز مسکراہٹ بھی تڑپ رہی ہو بہرحال مجھے جواب تو دینا ہی تھا۔ اُس نے تیسری بار پوچھا کہ آخر وہ کون تھا، جس کی یاد میں، میں نے اپنی ساری رات آنکھوں میں کاٹ دی تھی۔ اس سے زیادہ سکوت اچھا نہیں تھا۔ آخر کبھی نہ کبھی تو بتانا ہی پڑتا — مجھے اعتراف کر لینا چاہئے تھا کہ اسی پہلی نگاہ میں اُسے دل دے بیٹھا ہوں اس رات کے بعد سارا وقت سوچنے میں گزرا۔ میں نے خود سے کہا۔ سچی بات کیوں نہیں بتا دیتا کیوں نہیں کہتا کہ رات بھر اور پھر صبح سے لے کر اس وقت تک صرف اسی کے بارے میں سوچتا رہا اور اس کے بعد بھی صرف اسی کے بارے میں سوچتا رہوں گا۔

پھر میں نے آہستہ آہستہ اور بغیر کسی شک و شبہ کے کہا۔

"تمہارے متعلق سوچتا رہا۔"

جیسے میرے دل کا بوجھ اتر گیا ہو جیسے کسی نے میرے سینے پر رکھا ہوا ایک بھاری پتھر اٹھا لیا ہو۔

اس دن غروب کے وقت شہرہ میرے گھر آئی۔ میں اسی کے انتظار میں تھا۔ صبح ہی سے مجھے اس کا انتظار تھا۔ اسی وقت سے جب ہماری ٹیلیفون کی گفتگو ختم ہوئی اور میں نے ریسیور رکھ دیا تھا اس کا انتظار کر رہا تھا۔ ایک عجیب قسم کا ہیجان، اُمید و بیم غم اور خوشی کا ایک حسین امتزاج میرے دل میں ہلچل مچائے ہوئے تھا۔ ایک طوفان برپا تھا اگر میں یہ کہوں تو مبالغہ نہ ہو گا کہ چند منٹ کے بعد میری نظر گھڑی کی طرف اٹھ جاتی تھی میرا جی چاہتا تھا کہ گھڑی کی سوئیاں تیز سے تیز تر دوڑنے لگیں اور جتنی بھی جلدی ہو سکے ساڑھے چھ بج جائیں لیکن وہ ظالم سوئیاں کتنی آہستہ آہستہ چل رہی تھیں وقت کتنا آہستہ آہستہ گزر رہا تھا۔ وہ چند گھڑیاں میرے لئے چند صدیوں بلکہ چند برسوں کے برابر ہو گئی تھیں کتنا برا وقت گزرا۔ سب جان روبرو ہو گیا تھا۔

لیکن آخرکار وہ گھڑی آ ہی گئی۔ سوئیاں نزدیک ہوتی رہیں۔ ابھی اور گھنٹہ شہرہ کے آنے میں باقی ہے

سامنے اپنے کمرے پر ایک نگاہ ڈالی۔ بڑے غور سے جائزہ لیا۔ سرخ و سفید پھولوں سے سجا ہوا گل دان میز پر رکھا ہوا تھا۔

میں نے سوچا۔ یقیناً یہ پھول اسے اچھے لگیں گے پھر میں نے کمرہ میں روشنی کا جائزہ لیا میں نے دریچوں کے پردوں کو اُٹھا رکھا تھا روشنی زیادہ تھی پردوں کو کھول دیا۔ ذرا اندھیرا سا ہو گیا پھر میں نے ایک نوجوان کی طرح جو پہلی مرتبہ ایک وعدہ گاہ میں اپنی محبوبہ سے ملنے کے انتظار میں ہو خود کو کئی بار آئینے میں دیکھا اور پھر مجھے اپنے اوپر ہنسی آگئی۔

"آخر یہ کیا بچپن ہے؟"

پھر میں نے خود کو صوفے پر گرا دیا۔ میری آنکھوں کے سامنے شہرہ کے حسین چہرے اور خوبصورت جسم کی تصویر اُبھر رہی تھی۔ میں سوچ رہا تھا۔ "شہرہ میری سرد اور خاموش زندگی میں حرارت اور ہیجان پیدا کر سکتی ہے وہ وہی ہے جس کے انتظار میں، میں نے زندگی کے اتنے سال گزار دیئے۔ زندگی کے آغاز سے آج تک مجھے اسی کا انتظار تھا۔ میرے لئے یہ بات ایسی تعجب خیز نہ تھی کہ صرف ایک ملاقات اور ٹیلیفون پر گفتگو کے بعد میں اس کا والہ و شیدا ہو چکا تھا۔

میں نے بڑی بے تابی سے گھڑی کو دیکھا۔ اس کے آنے میں صرف پانچ منٹ باقی تھے۔ میں کھڑا ہو گیا۔ بیقراری کا یہ عالم کہ ایک جگہ کھڑا ہونا دشوار ہو گیا تھا میں کمرے میں ٹہلنے لگا۔ مجھے یاد آیا۔ "صبح جب میں شہرہ سے ٹیلیفون پر باتیں کر رہا تھا اور جب میں نے اُسے بتایا تھا کہ گزشتہ رات میں نے صبح تک جاگ کر گزاری تھی اور صرف اس کے متعلق سوچتا رہا تھا تو اُس نے کوئی جواب نہیں دیا تھا . . . "

لیکن کیا لازم تھا کہ وہ کوئی جواب بھی دیتی۔

دروازے کی گھنٹی بجی۔ میرا دل دھڑکنے لگا تڑپ کر آگے بڑھا، لیکن بڑے سکون کے ساتھ دروازہ کھولا۔ شہرہ کی خوبصورت اور حسین تصویر میری آنکھوں کے سامنے تھی۔ لیکن وہ تنہا نہ تھی ایک خوبصورت خوش پوش بلند قد نوجوان بھی اس کے پہلو میں تھا قبل اس کے کہ میں کچھ کہوں — شہرہ نے کہا۔

"میرے منگیتر سے ملئے۔ آج ہی دوپہر کو یورپ سے آئے ہیں" میرا سر چکرانے لگا۔ آنکھوں کے سامنے جیسے کسی نے ایک سیاہ چادر پھیلا دی ہو۔ مجھے ایسا محسوس ہو رہا تھا کہ میرے ہونٹ آپس میں چپک کر رہ گئے ہیں میری مسکراہٹ کے پھول میرے لبوں پر ہی مرجھا کر رہ گئے۔

———

غزلیں

تازہ تازہ لڑکیاں آنے لگی ہیں رات میں
خوبصورت تتلیاں آنے لگی ہیں رات میں
اب تلک تو صرف تمہارا ذہن میں محفوظ تھا
یاد اب وہ کھڑکیاں آنے لگی ہیں رات میں
رنگ سازی کا قرینہ سیکھنے کے واسطے
ڈال پیلی تتلیاں آنے لگی ہیں رات میں
گھر کی ڈیوڑھی پر دیئے روشن کئے جو آپ نے
اس لئے تو آندھیاں آنے لگی ہیں رات میں
مختلف رنگوں کی چادر جو بچھی تھی فرش پر
دیکھنے کو تتلیاں آنے لگی ہیں رات میں
دن تو اپنا کٹ چکا ہے دھوپ میں سارا یہاں
ہاں مگر اب سردیاں آنے لگی ہیں رات میں
جب سے اس کو نوکری اچھی سی ساحل مل گئی
خوبصورت لڑکیاں آنے لگی ہیں رات میں

ساحل احمد

ہم حرفِ تمنا کو گنہ جانتے رہے
اک وہ ہے اس ادا کو کہاں مانتے رہے
میں درد سے تڑپا کیا اور دیکھئے انھیں
زخموں کو مرے پھول ہی گردانتے رہے
آیا ہے ایسا موڑ وہ زندگی میں کہ
اک دوسرے کو ہم کھڑے پہچانتے رہے
اپنی بھی نگاہیں تھیں لگی آسمان پر
کیا کیجئے ہم اس کی گلی چھانتے رہے
بیٹھے تھے بچھڑے تھے گلستاں میں چار سو
پھولوں کو اپنے پاس مگر آنتے رہے
مت پوچھئے کہ عمر گزاری ہے کس طرح
کھوئی ہوئی تھی زندگی سو ڈھونڈتے رہے
چاہا تھا کبھی خود سے محبت کروں مگر
جوہر وہ بات اپنی کہاں مانتے رہے

ایوب جوہر

تحریر اک خلوص کا جملہ نہ کر سکے
ہم بے زبان لفظوں کو یکجا نہ کر سکے
اک ہم کہ ہم نے غیروں کو اپنا بنا لیا
اور ایک وہ جو اپنوں کو اپنا نہ کر سکے
روشن کیا تھا شمعِ تمنا کو ایک بار
پھر اس کے بعد کوئی تمنا نہ کر سکے
جو ابتدائے عشق میں پہنچے کو رخ تک
وہ انتہائے شوق میں سجدہ نہ کر سکے
اے کاش رنگ لائے یوں دیوانگی مری
جو اہلِ عقل و ہوش کو دیوانہ کر سکے
خدمت گزارِ خلق کا دعویٰ ہے ان کو آج
جو اپنے والدین کی سیوا نہ کر سکے
مظفر ہر ایک فاصلہ اپنی جگہ رہا
ہم قربتوں میں اور اضافہ نہ کر سکے

مظفر صدیقی

ترقیٔ اُردو بیورو

ہیرا لال چوپڑہ

اِس مرتبہ دہلی آنے پر کم از کم میرے علم میں اس امر کا اضافہ ہُوا ہے کہ تقسیم ہند کے بعد اگر اُردو کی ناگفتہ بہ حالت کو اُس کی جنم بھومی وسطی ہند میں سنوارنے کا کسی ادارے نے ٹھوس کام کیا ہے تو وہ ادارہ ترقیٔ اُردو بیورو ہے جو حکومتِ ہند کے محکمۂ تعلیم کی طرف سے اجرا کردہ ہے۔ یُوں تو آج تک یہی دیکھنے میں آیا ہے کہ اگر کسی خاص مقصد کی تکمیل کا کام حکومت کے کسی ادارے کے سپرد کر دیا جائے تو وہ شاذونادر ہی حصولِ مدعا میں کامیاب ہوتا ہے۔ اکثر و بیشتر اُس میں اپنے پیٹ پالنے کیلئے خودغرضیوں اور سیاست کے وہ زاویے دیکھنے نصیب ہوتے ہیں کہ اکثر مطلب طاقِ نسیاں ہو جاتا ہے۔ لیکن ترقیٔ اُردو بیورو ایک ایسا ادارہ ہے۔ جس نے اُردو کو اُس کی کس مپرسی کی حالت میں ہاتھ میں لیا اور اُسے گزشتہ عظمت کے درجہ تک پہنچایا۔ اس نے زمانہ ماضی کی وہ تمام کُتب جن پر ادب اُردو کا زیادہ تر انحصار تھا اور جو تقسیم مُلک کے وقت یا تو فنا کر دی گئی تھیں یا پاکستان کو منتقل کر دی گئی تھیں، اُنھیں ازسرِ نَو نہایت مناسب قیمتوں پر پھر سے دستیاب کروانے کا بندوبست کیا۔ کون نہیں جانتا کہ فرہنگ آصفیہ جیسی اہم کتابوں کا نہ ہونا اُردو ادب کی ترقی اور رہنمائی میں کتنا بڑا روڑہ تھا لیکن اس ادارے نے اسے لاگت کی قیمت پر لوگوں کو دیا۔ اسی طرح اُردو ادب کا ماضی کا خزانہ مُہیّا کر کے اس ادارے نے ادب کو نئی زندگی بخشی اور اس کی مزید ترقی کے اسباب پیدا کیے۔

اب دیکھنے کی بات تو یہ ہے کہ یہ سب ہُوا کیسے۔ حکومتِ ہند نے نہایت دانائی سے ایک ایسی شخصیت کو اس کا سربراہ مقرر کیا جسے اُردو ادب کو فروغ دینے کا سودا سوار تھا اور جو اپنے اِس عشقِ حقیقی کو کامیاب کرنے کے لئے ہر مناسب وسائل کا استعمال جائز سمجھتی تھی۔ میری مُراد اِس بیورو کی ڈائرکٹر ڈاکٹر فہمیدہ بیگم سے ہے جنھوں نے لندن یونیورسٹی سے لسانیات کی ڈگری لی تھی اور جو بنگلور یونیورسٹی وغیرہ میں اُردو پڑھاتی تھیں۔ اُنھوں نے اس ادارے کی باگ ڈور ہاتھ میں لے کر اُسے ایسا رنگ عطا کیا کہ تمام اُردو پرست مطمئن ہو گئے کہ اب اُردو کا مستقبل تاریک نہیں، بلکہ روشن ہے۔ حکومتِ ہند سے مناسب امداد لے کر صُوبجات کی اُردو اکادمیوں کو کام کرنے پر مُستعد کیا، طباعت، کتابت وغیرہ کو بہتر بنانے کی کوشش کی تو ہندوستان کے کونے کونے میں اُردو کے فروغ کے وسائل مُہیّا ہونے لگے۔ طلباء

...ظائف دیے جانے گے اور ناشرین کو مالی
...مداد۔ ڈاکٹر فہمیدہ بیگم خود بھی اعلیٰ درجے
...کی ادیب ہیں لیکن انھوں نے ذاتی مفاد کو
...یک طرف رکھتے ہوئے، اردو ادب کی اشاعت
...ے کام کو سب سے آگے رکھ کر ایسا کام کیا کہ
اردو ادب ہمیشہ موصوفہ کا ممنونِ احسان رہے گا۔
اس ادارے نے کئی بیش قیمت مطبوعات شائع کی ہیں اور انھیں مناسب قیمت پر فروخت کرنے کا اہتمام کیا ہے جو کام کہ بہت ہی قابلِ تحسین ہے۔
اس مرتبہ دورۂ دہلی میں اس ادارے کی سرگرمیوں کو دیکھ کر یہ یقین ہو گیا کہ اب ہندوستان میں اردو کا مستقبل نہایت امید افزا، روشن اور تابناک ہے۔

غزلیں

دیپک قمر



لوگ سب ہیں یہاں تو بیگانے
لاش کس کی ہے کون پہچانے

ہار اور جیت کا کہاں سودا
کھیل کھیلے بہت سے انجانے

کیا سمجھ کے پکڑنے بیٹھے ہیں
طوطا مینا کے اڑتے افسانے

اپنا کہنا ہے ریت پر شبنم
بات تو تب ہے جب کہ وہ مانے

ٹیڑھے رستے پہ چل دیا تنہا
اس کو آتے ہیں لوگ سمجھانے

ہم کو خود بھی پتہ نہیں چلتا
درد کیسا ہے کوئی کیا جانے

اب غزل گھومتی ہے چھپروں پر
شہر بھر کے ہیں بند میخانے

ہم ہیں فنکار، دستکار نہیں
ہم کو تاپو نہ لے کے پیمانے

پھول برسیں گے ان پہ جنگل میں
کھائیں پتھر نگر میں دیوانے

کھیتوں میں جن ماہی بیٹھا کسے پکارے
بلتے ہلارے، بلتے ہلارے، بلتے ہلارے

وقت نہیں رونے دھونے کا، میلہ دیکھو
چھوٹ رہیں پھلجھڑیاں لاکھوں ساجھ کنارے

کھنک کھنک کر پائل جھنکے، تن تن چھلکے
گاؤں والا آتے جاتے کرے اشارے

کھیل سمجھ کر کھیلے جائے آنگن آنگن
چتر کھلاڑی کبھی نہ جیتے، کبھی نہ ہارے

بات پہنچ پائے تو کیسے، رستہ روکیں
دور دور سے بیری جھٹکے دیں لشکارے

رنگ برنگے جھکڑ والا، ہوا سویرا
منیاروں کے آنچل اڑتے دوارے دوارے

رنگ محل سے آنکھیں دیکھیں حیراں حیراں
جوگی الکھ جگاتا پھرتا من کو مارے

کس کا دیکھا روپ انوکھا سدا بہاری
بھول گئے ہم رنگ بدلتے سبھی نظارے

گھر باہر کوئی بھی پیر ادرد نہ جانے
چھوڑ گیا پردیسی ڈھونڈو کس کے سہارے

وقت کا فیصلہ

شبیہ عباس جارچوی

محمد پور گاؤں کا چوکیدار سلطان خاں رات کی ڈیوٹی ختم کرکے صبح سویرے نواز کے ہوٹل میں ایک چارپائی پر بیٹھا تھا۔ کڑاکے کی سردی تھی۔ سلطان خاں نے سردی سے بچنے کے لئے اوورکوٹ کے اوپر کمبل بھی ڈال رکھا تھا اور اس کی صرف آنکھیں ہی نظر آرہی تھیں ورنہ پورا جسم اس نے کمبل سے ڈھانپا ہوا تھا۔ سلطان خاں کی سیٹی، ٹارچ اور ڈنڈا پلنگ پر ایک طرف پڑے ہوئے تھے۔ اس گاؤں کی آبادی زیادہ نہیں تھی۔ یہی کوئی ڈھائی تین سو گھر ہوں گے۔ لیکن ایک بڑی شاہراہ پر واقع ہونے کے سبب اس کی اہمیت تھی۔ نواز کا ہوٹل بھی سڑک کے کنارے تھا۔ جس میں چائے، لسی، کھانا ملتا تھا اور اگر رات کو کوئی ٹرک ڈرائیور یا مسافر ہوٹل میں قیام کرنا چاہتا تو نواز نے تین چار بستروں کا بندوبست بھی کر رکھا تھا۔ نواز اس گاؤں کا باشندہ نہیں تھا بلکہ دس سال قبل کہیں اور سے آکر اس نے یہاں یہ ہوٹل کھولا تھا۔ اور اب اس کا ہوٹل اچھا خاصا چل نکلا تھا۔ نواز کی عمر یوں تو ساٹھ سال کے لگ بھگ تھی لیکن دیکھنے میں وہ اپنی عمر سے کم نظر آتا تھا۔ سلطان خاں بھی کم و بیش اس ہی کا ہم عمر تھا۔ صبح کا اجالا تو چاروں سو پھیل گیا تھا لیکن سورج ابھی نہیں نکلا تھا۔ نواز ایک دیوار کی اوٹ میں نیم گرم پانی سے غسل کر رہا تھا اور سلطان اس انتظار میں تھا کہ کب نواز غسل سے فارغ ہو اور کب تیل کے چولہے پر چائے رکھے تاکہ وہ چائے کی دو پیالیاں اور دو تین بسکٹ کھا کر وہاں سے اپنے گھر روانہ ہو۔ دونوں ہی ایک دوسرے کے روزمرہ کے معمولات سے واقف تھے۔ نواز اور سلطان ناشتہ کر رہے تھے۔

کہ سڑک پر ایک بس آکر رکی۔ اس میں سے گاؤں کے دو تین مسافروں کے علاوہ سردار علی دوا فروش بھی تھا۔ یہ دوا فروش رہتا تو لاہور میں تھا لیکن لاہور سے باہر دور دراز جانے والی مسافر بسوں میں دوائی کی شیشیاں فروخت کرتا تھا۔ وہ اس دوائی کا نام "امرت دھارا" بتاتا۔ سردار اپنی صحت کا سبب اسی دوا کو بتایا کرتا تھا۔ سردار بس کے مسافروں کو اپنے دانت دکھاتا اور کہتا کہ وہ اس کی ستر سال کی عمر میں بھی پورے کے پورے اپنی جگہ پر مضبوطی سے قائم ہیں۔ وہ بس کے مسافروں کو اپنے دانتوں کو شہادت کی انگلی اور ایک انگوٹھے سے پکڑ کر دکھاتا اور اس طرح اپنے متوقع گاہکوں کو یقین دلانے کی کوشش کرتا کہ اس کے دانت بالکل نہیں ہلتے اور یہ سب اس کے امرت دھارا کا کرشمہ تھا کہ وہ اس کے چند قطرے اپنے

توں پہ بھی بیتا تھا۔ داد، خارش، چنبل، جاتا، کٹ جانا، پیٹ کا درد، کان کا درد، بن سردار علی کا امرت دھارا ہر مرض کی دوا تا۔

سردار علی کا اندازِ بیان بالکل رکھا تھا۔ وہ اپنی بھاری بھرکم بلند آواز میں تا:۔

"میرا نام سردار علی ہے۔ میں یہ امرت ھارا بیچتا ہوں۔ میری یادگار لے جانا — داتا کی نگری کا تحفہ ہے — نبی کے صدقے جب کبھی ملو گے تو کہو گے بھائی سردار علی، شیشی اور دو پیا۔ اس کی قیمت تین روپے — وہ زمانہ اب نہیں رہا جب دو روپے کی بنس آتی تھی اور سارا گاؤں اسے دیکھنے تا تھا۔"

اور ساتھ ہی وہ اس امرت دھارا کی موصیت بتانا شروع کرتا۔

سردار علی مضبوط جُثّے کا مالک تھا۔ س کا رنگ کالا تھا اور وہ دھوپ کا چشمہ گاتا تھا۔ اُس کے بائیں کاندھے پر ایک بڑا ما تھیلا ہوتا جس میں چھوٹی اور بڑی دو سائز کی بہت سی شیشیاں ہوتیں۔ وہ بہت چرب زبان اور خوش مزاج تھا۔ بس سے اتر کر نواز کے ہوٹل کی طرف آتے ہوئے سردار علی ہیر وارث شاہ بڑی موج میں گا رہا تھا۔

"اَیسا کوئی نہ ملیا میں ڈھونڈ تھکی
جیہڑا گیاں نوں موڑ لیاوندا ای"

سردار علی نے نواز سے پُرجوش اور بے تکلفانہ معانقہ کیا اور سلطان خان سے رسمی سلام دعا کی۔ سردار علی نے نواز سے کچھ دیر اِدھر اُدھر کی باتیں کیں۔ ایک چائے پی۔ اپنے تھیلے کی شیشیوں کو جما کر رکھا اور دوسری بس آنے کے بعد اُس میں سوار ہو گیا۔ سردار کے جانے کے بعد نواز نے سلطان سے پوچھا:۔

"سلطان! تم سردار کو جانتے ہو؟"

"ہاں، یہ بسوں میں اپنا بنایا ہوا امرت دھارا فروخت کرتا ہے۔" سلطان نے جواب دیا۔

"ہاں! لیکن اس کے علاوہ کچھ اور... ؟"

"نہیں اس کے علاوہ کچھ اور تو میں نہیں جانتا۔" سلطان نے جواب دیا۔

"سردار کی بھی بڑی عجیب کہانی ہے۔" نواز نے کہا۔

سلطان کے اصرار پر نواز نے کہنا شروع کیا:

"سردار علی اور میں ایک ہی گاؤں کے رہنے والے ہیں۔ ہمارے گاؤں کا نام رالیاں والی ہے اور یہ دریائے جہلم کے کنارے واقع ہے۔ سردار علی ایک سکھ گھرانے سے تعلق رکھتا ہے۔ اس کا پہلا نام ہرنام سنگھ تھا۔ نوعمری میں ہرنام سنگھ کو گاؤں کی ایک لڑکی شہناز سے محبت ہو گئی۔ وہ بھی اُسے بڑی طرح چاہنے لگی۔ دونوں کی جوڑی بھی خوب تھی۔ اگر مذہب کا معاملہ نہ ہوتا تو ان دونوں کی جوڑی ہر طرح موزوں تھی۔ ان دونوں میں سے کوئی بھی اپنا مذہب بدلنے کو تیار تھا اور یہ دونوں ہر قیمت پہ ایک ہونا چاہتے تھے۔ رنگ روپ، قد کاٹھ، جسامت، صورت، ہر طرح یہ دونوں ایک دوسرے سے بہت ملتے تھے بلکہ ان کی صورتیں آپس میں اس قدر مشابہ تھیں کہ ناواقف شخص انہیں بڑی آسانی سے بھائی بہن قیاس کر سکتا تھا۔ جبکہ اُن کا ایک دوسرے ظاہر ہے کہ کوئی تعلق نہ تھا۔"

نواز کی بات ابھی جاری تھی کہ سڑک پر ایک تانگہ آ کر رُکا اور کوچوان نے نواز کو تانگے ہی میں اپنے اور سواریوں کے لئے چائے لانے کے لئے کہا۔ جب تک تانگہ روانہ نہیں ہوا اُس وقت تک نواز خاموش رہا اور بعد میں اُس نے پھر کہنا شروع کیا:

"ہرنام سنگھ کے والد دھرم سنگھ کو جب اس کا پتہ چلا تو اُس نے بیٹے کو اس بارے میں بہت دھمکیاں دیں اور اسی عرصے میں تقسیم ہند کی تحریک زور پکڑ گئی۔ اور سکھوں کے اکثریتی علاقوں سے آنے والے اس نعرے کی بازگشت دوسرے علاقوں میں بھی سُنائی دینے لگی "راج کرے گا خالصہ آکی رہے نہ کوئی" ایسے کشیدہ حالات میں ہرنام سنگھ اور شہناز کی چھپ چھپ کر ہونے والی ملاقاتیں بھی ختم ہو گئیں۔ اُن دنوں دھرم سنگھ نے بھی اپنے بیٹے کی شادی ایک سکھ نوجوان لڑکی سے کر دی اور کچھ عرصہ بعد یہ خاندان بھارت منتقل ہو گیا۔ سُنا گیا تھا کہ شادی

غزل

دے گا جواب کون کسی کی صداؤں کا
اپنی ہی بازگشت ہے عالم خلاؤں کا
اپنا ہی عکس دیکھ کے چھپتا رہا ہوں میں
بچ ہو تو کہاں ہے آئینہ کب بے وفاؤں کا
پھرتے ہیں اپنے سر پہ یہ پتھر لئے ہوئے
کیا خوب مشغلہ ہے صنم آشناؤں کا
بندے خدا کے ہو گئے حیراں یہ دیکھ کر
"ہر موڑ پر ہجوم کھڑا ہے خداؤں کا"
مصلوب کر کے آج مجھے کہہ رہے ہیں وہ
کتنا عظیم مرتبہ ہے دیوتاؤں کا
انسان سے ہی ہوتا ہے انسان مطمئن
آئینہ کب سمجھتا ہے مطلب اداؤں کا
منصف بنا کے اپنے ہی قاتل کو آج پھر
میں لے رہا ہوں جائزہ اپنی خطاؤں کا
جھلسی ہوئی فضاؤں کو بخشی ہے تازگی
احسان مانتا ہوں میں ٹھنڈی ہواؤں کا
اپنے ہی درد میں جو رہے مبتلا اے دردؔ
دیکھے گا کیا وہ حوصلہ درد آشناؤں کا
پریم سکھ شیل دردؔ

والے روز ہرنام سنگھ اور شہناز کی ملاقات ہوئی اور اُن دونوں نے ختم کھائی کہ وہ ساری عمر ایک دوسرے کو یاد رکھیں گے۔ شہناز نے پھر شادی نہیں کی۔"

اِس دوران ہارن کا شور مچاتی ہوئی ایک تیز رفتار بس کے سڑک پر سے گزرنے کے سبب نواز پھر کچھ دیر کے لئے خاموش ہو گیا اور تھوڑی دیر کے بعد اُس نے پھر کہنا شروع کیا۔

"ہندوستان میں ہرنام سنگھ نے لدھیانہ میں رہائش اختیار کی اور وہاں اُن کے یہاں ایک بیٹی پیدا ہوئی۔ وہ ہرنام کی اکلوتی اولاد تھی۔ اٹھارہ سال کی عمر میں اُس لڑکی نے ماں باپ کے منع کرنے کے باوجود وہاں ایک مسلمان نوجوان سے شادی کر لی۔ اس عجیب واقعہ کے بعد ہرنام سنگھ رنجیدہ رہنے لگا اور بقول اُس کے اُسے اب شہناز کچھ زیادہ ہی یاد آنے لگی۔ ہرنام کی بیوی بھی اس صورتحال سے پریشان اور رنجیدہ رہنے لگی۔ ہرنام کی اکلوتی بیٹی مسلمان ہو گئی تھی۔ میاں بیوی کشمکش میں مبتلا تھے۔

ہرنام کی بیوی کو پتہ تھا کہ اُس کا شوہر اب تک شہناز کی یاد کو دل سے نہیں بھلا سکا ہے اور شہناز بھی اب تک اُس کے نام پہ بیٹھی تھی۔ پھر ایک دن یوں ہوا کہ ہرنام کی بیوی نے شوہر کو نہ صرف اجازت دی بلکہ وہ مُصر ہوئی کہ ہرنام اپنی محبوبہ اور اُس کی بچپن کی سہیلی شہناز سے شادی کرے۔ دونوں میاں بیوی پاکستان آ گئے اور ہرنام سنگھ مسلمان ہو گیا اور اُس کا نام سردار علی رکھا گیا۔ اور پھر اُس کی شادی شہناز سے کر دی گئی۔ سردار علی تو پاکستان ہی میں رہ گیا لیکن اُس کی سکھ بیوی واپس بھارت اپنی بیٹی اور داماد کے پاس چلی گئی۔"

نواز نے سردار کی کہانی ختم کی

سُلطان خان نے آخری ہنکارا بھرا۔ اپنی سیٹی، ٹارچ اور ڈنڈا اُٹھایا اور اوور کوٹ کو ایک مرتبہ اور مضبوطی سے کسا اور اپنے گھر کی طرف روانہ ہو گیا۔

بابِ انتقاد

شعورِ زبان —
ڈاکٹر فہمیدہ بیگم
ڈیمائی سائز۔ ۱۶۰ صفحات
قیمت مجلد مع گرد پوش: ۶۵ روپے
ناشر: — ڈاکٹر فہمیدہ بیگم۔
ڈی III سی I موتی باغ I
نئی دہلی ۱۱۰۰۲۱ —

اُردُو اَدَب اور اس کی تاریخ پر تو آج تک بہت سی کتابیں لکھی گئی ہیں لیکن اُردُو لسانیات پر شاذ و نادر ہی کوئی کتاب معرضِ وجود میں آتی ہے۔ اس کتاب میں فاضل مُصنّف نے اُردُو لسانیات کے اُن گوشوں کو اُجاگر کیا ہے جن پر آج تک کسی نے نہیں لکھا۔ یہ تو سب پر واضح ہے کہ انیسویں صدی کے شروع سے ہی جب سے انگریز ہندوستان پر مکمل حکومت کرنے کے مراحل طے کر رہے تھے تو اکثر و بیشتر انگریزی الفاظ اُردُو میں زبردستی سرایت ہی کر گئے تھے بلکہ عام گفتگو میں بھی مستعمل ہوتے تھے اور بیسویں صدی کے شروع میں تو یہ ایک فیشن ہوگیا تھا کہ جہاں تک ہو سکے اُردُو اور ہندوستانی زبانوں میں زیادہ سے زیادہ انگریزی الفاظ کا استعمال کیا جائے اور سرکاری افسروں کے عہدے، اُن کی کارکردگی وغیرہ میں جو انگریزی الفاظ استعمال ہوتے تھے انھیں ہو بہو اُسی صورت میں پیش کیا جائے۔

یہ معاملہ درجۂ انتہا کو پہنچا اکبر الہٰ آبادی کے کلام میں۔ اسی لئے اس کتاب میں فاضل مصنف نے اکبر الہٰ آبادی کے انگریزی الفاظ کا استعمال پر ایک علیحدہ باب وقف کیا ہے جس سے پتہ چلتا ہے کہ اُس زمانے میں انگریزوں کی وفاداری ثابت کرنے کے لئے یہ بھی ایک فن تھا کہ صاحب لوگوں کی مستعمل زبان کو اپنی زبان میں زیادہ سے زیادہ داخل کیا جائے۔ چنانچہ اس سے تو علامہ اقبالؔ بھی نہ بچ سکے اور کوئی بھی ایسا شاعر نہ تھا جس نے انگریزی الفاظ کے استعمال کو اپنے لئے سرمایۂ افتخار نہ سمجھا ہو۔

کتاب ہٰذا میں ایک بہت ہی اہم باب ہے انگریزی الفاظ کے اُردُو میں منتقل ہونے پر اُن کے اسم جمع کا۔ کہ کس طرح سے ان انگریزی الفاظ کی جمع کو مختلف صورتوں میں استعمال کیا جاتا ہے۔ اور یہ باب اُردُو لسانیات میں ایک اہم اضافہ ہے۔ اسے پڑھ کر موجودہ اُردُو کی تازہ ترقی کی غزلوں کے نظارے آنکھوں کے سامنے آموجود ہوتے ہیں۔

اس کے علاوہ مُصنّف نے گزشتہ بیس پچیس سالوں میں اُردُو کی نشر و اشاعت کے لئے جو سرکاری اور غیر سرکاری اداروں نے کام کیا ہے اُس کا مفصل تذکرہ کیا ہے کہ کہاں کہاں سے اُردُو اکھڑ گئی تھی اور اُسے پھر سے بحال کیا گیا ہے اور اُردُو اکادمیوں اور دیگر اداروں کے توسط سے اُسے اس کے ماضی کی اہمیت سے سرفراز کیا گیا ہے۔ نیز اکثر اخبارات کے اقتباسات اور اشتہارات کے عکس دیئے گئے ہیں کہ کس طرح سے اُن میں انگریزی الفاظ اور ان کی جمع کے الفاظ کا استعمال ہوتا ہے۔ اخبارات شمالی، وسطی، جنوبی، مشرقی اور مغربی ہندوستان کے ہیں جو اُردُو میں شائع ہوتے ہیں اور اپنے اداریوں میں، خبروں میں یا دیگر مضامین میں کس طرح انگریزی الفاظ کو اور ان کی جمع کو استعمال کرتے ہیں۔ جس سے یہ بات واضح ہوجاتی ہے کہ عوام انگریزی کے اُن الفاظ سے اچھی طرح واقف ہیں اسی لئے اب ان کا ترجمہ دینے کے بجائے اُنہیں اصل صورت میں اردو خواندہ لوگوں کے سامنے پیش کیا جاتا ہے۔

کتاب لسانیاتِ اُردُو میں ایک اہم تصنیف ہے جس سے ہر اُردُو خواں استفادہ کر سکتا ہے۔ مُصنّفہ اس کتاب کی تصنیف کے لئے مبارکباد کی مستحق ہے کیونکہ اُس نے ایک بالکل نئے گوشے کو اَدَبِ اُردُو میں اجاگر کیا ہے۔ یہ کتاب ادارہ شانِ ہند سے دستیاب ہے۔

ڈاکٹر ہیرا لال چوپڑا

من کہ مکتوب الیہ

عالیجناب، تسلیمات!

آپ کی کتاب "دلی کے مشاعرے" پڑھی ہو تو کچھ عرض کروں۔ یہ جس دن آئی اسی دن سے حلقۂ احباب میں مسلسل سرکولیٹ کر رہی ہے۔ کوئی بات، کوئی انوکھا پن، کوئی انفرادیت ہے تو ضرور اس کتاب میں۔ قبولیتِ عام کسی کے حصے یوں نہیں آتی!

خدا کرے آپ صحت یاب ہو چکے ہوں۔ آپ کی درازیٔ عمر کے لئے دعا گو ہوں۔ بہت دنوں سے آپ کا تفصیلی خط پڑھنے کی لذت اور سعادت سے محروم ہوں۔ اس بار مفصل خط لکھیے گا۔

طالبِ دعا، خیر اندیش
مشتاق اعظمی

فخرِ ادارت مکرمی سرور صاحب
تسلیمات!

آپ کے موقر میگزین مئی ۱۹۹۱ء میں زیرِ عنوان "من کہ مکتوب الیہ" حضرت دلیپ بادل کا ایک مکتوب شائع ہوا ہے جو اُن کی قابلِ قدر ادب دوستی پر دال ہے۔

مَیں نقاد نہیں۔ سخن فہمی کا دعویٰ بھی نہیں کرتا۔ اس لئے کہ سخن فہمی کے لئے شعر کا مکمل احاطہ کرنے کی صلاحیت از بس ضروری ہے۔ ادب اردو سے مجھے اتنی دلچسپی ضرور ہے کہ مَیں اساتذہ کے کلام سے محظوظ ہونے کے مواقع تا حدِ امکان ہاتھ سے نہیں جانے دیتا

بادل صاحب نے حضرت زار علامی کے اپنے ہی اصلاح شدہ شعر ؎

راہِ اُلفت میں ذرا دیکھ کے چلنا اے زار
مُنہ کے بل کب نہ گرے دوڑ کے چلنے والے

کے مصرعۂ اوّل کی تصحیح یوں فرمائی ہے:

؏ - عشق کی راہ ہے اب زار سنبھل کر چلئے

"راہِ اُلفت" کو بادل صاحب نے "عشق کی راہ" میں بدل دیا ہے۔ اس اصلاح کا محرک غالباً یہ احساس رہا ہے کہ زبانِ شعر کو حتی الوسع روزمرہ کی بول چال کے قریب ہونا چاہئیے۔ اضافت بول چال میں بالعموم غیر مستعمل ہے۔ اس عمل اصلاح میں بادل صاحب کچھ لسانی، ادبی اور فنی مطالب کا شکار ہوگئے۔

عشق ایک شدید جذبہ ہے۔ راہِ عشق میں سنبھل کر چلنا جوئے شیر کا لانا ہے۔ راہِ اُلفت میں سنبھل کر چلنا ضرور ممکن ہے۔

پھر موصوف اصوات کی معنویت کو بھی نظر انداز کر گئے۔ "عشق کی راہ ہے" میں ہائے ہوز کی تکرار ثقیل ہے۔ قافِ قرشت اور کافِ کلمن کی قربت بھی ناگوارِ گوش ہے۔

زار صاحب کے مصرع میں صنعتِ تجنیس کی خوبی تھی جو بادل صاحب کی اصلاح میں مفقودالخبر ہوکر رہ گئی۔ شعر کے مصاریع کے آخری الفاظ "چلنے" اور "والے" قوافی نہ سہی، ایک عیب نحوی کی کیفیت ضرور پیدا کر دیتے ہیں۔ اصلاحِ بادل نتیجۂ تعجیل ہے یا اصلاح برائے اصلاح۔

آزادانہ اظہارِ رائے کے لئے معذرت خواہ

احقر
نونہال کرخی ایم۔ اے
ریٹائرڈ پرنسپل

مکرمی سرور صاحب، سلام و رحمت

تازہ شمارہ پہنچ گیا تھا۔ محترم ڈاکٹر چوپڑہ صاحب کا معلوماتی، علمی اور تاریخی مضمون خوب سے خوب تر ہے۔ وہ صاحبِ قلم محقق اور ادیب ہیں۔ یاد پڑتا ہے کہ وہ حضرت تحقیق بھی کرتے ہیں جب تاریخ پر وہ تقریر فرماتے ہیں تو کلکتہ کے مسلمان نعرۂ تکبیر سے پنڈال کو سر پر اٹھا لیتے ہیں۔ کیسے پیارے ہندو ہیں کہ جن کی زبان اسلامی ہے۔ قول ہے جس کے ہاتھ اور زبان سے کسی کو کوئی تکلیف نہ پہنچے وہ مسلمان ہوتا ہے۔ اس کسوٹی پر کتنے مسلمان پورے اُترتے ہیں، بس اُنگلیوں پر گن لیجئے۔ ان سے کہئے وہ اس قسم کے یادگاری مضامین ضرور لکھا کریں۔ مَیں ان کو ہمیشہ انسانیت کے علمبردار کے نام سے پکارتا ہوں۔ اُن کی ذاتِ گرامی اور دم آج بھی غنیمت ہے۔ اللہ تعالیٰ اُن کی عمر دراز کرے۔ آمین!

خیر طلب
کریمی الاحسانی

محترمی سرور تونسوی صاحب،
تسلیمات!

اُمید ہے مزاج بخیر ہوگا۔ آپ کی ارسال کردہ کتابیں مل گئی تھیں۔ شکر گزار ہوں۔ یہاں تقریبات اور عالمی مشاعروں میں مصروف رہا۔ اس لئے جواب وقت پر نہ دے سکا۔ معذرت قبول کریں۔ بات یہ ہے کہ یہاں جتنے بھی مشاعرے ہوتے

[illegible] ان میں سے نوے فیصد میں اسٹیج کرتا ہوں۔ اس سے مصروفیت رہتی ہے۔ "دلّی کے مشاعرے" خاصے کی چیز ہے۔ میں آج کل اسے پڑھ رہا ہوں۔ انشاء اللہ تفصیلی مضمون لکھ کر چھپواؤں گا، اور پھر آپ کو ارسال کروں گا۔ ماہر القادری صاحب پاکستان آئے ہوئے تھے مگر ملاقات نہ ہو سکی۔ اس کا افسوس ہے۔ ملتان میں ہم نے عالمی مشاعرہ کرایا تھا جناب علی سردار جعفری، ملکہ نسیم اور ریحانہ نواب سے ملاقات ہوئی تھی۔ آپ کا ذکر بھی رہا۔ خاص طور پر ملکہ نسیم سے۔ میں بار بار آپ کو لکھ رہا ہوں کہ پاکستان کا چکر لگائیں۔ ضروری ہے۔ زندگی کا تو بھروسہ نہیں، ایک بار آ ہی جائیں۔ یہاں آپ کو کوئی تکلیف نہیں ہوگی۔ ہر طرح کا آرام ملے گا۔ اس بارے میں ضرور سوچیں اور فیصلہ کریں۔ ستمبر، اکتوبر میں یہاں موسم خاصا خوشگوار ہوتا ہے۔ بس آ ہی جائیں۔

کافی دنوں سے رسالہ نہیں ملا۔ بھابی صاحبہ کا کیا حال ہے۔ انھیں میرا آداب کہیں اور ساتھ انھیں ساتھ لانا نہ بھولیے گا۔

میرے لائق کوئی خدمت ہو تو تحریر فرمائیں۔

خیر اندیش
طاہر تونسوی

سے بارے میں آپ کی کتاب شائع ہوگئی۔ خوشی ہوئی۔ ایک بار آپ نے فرمائش کی تھی کہ میں اس کا دیباچہ لکھ دوں۔ باوجود مصروفیت میں نے جواب میں لکھا تھا کہ آپ کا حکم واجب التعمیل ہے، لکھ دوں گا۔ پھر آپ کا کوئی خط نہ آیا۔ میں نے گمان کیا کہ آپ نے ارادہ بدل دیا ہوگا۔ یہ اس لئے لکھ رہا ہوں کہ شاید آپ کو وہ خط نہ ملا ہو۔ اس زمانے میں میں دلّی میں تھا۔ اور آپ کو بجا ہو کر میں نے جواب نہ دیا۔

نیاز مند
شمس الرحمٰن فاروقی

مشہور محقق جناب انور سدید کا فرمان

دِلّی کے مُشاعِرے

مُشاعِروں کی تخیلی رُوداد نگاری کا اوّلین نقش مرزا فرحت اللہ بیگ نے بنایا۔ اس کو تمثیلی رُوپ دتاتریہ کیفی نے دیا۔ آزادی کے بعد ۶ر فروری ۱۹۵۰ء کو جب دہلی میں بھارت کے جشنِ جمہوریہ پر لال قلعہ میں پہلا مشاعرہ ہوا تو اس کی رُوداد سرور تونسوی نے لکھی اور یہ اتنی مقبول ہوئی کہ اُن سے ہر سال اس قسم کی رپورٹ لکھنے کا مطالبہ کیا جانے لگا۔

زیرِ نظر کتاب "دلّی کے مشاعرے" ۱۹۵۰ء سے لے کر ۱۹۸۴ء تک کے اہم مشاعروں کی رُوداد ہے۔ سرور تونسوی نے ان مشاعروں میں محض ایک شریکِ محفل شخص کا فریضہ ادا نہیں کیا، بلکہ وہ اِن مشاعروں میں نکتہ رسی اور سخن شناسی کا ثبوت بھی دیتے ہیں۔ اور ہر غزل پر اپنا بے لاگ تبصرہ کر کے غزل کی تعیینِ قدر بھی کر ڈالتے ہیں۔ اس ضمن میں اُن کی ایک خوبی یہ ہے کہ وہ صداقتِ رائے سے گریز نہیں کرتے اور کسی کو ستائشی رائے کی روشنی میں سرافراز ہونے کا موقعہ بھی نہیں دیتے۔ اس کتاب میں سرور تونسوی ایک ناظر کی صورت میں سامنے آتے ہیں جو مشاعرے کے خبر کار کی سب حرکتیں دیکھ رہا ہے انہیں لوحِ دل پر محفوظ کر رہا ہے اور اب انھیں کتابی صورت دے کر اس دور کی یادوں کو تازہ کر رہا ہے۔

مُشاعرہ اُردو تہذیب کا ایک اہم اور روشن ادارہ تھا، لیکن مرورِ ایام کے ساتھ شاعر تفریح رساں بن گیا اور مشاعرے کا تہذیبی مزاج رُو بہ زوال ہو گیا۔ یہ کتاب مشاعرے کے عروجی دور سے شروع ہوتی ہے اور اس کے زوال آمادہ دور تک کی تاریخ بالواسطہ سامنے لے آتی ہے۔

اسے مکتبہ شانِ ہند نے خوبصورت انداز میں شائع کیا ہے۔

انور سدید

"اوراق" خاص نمبر، جون جولائی ۱۹۹۱ء

برادرم، تسلیمات!

شانِ ہند کا تازہ شمارہ (مئی ۱۹۹۱ء) ابھی ملا۔ شکر گزار ہوں۔ یہ دیکھ کر بہت خوشی ہوئی کہ آپ نے خدا بخش لائبریری کے دفاع میں لکھا۔ آپ نے بالکل حق لکھا۔ بیدار صاحب جس محنت، لیاقت اور بیدار مغزی سے خدا بخش لائبریری کا نظم و نسق چلا رہے ہیں، وہ قابلِ داد ہے۔ رضوان احمد صاحب خدا معلوم کیوں عرصۂ دراز سے بیدار صاحب کے خلاف لکھتے رہے ہیں۔ وہ میرے بھی دوست ہیں اور میں نے اُن کو منع بھی کیا تھا کہ اس طرح کی باتیں انھیں زیب نہیں دیتیں۔

اس شمارے سے یہ بھی معلوم ہوا کہ مشاعرے

شانِ ہند

جلد ۵۲ شمارہ ۔

چیف ایڈیٹر
سرور تونسوی

جوائنٹ ایڈیٹر
مُطرب صحرائی

اشاعت کا ۵۲ واں سال

پرنٹر، پبلشر، پروپرائٹر: وِدیا پرکاش سرور تونسوی
طباعت: خواجہ پریس، جامع مسجد دہلی۔ مقامِ اشاعت: دفتر ماہنامہ
"شانِ ہند" فلیٹ ۵ انصاری مارکیٹ، دریا گنج، دہلی ۱۱۰۰۰۲۔

اس شمارے کی اہم جھلکیاں

بنجابیوں کے جذبات اور احساسات کی ترجمانی دوسری سیاسی پارٹیوں سے بہتر بھاجپا کرتی ہے۔ وہ سب کچھ کہہ دیتی ہے جو بہت سے شوسکر دلوں میں چھپا ہوا ہے۔

بی جے پی سے ارتباط

عورت خوشبو، نغمہ، رقص اور روشنی کا مجموعہ ہے۔ عورت سب سے اچھا آسمانی تحفہ ہے ....

ڈاکٹر انجنا سندھیر جنیوں کی شاعرہ۔

"رسائی" کہانی۔ عابدہ نرجس۔ "جلتے رہے تنہا تنہا" کہانی، قمر آفاق۔ "گونگی غزاہت" کہانی، انور احمد "دو بافلح" کہانی، روشن آرا نزہت۔ "ملاقات ایک نقاد سے" مزاحیہ خاکہ، وجاہت علی سندیلوی۔

حقیر آشتانی، دیپک قمر، کالی داس گپتا رضا، دیوانہ دوجگی، قمر ایلوی، اختر شاہجہانپوری، مسنتر منتہی، ساحل احمد کی غزلیں۔ "میرا وطن" نظم، عرفان زیدی بدایونی۔

شرندو سیا حاشیے، بابِ انتقاد، حرفِ مکتوب الیہ مستقل کالم بہ دستور۔

ہندو پرست ہوں نہ مسلماں پرست ہوں
دامن پرست ہوں نہ گریباں پرست ہوں
ہر ذرۂ وطن سے ہے فیاض مجھ کو پیار
یعنی وطن پرست ہوں انساں پرست ہوں

فیاض گوالیاری

ممالکِ غیر میں:۔
بذریعہ سمندری ڈاک ۔/۱۰۰ روپیہ
بذریعہ ہوائی ڈاک ۔/۲۴۰ روپیہ

قیمت فی شمارہ
قیمت سالانہ
لائف ممبری

غزل

ڈاکٹر حقیر استانی مرحوم



کم نگاہی چڑھ رہی پروان ہے
پڑ گئی جوکھوں میں اپنی جان ہے

کیا کہیں کیسے نوازش کر گئی
زندگی تو بے سر و سامان ہے

جو بھٹکتا پھر رہا ہے چار سُو
آپ ہی کا عہدِ پیمان ہے

برسرِ پیکار اپنی ذات سے
آخرش انسان تو انسان ہے

آ سکا شاید سمجھ میں آپ کی
کیا یہاں مشکل ہے کیا آسان ہے

لاکھ اس میں پھول پتے ہیں مگر
یہ جگہ سنسان ہے ویران ہے

آج بھی زندہ ہو تم کیسے حقیر
بس نرالی ہی خدا کی شان ہے

جناب سرور تونسوی علیل ہیں اس لئے اداریہ نہ لکھ سکے۔ محترم سید حامد صاحب سابق وائس چانسلر مسلم یونیورسٹی علی گڑھ کے زریں خیالات پیش خدمت ہیں۔

مضطرب صحرائی

بی جے پی سے ارتباط

ہندو ہندوستان کی ترجمان دراصل بھاجپا ہے۔ ہم اس کے قریب جائیں گے، اس سے بات کریں گے تو ہمیں معلوم ہوگا کہ ہندو، مسلمان کے بارے میں کیا سوچتے ہیں۔۔۔

راقم السطور نے اپنا جھکاؤ پسماندہ طبقوں، مدرج فہرست ذاتوں اور قبیلوں اور ترقی پسندوں کے ساتھ اتحاد کی طرف ظاہر کرتے ہوئے ایک بار سے زیادہ یہ سمجھا بھی دیا ہے کہ ہمیں انتہا پسند ہندو سیاسی پارٹیوں کو دشمن سمجھ کر انھیں نظر انداز کرنے کے بجائے ان سے گفتگو کا دروازہ کھولنا چاہئے۔ اسے بیدا شبہ نہیں تھی کہ ہم سے گفتگو کے بعد انتہا پسند تنظیمیں جن کی نمائندگی بھاجپا کرتی ہے، ہمارے بارے میں اپنے ذہنوں میں کوئی نرم گوشہ ڈھونڈ نکالیں گی لیکن اسے [illegible] سمجھی کہ قریب جانے سے بہت سی غلط فہمیاں دور ہو جائیں گی اور کم سے کم تعصب کی [illegible] یہ توقع اور [illegible] اب بھی [illegible] ہے کیونکہ [illegible]

اختلافات کی ترجمانی دوسری سیاسی پارٹیوں سے بہتر بھاجپا کرتی ہے۔ وہ سب کچھ کہہ دیتی ہے جو بہت سے دوسرے دلوں میں چھپا ہوا ہے۔ دوسری پارٹیوں میں ایسے بہت سے لوگ ہیں جو بھاجپائی عقائد اور رجحانات رکھتے ہیں، لیکن سیکولرزم کی پوشاک پہن لیتے ہیں اور کھل کر سامنے نہیں آتے۔ ہندو ہندوستان کی ترجمان دراصل بھاجپا ہے۔ ہم اس کے قریب جائیں گے، اس سے بات کریں گے تو ہمیں معلوم ہوگا کہ ہندو، مسلمان کے بارے میں کیا سوچتے ہیں اور کیا عزائم رکھتے ہیں۔ ممکن ہے کہ جو تصویر ان ملاقاتوں اور مکالموں سے اُبھرے وہ زیادہ دل خوش کن نہ ہو۔ لیکن ہم خوش آئند باتوں کی تلاش میں نہیں نکلے۔ ہم تو حقیقت کو جاننا چاہتے ہیں، حقیقت کی تہہ تک پہنچنا چاہتے ہیں۔ حقیقت کو پہچانے بغیر کوئی لائحۂ عمل مرتب ہی نہیں کیا جا سکتا۔ راقم اب بھی اپنے مذکورہ بالا سجھاؤ پر قائم ہے۔

قارئین پوچھ سکتے ہیں کہ "اب بھی" کی معنویت کیا ہے۔ پچھلے کچھ دنوں میں بھارتیہ جنتا پارٹی نے تشدد کے وہ دانت دکھا دیے ہیں، جو ہونٹوں کے پیچھے چھپے ہوئے تھے۔ میں رتھ یاترا سے تعلق والے تشدد کی بات نہیں کر رہا ہوں، بلکہ اس تشدد آمیز افتادِ طبع اور طریقِ فکر کی جو پہلے الیکشن سیل یا چناؤ علامت کے سلسلے میں چیف الیکشن کمشنر کے خلاف ظاہر ہوا۔ اس کے بعد اُس کا اظہار اس حملہ کی شکل میں ہوا جو بھاجپائیوں نے شری مادھو راؤ سندھیا کے مکان پر اپنے غم و غصہ اور اپنی بڑھتی ہوئی طاقت کو ظاہر کرنے کے لیے کیا تھا۔ غم و غصہ اس بات پر کہ شری سندھیا نے انتہاپسندوں کو دیش دروہی یا غدار وطن کہہ دیا تھا۔ تیسری بار طاقت کے زعم اور نکتہ چینی کو برداشت نہ کرنے کی عادت کا پُرتشدد اظہار ابھی حال میں لوک سبھا میں سید شہاب الدین کے خلاف ہوا۔ پارلیمنٹ میں بھاجپا کے معزز ممبران نے جنتا دل کے مذکورہ ممبر کے بظاہر بے ضرر سے

مسلمانوں کو بھارتیہ جنتا پارٹی اور دوسری انتہاپسند ہندو تنظیموں کے ساتھ بیٹھ کر اُن کی شدت اور تشدد کو افہام و تفہیم کے ذریعے کم کرنے کی کوشش کرتے رہنا چاہیئے۔ قریب آنے سے نفرت گھٹتی ہے۔ ہم اُن سے باتیں کریں گے تو یہ آہٹ بھی ملے گی کہ ہمارے تئیں اُن کے منصوبے دراصل کیا ہیں۔

الفاظ پر مشتعل ہو کر اُسے سبق سکھانے کی ٹھانی۔ اور چاروں طرف سے اس پر حملہ کر دیا۔ وہ تو جنتا دل اور ترقی پسند پارٹیوں کے ممبر آڑے آ گئے ورنہ سید شہاب الدین کی جان کے لالے پڑ گئے تھے۔ یہ بات بالکل الگ ہے کہ بھاجپا کی حالیہ غیر معمولی توانائی کا سرچشمہ ایک حد تک خود معزز ممبر کی سابق پالیسیاں تھیں۔

ان تینوں واقعات سے ثابت ہوتا ہے کہ بھاجپا کا طرزِ فکر اور طریقِ عمل اور افتادِ مزاج جمہوریت میں شرکت کے باوجود جمہوریت کے سانچے میں نہیں ڈھل پایا ہے۔ یہ پارٹی کسی وقت جمہوریت کو خیرباد کہہ کر آمریت کو گلے لگا سکتی ہے اگر ہم نے اُسے (۱) اپنی روش پر دراز ہونے کا موقع دیا (۲) اس کی طاقت میں اضافے کے امکانات پیدا کر دیئے، تو یہ ہمارے ملک کے جمہوری نظام کے لیے خطرہ بن سکتی ہے۔ جمہوریت کی بنیاد رواداری، فراخدلی اور دوسروں کے ساتھ خیر خواہی اور کمزوروں کی دستگیری پر رکھی جاتی ہے۔ انتہاپسندی، بے اعتدالی، کٹرپن، تنگ نظری جمہوریت کو راس نہیں آتیں۔ تشدد خواہ وہ جسمانی ہو یا زبانی یا ذہنی، جمہوری نظام کے لیے سمِ قاتل ثابت ہوتا ہے۔

بھاجپا جب تک تشدد کو تلانجلی نہیں دیتی جمہوریت کی محفل میں بیٹھنے کا استحقاق پیدا نہیں کر پائے گی۔ ایک استحقاق تو اسے ووٹروں نے دے ہی دیا ہے، لیکن دیکھنا یہ ہے کہ وہ اس کی لاج رکھ بھی سکتی ہے یا نہیں ــــ استحقاق دراصل طرزِ عمل سے ثابت ہوگا۔ اس حوصلہ فرسا صورتِ حالات کے باوصف بلکہ اس کی وجہ سے اور زیادہ، راقم سطور یہ سمجھتا ہے کہ مسلمانوں کو بھارتیہ جنتا پارٹی اور دوسری انتہاپسند ہندو تنظیموں کے ساتھ بیٹھ کر اُن کی شدت اور تشدد کو افہام و تفہیم کے ذریعے کم کرنے کی کوشش کرتے رہنا چاہیئے۔ قریب آنے سے نفرت گھٹتی ہے۔ ہم اُن سے باتیں کریں گے تو یہ آہٹ بھی ملے گی کہ ہمارے تئیں اُن کے منصوبے دراصل کیا ہیں۔ ملنے جلنے اور باہم گفتگو کرنے کا یہی ایک فائدہ کیا کم ہے۔ ہمیں مخالف منصوبوں کے خلاف تیاری کرنے کا موقع بھی مل جائے گا۔ اُن کی کتابِ تنظیم سے کچھ اوراق ہم اپنی منفعت کے لیے اُڑا بھی سکتے ہیں۔

انگریزی مثل ہے کہ خطرہ کی اطلاع بروقت مل جانے سے ہماری دفاعی طاقت دوگنی ہو جاتی ہے۔ ہم میں سے کوئی بھی یہ نہ چاہے گا کہ وہ اچانک پورش کا ہدف بن جائے۔ غرض جس زاویے سے دیکھیے، ان لوگوں سے بات چیت مفید ہوگی، جنہیں ہم اپنا بدخواہ سمجھتے ہیں۔ خیرخواہوں سے بات کر کے ہم کیا کریں گے۔ اُن کا

مسلمانوں کیلئے تو جسمانی توانائی اور پھرتی اور مستعدی اور زیادہ ضروری ہیں کہ ان غریبوں کو اکثر فسادات کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ ایسا لگتا ہے کہ وہ ان کا معمول بنے گئے ہیں۔ وہ لوگ بہت پھوہڑ، بے ڈھنگے اور انجام فراموش ہوں گے جن پر حملے ہوتے رہیں اور وہ دفاع کی فکر بھی نہ کریں.....

جھکاؤ تو ہماری طرف ہے ہی اور وہ ہمیں، ہماری ضروریات اور شکایات کو سمجھتے ہیں۔ سمجھانا، قائل کرنا، رام کرنا تو ان لوگوں کو ہے جو فاصلے اور غلط فہمیوں کی بنا پر ہمارے درپے آزار ہیں۔ دوستی کا ہاتھ بڑھانے کا حق اُسی کو پہنچتا ہے جس کے ہاتھ مضبوط ہوں۔ جس کے دست و بازو مضبوط نہ ہوں، وہ تعلقات استوار کرنے کے لئے ہاتھ نہیں بڑھاتا، سر جھکاتا ہے۔

ہمیں اپنے اہلِ وطن، بلکہ اُن کی اکثریت کے ساتھ دوستی، خیر اندیشی، مفاہمت، آشتی، ہم آہنگی کے تعلقات قائم کرنے ہیں۔ یہ تعلقات برابری کی سطح پر ہی قائم کئے جا سکتے ہیں۔ اگر ہم اُن کے برابر نہ ہوئے تو سائل کی حیثیت سے ہی اُن کے سامنے جائیں گے۔ سوچئے کہ اگر عزتِ نفس ٹوٹ گئی تو باقی کیا رہا۔ اُس بقائے باہم کا، عزتِ نفس جس کی حلیف ہو، تقاضہ ہے کہ ہم تعداد کو چھوڑ کر باقی ہر لحاظ سے اکثریت کے برابر ہوں۔ کہنے کو تو ہم نے "باقی ہر لحاظ سے" کہہ دیا، لیکن رُوئے سخن صرف تین باتوں کی جانب تھا، افرادی طاقت جس سے بنتی ہے (۱) تعلیم (۲) صحت اور (۳) تنظیم۔

اُن لوگوں نے جو مسلمانوں کی فلاح کی سوچتے رہتے ہیں، ایک عرصے سے صدرِ فکر میں حصولِ تعلیم کو بٹھا رکھا ہے۔ اس سے بہتر انتخاب ہو بھی نہیں سکتا تھا۔ علم کے تعلق سے مسلمان کچھ کچھ جاگتے ہیں، کسمساتے ہیں۔ اس گاڑی کو جس کا انجن بیٹری کمزور ہونے کی وجہ سے چلنے سے انکار کر دیتا ہے، دھکے دے کر چلاتے ہیں۔ انجن بار بار فریاد کر کے رُک رہا ہے، گاڑی کو ایک بار زور سے دھکا دے دیجئے تو وہ دیکھتے ہی دیکھتے برق رفتار ہو جائے گی۔

لیکن صحت کی طرف جو تعلیم سے کم اہم نہیں ہے، ہم دھیان ہی نہیں دیتے۔ شومئی قسمت کہ ہم نے اکھاڑوں میں جانا ہی چھوڑ دیا۔ گھر پر بھی نہ ڈنڈ لگاتے ہیں، نہ مگدر ہلاتے ہیں۔ صبح کو ہمارے نوجوان نہ سرِ راہ، نہ سرِ میدان دوڑتے یا کسرت کرتے ہوئے نظر آتے ہیں۔ نہ اُن کے دست و بازو فولاد آسا ہیں، نہ اُن کی ٹانگیں اور پنڈلیاں توانائی اور پائیداری کی شہادت دے رہی ہیں۔ نہ اب وہ کھیلوں کے میدان میں امتیاز حاصل کر رہے ہیں، نہ مہم جوئی کے لئے نکل رہے ہیں۔ نہ وہ کسرتی جسم اور اس کی لائی ہوئی جامہ زیبی پر فخر کرتے ہیں، نہ جسمانی طاقت کے نشے کا احساس رکھتے ہیں جس کے آگے دیوار آئے تو چکنا چور ہو جائے۔

زمانے کے جھٹکوں نے ہمیں محنت اور طاقت بخش غذا سے دو گونہ کر دیا ہے اور ہمیں مسئلے اور لوگوں اور تیل کی گود میں ڈال دیا ہے۔ علم اور عقل کی فضیلت تسلیم، لیکن جسمانی صحت اور طاقت کے بغیر گاڑی چلتی نہیں۔ انسان ولولہ، اُمنگ، حوصلہ، اور زندگی کے لطف سے محروم ہو جاتا ہے۔ خدارا کسلمندی، سستی اور آسائش طلبی کو ترک کیجئے۔ اُٹھئے، صحت بنائیے، جسم بنائیے۔ صحت سے ذہن کو مہمیز دیجئے اور جینے کا ذوق پیدا کیجئے۔ وہ دَور بھی اب ختم ہو چلا ہے جس میں علم اور عقل کے سہارے سب کام ہو جایا کرتے تھے۔ اب تو ہر سیاستداں اور ہر صاحبِ اقتدار اور ہر افسر کو چاق و چوبند اور ستواں رہنا پڑتا ہے۔ دہشت گردی انسان کو پھر جنگل کی زندگی اور اس کی پھرتی اور چالاکی کی طرف لے جا رہی ہے۔

جو لیس ریبیرو کی مثال آپ کے سامنے ہے۔ دو بار دہشت گردوں نے اُن پر حملہ کیا۔ پہلی بار پنجاب میں اور دوسری بار رومانیہ کی راجدھانی بخارسٹ میں۔ کوئی اور ہوتا تو وہیں ڈھیر ہو گیا ہوتا، لیکن پولیس کے اس معمر افسر نے اپنے جسم کو تیغِ ہندی کی پرورش اور کساؤ دے رکھا تھا اور اس کے ساتھ ساتھ دماغ کو ہمہ وقت حاضر رہنے کے آداب سکھا دیے تھے، چنانچہ ایک بار دشمنوں کا وار خالی گیا اور دوسری بار اوچھا رہا۔

مسلمانوں کے لئے تو جسمانی توانائی اور پھرتی اور مستعدی اور زیادہ ضروری ہیں کہ ان غریبوں کو اکثر فسادات کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ ایسا لگتا ہے کہ وہ ان کا معمول بن گئے ہیں۔ وہ لوگ بہت پھوہڑ، بے ڈھنگے اور انجام فراموش ہوں گے جن پر حملے ہوتے رہیں اور وہ دفاع کی فکر بھی نہ کریں۔ دفاع کے لئے جسموں کو مضبوط اور مکانوں کو محفوظ بنانا ہوگا۔ جس ملک میں ہو، حوادث اور بیماریوں کے لئے فرسٹ ایڈ یعنی فوری امداد کا اہتمام کیا جاتا ہے تاکہ معالج کے آنے یا اسپتال لے جانے تک مریض یا مجروح سنبھالا جا سکے، فسادات سے دفاع بھی اہم فرسٹ ایڈ کے اصول میں شامل کر سکتے ہیں۔ آگے دیکھئے دہلی پولیس کی ...

حکومت کی ہے۔

انفرادی طاقت اور پھرتی ہمیں زیادہ دور تک نہیں لے جا سکتی۔ اجتماعی طاقت تنظیم سے آتی ہے۔ تنظیم کو جسمانی ورزش اور ذہنی کاوش دونوں درکار ہیں۔ تنظیم انفرادی انا اور بے راہ روی کو گوارا نہیں کرتی۔ اُسے خانہ جنگی ایک آنکھ نہیں بھاتی۔ جماعت فرد کو اپنا رُکن بناتے وقت اس سے کچھ ایثار مانگتی ہے اور اس کے عوض اُسے بہت کچھ دے ڈالتی ہے۔ ایثار صرف اس قدر کہ افراد آپس میں جُڑ جائیں، مل کر ایک نامیاتی وحدت بن جائیں۔ سر جوڑ کر بیٹھیں، قدم ملا کر چلیں اور اس احساس کو اپنے دل میں پیوست کر لیں کہ جماعت سے کٹ کر فرد کا فائدہ بلکہ اس کا وجود عارضی اور بے معنی ہو جاتا ہے۔

ہمیں وہ ہاتھ درکار ہے جو تعاون، محبت اور دوستی اور یگانگت کے لیے بڑھے، بلکہ پنجہ کشی کی نوبت آئے تو ایک پل نہ جھکپائے۔ دُنیا میں ضعیفی سے بڑھ کر کوئی جرم نہیں ہے۔ جھکی ہوئی گردن کے ساتھ جو ہاتھ بڑھایا جاتا ہے وہ دوستی کا ہاتھ نہیں ہوتا، گداگری کا ہاتھ ہوتا ہے۔ ہم اپنے قارئین کو ایسے ہاتھ اٹھانے کی ترغیب نہیں دے رہے ہیں۔ ہم تو انھیں صرف توانائی، سرفرازی، اور تنظیم کی تلقین کر رہے ہیں کہ ان کے بغیر ہمارے اہلِ وطن دوستی کے لیے بڑھائے ہوئے ہمارے ہاتھ کو اپنے ہاتھ میں عزت کے ساتھ لینے کے لیے تیار نہیں ہوں گے۔

غزلیں

دیپک قمر



چڑھتے سورج کو نمسکار کریں گے کیسے
رات بھر جاگ کے ہم صبح اٹھیں گے کیسے
سُننے والا جو کہیں بن بھی گیا تو کیا ہے
فکر تو یہ ہے کہ ہم دل کی کہیں گے کیسے
ساتھ پایا تو ہمیں اور ہوئی ہے مشکل
تھک کے ہارے ہوئے قدموں سے چلیں گے کیسے
ماناٹھن میں تری سوانگ بھرے ہیں خوشیاں
بات بے بات پہ بن کھلے ہنسیں گے کیسے
بن کے ہرکارے چلے جائیں گے رُت کے بادل
اُس کا انجان پتہ خط پہ لکھیں گے کیسے
دلدلی ریت پہ لے جاتی ہے اُن کا پانی
دھارے اس راہ سے آگے کو بڑھیں گے کیسے
درد کا سوتا کہیں ساتھ نہ لے کر ڈوبے
یہ رُکے آنسو ترے گیت بنیں گے کیسے

جب تری آخری گھڑی ہوگی
ساتھ کوئی نہ جو کڑی ہوگی
بات کرنے سے وہ جھجکتے ہیں
آنکھ چوری سے ہی لڑی ہوگی
جب بھی موسم ادھر سے گزرے گا
ہاتھ میں پھول کی چھڑی ہوگی
ننھی کونپل جو دل میں پھوٹی ہے
وقت پا کے ہی وہ بڑی ہوگی
دیکھ کے جس کو یاد آئے گا
وہ نشانی کہیں پڑی ہوگی
جب وہ توڑے گا بات کی ریکھا
در پہ آ کے سحر کھڑی ہوگی
دل جلا جل کے راکھ جب ہوگا
بارشوں کی لگی جھڑی ہوگی
میں کہیں ہو پیار والوں کا
داستاں ہر جگہ اُڑی ہوگی
دو دلوں کے ملن کی گھڑیوں میں
شب کے ہاتھوں میں پھلجھڑی ہوگی
تم سے پہلے بھی کوئی پہنچا ہے
ایک جھنڈی وہاں گڑی ہوگی
بات چلتی رہے روایت کی
ہر غزل اس کی ہی لڑی ہوگی

رباعی

وقت کے پہیوں کو ٹھہر جانے دے
یا کام کے ریلے کو گزر جانے دے
کب تک میں رہوں رہین ورزش دیکھو
اے شعر کی لذت مجھے گھر جانے دے

کالی داس گپتا رضا

غزل

قلم اُٹھاؤں مسلسل رواں دواں لکھ دوں
کوئی پڑھے نہ پڑھے میں کہانیاں لکھ دوں

جہاں تلک آئیں تصور میں وادیاں لکھ دوں
پھر اُن پہ نام تمہارا یہاں وہاں لکھ دوں

جہاں ملے مجھے روئی اُسے لکھوں دھرتی
جہاں پہنچ نہ سکوں اُس کو آسماں لکھ دوں

نکل چلوں کہیں حُسن و جنوں کے جنگل میں
ہرن کی آنکھ میں کاجل کی دوریاں لکھ دوں

کہانی ختم ہوئی لیکن اس کا کیا کیجے
جو لفظ یاد آئے اُسے کہاں لکھ دوں

جو ذہن میں ہیں حروف اُن کو کام میں لاؤں
جو دکھ پڑے ہی نہ ہوں اُن کی داستاں لکھ دوں

کچھ ایسا بہتر لکھوں آپ کو جو بھا جائے
سراہوں آپ کے گُن اپنی خامیاں لکھ دوں

غزل تو کہہ دوں رضاؔ یہ بھی تو اجازت ہو
جسے تو ہندوی کہتا تھا وہ زباں لکھ دوں

آپ کی
اور آپ کے کاروبار میں
ترقی کا ضامن



نصف صدی سے
ملک و ملت کی خدمت
میں ایک اہم اور منفرد
حیثیت کا حامل

آپکا اپنا بینک

بمبئی مرکنٹائل کوآپریٹو بینک لمیٹڈ

(شیڈولڈ بینک)

جو سماج کے ہر طبقہ کا ساتھی اور مددگار ہے ۔ جہاں فارین ایکسچنج سے متعلق سبھی سہولیات دستیاب ہیں ۔ جہاں جمع کی گئی رقم پر دوسرے کاروباری بینکوں

سے ایک فیصد زیادہ منافع ملتا ہے

ہمارے کھاتے دار ہی ہمارا سب سے بڑا سرمایہ ہیں ۔

عازمین حج کیلئے زرمبادلہ کے خصوصی انتظامات

ہمارے بینک کی اعلیٰ ترین معیاری خدمات کا نمونہ ہیں

ہیڈ آفس
زین رنگون والا بلڈنگ
۷۰ محمد علی روڈ
بمبئی ۴۰۰۰۰۳ مہاراشٹرا

فارین ایکسچنج ڈپارٹمنٹ
۲۶ نیتاجی سبھاش مارگ
دریا گنج نئی دہلی ۱۱۰۰۰۲
فون ۳۲۶۸۴۴۴، ۳۲۶۴۳۴۷، ۳۲۶۶۸۴۹
ٹیلیکس ۳۱-۶۶۸۲۳ ZAIN IN

دہلی آفس
۳۶۵۵ نیتاجی سبھاش مارگ
دریا گنج نئی دہلی ۱۱۰۰۰۲
فون ۳۲۷۱۳۹۵

ڈاکٹر انجنا سندھیر

جذبوں کی شاعرہ

آختر شاہجہانپوری

مُفکّرین کی نظر میں عورت انسان اور فرشتوں کے درمیان ایک نہایت لطیف مخلوق ہے۔ عورت خوشبو، نغمہ، رقص اور روشنی کا مجموعہ ہے۔ عورت سب سے اچھا اور آخری آسمانی تحفہ ہے۔ علّامہ اقبال نے بھی مفکرین کی رائے سے اتفاق کرتے ہوئے کہا ہے کہ ع۔

" وجودِ زن سے ہے تصویرِ کائنات میں رنگ "

لیکن اس سب کے باوجود ادبی سفر میں عورت کو مرد کے مقابلے میں ثانوی درجہ دیا جاتا ہے۔ حالانکہ عورتوں نے اَدب میں نمایاں خدمات انجام دی ہیں۔ میرا بائی۔ ایریکا ژونگ۔ لی چنگ چاؤ۔ سروجنی نائیڈو۔ امرتا پریتم۔ قرۃ العین حیدر۔ واجدہ تبسم۔ فہمیدہ ریاض۔ کشور ناہید۔ زہرہ نگاہ۔ پروین شاکر اور رفیعہ شبنم عابدی کا نام بڑے اعتماد سے

لیا جا سکتا ہے۔

حال ہی میں اَدب میں اور خاص طور سے شاعری میں جن شاعرات نے اعلیٰ مقام حاصل کرنے کی جدّوجہد کی ہے ان میں ڈاکٹر انجنا سندھیر کا نام سرِفہرست ہے۔ ڈاکٹر انجنا کا مجموعۂ کلام " موجِ سحر " حال ہی میں شائع ہوکر منظرِ عام پر آیا ہے۔ اَدبی حلقوں میں اس کی پذیرائی ہو رہی ہے۔

ڈاکٹر انجنا سے میری ملاقات جے پور کے آل انڈیا مشاعرے میں ہوئی تھی جس میں انہوں نے بڑے اعتماد سے اپنا کلام سنایا اور حاضرینِ اَدب سے داد و تحسین وصول کی۔ ڈاکٹر انجنا اپنے مخاطب پر یہ تاثر ڈالنے میں کامیاب نظر آتی ہیں کہ وہ کوئی بے بس مظلوم اور کمزور ہستی نہیں، بلکہ زمانے کے سرد و گرم سے باخبر اور حوصلہ مند لڑکی ہے۔

ڈاکٹر انجنا اَدب میں عریانیت کو ہرگز

پسند نہیں کرتیں۔ وہ کیفیاتِ عشق کو بیان کرنے کے لئے انتہائی شائستہ اور سلیس پیرایۂ اظہار اختیار کرتی ہیں۔ شاید اسی لئے وہ پروین شاکر کی بہت مداح ہیں۔ انہوں نے پروین شاکر کے اس شعر کی بہت تعریف کی اور مجھ سے بھی داد چاہی ؂

مَیں اُس کی دسترس میں ہوں مگر وہ
مجھے میری رضا سے مانگتا ہے

ڈاکٹر انجنا کی شاعری کا مطالعہ کرنے سے یہ بات بالکل صاف نظر آتی ہے کہ انھوں نے اپنے محبوب سے والہانہ محبت کی ہے مگر اس کا اظہار کیا ہے۔ اس کی یاد کو زندگی بنا لیا ہے۔ لیکن اپنے محبوب کے سامنے ناکام عاشق کی طرح دستِ سوال دراز کرکے جسم و کرم کی طلبگار نہیں ہوئیں بلکہ خودداری اور انا کا پرچم بلند اخیال رکھا ہے۔ انھوں نے زندگی کے ہر شعبے میں نمایاں کامیابی حاصل کی ہے۔ وہ ایک

اُن کا احساس اور شگفتہ ہی ہیں۔ مایوس ہوتا، یا شکست تسلیم کرنا تو اُن کی لغت میں ہے ہی نہیں۔ بلکہ وہ شکست سے تجربہ حاصل کرکے کامیابی کی سمت رواں ہو جاتی ہیں۔

محبت میں اگر سلیقہ ہو تو غمِ جاناں، غمِ دوراں کے پیکر میں ڈھل جاتا ہے اور یہ سلیقہ محبت انجنا کے کلام میں کارفرما ہے۔ وہ شکست خیالات و جذبات پر نوحہ کناں نہیں ہوتیں، نہ ہی اپنے آنسوؤں کو رائیگاں جانے دیتی ہیں بلکہ اپنے نہاں خانۂ دل میں ان آنسوؤں کو اپنے اشعار کے ذریعہ جگنوؤں کا پیرہن عطا کر دیتی ہیں۔

رفیعہ شبنم نے مندرجہ ذیل شعر میں تقدیر کے سہارے بیٹھے بے عمل لوگوں کی طرف اشارہ کیا ہے اور ڈاکٹر انجنا نے تیور بدل کر بات کہنے کی کوشش کی ہے ؎

کوئی ستارہ نہ کسی رات کا دامن پہ گرا
مانگتے ہی رہے صدیوں کی دعائیں ہم لوگ
"رفیعہ شبنم"

مَیں اپنے ہاتھ سے اپنا نصیب لکھواؤں گی
مرے نصیب کی ریکھا نہیں ہتھیلی میں
"ڈاکٹر انجنا"

اسی طرح پروین شاکر نے لڑکیوں کے دُکھ، شکوہ کا جس خوبصورتی سے مندرجہ ذیل شعر میں احاطہ کیا ہے وہ قابلِ تعریف ہے۔ ڈاکٹر انجنا نے اپنے انداز سے اس موضوع کو پیش کیا۔

؎ لڑکیوں کا دُکھ عجب ہوتا ہے اور شکوہ اس سے عجیب
ہنس رہی ہیں اور کاجل بھیگتا ہے ساتھ ساتھ "
"پروین شاکر"

؎ دھوپ کی چھاؤں ہے، رنج ہے کہ خوشیاں ہیں
لڑکیوں کی قسمت کا کیا پتہ ٹھکانا ہے۔
"ڈاکٹر انجنا"

ڈاکٹر انجنا کے مندرجہ ذیل اشعار اس بات کی گواہی ہیں کہ اُن کی زندگی میں بہار کی آمد محض ایک چھلاوہ تھی اور انھیں اپنے محبوب سے جس قدر اُمیدیں تھیں وہ پوری نہ ہو سکیں۔ اُس نے انتظار کی اذیت سے ہمیشہ دوچار رکھا اور وہ خیالوں میں چمپا چمیلی کی سیج سجائے بیٹھی رہیں اور یہ خیال بھی انھیں اکثر پریشان کرتا رہا کہ اُن کا محبوب انہیں بھول تو نہیں گیا۔ محبت میں اگر سب سے زیادہ۔۔۔ اذیت ناک بات کوئی ہے تو یہی کہ محبوب کی بے وفائی اور اپنے عاشقِ صادق کو فراموش کر دینا دُنیا کے غم کو غمِ جاناں سمجھ کے برداشت کیا جا سکتا ہے لیکن محبوب کی کج ادائی اور بے وفائی انتہائی تکلیف دہ ہوتی ہے۔

؎ بس ایک خواب تھا کہ بہار کا موسم
پلک جھپکتے ہی اب کے بہار گزری ہے

ہر ایک بات مرے دل پہ نقش ہے اس کی
مجھے بنا کے مکمل کتاب چھوڑ گیا

مَیں دل کی بات زباں تک نہ لا سکی لیکن
لکھا ہے کیا مرے چہرے پہ جانتا تھا وہ

مَیں اپنی آنکھوں میں یادیں چھپائے بیٹھی تھی
پرندے آئے مرا ہم سفر نہیں آیا

ہر ایک فکر مری رائیگاں گئی سنڈھیر
مَیں وہ درخت ہوں جس پر ثمر نہیں آیا

پھول چمپا چمیلی کے کھلتے رہے
مَیں خیالوں میں سیجیں سجاتی رہی

یہ مری میز کتابیں مرا کمرہ، در و بام
گھر کی ہر چیز تری یاد دلاتی ہے مجھے

تُو مجھے بھول گیا ہے کہیں ایسا تو نہیں
اک یہی بات تو دن رات ستاتی ہے مجھے

ہم نے لمحے تری رفاقت کے
رکھ لئے یاد کے خزانوں میں

اداس ہے گھڑی تو سوچا کلام کرتی ہوں
وہ مجھ سے رُوٹھ گئے ہیں سلام کرتی چلوں

اُلجھ گئی ہوں ترے ریشمی خیالوں میں
ترا خیال تو جینا حرام کر دے گا

اس کی صورت مری نظروں سے ہٹا کر دیکھو
پھولوں سے تم کسی تتلی کو جدا کر دیکھو

ڈاکٹر انجنا نے جہاں ہمت و حوصلے کی بات کہی ہے وہاں بھی وہ کامیاب ہیں۔ انھیں اس بات کا بھی دُکھ ہے کہ بجلی نے اُن کے آشیاں کو جلانے کے لئے سارے گلستاں کو کیوں جلا دیا۔ دُنیا کے دُکھ سکھ کو سمجھنے کا بھی انھیں شعور ہے۔ زمانے نے جو لوگوں کے ساتھ ناانصافی کی ہے اسے وہ اپنا ہی دُکھ سمجھتی ہیں اور اس پر خون کے آنسو بہاتی ہیں۔ لیکن اُن کے عزم و حوصلے میں احساسِ شکست کا شائبہ بھی نظر نہیں آتا۔ یہی باہمتی دراصل اُن کے طرزِ احساس کو ان کی ذات سے مخصوص کرتی ہے۔ ہمارے دور کے شعراء کا یہ المیہ رہا ہے کہ اُن کا ایک شعر زبان زدِ عام ہو جاتا ہے جس کی وجہ سے شائقینِ ادب اس شاعر کے مجموعۂ کلام کے منتظر رہتے ہیں۔ لیکن جب مجموعہ سامنے آتا ہے تو بڑی مایوسی ہوتی ہے یہ دیکھ کر کہ وہی شعر کام کا ہے۔ باقی شعر اس کے ہم پلہ نہیں۔ لیکن ڈاکٹر انجنا کا معاملہ کچھ جدا ہے۔ آپ کے یہاں کئی شعر ایسے ملیں گے جو زبان زدِ عام ہونے کی صلاحیت رکھتے ہیں۔

؎ قدم بڑھایا تو منزل پہ جا کے دم لوں گی
مَیں وہ نہیں ہوں کہ ہر جا قیام کرتی چلوں

بجلی کو دشمنی تھی مرے آشیاں کے ساتھ
لیکن یہ کیا کہ سارا گلستاں جلا دیا

لوگ اب راستوں پہ آ بیٹھے
راستے ہو گئے مکانوں میں

سب کا اپنا اپنا دُکھ
سب کے دُکھ کو سب کا کر

اب اُن کی جنبش لب پہ ہے زندگی کا مدار
ہمارے عہد کے کچھ لوگ تو خدا نکلے

خود اپنی کاوشوں سے بنائی ہے زندگی
اس زندگی میں کس نے کسے آسرا دیا

یہ غلط کہا کسی نے کہ ترا پتا نہیں ہے
تجھے ڈھونڈنے کی حد تک کوئی ڈھونڈتا نہیں ہے

ہر ایک گام پہ منزل کا گمان کر کے
نئے نئے ترے نقش و نگار دیکھیں گے

ہم نے ایک شمع جلائی ہے تری یادوں کی
اب اندھیروں سے گزر جائیں گے تنویر لئے

پچھلی دو دہائی سے مشاعروں میں ایسی غزلیں کثرت سے سننے کو ملتی ہیں جن کی لفظیات ایک دوسرے سے مشابہ ہوتی ہیں۔ شاید اس وجہ سے کہ ان کی تفہیم عوام کے لئے آسان ہوتی ہے۔

ڈاکٹر انجانا سندھیر جذبوں کی شاعرہ ہیں۔ ان کی تخلیقی بصیرت Creative awareness اور تخلیقی حسیت Creative sensibility کے سبب ان کی غزلیہ شاعری مزاج، موضوع، زبان، اسلوب اور آہنگ کے اعتبار سے انفرادی حیثیت رکھتی ہے۔ ان کی ایمجری ہی ان کی غزل کی پہچان ہے لیکن جذبے کی شدت کی وجہ سے کہیں کہیں فکر و فن کا فقدان نظر آتا ہے۔ لیکن اس بات کی امید کی جا سکتی ہے کہ جیسے جیسے ان کا مطالعہ اور مشاہدہ پختہ ہوگا، ان کی شاعری اور طاقتور ہوگی۔

غزلیں

بیداد گر تو قہر ہی ڈھاتے چلے گئے
ہم ہیں کہ اُن کی خیر مناتے چلے گئے
دن رات صبح شام کا رکھا نہ ہم نے فرق
تیرے قدم پہ سر کو جھکاتے چلے گئے
افسوس ہے کہ جا نہ سکے تو کسی طرح
تیرے قریب نیند سب آتے چلے گئے
تیرا گزر گلی سے ہماری جو ہو گیا
ہم راستے میں آنکھیں بچھاتے چلے گئے
وہ آسماں بھی لیتا رہا اپنا امتحان
اُس آسماں کو ہم بھی جھکاتے چلے گئے
ہم ہیں کہ عمر بھر ہی رہے اُن کے جاں نثار
وہ ہیں کہ عمر بھر ہی ستاتے چلے گئے
دیوانہ کو نہ سمجھا کسی نے گناہ گار
اک تم ہو، تہمت اُس پہ لگاتے چلے گئے

دیوانہ ردولی

تھا تو سرِ فہرست مگر نام ہی غلط
مجھ کو ملا ہے دوستو انعام ہی غلط
پی کر بقدرِ ظرف نہ تشنہ لبی مٹی
ساقی سے کیا ملا تھا مجھے جام ہی غلط
محبت بزور کی نہیں تحصیل سوچ لو
ہو جائے مفت میں نہ ترا نام ہی غلط
بزمِ طرب میں اُن کی مجھے تو سننا پڑا
لایا تھا نامہ بر مرا پیغام ہی غلط
شکوہ عبث ہی نہ اگر منزلِ مراد
پہلے اٹھائے آپ نے اقدام ہی غلط
ہوتی ہو بار یاب کہاں بزمِ حق میں
ہر اک نعرہ اُٹھی سرِ بام ہی غلط
تھا رابطہ کہیں نہ دل و ذہن میں قمر
اس واسطے ہوا مرا ہر کام ہی غلط

قمر ایلوی

چہرہ جو اُس کا دیکھا تھا اک دن بجھا ہوا
افسردگی کا میری وہی سلسلہ ہوا
دیرینہ یار کوئی ملے، گفتگو کرے
آنکھوں میں سیلِ اشک ہے کب سے رکا ہوا
گزرے جو تیرے شہر سے تو تیرے بعد ہم
دھڑکا قدم قدم تری آواز کا ہوا
بے خوف ہو سکا نہ کبھی میرا آشیاں
برقِ جب احتیاط سبھی حادثہ ہوا
ادراک و آگہی سے بھرے حرف حرف میں
سب مستند بنے ہیں مسیحا کہا ہوا
راہِ وفا میں روشنی پھیلی ہے دور تک
سجدہ خاص و عام مرا نقشِ پا ہوا
بے پردہ ہو کے سامنے کس کا خوف تھا
اختر بس اتنی بات پہ محشر بپا ہوا

اختر شاہجہاں پوری

آنتوں کی سوزش اور ہیضہ

گرمیوں میں ان کے حملے سے بچیے۔

احتیاط برتیے :-

- کم گہرے ہینڈ پمپوں اور کنوؤں سے اور پانی کی نامنظور ٹرالیوں سے پانی نہ پیجیے۔
- کٹے ہوئے پھل نہ لیں اور کھلی رکھی کھانے پینے والی چیزیں نہ خریدیں جن پر مکھیاں اور گرد و غبار ہو۔
- عام طور پر بازار میں ملنے والی گھٹیا برف کا استعمال نہ کیجیے۔
- کھانا پکانے اور پینے کے لیے صرف صاف ستھرا اور نگر پالیکا کا پانی استعمال کیجیے۔
- اگر شبہ ہو تو پانی ابال کر پیجیے یا اس میں کلورین کی گولیاں ڈالیے۔
- کھانا کھانے سے پہلے ہاتھوں کو اچھی طرح دھویئے۔
- پینے کے پانی اور کھانے کی چیزوں کو صاف اور ڈھکن دار برتنوں میں رکھیے۔

دست اور الٹیاں ہونے پر :-

- فوراً O.R.S. کا محلول دیجیے۔ ہر پانچ منٹ بعد نمک چینی کا محلول دیجیے۔
- اگر حالت بہتر نہ ہو تو نزدیک کے اسپتال یا ڈسپنسری میں دکھایئے۔
- نمک چینی کا محلول تیار کرنے کے لیے ابال کر ٹھنڈے کیے گئے ایک گلاس پانی میں دو چمچہ چینی اور چٹکی بھر نمک ڈالیے۔

O.R.S. کے پیکٹ اور کلورین کی گولیاں تمام سرکاری اسپتالوں، ڈسپنسری اور زچہ بچہ کے صحتی مرکزوں میں مفت ملتی ہیں۔

جاری کردہ



ڈائرکٹر اطلاعات اور رابطہ عامہ - دہلی انتظامیہ - دہلی

رسائی

عابدہ نرجس

"لو بھئی بارش تو آگئی ۔۔" بالے نے بلند آواز سے پکار کر کہا۔ تو سر پہ رکھے چھوٹے سے لکڑی کے تختے پر رنبوں پہ اینٹیں جاتے ہوئے خدابخش نے بڑی دقت سے سر اُٹھا کر دیکھا۔ بادل تو جھک رہے تھے۔ لیکن سورج کی تیز چمکیلی کرنیں یہاں وہاں سے اب بھی جھانک رہی تھیں۔ "او دے بالے۔ تُو تو ہر بات بڑھا چڑھا کر بیان کرتا ہے" خُدابخش نے اک گندی سی گالی اگلتے ہوئے کہا۔

مستری کی طرف اینٹیں اُچھالتے ہوئے رحمت نے اس کی گالی سے محظوظ ہو کر قہقہہ لگایا اور گالی پر گالی جماتا ہوا بولا۔

"پڑ جانے دے یار دو بوندیں۔ کلیجے میں کہیں ٹھنڈک پڑے۔ اس گرمی نے تو بھون کے رکھ دیا ہے"

"او وے۔" چھت پر بیٹھے ہوئے مالک مکان نے دھاڑ کر کہا۔ "جلدی جلدی ہاتھ چلاؤ۔ کہیں جو جھڑی لگ گئی تو کئی دن دلانے جا پڑیں گے"

اس کی کرخت آواز پر مزدوروں کے ہاتھوں میں تیزی آگئی ۔ لیکن زبان کی نوک پر توبہ توبہ گالیاں تھیں کچھ نے دانت پیس کر منہ ہی منہ میں کچھ کہا۔ خُدابخش نے آسمان کی طرف دیکھا "گھٹا تو قبلے کی طرف اُمنڈ رہی ہے۔ بارش تو ضرور ہوگی۔ پر ذرا دہاڑی لگ جائے۔ آدھی دہاڑی میں تو کچھ نہیں بنے گا"

بادل ایک دم ہی گھر آئے۔ ننھی ننھی پھوار ایک دم ہی موسلا دھار بارش میں بدل گئی۔ مالک مکان بکتا جھکتا نیچے اُتر آیا۔ بار بار گھڑی دیکھتا وہ مزدوروں کو کام سمیٹنے کو کہنے لگا۔ اور گن گن کر ان کی مزدوری کا حساب لگانے لگا۔ بوندیں اس طرح مسلسل اور تیز تھیں کہ بوچھاڑ سے ان کے کپڑے بھیگ گئے۔ تمام مزدور اپنے کپڑے نچوڑتے چھت تلے آگئے۔ بارش ختم ہونے کے آثار نظر نہیں آتے تھے۔ ذرا سی دیر میں سڑک پانی سے چھلکنے لگی۔ مالک مکان نے فکرمندی سے آسمان کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ "مولا نے اپنا فضل کیا تو کام تو کل ہی ہو سکے گا"

"او بھی" کسی نے دبی زبان سے کہا۔

مالک مکان نے جیب ٹٹولی اور بولا "صبح سے بھائی کو چیک دے کر بینک بھیجا ہوا ہے ابھی تک لوٹ کر نہیں آیا۔ تم کل حساب کر لینا آکر۔ ایسی کونسی جلدی ہے؟" مزدوروں کے چہرے اُتر گئے۔ کچھ حجت کرنے لگے مگر مالک مکان نے ایک غلیظ سی گالی دے کر انہیں خاموش کر دیا اور خود گھر جانے کی تیاری کرنے لگا۔ دھواں دھار برستے پانی میں اس کے بھائی کا آنا ناممکن سا معلوم ہوتا تھا دل ہی دل میں اُسے کوستے ہوئے سب نے اپنی اپنی راہ لی۔

خدابخش اپنے محلے میں پہنچا۔ تو دیکھا بچے سبھی شور مچاتے بھاگے جا رہے ہیں۔ اُسے دیکھا تو سب کچھ چھوڑ چھاڑ کر اس کی طرف لپکے۔ اس کی ننھی بچی منی نے تیزی سے بڑھ کر اس کا ہاتھ پکڑ لیا۔

"ابا۔ ابا۔ ابا آگیا۔" وہ اس کے ساتھ ساتھ بھاگتے ہوئے بولی۔

"چلو۔ چلو۔ گھر۔ بارش میں مت کھیلو۔" اس نے بچوں کو پانی میں غڑاپ غڑاپ چلتے دیکھ کر ڈانٹا۔ وہ ایک دوسرے کو دھکے دیتے چھینٹے اڑاتے۔ بھاگتے ہوئے گھر

میں گھس گئے۔

وہ بوسیدہ چادر وہ اٹھا کر اندر آیا۔ تو اس کی بیوی رضیہ نے اک خوشگوار سی حیرت سے اس کی طرف دیکھا۔ گیلا چولہا سُلگاتے سُلگاتے اس کی آنکھیں دھوئیں سے سُرخ ہو رہی تھیں۔ بچوں نے ماں کے گرد گھیرا ڈال دیا۔ اور ہنس ہنس کر باتیں کرنے لگے۔ وہ باپ کو خلافِ معمول گھر میں دیکھ بہت مسرور تھے۔ رضیہ نے میلی اوڑھنی سے سُرخ آنکھیں پونچھتے ہوئے اس کی طرف ایسی لگن سے دیکھا کہ اس کی ساری تھکن اُتر گئی۔

برستے پانی میں اور بھی تیزی آگئی۔ وہ کپڑے سنبھالتا چولہے کے نزدیک ہی بیٹھ گیا۔ اُسے بہت بھوک لگی تھی۔ اُسے بہت کم دوپہر کا کھانا گھر میں کھانے کا اتفاق ہوتا تھا۔ دوپہر کا کھانا تو جلدی جلدی نہار کے ایسے پھیر دہاڑی پر کھڑا ہونا ہوتا تھا۔ کام ختم کرکے کچھ ضروری خرید و فروخت کے بعد وہ گھر پہنچتا تو مغرب کی اذان اُسے راستے ہی میں ہو جاتی۔

آج بارش پڑتی ہوئی چھت کے نیچے رضیہ کے قریب بیٹھ کر کھانا کھاتے ہوئے اُسے اک ایسی طمانیت کا احساس ہو رہا تھا جسے وہ لفظوں میں بیان نہیں کر سکتا تھا اور نہ ہی اُسے رضیہ پر ظاہر کر سکتا تھا لیکن معمولی کھانے میں اُسے غیر معمولی لذت محسوس ہو رہی تھی۔ بچے آپس میں چھینا جھپٹی کر رہے تھے۔ آپس میں لڑ رہے تھے۔ خدا بخش نے انھیں ڈانٹا بھی نہیں وہ خاموشی سے کھانا کھاتے ہوئے رضیہ اور بچوں کی طرف دیکھتا رہا۔ اس احساس نے اسے اک عجیب تفاخر سے ہمکنار کر دیا تھا کہ وہ اس بھرے پُرے گھر کا مالک ہے۔

سب کو کھلا کر رضیہ جھوٹے برتن مانجھنے بیٹھ گئی۔ بچے آپس میں ہنسی کھیل رہے تھے۔ بارش کی تیز بوچھار سے ٹاٹ کا بوسیدہ پردہ گیلا ہو کر چیتھڑے کی طرح جھول رہا تھا۔ مختصر سے آنگن میں بارش کا پانی کھڑا ہونے لگا تھا۔ پانی کے چھینٹے اُڑ اُڑ کر اندر آنے لگے تھے۔ خدا بخش کچھ دیر کھڑا فکرمندی سے برستے پانی کو تکتا رہا بادل گرج رہے تھے اور اُجلا دن سانولی شام میں ڈھل گیا تھا۔ پانی کی تیز برستی دھندوں میں گرد و پیش کی چیزیں صاف نظر نہیں آتی تھیں۔ ۔ ۔

اتنا برا کچھ نہیں ہیں۔ اللہ اپنا کرم کرے۔ اس نے اپنے نیم شکستہ گھر کی چھت کی طرف دیکھتے ہوئے ہونٹوں ہی ہونٹوں میں جیسے خود سے کہا۔ رضیہ برتن دھوتے ہوئے چلائی۔ شادو کے ابا۔ چھت تو ٹپک رہی ہے۔"

خدا بخش نے سر اُٹھا کر دیکھا۔ اسے پہلے ہی اندیشہ تھا کہ چھت کی مٹی تیز بارش کے سامنے ٹھہر نہیں سکے گی "بارش کا زور گھٹے تو کوئی بندوبست کریں۔" اس نے ٹپکتی ہوئی چھت کے نیچے گھی کا پرانا خالی ڈبہ رکھتے ہوئے کہا۔

رضیہ پھر اپنے کام میں لگ گئی تھی بچے اس کی آنکھ بچا کر باہر گلی میں نکلنا چاہتے تھے جہاں ان کے ہمجولی ننگ دھڑنگ بارش کے پانی میں شڑاپ شڑاپ بھاگتے پھرتے تھے۔ لیکن خدا بخش دروازے کے پاس کھڑا تھا۔ وہ اس سے ڈرتے اور باہر تو نہیں نکل سکتے تھے اسی لئے کمرے میں ٹپکتی ہوئی چھت تلے ایک دوسرے کو دیکھنے اور ہنسنے لگے ان کے بے ہنگم شور سے خدا بخش کا جی الجھنے لگا۔ اُس نے زور سے انہیں ڈانٹ کر خاموش ہو جانے کو کہا۔ تو وہ ایک دوسرے کے پیچھے دبکنے لگے۔ رضیہ نے تیز نظروں سے اس کی طرف دیکھا۔ لیکن منہ سے کچھ نہیں بولی۔

بارش کچھ دیر کے لئے تھمی تو وہ اپنے بڑے لڑکے کے ساتھ چھت پر مٹی ڈالتا رہا۔ پھر اس نے بادلوں سے ڈھکے ہوئے آسمان کی طرف دیکھا۔ خوف کی لہر سی اس کی ریڑھ کی ہڈی میں سرایت کر گئی۔ جھکے ہوئے بادل اس کے سر سے جیسے چھو رہے تھے۔ مولا خیر رکھنا۔ اس نے ٹھنڈا سانس بھر کے کہا اور نیچے اُتر آیا۔ سیاہ بادلوں نے شام کو گہری رات بنا دیا تھا۔ رضیہ نے بڑی مشکل سے گیلا چولہا پھر سُلگا لیا تھا جس سے چھوٹے سے کمرے میں نیلا دھواں بھر گیا تھا۔ بارش تیز تو نہیں تھی۔ لیکن مسلسل برس رہی تھی۔ جب وہ کھانا کھانے بیٹھا۔۔ تو اس نے محسوس کیا کہ روٹیاں کم ہیں۔ اور بچے پوری طرح سے سیر نہیں ہوئے تھے۔ اور رضیہ سے اور روٹی مانگ رہے تھے۔ اُسے یوں محسوس ہوا۔ جیسے اس کی بھوک اُڑ گئی ہے۔ اُس کے منہ میں رکھا ہوا نوالہ اس کے حلق میں اٹکنے لگا۔ اُس نے اپنے آگے رکھی ہوئی روٹی بچوں کے سامنے رکھ دی اور خود ہاتھ جھاڑ کر اٹھ کھڑا ہوا۔ رضیہ نے غور سے اس کی طرف دیکھا۔ لیکن خاموش ہی رہی۔ رضیہ کی یہی بات اُسے سب سے زیادہ پسند تھی کہ وہ موقع محل کو خوب سمجھتی تھی اور دوسری عورتوں کے برعکس زبان کا استعمال بہت کم کرتی تھی۔ اس کا خیال تھا کہ اگر رضیہ زبان کا استعمال یوں سوچ سمجھ کر نہ کرتی، تو شاید وہ ایک دن بھی اس کے ساتھ نہ گزار سکتا۔

کہیں رات کے پچھلے پہر اس کی آنکھ لگی تو بارش کی آواز مسلسل آرہی تھی، صبح اس کی آنکھ کھلی تو پہلی آواز بارش ہی کی تھی، جو اس کے کانوں نے سُنی۔ بادل کی زوردار گرج سُنائی دی تو وہ گھبرا کر اٹھ کھڑا ہوا اور دروازہ کھول کر باہر گلی میں دیکھنے لگا۔ اس کا اپنا آنگن پانی سے بھرا تھا۔ گھٹنوں گھٹنوں پانی میں چلتے لوگ ساگ دودھ اور ضرورت کی دوسری چیزیں لا رہے تھے۔ وہ گھبرا کر پلٹ آیا اور رضیہ سے بولا۔ "بھلی لوک۔ جھڑی تو اس طرح لگی ہے پتہ نہیں آج دہاڑی لگے گی بھی یا نہیں۔"

رضیہ کے چہرے پر بھی پریشانی کے آثار نظر آ رہے تھے۔ اس نے گہرا سانس لے کر کہا۔ "جو اللہ کو منظور ہے۔۔!"

بچے نیند سے بیدار ہو گئے تھے۔ اور ناشتے کیلئے رضیہ کے گرد ہو گئے تھے۔ رضیہ نے روٹیاں پکالی تھیں اور چٹکی بھر شکر ان پر ڈال کر بچوں کے آگے رکھ رہی تھی۔ خدا بخش نے رات بھی روٹی ٹھیک سے نہیں کھائی تھی۔ اُسے بھوک تو محسوس رہی تھی۔ لیکن کچھ کھانے کو جی نہیں چاہتا تھا۔ اس نے روٹی بھی نہیں کھائی اور برستی بارش میں رضیہ سے بغیر کچھ کہے باہر نکل گیا۔ اس کی جیب میں کچھ پیسے تھے۔ پانی سے بھری ہوئی سڑک پر بغل میں جوتے دابے چلتے ہوئے وہ سوچ رہا تھا کہ اگر آج اُسے کوئی کام مل گیا تو وہ کسی دکان سے گرم حلوہ پوری کا ناشتہ کرے گا۔

جگہ جگہ پانی کھڑا تھا۔ ہر طرف پھسلن تھی وہ بڑی مشکل سے بچتا بچاتا پانی میں بھیگتا اپنے ٹھکانے پر پہنچا۔ اس کا خیال تھا کہ اگر کوئی مکان والا وہاں موجود ہوا تو اس سے کم از کم کل کی مزدوری تو لے ہی لے گا۔ وہاں چوکیدار کے سوا کوئی نہیں تھا۔ چوکیدار کا بھی یہی

خیال تھا کہ آج کام نہیں ہو سکے گا۔ بارش رُکنے کے کوئی آثار نظر نہیں آتے تھے۔ حالانکہ دن خاصا نکل آیا تھا۔ خدا بخش مایوس ہو کر وہاں سے جلد نکل آیا کہ کہیں کوئی اور کام دھندا تلاش کرے۔

وہ باہر سڑک پر آیا تو اسے احساس ہوا کہ پانی کی بوچھار خاصی تیز ہے۔ وقفے وقفے سے ایک دو چھینٹے اس زور سے پڑتے تھے کہ دیواروں اور سڑکوں پر برستے پانی سے ایک شور سا پیدا ہو جاتا تھا۔ لوگ درختوں تلے اور دکانوں کے تختوں پر پناہ لینے لگے۔ پھر بارش کی تیزی میں کمی آتی لیکن روانی میں فرق نہیں آتا تھا۔ خدا بخش پانی سے شرابور تھا۔ اس نے صبح سے کچھ نہیں کھایا تھا پیٹ خالی خالی سا محسوس ہوتا تھا۔ ایک قدم اُٹھانے کو جی نہیں چاہتا تھا۔

ایک گھٹیا سے تنور سے گرم روٹیوں اور پائیوں کی اشتہا انگیز خوشبو اُٹھ رہی تھی۔ اُس کی بھوک اور چمک اُٹھی اس کا جی چاہا کہ اس کی جیب میں جتنے پیسے ہیں ان سے ان تیز خوشبوؤں کو خرید کر پیٹ بھرے۔ غیر ارادی طور پر اُس نے جیب ٹٹولی۔ ایک مڑا تڑا سیلا ہوا میلا نوٹ اور چند سکے۔ جو شاید اس کا پیٹ بھرنے کو بھی ناکافی تھے۔ اُس نے ان پیسوں کو کئی بار گنا۔ لیکن بار بار گننے سے بھی ان میں کسی اضافے کا امکان نہیں تھا۔ کچھ سوچ کر اس نے چند سکے ہاتھ میں لئے اور تنور والے سے ایک روٹی خرید لی۔ ایک دکان کے تختے پر بیٹھ کر اس نے روکھی روٹی ہی حلق سے نیچے اُتار لی۔ اور ہاتھ جھاڑتا ہوا اس اڈے کی طرف ہو لیا۔ جہاں عموماً مزدور پیشہ لوگ روزگار کی آس میں بیٹھا کرتے تھے۔

بارش اب بھی مسلسل ہو رہی تھی۔ خدا بخش کے پاؤں کیچڑ سے اَٹ گئے تھے۔ ہوا چلتی تو بھیگے ہوئے کپڑوں میں سردی کا احساس ہوتا تھا۔ اُس نے دیکھا کہ وہ فٹ پاتھ پانی میں ڈوبا ہوا تھا۔ دُور و نزدیک اس کا کوئی ساتھی نظر نہیں آتا تھا۔ وہ ایک دکان کے سائبان تلے کھڑا رہا گرد کھڑے پانی میں چھینٹے اڑاتی گاڑیوں اور گرتے پڑتے مسافروں کو دیکھتا رہا کہ شاید کسی کو اس کی ضرورت ہو۔ لیکن سب اپنے آپ میں مگن برستے پانی سے بچتے اپنے اپنے ٹھکانوں پر پہنچنے کی فکر میں تھے۔

وہ نہ جانے کتنی دیر وہاں کھڑا رہا کہ اچانک ایک لمبی چمکیلی کار کا پہیہ کسی نالی میں پھنس گیا۔ اس کی پچھلی سیٹ پر بیٹھے ہوئے صاف ستھرے صاحب نے شیشہ اُتار کر اِدھر اُدھر دیکھا ڈرائیور دروازہ کھول کر باہر دیکھنے لگا۔ خدا بخش جلدی سے دکان کے تختے سے اُترا اور ان کے کچھ کہنے سے پہلے ہی اُس نے زور لگا کر گاڑی کا پہیہ گڑھے سے نکلوا دیا۔ پچھلی سیٹ پر بیٹھے ہوئے اُجلے صاحب نے شیشہ پھر چڑھا لیا تھا ڈرائیور نے کھٹ سے دروازہ بند کیا اور گاڑی پر چھینٹے اڑاتی آگے نکل گئی۔

خدا بخش نے حسرت سے آسمان کی طرف دیکھا تو بارش کی پھوار سے اس کی آنکھیں بند ہونے لگیں۔ آسمان کا نیلا رنگ گہرے بادلوں سے ڈھک کر کہیں بھورا، کہیں سے سیاہی مائل ہو رہا تھا۔ خدا بخش کے دل میں خوف گھور بدلیوں کی طرح امنڈنے لگا وہ اسی خیال میں بھیگتا ہوا آگے نکل گیا کہ اُسے کہیں تو کوئی کام مل جائے گا۔ اسٹیشن کے باہر، بسوں کے اڈے پر، کسی تندور کے پاس کسی سستے سے چائے خانے کے قریب وہ بہت دیر تک کھڑا رہا۔ لیکن کسی نے اس کی طرف نظر بھر کر بھی نہیں دیکھا۔

نزدیک کے کسی ہوٹل سے ریڈیو پر خبریں نشر ہونے کی آواز آئی۔ تو خدا بخش کو احساس ہوا کہ آدھا دن گزر گیا ہے۔ سورج کا روشن چہرہ کہیں دکھائی نہیں دیتا تھا۔ بھیگا ہوا دن کسی اُداس شام کی طرح کجلایا ہوا تھا بارش اب بھی تھمی نہیں تھی۔ پاس ہی دو آدمی کھڑے آپس میں باتیں کر رہے تھے۔ خدا بخش ان کی طرف متوجہ تو نہیں تھا لیکن ان کی آواز اس کے کانوں میں آ رہی تھی۔

ایک شخص دوسرے سے کہہ رہا تھا "سنا ہے اس بار برسات خوب ہوگی۔ میں نے تو چھت پٹوا دی تھی" دوسرا بولا "یار میں نے تو یہ روز کی کل کل ہی ختم کر دی ہے۔ پکا کوٹھا بنا لیا ہے اس بار تو روز کی خواری کون اٹھائے"

خدا بخش کانپ گیا۔ اُسے اپنی ٹپکتی ہوئی چھت یاد آئی۔ جس پر کل کی ڈالی ہوئی مٹی کا بھی نشان نہیں رہا تھا۔ ہزار دل اندیشوں اور وسوسوں نے چکرا دیا۔ رضیہ اور بچوں کے چہرے اس کی آنکھوں میں پھرنے لگے۔ برستا پانی کبھی پھوار بن جاتا تھا اور کبھی تیز بوچھاڑوں میں گرد و پیش کے مناظر جھکولے لینے لگتے۔ اس کے قدم تیزی سے اُٹھنے لگے اس نے اپنی گلی میں آ کر اطمینان کا سانس لیا۔ اس کا بوسیدہ کچا گھر پانی میں گھرا کھڑا تھا اس کے بچے جو گلی میں کھڑے پانی میں چھینٹے اڑاتے پھر رہے تھے۔ اسے دیکھتے ہی بھاگ کر گھر میں گھس گئے۔ وہ کچھ دیر کھڑا اپنے کچے گھر کی طرف فکرمندی سے دیکھتا رہا۔ پھر اس نے برستے آسمان کی طرف دیکھا۔ جو بادلوں سے سرتاسر ڈھکا ہوا تھا۔ تشویش کی ایک شدید لہر نے اُسے اس قدر خوف زدہ کیا کہ وہ گیلا بوسیدہ پن دیکھ کر جلدی سے اپنے گھر میں گھس گیا یوں جیسے پناہ کی تلاش میں ہو۔

رضیہ نے اس کی طرف دیکھا۔ لیکن وہ خاموش رہی۔ مگر اس کی آنکھوں نے کتنے ہی سوال پوچھ ڈالے۔ وہ کسی سوال کا جواب نہیں دینا چاہتا تھا۔ وہ چولہے کی طرف دیکھ رہا تھا۔ اور اس خوشبو کو سونگھ رہا تھا جو گھر کو گھر بناتی ہے۔ اُسے رضیہ پر فخر سا ہونے لگا وہ ہمیشہ بُرے وقت کے لئے چار پیسے بچا کر رکھتی تھی اُس نے اپنی جیب میں پڑے سکوں اور میلے کچیلے نوٹ کو چپکے سے نکال کر رضیہ کی میلی اوڑھنی کے پلو سے باندھ دیا۔ رضیہ کے چہرے پر رونق آ گئی۔ اُس نے جلدی سے گرہ کھول لی۔ اور اس کا سانولا چہرہ بجھ گیا۔ خدا بخش نے ٹھنڈے سے لہجے میں کہا۔ "آج کوئی کام نہیں ملا۔ یہ تو کل کے پیسے ہیں۔ جیب میں رکھ لئے تھے۔ سگریٹ پانی کے لئے۔"

رضیہ متفکر ہو کر اس کا منہ تکنے لگی۔ بارش کی آواز اب بھی آ رہی تھی — آسمان کا رنگ کہیں نظر نہیں آ رہا تھا۔ اُس نے رضیہ سے آنکھیں چرائیں اور ایک گٹھری سی بن کر جھلنگا چارپائی میں لیٹ رہا۔ اُس نے کھانا بھی نہیں کھایا اور دل ہی دل میں بارش کے رک جانے کی دُعا مانگنے لگا۔ نہ جانے کب اس کی آنکھ لگ گئی رضیہ نے اُسے جگایا۔ تو رات چھا رہی تھی۔ اُس نے کان لگا کر سُنا۔ برستے پانی کی آواز اس کے کچے گھر کو چاروں طرف سے گھیرے ہوئے تھی۔ اس نے آنکھیں جھپک کر دیکھا۔ بیمار سے بلب کی زرد روشنی میں رضیہ روٹیاں پکا رہی تھی۔ بچے اس کے گرد بیٹھے بھوکی نظروں سے توے سے اُترتی ہوئی روٹیوں کی طرف دیکھ رہے تھے

خدا بخش نے بازو آنکھوں پر رکھ لیا۔ وہ بظاہر سو تا گیا۔ لیکن اس کی تمام حسیں پوری طرح سے بیدار تھیں۔ اُسے معلوم ہو رہا تھا کہ روٹیاں کم ہیں۔ رضیہ جھلائی ہوئی ہے اس کی ہمسائیوں سے تھوڑی سی دال مانگ رہی ہے۔ لڑکے اک دوسرے سے چھینا جھپٹی کر رہے ہیں۔ رضیہ دبی زبان میں ان سے خاموش ہو جانے کے لئے کہہ رہی تھی۔ اس کا خیال تھا کہ وہ سو رہا ہے۔ وہ اسی طرح آڑا ترچھا لیٹا رہا۔

رضیہ بچوں کو سُلا کر اُس کی چارپائی کے قریب آئی اور اس کا بازو ہلایا۔ خدا بخش نے آنکھیں کھول کر دودھیا روشنی میں اس کا سانولا چہرہ دیکھا۔ اک روٹی پر تھوڑا سا اچار رکھا تھا۔ خدا بخش نے اس کا چہرہ دیکھا جس پر تھکن اور نقاہت تھی۔ اس کی آنکھیں نیند سے بھری ہوئی تھیں۔ خدا بخش کو معلوم تھا کہ اُس نے کھانا نہیں کھایا ہوگا۔ اپنے حصے کی روٹی جو بچوں سے بچ رہی تھی وہ اُس کے لئے لے آئی تھی۔ محبت کے اک جلا دینے والے احساس سے اس کی آنکھیں نم سی ہو گئیں۔

اس کو صبح کے لئے رکھ دے بچے کھالیں گے — خدا بخش نے ہولے سے اُس کا ہاتھ چھوڑ کر رسان سے کہا تو وہ چپ ہو گئی۔ اس کے ہونٹ اس طرح تھے جیسے کچھ کہتے کہتے رُک گئی ہو۔ خدا بخش اُس سے پوچھنا چاہتا تھا۔ کہ اگلے دن کے لئے کچھ کھانے کو گھر میں ہے لیکن پھر کچھ سوچ کر خاموش ہو گیا وہ اس تھکی ہوئی عورت کو صبح کی فکر میں مبتلا نہیں کرنا چاہتا تھا وہ چُپ چاپ اُٹھی اس کے پاؤں لڑکھڑا رہے تھے روٹی اُس نے کہیں سنبھال کر رکھ دی اور بچوں کے درمیان تھوڑی سی جگہ پر سکڑ کر لیٹ رہی۔

بارش کی آواز مسلسل آرہی تھی۔ اس کے لئے اک دلدل سی بن گئی تھی۔ جس میں وہ دھنستا چلا جاتا تھا وہ صبح کے تصور سے ہی عجیب سی بے چینی محسوس کر رہا تھا۔ اگر کل بھی بارش اسی طرح برستی رہی تو — اس خیال نے ہی اُسے مضطرب کر رکھا تھا۔ چھت کئی جگہ سے ٹپک رہی تھی کھڑکی کا گیلا پردہ جھول رہا تھا باہر سے آتی ہوئی بوچھار سے کھڑکی کے قریب پڑی ہوئی چیزیں بھیگ رہی تھیں۔ لیکن انہیں کہیں اور رکھنے کی جگہ ہی نہیں تھی اُسے کروٹیں بدلتے ہوئے بہت دیر ہو گئی تھی۔ رضیہ شاید نیند میں کچھ بڑبڑا رہی تھی۔ بچے ایک دوسرے سے اُلجھے ہوئے سو رہے تھے۔

خدا بخش کی آنکھوں میں نیند نام کو نہیں تھی اُسے محسوس ہوتا تھا جیسے برستی بارش کے ہر قطرے کے ساتھ پریشانیاں اور تفکرات اس پر برس رہے ہیں۔ اچانک باہر برستی ہوئی بارش میں شدت آگئی وہ پریشان ہو کر چارپائی سے اُٹھ بیٹھا۔ رات کی پُراسرار خاموشی میں اک شور سا مچ گیا اُسے محسوس ہوا جیسے ابھی چھت اس پر اور اس کے معصوم بچوں پر آن گرے گی جو ماں سے لپٹے بے خبر سو رہے تھے اس خیال نے اس کے اندر باہر اک ہلچل سی مچا دی۔ وہ گھبرا کر باہر نکل آیا اور تیز برستی بارش میں ہاتھ بلند کئے اُس نے سُن رکھا تھا کہ تیز بارش میں دُعا جلد قبولیت کی منزل پر پہنچ جاتی ہے —

لیکن وہ کیا مانگے، کیا کہے، اُسے کچھ سوجھتا نہیں تھا۔ وہ زیر و زبر دل کے ساتھ حیران کھڑا سوچ رہا تھا کہ وہ اس قادرِ مطلق سے کیا مانگے، جو شہ رگ سے بھی قریب ہے۔ وہ اس کے بھوکے بچوں، فاقہ زدہ بیوی کی اس کی مجبوری اور بے کسی کو دیکھتا ہے۔ وہ اس کی خستہ حالی سے واقف ہے۔ اس کے خالی پیٹ اور اندیشوں میں گھرے ہوئے دل کا حال جانتا ہے۔ وہ تو سب کچھ جانتا ہے۔ سب کچھ دیکھتا ہے۔ تو پھر وہ اُسے کیا بتائے، اُسے کیا دکھائے، اُس سے کیا مانگے۔ کس طرح مانگے؟

وہ حیران پریشان برستے ہوئے سیاہ آسمان کے تلے ہاتھ پھیلائے کھڑا تھا۔ اس کی سیلی ہتھیلیاں بارش کے پانی سے بھر گئی تھیں۔ اس کے بھیگے ہوئے بالوں سے ٹپکتا پانی اس کے رخساروں پر بہتے ہوئے آنسوؤں میں مل رہا تھا اس کے ہونٹ تھرتھرا رہے تھے۔ اس کی زبان اس طرح اکڑی ہوئی تھی۔ جیسے شدید پیاس لگی ہو۔ اس کے بے قرار دل میں کتنی ہی باتیں کھول رہی تھیں۔ لیکن ہونٹوں پر ایک لفظ بھی نہیں آتا تھا پانی — دھواں دھار برس رہا تھا اور گہرے بادلوں اور سیاہ اندھیرے میں کسی ایک ستارے کا روشن چہرہ بھی نظر نہیں آتا تھا۔

بادل ایک بار زور سے گرجے۔ بجلی آسمان پر شرارے برساتی ہوئی دُور تک چلی گئی۔ وہ اپنی جگہ پر ساکت کھڑا تھا۔ خالی الذہن جیسے نہ کوئی طلب تھی نہ سوال، نہ کوئی التجا نہ مطالبہ۔ کہیں دُور سے اذان کی آوازیں آنے لگیں۔ یکے بعد دیگرے۔ مختلف گھروں سے اذان کی آواز بلند ہونے لگی۔ خدا بخش کا دل پاکیزگی سے بھر گیا۔ دل میں کوئی اندیشہ یا وسوسہ نہیں تھا اس کے رخساروں پر آنسو پوری شدت سے بہہ رہے تھے بارش کا شور چہار جانب گونج رہا تھا۔ وہ گھٹنوں کے بل جھک گیا اور پیشانی آنگن میں کھڑے پانی میں رکھ دی۔

رضیہ نے اسے ہوشیار کیا۔ وہ اُسے صحن میں اس طرح پڑے دیکھ کر بُری طرح خوف زدہ ہو گئی تھی۔ وہ گھبراہٹ میں بار بار اس کا شانہ جھنجھوڑ رہی تھی۔ خدا بخش نے سر جھٹک کر آنکھیں کھولیں۔ رضیہ کی جان میں جان آئی۔ نیلا آسمان اس کے سر پر چمک رہا تھا۔

جلتے رہے تنہا تنہا

ظہیر آفاق

اچانک سیما کی نظر بنگلور کے مشہور اسٹار ہوٹل "نیلگریز نسٹ" کی تیسری منزل کے بالکونی پر پڑی۔ شام کا وقت تھا۔ بالکونی میں کھڑا ایک خوبصورت نوجوان آنکھوں پہ سیاہ چشمہ لگائے بنگلور کی سرد ہواؤں سے محظوظ ہو رہا تھا۔ سیما اس نوجوان کے چہرے کو اچھی طرح پہچان گئی۔ یہ وہی سجو تھا۔ سیما نے نیچے سڑک ہی سے اس نوجوان کو وِش کیا اور پھر اُس نے ہاتھ بھی ہلایا۔ لیکن نوجوان.... سیما کو دیکھ کر بھی انجانوں کی طرح وہاں سے سرک گیا۔ سیما کے دل کو ایک زبردست دھکا سا لگا۔ وہ پراگندہ جذبات کے انجانے موڑ پر بھٹک گئی اور سیما کے قدم وہاں سے آگے بڑھ گئے۔

اس کے ایک مہینے کے بعد ایجوکیشن ٹور پہ سیما مدھورائے گئی تھی۔ وہاں مدھورائے مینا کشی مندر میں کمبابھیشیگم کے جلسہ کی تیاریاں ہو رہی تھیں۔ کافی ہجوم تھا۔ مندر کے اندر آنے جانے کی قطاروں میں لوگ ایک پر ایک سوار ہونے کی کوشش کر رہے تھے۔ ایک بزرگ پنڈت جی کے ساتھ باتوں میں معروف، آنکھوں پر کوئی اسپونیڈ چشمہ لگائے اس بھیڑ میں سجو کھڑا ہوا تھا۔ سجو کو آواز دینے کے خیال سے سیما کے لب کھلے اور پھر نہ جانے کیوں بند ہوگئے۔ سجو نے سیما کو شاید دیکھا بھی تھا

کچھ اس طرح کے انداز سے سجو اس پنڈت جی کے ساتھ آگے بڑھ گیا اور سیما بھیڑ کے پیچھے رہ گئی۔ سجو کے تعاقب میں ناکام رہی۔ سیما کے دل پر پھر سے ایک زبردست سا دھکا لگا۔ سیما وہیں رُک گئی۔ بہت دیر تک سوچتی رہی۔ اُس کی نگاہیں سجو کو ڈھونڈ رہی تھیں۔ وہ سوچتی رہی — دیکھتی رہی —!

اس کے بالکل دو مہینوں کے بعد مدراس کے اسٹار ہوٹل اڈیار گیٹ کے لان میں انوپ جلوٹا اور طلعت عزیز کا جشنِ غزل کا پروگرام تھا۔ سیما اپنی ماں کے ہمراہ اس لان میں آئی اور چوتھی رو کے درمیان کی کرسیوں پر بیٹھ گئی۔ محفلِ موسیقی کا اجرا ہو چکا تھا۔ مائک پر محسن زیدی "جو اناؤنسر تھے" بڑے دلربا انداز میں انوپ جلوٹا کا تعارف کرا رہے تھے۔ اس کے بعد انوپ جلوٹا نے اپنی غزل کا وہ مشہور مطلع پیش کیا ؎

یہی وفا کا صلا ہے تو کوئی بات نہیں
یہ درد تم نے دیا ہے تو کوئی بات نہیں

اس شعر پر اربابِ بزم کا التفات جھوم اٹھا اور سیما پر ایک وجدانی کیفیت طاری ہوگئی۔ اچانک سامنے والی کرسیوں

کی لائن میں ایک خوبصورت نوجوان سفید سوٹ میں ملبوس، پیچھے سیما کی جانب مُڑ کر دیکھا۔ سیما چونک پڑی۔

"سجّو!" وہ پکارنا چاہتی تھی مگر سامعین کی لُطف اندوزی کا لحاظ کرتے ہوئے چُپ ہو گئی۔ سجّو کے بازو میں مدراس یونیورسٹی کے فارسی پروفیسر بھی تشریف فرما تھے۔ اُنھوں نے بھی سیما کو ایک دو بار مُڑ کر دیکھا۔ اب سیما کو مجبوراً خاموش ہی رہنا پڑا۔ پروگرام ختم ہُوا۔ سجّو اُس پروفیسر کے ساتھ لان سے باہر نکل گیا سیما اس کا تعاقب نہ کر پائی اور بے خیالی میں دل ڈوبنے والی کیفیتوں کو سینے میں دبائے اپنی ماں کے ساتھ گھر آ گئی۔

اس رات وہ بہت دیر تک سوچتی رہی۔ سجّو نے ایسا کیوں کیا؟ اور وہ اس بات پر بھی سوچتی رہی کہ دوران پروگرام سجّو غزل کے ایک ایک لفظ پہ تڑپ اُٹھتا تھا اور دل کھول کر داد دے رہا تھا۔ ویسے سیما کو معلوم تھا کہ سجّو میں غزل کی امتیازی، جمالیاتی، اور فکری پہلوؤں کو اچھی طرح جذب کرنے کی اچھی خاصی صلاحیتیں تھیں۔ غزل کے مزاج کو محسوس کرنے کے فن سے سجّو اچھی طرح واقف تھا۔ یہ سوچتے سوچتے سیما اپنے آپ، بغیر آگ کے جھلس رہی تھی۔

تنہا تنہا — !!

اب سیما کو یہ بات سمجھ میں نہیں آ رہی تھی کہ سجّو کیوں اس طرح سیما کو دیکھ کر بھی انجان ہو جاتا تھا۔ وہ سوچتی رہی — اُس کے احساسات تڑپ اُٹھتے تھے — اور اسی کشمکش میں وہ اسی طرح اپنے آپ جلتی رہی۔

تنہا تنہا — !!

کچھ دنوں بعد سیما کو اردو میں ٹائپ کیا ہُوا ایک خط بذریعۂ ڈاک موصول ہُوا:-

سیما! تمہیں سجّاد کا پیار بھرا سلام!

مجھے یاد ہے کہ اکثر شاموں میں ہم مختلف مراکز پہ ملتے تھے۔ کافی بار میں اپنی شامیں گزارتے تھے۔ مدھو رائے، مسلم اور بنگلور میں ہم اپنی چاہتوں کے جشنِ بہاراں مناتے تھے۔ اور ایک قابلِ تحسین بات یہ بھی یاد ہے کہ ہم دونوں کے مذاہب الگ ہونے کے باوجود بھی ہم دونوں کا تقوی ایک ہی تھا۔ ہم دونوں کی عقیدتمندی، ہم دونوں کی اخلاق نگاری اور تعلقات میں ایک انوکھی انفرادیت تھی ہم دونوں کی جدّت طرازیاں اور زندہ دلی زمانے کے لئے ایک مثال بن کر رہ گئی — !

مجھے یہ بھی اچھی طرح یاد ہے کہ تم سنتوشی ماں کی پوجا کے دوران سولہ ہفتوں تک جس پرہیز سے رہتی تھیں، میں ایک مسلمان ہوتے ہوئے بھی اس دیوی جی کا احترام کرتے ہوئے پوری عقیدتمندی کے ساتھ مکمل طور پر سولہ ہفتوں تک تمہاری پوجا کی تقریبوں میں اسی پرہیز کے ساتھ شامل رہتا تھا۔ اسلئے کہ تمہارا اور میرا ایمان ایک، فلسفہ ایک، عقیدہ ایک، اور ہم دونوں کا مزاجِ دل ایک رہا!

تصویر کے دوسرے رُخ پر، جب تمہاری جائیداد کے مقدمہ کے سلسلے میں تم حیدرآباد چلی گئیں۔ بہت دنوں تک تمہارا کوئی خط نہیں آیا۔ حیدرآباد میں تم کہاں رہتی تھیں میں تمہارے پتے سے ناآشنا تھا خط و کتابت کا کوئی سلسلہ نہیں رہا۔ اسی کشمکش میں ایک طویل مدّت گزر گئی۔ اتنے دن صرف تمہاری چاہتوں کے سہارے جی رہا تھا۔ اور جب یہ سہارے ہی ٹوٹ گئے تو میرے جینے کا سوال ہی کہاں پیدا ہوتا ہے!

صرف تمہاری ہی یادوں کے شعلوں میں جلتا رہا۔ بہت دنوں تک تمہارا انتظار رہا۔ آخر مجبوراً میں تمہاری یادوں سے نجات پانے کے لئے میرے ایک دوست کے ساتھ سعودیہ چلا گیا۔ وہاں جا کر بھی تمہاری یادوں سے باز نہ آ سکا اور پھر مدراس واپس لوٹ آیا۔ مجھے معلوم ہے کہ تم نے مجھے مختلف مقامات پر دیکھا تھا، پکارا تھا اور مجھ سے بات بھی کرنا چاہی۔ مگر میں تمہیں دیکھ نہیں پایا۔ تم سے ملنے کے خواب دیکھتے دیکھتے میری آنکھیں پک گئیں میرے خواب زخمی ہو گئے۔ اسی دوران قسمت کی خندہ نوازی کہ میں چکن پاکس کا شکار ہو گیا۔ سارے بدن میں جلتے ہوئے بلبلے اُبل پڑے۔ میری آنکھوں کی پتلیاں جل گئیں اور میری بصیرت مفلوج ہو گئی۔ اس عیب کو ڈھانپنے کے لئے مجھے مصلحتاً آنکھوں پہ ایک سیاہ چشمہ ہمیشہ کے لئے لگانا پڑا

غزل

میری نسلوں میں مرے فن کی جھلک باقی رہے
گُل اگر مُرجھا بھی جائے تو مہک باقی رہے

میرا اپنا میرے لئے کافی ہے گز دو گز زمیں
چھت نہیں تو کیا [illegible] سر پہ فلک باقی رہے

ایک دن پیشِ حقائق سرنگوں ہو جائے گا
دیکھتا ہوں یہ تکبّر کب تک باقی رہے

ہمسفر اس زندگی میں اک سفر ایسا بھی ہو
ذہن پر جس کا تاثر دیر تک باقی رہے

کاش عبرت گاہ بن جائے مرا جوشِ جنوں
یادگار ایسی بھی اک زیرِ فلک باقی رہے

آج تک موجود ہے جو اس کے میرے درمیاں
رہتی دُنیا تک یہ دردِ مشترک باقی رہے

درد جتنے بھی ہیں سب سے منتسب ہے [illegible]
جس کے مٹنے پر بھی تھوڑی سی کسک باقی رہے

کیا ہوا اگر ناامیدی کے اندھیرے بڑھ گئے
اپنی آنکھوں میں اُمیدوں کی چمک باقی رہے

محترم رکھنا ہے مضطر آج ہر اِک رنگ کو
تم اگر یہ چاہتے ہو کہ دھنک باقی رہے

مضطر صدیقی

اس کے بعد تمہارے ترکِ تعلقات کے زیرِ اثر میں دل کا مریض ہو گیا۔ دو بار دل کا دورہ پڑا۔ موت نے بھی ایسی حالت میں مجھے قبول نہیں کیا۔ اور تیسری بار جب دورہ پڑا تو دل کا آپریشن ہوا۔ ڈاکٹر نے سخت منع کر دیا کہ مجھے شادی نہیں کرنی چاہیئے۔ شادی میرے لئے سخت نقصان دہ ہے۔ ایسی صورت میں پھر تم سے ملوں؟ پھر سے چاہتوں کا سلسلہ شروع کروں؟ کیا تمہاری خوشگوار زندگی ایک اندھے کو قبول کرے گی جو مرد ہوتے ہوئے بھی اپنے آپ کو مرد کہنے سے شرمندہ ہے؟ کیا تمہارا وقار، تمہاری شاندار دوشیزگی اس چیز کو برداشت کر سکے گی؟ نہیں سیما! مجھے ایسے ہی تنہائیوں میں اپنے آپ جلتے ہوئے مر جانے دو۔

بس یہی اِک وجہ تھی کہ میں تم سے مختلف مقامات پر تمہاری موجودگی محسوس کرتے ہوئے بھی تم سے مل نہیں پایا۔

کہتے ہیں کہ جب کسی کی چاہت پائیدار ہوتی ہے تو یہ چاہت زندگی میں ادھوری رہ جاتی ہے اور ایسے چاہنے والے پھر سے دوبارہ جنم لیتے ہیں۔ اگر ایسا ہی ہے تو سُنو! ویسے مذہبِ اسلام میں دوسرے جنم کا عقیدہ نہیں ہے۔ پھر بھی میں اپنی موت کے بعد، عالمِ جاودانی میں جب مجھے دُعا مانگنے کا موقع ملے گا تو میرے پروردگار سے اجازت لے کر تمہاری خاطر یہی دُعاؤں کی بھیک مانگوں گا کہ یا الٰہی مجھے کم از کم ایک غیر مسلم کے روپ میں ایک اور جنم دے دے تاکہ میں میری سیما سے دوبارہ مل پاؤں اور اس کا شریکِ حیات بننے کے قابل رہوں۔ بس اس سے بڑھ کر آگے کہنے کو جی نہیں چاہتا۔!

تمہارا وہی
سجاد

غزل

بے حرامی اس لئے گالی بکے گا رات دن
اپنے نطفے کی وجہ سے وہ جلے گا رات دن
محفلوں میں بیٹھ کر مصرعہ کہے گا رات دن
خر کے باعث وہ شرارت ہی کرے گا رات دن
بیٹھ کر کچھ روز ان کے ساتھ دیکھو تم ذرا
ہاں میں ہاں کرتے رہو عزت کرے گا رات دن
جب ستارہ شام کا چمکے تمہاری آنکھ میں
تو افق کا وہ ستارا بھی جلے گا رات دن
پھول موسم کا کھلے گا جب تمہارے ہاتھ پر
وہ بھی گلشن بخت کا ساحل بنے گا رات دن
اس کی آنکھوں سے ہی اس کو دیکھئے تب بولئے
پھر ستارا ہی وہاں سِکّہ چلے گا رات دن

ساحل احمد

میرا وطن

یہ ہے میرا وطن، یہ ہے میرا وطن
اس کی عظمت پہ قرباں ہیں مرد و زن

کھیت کھلیان میں مست مزدور ہیں
درد کی چھاؤں میں لوگ مسرور ہیں
گھر ضیائے محبت سے معمور ہیں
شہر کیا گاؤں بھی اب تو پُر نور ہیں
مسکراتی ہے سورج کی ہر اک کرن
یہ ہے میرا وطن، یہ ہے میرا وطن

دیش گاندھی کے خوابوں کی تعبیر ہے
اور جواہر کی آنکھوں کی تنویر ہے
دستِ آزاد کی ٹھوس تعمیر ہے
اندرا جی کے ہاتھوں کی تصویر ہے
جس کو کہتے ہیں سب ایکتا کا چمن
یہ ہے میرا وطن، یہ ہے میرا وطن

اس کے پنجاب میں گرو کی آن ہے
اس کے پنجاب میں نانک کی پہچان ہے
سوئے اجمیر دیکھو تو کیا شان ہے
ان بزرگوں کا ہر دل میں ارمان ہے
سارے مذہب جہاں ایک ہو جائیں من
یہ ہے میرا وطن یہ ہے میرا وطن

باغِ کشمیر ہے رشکِ جنت یہاں
اور ہمالہ ہے تاجِ محبت یہاں
اس کی ندیاں ہیں بحرِ سخاوت یہاں
یہ سخی ہے لٹاتا ہے دولت یہاں
یوں برستی ہے رحمت کی اس پر پھبن
یہ ہے میرا وطن، یہ ہے میرا وطن

یوں تو سب شانتی کے پجاری ہیں یاں
حق ہیں دشمن کے لیکن ہیں تیر و کماں
ایک پل میں پلٹ دیں صفِ دشمناں
سرحدوں پر ہیں ایسے ہمارے جواں
جس پہ نازاں ہے عرفان گنگ و جمن
یہ ہے میرا وطن یہ ہے میرا وطن

عرفان زیدی بدایونی

گونگی غرّاہٹ

انوار احمد

پچھلے کئی مہینوں سے ایک گونگا فقیر اس راستے کا پتھر بن گیا ہے، جو میرے آقا حاجی خواجہ کے محل تک جاتا ہے۔ اگر میں اس کی طرف دیکھے بغیر آگے بڑھ جاؤں تو وہ بے لفظ صدا کی کند برچھی مجھ پر پھینکتا رہتا ہے۔ یہاں تک کہ میں لوٹ آتا ہوں اور اس کی ہتھیلی پر چند سکے رکھ دیتا ہوں جنہیں وہ بلا تامل نالی میں پھینک دیتا ہے۔ شاید وہ جانتا ہے کہ یہ سکے میں حاجی خواجہ کی تے میں سے چنتا ہوں بہرحال اس کی آواز سے ڈرتا ہوں، کٹے ہوئے زخرے سے نکلنے والے لفظ مل کر کیا معنی ادا کرتے ہیں، میں اس پر غور کرتا ہوں اور ڈرتا ہوں۔ میں ڈرتا ہوں اس آواز سے جو برے کی طرح میرے دل میں اتر جاتی ہے اور جس پر بجائے لجاجت اور گڑگڑاہٹ کے احتجاج اور اشتعال کا گمان گزرتا ہے۔

وہ رات کئی سال پہلے کی تھی، حاجی خواجہ جھوم جھوم کر موٹر چلا رہے تھے اور میں پچھلی نشست پر بیٹھا دن بھر میں خالی ہونے والی بوتلوں اور پامال عورتوں کا حساب کر رہا تھا کہ اچانک مجھے موٹر عجیب مانوس راستے پر جاتی ہوئی محسوس ہوئی۔ میں ایک ایک کرکے ہر درخت کو پہچانتا گیا، پھر دور سے بڑے درخت کے نیچے ایک چبوترہ دکھائی دیا، بچپن کی یادوں نے سرگوشی کی کہ یہاں لالہ مراد بخش اب بھی بیٹھا کہانی سنا رہا ہوگا۔ اس کی ہر کہانی ایک جیسی ہوتی تھی مگر کسی کا وہاں سے اٹھنے کو جی نہیں چاہتا تھا۔ ہر کہانی کے ہیرو کو فقیر کی دعا کی بدولت سونے چاندی سے بھرے سات کنوئیں ملتے تھے۔ مگر جب وہ شراب، عورت اور جوئے کے چکر میں پڑ جاتا تو وہ کوڑی کوڑی کو محتاج ہو جاتا۔ یہاں پہنچ کر لالہ مراد بخش اپنی پگ کے شملے اور مونچھوں کو تاؤ دیتا اور کہتا کہ دو جہانوں کے خزانے بھی اس کا ساتھ نہیں دیتے جو شراب، عورت اور جوئے کی لذت کے پیچھے بھاگتا ہے۔ اچانک میں نے محسوس کیا کہ حاجی خواجہ نے اپنا خمار موٹر کو بھی منتقل کر دیا ہے، نہ جانے میرے منہ سے چیخ پہلے نکلی تھی یا دھماکہ پہلے ہوا تھا، بہرطور قصہ خواں کا چبوترہ رنگین ہو گیا اور شاید دم توڑتے ہوئے لالہ مراد بخش نے کہا ہو گا "اوہ! او اسا ڈا خدا بادشاہ ہو" لیکن میرے کانوں میں تو اس کے ایسے لفظ ہی پہنچ سکے جن کے حرفوں کی سانس اکھڑ چکی تھی۔ مگر کمال حاجی خواجہ کا تھا کہ اس نے وہاں سے گاڑی کو بیک کرکے اتنی تیزی سے چلائی کہ بستی والوں نے اللہ کے عذاب کو یوں پلٹتے دیکھ کر سجدۂ شکر ادا کیا ہوگا۔

حاجی خواجہ کے محل میں بھی خزانوں سے بھرے ہوئے سات کنوئیں ہیں۔ کسی میں کھالیں پڑی ہیں تو کسی میں زرِ مبادلہ، کسی میں سمگل شدہ موٹریں پڑی ہیں، تو کسی میں روٹ پرمٹ۔ وہ دریا دل بھی ہے اور شہر کی کئی طوائفوں اور صحافیوں کے اس نے وظیفے مقرر کر رکھے ہیں۔ لندن میں قیام کے دوران جب اس نے چار غریب دوشیزاؤں کو محض سو پونڈ فی ہفتہ کی خاطر ہاؤسنگ کے شکنجے میں جکڑا دیکھا تو وہ استحصالِ انسانی پر تلملا اٹھا اور دو دو پونڈ فی ہفتہ

پرانی لڑکیوں کو اپنے ہوٹل کے کمرے میں لاکر آزاد کر دیا۔ ایک مرتبہ پیرس کے شراب خانے کے باہر اس نے ایک غریب میخوار کو حسرت بھری نظروں سے بوتلوں کو تکتے دیکھا تو اس نے بار کے مالک کو کہہ دیا کہ اس بے نوا شرابی کی ایک ماہ کی شرقاتی کا بل ادا کرے گا۔ اسی طرح روم کے بچوڑے خاندانوں میں وہ امداد کے مستحقین کو بھاری رقمیں قرضے کے طور پر دے کر بھول چکا تھا۔ خود ہمارے شہر کی کئی یتیم لڑکیوں کی دستگیری بھی حاجی خواجہ نے کی ہے۔

دراصل حاجی خواجہ سے کسی بھی قبول صورت عورت کی مجبوری اور بے بسی نہیں دیکھی جاتی اس کا دل کڑھتا ہے جب وہ عورت کو اندھیرے گھروں میں بند دیکھتا ہے۔ اس کو وہاں سے نکالنے کی خاطر وہ روپے پیسے کی قطعاً پرواہ نہیں کرتا۔

انعام کی خاطر یہ خبر میں نے ہی اسے دی تھی کہ ماسٹر بشیر کی چھوٹی بیٹی جوان ہوکر آپ کے وظیفے کی مستحق ہو گئی ہے، حاجی خواجہ نے اسی رات اسے اپنے محل میں منتقل کرنے کی ہدایت کی۔ میں قلندر اور عارف کو لے کر ماسٹر بشیر کے گھر گیا وہ دونوں گھر میں داخل ہو گئے مگر میں اندر جانے کا حوصلہ نہیں کر سکا کیونکہ مجھے خوف تھا کہ میں لاٹھی ٹیکتے ماسٹر بشیر کا سامنا نہیں کر سکوں گا۔ ماسٹر بشیر ریٹائرمنٹ کا بے حساب عذاب سہنے سے پہلے قومی مدرسے میں حساب پڑھاتے تھے۔ عاد اعظم، ذو اضعاف اقل اجزائے ضربی... میں نے اپنے دونوں ہاتھ بغلوں میں دبا لئے کیونکہ ان مشقوں کے سوال حل نہ کر سکنے پر ماسٹر بشیر کی چھڑی ہمارے ہاتھوں پر برستی تھی۔ عارف لڑکی کو اٹھا کر باہر نکلا تو اس کے تعاقب میں ماسٹر بشیر بھی ننگے پاؤں دروازے تک آئے۔ انہوں نے آنکھوں پر ہاتھوں کا چھجا بنا کر مجھے دیکھا اور ٹھٹک گئے مجھے محسوس ہوا کہ وہ عجب علامت کہہ رہے ہیں۔ عدد بالکل نالائق... مگر اسی لمحے قلندر نے زور سے ایک ڈنڈا ماسٹر جی کے سر پر مارا اور ان کے منہ سے نکلنے والے لفظ گونگے ہو گئے۔

کوٹھری میں جنوری کی ایک برفانی رات تھی کہ اپنا حاجی خواجہ کے بیٹے شوشو کا جانا تھا اور ساقی کی ساتھ ہی ... اٹھا کر ... بیٹ

خوالجلال کی عنایت سے سارے ورلڈ بینکر و صحافیت سر حد پار پہنچ چکے ہیں اور حاجی خواجہ اپنے اوور کوٹ کے اندر ہاتھ ڈال کر اپنے سوٹ کی ایک جیب میں موجود اس تقریر کو ٹٹول رہا تھا جو اسے مد قومی معیشت اور سمگلنگ کا انسداد " کے موضوع پر ہونے والے مذاکرے میں مہمان خصوصی کی حیثیت سے کرنا تھی کہ اچانک ہمارے سامنے دس گیارہ برس کا ایک پھٹا پرانا پہنے ہوئے کپڑوں میں اس ٹھنڈ سے دوزخ میں ننگے پاؤں چلتا ہوا آگیا۔ حاجی خواجہ نے نہایت فخر کے ساتھ ہی چند سکے اس بچے کے ہاتھ پر رکھنے کے لئے مجھے اشارہ کیا مگر اس سے پہلے وہ نفرت کی نگاہ ہم پر ڈالتا ہوا کسی اندھیری گلی میں گم ہو گیا۔

حاجی خواجہ بے پناہ پیتا اور کھاتا ہے، بڑھی شراب کی پیٹیاں دنوں میں ختم ہو جاتی ہیں، ہر رات جی بھر کے پینے کے بعد وہ پیٹ بھر کے کھاتا ہے۔ ایسے عالم میں وہ مجھے اور قادر بخش کو بالکل نہیلا دیتا ہے حالانکہ حاجی خواجہ کی ہر رات مالش کرنا اور اس کی بعض مردہ یا نیم مردہ رگوں کو جگانا قادر بخش کے ذمے ہے حاجی خواجہ کو کھاتا دیکھ کر آٹھ پہر کا بھوکا قادر بخش مسلسل کوشش کرتا رہتا ہے کہ وہ بھوکا نظر نہ آئے مگر جب میں قادر بخش کی طرف دیکھے بغیر حاجی خواجہ کے دسترخوان کے بچے کھچے ٹکڑوں پر ٹوٹ پڑتا ہوں تو قادر بخش ناقابل فہم زبان میں بڑبڑانا شروع کر دیتا ہے اور اگر میں اس کی طرف دیکھ لوں تو اس کی آنکھیں خراتی ہوئی محسوس ہوتی ہیں۔

حاجی خواجہ کی طرح اس کے گھر والے بھی انسان دوست اور دریا دل ہیں، حاجی خواجہ کی چار مول بیویاں گھر کے نوجوان ملازموں کو حقارت کی بجائے محبت سے دیکھتی ہیں اور نوازتی کو ان کے بیہودہ کپڑوں کی میلی جیبوں میں عطر اور اجلے نوٹ مٹھونستی رہتی ہیں۔ حاجی خواجہ کی بیٹی سے اپنے خوبصورت شوہر کی معاشی پریشانیاں برداشت نہیں ہوتیں حاجی خواجہ کا وظیفہ اس شہر کی طوائفوں کی کفالت نہیں کر سکتا حاجی خواجہ کے گودام کے ایک کونے میں زینت مائی بھی آنکھوں کے ساتھ پڑی رہتی ہے۔ گودام میں کام کرنے والے مزدور ترس کھا کر کبھی کبھی حاجی خواجہ کی بچی دال

کو اپنے کھانے میں شریک کر لیتے ہیں۔ محل کے پرانے ملازموں کو زینت مائی سے حاجی خواجہ کا التفات بھی یاد ہے اور حاجی خواجہ کے بڑے بیٹے کا۔ اسی التفات نے زینت مائی کی گود میں جو کچھ ڈالا وہ اس نے حاجی خواجہ کے محل میں لوٹا دیا۔ زینت مائی کی بیٹیاں جوان ہوکر مردان خانے کے لئے مخصوص ہو گئیں اور بیٹے زنان خانے کے لئے۔ چنانچہ کوئی بھی زینت مائی کے سرہانے بیٹھنے والا نہیں۔ میں کبھی کبھار اس کونے میں جا نکلوں تو زینت مائی میری آہٹ کو لفظوں میں منتقل کر کے سمجھنے کی کوشش کرتا ہوں تو کامیابی نہیں ہوتی مجھے اس بڑبڑاہٹ اور بھنبھناہٹ سے وحشت ہوتی ہے۔ زینت مائی کیا کہنا چاہتی ہے۔ وہ لالہ مراد بخش اور ماسٹر بشیر نے کیا کہا تھا، وہ پٹھان لڑکے اور قادر بخش کی آنکھیں کیا کہتی ہیں اور یہ گونگا فقیر کیا کہنا چاہتا ہے جو میرے راستے میں کھڑا ہے تاکہ ان سب کی غراہٹ کو لفظوں میں اس لئے بھی بدلنا چاہتا ہوں کہ اپنے آقا حاجی خواجہ کو خبردار کر کے انعام تو لے سکوں۔

دو پاؤں

روشن آرا نزہت

سبز بتی جلی اور پھر بجھ گئی۔ شاید اگلے لمحے لال بتی کے بعد پھر جلی ہو گر وہ کیا کرے اس نے تو دیکھا تھا۔ سبز بتی جل تھی اس نے راستہ کراس کرنے کے لئے قدم اٹھایا ہی تھا کہ لال بتی پھر جل گئی۔ اور ایک خطرہ بن کر اس کی راہ میں رکاوٹ بن گئی۔ اب جب بھی اس نے دیکھا تو لال بتی ہی جل رہی تھی اور وہ سر جھکا کر یہ سوچتا ہوا۔ بے بس انسان تھا کہ ایک ان کے قدم ہیں کہ اٹھے تو آگے بڑھتے چلے گئے اور ایک میرے پاؤں ہیں کہ اٹھے تو زمین میں دھنس گئے۔ مگر وہ حیران تھا۔ زمین تو ماں کے مانند ہے۔ وہ بھی کسی کو آگے بڑھتا ہوا قدم اپنے میں ہی پیوست کر کے اس کو چلنے سے باز نہیں رکھتی۔ وہ تو وہ ہے کہ جس کے سینے میں کوئی کسی بھی قسم کا دانہ گھر دیتا ہے تو وہ کونپل بنا کر سامنے لے آتی ہے۔ اور چند دنوں میں وہی کونپل پھر پودا بن کر درخت کی شکل اختیار کرنے لگتی ہے اور درخت پر بہت جلدی پھل کا بچپن نظر آنے لگتا ہے۔ اور تب شباب اور پھر پختگی جو پھل کے لئے تو واقعی موت ہے مگر دوسروں کے لئے زندگی۔ یہ ہر زمین کھیتوں کو کسانوں کے سپرد کر کے بھول جاتی ہے کہ اس کا بھی کچھ حصہ ہے۔ اور جب انسان سوکھ سا کر کسی قابل نہیں رہتا تو یہ اپنے سینے میں چھپا کر اس کی ہمراز بن جاتی ہے پھر کیسے ممکن ہے کہ وہ اس کے اٹھتے ہوئے قدم روک لے یہ خیال آتے ہی اس نے اپنا سیدھا پاؤں اٹھایا تاکہ آگے بڑھے۔ مگر ——— یہ کیا وہاں سامنے پھر سے لال بتی تھی ——— اور وہ دل مسوس کر رہ گیا۔ یہ کیا چکر ہے جب وہ قدم اٹھاتا ہے تو لال بتی ہی ہوتی ہے اس بار اس کی آنکھوں کی کٹوروں کی نمی چھونے لگی اس نے اوپر کے ہونٹوں کو نچلے دانتوں میں دبا لیا ——— زندگی اسے کیا دے رہی ہے؟ اور لوگ کہتے ہیں ترقی کرنی چاہیئے۔ آگے بڑھنا چاہیئے۔ اسی میں اپنے وجود سے دوسرے وجود تک کے لئے امید ہے ——— وہ امید جسے موت کا کڑا پنجا اٹھا کر کہیں اسے لے جاتا بلکہ موت خود زمین پر اوندھے منہ جا پڑتی ہے۔ بھلا یہ امید موت کو موت دے دیتا ہے۔ اسی کی جانب کیوں نہ بڑھا جائے۔ اس خیال نے اس میں نئی سکت اور نیا اعتماد پیدا کر دیا۔ اس نے بنا بتی دیکھے ہی اپنا قدم اٹھایا دنیا کے بھائی صاحب بیچ کے ——— دوسرے ہی لمحے ایک سائیکل سوار نے جیسے اسے طعنہ دیا۔ اور اسے لگا وہ کوئی پاگل ہے جو بنا ادھر ادھر دیکھے ہی ایک راستہ عبور کرنے کے لئے اندھا باؤلا ہو گیا تھا۔ یہ کیسی ندامت تھی جس نے اس سے اس نئی سکت کو چھین لیا۔ اور اس کے اعتماد کو پاش پاش کر دیا۔ وہ اپنے آپ کو بدنصیب سمجھنے لگا۔ وہ سمجھا بائے، زندگی کی دوڑ میں وہ ہی ایک تو ہے جو سب پیچھے ہے۔ اس نے اپنے آپ کو اس جھینپ سے نجات دلانے کے لئے پیچھے مڑ کر دیکھا۔ کچھ لوگ تھے مگر پیدل نہیں۔ وہ بڑھیا کاروں میں سوار تھے اگر رکشہ تھے تو ذرا بیچ راہ اور شوفر سرتانے بیٹھے تھے۔ ذیلی سواری ڈھو کر لے جا رہے تھے۔ جیسے وہ سواری پر کوئی

احساس تک نہ ہوا۔ کیونکہ جو چیز وقت نے اس کے چہرے کی شگفتگی اور کمر کی خمیدگی نہیں بلکہ چھین لیا ہے اسے اب اندر ایک طرح کی طاقت ہوئی۔ اس نے پڑی ہوئی کی انگلی تک میں سے لکڑی ہٹا کر انگوٹھا ہلایا اور اس سے زمین کو اس طرح چھوا جیسے وہ زمین کی کھال میں چٹکی بھر رہا ہو ——— اور کہہ رہا ہو ———

"واقعی بعد عمر کب سے ہو گئیں تم؟ واقعی ناانصافی"

اچانک ہی اسے جیسے زمین کی آواز سنائی دی۔ "اس میں میرا کیا قصور؟" اور وہ مسکرایا۔ پھر منہ ہی منہ میں کچھ بڑبڑایا۔ تب تک ایک کھمبا چھوڑ کر دوسرے کھمبے میں مدھم کار روشنی ہونے لگی تھی۔ اندھیرا چھا گیا "کیا ایسے میں آگے جا سکوں گا؟ کیوں نہیں؟" جیسے ننھے بلب نے اس کی طرف بات اچھال دی۔ وہ ہنس اٹھا۔ ایسی ہنسی جو بے جان سی تھی۔ بے آواز۔ کہیں راہوں میں ہی روپوش ہوئی ہوتی ہنسی جیسے کوئی مجرم لوگوں اور پولس کی نگاہوں سے چھپنے کی کوشش میں ادھر ادھر چھپنے کی کوشش کر رہا ہو۔ یا پھر وہ آواز ایسی تھی۔ جیسے آسمان کے پچھم میں کہیں وہ تارے ٹوٹتے ہوئے دکھن کی جانب تک چلے جاتے ہیں۔ مگر ان کی آواز نہیں ہوتی۔ اس نے ایک بار ادھر ادھر دیکھا۔ اور آہستہ سے قدم اٹھایا وہ کتنا خوش ہوا۔ جب وہ دو قدم چل سکا۔ اسے لگا وہ کوئی بہت بڑا فاتح ہے۔ بہادر ترین انسان ہے اور ایک ایسا انسان بھی جو اپنے پورے وجود میں ہونے والی ہر ہلچل سے آگاہ ہوتا ہے۔ "مرد کا سلوک" بالکل اس کے قریب آکر ایک کار رکی۔ اس میں سے ایک گوری لمبی ہیرے جواہرات سے جڑے ہار پہنے گردن باہر نکلی "ذرا تیزی سے چلا کرو۔ یہ تو دیکھو تم گزر سکتے یا نہیں کمبخت؟"

گردن نے یہ کہا اور کھپ سے اندر ہو گئی۔ کار چل دی۔ گویا کہ پیدا مسافات کی چیخ اور اور سخت رگڑی اسے لگا وہ ابھی خوبصورت لمبی سی چکیلی کار سے ٹکرا کر مر گیا ہے۔ مگر اس کے ان دو پاؤں میں ابھی تک چلنے کی تڑپ باقی ہونے کی وجہ سے وہ حرکت کر رہے ہیں۔ شاید مر کر ہی بڑھ جاتے ہیں۔ کہتے ہیں۔ کبھی لوگ مرنے کے بعد زیادہ عظیم مانے گئے ہیں۔ اگر یہ ہی جاذبیت اس کے ساتھ بھی تھی۔ جاتے تو کسے پتا چلتا کہ اس میں موت کے لئے اتنی خواہش پیدا نہیں ہوئی تھی۔ اس نے تو ابھی تک یہ ہی سمجھا تھا۔ جو مر گیا، مر گیا۔ مگر اس دن وہ پیروں میں حرکت کے لئے موت سے ہم کنار ہونے پر آمادہ تھا بس اس ایک خیال نے اس کے دھڑکتے دل میں سے ہر خوف باہر نکال کر پھینک دیا۔ وہ سڑک عبور کر کے آگے بڑھتا چلا گیا۔ اس کے قدموں میں بجلی کی کوند تھی وہ جیسے آزاد ہو گیا ہر خوف سے۔ ہر اس جذبے سے جو اس کے آگے بڑھنے سے پہلے پچھلے رہتے تھے اور وہ خواہ مخواہ ان کے بوجھ تلے دبا جا رہا تھا۔ اب اس نے دیکھا اس سڑک پر کھڑے سبھی کھمبوں میں بلب روشن تھے۔ اور ان کے نیچے سڑک پر اس طرح روشنی بکھری ہوئی تھی جیسے پہلی بار جب اس میں روشنی ہوئی تھی۔ تو اسے لگا تھا وہ بذاتِ خود روشنی کا کوئی ایسا منبع ہے جو کبھی ختم ہوگا نہیں۔ آج بھی بالکل ایسا ہی جذبہ اس کے دل میں اتر آیا تھا۔ نہ جانے کہاں سے؟ مگر اچانک ہی ایک تیز روشنی کا غول سا اس کے سامنے آ گیا۔ اور اس کی آنکھیں اندھی ہو گئیں۔ تب ہی اس نے سوچا یہ تیز روشنی بھی انسان کی دشمن ہے؟ کیا وہ بھی انسان کی اپنے اندر کی روشنی کو طلب کرتی ہے اور جہاں وہ طلب سے انہیں گل ہو گئیں تھیں۔ اور وہ منطقی شیشیں سب راستے راستوں کو گھپ اندھیروں میں پھیلا گئی تھیں۔ لوگ اپنا اپنا راستہ تلاش کرنے کے لئے اپنی آنکھوں کی روشنی سے کام لے رہے تھے۔ جو ان کی اپنی ہی تھی اور وہ بھی ان کی عظمت بن کر ان کی ان دو آنکھوں میں بستی ہے جو خود اپنا راستہ اپنے آپ تلاش کرتے ہیں۔

وہ ایک بار پھر اعتماد کی بلندیوں پر چڑھنے لگا اس کے اپنے دو پاؤں تھے۔ دو آنکھیں اور وہ اب سب ساری غلامیوں سے آزاد۔ کون ہو تم؟ کسی نے اس سے متصادم ہوتے ہوئے پوچھا تو وہ جیسے خفا ہو کر خوابوں کی دیواریں گرا کر چلتا جا رہا تھا بولا میں تو جانا پہچانا وہ شخص ہوں جو اپنا راستہ خود تلاش کرتا ہے۔ جواب میں ایک کھنکتا ہوا قہقہہ گونجا۔

"ٹھوک —— ٹھوک —— ٹھوک ——

ٹھوب۔ سڑک پر کھڑے کھمبوں میں برقی روشنیاں آ گئی تھی۔ مگر تب تک وہ بہت دور سے عبور کر چکا تھا۔ اور اس کے وہ دو پاؤں برق رفتاری سے ادھر بڑھ رہے تھے۔ جدھر وہ جانا چاہتا تھا۔

———



جب فلمی ستارے مداح بن گئے



● اداکار سنجے دت اور اُن کے مہمان نور محمدی ہوٹل کے کھانے سے لطف اندوز ہو رہے ہیں

فلمی ستارے جو ہر دم مداحوں میں گھرے رہتے ہیں، جب خود کسی کے مداح بن جائیں تو یہ حیرت کی بات ہے۔ لیکن اگر آپ نور محمدی ہوٹل کی نلی نہاری کا ایک بار ذائقہ لے لیں تو پھر آپ کو تعجب نہیں ہوگا۔ یہ ہے ہی اتنی عمدہ، لذیذ اور صحت مند کہ پہلے ہی لقمے میں خواص و عوام کا دل موہ لیتی ہے۔ اسی لئے نور محمدی ہوٹل کے مستقل گاہکوں میں بڑی بڑی ہستیاں، مشہور فلمی ستارے شامل ہیں۔ یہاں کی نلی، نہاری، بھیجہ، پائے، ماش کی دال اور دیگر کھانوں کے پیچھے ۶۰ سال کا تجربہ اور جناب عبدالحکیم مالک نور محمدی ہوٹل اور اُن کے فرزند خالد حکیم کی ذاتی نگرانی شامل ہے، جس نے اُسے ممتاز بنایا ہے۔ آپ یہاں تشریف لا کر شوق فرمائیں، اپنے احباب کے لئے گھر لے جائیں یا پارٹی کے لئے لے جائیں۔ آپ اور آپ کے مہمان ذائقہ کو کبھی فراموش نہ کر سکیں گے۔

نور محمدی ہوٹل، وزیر بلڈنگ 181/183 ای۔آر۔روڈ، بھنڈی بازار، بمبئی ۴۰۰۰۰۳

فون ہوٹل: 8511008 فون دفتر: 8516115

مُلاقات ایک نقّاد سے

وجاہت علی سندیلوی

رستم بیگ آج اپنے پورے فارم میں تھے۔ کسی شامت کے مارے نقاد نے ایک شاعر کے کلام پر تبصرہ کرتے ہوئے کہیں لکھ دیا تھا۔ "نازل صاحب پرانی روایتوں میں نئے رجحانات کو بڑی خوبصورتی اور چابکدستی سے سمو دیتے ہیں۔ اُن کا کلام ماضی کے خوابوں کو عصری تقاضوں کی روشنی میں نئی تعبیر بخشتا ہے اور وہ ادب کی پرانی روشوں میں تازہ دم جنبیت کے نئے گل بوٹے کھلاتا ہے۔ نازل صاحب کو پرانی علامتوں کو نئی علامتوں میں مدغم کرنے کا خاص ملکہ حاصل ہے۔ وہ پرانے اقدار کی شاخوں پر بھی اپنے نئے اقدار کی قلمیں باندھتے اور اگرچہ اس عمل سے ترسیل اور ابلاغ کا ایک پیچیدہ مسئلہ جلیبی کی طرح پیدا ہو جاتا ہے لیکن اس سے شعر کی معنویت اور قاری کی حیرت میں اضافہ ہو جانے کا بھی امکان بڑھ جاتا ہے....."

"لعنت! لعنت! استغفراللہ!" رستم بیگ گرجے۔ "یہ کوئی ادبی تبصرہ ہے یا کسی [illegible] کا الیکشن مینی فیسٹو۔ کچھ بھی میں نہیں آتا کہ کہنے والا کیا کہہ رہا ہے اور کیا کہنا چاہتا ہے۔ دراصل یہ کمبخت نقاد جانتا ہی نہیں کہ وہ کیا کہے۔ الفاظ کے طوطا مینا بنا کر وہ قاری کو مخبوط الحواس کرنا چاہتا ہے۔ تاکہ اس پر وہ اپنی علمیت اور ہمہ دانی کا رعب آسانی سے جما سکے۔"

رستم بیگ کبھی خود کار مشین کی طرح چالو ہوئے تو پھر چلتے ہی چلے گئے۔ کبھی ایک نقاد کی کیا، وہ نقادوں کی پوری قوم اور نسل کی بخیہ اُدھیڑنے لگے اور اُن کی شہرت اور عظمت کی عمارت پر کسی بل ڈوزر کی طرح چل پڑے۔ اور ہر گوشے اور زاویے سے اسے بے تحاشا ڈھانے لگے۔

ہم اپنی جہالت کے مارے کوئی ایسا فیتا تو رکھتے نہیں جس سے ہم رستم بیگ جیسے ابوالہول قسم کے محقق اور نقاد کا علمی اور ادبی قد ناپ سکتے۔ لیکن اتنا ہم بھی جانتے ہیں کہ وہ ہیں کوئی پہنچے ہوئے نقاد ہی قسم کے دانشور اور اس کا ایک ادنیٰ ثبوت یہ ہے کہ ہم نے جتنے بھی نقادوں کے نام سن رکھے ہیں وہ اُن میں سے ہر ایک سے تن تنہا نہ صرف لوہا لے چکے بلکہ بقول اپنے اُن کے پُرزے اُڑا چکے ہیں۔

رستم بیگ جب کبھی بے حد ناراض ہوتے تو اس نابکار پر اپنا غصہ اتارنے کے ریہرسل کے لئے ناک کی سیدھ پر سیدھے ہمارے غریب خانے پر تشریف لاتے اور از راہ خلوص و محبت اپنے معتوب کا بدل ہم کو [illegible] کر اپنے جلے پھپھولے پھوڑ ڈالتے [illegible] اور دھوبی سے زور زور سے گدھے کے کان اینٹھنے کی

تک ہم پہنچا دیں گے۔ ہم سعادت مندی سے منہ بند کئے اور کان لٹکائے یہ ارشادات سنتے رہیں گے تو ہم کو یہ خوش خبری سنائی گئی کہ ادیب و شاعر تو خیر کیا؟ اُس کے لئے علاحتیں چاہئیں، ایک بڑا نقاد ضرور بنا دوں گا۔"

اپنی خطابت کے طوفان میں بہتے ہوئے رستم بیگ یہ نکتہ سمجھانے لگے کہ آج کل کے نقاد ادھار کر ایسی مغلق، مبہم اور دو شاخی زبان لکھتے ہیں کہ یہی سمجھ میں نہیں آتا کہ وہ کسی کی تعریف کر رہے ہیں یا تنقیص۔ وہ چیخے۔

"باقی سب شعرا و ادیبات! وہ خبر نہیں کیسے گھاس کھودتے ہیں۔ شاعر تو بس ایک میں ہوں اور ہاں ہاں! کچھ تم بھی — لیکن میاں خدا لگتی پوچھتے ہو تو تم بھی کیا؟"

"اس کو کہتے ہیں صاف، کھری، دو ٹوک تنقید۔ کڑی کمان کے تیر کے مانند ہے۔

اللہ کے شیروں کو آتی نہیں روباہی

جو دل میں آیا اُسے کسی لگی لپٹی کے بغیر اور تمام مصلحت اندیشیوں کو بالائے طاق رکھ کر تڑاق سے کہہ دیا۔ نتیجہ کچھ بھی ہو گا۔

"یا اپنا گریباں چاک یا دامنِ یزداں چاک!"

رستم بیگ ایک لمحے کے لئے رُکے تو شرما جی نے اپنی کالے مخمل کی ٹوپی سر سے اتار کر میز پر رکھ دی۔ یہ سگنل تھا اس بات کا کہ ہم بھی منہ میں زبان رکھتے ہیں اور کچھ کہنا چاہتے ہیں۔ وہ ہمیشہ بولنے سے پہلے اپنی ٹوپی اُتار دیتے شاید اس سے الہامات کے لئے اُن کے سر تک پہنچنے میں کچھ آسانی ہو جاتی ہو۔

شرما جی نے بڑے جوش سے کہا: "ایسی جو شاعر اتنا خودسر، بد خود غلط اور انا پرور ہو کر اپنے علاوہ اُسے گنتی کے لئے بھی کوئی دوسرا شاعر نظر نہ آئے، اُسے تو میں ایک ذہنی مریض کہوں گا۔ اُسے آپ ایک کھرا، صاف، اور دو ٹوک تنقید کرنے والا نقاد کیسے تصور کر سکتے ہیں۔"

رستم بیگ اس غیر متوقع حملے سے گھبرائے نہیں اور غیر معمولی سنجیدگی سے بولے "برخوردار آپ اپنی ٹوپی سر پر رکھ لیں۔ آپ میرا مفہوم سمجھے نہیں۔ میں شاعر کے دعوے کی نہ تعریف کرتا ہوں نہ تائید۔ آپ اس کو اگر کبھی نفسیاتی اسپتال میں داخل کرانے کی کوشش کریں گے تو میں آپ کا ہاتھ نہیں پکڑوں گا۔ میری گزارش کا مطلب صرف یہ ہے کہ اُس نے اگر کوئی بے بنیاد بات بھی کہی تو اس انداز سے کہی کہ آپ سمجھ تو گئے کہ وہ کہہ کیا رہا ہے۔ آج کل بیشتر نقاد تو کچھ ایسی زبان میں گفتگو کرتے ہیں جیسے جان بوجھ کر یہ کوشش کر رہے ہوں کہ ع

بک رہا ہوں جنوں میں کیا کیا کچھ
کچھ نہ سمجھے خدا کرے کوئی

شرما جی نے اپنی ٹوپی اپنے سر کو واپس نہیں کی اور کہنے لگے۔

"تو اس کا مطلب میں یہ سمجھوں کہ آپ کی نظر میں سب سے بڑا نقاد وہی ہے جس کی بات آپ کی سمجھ میں آجائے، خواہ وہ بالکل بکواس ہی کیوں نہ کر رہا ہو؟"

رستم بیگ نے کرسی کی تکیہ سے ٹیک لگا کر آنکھیں بند کر لیں اور اپنے چہرے پہ کچھ اس قسم کا تاثر قائم کر لیا ع

یارب نہ وہ سمجھے ہیں نہ سمجھیں گے مری بات
دے اور دل اُن کو جو نہ دے مجھ کو زباں اور

چند لمحوں بعد آنکھیں کھول کر بولے" یہ بڑا کا لفظ آپ کس جنگل سے اور کیوں پکڑ لائے؟ اور پھر اُسے سب سے بڑا کیوں بنا دیا؟ میں نے بڑا نہیں کھرا کہا تھا۔ اور اب بھی کہتا ہوں کہ کھرا نقاد وہی ہے جو صاف اور دو ٹوک بات کرے اور ایسی زبان میں کرے کہ ہم یہ نہ سمجھیں کہ ہم کسی چڑیا گھر میں کھڑے محض کچھ ناقابلِ فہم آوازیں سُن رہے ہیں۔"

شرما جی نے طنزیہ لہجے میں کہا "کیا مغلق ہے آپ کی؟ بات آپ نہ سمجھیں اور گوشمالی کی جائے بیچارے نقاد کی۔ شیکسپئر اور غالب کی اگر آپ بہت سی باتیں نہیں سمجھ پائے تو آپ کی رائے میں انھیں بھی بساطِ ادب سے باہر کر دیا جانا چاہیئے۔"

رستم بیگ نے خفا ہونے کے بجائے شرما جی کو کچھ اس انداز سے دیکھا جیسے اُن کے ہم نام رُستم پہلوان اپنے مدِ مقابل کسی چیندی پہلوان کو اس نیت سے دیکھا ہو گا کہ میں اس بیوقوف کو اکھاڑے کی کس سمت اٹھا کر پھینکوں جو اس کے کم سے کم چوٹ آئے۔ اور پھر طنزیہ لہجے میں بولے؛

"میں نقادوں کی بات کر رہا ہوں آپ خلط بحث کے لئے تخلیق کاروں کو درمیان میں لے آئے۔ غالب اور شیکسپئر یا اُن کے ہی جیسے مرتبے کے تخلیق کاروں کو یقیناً یہ زیب دیتا ہے کہ وہ انسانی فکر کی عمومی جولان گاہ سے آگے نکل جائیں۔ اُن کا توسنِ خیال اگر سرحدِ ادراک کو پار کر جاتا ہے تو کوئی مضائقہ نہیں لیکن ایک نقاد کو کب یہ حق پہنچتا ہے کہ وہ کسی تخلیق کی تشریح اور توضیح کرتے کرتے اپنی تنقید میں مبہم، مغلق اور مہمل ہو جائے اور سراسر اول فول بکنے لگے اور "مدعا عنقا ہے اپنے عالمِ تقریر کا" کی تفسیر بن جائے۔"

شرما جی رستم بیگ کی اس شعلہ بیانی سے کچھ ڈھیلے پڑ گئے تھے۔ لیکن انھوں نے اپنی ٹوپی اپنے سر کو واپس نہیں کی اور بولے۔

"بہر کیف تنقید بھی تو ایک طرح کی تخلیق ہوتی ہے۔"

رستم بیگ اس جملے پر کسی خنکاری سُتے کی طرح جھپٹے "جی ہاں بہر کیف! صد حیف! تنقید بھی ایک قسم کی تخلیق ہوتی ہے۔ لیکن کس قسم کی؟ حفظِ مراتب نہ کنی زندیقی! — قاضی کے گھر کے چوہے بھی سیانے ہوتے ہیں۔ لیکن اگر وہ قاضی سے بھی زیادہ سیانے بنے

کی کوشش کرتے ہیں یعنی قاضی کے عمامے میں گھسنے کی کوشش کرتے ہیں تو پھر ان کی واقعی جگہ جو ہے دان میں ہوتی ہے۔ مطلب یہ ہے کہ تنقید کچھ بھی ہو وہ تخلیق کے بغیر وجود ہی میں نہیں آ سکتی۔ اسے تخلیق کے پیچھے چلنا چاہئے نہ کہ آگے۔ اب اگر تنقید قاری کو تخلیق سے بے نیاز کر کے اُسے مخبوط الحواس بنانے کی غرض سے، اپنی فتنہ سامانیوں اور کرشمہ سازیوں سے مرعوب اور مسحور کرنے لگتی ہے تو میں اسے حماقت اور صرف حماقت کہوں گا۔"

رستم بیگ نے جوش میں آکر میز پر اتنی زور سے گھونسا مارا کہ اُس پر رکھی ہوئی سب پیالیاں کھنک اُٹھیں۔ خمر ماجی نے نیچے اُٹھا کر اپنی ٹوپی سر پر رکھ لی لیکن رستم بیگ کی گفتگو کی سیلابی کیفیت میں کوئی فرق نہ آیا۔

"جی ہاں! آج کل تنقید کی جاتی ہے اپنی ہمہ دانی کا ڈھنڈورا پیٹنے کے لئے — بیچارہ الف کتاب لکھتا ہے۔ ڈاکٹر 'ب' اُس پر ایک تبصرہ لکھتے ہیں اور اس میں غیر ملکی نقادوں مثلاً پروفیسر چیچو اور موسیو سویابین اور مسٹر پاؤ پا کے ارشادات کو پلاؤ میں بوٹیوں کی طرح پیش کیا جاتا ہے۔ اس پر پروفیسر 'ج' جوش میں آکر ایک تبصرہ پر تبصرہ لکھ مارتے ہیں اور وہ پلاؤ کی بوٹیوں کو کچا نوش جان کرنے کے بعد کچھ مغفور لوزدلِ ادب کے الہامات کو نرگسی کوفتوں کی شکل میں سامنے لا کر رکھ دیتے ہیں۔ اس کے بعد ایک علامہ کا مجمد خون کھولنے لگتا ہے اور وہ تبصرہ اور تبصرہ پر تبصرہ دونوں پر ع

"اب جگر تھام کے بیٹھو مری باری آئی"

چیختے، چنگھاڑتے اور دہاڑتے حملہ آور ہوتے ہیں اور اپنے سامنے پڑنے والی ہر چیز کو ایک ہولناک ٹِل ڈوزر کی طرح روندتے اور زمین کے برابر کرتے ہوئے نکل جاتے ہیں۔ اب بتائیے اس تباہ کاری اور رقابت گری میں بیچارے 'الف' کی تخلیق کہاں گئی؟"

رستم بیگ بے حال ہو کر سانس لینے اور پانی پینے کے لئے رُکے تو خمر ماجی نے لقمہ دیا۔

"اچھا بھائی اب یہ پٹارہ بند کرو اور چلو نازل صاحب کے دیوان "بازیچۂ اطفال" کے جشنِ اجرا میں۔"

رستم بیگ قہقہہ لگاتے ہوئے کھڑے ہو گئے اور کہنے لگے " اور صاحبو آج کل تنقید بھی کی جاتی ہے کس انداز کی ع

اے طفلِ خود معاملہ قد سے عصا بلند'

مرغوب صاحب کے مقالے پر میں نے مضحک صاحب کی تنقید پڑھ کر پوچھا کہ یہ کس انداز کی تنقید ہے؟ کہنے لگے یہ ماحولیاتی تنقید کہلاتی ہے۔ میں نے پھر دریافت کیا کہ یہ کس جنگل سے پکڑ کر لائے ہو؟ آخر یہ ہوتی کیا ہے؟ بڑی شانِ استغنا سے بولے۔

"یہ ابجزائی تنقید سے کچھ مختلف ہوتی ہے۔"

رستم بیگ اور خمر ماجی ہنستے ہوئے چلے گئے تو میں نے اپنے سر پر ایک گلاس پانی انڈیلا اور آرام کرسی پر آنکھیں بند کر کے بے سُدھ ہو گیا۔

غالباً بے ہوش ہو گیا تھا۔

سُرخ وسِیاہ حاشیے

جیون لال شرما

فاصلے ایسے بھی ہونگے یہ کبھی سوچا نہ تھا

(عدیم ہاشمی)

جو مینڈھو بھاگ گیا سو بچ گیا، جو نہیں بھاگا وہ دھر لیا گیا۔ برطانیہ کی کورٹ آف اپیل نے اس قانونی اُصُول کو مسترد کر دیا ہے (۱۴ مارچ ۱۹۹۱ء) کہ شوہر کو بیوی سے زِنا کا مرتکب قرار نہیں دیا جا سکتا۔ بیوی سے زبردستی مباشرت کرنے والا شوہر زِنا بالجبر کا مجرم ہوگا۔ عدالت عالیہ نے بڑے یقین کے ساتھ اس رائے کا اظہار کیا ہے کہ اِس فیصلے سے ایک دل شکن، نازیبا اور فرسودہ قانونی اصول کو ختم کیا جا رہا ہے۔

جس وقت عدالت فیصلہ سُنا رہی تھی، ومین اگینسٹ ریپ (Women agains Rape) "وار" کی سرگرم خواتین باہر مظاہرہ کر رہی تھیں۔ اُنھوں نے بینرز پر اظہار کیے تھے کہ —

"رشتۂ ازدواج میں بھی ریپ جُرم ہے"

"بیوی بننے کا مطلب یہ نہیں کہ ساری زندگی کے لئے ہاں کر دی" —

ہم نے جب وعدہ کیا تھا تو بہت کمسن تھے
دیکھئے اب قابلِ اِنکار ہوئے ہیں کہ نہیں

ڈھونڈتی ہیں مری آنکھیں کسی ہرجائی کو

(قتیل شفائی)

"ہسبینڈ" (Husband) کے لفظی معنی ہیں 'گھر کا مالک' جس کی بیوی اُس کی ہاں میں ہاں مِلائے۔" موجُودہ دَور میں عورتوں کی دُہائی یہ ہے کہ وہ مَرد کی جائیداد نہیں ہیں۔ گائے بکری نہیں ہیں کہ کھونٹے سے باندھ کر رکھا۔ بعض کو تو بُرا (Bra) میں بند ہو کر رہنا بھی منظور نہیں ہے۔ ایک لہر تو ایسی آئی تھی کہ برا کے بندھن کو بھی غلامی کی علامت سمجھا گیا۔ لہٰذا بہت سی روشن دماغ بیبیوں نے برا کو اُتار پھینکا۔ بلکہ کئی بار تو پبلک مظاہرہ کرتے ہوئے آگ میں ڈال دیا۔ گویا غلامی کے تصوّر تک کو جلا کر راکھ کر دیا۔

شادی میں ریپ اور بن شادی کا بچہ عورت کی جنگِ آزادی کی تازہ ترین کامیابیاں ہیں۔ یہ ترقیاں انھیں سَو، سَوا سَو سالوں میں ہوئی ہیں۔ ۱۸۸۰ء سے پہلے شادی شدہ انگریز واقعی ہسبینڈ ہُوا کرتا تھا یعنی گھر کا مالک۔ جس کی بیوی اُس کی ہاں میں ہاں ملاتی تھی۔ آگیا کاری ہوتی تھی۔

اُن دنوں طلاق کا بھی کوئی چلن نہیں تھا۔ انگریز بیوی کے لئے طلاق حاصل کرنا بہت ہی مشکل ہُوا کرتا تھا۔ قریب قریب ناممکن۔

خاوند کے مظالم اور ہرجائی پن سے

[illegible] ساجن کہنے کا بہتر ایک ہی طریقہ تھا کہ بیوی اپنے آپ کو میلے میں گم کر لے۔"

ایک مرتبہ ایک شخص کی گھوڑی اور بیوی دونوں ہی کھو گئے۔ اُس نے گمشدہ کی تلاش کا اشتہار شائع [illegible]:-

"گھوڑی کی تلاش کرنے والے کو پانچ گِنّی (پانچ پونڈ اور پانچ شلنگ) کا انعام دیا جائے گا۔ اگر بیوی بھی ڈھونڈ دی گئی تو مزید پانچ شلنگ پیش کیے جائیں گے۔

وہ جسے آپ گنتے تھے آشنا جسے آپ کہتے تھے باوفا۔

(مومن)

ساجن کا اِصرار کہ ہم تو گیت سُنیں گے۔

(پروین شاکر)

بیوی چلّا چلّا کر کہہ رہی تھی "میں طلاق لینا چاہتی ہوں۔"

خاوند کہہ رہا تھا "پہلے بستر پر چلو، وہاں بات کریں گے۔"

پڑوسی کہتے ہیں کہ چیخ دُہائی کی آوازیں آ رہی تھیں۔

وکیلِ استغاثہ نے الزام دھرا کہ خاوند نے چاقو نکال لیا تھا۔

خاوند بیچارہ شاید سمجھ ہی نہ پایا ہو کہ یہ سب کیا ہو رہا ہے۔ اُس نے کیا غلط کیا ہے؟

خیر۔ آج دن منگلوار، تاریخ ۲۶ مارچ سنہ ۱۹۹۱ء لندن کی سینٹرل کریمنل کورٹ نے ایک خاوند کو اپنی بیوی کی "اِچّھا" کے بغیر اُس کا ریپ کرنے کے جرم میں پانچ سال کے لئے زندان میں ڈال دیا ہے ؎

ابھی بن کے جو گزرا ہے ابھی
تھا کسی وقت میں اپنا تو گو

(پروین شاکر)

خاوندوں کی ایک انجمن نے کہا ہے کہ 'موڈ' بنانے سے پہلے بیوی کا حلفیہ بیان تصدیق کروا لینا چاہیے:

"میں مسمّات...... زوجہ...... اپنے مکمل ہوش و حواس کے ساتھ یہ بیان حلفی تحریر و تصدیق کروا رہی ہوں کہ میں بھی آج شب اپنی خوشی...... اپنی رضا...... بلا کسی دباؤ...... یا دھمکی اور لالچ......"



بابِ انتقاد

آنچل اور پرچم
نظموں کا مجموعہ
شاعر — سروش یزدانی
صفحات ۹۶ قیمت ۲۲ روپیہ

ملنے کا پتہ۔ ماہنامہ شان ہند، فلیٹ نمبر ۵ انصاری مارکیٹ دریا گنج نئی دہلی۔ ۱۱۰۰۰۲

پچاس دہائیوں سے زیادہ طویل اپنے تخلیقی سفر کا ماحصل زیر تبصرہ مجموعہ سروش یزدانی کا دوسرا شعری مجموعہ ہے۔ جو خالصتاً روایتی انداز کی موضوعاتی نظموں پر مشتمل ہے اس جدت پسندی کی مروجہ فیشن پرستانہ روش سے ہٹ کر سروش صاحب نے اعلیٰ تعمیری اقدار اور اخلاقی معیارات پر مبنی ایسے شاہکار ادب پارے تخلیق کئے ہیں جو ان کی انفرادی شناخت کا ثبوت ہیں اور جن کی مثالوں سے زیر تبصرہ مجموعہ صفحہ اوّل تا آخر آراستہ ہے سروش صاحب کی شاعری میں ترقی پسند ادب کے اس لہجے کی بازگشت سنائی دیتی ہے جس کی گھن گرج سے ۱۹۳۶ء سے پوری ادبی دنیا گونجتی رہی ہے اور جو ۱۹۶۰ء کے بعد جدیدیت کے شور و غوغا میں گم ہو کر رہ گیا۔

نئے دور منظر عام پر آنے والے غزلیات کے مجموعوں کی بھیڑ بھاڑ میں "آنچل اور پرچم" کی ایک نمایاں خصوصیت یہ بھی ہے کہ خالصتاً موضوعاتی نظموں کا مجموعہ ہے۔

"آنچل اور پرچم" میں جہاں ماں، دوش گلاں، اطفال، علم، شاعر، خطیب، وطن جیسی ہمہ گیر مقصدیت کی حامل اخلاقی نظمیں شامل ہیں وہیں جمیل مرحوم کے کنٹراسٹ، امید اور دوار کی گری جیسی علاقائی موضوعات پر نظمیں بھی موجود ہیں جو شاعر کے اپنی مٹی سے جڑے رہنے کے پُرخلوص جذبے کی غماز ہیں۔

اس مجموعہ کو انفرادی معنویت عطا کرنے والی دو بےحد طویل نظمیں "امن" اور "جنگ" ہیں جن سے سروش صاحب کے بحرِ علم کے ساتھ ان کی زود گوئی اور قادر الکلامی کا اندازہ لگایا جاسکتا ہے ان میں ہر نظم پانچ پانچ قسطوں پر منقسم ہے اور ہر قسط سو اشعار پر مشتمل ہے اس اعتبار سے یہ دونوں نظمیں ڈھائی سو اشعار پر محیط ہیں۔ فارسی الفاظ و تراکیب کی کثرت سے زبان قدرے ادق ہو گئی ہے لہٰذا سہل پسندی کے اس دور میں مجموعہ خواص کی چیز ہو کر رہ گیا ہے۔

مذکورہ بالا نظموں کے علاوہ مختلف اچھوتے موضوعات پر سروش صاحب کی مزید پندرہ نظمیں "آنچل اور پرچم" کی دیدہ زیبی کے اضافے کا موجب ہیں ڈاکٹر مشتاق الرحمان خاں مشتاق کے پیش لفظ کے علاوہ سروش صاحب کی شاعری پر طارق جمال جیسے ماہرِ فن صاحبِ عروض، عمر فہ قریشی جیسے استاد کامل، شارق نیازی جیسے باعلم اور صاحبُ الرّائے اور اخلاق اثر جیسے مشہور محقق کے بیش بہا تاثرات شامل ہیں۔ جدت پسندی کے اس دور میں صحت مند اور لازوال گم گشتہ روایات کی بازیافت کے لئے اپنی نوعیت کا یہ منفرد مجموعہ ہر صاحبِ ذوق کی لائبریری کی زینت ہونا چاہیئے۔

محبوب راہی

من کہ مکتوب الیہ

برادرم سرورؔ تونسوی صاحب، آداب و نیاز!

اس ریاست (خصوصاً وادیٔ کشمیر) کی حالت برابر ابتر چل رہی ہے۔ مرکزی سرکار کی کج روی کے سبب اور ریاست کے خود غرض و چاپلوس رہنماؤں کے باعث نوجوان طبقہ افراتفری کی ہیج اپنائے میدانِ کارزار میں سرگرم عمل ہے۔ یہ جد و جہد اب عوامی تحریک کا روپ اختیار کر چکی ہے۔ اور نام نہاد لیڈروں سے قطع تعلق، "عوامی نمائندوں" سے رابطہ قائم کرنے کی ضرورت ہے۔ ایک افسانہ "وقت کا اسیر" حاضر خدمت ہے۔

نیاز کیش

حسن ساہو، سری نگر۔

مکرم و محترم شمیم مجاہدی صاحب،

سلام!

فروری کے شمارے میں اپنی نظم "تجزیہ" شائع ہوئی۔ خوشی ہوئی جس کے لئے میں آپ کا ممنون ہوں۔ میں کچھ دنوں کے لئے بمبئی آیا ہوں اور آپ کے مارچ اور فروری کے شانِ ہند کے شمارے یہیں ملے۔ آج کے حالات اور حالت سے متأثر ہو کر چند اشعار کہے ہیں جو آپ کی خدمت میں ارسال کر رہا ہوں۔ شاید آپ بھی ان حالات سے متفق ہوں گے۔

مارچ کے شمارے میں اختر شاہجہانپوری صاحب کی غزل کے کچھ اشعار نے بے حد متأثر کیا ہے۔ یعنی ؎

اخلاص و وفا ہو کہ بزرگوں سے عقیدت

اس دور کی تہذیب میں کھنڈروں کی طرح ہے

اس دور میں اولاد سے اُمید کفالت

سیلاب میں ڈوبی ہوئی فصلوں کی طرح ہے

مزید آپ کی صحت کے لئے دعا گو ہوں۔ کار لائق سے سرفراز کریں گے

خیر طلب

آپ کا بھائی، یوگیندر بہل تشنہ

جناب گرامی قدر سرورؔ صاحب،

آداب و نیاز!

"شانِ ہند" اردو کا ایک ایسا مجلہ ہے جس کے ذریعے آپ نے علم و ادب کی قابلِ لحاظ خدمات انجام دی ہیں جو بجا طور پر لائقِ تقلید ہیں۔ خدا آپ کو تا دیر سلامت رکھے تا کہ اردو ادب کو ایک عرصے تک ایسا ہی سرچشمہ ملتی رہیں۔

ہر ماہ کی مرسلہ اشاعتیں باقاعدہ پہنچتی رہتی ہیں۔ میں بھی توازن کا ہر شمارہ آپ کو بھیجتا رہتا ہوں۔ فضا ابن فیضی نمبر کے بعد کی اشاعت قریب التکمیل ہے۔ جلد ہی حاضرِ خدمت کر سکوں گا۔

ایک نئی بات یہ کہ فضا ابن فیضی نمبر پر سلطان سبحانی کا تبصرہ ارسالِ خدمت کر رہا ہوں۔ اسے ازراہِ ادب نوازی اپنے مجلہ کی قریبی اشاعت میں طباعت پذیر فرما کر ممنون فرمائیے۔ دوسری گزارش یہ ہے کہ آپ اپنی گرانقدر تازہ تصنیف "دلی کے مشاعرے" کی ایک جلد کے ساتھ کسی معتبر ادیب کا اچھا سا تبصرہ مجھے بھی بھیج دیجئے۔ "توازن" کے زیرِ ترتیب شمارہ میں نمایاں جگہ میں بھی دے دوں گا۔ اُمید ہے توجہ دیں گے۔

خدا کرے آپ ہر طرح اچھے ہوں۔

نیاز مند

عتیق احمد عتیق

ایڈیٹر "توازن" مالیگاؤں

گرامی المرتبت مکرمی و محترمی جناب سرورؔ صاحب، آداب و تسلیمات!

آپ کے دو گرامی نامے باصرہ نواز ہوئے شکریہ۔

"دلی کے مشاعرے" کی مقبولیت آپ کی سالہا سال کی اس مشقت جانکاہ کا صلہ ہے جو آپ خود ادبی نشستوں میں بہ نفسِ نفیس حاضر رہ کر کیمونیکی کی صورت میں شانِ ہند کے صفحات پر فرماتے رہے ہیں۔ تصنیف خاصی ضخامت لئے ہوئے ہے اور مشاعروں کا آنکھوں دیکھا حال حقائق کی عکاسی اس میں محفوظ کر لیا گیا ہے۔ بایں صورت وہ ایک تاریخ شعر و ادب معتبر ہے جو فرداً کی نسلوں کو ان کے فنکار کی مسلسل ادبی عروج و ارتقاء سے روشناس کرانے کا سبب ہو گی۔ لہٰذا یہ کہنا کوئی مبالغہ نہ ہوگا کہ آپ نے وہ احسن ترین کام دہلی کے حق میں انجام دیا ہے جو کسی نے نہیں دیا۔ شعرا حضرات کا تعارف ان کے منتخب اشعار کا انتخاب، انداز تحریر بڑی خوبی

[illegible] کی ... [illegible] جہاں
[illegible] ادب کی ترجمانیات کا [illegible]
[illegible]
([illegible])

حرف آپ ... آپ !
آپ کی کتاب [illegible]
[illegible]
[illegible] فراہم کرتی ہے۔

مشہور محقق جناب انور سدید کا فرمان

دلی کے مشاعرے

مشاعروں کی تخیلی روداد (افسانوی) کا اولین نقش مرزا فرحت اللہ بیگ نے بنایا۔ اس کو تشکیلی روپ [illegible] نے دیا۔ آزادی کے بعد فروری [illegible] کو جب دلی میں بہادر شاہ کے جشن [illegible] پر لال قلعہ میں پہلا مشاعرہ ہوا تو اس کی روداد [illegible] نے لکھی اور یہ اتنی مقبول ہوئی کہ اس کے بعد ہر سال اس قسم کی رپورٹ لکھنے کا مطالبہ کیا جانے لگا۔

زیر نظر کتاب "دلی کے مشاعرے" [illegible] سے لے کر [illegible] تک کے اہم مشاعروں کی روداد ہے۔ [illegible] نے ان مشاعروں میں محض ایک [illegible] شخص کا فریضہ ادا نہیں کیا، بلکہ وہ ان مشاعروں میں [illegible] رہے اور سخن شناسی کا [illegible] بھی دیتے رہے اور ہر غزل پر اپنا بے لاگ تبصرہ کر کے غزل کی تحسین و تنقید بھی کرتے رہے [illegible]۔ ان کی ایک خوبی یہ ہے کہ وہ صاف گوئی سے گریز نہیں کرتے اور کسی کو [illegible] کمزوری میں [illegible] کا موقع بھی نہیں دیتے۔ اس کتاب میں [illegible] ایک ناظر کی صورت میں سامنے آتے ہیں [illegible] مشاعرے کے [illegible] انہیں تاریخ دلی [illegible] کر رہا ہے اور اب انہیں کتابی صورت [illegible] کا کام کر رہا ہے۔

مشاعرہ ہماری تہذیب کا ایک اہم ادارہ [illegible] کے ساتھ [illegible] مشاعرے کے [illegible] بالواسطہ سامنے آتی ہے۔

اسے مکتبہ [illegible] نے شائع کیا ہے۔

[illegible]

[illegible]

نیاز گیلانی
ساقی [illegible]
(ماہنامہ [illegible])

[illegible] سلام مسنون !
[illegible]
[illegible]

[illegible]

شانِ ہند

جلد ۵۲ شمارہ ۱

چیف ایڈیٹر
سرور تونسوی

جوائنٹ ایڈیٹر
مطرب صحرائی

اشاعت کا ۵۲ واں سال

پرنٹر، پبلشر، پروپرائٹر: ودیا پرکاش سرور تونسوی
طباعت: خواجہ پریس، جامع مسجد دہلی۔ مقامِ اشاعت: دفتر ماہنامہ
"شانِ ہند" فلیٹ ۵ انصاری مارکیٹ، دریا گنج، نئی دہلی ۲-۰۰۱۱۔

اِس شمارے کی اہم جھلکیاں

اللہ دُوئے اسلام مسجد کے امام کا انتخاب وراثت کی بنا پر نہیں ہوتا کسی کو شاہی امام کہا جائے، یہ بات بھی انوکھی ہے....

"شاہی امامت" "تبیّن بہ تحقیق" میں

شاہی امامت تاریخ وشریعت کے آئینے میں۔

حاجی انور علی

پوشاک، (کہانی) اقبال مجید

بچا بقدم کی صحکی، جمیل انور

حقیر آستانی، محمد ابراہیم کوثر، وجاہت علی سندیلوی، راز لائلپوری کی غزلیں۔

دیپک قمر کے ماہیے۔

باب انتقاد، منن کر مکتوب الیہ،

مستقل کالم بدستور

ہندو پرست ہوں نہ مسلماں پرست ہوں
دامن پرست ہوں نہ گریباں پرست ہوں
ہر ذرّۂ وطن سے ہے فیّاض مجھ کو پیار
یعنی وطن پرست ہوں، انساں پرست ہوں

فیاض گوالیاری

قیمت فی شمارہ۔ پانچ روپے
قیمت سالانہ [illegible]
لائف ممبری [illegible]

ممالک غیر میں:-
بذریعہ سمندری ڈاک -/۱۰۰ روپے
بذریعہ ہوائی ڈاک -/[illegible] روپے

غزل

ڈاکٹر حقیر آستانی مرحوم



وہ جو ہے عرصے سے مائل بہ کرم
کیا بھروسہ یہ بھی ہو اُس کا ستم

آج وہ پھر سے کرم کرنے لگا
آج پھر سے ہو چلی ہے آنکھ نم

زخم تازہ ہوں کہ کہنہ زخم ہوں
رِستے رہتے ہیں زیادہ ہو کہ کم

کیسے شکوے کیا شکایت، کیا گلے
کیسے نالے، کیسی آہیں، کیسے غم

دیکھتے ہیں کیا اثر دِکھلائے گا
پی ہی لیں گے آج جا کے جامِ جم

آپ تو یوں ہی پریشاں ہو گئے
آپ لوٹیں گے وہاں سے تازہ دم

کس نظر کی بات کرتے ہو حقیر
اس نظر میں ایک ہیں دَیر و حرم

جناب سرور تونسوی علیل ہیں، اس لئے اداریہ نہ لکھ سکے۔ محترم سید حامد صاحب سابق وائس چانسلر مسلم یونیورسٹی علی گڑھ کے زریں خیالات پیش خدمت ہیں۔

——— مضطرب صحرائی

شاہی امامت

احساسِ تناسب کے آئینے میں

حضرت امام جامع مسجد کو سیاسی قیادت سونپنے میں کلیدی کردار ہیم وتی نندن بہوگنا صاحب نے ادا کیا، جنھوں نے حضرت امام جامع مسجد کو سیاسی مزاج میں پختہ تر کر دیا — وشو ناتھ پرتاپ سنگھ ہیں —

ہم ہندوستانی مسلمانوں کے بارے میں یہ بات عام طور پر تسلیم کی جاتی ہے کہ انھوں نے عقل کی جگہ جذبات کو بٹھا دیا ہے اور یہ بہر حال ہونے کا نتیجہ ہے۔ عقل [illegible] ہوتی ہے، جذبات

دھوئیں کی چادر تان دیتے ہیں جس کو چیر کر روشنی تک پہنچنا دوبھر ہو جاتا ہے۔ ایسے میں صحیح فیصلہ کرنا، بھلے برے کو سمجھنا کسی کے بس کی بات نہیں۔ لیکن جہاں تک ہمارا تعلق ہے ایک اور وصف بھی پرکھنے اور فیصلہ کرنے کی راہ میں

حائل ہوتا ہے۔ وہ ہے تناسب کے احساس اور اندازے [illegible] خیال [illegible] کی کمی۔ ہم بات کرتے [illegible] ہیں۔ ایمان کی بات کرتے ہیں [illegible] ہیں۔ [illegible]

[illegible] سے [illegible]
[illegible]
ان میں گم ہو کر اصل موضوع اور کسی مرکزی نقطہ کو فراموش کر دیتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ہم شاذ ہی کسی معقول اور منطقی نتیجہ پر پہنچ پاتے ہیں۔ ہمارے درمیان بات بہت جلد اپنے محور سے ہٹ جاتی ہے۔ حالانکہ جس طرح وہ زمین جس پر ہم بستے ہیں، شب و روز اپنی دُھری پر رقص کرتی رہتی ہے، اس پر رقص نہ کرے تو ایک پل میں بکھر جائے اور دن اور رات کا تواتر بھی داستانِ پارینہ ہو کر رہ جائے۔ دراصل ہم ہی نہ رہیں۔ قیامت کے روز شاید یہی ہونے والا ہے۔ اچانک یہ خوبصورت زمین، یہ مہ لقا کیتی رقص سے بھی محروم ہو جائیگی اور طواف سے بھی۔ اسی طرح انسان کے ذہن کے کارآمد ہونے کے لئے ضروری ہے کہ وہ موضوع کے محور کے گرد گردش کرے، یکسوئی اور یکجہتی کے ساتھ۔ ذہن کتنا ہی بڑا کیوں نہ ہو، اگر وہ محور سے ہٹتا ہے، ایک موضوع سے دوسرے موضوع تک منتقل ہوتا رہے، یا اصل کو چھوڑ کر فروعات میں اُلجھتا رہے تو انتشار کے سوا کچھ ہاتھ نہ آسکے گا۔

آوارہ فکری کا یہی وصف ہندوستانی مسلمانوں کو حساب سے دُور اور اس مضمون میں کمزور رکھتا ہے۔ گزشتہ پانچ دس سالوں میں اس وصف یا بیماری نے شدت پکڑ لی ہے۔ زبان تو زبان ہے، اب تحریر میں بھی کسی بات پر ہم بامقصد سیر حاصل، مربوط اور نتیجہ خیز گفتگو نہیں کر پاتے۔ اخبارات میں قارئین کے جو مراسلات شائع ہوتے ہیں اور ان میں جو بحثیں چھڑتی ہیں، وہ تو بزبانِ حال اور زبانِ قال سے بار بار ہماری اس ذہنی عادت کی طرف اشارہ کرتی ہیں۔ موقر جریدہ "قومی آواز" نے اپنے حالیہ کسی شمارہ میں حاجی انور علی دانی ایڈوکیٹ کا ایک مضمون "شاہی امامت تاریخ اور شریعت کے آئینہ میں" شائع کیا۔ مضمون کی زبان و بیان سے قطع نظر اس کا لب لباب اور مقصد تحریر یہ تھا کہ:

راقم السطور کو اسی کی طالب علمی کے دور میں سرحد اور پنجاب کے کلکتار شاہ صاحب کہہ کر پکارتے تھے۔ اُس کا نفس تو ضرور اس طرز تخاطب سے موٹا ہوا لیکن یہ تحریک کبھی نہیں ہوئی کہ وہ خود کو شاہی طالب علم یا ایسا کی کا شاہی کھلاڑی کہے یا کہلوائے۔ خواجہ صاحب کے استدلال میں ایک بار پھر غلطی ہوئی ہے۔ شاہانہ وقت میں سے کسی کا احترام کرنا ایک بات ہے اور جامع مسجد کے امام کو شاہی امام کہنا بالکل دُوسری بات ہے۔

(۱) از رُوئے اسلام مسجد کے امام کا انتخاب وراثت کی بنا پر نہیں ہوتا۔ کسی کو "شاہی امام" کہا جائے، یہ بات بھی انوکھی ہے۔

(۲) کسی بھی مسجد کے امام کو یہ حق نہیں پہنچتا کہ وہ سیاسی امُور میں مداخلت کریں، یا اُن میں قیادت کا دم بھرے۔

صاحب مضمون نے اور بہت سی باتیں جناب امام صاحب جامع مسجد دہلی کے ممتاز خانوادہ کے بارے میں کہہ دیں جو راقم السطور کی نگاہ میں غیر ضروری بحثیں اور فروعی بحثیں اور جن سے غلط مبحث کے امکانات پیدا ہو سکتے تھے۔ مضمون کے آخری حصے میں جناب امام صاحب جامع مسجد دہلی کے بارے میں جو لب و لہجہ اختیار کیا گیا وہ اختیار نہ کیا جاتا تو بہتر تھا۔ کہنے کی بنیادی باتیں وہی دو تھیں جو صاحب مضمون نے تقریباً شروع ہی میں کہہ دیں۔ یہ باتیں کہنے کی تھیں۔ مسلمانانِ ہند کی فلاح اور فلاح کے لئے یہ ضروری تھا کہ یہ باتیں کہی جائیں، دُہرائی جائیں اور ذہن نشین کرائی جائیں۔ جناب امام صاحب جامع مسجد کو بحیثیت ہندوستان کے ایک ممتاز شہری کے یہ حق حاصل ہے کہ وہ ہندوستان کے سیاسی مسائل پر غور کریں اور ایک شہری کی حیثیت سے (اپنی مذہبی حیثیت کا استعمال کئے بغیر) اپنی رائے کا اظہار کریں۔ انھیں بحیثیت ہندوستانی مسلمان کے یہ حق بھی حاصل ہے کہ مسلمانوں کی فلاح کے لئے کوشش کریں، لیکن انھیں یہ حق ہرگز حاصل نہیں ہے کہ بحیثیت امام جامع مسجد کے وہ مسلمانوں کی سیاسی قیادت اپنے ہاتھ میں لیں یا اُن کی ترجمانی اور نمائندگی کریں۔ اگر وہ ایسا کرنا چاہتے ہیں تو انھیں دو کام کرنے پڑیں گے۔

(۱) وہ جامع مسجد کی امامت سے مستعفی ہو جائیں
(۲) تاریخ اور سیاست اور عالمی حالاتِ حاضرہ کا گہرا مطالعہ کریں اور اپنے اندر تاریخ کا شعور اور سیاسی سُوجھ بُوجھ پیدا کریں۔

ہندوستان ایک جمہوری مُلک ہے، جہاں مسلمان دیگر مذہبوں کے ماننے والوں کے ساتھ رہتے ہیں۔ ان سب نے مل کر ایک دستور بنایا ہے جس کے تحت ہندو اور مسلمانوں کے سب کو مذہبی آزادی حاصل ہے۔ چونکہ ہندوستان ایک اسلامی مُلک نہیں ہے، اس لئے یہاں کی سیاست پر نہ اسلام کو (نہ کسی اور مذہب کو) اثر انداز کیا جا سکتا ہے۔ اس لئے یہ تصور سب سے غلط ہے کہ جناب امام جامع مسجد جمعہ کے خطبہ میں مسلمانوں کی سیاسی رہنمائی کے فرائض ادا کریں۔ جو کام جس کا ہو اُسے وہی کرنا چاہئے۔ بے جا مداخلت کا نتیجہ تباہی اور بربادی ہوتا ہے۔

محترم امام صاحب جامع مسجد نے گزشتہ [illegible]
تمام سیاست [illegible] ہمارے
[illegible] قیادت پر

ادیا۔ ایسا اُنھوں نے کچھ تو سیاسی داؤ پیچ اور
یا جہلی اور خوش عقیدگی کے تحت کیا، اس سے لئے
ضرت امام جامع مسجد کی موجودگی اور اُن کے
یاسی رجحانات اور قیادتی عزائم نے ایک بڑی
ہولت فراہم کر دی۔ اُنھوں نے سمجھا کہ امام صاحب
ہنوا لیا جائے تو عامۃ المسلمین اُن کی
رنی کے ثناخواں بن جائیں گے۔ پھر اُن لوگوں سے
، کوئی نہیں سُنے گا جو تاریخی شعور کے تحت حالات
ا صحیح تجزیہ کر کے کسی فیصلہ پر پہنچتے ہیں۔ حضرت
م جامع مسجد کو سیاسی قیادت سونپنے میں کلیدی
ردار ہیم وتی نندن بہوگنا صاحب نے ادا کیا،
جنھوں نے حضرت امام جامع مسجد کو سیاسی مزاج
ں پختہ تر کر دیا۔ وشوا ناتھ پرتاپ سنگھ صاحب
ں۔ آخر الذکر نے تو امام محترم سے سیاسی فتویٰ
ی حاصل کر لیا کہ مسلمان جنتا دل کو ووٹ دیں۔
اقم السطور اپنی اس رائے کا کئی بار اظہار
ر چکا ہے کہ مسلمانوں کا دُور رس مفاد درج
ہرست ذاتوں اور قبیلوں، پسماندہ طبقوں، ترقی
بند سیاسی پارٹیوں کے قریب آنے میں ہے، لیکن
ہ سمجھتا ہے کہ ان دونوں بزرگوں نے امام صاحب
محترم کو سیاست میں راسخ کر کے مسلمانانِ ہند
کو ایک عرصہ تک زبردست نقصان پہنچانے
کا اہتمام کر دیا ہے۔ اور امام صاحب کے سیاسی
اقتدار کی شکل اگر یہی رہی تو مسلمان ہوش و گوش
اور غور و فکر سے دُور ہوتے چلے جائیں گے اور بھیڑوں
کے گلّہ کی طرح ہانکے جائیں گے اور کاٹے جائیں گے۔
انور علی صاحب کے مضمون پر ایک طویل مراسلہ
۱۴ راگست کو خواجہ حسن ثانی نظامی صاحب نے
شائع کرایا ہے جو راقم السطور کی نظروں میں محترم
ہیں اور اسے افسوس ہے کہ وہ اُن سے اختلافِ
رائے کی جسارت کر رہا ہے۔ اس مراسلہ میں
بات دراصل اپنے محور سے ہٹ گئی ہے اور غلط
مبحث رونما ہو گیا ہے۔ مضمون نگار نے جو کچھ
اصلاً کہا ہے اس کی کسی بات کی تردید مراسلہ نگار
کی تحریر سے نہیں ہوتی۔ مراسلہ نگار نے امام صاحب
کے ممتاز خانوادہ کے ساتھ انصاف کر کے ہم سب کا

احسان کیا ہے؟ یہ اُن کا حق تھا جو انھوں نے ادا
کر دیا لیکن خود مضمون نگار نے بھی موجودہ امام صاحب
کے آبا و اجداد سے کوئی خامیاں منسوب نہیں کی
تھیں۔ مضمون نگار کی تحریر کا مدعا صرف یہ تھا
کہ ائمۂ جامع مسجد کے طویل مقدس سلسلہ میں سوائے
موجودہ امام صاحب کے کسی نے سیاست کو شعار
نہیں بنایا۔ مخدومی خواجہ حسن ثانی نظامی صاحب
کا مراسلہ "ہنر بِش نیز بگو" کی وضع کا ہے؟
اور ہُنر بھی آبا و اجداد کے بیان کئے گئے ہیں ـــ
خواجہ صاحب کا یہ عقیدت مند اُن کی خدمت میں
مؤدبانہ عرض کرے گا کہ مسئلہ یہاں کسی ایک شخص
کے کردار کے حسن و قبح کا نہیں ہے بلکہ ایک ملّت
کے دُور رس اور دیرپا مفاد کا ہے۔ کیا سیکولر
جمہوریت کے اس دور میں یہ مناسب ہوگا کہ
ہندوستانی مسلمانوں کی رہنمائی، ترجمانی اور تقدیر
کو جامع مسجد دہلی کے امام محترم . . . کے حوالے
کر دیا جائے اور ہم جامع مسجد سے فتاویٰ حاصل
کر کے سیاست کی بساط پر اُلٹی سیدھی چالیں
چلتے رہیں۔

لفظ "شاہی" کے ضمن میں جو توجیہ خواجہ
صاحب نے فرمائی ہے، وہ قارئین کی فکر کو زیادہ دُور
تک نہیں لے جاتی۔ یہ باور کرنا سعیٔ بلیغ کے بعد
بھی دُشوار ہوگا کہ شاہی کا سلسلۂ نسب یہاں
سادات سے ملتا ہے۔ راقم السطور کو اس کی
طالب علمی کے دَور میں سرحد اور پنجاب کے طلبا
شاہ صاحب کہہ کر پکارتے تھے۔ اس کا نفس تو ضرور
اس طرزِ تخاطب سے موٹا ہوتا لیکن یہ تحریک کبھی
نہیں ہوئی کہ وہ خود کو شاہی طالب علم یا بابا کی کا شاہی
کھلاڑی کہے یا کہلوائے۔ خواجہ صاحب کے استدلال
میں ایک بار پھر غلطی ہوئی ہے۔ شاہانِ وقت میں
سے کسی کا احترام کرنا ایک بات ہے اور جامع مسجد
کے امام کو شاہی امام کہنا بالکل دوسری بات ہے۔

ایک طرف دُنیا کی رسم ہے، دوسری طرف
مذہب کا اصول۔ غور کیجئے، مسجد کے امام کی عزت
نسبتِ شاہ سے بڑھتی نہیں گھٹتی ہے۔ امام کے لئے
تقویٰ شرط ہے اور شاہی ملازمین کے لئے شرط

بالعموم ترکِ تقویٰ ہے۔ خلیفۂ وقت نے لاکھ چاہا
کہ حضرت امام ابوحنیفہؒ قاضی القضاۃ کا منصب
قبول فرمائیں۔ انہوں نے انکار کر دیا۔ مسلمان
اپنے بادشاہوں کے لئے دل میں نرم گوشہ رکھتے
ہیں۔ یہ ایک طبعی امر ہے لیکن اس سے بادشاہی
کا جواز پیدا نہیں ہوتا۔ علّامہ اقبالؔ نے ایک جگہ
لکھا ہے ؎

دل ہمارے یادِ عہدِ رفتہ سے خالی نہیں
اپنے شاہوں کو یہ اُمّت بھولنے والی نہیں

اس شعر کو پڑھ کر سب سے زیادہ برہم ایک
ایسے بزرگ ہوئے جو عبقری حیثیت رکھتے تھے، جو
دن رات شاعرِ مشرق کا کلمہ پڑھتے رہتے تھے، جن
کے بے شمار اشعار اُن کے وردِ زبان اور زیبِ تقریر
تھے۔ آپ ان بزرگ سے ناواقف نہیں ہیں، یہ تھے
رئیس الاحرار مولانا محمد علی جوہر۔ اقبالؔ کی زبان
سے "اپنے شاہوں" سُن کر انھیں سخت دھکا پہنچا
اور اُنھوں نے شکایت، دُکھ اور احتجاج بھری زبان
میں اس کا اظہار کیا۔ ہمارا شاعر تھوڑی دیر کے
لئے محور سے ہٹ گیا تھا۔ مولانا محمد علی نے لکھا کہ
اسلام اُنھوں نے اقبالؔ سے سیکھا تھا۔ اقبالؔ نے
شاہی کو تسلیم کر کے بظاہر اسلام کے ایک بنیادی
اصول سے انحراف کیا تو انھیں سخت دُکھ پہنچا۔

راقم کہتا ہے کہ انور علی صاحب کو اس
مضمون کے لئے جو تحقیق کے بعد ایک دل پذیر انداز
میں لکھا گیا ہے، داد ملنی چاہیئے (سوائے اُن
مقامات کے جہاں لہجے میں تلخی اور طنز آگیا ہے)
داد پیرایۂ بیان یا محض تحقیق کے لئے نہیں، بلکہ
اس بات کے لئے کہ اُنھوں نے جرأت کے ساتھ ایک
ایسے موضوع کو چھیڑا ہے جس کا گہرا تعلق ہندوستانی
مسلمانوں کے امکانات اور اُن کے مستقبل سے ہے۔
یہاں سوال ایک فرد کی نیک نامی یا اقتدار کا نہیں،
ایک ملّت کی فلاح اور اصلاح اور اجتماعی اصابتِ
رائے کا ہے۔ کاش ہم سب، سارے ہندوستانی
مسلمان، یہ طے کر لیں کہ ہر حالت میں کسی فرد کے مفاد
پر خواہ وہ کتنا ہی بڑا کیوں نہ ہو، جماعت اور ملّت
کے مفاد کو بالا رکھیں گے کہ یہی طریقہ جماعت اور

ملت کی فلاح اور پیشرفت کا ہے۔ ہم پر لازم ہے کہ جہاں موٹی موٹی باتیں وہ لوگ کہہ گئے ہیں جہاں موشگافی سے پرہیز کریں کہ غلط جگہ کا موشگافی سے بہتر طریقہ ہونا ہمارا نہیں ہوا ہے۔

دراصل مسئلہ اتنا سہل نہیں جتنا پہلی نگاہ میں دکھائی دیتا ہے۔ لیل و نہار کا پاہی پلٹ دیتے ہیں۔ صاحبقرانِ ثانی شاہجہاں کے جاہ و جلال کو دیکھا، وہ شاہجہاں جس کی نازک اندام صورت ملکہ ارجمند بانو بیگم نے، جس کے ہوشربا جمال کا تاج محل ایک بھیگا سا عکس ہے، ایک شیر جنا، اسی کی نسل میں آگے چل کر محمد شاہ رنگیلا اور اس قماش کے ذوسیکر کمزور عیش کوش اور خفیف الحرکات بادشاہ پیدا ہوئے جن کا وجود مغلیہ سلطنت پر کبھی نہ مٹنے والا داغ بن گیا ہے۔ یہ کہنے سے مراد ہرگز تشبیہ موجودہ محترم امام صاحب جامع مسجد کی تنقیص نہیں ہے۔ ہم اُن کا احترام کرتے ہیں۔ اور چاہتے ہیں کہ اُن کے خرقۂ زہد اور گریبانِ امامت پر سیاست کا دھبہ نہ لگنے پائے۔

راقم خواجہ صاحب سے برملا اختلاف ہرگز نہ کرتا، اگر اسے اس بات کا یقین نہ ہوتا کہ اس مضمون میں جو بنیادی باتیں اُٹھائی گئی ہیں، وہ سارے مسلمانوں کے غور و فکر کی مستحق ہیں اور ان پر غور کئے بغیر وہ پسماندگی اور گمراہی کی دلدل میں دھنستے جائیں گے۔

مذہب' یا مذہبی منصب کا ضرر رساں استعمال امام صاحب جامع مسجد تک محدود نہیں ہے۔ مولانا عبیداللہ اعظمی صاحب ایوان میں پہنچنے سے پہلے بہت آتش افشانی فرما چکے ہیں مولانا سید مظفر حسین کچھوچھوی نے ابھی چند مہینے ہوئے ایسی باتیں کہیں جو آگ لگا دینے والی تھیں اور خود انتہا پسندوں کے مجمع میں ایک نوجوان کو اُنھیں اُن کے ہاتھ سے مائیک چھین کر روکنا پڑا۔ جنوب میں بھی ایک بزرگ ہیں جن کی زبان آگ کے دریا برساتی ہے لیکن خدا کا شکر ہے کہ انھوں نے اپنی خطاؤں کا کفارہ تعلیمی ادارے کھول کر کردیا ہے۔ امام صاحب محترم اپنے غیر معمولی سیاسی رسوخ کے علاوہ ایک علامت ہیں اُن سارے شعلہ انداز خطیبوں کی جو جوشِ خطابت اور زعمِ قیادت میں وہ سب کچھ کہہ جاتے ہیں جو انھیں نہیں کہنا چاہیئے۔ اور جس سے مسلمانوں اور فرقہ وارانہ ہم آہنگی کو زبردست نقصان پہنچتا ہے۔ وہ نمائندہ ہیں سیاست میں مذہب اور مدعیانِ مذہب کی مداخلت کا۔ یہ مداخلت مسلمانانِ ہند کے لئے مضر ثابت ہورہی ہے۔ ہمیں تہیہ کر لینا چاہیئے کہ ہم اربابِ مذہب کو سیاست پر اثر انداز نہ ہونے دیں گے۔ اگر مذہب کی اثر اندازی کا سلسلہ بڑھتا چلا گیا تو ظاہر ہے کہ غلبہ اکثریت کے مذہب کا ہوگا۔ ہم ایسی بازی کیوں شروع کریں جس میں ہمارے جیتنے کا سرے سے کوئی امکان ہی نہ ہو۔

انور علی صاحب نے دو باتیں ثابت کردی ہیں۔ جامع مسجد کی امامت موروثی نہیں ہوسکتی، امامت کا رشتہ سیاسی قیادت سے جوڑنا ضرر رساں اور تباہ کن ہے۔ آپ ان کی تحقیق و تدقیق کو بھول بھی جائیے تو بھی یہ دو باتیں فراموش نہیں ہوسکتیں۔ اگر سارے ہندوستانی اسلام کے ماننے والے ہوتے تب ہی مذہب کی روشنی میں سیاسی فیصلے کئے جا سکتے تھے، یہاں تو ہم بمشکل آٹھ میں ایک ہیں۔ ہم سب نے مل کر یہ صحیح فیصلہ کیا تھا کہ ہندوستان کو ایک سیکولر جمہوریت بنایا جائے گا۔ اگر یہاں مذہب کا عمل دخل ہوا تو چاروں طرف اکثریت کے آچاریہ منصبِ اقتدار پر متمکن نظر آئیں گے اور امام صاحب محترم اس ہجوم میں دکھائی بھی نہ دیں گے۔ عقلمند وہ کام کرے ہی کیوں جو بعد میں پشیمانی کا باعث ہو۔ گفتگو کو پایۂ تکمیل تک پہنچانے سے پہلے یہ کہنا بے محل نہ ہوگا کہ سیاسی باتوں کے لئے مسجد اور جمعہ کے خطبے کا استعمال نامناسب اور پُر خطر ہے۔ اگر کسی خطبے میں سیاسی لَے اور اشتعال کی آنچ زیادہ تیز ہوگئی تو اسی لمحہ جامع مسجد کی بے حرمتی اور اس میں اربابِ اختیار کی دراندازی کا خطرہ لاحق ہوجائے گا۔ قارئین واقف ہیں کہ اورنگ زیب نے سینکڑوں مندروں کو عطیات اور جاگیریں دیں جس کے بارے میں فرامین آج تک محفوظ ہیں۔ اسی اورنگ زیب نے کئی مندروں کو مسمار کیا۔ اورنگ زیب نے اچھا نہیں کیا۔ لیکن میں جو بات کہنا چاہ رہا ہوں وہ یہ ہے کہ حکومت کوئی بھی ہو کسی وضع کی ہو، شاہی ہو یا جمہوری، اپنے خلاف اشتعال اور سازش کو برداشت نہیں کرسکتی۔ اورنگ زیب نے انہی مندروں کو توڑا جہاں حکومت کے خلاف سازشیں کی جاتی تھیں اور لوگوں کو بغاوت پر اُکسایا جاتا تھا۔ اس میں ہمارے لئے سبق ہے جمہوری حکومت اپنی حفاظت پر اسی طرح کمربستہ اور نگراں رہتی ہے جیسے شاہی حکومت۔ ہم اس دن سے ڈرتے ہیں کہ باوردی پولیس جامع مسجد دہلی اور دوسری مسجدوں میں داخل ہونے لگے اور اس کی دست برد سے نہ امام بچیں نہ مقتدی۔

الغرض احساس تناسب ہمیں یہ بتاتا ہے کہ (۱) شاہی امامت کا جواز نہ شریعت میں ہے نہ تاریخ میں (۲) سیکولر اور جمہوری ہندوستان میں جہاں مسلمان شدید اقلیت میں ہیں، اُن کے مذہب کا سیاست پر اثر انداز ہونا ملک کے لئے مضر ہے، اور خود مسلمانوں کے لئے بے حد مُضر ہوگا۔ (۳) جامع مسجد یا دوسری مسجدوں کو سیاسی اور اشتعال انگیز تقریروں کے لئے استعمال کرنا ان مساجد کی توہین کے مترادف ہے اور اُن کی بے حرمتی کا موجب ہوسکتا ہے (۴) جناب امام صاحب جامع مسجد نے ذاتی طور پر کبھی سیاسی دانشمندی کا ثبوت نہیں دیا اور یوں بھی یہ اُن کا میدان نہیں ہے۔ انہوں نے جامع مسجد کے منبر سے شعلہ بار اور اشتعال انگیز تقریریں کی ہیں، اُنہوں نے مسلمانوں کو توازن اور اعتدال اور تعمیر کی تلقین کبھی نہیں کی۔ انہوں نے بعض باتیں ایسی کہیں اور کیں جو نہ جامع مسجد دہلی کے امام کے شایانِ شان تھیں جو وہ ہیں، نہ مسلمانوں کے سیاسی رہنما کی، جو وہ ہونے کا دعویٰ کرتے ہیں۔ لال قلعہ سے وزیر اعظم ہند کی تقریر کو اپنی تقریر سے کاٹنے کی کوشش میں وزن و وقار کی کمی تھی۔ حضرت امام جامع مسجد نے آدم سینا بنانے کا اعلان کیا۔ ہندو سمجھے کہ مسلمان جنگ کی تیاریاں

رہے ہیں۔ انہوں نے اپنی سیناؤں کو مضبوط
یا اور نئے جنگی دل قائم کرنے اور ہندستان
کی فضا مسلمانوں کے لئے مکدر ہو گئی۔ ستم یہ کہ
ری آدم سینا کا غدر سے زمین پر منتقل نہ ہو سکی۔

(۵) یہ نکتہ بھی بنیادی طور پر صحیح نہیں ہے
تاریخ صرف کتاب میں لکھی ہوئی بات کو نہیں
تے ہیں۔ تاریخ معاصر کتابوں، روایتوں، اقوال،
ارتوں، کھنڈروں، کتبوں اور قرائن سے سب
ذ کی جاتی ہے، لیکن جگہ بالآخر کتابوں میں پاتی
ہے۔ تحقیق، تدقیق، چھان بین کے بعد، تاریخ کو
انگریزی میں History کہتے ہیں،
اور قصہ کہانی، افسانہ، روایت کو لیجنڈ (Legend)
ہے۔ تاریخ کو مورخین نے دریافت شدہ
مواد اور تحقیق کے نئے طریقوں کی روشنی میں کئے
زر پرکھتے رہتے ہیں اور یہ عمل برابر جاری رہتا ہے۔

(۶) 'شاہی امامت' اس ترکیب میں باہم تضاد ہے۔ "شاہی طبیب" اور "شاہی جوہری" اور شاہی منجم یا جوتشی کی تراکیب تو سمجھ میں آتی ہیں کہ ان کی خدمات شاہ کے لئے مامور تھیں، اور انھیں بادشاہ کی طرف سے تسلیم کیا گیا تھا۔ شاہی امام کا مفہوم اس نہج پر سمجھنا دشوار ہے۔ ایسا امام تو کوئی کبھی نہیں ہوا جس کی خدمات امامت بادشاہ وقت کے لئے وقف ہوں۔ علاوہ بریں یہ اصطلاح فرسودہ اور بعد از وقت اس لئے نظر آتی ہے کہ شاہوں کا دور کبھی کا ختم ہوا، یہ جمہوریت کا زمانہ ہے۔ جمہوریت کے زمانے میں ہم شاہی کے گن گا رہے ہیں۔ امامت کو، جو تقویٰ پر مبنی ہوتی ہے، بادشاہت کے ساتھ جوڑ رہے ہیں اور وراثت کو اس کی وجہ تسمیہ بتا رہے ہیں۔ ایک سیکولر جمہوریت میں زمام قیادت ایک ایسے بزرگ اپنے ہاتھوں میں لے رہے ہیں جو ایک مذہبی منصب پر مامور ہیں۔ ان صاحب کو مسلمانوں کی سیاسی رہنمائی عبر مسلم سیاسی لیڈر عطا کر رہے ہیں۔ سیاسی لیڈر کے لئے باخبری، ہوش و گوش، غور و فکر، سنجیدگی اور حلم ضروری ہے۔ ہماری لیڈری کے مدعی ایک ایسے صاحب جو جلد مشتعل ہو جاتے ہیں اور مشتعل کر دیتے ہیں۔ ناخدا کا اگر یہ حال ہو تو سفینہ کا کیا حشر ہوگا؟ احساس تناسب کے آئینہ میں دیکھیے تو یہ ساری تصویر اندھی دکھائی دے گی۔ اس میں قصور ہمارے لائق احترام امام صاحب جامع مسجد کا نہیں ہے، قصور مسلم عوام اور ہندو سیاسی لیڈروں کا ہے جو امام صاحب محترم سے سیاسی رہنمائی منسوب کر رہے ہیں۔

شاہی اِمامت

تاریخ اور شریعت کے آئینے میں

حاجی انور علی، ایم۔اے، ایل۔ایل۔بی

آزادی سے پہلے اینگلو ورناکیولر مڈل اسکول ہوا کرتے تھے۔ ان اسکولوں کے ٹیچروں کی تنخواہ قلیل ہوا کرتی تھی، لیکن یہ بڑی تندہی، لگن، محنت اور بے غرضی سے اپنے شاگردوں کو پڑھاتے تھے۔ یہ ٹیچرز ہندوستانی زبانوں پر عبور رکھتے تھے، ان کا عمومی مطالعہ بڑا وسیع ہوتا تھا۔ لیکن کالج اور یونیورسٹیوں کے فارمل ایجوکیشن، گریجویٹ پوسٹ گریجویٹ ڈگریوں کے نہ ہونے سے یہ بیچارے ٹیچر نہ "ماسٹر" ہی کہلاتے تھے

آج ہم ایک ایسے ہی ٹیچر کا تذکرہ کرتے ہیں اس مضمون کے لئے ہم ان کا نام "ماسٹر چراغ دین" رکھے دیتے ہیں۔ سادہ لباس میں نستعلیق شخصیت کے حامل ماسٹر چراغ دین صاحب بحر العلوم تھے۔ کلاس میں وقت کی پابندی، اچھے عادات واطوار اور آداب مجلس کی پابندی ہوم ورک روزانہ کرنے کی پابندی ان کو بہت پسند تھی۔ اس زمانہ میں گھر پر ٹیوشن پڑھانے کے متعلق تو کوئی سوچ بھی نہیں سکتا تھا۔ ماسٹر چراغ دین صاحب بڑی شفقت اور بے غرضی کے ساتھ ہونہار طلباء کو گھر پر بلاتے، ان سے اپنا حقہ تازہ کراتے، چلم گرم کراتے خود چارپائی پر آلتی پالتی مار کر بیٹھ جاتے اور پھر گھنٹوں اپنے مخصوص سوال وجواب کے انداز میں علمی معلومات کے گوہر لٹاتے، ان کے پڑھانے کے انداز کی عظمت کا احساس ہمیں اس وقت ہوا جب ہم نے اپنے پوسٹ گریجویشن کرنے کے زمانے میں مکالمات افلاطون اور سقراط وارسطو کی تدریسی تقاریر پڑھیں

ایک دن بارش ہو رہی تھی۔ موسم سہانا تھا ماسٹر صاحب حقہ کے کش لے رہے تھے، ہم لوگ بے وفا ہسٹری کی کتاب میں "اکبر اعظم کی دکن کی مہم" یاد کر رہے تھے۔ یہ سوچتے ہوئے کہ ماسٹر صاحب کیا جواب دیں گے میں نے سوال کیا "ماسٹر جی! شاہی کے کیا معنی ہیں؟ اس کے مختلف محل استعمال کیا ہیں؟"

ماسٹر صاحب نے فرمایا۔ لفظ "شاہی" مختلف معنوں میں استعمال ہوتا ہے۔ وقت کے سیاق وسباق میں "شاہی" سے مطلب "دورِ حکمرانی" ہوتا ہے — جگہ کی نسبت سے اس کے معنی "بادشاہ سے متعلق" ہوتے ہیں۔ مثلاً شاہی محل، شاہی اصطبل، شاہی چراگاہ۔ اور فرد کی نسبت سے بطور صفت بھی اس کا استعمال ہوتا ہے مثلاً بادشاہ کا درزی، "شاہی درزی" "بادشاہ کا طعام گر" "شاہی بھنڈارہ" اور بادشاہ کا محافظ دستہ "شاہی باڈی گارڈ"۔ یہ اسم بھی ہے جس کے معنی "اقتدار اعلیٰ" کے ہوتے ہیں، مملکت جغرافیائی کے تعلق سے اس کے معنی مملکت Dominion کے ہوتے ہیں فرہنگ آصفیہ میں اس کے معنی "بادشاہی"، "سرداری"، "بادشاہت"، "حکومت" اور "شاہانہ" لکھے ہیں

پھر تھوڑی دیر رک کر فرمایا۔ انگریزوں کی حکومت کے قیام کے بعد بھی کچھ لوگوں میں شاہوں کی ذہنی غلامی رہی اور اچھے اچھے ادیبوں نے مغل شاہزادوں اور بیگمات کے دردبھرے قصوں کو اپنی تخلیقات کا موضوع بنایا اسی ذہنیت کے زیر اثر جامع مسجد دہلی کے علاقہ میں "شاہی کباب گر" اور "شاہی حمام" کے بورڈ بھٹیاروں اور حجاموں کی دکانوں

پر کافی عرصہ تک لگائے جاتے رہے۔ اردو ڈرامہ نویسی میں "شاہی چور"، "شاہی لٹیرا"، "شاہی محسبہ" وغیرہ ڈرامے لکھے گئے جن کو انھیں ناموں سے فلمایا بھی گیا اور یہ سب ہمارے تحت الشعور میں چھپی "شاہ پرستی" کی علامت ہے جو بدترین ذہنی غلامی ہے۔

ماسٹر چراغ دین کھرے سید تھے۔ لیکن انھوں نے اپنے نام کے ساتھ کبھی سید نہیں لکھا۔ کہا کرتے تھے "میں عاجز گنہگار۔ مجسم عصیاں۔ سرور کائنات سے نسبت کا اظہار اس وقت تک کیسے کر سکتا ہوں جب تک اس کے لئے خود کو اہل ثابت نہ کر لوں"

ایامِ محرم۔ عشرہ کا دن تھا ماسٹر صاحب واقعۂ شہادت اور حضرت امام حسینؓ کی حیاتِ مبارک کے متعلق بتا رہے تھے..... باتوں باتوں میں لفظ "امام" پر بات چل گئی۔ ماسٹر صاحب نے فرمایا۔

امام کے معنیٰ ہیں آگے چلنے والا۔ ہادی، رہبر، رہنما، سردار۔ اس کے معنیٰ مجتہد کے بھی ہیں اور یہ فقیہ، محدث اور محقق شریعت کے معنیٰ میں بھی استعمال کیا جاتا ہے جیسے امامِ اعظمؒ، امام شافعیؒ۔ یہ لفظ بادشاہ، سلطان وقت اور ملک کے معنیٰ میں بھی استعمال ہوتا ہے۔ فتح گجرات پر جمعہ کی نماز میں اکبر اعظم کا مشہور خطبہ احمدآباد (۱۵۷۲ء) جس میں اس نے خود کو "امام عادل" کے لقب سے ملقب کیا، سکوں پر بھی اکبر اعظم "امام عادل" کندہ کیا گیا۔ جس وقت کے علمائے اسلام نے برا بھی کا اظہار کیا تھا۔ امام تسبیح کا وہ دانہ بھی کہلاتا ہے جو سب دانوں سے اوپر اور سرے پر ہوتا ہے"

کچھ دیر رک کر ماسٹر صاحب نے فرمایا۔ "سنی فقہ میں "امام" نماز با جماعت پڑھانے والے کو بھی کہتے ہیں۔ اثنا عشری شیعہ حضرات "پیش نماز" کہتے ہیں..."

پھر ماسٹر صاحب نے علامہ اقبال کا یہ شعر پڑھا

قوم کیا چیز ہے قوموں کی امامت کیا ہے
اس کو کیا سمجھیں یہ بیچارے دو رکعت کے امام

چنانچہ اس شعر کے پہلے مصرعہ میں علامہ موصوف نے "امام" قوم کے رہبر، قائد اور رہنما کے معنوں میں استعمال کیا ہے اور دوسرے مصرعہ میں با جماعت نماز کی امامت کرنے والے کے معنوں میں"

سلسلہ کلام جاری رکھتے ہوئے ماسٹر چراغ دین نے فرمایا۔ "شیعہ فقہ میں امام معصوم عن الخطا ہوتا ہے اس سے غلطی ممکن نہیں۔ وہ مامور من اللہ ہوتا ہے وہ خاص مشن کے لئے مبعوث ہوتا ہے اور مشیتِ الٰہی کے مطابق اس کو پورا کرتا ہے اسی لئے شیعہ مجتہد بھی اپنے نام کے ساتھ "امام" کا لفظ استعمال نہیں کر سکتا"

پھر فرمایا: "شیعہ حضرات میں امام ضامن باندھنے کی ایک رسم ہوتی ہے۔ جب کوئی شخص کسی مہم یا سفر پر روانہ ہوتا ہے، یا شادی منگنی کے موقعہ پر سیدنا امام علی رضا علیہ السلام سے منسوب "امام ضامن" (ایک روپیہ) اس کے بازو پر باندھ دیا جاتا ہے عقیدہ یہ ہے کہ حضرت امام علی رضا علیہ السلام نے اس کو اپنی حفاظت و ضمانت میں لے لیا"

پھر سنی نقطۂ نظر کی وضاحت کرتے ہوئے ماسٹر چراغ دین نے فرمایا۔ "امام اور امیر اسلامک پولیٹیکل سائنس کی اصطلاح ہے خلیفۃ المسلمین کے لئے یہ اصطلاح دورِ اول خلافت راشدہ (۶۳۲ء) سے ۱۹۲۴ء میں ترکی خلافت عثمانیہ کے خاتمہ تک برابر استعمال کی جاتی رہی۔ اور خلیفۂ دنیا کے تمام مسلمانوں کا "امام" ہوتا تھا اس کے بعد کسی بھی مسلمان بادشاہ یا سلطان کے لئے "امام" کی اصطلاح کا استعمال نہیں کیا گیا اس معنیٰ میں "امامت" انگریزی لفظ Sovereign سے مماثلت رکھتی ہے جو دنیاوی ([illegible]) اور دینی ([illegible]) دونوں طرح سے سربراہِ ملک و قوم ہو۔ اس مفہوم میں ہندوستان کے آئینی، سیاسی اور معاشرتی پس منظر میں "امام" اور "امامت" بے محل اور خارج از بحث ہے ہندوستان تو ایک آئینی سیکولر جمہوریت ہے جہاں مسلمان کو عقیدہ اور مذہبی شعائر پر عمل کی آزادی ہے اور اس کی آئینی ضمانت دی گئی ہے لیکن ملکی آئین اور قانون کسی بھی شخصیت کو مذکورہ مفہوم میں "امام" تسلیم نہیں کرتا۔

ماسٹر چراغ دین صاحب نے سلسلہ کلام جاری رکھا "نماز با جماعت کے لئے "امام" محض امام مسجد ہوتا ہے شریعت اسلامی کے مطابق نماز باجماعت کی امامت کرنے والے شخص کے لئے کچھ دینی خصوصیات کا حامل ہونا ضروری ہے۔ حجۃ اللہ البالغہ میں حضرت شاہ ولی اللہؒ اور مولانا اشرف علی تھانویؒ کی تصنیف بہشتی زیور (حصہ دوم) میں خصوصیات اس طرح لکھی ہیں۔

"مقتدیوں کو چاہیئے کہ تمام حاضرین میں جو امامت کے لائق ہو، جس میں اچھے اوصاف زیادہ ہوں اس کو امام بنا دیں۔ سب سے زیادہ استحقاق امامت اُس شخص کو ہے جو نماز کے مسائل خوب جانتا ہو بشرطیکہ ظاہراً اس میں فسق وغیرہ کی بات نہ ہو اور جس قدر قرآن مسنون ہے اسے یاد ہو۔ اور قرآن صحیح اور اچھا پڑھتا ہو۔ پھر وہ شخص جو قرآن مجید خوش الحانی سے پڑھتا ہو یعنی قرآن کے قواعد کے مطابق پھر وہ شخص سب سے زیادہ پرہیزگار ہو۔ پھر وہ شخص جو سب سے زیادہ عمر رکھتا ہو پھر وہ شخص جو سب سے زیادہ خلیق ہو پھر وہ شخص جو سب سے زیادہ خوبصورت ہو پھر وہ شخص جو سب سے زیادہ شریف ہو پھر وہ شخص جس کی آواز سب میں عمدہ ہو... اور وہ شخص جس میں دو یا دو سے زیادہ وصف پائے جائیں وہ زیادہ مستحق ہے بہ نسبت اس کے جس میں ایک ہی وصف پایا جاتا ہو... بے رضامندی قوم، امامت کرنا مکروہ تحریمی ہے..."

ماسٹر صاحب نے کہا۔ "یہ ہیں وہ خصوصیات جن کا امام کی شخصیت میں ہونا ضروری ہے اور قوم کی رضامندی نہ ہونے سے ایسے شخص کا امام ہونا حرام ہے"

پھر ماسٹر صاحب نے وضاحت کرتے ہوئے کہا۔ مسجد کی امامت کسی خاندان میں نسلاً بعد نسلاً قابل انتقال نہیں ہوتی یہ ضروری نہیں کہ کسی امام کا لڑکا بھی امام بنایا جائے مسجد کی امامت کے منصب کو ہندو مٹھ کے مہنت یا سٹہ آڈیشن یا کسی حمام کے ٹھیکہ اجارہ سے بالکل بھی مماثلت نہیں ہے..."

ہم میں سے ایک شاگرد عزیز مسلم موہن داس بھی تھے یہ پڑھے پڑھا کو قسم کے طالب علم تھے، اخبار بینی بھی خوب کرتے تھے ان کی معلومات عامہ ہم سبھی شاگردوں سے کہیں زیادہ تھی اور اس کا یہ اظہار بھی کرتے تھے۔ موہن داس چہرے کے خط و خال میں بقراطیت پیدا کرتے ہوئے پوچھا۔ "ماسٹر جی! یہ دہلی کی جامع مسجد کے شاہی امام اس خاندان میں تو امامت شاہجہاں کے زمانہ سے چلی آتی ہے.....؟"

ماسٹر صاحب نے بڑی شفقت اور محبت سے بس کو بیٹھنے کا اشارہ کیا۔ پھر بولنا شروع کیا ہوئے "اسلام اور شاہیت یا شہنشاہیت یا ملوکیت۔۔۔ دونوں الگ الگ ہیں اور ایک دوسرے کے متضاد۔ اسلام کے بنیادی اصولوں میں "شاہیت" نام کی کوئی چیز نہیں۔ اسلام تو سیاسی اور معاشرتی جمہوریت و مساوات کا مذہب ہے۔ اور "شاہی امام" جیسا کوئی منصب کسی بھی مسلک میں نہیں ہے۔

خلافت راشدہ (۶۳۲ء تا ۶۶۱ء) انسانی تاریخ میں حکمرانی کا بہترین باب ہے۔ بنی امیہ نے اسلام کے شفاف اصولوں میں شاہیت اور ملوکیت کا میل کیا (۶۶۱ء تا ۷۵۰ء) عباسی حکومت (۷۵۰ء تا ۱۲۵۸ء) اسپین کی اموی خلافت (۷۵۶ء تا ۱۰۳۱ء) افریقہ کی فاطمی خلافت (۹۰۹ء تا ۱۱۷۱ء) سلاطین روم (۱۰۷۷ء تا ۱۳۰۰ء) ساسانی سلطنت (۸۷۴ء تا ۹۹۹ء) غزنوی سلطنت (۹۶۲ء تا ۱۱۸۶ء) اور خلافت عثمانیہ ترکی (۱۲۹۹ء تا ۱۹۲۴ء) ایران کی شیعہ شہنشاہیت غرض یہ کہ مسلمانوں نے کرۂ ارض کے ایک بہت بڑے حصہ پر اور ایک بڑے زمانہ تک حکومت کی، لیکن کسی بھی جگہ "شاہی امام" کا وجود نہیں ملتا۔

اور ہندوستان میں محمد بن قاسم کی آمد (۷۱۲ء) کے بعد سندھ میں لگ بھگ تین سو برس عرب حکومتیں قائم رہیں۔ یہ خالص عرب حکمراں تھے لیکن تاریخ ہمیں بتاتی ہے کہ ان کی مساجد میں شرعی امام ہوتے تھے "شاہی امام" نہیں۔

دہلی کے غلام سلطانوں کے دربار میں (۱۲۰۶ء تا ۱۲۹۰ء) ترکی اور نو مسلم امرا کے ساتھ شیخ الاسلام کی سربراہی میں علماء کے طبقہ کی سیاسی سرگرمیاں عصری لٹریچر میں ملی ہیں۔ خلجی امپیریلزم کے دور (۱۲۹۰ء تا ۱۳۲۰ء) میں صوفی بزرگ سید محمد حضرت نظام الدین اولیاؒ اور دہلی کے قاضی کی سرگرمیاں اور سلطان وقت سے ان کی کشمکش کے واقعات وضاحت سے تاریخی تذکروں میں ملتے ہیں۔ قرون ترک تغلق سلاطین (۱۳۲۰ء تا ۱۴۱۴ء) اور لودھی پٹھان سلطانوں کی حکومت (۱۴۵۱ء تا ۱۵۲۶ء) اور سوری خاندان کے بادشاہ (۱۵۴۰ء تا ۱۵۵۵ء) کے دربار میں علماء شیخ الاسلام کے کارنامے اور سرگرمیاں ملتی ہیں لیکن اس پورے دَور میں "شاہی امامت" کا منصب یا عہدہ نہیں ملتا۔

مغل سلطنت ۱۵۲۶ء میں قائم ہوئی بابر اور ہمایوں کو حکمرانی کا موقعہ کم ہی ملا۔ ہمایوں کے آخری اور اکبر کے اولین دور میں شیخ الاسلام شیخ عبدالنبی کی موجودگی اور ان کے ہمہ گیر اثرات پاتے ہیں۔ ان کے بعد شیخ مبارک اور ان کے صاحبزادگان ابوالفضل و فیضی کے سیاسی اثرات وبدبہ کی چھاپ اس پورے دَور میں ملتی ہے۔ لیکن ملا عبدالقادر بدایونی کی یادداشتوں اور ابوالفضل کے اکبر نامہ اور آئین اکبری میں یا کسی دوسری عصری تصنیف میں "شاہی امام" نام کی جنس ناپید ہے۔ جہانگیر نے پہلے حضرت مجدد الف ثانیؒ کو زندان گوالیار میں قید کیا پھر ان کا مُرید ہو گیا حضرت مجدد کے ملفوظات اور خطوط تزک جہانگیری یا دوسرے تاریخی ماخذوں میں مذہبی، سیاسی، معاشرتی حالات کی عکاسی ملتی ہے لیکن "شاہی امام" یہاں بھی مفقود ہے۔۔۔۔"

یہاں ماسٹر صاحب تھوڑی دیر کے لئے رُکے، حقے کے دو چار کش لے کر پھر فرمانے لگے "شاہجہاں کے دور میں دہلی کی جامع مسجد کی تعمیر (۱۶۵۰ء تا ۱۶۵۶ء) کی تفصیلات عبدالحمید لاہوری اور سبحان رائے نے بادشاہ ناموں میں لکھی ہیں امام جامع مسجد مولوی سید عبدالغفور شاہ صاحب مرحوم کے متعلق ان عصری ماخذوں میں چند سطریں لکھی ہیں کہ "مولوی صاحب کے تقویٰ و طہارت بزرگی اور قراءت قرآن کی عمدگی سے متاثر ہو کر شہنشاہ شاہجہاں نے وزیر اعظم سعد اللہ کے مشورے سے ان کو جامع مسجد میں امامت کے منصب پر فائز کیا" یہاں اس ابتدائی تقرر کے موقع پر "شاہی امامت" کا لفظ استعمال نہیں کیا گیا۔

اورنگ زیب عالمگیر صاحب علم و دانش بادشاہ تھا۔ اپنی مذہبیت میں وہ تعصب کی حد تک بنیاد پرست مسلم حکمراں تھا۔ اس نے دینی تعلیم کے نظام درس نظامی (جو اب بھی عربی مدارس میں پڑھایا جاتا ہے) اور فتاویٰ عالمگیری (کوڈ آف اسلامک لا) کی تدوین براہ راست اپنی نگرانی میں کرائی فتاویٰ عالمگیری میں ایک باب مساجد کی امامت سے متعلق ہے۔ لیکن شاہی امام کے موضوع پر یہ بھی خاموش ہے۔

اورنگ زیب کی وفات ۱۷۰۷ء کے بعد ۱۸۵۷ء تک پوری تاریخ مغلیہ حکومت کے زوال کی کہانی ہے۔ اس دَور میں ایرانی، تورانی، راجپوت، پٹھان اور مرہٹہ سرداروں کی سیاسی سرگرمیاں اور ریشہ دوانیاں مغل دربار میں پائی جاتی ہیں لیکن دہلی کی جامع مسجد کے امام کی کوئی سرگرمی اس دَور میں بھی نہیں ملتی۔ "مغل ایڈمنسٹریشن" کا موضوع تاریخ دانوں کے لئے ریسرچ کا موضوع رہا ہے اشتیاق حسین قریشی، ایس۔ آر۔ شرما، سرکار اور مجمدار کی تحقیقات اس موضوع پر حرف آخر ہیں۔ ان کالرز نے مغل ایڈمنسٹریشن میں مذہبی اداروں کے ایڈمنسٹریشن پر الگ عنوان قائم کر کے تاریخی ماخذوں کو کھنگال ڈالا ہے لیکن ان کو ریسرچ کی باریک ترین چھلنی میں بھی "شاہی امامت" نہیں مل سکی"

ماسٹر صاحب نے آنکھیں بند کر لیں شاید وہ تھکن بھی دور کر رہے تھے اور کچھ سوچ بھی رہے تھے کچھ دیر بعد فرمایا۔

"ایسٹ انڈیا کمپنی کی سرگرمیاں شروع میں تو صرف تجارت کے میدان میں محدود تھیں لیکن مرکزی حکومت کی کمزوری کے ساتھ ساتھ انگریزوں نے سیاسی میدان میں پر پھیلانے شروع کر دیئے۔ پلاسی کی جنگ (۲۳ جون ۱۷۵۷ء) اور اس کے بعد بنگال بہار اڑیسہ میں دیوانی کے حقوق (۱۷۶۵ء) حاصل کرنے کے بعد انگریزی سیادت اور قومی و سیاسی اثر و نفوذ میں تیزی سے اضافہ ہوا۔ مذہبی میدان میں پادریوں کی بھاری تعداد کمپنی کی براہ راست سرپرستی میں عیسائیت کی تبلیغ میں شدت سے سرگرم ہو گئی۔

دہلی میں پادری ڈاکٹر کاٹن، پادری جو بیکا کیمرج مشن کے پادری اے۔ آر۔ ہبرڈ اور پادری جیننگ صاحب چاندنی چوک اور جامع مسجد کے سامنے عیسائی لٹریچر کی تقسیم اور تبلیغی تقاریر کرتے تھے۔ یہ مذہب اسلام پر براہ راست رکیک حملے کرتے تھے۔ (مولوی بشیر احمد واقعات دارالحکومت میں لکھتے ہیں کہ غدر ۱۸۵۷ء میں جو ان میں مسلمان مجاہدین نے ان پادریوں کو قتل کر دیا) سر سید مرحوم نے اسباب بغاوت ہند میں لکھا ہے کہ عیسائی پادریوں کی سرگرمیوں سے مسلمانوں میں بے چینی و بدگمانی اور سرکار کمپنی کے خلاف غم و غصہ کے جذبات پیدا ہو گئے

برٹھ رہے تھے۔ ان عیسائی پادریوں سے اس وقت کے علماء مناظرے کیا کرتے تھے۔ لیکن "شاہی امام" کی سرگرمی ہمیں اس بحث میں نہیں ملتی۔"

"۔ مئی ۱۸۵۷ء کو جنگ آزادی کی ابتدا ہوئی۔ ساٹھ سو مسلم علماء نے انگریزوں کے خلاف جہاد کا فتویٰ دیا تھا غالب کے خطوط میں ہم اس پرآشوب وقت کا پورا حال پاتے ہیں۔ یہ سلسلہ جد وجہد ۲۱ ستمبر ۱۸۵۷ء کو سقوط دہلی پر ختم ہوئی ہے۔ دہلی میں ۱۸۵۸ء کا انقلاذکر کر دیا جاتا ہے بغاوت کے جرم میں مسلمانوں پر مقدمات چلائے جاتے ہیں جہاد کا فتویٰ استغاثہ کی بنیاد ہے لیکن اس پوری سرگرمی میں امام جامع مسجد دہلی کا کوئی کردار ہم نہیں پاتے۔ فتویٰ جہاد کے فتوے پر ان کے دستخط نہیں ملتے ہیں۔"

ماسٹر چراغ دین جذباتی ہو گئے۔ ان کی آواز بھرا گئی۔ تھوڑی دیر خلا میں گھورتے رہے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ وہ اپنے ذہن میں کچھ خیالات جمع کر رہے تھے پھر دھیمی آواز میں کہنا شروع کیا۔

مغل اینڈ منسٹریشن میں مذہبی امور مساجد اور مدارس کے انتظام کے لئے ایک الگ محکمہ تھا یہ صدر خانی کہلاتا تھا۔ اس محکمہ کا سربراہ شیخ الاسلام ہوتا تھا اور یہ براہ راست وزیر اعظم کے چارج میں رہتا تھا۔ مسجد کے اماموں کی تنخواہ اسی محکمہ سے ملتی تھی امام جامع مسجد دہلی بھی حکومت کے تنخواہ دار ملازم ہوتے تھے۔

جامع مسجد دہلی کا کل خرچ لال قلعہ کے ساتھ تھا اور یہ مسجد ایک طرح سے لال قلعہ کی ذیلی عمارت (Annexe) تھی یہی وجہ ہے کہ اس کے لئے کوئی جائیداد وقف نہیں کی گئی۔ یہ صورت حال ستمبر ۱۸۵۷ء تک رہی اور انگریزوں کے دہلی میں فاتحانہ داخلہ پر دیگر شاہی املاک کے ساتھ جامع مسجد کو ضبط کر کے منتقل کر دیا گیا۔"

عصری ریکارڈ کے مطالعہ سے پتہ چلتا ہے کہ کٹر مذہبی عیسائی چاہتے تھے کہ جامع مسجد دہلی کو گرجا میں تبدیل کر دیا جائے۔ لیکن لندن میں اس خیال کو سرسری طور پر ہی رد کر دیا گیا۔ واقعات دارالحکومت دہلی مصنفہ بشیر احمد صفحہ ۔۔ پر لکھا ہے کہ "کچھ دنوں یہ بات معرض بحث رہی کہ کیوں نہ سارے شہر کو یا کم از کم جامع مسجد اور لال قلعہ کو مسمار کر کے زمین کے برابر کر دیا جائے۔" بالآخر دیگر منقولہ شاہی جائیداد اور املاک کے ساتھ جامع مسجد کو نیلام کر دینے کا فیصلہ کیا گیا۔ دہلی اور نواحات کے مسلمان امراء اور زمینداروں میں نیلام میں بولی دینے کی مالی سکت نہیں تھی۔ قابل قدر بات یہ ہے کہ دہلی ہندو روٴسا اور مہاجنوں نے مسجد کی نیلامی میں کوئی حصہ نہیں لیا۔ میر منھو قریش برادری کے رئیس الٰہی بخش مرحوم اور ایک عیسائی ڈبلیو ڈبلیو والکر نے ایک دوسرے سے بڑھ کر بولی دی اور آخر میں الٰہی بخش قریشی میرٹھی نے ایک کروڑ پانچ لاکھ روپئے میں خرید لی۔ لیکن انگریز حکام نے اس میں نماز با جماعت ادا کرنے کی اجازت نہیں دی۔

"آثار دہلی" مصنفہ مولوی سید عبدالعزیز صاحب مطبع حقانی دہلی ۱۹۱۱ء اڈیشن صفحہ ۔۔ پر لکھا ہے۔:

یہ مسجد غدر ۱۸۵۷ء کی وجہ سے ضبط ہو گئی تھی مسلمانوں نے اپنی گورنمنٹ کے حضور میں ادب کے ساتھ عرض معروض کی۔ اس پر سرکار دولت مدار نے اپنی وفادار رعایا کی خاطر مد نظر رکھی اور مفصلہ ذیل معززین کے اس اقراری دستخط پر کہ ہرگز کوئی دنگا فساد وغیرہ بدعنوانیاں واقع نہ ہوں گی، مسجد کو نماز با جماعت کے لئے واگذاشت کر دیا۔ معززین مقران دستخط کنندگان یہ ہیں۔

الٰہی بخش، محمد صدر الدین، محمد ابراہیم محمد حسین، محبوب بخش، حافظ سید محمد امام بقلم تراب علی، تراب علی، یہی مصنف آگے چل کر لکھتا ہے کہ "مسجد کے تینوں دروازوں پر مسلمانوں کے لئے من جانب ڈپٹی کمشنر دہلی ہدایات آویزاں ہیں۔"

یہاں ماسٹر چراغ دین صاحب نے زور دے کر کہا۔

مئی ۱۸۵۷ء سے شہر دہلی میں حالت جنگ تھی "شاہی امام" صاحب اس پورے عرصہ میں اپنے مکان واقع امام کی گلی، جو جامع مسجد کے جنوب مغرب سمت میں ہے، میں گوشۂ عافیت میں معتکف رہے۔

ماسٹر صاحب نے اس پس منظر کو بیان کرنے کے بعد ایک قانون داں کی طرح بتایا کہ "اس طرح یہ مسجد شاہی املاک (گورنمنٹ پراپرٹی) کے زمرہ سے نکل کر پبلک وقف علی الخیر کی حیثیت میں آگئی۔"

سلسلہ کلام جاری رکھتے ہوئے ماسٹر صاحب نے بتایا۔

جامع مسجد کے انتظام و انصرام کے لئے دہلی کے شہریوں پر مشتمل ایک منتظمہ کمیٹی بنا دی گئی تھی۔ آثار دہلی کا مصنف ص ۔۔ پر لکھتا ہے کہ ۱۹۱۱ء میں کمیٹی کے ارکان حسب ذیل تھے۔

(۱) مرزا محمد کیوان گورگانی (۲) حاجی سید احمد صاحب امام جامع مسجد دہلی (۳) حاذق الملک حکیم محمد اجمل صاحب (۴) خان بہادر غلام محمد حسن خاں صاحب میونسپل کمشنر و سب رجسٹرار دہلی (۵) مولوی سید محمد عبدالاحد صاحب مالک مطبع مجتبائی و میونسپل کمشنر دہلی (۶) مولوی سید احمد حسن صاحب پینشنر تعلقدار حیدر آباد دکن ساکن دہلی (۷) حکیم احمد سعید خاں صاحب میونسپل کمشنر و وائس پریزیڈنٹ و آنریری مجسٹریٹ دہلی (۸) حاجی محمد اسحق صاحب سوداگر صدر بازار دہلی (۹) حاجی عبدالغنی صاحب میونسپل کمشنر و متولی عیدگاہ دہلی (۱۰) نواب فیض احمد خاں صاحب رئیس دہلی۔"

اس موقع پر ہم میں سے کسی نے کہا "ماسٹر صاحب! پھر ہم کیا نتیجہ نکالیں؟"

ماسٹر صاحب نے جواب دیا۔

ارے بچو! مجھے بات تو پوری کرنے دو توجہ طلب کئی باتیں ہیں۔

(الف) ممبر کمیٹی حاجی سید احمد صاحب امام جامع مسجد دہلی کو "شاہی امام" نہیں لکھا گیا۔ مطلب صاف ہے "شاہی امام" کے نام سے لوگ نابلد تھے۔

(ب) مسجد کھلوانے کی عرضداشت اور اقرار نامہ مچلکہ میں مقران میں امام جامع مسجد کا نام نہیں ہے۔ اس پورے عرصہ میں امام صاحب تو منظر پر ہی نہیں ہیں۔

(ج) مسجد کھلنے پر امام صاحب کو مسجد میں امامت کے لئے دوبارہ بلایا گیا اس لئے نہیں کہ وہ "شاہی امام" تھے۔ بلکہ اس لئے کہ امامت کے منصب کی تمام صفات شرعیہ ہونے کی وجہ سے ان کو امامت کا اہل سمجھا گیا۔"

ماسٹر صاحب یہاں آکر رک گئے۔ ایسا محسوس ہوا کہ وہ ہمارے چہرے کے تاثرات پڑھ رہے ہوں ہم سب خاموش تھے۔ لیکن ہمارے ساتھی موہن داس نے اپنی معلومات کا رعب دکھانے کے لئے فلاسفر جیسا چہرہ بنا کر پوچھا۔

"ماسٹر صاحب! بیسوی صدی کے شروع ہونے پر مسلمانوں میں سیاسی بیداری شروع ہو گئی تھی۔ اس

میدان میں جامع مسجد کے امام کا کیا رول رہا؟"

ماسٹر صاحب نے کچھ دیر کے لئے اپنی ہتھیلی سے سر کو سہارا دیا۔ خاموش رہے، اور پھر یوں گویا ہوئے۔

پہلے پہل تو مسلمانوں میں عرض داشتوں اور میمورنڈم پیش کرنے کی سیاست رہی تقسیم بنگال اور اس کی منسوخی سے مسلمانوں کو احساس ہوا کہ ان میں سیاسی حرکت آنی چاہیئے اس عرصہ میں بلقان کی جنگ شروع ہوگئی (۱۹۱۲ء-۱۹۱۱ء) خلافت عثمانیہ ترکی کے خلاف یورپ کی بڑی طاقتیں بلقان کی قومیتوں کی حمایت پر اکھڑی ہوئیں خلافت عثمانیہ کی حمایت میں ہندوستانی مسلمانوں میں ایک عام تحریک شروع ہوگئی۔ مولانا ابوالکلام آزاد کے الہلال کلکتہ، مولانا ظفر علی خاں کے اخبار زمیندار لاہور، اور مولانا محمد علی جوہر کے کامریڈ (انگریزی اخبار) اور ہمدرد اردو اخبار نے ہندوستانی مسلمانوں میں سیاسی شعور کی لہر پیدا کی جبکہ مسلم لیگ فدویان وفاداران سرکار برطانیہ کی جماعت رہی — اسی دوران مسلم یونیورسٹی کے قیام کے لئے فاؤنڈیشن کمیٹی کی تشکیل عمل میں آئی اور یہ تحریک مدراس سے پشاور تک پھیل گئی۔ پہلی جنگ (۱۹۱۳ء-۱۹۱۸ء) سے خلافت عثمانیہ کا وجود ہی خطرہ میں پڑ گیا ترکی سلطنت کی مدد کی تحریک نے مزید زور پکڑا ہندوستانی مسلمانوں نے چندہ کر کے کافی رقم اور ڈاکٹر ایم اے انصاری کی قیادت میں طبی مشن ترکی بھیج کر اپنے ملی فرض کی ادائیگی کی لیکن ان کسی بھی تحریک میں امام جامع مسجد دہلی کا نام کسی بھی زمرہ میں نہیں ملتا۔

ہندوستانی مسلمانوں کی سیاسی جدوجہد میں تحریک خلافت ایک سنگ میل کی حیثیت رکھتی ہے اس تحریک اور ترک موالات تحریک کے لئے ۵۰۰ مسلم علما نے فتویٰ دیا تھا خلافت کے جلسے جامع مسجد دہلی میں ہوئے ایک بار تو مہاتما گاندھی جی نے خلافت کے جلسہ میں جامع مسجد دہلی کے منبر پر بیٹھ کر تقریر کی اس تحریک کے دوران بھی امام جامع مسجد نے صرف نماز کی جماعت کی امامت سے ہی سروکار رکھا۔ رد قادیانیت کے لئے اور شدھی سنگٹھن کے خلاف مسلمانوں کی تحریک شمالی ہندوستان بھی اہم ہے۔ ان میں مسلمانوں نے سیاسی اور فرقہ وارانہ مسلک سے اوپر اٹھ کر حصہ لیا۔ امام جامع مسجد اس منظر پر بھی نظر نہیں آئے مسلم لیگ کی تحریک پاکستان، جمعیۃ العلماء ہند کی تحریک استخلاص وطن اور علامہ مشرقی کی نیم فوجی خاکسار تحریک ہندوستانی مسلمانوں کی تاریخ کے اہم صفحات ہیں لیکن ان میں بھی امام صاحب جامع مسجد کا کوئی حصہ نہیں۔ مسلمانوں کی تاریخ میں مسجد کانپور کی تحریک اور مسجد شہید گنج لاہور کا قضیہ (۱۹۳۴ء تا ۱۹۴۰ء) بھی اہم ہے۔ لیکن ان مساجد کی تحریکات میں بھی "شاہی امام" دہلی کا کوئی رول نہیں ہے۔

۱۵ اگست ۱۹۴۷ء اور اس کے بعد ۳۰ جنوری ۱۹۴۸ء (گاندھی جی کے قتل) کو امن وامان قائم ہونے تک اور اس کے بعد آنے والے کئی سالوں تک مسلمانوں پر ایک عام مایوسی طاری تھی اس نازک موقع پر مولانا حفظ الرحمن سیوہاروی، مولانا حبیب الرحمن لدھیانوی، مولانا احمد سعید صاحب، مولانا عبدالوحید صدیقی، میر مشتاق احمد، قاضی سجاد حسین صاحب، مفتی عتیق الرحمن صاحب، اور ایسے ہی دوسرے مسلم زعما نے اس مایوس کن اور تاریک دور میں مسلمانوں کے حوصلے بلند کئے۔ اور ان کو پاکستان جانے سے روکا لیکن امام جامع مسجد اس دور میں بھی اپنے مکان گوشہ عافیت میں متمکن رہے۔

یہاں پر بات ختم کر میں نے سوال کیا۔

"ماسٹر صاحب! امام صاحب مسجد کے تنخواہ دار ملازم رہے! کیسی کیا ہوئی؟"

ماسٹر چراغ دین نے مجھے بیٹھے کا اشارہ کیا اور اپنی بات جاری رکھی۔

"ٹھیک ہے۔ امام صاحب تنخواہ دار ملازم رہے منتظمہ کمیٹی مسجد کا انتظام کرتی رہی۔ حکیم اجمل خاں اپنی حیات تک کمیٹی کے صدر رہے، ان کے انتقال کے بعد صاحبزادہ حکیم جمیل خاں کمیٹی کے صدر ہوئے جو ۱۹۴۷ء میں پاکستان چلے گئے۔ ان کی جگہ مسٹر نورالدین بیرسٹر ایٹ لاء میئر دہلی کارپوریشن اسمبلی کے صدر ہوئے۔ جواہر کی آزادی کے بعد دہلی کو صوبہ کا درجہ دیا گیا چودھری برہم پرکاش کی منسٹری تھی اور شفیق الرحمن قدوائی وزیر تعلیم و مسلم اوقاف تھے۔ قانون بنوا کر مجلس اوقاف دہلی قائم کرائی۔ امام صاحب کی تنخواہ اس وقت ایک ہزار روپیہ ماہانہ ہوا کرتی تھی۔ انھوں نے مجلس اوقاف کو درخواست گزاری کہ

(۱) اس تنخواہ میں گزر بسر نہیں ہوتا۔ تنخواہ میں اضافہ کیا جائے۔

(۲) جامع مسجد کے اطراف وجوانب کے بازار نشینوں سے ان کو تہ بازاری وصول کرنے کے اختیارات دیئے جائیں۔

اس دوران ۱۹۵۴ء مرکزی وقف ایکٹ پاس کیا گیا۔ اس کے تحت دہلی مجلس اوقاف کی جگہ دہلی وقف بورڈ نے لی اور امام صاحب اس کے روبرو برابر تنخواہ میں اضافہ اور تہ بازاری کے استحکام کی درخواست کرتے رہے۔

بدقسمتی سے اپریل ۱۹۷۶ء کا وقت آیا وقف منسٹر جنرل شاہ نواز تھے دہلی وقف بورڈ کی میٹنگ ان کے گھر دریا گنج میں ہو رہی تھی شاہی امام عبداللہ بخاری صاحب نوجوانوں کو جوش دلا کر کہ اندرا سرکار جامع مسجد پر قبضہ کرنا چاہتی ہے، وقف بورڈ کی میٹنگ پر چڑھ دوڑے۔ گرماگرمی تشدد میں بدل گئی آٹھ نوجوان پولیس کی گولیوں کا نشانہ بن گئے اس دوران نسبندی کانڈ اور ترکمان گیٹ پولیس ایکشن ہوا۔ اور ایمرجنسی میں نوکر شاہی کی زیادتیوں سے عوام پریشان تھے ہندوستانی مسلمانوں میں عام ناراضگی اور بے چینی کانگریس کے خلاف تھی "شاہی امام" مسلمانوں کے ہیرو بن کر ملکی سیاست پر نمودار ہوئے "شاہی امامت" کا سورج طلوع ہو گیا۔

۱۹۷۷ء کے الکشن میں جنتا پارٹی کے لیڈروں۔ مرارجی ڈیسائی، بہوگنا وغیرہ — سے امام صاحب نے باہمی مفادات کے معاملات طے کئے پھر انھوں نے اپنا مفاد مسز اندرا گاندھی کے ساتھ دیکھا دسمبر ۱۹۷۹ء کے چناؤ میں ان سے قول و قرار کئے کرائے فرقہ وارانہ فسادات نے ان کی لیڈری کے پودے کی آبیاری کی یکم فروری ۱۹۸۶ء کو فیض آباد کے جج ضلع کے حکم سے بابری مسجد کا تالا کھولے جانے سے "شاہی امام" صاحب کی شخصیت میں زبردست نکھار آیا اور ان کی کشش میں اضافہ ہوا۔

وہ مسلم وسٹ جنگ کے واحد مینجنگ ڈائرکٹر بن کر سامنے آئے۔ ان کی لیڈرانہ شخصیت کی آزمائش میں

جانے ابتدائی طور پر قومی پریس اور ہندو دانشوروں نے زبردست حصہ لیا۔ اس دوران ہندو احیاء پرست تنظیموں نے نیم فوجی سنگٹھن بجرنگ دل، شو سینا بنائیں۔ شاہی امام بھلا موقع سے کب چوکنے والے تھے بابری مسجد رام جنم بھومی تنازعہ کے بادل امام صاحب کے لئے موسم بہار لائے۔ آدم سینا، محافظ دستہ اور اسی قسم کی تنظیمیں بنا کر انھوں نے کروڑوں روپیہ کا چندہ قوم سے بطور "خراج امامت" وصول کیا۔۔۔"

ماسٹر صاحب نے زور دے کر کہا۔ "بہرحال امام صاحب صرف وہی کام کرتے ہیں جس میں ان کا ذاتی نفع ہو۔ جامع مسجد دہلی تو ان کی ذاتی جاگیر بن گئی ہے حضرت شاہ ولی اللہ اور حضرت شاہ اسمٰعیل شہید کے مرتبہ خطبات جمعہ، اللہ تعالیٰ کی حمد و ثنا ئے رسولؐ درود و صلوٰۃ و سلام کے بجائے سیاسی مغلظات کی نشر و اشاعت جامع مسجد کے تاریخی منبر سے ہر جمعہ کا معمول بن گیا ہے۔

راجہ وی پی سنگھ نے ۸۹۔۱۹۹۰ء میں امام صاحب کی خدمت میں حاضری دے کر ان کے سیاسی قد میں زبردست اضافہ کیا۔ وزیر اعظم بن کر راجا ؤں کی روایت کے مطابق (اظہار تشکر کے لئے پچاس لاکھ روپیہ کا نذرانہ شاہی امام صاحب کی خدمت میں پیش کیا، یہ کہا گیا کہ یہ تو جامع مسجد کی مرمت کے لئے دیئے گئے ہیں۔ لیکن کسی کو مسجد میں کوئی کام ہوتا تو نظر نہیں آیا۔

ماسٹر جہیر الدین کے چہرے پر کرب و بے چینی کے آثار بڑھ رہے تھے لیکن کہے جا رہے تھے۔

"امام صاحب نے ۱۹۸۸ء میں وہ کیا جو کوئی نہیں کر سکتا۔ مسجد کو سیاہ پوش کر کے مقفل کر دیا۔ فسادات پر یہ انوکھا احتجاج کرتے ہوئے وہ بھول گئے کہ۔

"اور غور کرو! اس سے بڑھ کر ظلم کرنے والا انسان کون ہو سکتا ہے جو اللہ کی مسجد میں اس کے نام کی یاد کو روکے اور ان کی ویرانی کرے ان لوگوں کو تو بے ہیبت ہو کر کبھی ان میں قدم بھی نہ رکھنا چاہیئے تھا بلکہ مسجد میں اللہ کے خوف کے ساتھ باادب ہو کر جانا چاہیئے تھا ان لوگوں کو دنیا میں رسوائی ملے گی اور آخرت میں سزائے عظیم ملے گی۔

(ترجمہ البقر رکوع ۲۔ آیت ۱۱۴)

ماسٹر صاحب نے آیت اور اس کا ترجمہ کئی بار پڑھا پھر کہنے لگے۔ شاہی امام کے حمایتی لوگوں کے خوف سے اس زمانہ میں کوئی مسلمان مسجد میں جانے کی جرأت نہیں کر سکتا تھا۔ فسادات میں پی اے سی کے مظالم پر احتجاج کے لئے ایجی ٹیشن اور جیل یاترا کرنے کے بجائے انھوں نے خانۂ خدا کو سیاہ پوش اور اس میں عبادتِ خداوندی کر کے شاید اللہ تعالیٰ سے احتجاج کیا۔۔!!

ماسٹر صاحب نے گفتگو جاری رکھی اور کہنے لگے

"مسجد تو ان کی آمدنی کا ذریعہ ہے۔ مسجد میں داخلہ پر مختلف طرح کی فیس مقرر کر رکھی ہے۔ "نذرانہ" نہیں سود ہے پیران حرم کا کیمرہ اندر لے جانے کا فیس مینار پر چڑھنے کی فیس، اس امر کی فیس۔۔۔ اور کسمپرسی کی حالت میں مرثیہ خواں ہے۔ مسجد کے سامنے کا وسیع میدان جو کبھی اس عظیم الشان عمارت کا (Piazza) پلازہ تھا جو مرکز عیسائیت ویٹیکن کے بڑے چرچ سے زیادہ شاندار منظر پیش کرتا تھا۔ اب اس "شاہی امام" کی ذاتی جیب بھرنے کے لئے مینا بازار بن گیا ہے۔ مسجد کی یہ عظیم عمارت جس کے متعلق مشہور عالمی ماہر فن تعمیرات کنگھم نے لکھا ہے کہ۔ لطافت، نزاکت خوبی و خوش نمائی اس کی بیان سے باہر ہے۔ ایسی خوش قطع اور خوش نما مسجد روئے زمین پر نہیں، ہندوستانی تہذیب و کلچر کا یہ مایہ ناز اور گراں قدر ورثہ ایک خود غرض اور بد ذوق شخص کے قبضہ اور تحویل میں حالتِ یتیمی میں مسلمان قوم کے لئے باعث شرم ساری ہے۔"

موہن داس نے دبی ہوئی آواز میں کہا۔

"ماسٹر صاحب! کچھ بھی ہو شاہی امام مسلم عوام کے لیڈر ہیں اور ابھی ان کا وزن ہے۔"

ماسٹر جہیر الدین اس ریمارک پر چونک گئے ان کا چہرہ سرخ ہو گیا۔ لیکن انھوں نے جذبات پر قابو کر کے جواب دیا۔

موہن! جانتے ہو لیڈر یا رہنما کون ہوتا ہے؟ قوم و ملک کا رہنما وہی ہوتا ہے اور رہنمائی کا حق اسی کو حاصل ہے جو بے غرض ہو، تاریخ پر اس کی نظر ہو اور جو ذاتی جذبات اور شخصی مفادات سے بالاتر ہو کر قوم و ملک کے مستقبل کی سوچے اور ایک منزل متعین کر کے قوم و ملک کو مقصد و منزل کی طرف لے کر چلے کچھ لوگ "رہنما صورت" ہوتے ہیں۔ یہ انگریزی "ڈیماگاگ" کہلاتے ہیں یعنی وہ شخص جو اپنے شخصی مفادات کے لئے عوام کے جذبات کو ابھارے اور ذاتی فائدے حاصل کرے"

ماسٹر صاحب نے ایک ٹھنڈی سانس لی اور کہا۔ "بھائی، میرے عزیز موہن! ہندوستان کے مسلمانوں کی بدقسمتی یہ ہے کہ ان کو کوئی رہنما نہیں ملا۔"

پھر ماسٹر صاحب کہنے لگے کہ "سر سید اور مولانا آزاد کو چھوڑ کر مسلمانوں کو جذباتی لیڈر ہی ملے۔۔۔ اور شاہی امام دان کی خدمات۔۔۔ توبہ توبہ۔ بقول مولانا آزاد مرحوم۔۔۔۔

"ہندوستانی مسلمانوں کی بدبختی یہ ہے کہ ہم میں جو گروہ آج رہنمائی کی موٹر پر سوار ہے اور جس نے لیڈری کا تخت خود ہی بچھایا ہے اور خود ہی اپنے ہاتھوں سے اپنی رسم تاج پوشی ادا کی ہے اس نے اپنی دنیاوی عزت و شوکت اور جاہ و نمائش کا جوا کھیلنے کے لئے اپنی ملت مظلومہ کو ایک بازیچہ بنا لیا ہے اور ان میں سے جو گشتا ہے، اسی گنبد کو ایک ٹھوکر لگا کر اپنی طاقت کی نمائش کرنا چاہتا ہے۔ مسلمان بیچارے تو اپنے لیڈروں کی پرستش کرنے کے لئے موجود ہیں۔۔"

(الہلال ۴ر اگست ۱۹۱۲ء صفحہ ۴)

اور یہاں تو معاملہ ہی مزید شدت پر ہے مسلمان قوم کی حالت تو یہ ہے جو مولانا آزاد نے لکھی لیکن "شاہی امام" کے سامنے نیشنل لیڈر دست بستہ حاضر ہیں۔ اس کو ان داتا نہیں "ووٹ داتا"۔ کچھ لیڈر قومی لیڈروں نے مسجد کی آمدنی، سبھی ذرائع اور صدمات سے ہے۔ لیکن کوئی پرسش کرنے والا نہیں۔ دہلی وقف بورڈ اور سینٹرل وقف کونسل کے ریکارڈ میں "شاہی امام" کی حیثیت ملازم کی ہے لیکن ان سے کوئی حساب لینے والا نہیں ہے، وہ کسی کے سامنے جوابدہ نہیں مسلمان اس امت میں ہونے کا دعوا کرتے ہیں جس کی ایک بڑھیا نے برسر مجلس عام فاروق اعظمؓ کا دامن پکڑ کر پوچھا تھا۔ اے مسلمانوں کے امام! بتا یہ چادر تیرے پاس کہاں سے آئی؟۔۔ اور اس بیسویں صدی کے امام سے کوئی مائی کا لال ہے جو پرسش کر سکے۔؟

"شاہی امام" میں میکیاولی کی سبھی خصوصیات ہیں یہی وجہ ہے کہ وہ آج ہندوستان کی سیاست

ہیں یہ سب Brokers of Power & Influence ہیں جو مسلمان ووٹ کو اپنے ’’احکامات‘‘ سے جس پارٹی کو چاہتے ہیں دیدیتے ہیں۔ان کے لئے کوئی اصول نہیں جس کی پابندی ضروری ہو کوئی عوامی اخلاق morality نہیں جس پر عمل کرنا ضروری ہو۔ان کو کوئی معاشرتی سماجی شعور واحساس نہیں مسلم عوام کی پسماندگی ،غربت ،نکبت اور بے چارگی کا ان کے سامنے کوئی اصلاحی و فلاحی و قومی مقصد نہیں۔سوائے اپنے نفعی مفادات کو پورا کرنے کے امامت اور سیاست دو الگ الگ ،ایک دوسرے سے متضاد ہیں۔امام کبھی بھی سیاست کے میدان میں قدم نہیں رکھے گا۔کیونکہ بقول ڈاکٹر سموئیل جانسن ’’سیاست بے اصولی پاجیوں کی آخری پناہ گاہ ہے‘‘

اور کچھ دیر خاموش رہ کر ماسٹر صاحب نے کہا ’’میرا حقہ بھر کر آپ سب جائیں اب آپ لوگوں کی چھٹی‘‘۔

ماہیا

دیپک قمر



گاگر میں بھرا پانی
پیاسوں کی خدا اس نے
یہ عمر نہیں آنی

جیون جھونکا بندھن ہو
خواہش ہے مرے دل میں
جیسے کوئی دلہن ہو

پانی ہے نہ پنگھٹ ہے
خالی ہے مرے دل میں
یادوں کی ہی تلچھٹ ہے

کیا کہنا ہے گانی کا
انگلی میں مگر اس کے
چھلا ہے نشانی کا

کلیاں ہیں گلابوں کی
آتی ہیں مگر اُن سے
خوشبوئیں کتابوں کی

حاجت نہیں دولت کی
کافی ہے ہمیں یارو
اک بات محبت کی

پیڑوں پہ چڑے رہتے
بن جاتے اگر پنچھی
کیوں ایسے پڑے رہتے

کیا راکھ بھری سر میں
پائل تھی مہاور بھی
دُلہن نہ تھی گھر میں

خط ہم کو نہ لکھے گا
کاگا کی زبانی ہی
پیغام وہ بھیجے گا

گھر گھر میں صدا دینا
ماریں جو نہیں پتھر
تم اُن کو دُعا دینا

کھیتوں میں کھلی سرسوں
پردیس میں ہی بیٹھے
دیکھے بنا گھر برسوں

ہیں پیار کے دن راتیں
ہر بار مزا دُونا
رہ رہ کے وہی باتیں

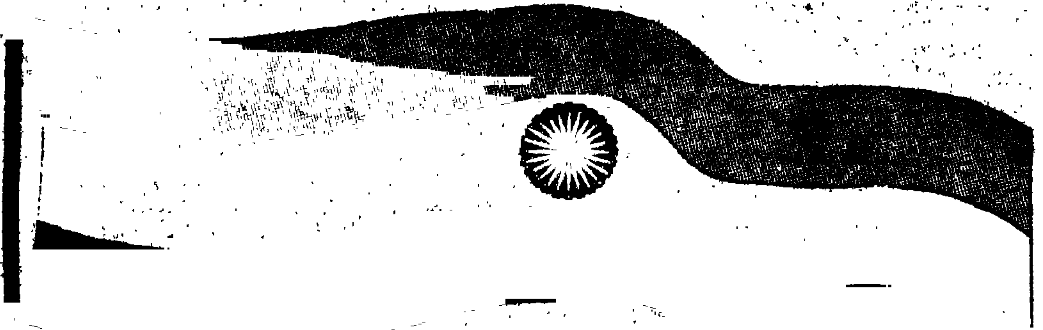
’’کھلتے کھلارے‘‘ کا ایک ورق

دہلی

سیکولر ہندوستان کی قابل فخر راجدھانی ہے

یہاں مختلف فرقوں، نظریوں اور مذاہب کے لوگ مل کر پُرامن طریقے سے رہتے آئے ہیں

آئیے اس روایت کو برقرار رکھیں





"اِسے سینے سے لگائے رکھیں"

یہ جھنڈا نشانی ہے
ہماری آزادی کی
ہماری جنگ آزادی کی جدوجہد کے دوران شہید ہوئے
کروڑوں محب الوطنوں کی قربانیوں کی۔
آج ہم یاد کرتے ہیں
ان تمام لوگوں کو
جو سبھی مذاہب، ذاتوں، زبانوں
اور صوبوں سے تعلق رکھتے تھے۔
جن میں امیر بھی تھے اور غریب بھی،
مرد بھی تھے اور عورتیں بھی،
بوڑھے بھی تھے اور جوان بھی
اور جنہوں نے
قوم کی حفاظت اور خوشحالی کے لئے جدوجہد کی۔
یہ جھنڈا ہمیں دل و جان سے پیارا ہے
ہم اس کی عزت کرتے ہیں
یہ بھارت کی طاقت کی نشانی ہے
اور یہ ہم سب کو ایک لڑی میں پروتا ہے۔



اس جھنڈے کی عظمت کی حفاظت کریں

پوشاک

اقبال مجید

اور تب اینڈرسن کے اس عاقل بادشاہ نے اپنی رعایا کی فہم و فراست کو پرکھنے کے لئے یہ ترکیب کہ وہ اس پوشاک کو پہن کر ہاتھی پر بیٹھا۔ اراکین سلطنت اور امرا اور منصب داروں کو اپنے ساتھ لیا اور ایک عالیشان جلوس اپنی سواری کا شہر میں نکالا وہ دیکھنا چاہتا تھا کہ اس کی رعایا میں کتنے لوگ عقلمند ہیں، کتنے لوگ اس پوشاک کو دیکھ سکتے ہیں کہ جسے وہ زیب تن کئے ہوئے تھا کیوں کہ کپڑا بننے والوں نے یہی کہا تھا کہ جو کپڑا وہ بادشاہ کی پوشاک کے لئے بن رہے ہیں اس کپڑے کو صرف وہی لوگ دیکھ سکیں گے جو دانا اور عاقل ہیں، بے وقوفوں کو وہ کپڑا نظر نہیں آسکتا۔

کپڑا تیار ہوا، اس کی پوشاک سلی اور بادشاہ نے اسے پہنا تو قد آدم آئینے کے سامنے کھڑے ہو کر جب اس نے اپنا جائزہ لیا تو اسے یہ دیکھ کر بڑی حیرت ہوئی کہ وہ ننگا ہے۔ اس کے بدن پر کوئی پوشاک نہیں تھی۔ لیکن یہ بات اس کی سمجھ میں نہیں آئی کہ وہ کپڑا جس کی تعریف اس کے درباریوں، وزیروں، دوستوں عالموں اور خدمت گاروں نے کی ہے وہ پوشاک بادشاہ کو خود کیوں نظر نہیں آرہی ہے اور وہ ننگا ہے تو پورے دربار میں کہرام مچ جائے گا ہر درباری کو یقین ہو جائے گا کہ ہو نہ ہو ان کا بادشاہ ہی بیوقوف ہے کیوں کہ جو کپڑا ان سب کو دکھائی دیتا ہے وہ خود بادشاہ کو کیوں نہیں دکھائی دیتا۔

جینس کرسچن اینڈرسن کا بے چارہ بادشاہ بڑی مصیبت میں پڑ گیا۔ آئینہ کے سامنے اس نے اپنے کو ہر زاویے سے دیکھا لیکن اس کے بدن پر کچھ ہوتا تو نظر آتا۔ وہ تو مادر زاد ننگا تھا اور تب ہی بادشاہ اس پوشاک کو پہنے پہنے دربار میں آیا۔ لوگوں نے آفریں اور مرحبا کی صدائیں بلند کیں۔ بادشاہ کی پوشاک کی شان میں قصیدے پڑھے تب بادشاہ کو یقین ہو گیا کہ وہ ننگا نہیں ہے بلکہ دھیرے دھیرے اسے اپنی پوشاک کے خدوخال نظر آنے لگے۔ اس کا حسن ابھرنے لگا اور اس کی قدر و قیمت کے جوہر کھلنے لگے۔ اسے لگا کہ اس کے تار تار میں تجلیاں کوند رہی ہیں۔ موتیوں اور جواہرات میں گندھی اپنی قبا نظر آئی۔ اس کے ایک ایک بند اور تکمے میں لعل و زمرد کی لڑیاں نظر آئیں اور مادر زاد ننگے بادشاہ نے اپنی سواری شہر میں نکالی تاکہ وہ اس بیش بہا پوشاک کو اپنی رعایا کو بھی دکھا سکے اور اس سے داد و تحسین پاسکے اور اس کی فہم و فراست کا امتحان بھی لے سکے۔

بادشاہ اپنے شاندار ہاتھی پر ننگ دھڑنگ بیٹھا دور دور تک قطار میں کھڑی اپنی رعایا کے درمیان سے گزر رہا تھا۔ شہر میں اعلان ہو چکا تھا کہ آج بادشاہ ایسی پوشاک پہن کر درشن دے رہے ہیں جو صرف عقلمندوں کو ہی دکھائی دے سکتی ہے۔ لوگ دم بخود آنکھیں پھاڑے ننگے بادشاہ کو دیکھ رہے تھے۔ لیکن کسی کی مجال نہ ہوئی کہ بادشاہ کو ننگا کہہ سکتا۔ سب خاموش تھے کیوں کہ سب عقلمند تھے لیکن جب بادشاہ ایک بچے کے قریب سے گزرا جو اپنے والد کے کندھے پر

بجائے منظور کر لیا تھا تو بادشاہ کو بیچ کے [illegible] اٹھا۔ اور سب ہی تو ننگا ہے"

[illegible] بادشاہ سب کو جانتا ہے وہ سب [illegible] اور بہت ڈر گئی [illegible] کہ اینڈرسن کو یہ بات نہیں معلوم تھی اس لئے اس کو یہ بھی معلوم نہ ہو سکا کہ بادشاہ نے بچے کی وہ بات سن لی تھی ورنہ اینڈرسن یہ بات ضرور بتاتا اور یہ کہانی یہ کہہ کر ختم کرتا لیکن میں یہ جانتا ہوں کہ بادشاہ کے کان بہرے ہوتے ہیں اس لئے میں آپ کو بتاتا ہوں کہ بادشاہ نے بچے کے منہ سے نکلا ہوا جملہ سن لیا تھا اور وہ جملہ سن کر اس کا چہرہ لال ہو گیا تھا اور اس رات اس نے رنگ رلی سے بھی کوئی بات نہ کی تھی وہ سیدھا اپنی آرام گاہ میں چلا گیا تھا اور منادی کرا دی کہ کوئی اس سے ملنے کی کوشش نہ کرے وہ رات گئے اپنے کمرے میں ٹہلتا رہا۔ بار بار اس کے کانوں میں بچے کی وہ آواز آ رہی تھی "وہ تو ننگا ہے"

وہ اس آواز کی دہشت سے بہت دیر تک لرزتا رہا اور تھک کر نڈھال ہو گیا۔ اس نے خواب آور گولی کھائی اور اپنے بستر پر لیٹ گیا اور وہ سو نہ سکا تو اس نے کال بیل بجائی اور اپنے پرسنل سکریٹری کو طلب کیا۔ اسے حکم دیا کہ وہ اسی وقت کیبنٹ کو طلب کرے کہ وہ فوراً اپنی کابینہ سے مخاطب ہونا چاہتا ہے۔ حکم کی تعمیل کی گئی کابینہ کے ممبران آ گئے اور بادشاہ نے تقریر کی۔

کیونکہ اینڈرسن کو یہ بات نہیں معلوم تھی کہ بادشاہ رات کو دیر سے بھی کابینہ کا جلسہ منعقد کر سکتا ہے اسی لئے اس نے آپ کو یہ بات نہیں بتائی لیکن میں آپ کو بتاتا ہوں کہ کابینہ کا جلسہ ہوا اور بہت خوب طور سے ہوا۔ اس دن کے جلسے کے ایجنڈے میں صرف ایک ہی موضوع تھا یعنی ہمارے ملک کے بچے [illegible] ہیں۔ بادشاہ نے اس دن جو تقریر کی وہ بابر کی اس تقریر سے کم نہیں تھی جو اس نے پانی پت کی لڑائی سے پہلے کی تھی۔ بادشاہ کی اس دردناک تقریر پر سب رو پڑے اور دیکھتے ہی دیکھتے کیبنٹ ہال ماتم کدہ بن گیا لیکن ان ممبروں میں ایک بڑا عاقل اور دانشمند وزیر بھی تھا۔ اس نے بڑی دانشمندی سے معاملات کو کنٹرول میں کیا۔

کیونکہ اینڈرسن کو یہ بات نہیں معلوم تھی کہ یہاں کوئی عاقل وزیر بھی تھا اس لئے اس نے آپ کو یہ بات نہیں بتائی لیکن میں آپ کو بتاتا ہوں کہ اگر اس رات وہ وزیر باتدبیر بادشاہ کو دلاسہ نہ دیتا تو [illegible] مرنے بیٹھتے کے اور کوئی راستہ نہ نکلتا۔ تو بتایئے کہ اس وزیر نے بادشاہ سے کہا کہ بچوں کو عقل مند بنانے کا صرف ایک ہی راستہ ہے اور پھر اس نے بادشاہ کے کان میں ایسی تدبیر بتائی کہ بادشاہ اپنی مسند سے اچھل پڑا۔ اسی وقت اس فہم و فراست کے پتلے کو بادشاہ نے خلعتِ فاخرہ سے نوازا اور اسے دس ہزاری کے منصب پر فائز کیا۔

اس وزیر کی تدبیر کے مطابق دوسرے دن [illegible] گھڑسوار اپنے اپنے گلوں میں ڈھولک لٹکا کر محل سے نکلے اور بادشاہ کی بادشاہت میں گلی گلی پھیل گئے ان کا کام تھا کہ وہ ڈھنڈورا پیٹ پیٹ کر بادشاہ کی پوشاک کی خوبیوں کا بیان کریں، اس کی شان اور عظمت کے قصیدے پڑھیں، اس کے حسن اور معیار کی بلندی کو بیان کریں اور پھر اس دن سے اس بادشاہ کی بادشاہت میں ٹیلی ویژن، سینما، اخبار اور رسالوں میں بادشاہ کی اس عظیم پوشاک کے بکھان ہونے لگے کیونکہ اینڈرسن کو یہ بات نہیں معلوم تھی کہ اس بادشاہ کے پاس ریڈیو، ٹیلی ویژن اور سینما بھی تھا اس لئے اس نے آپ کو یہ بات نہیں بتائی تھی لیکن میں آپ کو بتاتا ہوں کہ بادشاہ کے پاس وہ سب کچھ تھا جو اس کی بات کو دوسروں تک پہنچا سکے۔ صرف یہی نہیں اس نے ایسے ڈاک ٹکٹ چھپوائے جن میں وہ اپنی پوشاک کو پہن کر کھڑا ہوا تھا اور جسے عقلمند ہی دیکھ سکتے تھے۔ اس نے گلی گلی، چھوٹا ہو یا بڑا، بسوں اور [illegible] کھیتوں اور کھلیانوں میں، بازاروں اور کھیل کے میدانوں میں، اسپتال اور اسکولوں میں دیو ہیکل پوسٹر لگوائے جن میں اس عظیم پوشاک کے ساتھ بادشاہ کی تصویر تھی جس کے نیچے لکھا تھا "عقلمند بچو دیکھو تمہارا بادشاہ کتنی خوبصورت پوشاک پہنے ہے"

نرسری سے لے کر یونیورسٹیوں تک کے نصاب کے ہر مضمون میں بادشاہ کی پوشاک کا ذکر تھا۔ اسکول میں گائی جانے والی پرارتھناؤں میں بادشاہ کی پوشاک کی دعا کی جگہ [illegible] تھیں۔ کتابوں اور نوٹ بکوں کی جلد پر اس پوشاک کی تصویر تھی۔ ایسے تمام صحافیوں کو ایک ہزاری کے منصب سے پنج ہزاری کے منصب پر لے آیا گیا تھا جنہوں نے اپنے اخباروں کے سب سے زیادہ صفحے [illegible] بادشاہ کی پوشاک کے اسپیشل کے لئے وقف کر دیئے تھے۔ ایسے تمام محققوں کو جاگیریں اور خلعت تقسیم کی گئی تھیں جنہوں نے بادشاہ کی پوشاک پر بچوں کے نقطۂ نظر سے تحقیق کی تھی اور ایسے تمام ادیبوں اور شاعروں کو راج کوی تسلیم کر لیا گیا تھا جنہوں نے خونِ جگر سے بادشاہ کی پوشاک میں رنگ بھرا تھا۔ بادشاہ نے ایسی تمام انجمنوں اور اداروں کی مالی امداد تسلیم کر لی تھی جنہوں نے اپنے منشور اور مقاصد میں بادشاہ کی پوشاک نوازی کو شامل کر رکھا تھا۔

جب بادشاہ کو یہ خبر ملی کہ اب بڑے شہروں میں ایسی اکیڈمی بھی قائم کر دی گئی ہیں جو مختلف زبانوں میں بادشاہ کی پوشاک کے تانوں بانوں کے ایک ایک دھاگے کو کھول کر رکھ دیں گی اور اس کے چھپے ہوئے حسن کو بچے بچے کے دماغ میں پیوست کر دیں گی تو وہ خوشی سے دیوانہ ہو گیا۔ اس نے اکیڈمی کے ناظموں کو مبارکباد کے تار بھیجے اور اپنی آٹوگراف کے ساتھ تصویریں بھی۔

اور پھر یوں ہوا کہ سگریٹ کی ڈبیوں پر، صابنوں کے لیبل پر، لفافوں اور پوسٹ کارڈوں پر، ٹیلی گرام اور منی آرڈر فارموں پر، پیپر ویٹ اور فاؤنٹن پینوں پر، کوٹ شیروانی اور سوئٹر کے بڑے بڑے بٹنوں پر، دودھ کے ڈبوں اور شیشیوں پر، وقت بتانے والی گھڑیوں پر، پاپڑ، گرم مسالوں اور دالوں کے پیکٹوں پر، کیش میمو اور رسیدوں پر، اسپتالوں کے آؤٹ ڈور نسخوں پر، بجلی کے بلوں پر، ریڈیو اسٹیشن اور سکوٹروں کے لائسنسوں پر، بینک کی پاس بکوں پر، ٹیلیفون ڈائرکٹریوں پر، ریلوے ٹائم ٹیبلوں پر، غرضیکہ بادشاہ کی پوشاک کا بلاک ہر جگہ نمایاں رنگوں میں چھپا ہوا دکھائی دینے لگا۔

کیونکہ اینڈرسن کو یہ معلوم نہیں تھا کہ بادشاہ اتنی تشہیر [illegible] پوشاک کی کیفیت چھپا رکھے [illegible] اس لئے اس نے آپ کو یہ نہیں بتایا لیکن آج [illegible] بادشاہ [illegible] سائنسدانوں اور فلسفیوں کو اس

بات کے لئے مقرر کیا کہ وہ شب و روز بھوپ پیٹروں اور ریسرچ سنٹروں میں اس کی پوشاک کی کنیہ آدھیڑتے رہیں۔ اس نے ایسی فلموں کے ڈائرکٹروں پروڈیوسروں اور ایکٹروں کو انعامات دیئے جو اس کی پوشاک کے تمام زاویوں کو پیش کر کے بچوں کے ذہنوں کی تقویت کرتے تھے۔ اس نے ایسے تمام استادوں کو خصوصی تحفے اور نقد رقمیں عطا کیں جو تختہ سیاہ پر اس کی پوشاک کا خاکہ کھینچنے میں بہا اسلوب حاصل کر چکے تھے۔ وہ ہر سال ایسے تمام فوجی افسروں اور پولیس کے سپاہیوں کی بیواؤں کو سونے اور چاندی کے میڈل بھی تقسیم کرتا رہا جو اس کی پوشاک کے ناموس کے تحفظ میں اپنی جانیں دے چکے تھے۔

اور پھر یوں ہوا کہ ایسا کچھ ہوتے ہوتے برسوں گزر گئے اور کیونکہ تب اینڈرسن کو مرے ہوئے بہت ہو چکے تھے اس لئے وہ یہ بتانے سے قاصر رہا کہ اس کہانی کا انجام کیا ہوا لیکن میں آپ کو اس کہانی کے آگے کی کہانی سناتا ہوں ہوا یہ کہ کئی برس بعد جب بادشاہ کو یہ یقین ہو گیا کہ اب اس کے ملک کے بچے عقلمند ہو چکے ہوں گے تو اس نے ان کے امتحان کی تیاری شروع کر دی ایک شاندار جلوس پھر نکالا گیا ہاتھی گھوڑے فوج اور بینڈ باجے کے ساتھ بادشاہ کی سواری پھر نکلی۔ اس روز بادشاہ نے اپنے جسم پر وہی لباس زیب تن کیا تھا اور وہ ایک اونچے سے ہاتھی پر سوار تھا۔ چھوٹے چھوٹے لاتعداد بچے سڑک کے دونوں طرف اس کے استقبال کے لئے ہاتھوں میں جھنڈے لئے کھڑے تھے۔ ان چھوٹے چھوٹے جھنڈوں پر بادشاہ کی پوشاک کی تصویر تھی بادشاہ بہت خوش ہوا لیکن اس کی آنکھیں بے قراری کے ساتھ اس بچے میں اس لڑکے کو تلاش کر رہی تھیں جو کئی برس پہلے اپنے دادا کے کندھے پر سوار ہو کر آیا تھا۔ بادشاہ کی یادداشت میں اس بچے کی ایک ہلکی سی تصویر باقی تھی۔ جلوس دھیرے دھیرے آگے بڑھ رہا تھا۔ سب اس کی پوشاک کی شان میں قصیدے پڑھ رہے تھے۔ پورے شہر کا گشت لینے کے بعد بھی بادشاہ کو وہ بچہ نہیں دکھائی دیا۔ ہر موڑ پر بچے تھے لیکن جس بچے کو اس کی آنکھیں تلاش کر رہی تھیں

وہ ان میں نہیں تھا۔ بادشاہ کو یقین تھا کہ اتنا عرصہ گزر جانے کے بعد بھی وہ بچے کو پہچان لے گا۔ اس کی آنکھوں کی چمک سے پہچان لے گا جو سب سے مختلف تھی۔ بادشاہ ایک ایک بچے کی آنکھوں میں جھانک رہا تھا۔ بے چین ہو کر ہر بچے کی نظروں میں ٹٹول رہا تھا لیکن وہ بچہ اسے کہیں نہیں ملا۔ جلوس شام ہوتے محل واپس آگیا۔ بادشاہ بھاری دل کے ساتھ اپنی آرام گاہ میں داخل ہوا۔ وہ رات رانی سے بھی نہیں ملا۔ اس نے منادی کرا دی کہ کوئی اس سے ملنے کی کوشش نہ کرے۔ تھکے ہارے جسم کے ساتھ وہ بستر پر لیٹ گیا۔ اس نے نیند کی گولی کھا کر سو جانا چاہا لیکن اسے نیند نہیں آئی۔ کسی بچے کی آنکھیں جیسے بار بار اس کی آنکھوں میں جھانک رہی تھیں اس کی آنکھیں تپ رہی تھیں۔ جی چاہ رہا تھا کہ وہ چیخ چیخ کر رو دے۔ اس کا بدن پھنکنے لگا تھا۔ اس نے کال بیل بجائی اور بے ہوش ہو گیا۔

بادشاہ کے پرائیوٹ سکریٹری نے جب اسے ایسی حالت میں دیکھا تو وہ دوڑ کر شاہی طبیب کو بلا لایا طبیب نے بادشاہ کو غور سے دیکھا۔ بادشاہ کے ہونٹ ہل رہے تھے وہ دھیرے دھیرے کچھ کہہ رہا تھا۔

"وہ بچہ کہاں ہے۔"

طبیب گرگ جہاندیدہ تھا۔ اس نے دیگر طبیبوں سے مشورہ کیا تو طے پایا کہ سارے طبیب اس بچے کی تلاش میں نکل پڑیں ورنہ بادشاہ مر جائے گا۔ سلطنت بہت بڑی تھی لیکن طبیبوں کا خیال تھا کہ شاید کسی کونے میں ایک بھی بچہ ایسا مل جائے جو بادشاہ کو اس موذی مرض سے نجات دلا سکے۔ طبیب ہزاروں بچوں سے ملے ان کا طبی معائنہ کیا گیا لیکن جس بچے کا بھی وہ معائنہ کرتے وہی بچہ عقلمند نکلتا تو ان کی مایوسی اور بڑھ جاتی دراصل انہیں ایک بے وقوف بچے کی تلاش تھی گھوڑے ہر طرف دوڑائے گئے لیکن ہر طرف سے ناکامی کی خبر آئی۔ ہر کارے نے کہا کہ پوری مملکت میں ایک بھی بچہ بے وقوف نہیں مل سکا تھا۔ ادھر بادشاہ کی حالت دن بدن بگڑتی جا رہی تھی۔ آخرکار شاہی طبیبوں نے فیصلہ کیا کہ ایک بچے کو تیار کر کے بادشاہ کے سامنے لے جائیں جس سے ممکن ہے کہ بادشاہ کو کچھ افاقہ ہو سکے۔

ایک چھوٹے سے بچے کو بادشاہ کے لئے تیار کیا گیا کہ جب وہ بادشاہ کے حضور میں حاضر ہو تو بادشاہ سے کہے۔

"بادشاہ جی آپ ننگے ہیں۔"

جب بچہ اس بات کو اچھی طرح یاد کر چکا تو اسے بادشاہ کے سامنے حاضر کیا گیا بچہ سب سے پہلے بادشاہ کے سامنے ادب سے کورنش بجا لایا۔ اور پھر دونوں ہاتھ باندھ کر اور گردن جھکا کر فلم "پکار" کے سہراب مودی کی طرح بولا۔

"بادشاہ جی آپ ننگے ہیں"

یہ سن کر بادشاہ نے آنکھیں کھول کر بچے کی طرف دیکھا اور پھر وہ جلدی سے اٹھ کر بیٹھ گیا۔ اس نے بچے کو اپنی باہوں میں لے لیا اور اس کے چہرے کو قریب کر کے اس کی آنکھوں میں غور سے دیکھ کر بولا۔

"ایک بار پھر تو یہی بات کہو میرے بچے"

بچہ پھر سہراب مودی کی طرح متانت سے بولا۔

بادشاہ جی آپ ننگے ہیں۔"

بچے کا چہرہ سپاٹ تھا، آواز اور لہجہ سپاٹ تھا اور آنکھوں میں دور دور تک وہ روشنی نہیں تھی جو بادشاہ نے سڑک کے کنارے ایک بوڑھے کے کندھے پر بیٹھے ہوئے ایک بچے میں دیکھی تھی۔ اس نے پیار سے بچے کے سر پر ہاتھ پھیرا اور بولا۔

"یہ بات تمہیں کس نے بتائی بیٹے کہ میں ننگا ہوں۔"

بچہ یہ سن کر ڈر کے مارے کانپنے لگا۔ بادشاہ نے اسے ایک شاہی چاکلیٹ دی جو اس نے پہلے کبھی نہیں دیکھی تھی اور پھر بڑے پیار سے بولا۔

"تم ڈرو نہیں مجھے بتاؤ کہ یہ بات تمہیں کس نے بتائی میں تمہیں بہت اچھے کھلونے دوں گا۔"

بچہ چاکلیٹ کو جیب سے کھولتے ہوئے بولا۔

"مجھے تو آپ کی پوشاک بہت اچھی لگتی ہے یہ بات تو مجھے بڑے حکیم صاحب نے یاد کرائی تھی کہ آپ ننگے ہیں"

یہ سنتے ہی بادشاہ نے یکبارگی دونوں ہاتھوں سے بچے کا گلا پکڑ لیا۔ اس کی آنکھوں میں نفرت اتر آئی۔ اس نے پوری بربریت کے ساتھ بچے کا گلا گھونٹ دیا۔ بچے کی مردہ مٹھی میں آدھی کھلی ہوئی شاہی چاکلیٹ اب بھی

دی ہیرا گئی اور اسی گھڑی جب بادشاہ نے بادشاہی
فرمان جاری کیا جس کی رو سے ملک میں [illegible]
گردی کی [illegible] بادشاہ کی مملکت میں کسی بچے کو [illegible]
دیا جائے گا کیوں کہ جتنا وقت، محنت اور روپیہ
ایک بچے کو عقلمند بنانے میں لگتا ہے اس سے کہیں کم وقت

میں اور کبھی کبھی تو صرف ایک شاہی چاکلیٹ کے بدلے
بچے کو بے وقوف بنایا جا سکتا ہے۔

پھر اس بادشاہ کی بادشاہت میں بچوں سے ان
کا بچپن کیسے چھین لیا گیا اور اس بادشاہ کا حشر کیسے
ٹھیک ہوا یہ بات اینڈرسن کیسے جان سکتا تھا

جب اگر یہ بات تو ہمیں بھی ٹھیک معلوم لیکن یہ پتہ
ہے کہ یہ کہانی [illegible] بہت جلد آپ کو اس کہانی سے
کہ وہ کیا [illegible] کا حصہ [illegible] اینڈرسن پوری کر
اور [illegible]

غزلیں

ہر رہ گذر عذابوں سے ثوابوں سے سجا ہے
یہ شہر تو ہم خانہ خرابوں سے سجا ہے
مغرب نے [illegible] کتابوں سے سجا ہے
چہرہ ترا دلچسپ نقابوں سے سجا ہے
افلاس کی دیمک نہ کہیں چاٹ لے اس کو
وہ ذہن جو انمول کتابوں سے سجا ہے
ہر سمت سمندر کا نشاں ڈھونڈنے والو
یہ دشتِ تمنا تو سرابوں سے سجا ہے
موسم کا نہیں یاد کے چہرے پہ اثر کچھ
وہ فصلِ بہاراں کے گلابوں سے سجا ہے
حاصل ہے جنھیں عشق کی نایاب مئے غم
غم خانۂ ہستی تو شرابوں سے سجا ہے
اے عشق کہ کم ہوتے نہیں آنکھ کے آنسو
یہ درد کا دریا ہے حبابوں سے سجا ہے
رحمت کی گنہگار کے دامن میں سراسر
یہ دامنِ زاہد تو حجابوں سے سجا ہے
جس دن سے بچھایا ہے تری یاد کا بستر
اس دن سے مرا گھر ترے خوابوں سے سجا ہے
اس شخص پہ الزام تراشی پہ سوالات
خاموش ہے لیکن وہ جوابوں سے سجا ہے
اب گوشۂ تنہائی تو کوثر نہیں ممکن
درویش کا کمرہ تو نوابوں سے سجا ہے

محمد ابراہیم کوثر

چشمِ بینا کو نہیں یارا ہے جب اظہار کا
دیدنی ہے نور بہتر نرگسِ بیمار کا
تشنہ سورج کا اٹھائے دشت میں چلتے رہے
اپنی قسمت میں نہیں سایہ کسی دیوار کا
خانۂ غم کی ظلمتیں مجھ کو ہراساں کیا کریں
ہاتھ میں اپنے ہے دامن مطلعِ انوار کا
اپنے غم سے بے خبری دل کی نہیں ممکن مگر
خوف اب بھی ہے اسے پی جائے غم سنسار کا
اپنے سر کو خود ہی میں نیزے پہ لے کر جب چلا
مرتبہ دنیا نے سمجھا پھر مرے انکار کا
آگہی کے جام سے میں وقت کا پیتا ہوں زہر
ہے مقدر خامشی میرے دلِ بیدار کا
شیخ کیوں اقرار پر اپنے ہے نازاں اس قدر
ہر یقیں میں ہے چھپا دعویٰ کسی انکار کا
علم کی [illegible] آگہی سے دل میں اپنے روشنی
ضربِ تیشہ سے منور سینہ ہے کہسار کا
کون [illegible] کاش ہوتا اپنے کھیتوں کا نصیب
جا رہا ہے قافلہ ابرِ گہربار کا
خواب سب میرے خس و خاشاک بن کر بہہ گئے
کس نے بھڑکایا ہے شعلہ یوں مرے افکار کا

وجاہت علی سندیلوی

وہ ہم سے بانٹ لیں گے رنج و غم کیا
ابھی دنیا میں ہیں اہلِ کرم کیا
مقدر میں لکھا ہے غم ہی غم کیا
اسی کے ہو کے رہ جائیں گے ہم کیا
تکلف سے [illegible] میں [illegible] کیا
اگر پینا ہی ٹھہرا بیش و کم کیا
دلِ برباد میں برسوں رہے ہیں
یہ غم کیا، درد کیا، رنج و الم کیا
تمہارا بھی تو اس میں ہاتھ ہوگا
خدا ہی نے دیے ہیں رنج و غم کیا
میں ساقی کی سخاوت جانتا ہوں
مجھے وہ بخش دے گا جامِ جم کیا؟
بجز رسوائی اس میں کچھ نہیں ہے
محبت کیا، محبت کا بھرم کیا
ارادہ ترکِ الفت کا تو کر لوں
اٹھا سکتا ہے دل ایسا قدم کیا
انہیں تو راز دیکھے گا پشیماں
تری آنکھیں بھی ہو جائیں گی نم کیا؟

راز لائلپوری

منشی پریم چند نے اپنے افسانوں میں دیہاتی ماحول کی جس خوش اسلوبی سے عکاسی کی ہے اس کی مثال دیکھنی ہو

تو

ڈاکٹر اودے سرن ارمان

کے افسانوی مجموعوں کو پڑھیئے۔ آپ بے ساختہ یہ کہنے پر مجبور ہو جائیں گے کہ ڈاکٹر ارمان ہندو پاک کے افسانہ نگاروں کی صفِ اوّل میں خصوصی مقام رکھتے ہیں۔

مان سروور

ڈاکٹر ارمان کا اوّلین افسانوی مجموعہ جو اکتیس ایسے افسانوں پر مشتمل ہے جو دیہاتی معاشرہ کی صحیح عکاسی کرتے ہیں۔ ہر افسانہ قاری کے دل و دماغ کو یہ سوچنے اور کہنے پر مجبور کرتا ہے کہ

"جو کہا تو نے وہ میرے دل میں تھا۔"

قیمت: -/۲۱ روپے۔ ڈی لکس -/۲۵ روپے

ہر بار کہا دل نے

ماہ جدید کی تمام تر شاعتی خوبیوں سے مزین یہ افسانوی مجموعہ ہر لحاظ سے اتنا دلچسپ، دلکش اور پُرلطف ہے کہ جسے پڑھنے کے بعد آپ دیہاتی زندگی کا ایک نعمتِ غیر مترقبہ کہنے پر مجبور ہوں گے۔ اور یہ خوبصورت افسانوی مجموعہ آپ اپنے احباب کو تحفۃً پیش کریں گے۔ قیمت: -/۲۵ روپے۔

کرنوں کے پدچن

ڈاکٹر ارمان کی یہ ہندی تصنیف سوانحی خاکوں پر مشتمل ہے جسے پڑھ کر آپ زندگی کو بہتر انداز میں بسر کرنے کے گر سیکھ سکیں گے۔ ۱۹۹۰ء کی انتہائی دلچسپ کی خوبصورت کتاب جو کمپیوٹر لیزر پر کمپوز ہوئی ہے۔

قیمت: -/۵۰ روپے

ملنے کا پتہ:-

یو۔ ایس۔ اے ہسپتال۔ گاندھی روڈ۔ بلاری۔ ضلع مرادآباد۔ یو۔پی۔ ۲۰۲۴۱۱۔

تقسیم کار:-

دفتر ماہنامہ "شانِ ہند"۔ فلیٹ ۸۔ انصاری مارکیٹ، دریا گنج۔ نئی دہلی۔ ۱۱۰۰۰۲

हिन्दी अका मी, िल्ली

इन्द्रप्रस्थ भारती

का

महत्वपूर्ण प्रकाशन

इन्द्रप्रस्थ कहानी– संग्रह*

0 इस संग्रह में वरिष्ठ पीढ़ी के एवं युवा पीढ़ी के कहानीकारों की रचना–दृष्टि एक साथ ही पाठकों के लिए उपलब्ध कराने का प्रयास किया गया है ।

0 लगभग 300 पृष्ठ के इस कहानी संग्रह में 35 कहानियां संकलित की गई हैं ।

0 ये कहानियां जहां आज के सामाजिक, आर्थिक एवं राजनीतिक पहलुओं का आईना प्रस्तुत करती हैं, वहीं जीवन के विभिन्न पक्षों को अपने अंक में समेटते हुए, मानवीय रिश्तों, संवेदनाओं और परिवेश से भी जुडी हुई हैं ।

0 कृपया अपनी प्रति आज ही सुरक्षित कराइए ।

0 रॉयल डिमाई आकार में पक्की जिल्द सहित संग्रह का मूल्य केवल 100/–रु0, जिसे सचिव, हिन्दी अकादमी, दिल्ली के नाम मनीआर्डर/पोस्टल/आर्डर /बैंक ड्राफ्ट द्वारा नीचे दिये गये पते पर भेजा जा सकता है ।

0 अधिक जानकारी के लिए संपर्क करें :–

दूर0:– 733950.
733274.

सचिव, हिन्दी अकादमी, दिल्ली,
ए–26/27, सनलाइट इंश्योरेंस बिल्डिंग,
आसफ अली रोड, नई दिल्ली– 110002



اُردو اکادمی، دہلی

آپ کی

اپنی اکادمی ہے

سیکریٹری

ط: گھٹا مسجد روڈ، دریا گنج، نئی دہلی
ن: ۳۲۷۶۲۱۱، ۳۲۶۳۳۳۸

چچا بعدم کی جھلکی

جوزف انور

(بیک گراؤنڈ میں ہلکے سُروں میں موسیقی)
بعدم چچا کا اشعار موزوں کرتے ہوئے گنگنانا۔ کارِ جہاں اور ——— بارِ گراں اور ——— اندازِ بیاں اور ۔ ۔ ۔ بس بس، پکڑ میں آگیا۔ واللہ کیا سلسلۂ آمد ہے۔

ہیں اور بھی دُنیا میں سخنور بہت اچھے
کہتے ہیں کہ غالبؔ کا ہے اندازِ بیاں اور "

سبحان اللہ! کیا حاصلِ غزل مقطع ہُوا ہے۔ میاں غالبؔ کی رُوح بھی پھڑک اٹھی ہوگی —
(دفعتاً کرکٹ گیند کے بعدم چچا کے سر پر لگنے کی آواز)

بعدم چچا (کراہتے ہوئے) ارے مار ڈالا۔ یہ بال ہے کہ ہینڈ گرینیڈ؟ ارے یہ سارے ہندوستانی کے ٹیسٹ میچ کے کھلاڑی میرے گھر میں کہاں سے آگئے۔ ارے او چھوٹو، منٹو، کالو وغیرہ وغیرہ ارے یہ ڈرائنگ روم اسٹیڈیم ہے کہ گھر کا دالان۔

قسم خدا کی سب کو شہر بدر بھیج دوں گا۔

ممتاز بیگم: (باورچی خانے سے) اجی بچوں کو کیوں کوستے ہو۔ اس میں سارا قصور تمہارا ہے۔ آؤ دیکھا نہ تاؤ۔ چشم زدن میں مجاہدین کی فوج تیار کر کے رکھ دی۔

بعدم چچا: (تھکے ہوئے لہجے میں) اب ہم بھی کیا کرتے بیگم۔ اُس وقت یہ ٹی وی تھا نہ پوسٹ بکس ۵۴۲۲ تھا۔ بیگم ذرا چائے تو بنا دو۔ کمبخت سارا سلسلۂ آمد ہی ختم ہو کے رہ گیا۔

ممتاز بیگم: (باورچی خانے سے) ابھی لائی۔
(تھوڑے وقفے کے بعد باورچی خانے سے ممتاز بیگم کے گنگنانے کی آواز)

"رات بھر رہیو سویرے چلا جائیو رے"

بعدم چچا: (غصے سے) ارے او ممتاز بیگم۔ شرم نہیں آتی۔ کیا واہیات گیت گا رہی ہو —

ممتاز بیگم: (اسی لہجے میں) کیوں کیا ہُوا۔ کل جب چترہار میں یہ گیت آ رہا تھا ۔ ۔ ۔ تو کیسے آنکھیں مٹکا مٹکا کر میری طرف دیکھ رہے تھے۔

بعدم چچا: لاحول ولا۔ ارے وہ گیت یوں تھا۔

"رات بھر رہیو سویرے چلی جائیو ری"

یہ گیت مردوں کے گانے کے لئے ہے۔

ممتاز بیگم: اجی رہنے دیجئے مردوں عورتوں کی باتیں۔ اب ویمن لبریشن کا زمانہ آچکا۔ اگر مرد "چلی جائیو ری" گا سکتے ہیں تو عورتیں بھی "چلا جائیو رے" گا سکتی ہیں۔

بعدم چچا: ارے جانے تو جب کیسے — سالے کو زندہ قبر میں نہیں گاڑ دُوں۔ تو بہ تو بہ اس ٹی وی نے تو خانہ خراب کر کے رکھ دیا ہے۔ گھر کو تماشا گاہ بنا کر رکھ دیا ہے۔ ہم نے تو سوچا تھا جب سُکھانتلی وی مشاعروں میں حاضر مشاعرہ غزلیں پڑھتے دیکھیں گی تو انھیں بھی ہماری شاعرانہ عظمت کا احساس ہوگا۔

مگر پھر ماہ ہوئے [illegible] تک تو ۔۔۔۔

(اچانک دروازے پر دستک کی آواز)

آواز: پوسٹ مین

بقدم چچا: ذرا بیگم ڈاک کا پلندہ تو لے آؤ۔ کمبخت روزانہ پچاس ساٹھ شاگردوں کی غزلیں اصلاح کے لیے آجاتی ہیں۔

(وقفہ اور دروازہ کھلنے کی آواز)

ممتاز بیگم: اجی سنتے ہو۔ یہ تو ایک لمبا سا لفافہ ہے۔ ہائے اللہ اس پر تو O.I.G.S. بھی لکھا ہے۔ ٹکٹ بھی گورنمنٹ کے ہیں۔ ہائے جس کا ڈر تھا وہی ہوا۔ لاکھ کہا اپنی حرکات سے باز آجاؤ۔ لو سنبھالو اب اپنی گرفتاری کا وارنٹ۔

بقدم چچا: (تعجب سے) وارنٹ؟ ذرا لفافہ تو دینا (لفافہ کھولنے کی آواز) تم بھی بیگم کمال کرتی ہو۔ یہ تو آل انڈیا ریڈیو ایگریمنٹ کنٹریکٹ ہے۔

ممتاز بیگم: آل انڈیا ریڈیو یعنی آکاش وانی۔ کیا مرثیہ پڑھنے بلوایا ہے؟

بقدم چچا: بیگم تم تو احمق ہو۔ ارے بیگم ہمیں تو جھلکی کے لیے بلوایا ہے۔

ممتاز بیگم: مگر تمہاری جھلکیاں تو بھائی انور لکھتے رہے ہیں۔

بقدم چچا: ارے وہ کیا جانے کمبخت ہمارے کارہائے نمایاں کا تذکرہ کر کر کے اپنے آپ کو بڑا مزاح نگار سمجھنے لگا ہے۔ غالباً آکاش وانی والوں کو پتہ چل گیا کہ کاتب، بیم، فون سمرقندی عرف پاگل پریمی عرف بقدم چچا ہم ہی ہیں۔ لہٰذا کنٹریکٹ براہِ راست ہمیں بھیج دیا۔

ممتاز بیگم: چلو اچھا ہوا۔ ریڈیو والوں سے پہلا کنٹریکٹ تو ملا۔

بقدم چچا: (قدرے تذبذب سے) مگر بیگم ہم نے ہزاروں حاصلِ مشاعرہ غزلیں پڑھی ہیں۔ ہزاروں شگفتہ مضامین پڑھے ہیں۔ مگر ریڈیو والے بھی کمال کرتے ہیں۔ جھلکی کا تعلق تو دیدہ و دل سے ہے۔ سخنوروں سے اس کا کیا لینا۔ بہرحال ہم انھیں جھلکی ہی نہیں اپنا جلوہ دکھائیں گے۔

ممتاز بیگم: (خوشامدانہ لہجے میں) اجی آپ اپنا جلوہ دکھائیں مگر تمہیں خدا کی قسم ہماری بھی جھلکی دکھوا دیجئے نا۔ ہم بھی سلمیٰ سلطان سے کم نہیں۔

بقدم چچا: تم بھی کمال کرتی ہو بیگم۔ یہ آکاش وانی ہے "دوردرشن" نہیں۔ پھر جھلکی تو کسی آج تک ہم نے لکھی بھی نہیں۔ اس کمبخت انور سے ملنا ہی پڑے گا

ممتاز بیگم: (غصے سے) کان کھول کر سن لو۔ آکاش وانی ہو کہ "دوردرشن" ۱۱ر دسمبر کو میری جھلکی نہیں آئی تو دوسروں کو تو بعد میں سمجھوں گی مگر تم مہر کی رقم ضرور تیار رکھنا۔

(وقفہ اور موسیقی)

ممتاز بیگم: (غصے سے) ہائے ۱۱ر دسمبر بھی آگیا۔ ابھی تک کوئی کیمرہ مین جھلکی لینے نہیں آیا۔ یہ بھی خدا جانے کہاں جا کر مر گئے۔ خیر بچ کر کہاں جائیں گے۔ میں خود ہی آکاش وانی جاتی ہوں۔

(وقفہ اور موسیقی۔ پھر قدموں کی چاپ کی آواز)

ممتاز بیگم: (غصے سے) کیا آپ ہی آل انڈیا ریڈیو والے ہیں؟

پروگرام ایگزیکٹو: جی ہاں ۔۔۔ جی ہاں ۔۔۔ تشریف رکھئے محترمہ ۔۔۔ فرمائیے کیسے زحمت فرمائی؟

ممتاز بیگم: (اُسی انداز میں) زحمت تو میں بعد میں فرماؤں گی پہلے یہ بتائیے آج اُن کی جھلکی آنے والی ہے؟

پی۔ای: کس کی؟

ممتاز بیگم: اجی ہمارے اُن کی یعنی کاتب، بیم، فون سمرقندی عرف پاگل پریمی عرف بقدم چچا کے نام سے لکھتے ہیں۔

پی۔ای: او' پاگل پریمی صاحب۔ ہاں ابھی تھوڑی دیر میں اُن کی جھلکی نشر ہونے والی ہے۔

ممتاز بیگم: اُن کی جھلکی آسکتی ہے۔ بھائی انور کی آسکتی ہے، تو ہماری کیوں نہیں آسکتی؟ کیا ہم بھی کسی سے کم ہیں۔

پی۔ای: مگر محترمہ سنئے ۔۔۔ یہ جھلکی ۔۔۔"

ممتاز بیگم: مجھے کچھ نہیں سننا ۔۔۔ ہاں مگر آپ کان کھول کر ضرور سن لیں۔ اگر آج ہماری جھلکی نہیں آئی تو میں اُن کو ۔۔۔ انور کو ۔۔۔ اور آپ کو چھوڑنے والی نہیں۔ دعویٰ دائر کروں گی ہائی کورٹ، سپریم کورٹ اور ضرورت پڑی تو ہیگ کی ورلڈ کورٹ تک لے جاؤں گی۔

(جاتے ہوئے قدموں کی چاپ کی آواز۔ وقفہ اور موسیقی)

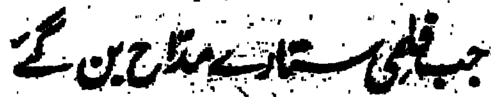
. . . .

پی۔ای: ارے یہ آج صبح صبح کس کا منہ دیکھا تھا۔ یہ کیسی بلا سر آن پڑی ۔۔۔ براڈکاسٹ کا وقت بھی ہونے آیا ۔۔۔۔ ہاں یہی ٹھیک رہے گا ۔۔۔ ارے او بھیا چپراسی ذرا جلدی سے یہ چٹ اناؤنسر کو تو دے آ۔

(وقفہ اور موسیقی)

اناؤنسر: ابھی تک (وقفہ) معاف فرمائیے گا ابھی جو جھلکی آپ سماعت فرما رہے تھے اس میں نام، مقام اور واقعات سب فرضی ہیں۔ کسی اتفاقیہ مطابقت کیلئے ہم یا پاگل پریمی صاحب یا جوزف انور صاحب ذمہ دار نہیں ہیں ۔۔۔۔!

(مناسب موسیقی سے خاتمہ)





● اداکار سنجے دت اور ان کے مہمان [illegible] ہوٹل کے کھانے سے لطف اندوز ہو رہے ہیں

فلمی ستارے جو ہر دم مداحوں میں گھرے رہتے ہیں، جب خود کسی کے مداح بن جاتے ہیں تو یہ حیرت کی بات ہے لیکن اگر آپ [illegible] ہوٹل کی نئی تیاری کا ایک بار ذائقہ [illegible] حیرت [illegible] خواص و عوام کا دل موہ لیتی ہے [illegible] ہوٹل [illegible] شامل ہیں۔ یہاں کی نئی تیاری [illegible] نہ کر سکیں گے۔

سہ ماہی "آوازِ نو" مالیگاؤں

(خصوصی شمارہ ابو جعفر نمبر)

ایڈیٹر: عتیق احمد عتیق

پتہ: [illegible] مالیگاؤں

ملک کے مختلف اخبارات اور رسائل کی صف میں "آوازِ نو" اپنے مواد کے لحاظ سے ایک منفرد حیثیت کا حامل ہے [illegible] اس کی شکل اور [illegible] نظری [illegible] مرکز نظر ہے۔

"آوازِ نو" کا تازہ شمارہ ابو جعفر [illegible] کے مصداق [illegible] ہے جس کے [illegible] صفحات [illegible] کے نہایت اہم اور [illegible] الکلام شاعر جناب [illegible] کے فن کی قدر و قیمت متعین کرتے ہیں [illegible] کے نہایت اہم [illegible] ہیں لیکن [illegible] ہے۔

[illegible] دکھائی دیتا ہے۔

اس نمبر کے [illegible]

کی تاریخ مرتب ہوتی ہے۔ مضامین، تبصرے، خطوط، تجزیے اور تاثرات وغیرہ کے مطالعے سے [illegible] صاحب کی شاعری کا پورا منظرنامہ سامنے آجاتا ہے اور اس بات کا اندازہ بھی ہو جاتا ہے کہ [illegible] صاحب ہر مکتبۂ فکر میں قدر و احترام کی نگاہ سے دیکھے جاتے ہیں۔ ان کی شاعری کا جائزہ لیتے وقت [illegible] قدیم و جدید کا امتزاج پایا جاتا ہے۔

اس نمبر میں ڈاکٹر [illegible] ڈاکٹر محمد حسن، پروفیسر گیان چند، پروفیسر [illegible] کرامت، نظام صدیقی، ڈاکٹر [illegible] شمس الرحمٰن فاروقی، عبد الغنی [illegible] عنوان چشتی، احمد سعید [illegible]

[illegible] تبصرے کے مضامین [illegible] نہایت [illegible]

اس نمبر کی ایک نمایاں خوبی [illegible] ترتیب [illegible] ہو جائے [illegible] دیکھتے ہوئے مدیر کی ہوشمندی کا احساس ہوتا ہے اور یہ حقیقت کھل جاتی ہے کہ [illegible] اور [illegible] دونوں کو ایک دوسرے سے [illegible] کر کے لایا گیا ہے۔

یقین ہے کہ یہ [illegible] خاص نمبر ہمیشہ قدر کی نگاہ سے دیکھا جائے گا۔

سلطان سبحانی

"بول ابول"، "انمول" اور "اعتماد" کا خالق

دیپک قمر

معتبر اور منفرد لہجہ کا البیلا شاعر ہے۔

"ماہیا" [illegible] اصنافِ شعری ہے [illegible] کی طرح [illegible] طور پر اظہارِ محبت کا ایک فارم ہے۔

اس [illegible] صنف [illegible] ماہیا میں صاحبِ دیوان [illegible] کی طرف [illegible]

سپنے بنجارے

ایک ایسی ہی حسین [illegible] شاعری [illegible]

خوبصورت [illegible]

صفحات [illegible]

[illegible]

محترمی قدر مکرم و محترم، السلام و رحمت!

مزاج گرامی — [illegible] سے بہر حال [illegible] آپ نے [illegible] عزیز وارثی مرحوم اور [illegible] شعراء کے [illegible] رنگ [illegible] کے ذریعہ [illegible] ادب سے [illegible]

[illegible] آپ بزرگ [illegible] آمین!

مخلص —
آزاد قاسمی
[illegible] راجستھان

فقط والسلام!

[illegible]

جناب [illegible]

[illegible]

[illegible]

کتنی عمر تیرے سامنے [illegible]

[illegible]

اس [illegible] نہیں ہے [illegible]

[illegible]

[illegible] سے تیری

[illegible] اپنا

[illegible] اپنا

[illegible] نہیں

[illegible]

[illegible]

دلی کے مشاعرے

مشاعروں کی تفصیلی روداد نگاری کا آغاز مرزا فرحت اللہ بیگ نے کیا۔ اس کو تفصیلی روپ ڈاکٹر کامل قریشی نے دیا۔ [illegible]

[illegible]

شانِ ہند

جلد ۵۲ شمارہ ۵

چیف ایڈیٹر
سرور تونسوی

جوائنٹ ایڈیٹر
مطرب صحرائی

اشاعت کا ۵۲ واں سال

پرنٹر، پبلشر، پروپرائٹر: وِدّیا پرکاشش سرور تونسوی
طباعت: خواجہ پریس، جامع مسجد دہلی۔ مقام اشاعت: دفتر ماہنامہ
"شانِ ہند" فلیٹ ۵ انصاری مارکیٹ، دریا گنج، نئی دہلی ۲-۱۱۰۰۰۔

اس شمارے کی اہم جھلکیاں

"اس حقیقت سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ کانگریس سیکولر پارٹی ہے اور سیکولر اتحاد میں اس کا اہم رول ہے" —— جمیل جہ گھٹ۔

"آقا" (نظم) سردار جعفری۔

"تحقیق کا اصل مقصد نئے حقائق کی دریافت ہے اور ان کے ذریعے نئے خیالات و افکار تک پہنچنا ہے" —— فن تحقیق کے آداب و اصول۔ (خواجہ احمد فاروقی)

"مفرور" (کہانی) شبیہ عباس جارچوی — "راجہ جوز میں [illegible] ایک دلچسپ خاکہ" "رشید احمد صدیقی کے خطوط" حسن ضیا۔ "اقرار" (کہانی) ڈی اے پیرمیں قربان — "اجنبی تنہا سا" (کہانی) طاہرہ مجوجہ۔

حقیر آستانی، محسن نقشبندی، منظور صدیقی، گوپال کرشن شفق، شفق شاہ جہانی، جمشید مسرور کی غزلیں —

"مابیا" دیپک قمر اللہ —

"باب استفادہ" — "تیرے کرم تو شب الیہ" [illegible]

مستقل کالم بدستور

ہندو پرست ہوں نہ مسلماں پرست ہوں
دامن پرست ہوں نہ گریباں پرست ہوں
ہر ذرّۂ وطن سے ہے فیاض مجھ کو پیار
یعنی وطن پرست ہوں انساں پرست ہوں

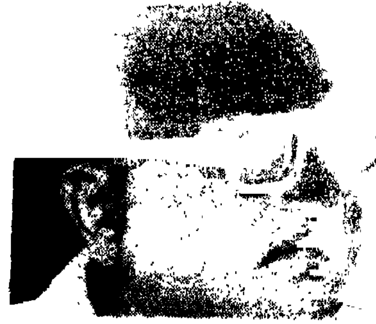
فیاض گوالیاری

ممالک غیر میں:-
بذریعہ سمندری ڈاک -/۱۰۰ روپے
بذریعہ ہوائی ڈاک -/۳۰۰ روپے

قیمت فی شمارہ — پانچ روپے
قیمت سالانہ — پچاس روپے
لائف ممبری — پانچ سو روپے

غزل

ڈاکٹر حقیر آستانی مرحوم



ظلم ڈھانے کی اِجازت کیسی ؟
خون بہانے کی اِجازت کیسی ؟

دِل فِدا ہے تو فِدا ہے اِس میں
لیں زمانے کی اِجازت کیسی ؟

وہ تِرا ہو نہ سکے گا اُس کو
آزمانے کی اِجازت کیسی ؟

خرمنِ زیست پہ تیرا حق ہے
دانے دانے کی اِجازت کیسی ؟

اپنے خوابوں میں خیالوں میں اُسے
پاس لانے کی اِجازت کیسی ؟

پھول ہنستی ہی رہیں گی کلیاں
مُسکرانے کی اِجازت کیسی ؟

گھر یہ سب کا ہے یہاں جانِ حقیرؔ
آنے جانے کی اِجازت کیسی ؟

جناب سرور تونسوی علیل ہیں، اس لئے اداریہ نہ لکھ سکے۔
محترم غلام ربانی تاباں کے زرّیں خیالات پیشِ خدمت ہیں۔
——— مضطرب صحرائی

سیکولر پارٹیوں کیلئے لمحۂ فکریہ

ہمارے کچھ سیکولر رہنما بساطِ سیاست پر ایسی چالیں چل رہے ہیں جو ایک عام انسان کے لئے ناقابلِ فہم ہوتی ہیں۔

اگر ہماری سیکولر پارٹیاں اور سیکولر لیڈر تنقید کے ساتھ خود تنقیدی کی طرف بھی توجہ کریں تو اس سے خود انھیں بھی فائدہ ہو، وہ بار بار ایک ہی غلطی کرنے سے بچے رہیں اور ملک و قوم کو بھی فائدہ ہو۔ ضمنی انتخابات نے ایک دفعہ پھر ثابت کر دیا کہ سیکولر پارٹیوں نے پچھلے تجربات سے کوئی سبق نہیں سیکھا۔ خدا جانے اس کی وجہ خود احتسابی کی صلاحیت کی کمی ہے یا کسٹ منٹ کی کمی۔ بڑی دلچسپ بات یہ ہے کہ سبھی سیکولر لیڈر، چاہے اُن کا تعلق جنتا دل سے ہو، یا سماج وادی جنتا پارٹی سے، کانگریس سے ہو یا بائیں بازو کی پارٹیوں سے، ملک کو درپیش چار محاذ فرقہ پرستی سے تحفظ کی بات کرتے ہیں، فسطائیت کے خطرے سے ملک کو محفوظ رکھنے کی بات کرتے ہیں، ملک کے

استحکام و سالمیت کے دفاع کی بات کرتے ہیں' لیکن جب عمل کا وقت آتا ہے تو یہی جماعتیں بالکل کمزور ہو جاتی ہیں۔ یہ حقیقت کسی سے چھپی نہیں ہے کہ پچھلے عام انتخابات میں اُتر پردیش میں بی جے پی کی کامیابی کی ایک بڑی وجہ تھی' سیکولر ووٹوں کی تقسیم۔ توقع کی جاتی تھی کہ سیکولر پارٹیاں اس سے سبق سیکھیں گی اور سیکولر ووٹوں کی تقسیم سے بچیں گی لیکن ضمنی انتخابات میں ایک دفعہ پھر سیکولر ووٹ تقسیم ہوئے جس کے نتیجے میں بی جے پی نے سترہ میں سے دس نشستیں حاصل کر لیں۔

ظاہر ہے کہ اس کامیابی نے اُن کے حوصلے بلند کر دئیے ہیں۔ کلیان سنگھ نے اعلان کیا ہے کہ رام مندر کی تعمیر کی راہ کی رکاوٹوں کو دُور کرنے کے لئے جلد ایک قانون بنایا جائے گا۔

ہمارے کچھ سیکولر رہنما بسا اوقات سیاست پر ایسی چالیں چل رہے ہیں جو ایک عام انسان کے لئے ناقابلِ فہم ہوتی ہیں۔ مثال کے طور پر امیٹھی کو لیجئے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ وی پی سنگھ اس خوش فہمی میں مبتلا تھے کہ امیٹھی میں اگر کیپٹن ستیش شرما ہار گئے تو ہمارے سب مسائل حل ہو جائیں گے۔ انہوں نے اُتر پردیش کے تمام دیگر حلقہ ہائے انتخاب اللہ کے سُپرد کر کے امیٹھی میں ڈیرہ ڈال دیا تھا۔ اگر امیٹھی میں جنتا دل اُمیدوار کامیاب ہو جاتا تو ذاتی طور سے مجھے بہت خوشی ہوتی لیکن میں اس کو کوئی بڑا کارنامہ تصوّر نہ کرتا۔ کارنامہ تو اس وقت کہا جاتا اگر اُتر پردیش میں بی جے پی کے بجائے سیکولر پارٹیاں دس نشستیں جیت لیتیں۔ لیکن وہاں جو کچھ ہوا وہ آپ کے سامنے ہے۔

ہمیں ذرا صاف بات کرنی چاہیئے۔ جنتا دل کے کچھ لیڈر حضرات کا کہنا ہے کہ بی۔ جے۔ پی فرقہ پرست ہے اور کانگریس صورتِ حال کو جوں کا توں برقرار رکھنے کی حامی ہے' اس لئے دونوں کی مخالفت ضروری ہے۔ ایک مبہم اور غیر واضح الزام لگا کر وہ آئینی ذمہ داری سے نہیں بچ سکتے ہیں۔ کم از کم اُتر پردیش کی حد تک مقابلہ تھا سیکولر اور فرقہ پرست پارٹیوں

> اس وقت فرقہ پرستوں نے نفرت کے شعلوں کو ہوا دے کر وارانسی میں آگ لگا دی ہے۔ اخبارات کی اطلاعات اور وہاں جانے والے وفود کی رپورٹوں کے مطابق فرقہ پرستوں نے ایک سوچی سمجھی سازش کے تحت وہاں فساد کرایا ہے۔ ایسے وقت جبکہ وارانسی کے امن پسند ہندو اور مُسلمان آگ و خون کے دریا سے گزر رہے ہیں کیا ہم خاموش تماشائی بنے رہیں گے...؟

کے درمیان۔ اگر جنتا دل کے یہ لیڈر کانگریس کو بی۔ جے۔ پی کے ساتھ بریکٹ کرتے ہیں' تو انھیں کھُل کے کہنا چاہیئے کہ کانگریس فرقہ پرست جماعت ہے۔ لیکن آپ جانتے ہیں کہ جھوٹی گھڑنا آسان کام نہیں۔ پھر بھی انھیں کچھ تو کہنا تھا چنانچہ "صورتِ حال کو جوں کا توں برقرار رکھنے کی حامی ہے" کا الزام تراشنا پڑا۔ مَیں نے پہلے کبھی کانگریس کی وکالت کی ہے نہ آج کرنا چاہتا ہوں۔ اُن کی غلط پالیسیاں، کوتاہیاں اور غلطیاں میری بھی نظر میں ہیں اور اُن کے خلاف مَیں باربار اظہارِ خیال کرتا رہا ہوں اور آئندہ بھی کرتا رہوں گا۔ کانگریس کی غلط پالیسیوں کی بنا پر اگر مُلک کو نقصان پہنچا تو خود جنتا دل کا دامن بھی داغدار ہے۔ کانگریس کی اندرونی دشمنی میں نشستوں کا بٹوارہ کر کے بی جے پی کو مستند و معتبر قومی سیاسی پارٹی کس نے بنا دیا؟ لال کرشن آڈوانی کو رتھ یاترا کے نام پر مُلک میں آگ لگانے کی چھوٹ کس نے دی؟ غلطیاں سب سے ہوتی ہیں۔ کسی سے زیادہ کسی سے کم۔ غلطیوں کی بنا پر کسی جماعت کا بُنیادی کردار نہیں بدل جاتا ہے۔ اس حقیقت سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ کانگریس سیکولر پارٹی ہے۔ اور سیکولر اتحاد میں اس کا اہم رول ہے۔ مُلک کے بدلتے ہوئے سیاسی حالات اور تیزی کے ساتھ اُبھرتی ہوئی فسطائی طاقتیں آج نہیں تو کل سیکولر پارٹیوں کو متحد ہونے پر مجبور کر دیں گی۔ آپسی رقابتیں اور کرسی کی کشش انھیں زیادہ دن تک برسرِ پیکار نہیں رکھ سکے گی۔

اگر مُلک کی سالمیت و استحکام کی حفاظت کرنی ہے تو انھیں اتحاد و اشتراکِ کار کا راستہ اختیار کرنا پڑے گا۔ مَیں کسی پارٹی کو دوش نہیں دے رہا ہوں۔ اس حمام میں سب ننگے ہیں۔ ظاہر ہے کہ بڑی سیکولر پارٹی کی حیثیت سے کانگریس کو اس میں پہل کرنی چاہیئے۔ لیکن شاید وہ احساسِ برتری کا شکار ہے۔ حالانکہ ماہرینِ تحلیلِ نفسی کے مُطابق احساسِ برتری بھی احساسِ کمتری کا ایک رُوپ ہے۔ بہرحال ایسا لگتا ہے کہ ہر سیکولر پارٹی نے اس کو وقار کا سوال بنا لیا ہے۔ کوئی پارٹی پہل کرنے کو تیار نہیں ہے جس کا نتیجہ ہمارے سامنے ہے۔ امیٹھی میں اگر جنتا دل کو شکست کا مُنہ دیکھنا پڑا تو بلند شہر میں کانگریس کو شکست کھانی پڑی۔

اب بھی کچھ نہیں بگڑا ہے۔ صبح کا بھولا اگر شام کو آ جائے تو اُسے بھولا نہیں کہتے۔ نرسمہا راؤ زیادہ حقیقت پسندی سے کام لے رہے ہیں۔ ایک حالیہ بیان میں انہوں نے مطلوب کانگریس تمام سیکولر اور بائیں بازو کی پارٹیوں کو فرقہ پرستی کے خلاف متحدہ جدوجہد کی دعوت دی ہے۔

جنگ میں بہت سی لڑائیاں لڑی جاتی ہیں۔ لڑائی ہارنے کے معنی جنگ ہارنا نہیں ہوتا۔ تسلیم کہ ہم اپنی تنگ نظری اور باہمی اعتماد کی کمی کی بنا پر انتخابات میں کامیاب نہ ہو سکے، پھر بھی جنگ جاری ہے اور جاری رہے گی۔ جنتا دل، سماج وادی جنتا پارٹی، کانگریس اور بائیں بازو کی جماعتوں کو اپنی ذمہ داری محسوس کرنی چاہیئے اور فرقہ پرست طاقتوں کے خلاف جدوجہد کا ایک جامع پروگرام بنانا چاہیئے۔

اس وقت فرقہ پرستوں نے نفرت کے شعلوں کو ہوا دے کر وارانسی میں آگ لگا دی ہے۔ اخبارات کی اطلاعات اور وہاں جانے والے وفود کی رپورٹوں کے مطابق فرقہ پرستوں نے ایک سوچی سمجھی سازش کے تحت وہاں فساد کرایا ہے۔ ایسے وقت جبکہ وارانسی کے امن پسند ہندو اور مسلمان آگ و خون کے دریا سے گزر رہے ہیں کیا ہم خاموش تماشائی بنے رہیں گے؟ کیا وقت نہیں آگیا ہے جبکہ لوازم اور مشترکہ آشتی کا پیغام اتر پردیش کے کونے کونے تک پہنچایا جائے؟

جب کسی شہر میں ہیضے کی وبا پھوٹتی ہے تو اس کا تدارک دو سطحوں پر کیا جاتا ہے۔ ایک طرف لوگوں کے ٹیکے لگا کر اور بیماروں کو طبی امداد فراہم کر کے انسانی جانیں بچانے کا فوری اقدام کیا جاتا ہے اور دوسری طرف صفائی اور حفظانِ صحت کے اصولوں پر عمل کیا جاتا ہے تاکہ آئندہ وبا نہ پھوٹے۔

وارانسی میں حالات کو معمول کے مطابق بنانے کے لئے ضروری ہے کہ فوری طور سے مرکزی نیم فوجی دستے اور بشرط ضرورت فوجی دستے وہاں بھیجے جائیں، تاکہ وہاں کے لوگوں اور خصوصیت کے ساتھ اقلیتی آبادی کا اعتماد بحال کیا جائے۔ اس لئے کہ بوجوہ انھیں ریاستی حکومت اور حکومت کی مشنری اور خصوصیت کے ساتھ پی اے سی کی کارکردگی پر اعتماد نہیں رہا ہے۔ دوسری طرف سیاسی سطح پر فرقہ پرستی کے خلاف جدوجہد تیز تر کردی جانی چاہیئے تاکہ فرقہ پرستوں کے بھڑکائے ہوئے نفرت کے شعلے اتر پردیش کے دوسرے شہروں اور قصبوں کو اپنی لپیٹ میں نہ لے سکیں۔ اس تناظر میں ملائم سنگھ یادو کی حقیقت پسندانہ اپیل کا خیر مقدم کیا جانا چاہیئے۔ اور سیکولر طاقتوں کو اپنا تاریخی رول ادا کرنا چاہیئے۔ نازی جرمنی کی تاریخ ہمارے سامنے ہے۔ ایسا نہ ہو کہ فسطائیت کے شعلے ہماری تمام اعلیٰ قدروں کو جلا کر خاک کردیں۔ نہ صرف اتر پردیش، بلکہ پورے ملک کے دفاع کے لئے سیکولر اتحاد لازمی شرط ہے۔ یہ ایک ناقابلِ تردید حقیقت ہے اور بقول جگر مرحوم ؎

"حقیقت خود کو منوا لیتی ہے مانی نہیں جاتی"



قلندر نے چمٹا گھمایا
میرے ہاتھ میں روشنی دھوپ سایا
اُبلتے ہوئے پانیوں کا تموّج
میرے ہاتھ میں موسموں کا تصرّف
ہواؤں کے چرکا سُنا میرے بس میں
حرارت، برودت مرے دسترس میں
مرا زور شامل ہے موروثگس میں
میں رزقِ رساں ہوں
بہار و خزاں ہوں
تمنا کرتا ہوں تدبیر کے ناخنوں سے
امیدوں، تمناؤں کی بخیہ کاری
میرے نام لکھی گئی شہریاری
قلندر نے چمٹا گھمایا
مرے ہاتھ میں روشنی دھوپ سایا

بدلتے ہوئے موسموں کو خبر ہے
ہوئے ہیں زمیں بوس پندار کے بت
انا سربسجدہ
ہوس نالہ برلب
حکایاتِ نخوت کی ناپائیداری
منافی گئیں جبر کی داستانیں
شکستہ ہوئیں سب طلسمی کمانیں
قلندر نے چمٹا گھمایا
کہیں دھوپ تھی روشنی تھی نہ سایا

سردار شفیق

علمی تحقیق کے آداب و اصول

پروفیسر خواجہ احمد فاروقی

ملکی اور قومی ترقی کے لئے تحقیق از بس ضروری ہے۔ اسی کی بدولت آج علم طب، فن تعلیم، طرق تعمیر، آثار قدیمہ، اسلحہ سازی، رسل و رسائل، ذرائع آمد و رفت، سائنس، اور تاریخ قدیم کے میدانوں میں نئے افق اور نئے جہاں سامنے آگئے ہیں جو اس سے پہلے نظروں سے اوجھل تھے۔ یہ کام بغیر ریسرچ کی تکنیک اور آداب و اصول کو جانے ہوئے ممکن نہیں ہے۔

شروع شروع میں تحقیق بحث و اتفاق کا نام تھا۔ آگ کی دریافت اور اس کی خاصیت دونوں اتفاق ہی سے معلوم ہوئیں۔ آگ سے کسی کا ہاتھ جل گیا۔ اس کے بعد یہ نظریہ عام ہو گیا کہ آگ جلاتی ہے۔

یہی صورت بعض جڑی بوٹیوں اور کھانے کی چیزوں کے متعلق ہے۔ ایک خاص مہینہ اور خاص وقت میں پھل FRUIT — مثلاً ککڑی یا کھیرا کھانے سے کسی خاص شخص کو نقصان پہنچا، پھر اس کو ممنوعیت دے دی گئی اور ان چیزوں کا عام استعمال خاص موسم میں روک دیا گیا۔ میری والدہ مرحومہ برسات میں کھیرا کھانے کو منع کرتی تھیں۔ بازار جانا بھی منع تھا۔ ایک دن میں چپکے سے بازار گیا اور ایک پیسہ کا کھیرا خریدا، اسے چکھا اور فوراً پھینک دیا کہ یہ والدہ صاحبہ کے حکم کے خلاف ہے۔

سانپ کے متعلق یہ مشہور ہے کہ وہ زہریلا ہوتا ہے لیکن یہ تعمیم غلط ہے ہر سانپ زہریلا نہیں ہوتا اسی لئے کہ دنیا میں سانپ کا شور با پانچ ہزار روپے میں ملتا ہے۔

تحقیق کا اصل مقصد نئے حقائق کی دریافت ہے اور ان کے ذریعہ نئے خیالات و افکار تک پہنچنا ہے کبھی کبھی اس کا مقصد نئی تعبیر اور نئی تشریح بھی ہوتی ہے لی نارڈو دی ونچی Leonardo Da Vinci نے جو بے مثل تصویر مونالیزا کی بنائی ہے اس کے متعلق یہ بحث جاری ہے کہ اس کے چہرے پر جو ہلکی سی مسکراہٹ ہے وہ کس چیز کی غمازی کرتی ہے۔ اس کی مسکراہٹ پر پوری کتابیں لکھی گئی ہیں لیکن ابھی تک یہ قطعی فیصلہ نہ ہو سکا کہ اس کے تبسم کے پیچھے کیا چیز چھپی ہوئی ہے۔ اسی طرح

ایک شخص سمندر کے کنارے ریت پر لیٹا ہوا ہے یہ بات تحقیق طلب ہے کہ وہ خوش ہے، رنجیدہ ہے، اکیلا ہے، وطن کی دوری پر اس کی ذہنی کیفیت کیا ہے۔ وہ اس دوری و مجبوری پر خوش ہے، ملول ہے۔ کسی کا منتظر ہے، اس نے سمندر پہلی دفعہ دیکھا ہے۔ عرصہ کی جلاوطنی کے بعد اس سرزمین پر قدم رکھا ہے۔ اگر وہ محبت میں گرفتار ہے تو اس کی محبت کس قسم کی ہے مجنوں کی سی، فرہاد کی سی، سینٹ فرانسس کی سی، زہیر عشق کی مہ جبیں کی سی یا بہار عشق کے مہجور کی سی۔

تحقیق میں ہمیں تمام انسانی اور سائنسی علوم سے مدد لینا ہوگی پھر بھی حقیقت یہ ہے کہ سچائی تک پہنچنا نہایت دشوار ہے اور لیسے پا کر تل کی دھار پر چلنا ہے۔ سر والٹر ریلے کو ایلزبیتھ اول نے کسی بات پر ناراض ہو کر جیل خانہ میں ڈال دیا تھا۔ اس نے سوچا کہ میں صبح سے شام تک بے کار پڑا رہتا ہوں مجھ کو کوئی بڑا علمی کام کرنا چاہیے چنانچہ اس نے تاریخ عالم لکھنے کا ایک منصوبہ بنایا اور دنیا کی تاریخ لکھنے میں منہمک

ہو گیا۔ ایک روز جیل خانہ کے دو قیدیوں میں لڑائی ہو گئی۔ ایک قیدی سر والٹر کے پاس آیا اور کہا، سر والٹر تمہیں کچھ خبر بھی ہے، ابھی میری آنکھوں کے سامنے ان دو قیدیوں میں لڑائی ہوئی جیک غریب کا سر پھٹ گیا ہے تو اس کی حالت دیکھی نہیں جاتی برابر خون بہہ رہا ہے۔ مجھے اُمید نہیں کہ وہ جانبر ہو سکے گا۔ دوسرا قیدی آیا اور اس نے کہا میرے سامنے جیک کی پیٹھ پر اتنی لاٹھیاں ماری گئیں ہیں کہ وہ شاید ہی سیدھا کھڑا ہو سکے۔ تھوڑی دیر کے بعد ایک اور قیدی آیا اور اس نے بھی سر والٹر کو یہ چشم دید واقعہ سنایا کہ جیک کی ٹانگوں پر اتنی ضربیں آئی ہیں کہ وہ مشکل سے چل پھر سکے گا۔ سر والٹر نے اپنا سر پیٹ لیا اور دل میں کہا میں دُنیا کی تاریخ لکھ رہا ہوں جس میں آفرینشِ آدم سے اس وقت تک کے حالات اور واقعات ہوں گے اور جو صدیوں پر محیط ہیں۔

یہ لڑائی کا واقعہ آج کا ہے آج ہی اس کی اطلاع دی گئی ہے، زمان و مکان کا بھی فرق نہیں ہے لیکن تینوں گواہوں کے بیانات مختلف ہیں ممکن ہے یہ تینوں غلط ہوں، مبالغہ آمیز ہوں یا صرف ایک بیان صحیح ہو یا تینوں بیان صحیح ہوں اور جیک کے چوٹ سر میں بھی آئی ہو، کمر میں بھی آئی ہو اور ٹانگوں میں بھی۔

عرض کرنے کا مدعا یہ ہے کہ سچائی کی تلاش آسان کام نہیں ہے اس لئے کہ اس میں تعصبات و میلانات اور اغراض و مقاصد سب مل کر اس کام کو دشوار بنا دیتے ہیں۔

اے رشتہ بر انگشت نہ پیچی کہ دراز است

ائمہ حدیث نے احادیث حضور سرورِ کائنات صلی اللہ علیہ وسلم کو جمع کرنے اور ان کی صحت و استناد میں جو غیر معمولی اہتمام کیا ہے اس کی مثال تاریخ عالم پیش کرنے سے قاصر ہے انھوں نے زمین کی طنابیں کھینچ دیں، جغرافیائی حدوں کو مسمار کر دیا اور ایک ایک لفظ کی تلاش و تحقیق میں زندگی گزار دی پھر بھی بعض احادیث مشکوک یا موضوع ہیں یا ان کا اطلاق اسرائیلیات میں ہوتا ہے۔

اردو میں تحقیقی و تنقیدی سرمایہ زیادہ نہیں ہے اور جو ہے اس کا معیار بھی لائق رشک نہیں ہے۔ بیسویں صدی کے اوائل تک اس کا معیار میر حسن یا محمد حسین ہی سے آگے نہیں بڑھا۔ علامہ شبلی کی موازنۂ انیس و دبیر پر ایک تبصرہ نگار نے اس طرح بحث شروع کی ہے۔

"میں پہلے شبلی صاحب کا نام ہی نہیں سمجھا، یہ بھیل آیا دیکھنے میں ہے یا کھانے میں۔ چرندوں میں ہے یا پرندوں میں آخر کہاں کا رہنے والا ہے"

موازنۂ انیس و دبیر کے جواب میں مرزا اوج لکھنوی کے ایما پر تبصرہ کا آغاز بھی اس طرح ہوتا ہے۔

"یہ مجموعہ ہے اُن بازاری گالیوں اور سوقیانہ پھبتیوں کا جو کہ لکھنؤ کے نوابی دور میں اس برگشتہ بخت شہر کے اراذل نے ترکہ میں چھوڑی ہیں۔"

جون سنہ ۱۹۱۰ء کے رسالہ زمانہ کانپور میں مولانا شبلی کی شعر العجم کو ہدفِ ملامت بنایا گیا ہے اور طعنہ زنی کی حد کر دی ہے۔ حالانکہ ایرانی بھی اس کے معترف ہیں کہ اس موضوع پر شعر العجم سے بہتر کتاب نہیں لکھی گئی۔ اشعار کا انتخاب تو ایسا ہے کہ اس سے زیادہ دلکش تصور میں نہیں آسکتا اسی زمانہ میں پروفیسر براؤن اپنی لٹریری ہسٹری آف پرشیا اور مولانا محمد حسین آزاد نے سخندانِ پارس مصروم شائع کی لیکن ان دونوں نے بقول مولانا شبلی میرے شعر العجم کو ہاتھ نہیں لگایا، دونوں کے میدان الگ تھے، بہتوں کلام کے احواب اور تنقید میں واقعی شعر العجم کا جواب نہیں۔

غدر سر سید کی آثار الصنادید کے بارے میں بہت اچھی رائے نہیں رکھتے تھے اور ان کا خیال تھا کہ سر سید نے عام لوگوں کی بتائی ہوئی باتوں کو یکجا کر دیا ہے اور اسے تحقیق و تفتیش سے کم تعلق ہے۔ مشتہر کی یہ تنقید فضا میں تحلیل ہو چکی ہے اور کسی کو یہ بھی نہیں معلوم کہ وہ کب چھپی اور کہاں چھپی۔ کم و بیش یہی صورت محمود شیرانی کی تنقید شعر العجم کی ہے۔ اس مخالفت کے باوجود شعر العجم آج بھی زندہ ہے۔ انگلستان کے شاعر کیٹس کے خلاف کیسے کیسے زہر ناک مضامین لکھے گئے لیکن اب زمانہ ان کو بھول چکا ہے اور صرف کیٹس کی خوبیاں یاد رہ گئی ہیں۔ پرانی اصطلاحوں کو نئے معنی پہنائے گئے ہیں اور حقائق کی نئی توجیہہ کی گئی ہے۔

خاق اور زمانہ کا اختلاف بھی دلچسپ ہے۔ میرا تعلق یو۔ پی کے ایک روایت پسند خاندان سے ہے۔ سسرال کی ناش کا کہ بیز سی پر بیٹھ گئی تھی ایک عرصہ تک لڑکیوں کا اس بیز سی سے پردہ ہوتا رہا۔ سائز ی معیوب تھی جو خاتون اس کو استعمال کرتی تھیں ان سے پردہ واجب تھا۔ مثنوی زہر عشق کو بہو بیٹیاں ہاتھ نہیں لگا سکتی تھیں۔ انیسویں صدی کے شروع میں باغ و بہار کا پڑھنا شرفا کے دستور کے خلاف تھا ہمارے گھر میں حکیم محمد علی طبیب کے سب ناول تھے لیکن لڑکیوں کی مجال نہیں تھی کہ انھیں ہاتھ لگا سکیں۔

رائے قائم کرنے میں بہت سے عوامل کام کرتے ہیں اس پروپیگنڈے کے زمانے میں ان کی تہہ تک پہنچنا بھی آسان نہیں۔ جس زمانہ میں الجیریا کی جنگِ آزادی شدت سے جاری تھی میں امریکہ میں تھا کئی کئی اخبار لے کر بیٹھتا تھا اور تعجب کرتا تھا کہ ان کی رپورٹوں میں آخر اتنا تضاد کیوں ہے۔ جس زمانے میں نپولین پیرس سے دور تھا اور اس کو لینے کی فکر میں مبتلا تھا، اخباروں نے یہ لکھا کہ "اگر یہ حرامزادہ آگے بڑھ گیا تو فرانس کو تباہ کر کے رکھ دے گا" جب نپولین اور آگے بڑھا اور پیرس کے قریب آگیا تو ان ہی اخباروں نے لکھا کہ نپولین شجاعت اور جہانبانی میں جواب نہیں رکھتا اور جب اس نے پیرس پر قبضہ کر لیا تو ان ہی مخالف اخباروں نے لکھا،

آنچہ خوباں ہمہ دارند تو تنہا داری

تحقیق میں منطق و فلسفہ، سماجیات، نفسیات، لسانیات، تمدنی وراثت، تہذیبی عوامل اور زبان کی باریکیوں پر نظر ہونا چاہیے۔ ایک عرب ایرانی نے ایک عرب لڑکی سے شادی کر لی اور اس کو دھوکہ دیا کہ وہ حسبی النسب ہے۔ فارسی میں چہلہ نگشتن محاورہ ہے اس ایرانی نے اس محاورہ کو عربی لباس میں پیش کیا۔ وہ لڑکی فوراً سمجھ گئی کہ یہ عرب نہیں اور مجھے دھوکہ دیا گیا ہے۔ فوراً طلاق لے لی اور علیحدہ ہو گئی۔

مشتاق شیرازی منتقی سے ملنے گیا اس کے یہاں کنٹرے پیچ کے بھرے تھے۔ پوچھا،

"یہ سنگ ہم پایہ چیست" ہم وزن و ہم قدر کی ضرورت ہے۔ مرزا نے برجستہ کہا "شبابک" بانده منتقی کے ہم کلام

شیخ مبارک تھا۔ اس میں جو طنز ہے وہ ظاہر ہے۔

میر تقی میر تیس برس کے بعد آگرہ ایک عالم کے پاس گئے۔ انھوں نے میر کی تسبیح خاک شفا پر اعتراض کیا اور کہا، ایں تسبیح خاک امام شاکہ موجب غبار خاطر ماستا چنیشگان ست، دلیل ست کہ شما میل بہ رفض دارید اگر در واقع چنیں است مرا بحال من واگذارید۔

میر صاحب نے فرمایا مرا نیز ہمیں تردد بود الحمد للہ کہ صاحب سنی برآمدند۔ اس کے بعد میر صاحب لکھتے ہیں کہ وہ احمق میرے کنائے کو نہ سمجھا اور بہت خوش ہوا

بے مزہ ترشدم و برخاستہ آمدم۔

ان لطیفوں سے ایک شخص اسی وقت لطف اندوز ہو سکتا ہے جب وہ تاریخ و تہذیب اور زبان و ادب سے پوری شناسائی رکھتا ہو۔ ریسرچ کا مقصد بنفشہ یا گل لالہ کی دھاریاں گننا نہیں ہے اور نہ یہ دیکھنا کہ غالب ہر ہفتہ کتنے کپڑے دھوبی کو دیتے تھے یا انھوں نے صرف دو سو شعر کہے تھے یا دو سو ایک۔ ان کی بڑائی کا راز صرف اس میں نہیں ہے کہ انھوں نے کیا کہا بلکہ اس میں بھی ہے کہ انھوں نے کس طرح اور کس انداز سے کہا ہے۔

تحقیق کے ہزار پہلو ہیں اور ہر پہلو پر مستقل کتاب لکھی جا سکتی ہے۔ یہاں صرف چند اشارے کئے گئے ہیں لیکن آخر میں ایک بات پر پھر زور دینا ہے اور اسے بار بار دہرانا ہے کہ تحقیق میں احتیاط اور صحت کا خیال سب سے زیادہ ضروری ہے۔ ہمارا حافظہ چاہے ابوالفضل ہی کا سا کیوں نہ ہو۔ لیکن کسی واقعہ یا نکتہ کو بیان کرنے سے پہلے اس کی تصدیق ضروری ہے۔ ممکن ہے ہمارا حافظہ غلطی کر رہا ہو۔ قزوینی نے مرزبان نامہ کی ترتیب و تصحیح میں بڑی جان لڑائی تھی اور اس کا خیال تھا کہ اب اس میں کوئی غلطی نہیں ہے۔ لیکن جب قزوینی کا مرتب کیا ہوا نسخہ انگلستان سے ایران پہنچا تو اس میں بیسیوں غلطیاں ملیں۔ جو ان کے ضعیف حافظہ کی بدولت پیدا ہو گئی تھیں۔ قزوینی نے کان پکڑے اور کہا کہ اب اگر قل ھو اللہ بھی نقل کرنا ہوگی تو اسے پہلے قرآن مجید میں دیکھ لوں گا۔ صرف حافظہ پر بھروسہ کرنا صحیح نہیں ہے۔

غزلیں

کاغذوں سے اُجلی تحریریں مٹا دی جائیں گی
ظلمتیں روشن دماغوں پر سجا دی جائیں گی
ننگی تصویریں فضاؤں میں ملا دی جائیں گی
اس طرح جذبات کی جھیلیں سکھا دی جائیں گی
اس حویلی کی ہر اک دیوار اک تصویر ہے
وقت کے ہاتھوں یہ تصویریں بھی ڈھا دی جائیں گی
کر چکے ہیں ذمہ دارانِ چمن یہ فیصلہ
آشیاں کے ساتھ شاخیں بھی جلا دی جائیں گی
ہو چکی ہے زندگی بے دست و پا تو کیا ہوا
سُن لیا ہے بیڑیاں ساری ہٹا دی جائیں گی
کوئی مانے یا نہ مانے ایک دن وہ آئے گا
نفرتوں کی اُونچی دیواریں گرا دی جائیں گی
منکشف ہونے لگا ہے مجھ پہ اب میرا وجود
اب سزائیں بھی مری شاید بڑھا دی جائیں گی
تو ذکر بسمل مرتبے سازوں کی بندشیں
سادگی سے خود کی قدریں بڑھا دی جائیں گی

بسمل نقشبندی

محفوظ ہے ہمسایہ بھی ہمسائے کا گھر بھی
پیغام مسرت سے نہیں کم یہ خبر بھی
ہوگا جو شبِ غم کے تقاضوں سے شناسا
دیکھے گا وہی رونقِ انوارِ سحر بھی
ہر درد کی معراج ہے یہ دردِ محبت
اس درد سے واقف ہیں فرشتے بھی بشر بھی
معلوم نہ تھا اپنے ہی خمیازے کے باعث
ہو جائیں گے اک روز قلم دستِ ہنر بھی
وہ جس کے مقدر میں ہو بیدار نہ ہونا
بیکار ہے اُس کے لئے آوازِ گجر بھی
بنتے ہیں تماشائی بھی اک روز تماشا
آیا ہے جو طوفان وہ جائے گا اُدھر بھی
میں نشر و اشاعت کی حقیقت سے ہوں واقف
خود میں نے سُنی ہے مرے مرنے کی خبر بھی
بیدار ہو کہ شبنم ہو کہ اُختر ہو کہ دُکھش
مضطر ہے ہر اک شخص نظر ڈالو جدھر بھی

مضطر صدیقی

یُوں جلانا دو کسے کو ایک پروانے کے بعد
کیا کہو گے تم خدا سے یہ ستم ڈھانے کے بعد
پی بیٹے نئے کی بُرائی شیخ جی اچھی نہیں
جو بھی کہنا ہو سو کہنا نوش فرمانے کے بعد
پارسائی کی یہ باتیں شام تک تو ٹھیک ہیں
یہ اثر رکھتی نہیں ہیں شام ڈھل جانے کے بعد
سوچئے تو در حقیقت شاہ و مُفلس ایک ہیں
فرق کچھ رہتا نہیں جاں سے گزر جانے کے بعد
رہزنوں سے رہبری کا اُن کو ڈر رہتا نہیں
جو بنا لیتے ہیں رستہ ٹھوکریں کھانے کے بعد
راحتیں کیوں ڈھونڈتے ہو خواہشوں کی بھیڑ میں
کوئی شے ملتی نہیں جنگل میں کھو جانے کے بعد
ہر طرف دُشواریاں، ناکامیاں، مایُوسیاں
ہو خوشی میں رہتا ہیں کیسے ہوش میں آنے کے بعد
روبرو ہو جو اب شفق سے بات بھی کرتے نہیں
یاد کر کے روئیے گا اُس کے مرجانے کے بعد

گوپال کرشن شفق



جب فلمی ستارے مدّاح بن گئے



● اداکار سنیل دت اور اُن کے مہمان نور محمدی ہوٹل کے کھانے سے لطف اندوز ہو رہے ہیں

فلمی ستارے جو ہر دم مدّاحوں میں گھرے رہتے ہیں، جب خود کسی کے مدّاح بن جائیں تو یہ حیرت کی بات ہے۔ لیکن اگر آپ نور محمدی ہوٹل کی نلی نہاری کا ایک بار ذائقہ لے لیں تو پھر آپ کو تعجب نہیں ہوگا۔ یہ ہے ہی اتنی عمدہ، لذیذ اور صحت مند کہ پہلے ہی لقمے میں خواص و عوام کا دل موہ لیتی ہے۔ اسی لئے نور محمدی ہوٹل کے مستقل گاہکوں میں بڑی بڑی ہستیاں، مشہور فلمی ستارے شامل ہیں۔ یہاں کی نلی، نہاری، بھیجہ، پائے، ماش کی دال اور دیگر کھانوں کے پیچھے ۶۰ سال کا تجربہ اور جناب عبدالحکیم مالک نور محمدی ہوٹل اور ان کے فرزند خالد حکیم کی ذاتی نگرانی شامل ہے، جس نے اُسے ممتاز بنا لیا ہے۔ آپ یہاں تشریف لا کر شوق فرمائیں، اپنے احباب کے لئے گھر لے جائیں یا پارٹی کے لئے لے جائیں۔ آپ اور آپ کے مہمان ذائقہ کو کبھی فراموش نہ کر سکیں گے۔

نور محمدی ہوٹل، وزیر بلڈنگ 181/183 ای۔ آر۔ روڈ، بھنڈی بازار، بمبئی ۴۰۰۰۰۳

فون ہوٹل: 8511008 فون دفتر: 8516115

خاں ہند دہلی، ستمبر ۱۹۹۱ء

مفرور

شبیہ عباس جارچوی

گوجرانوالہ شہر کے ریل بازار میں کیمور تلوی طعام گاہ کے نام سے ایک ہوٹل ہے۔ محبوب اسی ہوٹل میں برتن دھونے پر ایک ماہ قبل ملازم ہوا تھا۔ محبوب کا پورا نام راجہ محبوب حسین تھا اور وہ اپنے گھریلو حالات سے تنگ آکر گھر سے بھاگ آیا تھا اور اس نے اس ہوٹل میں ملازمت کر لی تھی۔ محبوب انٹر پاس تھا لیکن اس کے گھریلو حالات کچھ اتنے خراب اور پیچیدہ ہو گئے تھے کہ اس نے اپنی اچھی بھلی کلرکی کی سرکاری نوکری اور اپنے گھر دونوں جگہ سے فرار حاصل کر لیا۔ کچھ دنوں تک جب تک کہ اس کی جیب میں گھر سے لائے ہوئے پیسے رہے وہ مختلف شہروں میں گھومتا رہا اور جب اس کے پاس رقم بالکل ختم ہو گئی تو اس نے ہوٹل میں نوکری کر لی۔

محبوب کی عمر انیس سال تھی۔ ہوٹل صبح چھ بجے سے لیکر رات گیارہ بجے تک کھلا رہتا ہوٹل کے مالک چودھری فضل دین اور ان کے دو جوان بیٹے ہوٹل چلاتے تھے۔ ہوٹل میں ایک خانساماں، دو بیرے اور دو ڈش واشر تھے جن میں سے ایک محبوب تھا۔ ہوٹل تھا تو ریل بازار میں جو ایک بڑا اور مشہور بازار تھا لیکن اس کا ایک بغلی دروازہ ایک چھوٹے بازار میں جس میں بیشتر کپڑے کی اور جنرل اسٹور کی دوکانیں تھیں، بھی کھلتا تھا۔ اس چھوٹے بازار میں دکانداروں نے پورے بازار میں کپڑے کا سائبان تان رکھا تھا۔ جس سے گاہکوں کو بازار میں دھوپ کی شدت سے نجات مل جاتی تھی۔ دکانیں لکڑی کے کیبنوں کی بنی ہوئی تھیں جن کے سامنے لکڑی کے تختے بنے ہوئے تھے۔ جب رات کو ہوٹل بند ہو جاتا تو محبوب انہیں دکانوں میں سے ایک دکان کے تختے پر سو جاتا۔

ہوٹل میں محبوب کا ایک ہم عمر لڑکا تقریباً روز ہی شام کو چائے پینے آتا اور پندرہ منٹ آدھ گھنٹہ بیٹھ کر چلا جاتا۔ ایک روز خانساماں نے محبوب سے کہا کہ وہ ڈاکخانے سے منی آرڈر فارم لے آئے۔ وہاں اُسے معلوم ہوا کہ اس کا نام شبیر محمد وٹو تھا اور وہ کسی دوسرے شہر کا رہنے والا تھا اور بغرض ملازمت گوجرانوالا میں مقیم تھا اور یہاں اپنے دور کے رشتہ داروں کے یہاں رہتا تھا جنہوں نے اسے اپنے مکان کا ایک چھوٹا کمرہ دے رکھا تھا۔

پھر اس کے بعد شبیر محمد وٹو جب بھی ہوٹل میں آتا تو محبوب سے علیک سلیک کرتا اور دونوں آپس میں ایک دوسرے کی خیر خیریت دریافت کرتے۔ دونوں میں ایک قسم کی دوستی ہوتی جا رہی تھی۔ پھر یہ تعلق کچھ یوں بڑھا کہ اکثر شبیر محمد وٹو ایسے وقت ہوٹل آتا جب ہوٹل میں رش بالکل نہ ہوتا۔ پھر یہ دونوں ایک دوسرے سے دنیا جہان کی باتیں کرتے۔ محبوب نے چند مرتبہ ہوٹل کے مالک سے چھٹی لی اور دونوں ساتھ سنیما بھی دیکھنے

گئے۔ دونوں میں یہ قربت اس لئے بڑھی کہ دونوں شہر میں نئے تھے اور ہم عمر اور تعلیم میں بھی برابر تھے۔ اور ان دونوں کے شہر میں نئے ہونے کے سبب ان کی دوستی دوسرے لڑکوں سے نہیں تھی۔

لہذا جب دونوں نے ایک دوسرے کو دوستی کا متلاشی پایا تو دوست بن گئے۔ اب ان کو ایک دوسرے کے حالات کی پل پل خبر رہتی اور دونوں اپنے معاملات کے سلسلے میں باہم مشورہ کرتے۔ لیکن اس تمام یگانگت کے باوجود ایک بات ایسی بھی تھی کہ جو دونوں کو ایک دوسرے سے بیگانہ بناتی تھی۔ وہ یہ کہ راجہ محبوب حسین چونکہ اپنے گھر سے بھاگ کر آیا تھا اس لئے اس نے اپنے شہر اور محلے کا نام شبیر محمد کو پوچھنے کے باوجود نہیں بتایا تھا۔ اور جب محبوب نے بار بار کے اصرار کے باوجود بھی اپنا پتہ نہیں بتایا تو شبیر محمد نے بھی پوچھنا چھوڑ دیا البتہ پھر ہوا یہ کہ شبیر محمد نے بھی اپنا مستقل پتہ محبوب کو نہیں بتایا۔ اور پھر دونوں میں اس بارے میں ایک طرح کا خاموش معاہدہ ہو گیا۔

پھر ایک دن گرمیوں کی تپتی دوپہر میں جب بازار ہوٹل اور سڑکیں سب سنسان پڑے تھے، شبیر محمد ہوٹل آیا اور یہ دونوں دوست ہوٹل کے پاس ہی ایک بند دکان کے تختے پر بیٹھ کر باتیں کرنے لگے۔ شبیر محمد نے محبوب کو بتایا کہ جس گھر میں وہ رہتا ہے وہ اس کے بہت دور پرے کے عزیز ہیں اور صاحب خانہ اس کے چچا لگتے ہیں۔ ان سے ان کی قرابت داری اتنی دور کی ہے کہ گوجرانوالا آنے سے پہلے نہ تو شبیر محمد ہی ان چچا سے واقف تھا اور نہ انہوں نے ہی اس سے قبل اسے دیکھا تھا۔ اس نے بتایا جب گوجرانوالہ کے ڈاک خانے میں اسے ملازمت ملی تو اس کے والد نے اپنے رشتہ کے ان بھائی کے نام ایک خط دے دیا۔ جس میں اس کے والد نے انہیں شبیر محمد کو اپنے گھر ٹھہرانے اور کھانے پینے کے انتظام کے لئے لکھا تھا اور ساتھ ہی اس کے والد نے شبیر محمد کو تاکید کی تھی کہ وہ اپنے طعام وقیام کے عوض مناسب رقم ہر ماہ چچا کو دے دیا کرے۔ شبیر محمد نے محبوب کو بتایا کہ اس کے چچا کی دو لڑکیاں ہیں بڑی کا نام ریحانہ اور چھوٹی کا نام شبانہ ہے۔ اس نے کہا کہ شبانہ جتنی زیادہ خوبصورت ہے بڑی ریحانہ اتنی ہی زیادہ بدصورت ہے۔ اور یہ کہ ریحانہ کے لئے اس کے والدین جتنے بھی رشتے آج تک گھیر گھار کر لائے وہ سب واپس چلے گئے اور اکثر لڑکے والے جو لڑکی کیلئے رشتہ لیکر آئے وہ چھوٹی کو پسند کرتے اور پھر پروپوزل دیتے جس کو اس کے والدین یہ کہکر ٹال دیتے کہ پہلے بڑی کا رشتہ ہو جائے پھر چھوٹی کی شادی کریں گے یا پھر دونوں کی ساتھ کریں گے اور معاملہ اس طرح ٹلتا جا رہا ہے پھر بعد کی ملاقاتوں میں شبیر محمد نے اُسے ایک نئی تبدیلی کی اطلاع دی وہ یہ کہ اس کے چچا اور چچی چاہتے ہیں کہ میں ریحانہ سے شادی کر لوں اور ان کی اس بار بار کی کوشش سے اور ریحانہ کی طرف سے بھی ترغیب اور اقرار سے وہ بھی ظاہر یہی کرتا ہے کہ وہ ریحانہ کو چاہتا ہے لیکن حقیقت میں وہ اور شبانہ ایک دوسرے کو پسند کرتے ہیں اور اس سلسلے میں گھر میں اچھی خاصی کشمکش رہتی ہے۔ اور وہ یہ بھی بتاتا کہ اب اسے گھر میں بہترین کھانا، حلوہ پراٹھا انڈے اور مکھن اور لسی وغیرہ ملتے ہیں اور سب گھر والے اس کے مسائل میں بے حد دلچسپی اور فکرمندی ظاہر کرتے ہیں اور اس کا بہت خیال رکھتے ہیں۔ پھر بعد میں اس نے متعدد بار ایسے واقعات بتائے کہ آج میں نے شبانہ سے گھر میں کھانا منگایا اور جب وہ کھانا لیکر آئی تو میں اور وہ باتیں کرنے لگے کہ اتنی دیر میں چچی آگئیں اور شبانہ کو اس کے کمرے میں واپس بھیج دیا اور ریحانہ کو آواز دے کر میرے پاس بھیج دیا اور ریحانہ کو آواز دے کر تاکید کی کہ وہ میرے کھانے اور پانی وغیرہ کا خیال رکھا کرے یا پھر یہ کہ کسی دن میں اور شبانہ باتیں کر رہے تھے کہ ریحانہ آگئی اور شبانہ کو اس نے میرے پاس سے اٹھا دیا اور خود بیٹھ کر باتیں کرنے لگی اور میں جو شبانہ سے خوش دلی سے باتیں کر رہا تھا مجبوراً دکھاوے کے طور پر ریحانہ سے باتیں کرنے لگا۔ شبیر محمد ہر روز یا ایک دن چھوڑ کر مجھے ان واقعات کی تفصیل بتاتا اور میں سوچتا کہ دیکھو آئندہ چلکر یہ اونٹ کس کروٹ بیٹھتا ہے۔

ایک مرتبہ ایک ہفتے تک شبیر محمد ہوٹل نہیں آیا تو محبوب کو تشویش ہوئی۔ دو تین دن مزید انتظار کرنے کے بعد محبوب ڈاکخانے گیا تو معلوم ہوا کہ شبیر محمد دس بارہ دن سے ڈاکخانے اپنی ڈیوٹی پر نہیں آیا۔ آخر ایک دن وہ بختے والا محلے میں واقع اس کے چچا کے گھر گیا تو وہاں سے بھی کوئی جواب نہیں ملا۔ یہ تو صاف ظاہر تھا کہ وہ اب شہر چھوڑ کر کہیں اور چلا گیا تھا لیکن اسے یہ تعجب تھا کہ اگر شبیر محمد کو شہر چھوڑ کر جانا ہی تھا تو وہ اس سے آخری ملاقات تو ضرور کر کے جاتا۔ بہت کچھ سوچنے کے باوجود بھی محبوب کو شبیر محمد کے یوں اچانک غائب ہونے کی وجہ سمجھ میں نہیں آئی پھر ایک دن ایسا ہوا کہ محبوب کو اپنے گھر والوں کی یاد نے بہت ستایا تو اس نے اپنے پتے اور خیریت سے مطلع کرنے کیلئے گھر والوں کو خط لکھ دیا۔ خط ملتے ہی محبوب کے گھر والے آکر محبوب کو اپنے ساتھ لے گئے۔ محبوب ایک مرتبہ پھر اپنے گھر واپس پہنچکر کاروبار زندگی میں مصروف ہو گیا۔

نہ جانے کتنے موسم بدل گئے، کتنے جگ بیت گئے، کاروبار دُنیا اسی طرح چل رہا تھا جیسا کہ آج سے چالیس سال قبل زندگی اسی طرح رواں تھی، صرف اس وقت اور آج کے محبوب حسین میں بہت فرق ہو چکا تھا۔ اس وقت جب محبوب حسین ایک نوجوان تھا اور آج جب اس کے سر میں اکا دکا ہی کالے بال نظر آتے تھے۔

محبوب حسین آج اپنے گاؤں سے دُور دراز اپنے کھیتوں کے پاس ایک درخت کے نیچے کھانا کھانے کے بعد مختصر آرام کر رہے تھے۔ ان کے کھیتوں کے پاس سے ایک گزرگاہ گزرتی تھی جو ایک شہر

درگاہ سے بڑی سڑک تک تین میل کے لگ بھگ طویل تھی اور اس کے درمیان میں محبوب حسین کے کھیت تھے۔ کل رات ہی اس درگاہ کا سالانہ عرس ختم ہوا تھا اور اب صبح ہی سے عرس میں شریک ہونے والے لوگ تانگوں، سائیکلوں پر بسوں میں یا پیدل بڑی شاہراہ کی طرف جا رہے تھے، جہاں سے انہیں اپنی منزل کی طرف روانہ ہونا تھا۔ کچھ دیر کے بعد ایک آدمی جو محبوب حسین ہی کا ہم عمر تھا پگڈنڈی چھوڑ کر کچھ دیر ستانے کے لئے درخت کے نیچے آکر سلام دعا کر کے محبوب حسین کے پاس بیٹھ گیا۔ محبوب حسین نے حقے کی نڑی نووارد کی طرف گھما دی۔ جب نووارد کچھ دیر کے بعد تھکن کم ہونے کے ساتھ ساتھ پرسکون ہوا تو محبوب حسین نے پوچھا۔ "بھائی صاحب آپ کا نام کیا ہے"، تو نووارد نے جواب دیا "درگاہ کا فقیر ہوں، چوہدری میرا نام کیا"۔ چند لمحوں کے بعد پھر محبوب حسین نے دوسرا سوال کیا، "آپ کہاں کے رہنے والے ہیں"، تو نووارد نے وارث شاہ کا یہ شعر سنایا۔

"رمتے سب، فقیر دا دیس کیہا"

اور ساتھ ہی نووارد نے انداز بے خودی میں خود کلامی کے طور پر یہ شعر پڑھے۔

"کونجاں وانگ ممولیاں دیس چھٹے
اساں ذات صفات تے بھیس کیہا
وطن وساں دے نال تے ذات جوگی
ساڈا دیس کبیلڑا خویش کیہا
چھڈ وطن تے ذات وارثیاں رکھے
دنیا دار ہے اور درویش کیہا"

محبوب حسین نے جب دیکھا کہ ان کا ہم وار قافلہ جا رہا ہے تو خاموش ہو رہے لیکن یہ سوچ کر کہ کوئی دلچسپ اور پراسرار ہے ذرا غور سے دیکھا تو انہیں نووارد کے ماتھے پر چوٹ کا ایک نشان نظر آیا۔ محبوب حسین کچھ سہم سے گئے، جب انہیں کچھ دیر کے بعد [illegible] تو محبوب نے اس سے آخری سوال کیا،

"بھائی آپ کا نام بشیر محمد تو نہیں ہے؟" ابھی یہ سننا تھا جاتے جاتے رک گیا اور محبوب کو غور سے دیکھنے کے بعد بولا "ہاں میرا نام ہے تو بشیر محمد لیکن تم مجھے کس طرح جانتے ہو؟" جب محبوب حسین نے تفصیل بتائی تو دونوں دوستوں نے زوردار معانقہ کیا اور دونوں زمین پر بیٹھ گئے۔ محبوب حسین نے پرانے دوست سے کھانے وغیرہ کے متعلق اور ایک آدھ دن اپنے گھر ٹھہرنے کیلئے کہا لیکن بشیر محمد نے انکار کر دیا۔ آخر جب محبوب حسین نے بے حد اصرار کیا تو کچھ دیر کے لئے وہ اس کے گھر جانے کے لئے رضامند ہو گیا۔ گھر کے باہر دونوں دوست چارپائی پر بیٹھ گئے۔ سامنے ایک چھپر میں مویشی بندھے ہوئے تھے۔ شدید گرمی تھی اور حبس بھی تھا قریب بچوں کی ایک ٹولی ہاتھوں میں کٹورے اٹھائے ہوئی آسمان کی طرف منہ اٹھائے پکار رہی تھی "کالیاں اِٹاں کالے روڑ، مینہ وسا دے زورو زور"

لسی پانی پینے کے بعد اور رسمی گفتگو کے اختتام پر محبوب حسین نے بشیر محمد سے پوچھا کہ "آج کل کیا کرتا ہے۔" "یہاں سے قریباً سو میل دور ایک قصبے میں اسکول ٹیچر ہوں" بشیر محمد نے جواب دیا اور اپنے دوست کے دریافت کرنے کے باوجود اسے پتہ ٹھکانہ نہیں بتایا۔ "اچھا دوست یہ تو بتاؤ کہ تم گھر بار چھوڑ کر اچانک اور بغیر کسی کو اطلاع دیئے کیوں اور کہاں چلے گئے تھے"، محبوب حسین کے اصرار پر بشیر محمد بولا، "دوست گیا تو میں کسی خاص جگہ نہیں تھا بلکہ مختلف شہروں اور دیہاتوں میں گھومتا پھرا البتہ اپنے آبائی گاؤں آج تک نہیں گیا اور نہ ہی کسی عزیز کو آج تک اپنی اطلاع دی اب ایک طویل عرصے سے ایک قصبے میں گھر کر چکا ہوں۔ [illegible] میں نے شادی بھی کی تھی اولاد کوئی نہیں ہوئی اور بیوی شادی کے پانچ سال بعد [illegible] کے سبب مر گئی۔" یہ کہہ کر بشیر محمد خاموش ہو گیا، جب محبوب حسین نے دیکھا کہ بشیر محمد اصل سوال کا جواب بھول کے سبب یا جان بوجھ کر چھوڑ گیا ہے تو اس نے سوال پھر دہرایا۔ "بشیر محمد تم گاؤں سے اچانک غائب ہوئے تھے [illegible] ہوا تھا تم نے اس کا سبب نہیں بتایا۔" محبوب بات

اصل میں یہ گفتگو اس قسم کی ہے۔ اور اسی سبب میں نے اپنے تمام جاننے والوں سے خود کو چھپا لیا اور آج تم نے خود ہی مجھے پہچان لیا تو گفتگو اس حوالے سے ہو رہی ہے۔ تمہیں یاد تو ہے کہ جس گھر میں میں رہتا تھا اس میں دو نوجوان لڑکیاں بھی تھیں"۔ "ہاں مجھے معلوم تھا۔ اب تک یاد ہیں جو تم مجھے اس وقت روز بتایا کرتے تھے۔ بعد میں کیا ہوا یہ بتاؤ" محبوب حسین نے کہا۔ "ہاں تو ہوا یہ کہ ایک دن سارے گھر والے کسی تقریب میں گئے ہوئے تھے۔ سارا گھر خالی پڑا تھا میرے دماغ میں جانے کیا سودا سمایا کہ میں اپنے بستر کے بجائے کسی دوسرے پلنگ پر سو گیا۔ جب آنکھ کھلی تو پلنگ پر کسی دوسرے وجود کا بھی احساس ہوا اور یہ تو ہماری پہلی اور آخری بھول ہے بعد میں نے خوشگوار لہجے میں اس بستر والے کا نام لیا تو جواب کسی اور کا آیا۔ اب یا تو اس صورت لڑکی سے میں شادی کرتا یا راہ فرار اختیار کرتا۔ سو میں نے آخری مرتبہ اس کی شکل کو غور سے دیکھا اور دوسری صورت کو موزوں سمجھا اور آج تک مفرور ہوں۔"

غزلیں

سید شفق شاہ چشتی

برسوں تو حادثوں کا نشانہ رہا ہوں میں — ہاں اب فنا امیدِ سکوں پا رہا ہوں میں
اس درجہ بے خود و شبِ فرقت رہا ہوں میں — دن میں بھی تو چراغ جلاتا رہا ہوں میں
جبتک جنونِ شوق سے الجھا رہا ہوں میں — آئینہ آئینہ نظر آتا رہا ہوں میں
کس طرح دو قدم بھی لہرا رہا ہوں میں — وہ نقش کہ جیسے اُڑا جا رہا ہوں میں
کی اہلِ دل نے بات تو بیعت اسی لیے — اہلِ جنوں کی بھیڑ میں تنہا رہا ہوں میں
بخشا ہے بس غریب کے اچھے ہیں دوستو — پانی پہ جال ڈال کے گھیرا رہا ہوں میں
ہے کوئی جو خرید لے خوابوں کے آئینے — آواز شہر شہر میں لگاتا رہا ہوں میں
پہنچا جہاں جلا دی وہیں شمع پیار کی — ہر گھر میں بن کے اس کا اجالا رہا ہوں میں
پھولوں سے بے رخی کا تہیہ کئے ہوئے — کانٹوں کے جال ہی کو الجھا رہا ہوں میں
منزل کا ہے شعور نہ ہے سمت کی خبر — اک شخص ہے اور پھر بھی چلا جا رہا ہوں میں
یہ بھی عجیب ہے مگر عجب اتفاق ہے — ہر موڑ پہ ہمیشہ اکیلا رہا ہوں میں
روزِ حساب دیکھئے ہوتا ہے حشر کیا — انجام سوچ سوچ کے گھبرا رہا ہوں میں
دنیا میں دوسروں کی غلامی کروں کس طرح — بندہ نواز آپ کا بندہ رہا ہوں میں
جتنی بھی دیر آج رہا اُن کے رُو برُو — محسوس یہ ہوا کہ مہکتا رہا ہوں میں
چھوٹی سی زباں اس کی حقیقت کو کیا کہوں — کیا جانے کیوں ہلاکِ تمنا رہا ہوں میں
اس زندگی کے تاج محل میں خدا گواہ — خوابوں کے آئینے ہی سجاتا رہا ہوں میں

ظاہر ہوا نہیں یہ شفق رازِ بے بسی
ناکامیوں کے بعد بھی زندہ رہا ہوں میں

جتنے دنوں فروکشِ صحرا رہا ہوں میں — اک شہر یار، شہرِ تمنا رہا ہوں میں
منت کشِ مسائلِ دنیا رہا ہوں میں — کرنی تھی جیسی ویسی سزا پا رہا ہوں میں
دل سوزیِ حضور کو بھاتا رہا ہوں میں — موقع بموقع آپ سے کہتا رہا ہوں میں
ہوتے نہیں کسی کے یہ خوباں خوش خرام — دل لاکھ نا کہے یہی سمجھا رہا ہوں میں
شاید وہ آ ہی جائیں فقط اس خیال سے — شب بھر چراغِ اشک جلاتا رہا ہوں میں
ساقی نہ کہنا میں نے تعاون نہیں کیا — مرہونِ منتِ مے و مینا رہا ہوں میں
رخصت تو آپ ہو گئے اب کچھ نہ پوچھئے — تا دیر گرد میں ہی بکھرتا رہا ہوں میں
واقف ہو کوئی کیوں مرے غم سے اسی لئے — لب پہ تبسموں کو سجاتا رہا ہوں میں
عزت مآب کہہ کے مخاطب کیا گیا — لیکن نگاہِ وقت سے ڈرتا رہا ہوں میں
کتنے تو خیر تھے مقابل بہت سے لوگ — قد میں خدا کا شکر کہ اونچا رہا ہوں میں
خوابوں کے آئینے بھی سلامت نہ رہ سکے — شرمندۂ ملامتِ دنیا رہا ہوں میں
ہمت بلند ہو گئی طوفان بھی تھم گیا — جیسے کسی ندی کی ہو صدا آ رہا ہوں میں
دنیا خریدتی بھی تو کیونکر خریدتی — ہر آن ہر لحاظ سے مہنگا رہا ہوں میں
دامن جھٹک کے تیرا وہ جانا کہ آج تک — دن رات کیسا کیسا تڑپتا رہا ہوں میں
کس منہ سے جاؤں داورِ محشر کے سامنے — اعمال ہی ہیں ایسے کہ شرما رہا ہوں میں
ذمے اسی کے ناؤ ڈبونے کا کام تھا — وہ جس کو اپنا دوست سمجھتا رہا ہوں میں
رستے میں اس نے روک کے پوچھا مرا احوال — کچھ سوچ کے جواب کو کترا رہا ہوں میں
اچھی طرح سے یاد ہے وہ دور بھی مجھے — اپنوں کی جب نظر میں پرایا رہا ہوں میں
سنتا ہوں وہ بھی میرے لئے اب ہیں بے قرار — اللہ کا کرم ہے کہ اچھا رہا ہوں میں

خود آگہی نصیب نہ تھی جب تلک اے شفق
در در قسم خدا کی بھٹکتا رہا ہوں میں

راسپوٹین

راسپوٹین دُنیا کا سب سے زیادہ گندا، بدکار اور بدخصلت انسان تھا جو کئی سال تک روس پر اپنی شیطانی صفات کی بدولت حکمراں رہا اور جس کے باعث زارِ روس کی عظیم الشان سلطنت تباہ ہوئی۔ چھ فٹ دو انچ لمبے قد کے اس گرانڈیل راہب کی گناہوں بھری زندگی کے قصے جہاں اہلِ روس کو ازبر یاد ہیں، وہاں دنیا کو بھی معلوم ہیں۔

راسپوٹین کا اصل نام گریگوری یفیموچ تھا۔ پیدائش ۱۸۷۲ء کو سائبیریا روس میں پیدا ہوا۔ راسپوٹین اصل میں گریگوری کی عرفیت تھی جس کا مطلب بے راہرو یا بداخلاق کے ہیں۔

راسپوٹین نے اپنی عمر کا ابتدائی حصہ روس میں آوارہ گردی کرتے ہوئے گزارا۔ اس نے شروع ہی سے راہبانہ طرز کا اندازِ زندگی اختیار کئے رکھا

اس کا اندازِ گفتگو اور چال ڈھال عام لوگوں سے مختلف تھا۔ مذہب کے بارے میں اس کے عقائد نہ ہونے کے برابر تھے بلکہ وہ جادوگر — ہپناٹزم جسمانی اتصال و گناہ کو ہی مذہب قرار دیتا تھا اور لوگوں سے اعلانیہ کہتا پھرتا تھا۔ "اگر تم حقیقی دُنیاوی حقوق و فوائد سے بہرہ ور ہونا چاہتے ہو، تو گناہ کرو۔ اور بار بار کرو۔"

راسپوٹین راہب کے منصب میں نہ صرف ہپناٹزم کے ذریعے لوگوں کو اپنا گرویدہ بنا لیتا تھا بلکہ بڑے عقیدے سے اور ترغیبِ گناہ کا پرچار بھی خاص طور پر عورتوں کے مجمع میں کیا کرتا تھا اور اس بات پر بطورِ خاص زور دیا کرتا تھا کہ "اگر تم زندگی میں اپنی فلاح و بھلائی چاہتے ہو تو گناہ ابھی سے ہی شروع کر دو۔ کیونکہ اس کے بغیر نجات ممکن ہی نہیں۔"

چنانچہ اسی عقیدے کی بنا پر سیکڑوں عورتیں چھپ چھپ کر اور بھیس بدل بدل کر اس شیطانی راہب کے پاس جنسی تسکین کے لئے آنے جانے لگیں۔

یہ بات قابلِ ذکر ہے کہ مذہبی خلیفہ ہونے کے باوجود راسپوٹین کا حلیہ بڑا عجیب و غریب تھا۔ وہ بالکل غسل نہیں کرتا تھا۔ اس کے ہاتھ گرد میں اٹے ہوئے تھے۔ اس کے بدن سے سخت بدبو آتی تھی۔ اس کے لمبے لمبے ناخنوں میں ہر وقت میل بھرا رہتا تھا۔ اس کی داڑھی بے حد کریہہ تھی جس کے بال چکناہٹ کے باعث آپس میں چپکے رہتے تھے۔ یہاں اس بات کا ذکر دلچسپی سے خالی نہ ہوگا کہ راسپوٹین کے اسی عجیب و غریب حلیے کی وجہ سے لوگ دور دراز سے اس کے لئے آتے تحفے کے طور پر شراب اور مچھلیاں پیش کرتے۔ اور شب بھری کے لئے اپنے ہاں مدعو کرتے تاکہ وہ [illegible] راسپوٹین کے پاس [illegible] خوبصورت عورت آجاتی تو راسپوٹین کی یہ کوشش ہوتی کہ وہ اپنے آپ کو اس کے حوالے کر دے۔ اس کی

زیادہ تر راتیں ایسی ہی دعوتوں میں گزرتیں جو تمام رات جاری رہتیں۔ ان دعوتوں [illegible] راسپوتین کی ناپاک خواہشوں کو پورا کر [illegible] روس کی بیشتر باوقف قحبہ خانوں میں گزرتیں۔

۱۹۰۵ء میں جب راسپوتین کی عمر تینتیس برس کی تھی۔ اچانک ایک دعوت میں راسپوتین کی ملاقات روس کے بادشاہ نکولس دوم (زار روس) اور اس کی بیوی الیگزینڈرا سے ہوئی۔ اس وقت الیگزینڈرا کی چار بیٹیاں تھیں۔ اور مقام ملاقات سینٹ پیٹرز برگ (لینن گراد) تھا۔ اس ملاقات کے دوران راسپوتین نے الیگزینڈرا کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے پیش گوئی کی کہ وہ اس دفعہ لڑکے کو جنم دے گی اسی برس جب الیگزینڈرا کے ہاں لڑکا تولد ہوا تو الیگزینڈرا نہ صرف راسپوتین کی غیر معمولی پُر اسرار مخفی قوتوں سے بے حد متاثر ہوئی بلکہ اس نے راسپوتین کی خواہش کے مطابق اس بچے کا نام زارویچ الیکسس رکھا۔ تاہم اس بچے کو ایک ہیمو فلیا (جریان خون) تھی جس کی وجہ سے زارویچ الیکسس کو دورے پڑتے تھے۔ واقعات بتاتے ہیں کہ راسپوتین نے اپنی غیر معمولی پُراسرار قوتوں کی مدد سے زارویچ الیکسس کے ان دوروں کا کامیاب علاج کیا۔ جس سے الیگزینڈرا کا راسپوتین پر اعتماد اور پختہ ہو گیا اور اسے یقین ہو گیا کہ راسپوتین غیر معمولی پُراسرار قوتوں اور طاقتوں کا مالک ہے۔ اور وہ خدا کی طرف سے بھیجا گیا ہے۔

راسپوتین جس کے نزدیک اخلاق ایک فضول سی چیز تھی۔ الیگزینڈرا کو ماں کہا کرتا تھا الیگزینڈرا واحد عورت تھی جس کے بارے میں راسپوتین نے اخلاق کا ضابطہ برقرار رکھا۔ اگرچہ بعض مورخین نے اسے غلط بتایا ہے۔ تاہم الیگزینڈرا کی مدد سے حکومت روس کی سیاست راسپوتین کے ہاتھوں کھلونا بن گئی۔ راسپوتین کو روس کی حکومت میں دخل اندازی کا موقع مل گیا اور اس نے روس کی انتظامیہ میں اپنی خواہش کے مطابق تبدیلیاں کروائیں جس کا وہ مدت سے خواہشمند تھا۔

۱۹۱۶ء میں جب روس کے شرفا نے یہ محسوس کیا کہ راسپوتین وزیر اعظم بننے کے منصوبے بنا رہا ہے۔ تو وہ پریشان ہو گئے۔ اور ان کا وفد فوری طور پر زار روس کے پاس گیا۔ اس وفد نے الیگزینڈرا کے چال چلن پر شبہ کا اظہار کیا اور درخواست کی کہ راسپوتین کو روس کی حکومت و سیاست میں دخل اندازی کے علاوہ بُرے عقیدے اور ترغیب گناہ کے پرچار سے روکا جائے۔ مگر یہ واقعہ ہے کہ زار روس نے اس وفد کی کوئی بات نہ سنی کیوں کہ اس کی بیوی الیگزینڈرا پوری طرح راسپوتین کی مدّاح تھی۔ اس کا یہ کہنا تھا کہ راسپوتین خدا کا بھیجا ہوا ہے۔ چنانچہ سینٹ پیٹرز برگ (لینن گراڈ) میں خاص شرفا نے روس کو بچانے کے لئے آخری سازش کا انتظام کیا۔ اس پروگرام میں سب سے پہلے راسپوتین کا قتل تھا۔

۱۷ دسمبر کی رات کو روس کے شہزادے فیلیکس یوسوپاؤ کے علاوہ پرنس متری نے رقص و سرود اور شراب کی دعوت میں راسپوتین کو مدعو کیا تاکہ اسے قتل کیا جا سکے پال سیتپانوف بھی موجود تھا۔

یوسوپاؤ:۔ بلند آسمانوں کی قسم! آج سرد طوفانی شب میں میں نے تمہیں اس لئے زحمت دی ہے اور بطور خاص بلایا ہے کہ میں تمہیں اپنا دوست سمجھتا ہوں اور میں نے تم پر بے شمار احسان کئے ہیں۔ یہ بجا ہے کہ تمہاری جد و جہد بالاتر ہے۔ تم خون بہانے کے ماہر ہو۔ اور جنون کی حد تک دلیر ہو۔ بلکہ میں یہ بھی جانتا ہوں کہ تم وطن پرست اور میرے وفادار بھی ہو۔ میں نے جو کام تمہارے سپرد کیا تم نے نہایت احتیاط سے سرانجام دیا۔ اور مجھے ایسے کاموں سے بھی روکا جو غلط تھے۔ لہٰذا اس صورت حالات میں جب کہ گناہ اور جنگ کی تباہ کاریاں عروج پر ہیں۔ میں جزوی طور پر تم سے ایک قربانی چاہتا ہوں۔

پال سیتپانوف:۔ قربانی۔۔ کون سی قربانی۔۔؟ میں بسر و چشم حاضر ہوں فرمائیے!

یوسوپاؤ:۔ صورت حال یہ ہے کہ راسپوتین ایک بدکار، بدخصلت اور بد اعمال شخص ہے جو ہر وقت شراب کے نشے میں چور رہتا ہے اور ترغیب گناہ کے پرچار کے ساتھ ساتھ اپنی ناپاک خواہشوں کو بھی پورا کرنے کا عادی ہے۔ اس کے پاس جاسوسوں اور وحشیوں کا ایک ایسا گروہ بھی موجود ہے جو قوم کے اکابرین کو جلاوطن کر چکا ہے۔ حکومت کی جڑیں کاٹ رہا ہے۔ اور عوام کو بے راہروی اور برائی پر مائل کر رہا ہے۔ اگرچہ اس پلید شخص نے بے شمار عورتوں کی عصمت دری کی۔ لاتعداد معزز انسانوں کی توہین کی اور ان گنت نوجوانوں کو بے دردی کے ساتھ جنگ میں ہلاک کروا دیا۔ لیکن پھر بھی نہ جانے کیا بات ہے کہ بادشاہ اس شیطان کی بے حیائی بدکاری اور بد اعمالی کو روکنے کی بجائے اس کی ہر خواہش کو بجا لانا اپنی زندگی کا فرض سمجھتا ہے اور یہ امر بہر پہلو قدرے اہم ہے کہ ملکہ الیگزینڈرا بھی راسپوتین کے اشارہ چشم و ابرو پر چل رہی ہے۔ شاہی محل کی تمام کنیزیں الیگزینڈرا کی تمام خوبصورت سہیلیاں اور خاندانِ شاہی کی تمام بیگمات اس کی گرویدہ اور پرستار ہیں۔ اس کا حکم ماننے کے لئے بجان و دل تیار ہیں۔ تم جانتے ہو اگر یہی لیل و نہار رہے تو ملک کی حالت اور ناگفتہ بہ ہو جائے گی۔ بدامنی اور قحط کا دور دورہ ہو جائے گا اور فوج ایک بے مقصد لڑائی لڑتے لڑتے اکتا جائے گی چنانچہ میں نے سوچا ہے کہ ملک کو بچانے اور پھیلی ہوئی بے حیائی اور بے چینی کو دور کرنے کے لئے اب ایک ہی راستہ رہ گیا ہے اور وہ یہ ہے کہ اس نابکار اور ناخلف شخص کو آج رات پو پھٹنے سے پہلے ہی موت کے گھاٹ اتار دیا جائے۔ خواہ اس کا نتیجہ ہمارے لئے باعث مسرت ہو یا رنج و غم!

پال سیتپانوف:۔ بہتر۔ آپ اس کا فیصلہ مجھ پر چھوڑ دیں کیوں کہ اس قسم کا کام میرے لئے اتنا آسان ہے جتنا ملاح کے ساتھ کشتی لے جانا!

یوسوپاؤ:۔ کیا تم سچ کہہ رہے ہو۔ اور اب بھی اپنی جگہ پر مستعد ہو؟

پال سیتپانوف:۔ اس میں تعجب کی کون سی بات

ہے۔ آپ فکر نہ کریں میں ہر طرح سے تیار ہوں۔

یوسوپاؤ :۔ ایسا نہ ہو کہ ہمارا تیر نشانے پر نہ بیٹھے اور وہ شیطان ہمارے جال سے بچ کر نکل جائے یا ہمارے تمام کے تمام منصوبے ادھورے کے ادھورے رہ جائیں۔

پال سیتپانوف :۔ میرا خیال ہے ایسا نہ ہوگا کیونکہ ہم اسے ضیافت کے تمام لذیذ و نفیس کھانوں کے علاوہ موسیقی اور شراب پیش کریں گے اور یہ لالچ بھی دیں گے کہ تخلیہ میں ایک ایسی خوبصورت لڑکی بھی آپ کی منتظر ہے جو ابھی تک کنواری ہے آپ کو بے پناہ چاہتی ہے اور آپ کی ہی گرویدہ ہے۔

یوسوپاؤ :۔ اچھا جیسے تمہاری مرضی۔ مگر اس کے باوجود نہ جانے کیوں میرا دل گھبرا رہا ہے کہ وہ ایسے دلفریب انتظامات دیکھ کر ٹھٹک نہ جائے اور یہ بھی ممکن ہو سکتا ہے کہ شاید وہ معشوقہ کے ساتھ شب بسری سے انکار کر دے۔

پال سیتپانوف :۔ یہ امر بالکل فضول ہے۔ اور اس قسم کی پریشانی اور الجھن کے کوئی آثار نہیں بلکہ حقیقت تو یہ ہے کہ جہاں عیش و عشرت کا سامان ہو، وہاں وہ کبھی دیر نہیں کرتا۔ وہ کسی نہ کسی حیلے بہانے سے عین وقت پر پہونچ جایا کرتا ہے اور وہ حرام زادہ عورتوں پر یوں ٹوٹتا ہے جیسے شہد پر مکھیاں!

یوسوپاؤ :۔ اس رائے سے مجھے بھی اتفاق ہے۔ مگر اس وقت جب کہ رات کے گیارہ بج چکے ہیں۔ تم ہی بتاؤ، کیا طے کیا جائے؟

پال سیتپانوف :۔ یہی سوچ رہا ہوں مگر سب سے بڑا حربہ جو میرے دل میں آیا ہے وہ یہ ہے کہ ہم شراب کی بوتلوں میں سے اس کی پسندیدہ شراب میں زہر ملا کر اسے پلا دیں گے اور جو اس کا اثر ہوگا ظاہر ہے۔ راسپوتین سسک سسک کر مر جائے گا اور اس کی لاش باہر صحن میں پڑی ہوگی۔

یوسوپاؤ :۔ تمہارا خیال ٹھیک ہے مگر سوال پھر وہی پیدا ہوتا ہے کہ اگر عین وقت پر شراب کی بوتلوں میں کوئی رد و بدل اور گڑبڑ ہو گئی تو؟

پال سیتپانوف :۔ اول تو وہ نہایت درجہ پیچیدہ اور عیز ذمہ دار ہے۔ تاہم پھر بھی میں بطور احتیاط زہر والی بوتل کو نشان لگائے دیتا ہوں۔

یوسوپاؤ :۔ ہاں۔ زہر ڈال دو۔ اور نشان لگا دو تاکہ کسی غلطی کا احتمال نہ ہو سکے۔

شراب اور کیک میں سریع الاثر زہر سیانائیڈ شامل کر دیا گیا۔ یہ زہر اتنی مقدار میں تھا کہ اس سے بآسانی کئی آدمیوں کو موت کے گھاٹ اتارا جا سکتا تھا۔ مگر جیسے ہی وہ اس کام سے فارغ ہوئے اچانک راسپوتین کی کار شاہی محل کے خفیہ دروازے پر آ کر رکی۔ راسپوتین اس وقت سیاہ لباس میں ملبوس تھا اور جواہرات سے مرصع طلائی صلیب اس کے سینے پر لٹک رہی تھی۔

یوسوپاؤ :۔ آیئے۔ آیئے۔ بسر و چشم تشریف لایئے۔ ہم آپ ہی کا انتظار کرتے کرتے گھبرا گئے تھے اور آپ ہی کی راہ دیکھ رہے تھے۔

راسپوتین :۔ مجھے اس کا بہت افسوس ہے کہ تم میرا انتظار کرتے رہے۔ مگر میں کیا کرتا میری طبیعت ہی خراب تھی اسی وجہ سے اتنی دیر ہو گئی۔

یوسوپاؤ :۔ تعجب ہے مقدس باپ سب کچھ آپ کے اختیار میں ہے۔

راسپوتین :۔ میں جانتا ہوں، یہ درست ہے مگر اس میں تعجب کی کوئی بات نہیں، ایسا ہوتا ہی رہتا ہے مسلسل کوشش کے باوجود میں اس کوتاہی کی نوعیت کو نہیں سمجھ سکا البتہ اتنا ضرور جانتا ہوں کہ مجھے تخلیہ کی ضرورت ہے اور میں آج بھی کسی ایسی حسین آنکھوں والی خوبصورت دوشیزہ سے ہم آغوش ہونے کیلئے بے حد مضطرب، بے قرار اور بے تاب ہوں جو میری جادوانی طاقتوں پر ایمان رکھتی ہو۔ اور جو اپنا وجود میرے رحم و کرم پر چھوڑ دینے کی قائل ہو۔

مگر . . . مگر یہ کون ہیں اور ان کا کیا نام ہے

یوسوپاؤ :۔ مقدس باپ آپ فکر نہ کریں یہ میرے بہت ہی پرانے دوست پال سیتپانوف ہیں، جنہوں نے آج رات کی اس دعوت کو دلفریب بنانے کیلئے رقص، شراب اور شباب کا پورا پورا بند و بست کیا ہے اور اس پر مستزاد یہ کہ پال آپ کے لئے ایک نہایت ہی حسین و جمیل، نوخیز، سحر طراز اور طلسماتی لڑکی کو بھی لایا ہے جس کی عمر بمشکل سولہ سترہ برس کے لگ بھگ ہے۔ شاید وہ پری زاد ہے اس کا جسم ایک شاہکار کی طرح بے عیب ہے نہایت ملائم ہے۔ اس کے ہاتھ ریشم کی طرح نرم ہیں اور وہ ایمان کو متزلزل کر دینے کی حد تک معصوم اور حسین ہے یقین جانیئے وہ حقیقت میں افروڈیٹس اور بہار کی دیوی ہے۔ وہ جب مسکراتی ہے تو اس کی آنکھوں میں اودے اودے نیلے نیلے رنگ جھلکتے ہیں۔ اس کے دونوں رخساروں میں ننھے ننھے گڑھے پڑ جاتے ہیں جو اس کے حسن کی چاشنی کو دوبالا کر دیتے ہیں۔ میرا مطلب ہے اگرچہ وہ ابھی روحانی مسرت سے ہمکنار نہیں لیکن پھر بھی وہ شدید ترین محبت کی متلاشی ہے۔ وہ ہمیشہ کے لئے آرزو مند ہے اور وہ آپ کے ایک اشارہ پر قربان ہونے کے لئے تیار ہے۔

راسپوتین :۔ کون سی لڑکی؟

یوسوپاؤ :۔ وہی لڑکی جو شہر میں مصوری کے ساتھ ساتھ ظروف پر نقش نگاری کا کام بھی کرتی ہے۔ اور جس کے نشاط انگیز نغموں کی شہرت ملک کے چپے چپے میں پھیلی ہوئی ہے۔

راسپوتین :۔ ظاہر ہے میں نے بھی اس کے نغموں کی تعریف سنی ہے۔ واقعی وہ اچھا گاتا گاتی ہے اور اس کی آواز کوئل کی آواز سے بھی زیادہ شیریں ہے۔

یوسوپاؤ :۔ ہاں میرا بھی یہی خیال ہے مقدس باپ۔ کوئی چیز اس وقت تک مشہور نہیں ہو سکتی جب تک اس میں کوئی خوبی نہ ہو۔

راسپوتین :۔ زہریلی شراب ہونٹوں سے لگاتے ہوئے) یہ میری عین خوش قسمتی اور خوش نصیبی ہے مگر اس لڑکی کا نام کیا ہے۔؟

یوسوپاؤ :۔ میں اس کے نام کا تصور تو نہیں کر سکتا البتہ اتنا جانتا ہوں کہ اس کی آواز میں حسرت ہے اس کے لہجے میں التجا ہے اور اس کے بدن کا انگ انگ آپ کے لئے وقف ہے۔

راسپوتین :۔ یہ آپ نے کیوں کر اور کیسے جانا؟

یوسوپاؤ :۔ اس کے موجودہ رویے سے، موجودہ حالت سے موجودہ بے چینی سے اور کس سے!

راسپوتین :۔ وہ یہاں کیوں آئی ہے؟

یوسوپاؤ :- آپ کی ... ایک ہیں کہ وہ آپ کو ملنا چاہتی ہے۔ آپ سے بے پناہ محبت کرتی ہے اور آپ کی بے حد مداح، گرویدہ اور پرستار ہے۔

راسپوتین :- کیسی ہے؟

یوسوپاؤ :- مادرِ بابل کے مہرباں سینے کی قسم۔ گو وہ ذرا ذرا سی بات پر روٹھ جاتی ہے لیکن وہ نہایت ہی حسین و جمیل اور دلآویز لڑکی ہے۔ اس کے لانبے لانبے عطرفشاں بال کمر تک پھیلے ہوئے ہیں اس کا چہرہ نہایت خوبصورت اور شاداب ہے اگرچہ وہ حسن و نغمہ کی ملکہ ہے قدم قدم پر نشہ بکھیرتی ہے مگر یہاں وہ شہزادی کی سہیلی اور اس کی ہمراز بھی ہے۔

راسپوتین :- (باقی ماندہ زہریلی شراب پیتے ہوئے) حیرت ہے۔ آخر وہ لڑکی رات کی تاریکی میں پہلے کیوں نہیں آئی۔ اور اب ملنے کے لیے اتنی بے تاب اور مجبور کیوں ہے؟

یوسوپاؤ :- آخر اس تغیر کی کوئی وجہ تو ہوگی!

راسپوتین :- بس یہی پریشانی ہے، جس کو سمجھنے کے لئے ایک خاص دل اور ایک خاص دماغ کی ضرورت ہے۔ اور یہ دونوں چیزیں خدائے ذوالجلال نے مجھے بخشی ہیں۔ جیسا کہ تم جانتے ہو۔ بظاہر لوگ مجھے جادوگر سمجھتے ہیں کہ میں شہروں کو خاک کے تودوں، آبادیوں کو لق و دق صحرا اور بارونق ملکوں کو ہولناک قبرستان بنانے کی صلاحیت رکھتا ہوں، مگر وہ یہ نہیں سمجھتے کہ میں تغیر گو اور رحملی دوراں ہوں۔ پُراسرار روحانی طاقتوں اور قوتوں کا مالک ہوں اس نے مجھے ہدایت کار بنایا۔ اور امن و نجات کی کلید میرے ہاتھ میں دی ہے۔ دُنیا و آخرت میں میرا بلند مقام ہے۔ اور میں خُدا کا بھیجا ہُوا پیغمبر ہوں۔

سرخ لالہ فرز زہریلی شراب پینے کے بعد راسپوتین نے میز پر سے کیک اٹھا کر کھائے، ڈکارا۔ اور کہا کہ مجھے اس لڑکی کے پاس لے چلو جو مجھ سے ملنے کی اشتیاق مند ہے۔ شہزادہ فیلیکس یوسوپاؤ، پرنس منتری اور سپال ستیپانوف سخت حیران تھے کہ راسپوتین اتنا زہر پینے کے باوجود بھی زندہ ہے اور بالکل تندرست ہے چنانچہ شہزادہ فیلیکس یوسوپاؤ نے پستول نکالا۔ اور راسپوتین پر فائر کیا، لیکن اس کے باوجود بھی راسپوتین زندہ کھڑا رہا۔ پال ستیپانوف جو خرافات کا قائل نہ تھا خنجر لے کر چیتے کی طرح اُچھلا۔ اور اس نے راسپوتین کی پیٹھ میں خنجر دستے تک اُتار دیا۔

تھوڑی دیر کے بعد راسپوتین گر پڑا۔ شہزادے کو اب بھی اس کی موت پر شک تھا۔ اس نے لکڑی کا ڈنڈہ اٹھایا۔ اور راسپوتین کی کھوپڑی پاش پاش کر دیا۔

کہتے ہیں راسپوتین کو اٹھا کر وہ نزدیک سے گزرنے والے دریا نیوا ... میں پھینک دیا ... اسے کہ

غـــزل

پہلے احسان سفینے کا اُتارا جائے
پھر وہاں جائیں جہاں تک کہ کنارا جائے

خم گردن نہ مٹے سر کا سہارا جائے
ہارنے والو کسی ڈھنگ سے ہارا جائے

حاکمِ شہر نے رکھا ہے خیال اب کے برس
جسم مصلوب نہ ہوں سوچ کو مارا جائے

خوش جمالوں کے در و بام ہُوئے دُور ایسے
نہ وہاں لفظ ہی پہنچیں نہ اشارا جائے

کھو گیا ہُوں میں زرد سیم کے ویرانوں میں
مجھ کو آفاق میں ہر سمت پکارا جائے

گردِ حالات نے کیا حالتِ جاناں کر دی
پھر سے ان ابرو و مژگاں کو سنوارا جائے

اپنی نسلوں کے لئے دید کی صورت ہے یہی
آشبِ عمر کو آنکھوں میں گزارا جائے

چاندنی جرم ہے گر قریۂ شب میں جمشید
چاند پھر آج مری چھت پہ اُتارا جائے

جمشید مسرور
ایڈیٹر "بازگشت"
اوسلو، ناروے

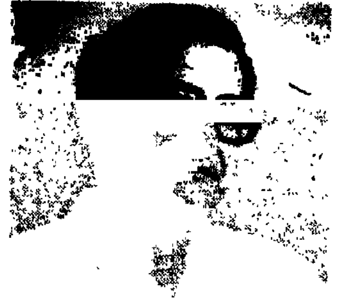
ے گئے۔ اس وقت راسپوتین کے جسم میں جان کی
ق تھی۔ راسپوتین نے اپنا ایک ہاتھ ہوا میں
ند کیا اور سینے پر صلیب کا نشان بنایا۔ اس
بعد شاہی سازش والوں نے اُسے دریا میں پھینک
برف کے نیچے دھکیل دیا۔ کئی ہفتوں کے بعد

جب اس کی لاش نکالی گئی تو ایسا معلوم ہوتا تھا کہ وہ زندہ
رہنے کی کوشش کر رہا ہے۔ تاہم ڈاکٹروں میں یہ بات اب تک
کوئی بھی ثابت نہیں کر سکا کہ زہر خورانی کے بعد پستول
کی گولیاں لگنے اور کھوپڑی ٹکڑے ٹکڑے ہونے
کے باوجود راسپوتین ایک ہفتہ تک کیسے زندہ رہا؟

جب راسپوتین کی لاش کو باہر نکالا گیا۔ تو لاش
کے معائنے پر معلوم ہوا کہ وہ ڈوبنے سے مرا تھا
اس کے ہاتھ ایسی حالت میں تھے جیسے وہ ڈوبنے سے
بچاؤ کے لئے ہاتھ پاؤں مار رہا ہو۔ ۔ ۔ !

ماہیا

دیپک قمر



فرصت کی سوالی ہے
یہ بھیڑ بھری نگری
تنہائی سے خالی ہے

کل پڑتی نہیں دن بھر
آکاش ہے تانبے سا
تپتی ہے زمیں دن بھر

کہنے سے وہ شرماتے
ملنے کے کئی رستے
دیوار پہ لکھ جاتے

کیا وقت کی قیمت ہے
مرنے سے جو گھبرائے
ہر کام مصیبت ہے

ہر رات کے خوابوں میں
ملنے کا مزا لینا
بس باتوں ہی باتوں میں

سب مال ہے اوروں کا
بازار سی ہے دنیا
جوں تھانگہ ہو چوروں کا

آوارہ زمانے کے
ذمہ دار ستاروں سے
جن شور مچانے سے

میں خود ہی مکمل ہوں
کچھ اور نہ اب مانگوں
سب کہتے ہیں پاگل ہوں

ایندھن کو بچائیں گے
سب شہر کے مُردوں کو
اک ساتھ جلائیں گے

سیدھا ہو کہ اُلٹا ہو
ہونا تو ضروری ہے
کچھ بھی ہو وہ کیسا ہو

یہ عام نہیں رستہ
گزرا ہے کوئی کیسے
کس نے ہے یہاں لکھا

کچھ پل کی خوشی دیدوں
کچھ آنسو ترے لے کر
پھولوں کی ہنسی دیدوں

من مست ہے گہری ہے
سُن کر بھی نہیں سُنتی
دیوار یہ بہری ہے

بستہ جھولی ہے رنگوں کا
تتلی سی نقشہ چنچل
فوارہ ہے خوشیوں کا

رشید احمد صدیقی کے خطوط

حسن ضیاء

بیسویں صدی کے اُردو نثر نگاروں میں رشید احمد صدیقی کا نام بہت اہم ہے۔ اس دور کے اُردو طنز و مزاح کا ہر تذکرہ اُن کے تذکرے کے بغیر نامکمل رہے گا۔ اس صدی کے ابتدا میں اُن کی ادبی زندگی کا آغاز ہُوا۔ شروع سے ہی اُن کا میدان طنز و مزاح رہا۔ اُن کی بیشتر تحریریں اسی رنگ میں رنگی ہوئی ہیں۔ اُن کی تنقید بھی اُن کے اس مزاج سے دامن نہیں بچا سکی ہے۔

رشید احمد صدیقی مڑیاہو ضلع جونپور یُوپی کے رہنے والے تھے۔ اُن کی جائے پیدائش بیریا ضلع بلیا یُوپی میں ۲۴ر دسمبر ۱۸۹۲ء کو ہوئی۔ ابتدائی تعلیم جونپور میں ہوئی۔ ۱۹۱۵ء میں اُنھوں نے محمڈن اینگلو اورینٹل کالج علی گڑھ سے بی۔ اے کا امتحان پاس کیا۔ ۱۹۲۰ء میں یہ کالج مسلم یونیورسٹی بن گیا۔ یہیں سے ۱۹۲۱ء میں اُنھوں نے فارسی میں ایم۔ اے کیا۔ شروع میں اُنھوں نے ہائی اسکول میں مدرّسی کی۔ ۱۹۲۲ء میں وہ اُردو مولوی کی حیثیت سے کام کرنے لگے۔ بعد میں وہ علی گڑھ مسلم یونیورسٹی میں لکچرر بنے۔ ۱۹۲۵ء میں وہ ریڈر ہو گئے... اور ۱۹۵۲ء میں پروفیسر بنے۔ بحیثیت پروفیسر اور صدر شعبۂ اُردو یکم مئی ۱۹۵۸ء کو یونیورسٹی کی ملازمت سے سبکدوش ہوئے۔ ۱۵ر جنوری ۱۹۷۷ء کو علی گڑھ میں ہی طویل علالت کے بعد انتقال ہُوا۔ اُن کی تصانیف کی تعداد ۱۴ ہے۔ اُن میں مضامینِ رشید، گنج ہائے گراں مایہ، ہم نفسانِ رفتہ، آشفتہ بیانی میری اور غالب کی شخصیت اور شاعری بطورِ خاص قابلِ ذکر ہیں۔

خط یا مراسلہ بنیادی طور پر دو افراد کے درمیان ایک قسم کا مکالمہ ہے جو زیادہ تر غیر رسمی اور نجی نوعیت کا حامل ہوتا ہے۔ اس لیے یا مضمون وغیرہ سے یہ اِن معنوں میں بھی مختلف ہوتا ہے کہ اس میں مکتوب نگار کی مخاطبت مکتوب الیہ تک محدود ہوتی ہے۔ خط میں لکھنے والے کی شخصیت اکثر آپ بیتی سے بھی زیادہ کھل کر سامنے آتی ہے۔ خاص کر بے تکلف احباب کو لکھے گئے نجی خطوط مکتوب نگار کی زندگی کے بارے میں معلومات حاصل کرنے، اس کی شخصیت کا نفسیاتی مطالعہ کرنے اور اس کے طرزِ فکر کو سمجھنے کا اہم ذریعہ کہلاتے ہیں۔

بحیثیت مجموعی رشید صاحب کی تحریروں سے جو شخصیت اُبھرتی ہے وہ بظاہر پرانی اقدار کے آدمی کی ہے۔ نئی چیزیں ان کو کم بھاتی ہیں۔ تہذیب و شائستگی، وضع داری، حفظِ مراتب اور اصول و ضوابط کی پابندی اور تنہا نشینی اُن کی شخصیت کے نمایاں پہلو ہیں۔ وہ زیادہ تر بیمار رہے، لیکن اُن کی کسی تحریر سے بیمار ذہن کی عکاسی نہیں ہوتی۔ مگر

کے نصف آخر میں تو بالکل عزلت گزیں ہو گئے تھے۔ مخصوص احباب کے علاوہ بقیہ لوگوں سے ملنے جلنے سے پرہیز کرتے تھے۔ علی گڑھ سے جانا ہوتا تو آخری گاڑی سے روانہ ہوتے اور پہلی گاڑی سے علی گڑھ واپس آجاتے تھے۔ اکثر ایسے احباب تک سے اُن کی ملاقات کا ذریعہ خط ہی تھے جن کی رہائش اُن کے گھر کے پاس ہی تھی۔

رشید صاحب اپنے خطوں کی اشاعت کے سخت مخالف تھے۔ وہ اسے قطعی نجی چیز سمجھتے تھے جس میں وہ مکتوب الیہ کے علاوہ کسی اور کی شرکت کو بہت ناپسند کرتے تھے۔ اُن کے مکاتیب کو اشاعت کی غرض سے جمع کرنے کا کام اُن کی زندگی میں ہی شروع ہو گیا تھا۔ اس پر اپنا ردِ عمل ظاہر کرتے ہوئے اُنھوں نے لکھا تھا کہ کسی کے نجی خطوط چھاپنا غسل خانے میں تاک جھانک جیسی بات ہے جو قطعی غیر اخلاقی ہے۔ وہ ان خطوں تک کو محفوظ نہیں رکھتے تھے جو لوگ انھیں بھیجتے تھے۔

عبدالطیف اعظمی کے نام ۱۰ر اگست ۱۹۶۱ء کو لکھے خط میں کہتے ہیں:

"... میں بھی اپنی اس عادت پر نادم ہوں کہ کسی کے خط محفوظ نہیں رکھتا۔ جلد سے جلد جواب دے کر تلف کر دیتا ہوں۔ کبھی کبھی کسی کے عتاب کے خط آجاتے ہیں تو جواب لکھ کر انھیں کو واپس کر دیتا ہوں کہ ایسا خط لکھنے والے کو ان کی نجات نہ ہو۔"

نجی خطوں کو عام کرنے کی اُن کی مخالفت کا اندازہ ڈاکٹر خلیل الرحمٰن اعظمی کے نام اُنھی کے خط کے جواب میں لکھے گئے ۵ر جنوری ۱۹۶۲ء کے اِس خط سے ہوتا ہے:

"اس خط کو آپ ہی رکھ لیں میں ایسے خطوں کو اپنے پاس نہیں رکھنا چاہتا جن میں لکھنے والے نے نجی باتیں لکھی ہوں۔ اور اس کا امکان ہو کہ جس کو لکھا گیا ہے وہ کبھی اس سے اس طور پر فائدہ اُٹھائے کہ لکھنے والے کو شرمساری ہو۔"

رشید صاحب کے خطوط کے جو مجموعے اب تک شائع ہوئے ہیں وہ اس طرح ہیں:

مکاتیبِ رشید احمد صدیقی (مرتبہ پروفیسر خلیق احمد نظامی)

مکاتیبِ رشید (مرتبہ ڈاکٹر سلیمان اطہر جاوید)

رقعاتِ رشید صدیقی (مرتبہ پروفیسر مسعود حسین خاں) اور

خطوطِ رشید احمد صدیقی (مرتبہ لطیف الزماں خاں)

ان تمام مجموعوں میں لطیف الزماں صاحب کے مرتب کردہ مجموعے میں نجی نوعیت کے خطوط کی تعداد سب سے زیادہ ہے۔ اِن خطوں میں دوسرے ہی رشید احمد صدیقی نظر آتے ہیں اور... گھریلو زندگی پر پڑا پردہ اُٹھ جاتا ہے۔ اِن خطوں میں انداز بے تکلفانہ اور عظمت پسندانہ ہے اور شخصیت کا تضاد صاف نظر آتا ہے۔ گو یہ کوئی بڑی بات نہیں، کیونکہ تضاد خود زندگی میں ہے اور انسان مجموعۂ اضداد ہے۔

یہ خطوط ان کی شخصیت کے بتدریج ارتقا کے آئینہ دار بھی ہیں۔ مثال کے طور پر مولانا عبدالماجد دریا آبادی کو ابتدائی دور یعنی ۱۹۲۳ء کے آس پاس جو خط لکھے گئے ہیں، ان میں انداز نیازمندانہ ہے جب کہ بقیہ دور کے خط بے تکلفانہ اور دوستانہ ہیں۔

بے تکلف احباب کے نام خطوں میں اظہارِ حال کی کیفیت ملتی ہے۔ ۹ر اگست ۱۹۶۰ء کو مسعود حسین صاحب کو ایک خط میں لکھتے ہیں:

"ایک زمانہ تھا کہ اچھے گلاب، اچھے قالین اور چینی کے اچھے ظروف جمع کرنے کا شوق تھا۔ گراکری چوری ہو گئی۔ گلابوں کا شوق کسان کو منتقل ہو گیا۔ قالین کے بجائے اب چٹائیاں بچھانے لگا ہوں۔ خانہ آرائی کے لئے کیا دیدۂ سپید اور کیا حجلۂ ماہ کنعاں۔"

۱۱ر اپریل ۱۹۶۳ء کا ایک خط دیکھئے۔ کس طرح اس پہلو سی سکات سے بہ سرپا ٹھی ہیں:

"سالہا سال سے کچھ اس طرح کا حال ہے جیسے کسی نے زندگی کے سارے ہرے بھرے درخت کاٹ کر گرا دیے ہوں اور ان میں آگ لگا دی ہو۔ آپ جانتے ہیں گیلی لکڑی کتنے دھیرے دھیرے کتنے دنوں تک سلگتی رہتی ہے اور اس سے کیسا تاریک دم گھٹنے والا دھواں اُٹھتا رہتا ہے۔"

رشید صاحب کو اُردو تحریک سے گہری دلچسپی تھی گو یہ دلچسپی نظریاتی سطح تک محدود تھی۔ اُردو کی ترویج و فروغ کے کاموں کی پیش رفت سے وہ خود کو مسلسل باخبر رکھتے تھے۔ وہ اُردو کے مخالفین کو منہ توڑ جواب دینے کے قائل تھے ہر چند کہ اپنی اس رائے کو عام کرنے سے جھجکتے تھے۔ اُردو کی مخالفت میں شائع شدہ کسی تحریر کے جواب میں لکھے گئے ایک مضمون کو سراہتے ہوئے ایک خط میں لکھتے ہیں:

"مضمون اور اس کا رنگ و آہنگ معیاری تو نہیں ہے لیکن میرا خیال ہے کہ کبھی کبھی اس کی ضرورت ہوتی ہے۔ بعض ذہنیتیں اسی انداز گفتگو کی مستحق ہوتی ہیں اور قابو میں رکھی جا سکتی ہیں۔ کیا ضرور ہے کہ ایوانِ ادب اور میدانِ مصاف ہی میں نہیں، کبھی کبھی مخالفوں کا مقابلہ بازار میں بھی کر لیا جائے۔"

لیکن رشید صاحب لسانی تنگ نظری اور تعصب سے دور تھے۔ سابق مشرقی پاکستان میں اُردو کو مسلط کیے جانے کے بھی وہ مخالف تھے۔ ۲۴ر ستمبر ۱۹۷۱ء کو لکھے گئے ایک خط میں پروفیسر مسعود حسین خاں کو لکھتے ہیں:

"اُردو والے جس طور پر اُردو کو ایک غیر رضامند طبقہ یا خطے پر تھوپنا یا بنگالی کو بے حیثیت کرنا چاہتے تھے اس کو میں کب پسند کرتا تھا۔ ایسوں کی مخالفت میں آپ نے جو کچھ (لکھا ہے) وہ اپنی جگہ پر بالکل درست ہے لیکن آج کل جن حالات کا سامنا ہے اس میں نہ لکھتے تو بہتر تھا۔ چاہتا ہوں کہ اُردو سے آپ کی جذباتی وابستگی ہر حال میں قائم رہے۔"

رشید صاحب کے خطوں میں علی گڑھ کی

موضوعات پر بھی بے تکلفانہ اظہارِ خیال ملتا ہے۔ حبیب احمد صدیقی کے نام ۳۰ مئی سنہ ۱۹۵۰ء کے ایک خط میں لکھتے ہیں:

"اقبال سے متعلق آپ نے GIBBS کے جو اقتباسات بھیجے ہیں وہ آنکھوں کی تکلیف کے باعث ان میں سے بیشتر کا مطالعہ نہ کر سکا۔ پھر بھی کچھ باتیں ذہن میں محفوظ رہ گئی ہیں، لیکن ان پر براہِ راست گفتگو نہیں کر سکتا۔ لکھنے کی سکت محدود ہے۔ دراصل فلسفہ اور تصوف سے میں کبھی مانوس نہیں ہوا۔ ذہن اور تخیل کو ان سے بالیدگی اور سیرابی نہیں ملی بلکہ ایک طرح کی فرسودگی اور تھکن محسوس ہوئی۔"

آگے لکھتے ہیں:

"فلسفی یا صوفی ہونا میرے نزدیک بڑے شاعر ہونے کا امتیاز نہیں۔ اقبال نے اپنے کلام کو دلکش و پاکیزہ اور بلند رکھنے میں ان علوم و فنون سے کام لیا جس کی جہاں تک وہ ضرورت سمجھتے تھے۔ انھوں نے شاعری کو بنیادی اور فلسفہ و تصوف کو فروعی یا اضافی حیثیت دی۔ وہ فلسفے یا تصوف کے پابند نہیں ہوئے بلکہ حسبِ ضرورت فلسفے یا تصوف کو اپنا پابند رکھا۔ یہی سبب ہے کہ ان کے کلام میں جا بجا فلسفے یا تصوف کی جامعیت یا عرفان نہیں بلکہ تضاد اور تخالف ملتا ہے۔ اچھا اور بڑا شاعر مذہب، اخلاق، فلسفہ، تصوف، فنونِ لطیفہ/عالیہ سب سے استفادہ کرتا ہے لیکن کسی کا پابند نہیں ہوتا۔"

ایک اور خط میں حبیب صاحب کو ہی لکھتے ہیں:

"اقبال کے فلسفے کی طرف میری نظر کبھی نہیں گئی۔ جیسا کہ پہلے عرض کر چکا ہوں فلسفہ میرا اندازِ فکر نہیں۔ اس سے مستفید ہونے کی صلاحیت بھی نہیں۔"

رشید صاحب کوئی مضمون وغیرہ لکھتے تو اس پر مشورہ یا اصلاح طلب کرنے کے لئے اکثر بے تکلف احباب سے رجوع کرتے تھے۔ مسعود صاحب کو ایک خط میں لکھتے ہیں:

"مضمون حاضر ہے۔ ۴-۵ صفحے یا کم اور لکھوں گا۔ چاہتا ہوں کہ آپ اسے بے لاگ نظر سے دیکھیں۔ جہاں جس قسم کا سقم نظر آئے اسے حتی الوسع خود ٹھیک کر دیں یا مجھے مطلع فرمائیں۔ مضمون خاصا طویل ہو گیا ہے۔ آپ کو اختیارِ کامل ہے جہاں سے چاہیں، جتنا چاہیں قلمزد کر دیں۔ معیار یہ نہ ہونا چاہئے کہ جتنا غیر معمولی طویل ہے اتنا ہی مناسب اور معقول بھی ہے یا نہیں۔

الفاظ، فقرے، عبارت کو بھی بہ نظرِ اصلاح دیکھئے گا کہیں ہو گیا ہو، یا کسی اعتبار سے توازن نہ رہا ہو تو اسے اپنی صوابدید کے مطابق بے تکلف درست کر دیجئے۔"

غرض ان خطوں میں شخصیت کا جو عکس نظر آتا ہے وہ ان کے مضامین وغیرہ سے دلچسپ بھی ہے اور جداگانہ بھی۔ ان کی خط نگاری کے دوسرے پہلوؤں کا بھی جائزہ لیا جا سکتا ہے۔ اس میں شک نہیں کہ یہ خط رشید احمد صدیقی کے سوانح نگار کا اہم ترین ماخذ فراہم کرتے ہیں۔

اتوار

ڈی اے ہیریسن قربان

یادش بخیر کہ چند برس پہلے کی بات ہے کہ ہم ہی میں سے کسی نے ہم جیسے صبح سے شام تک دفتر کی چکی میں پسنے والے لوگ بڑی بے تابی کے ساتھ اتوار کا انتظار کیا کرتے تھے۔ بلکہ خدا سے شکایت کرتے تھے کہ یا خدا ہفتے میں دو تین اتوار کیوں نہیں بنائے۔ یا پھر اپنے عیسائی بندوں کو یہ توفیق کیوں نہیں بخشی کہ ہفتے میں کم از کم دو اتوار تیری عبادت کر لیا کرتے۔ بہرحال سوموار سے سنیچر تک اتوار کا دن گذارنے کے لئے پروگرام تھے بہت سارے گھریلو اور باہر کے کام اتوار کے لئے اٹھا کر رکھ دیئے جاتے تھے۔ جوتا پھٹ رہا ہے اتوار کو مرمت کرائیں گے۔ اتوار کو بال ترشوانا ہے۔ اتوار کو کپڑے لونڈری میں دینا ہے کوٹ کا بٹن نکلا جا رہا ہے اس کو ٹنکوائیں گے گھر کی صفائی کریں گے ردی اخبار فروخت کریں گے۔ اچھے قسم کا کھانا تیار کریں گے۔ اور دن بھر آرام کریں گے۔ شام کو کسی دوست کے یہاں جائیں گے گپ شپ کریں گے۔ وغیرہ وغیرہ اتوار کے ساتھ ساتھ سنیچر کی شب بھی بڑی دلفریب ہوا کرتی تھی۔ رات کو ۱۲ بارہ ایک بجے تک تاش یا کیرم کھیلا جاتا تھا۔ چائے کے دور چلتے تھے کہ صبح اتوار ہے۔ دیر تک خراٹے بھریں گے۔

خیر اتوار تو اب بھی آتا ہے وہی سات دن بعد اب اسکی شانِ نزول یکسر بدل گئی ہے جب سے کہیں ہم نے ایک رنگین ٹی وی خرید لیا ہے۔ خدا بہتر جانتا ہے یہ ٹی وی خریدنا جان لیوا ثابت ہو رہا ہے یا ٹی وی پروگرام چلانے والے قصوروار ہیں جنھوں نے کھانا پینا سونا بچوں کا پڑھنا لکھنا سب حرام کر رکھا ہے۔

ایک وقت وہ تھا کہ صبح سویرے آنکھ کھلتے ہی بھگوان یا اللہ یا خدا یا گاڈ کا نام زبان پر آتا تھا پر اب آنکھ کھلتے ہی کم کم کتنا پیار کریں گے ہم دونوں۔

ہم تم کمرے بند ہوں اور چابی کھو جائے پردہ نشین جب کوئی خدا سے بندوں سے پھر پردہ کیا آوازیں کان میں آنے لگتی۔ کیسا خدا اور کس کا بھگوان

سنیچر کی شب ارادہ کر کے سوئے تھے کہ صبح دیر تک سوئیں گے لیکن ابھی پہلے خوابوں کی دنیا میں پہونچ کر کسی حسینہ کے ساتھ باغ باغیچوں کی سیر سے لطف اندوز ہو رہے تھے کہ سات بجے ٹی وی کی آواز کانوں میں آنے لگتی ہے دو چار کروٹیں بدل کر آنکھ کھولتے ہیں تو بیگم مع تین عدد بچوں کے ٹی وی کے ارد گرد بیٹھی ہوئی دکھائی دیتی ہیں۔ تھوڑی دیر میں تمام گھر کارٹون کی آوازوں سے گونجنے لگتا ہے اور گرد اور ہمارے تین سال کے صاحبزادے چیخنا شروع کر دیتے ہیں۔ پاپا جلدی اٹھئے دیکھئے ٹنگولا آ رہا ہے۔ مجبور ہو کر اٹھتے اور بیٹھ گئے ٹی وی کے سامنے بیگم نے [illegible]

میں ٹھنڈی چائے انڈیل دی۔ کیونکہ انگنٹی چھوڑ کر چائے گرم کرنے کیسے جا سکتی ہیں۔ چنانچہ اسکی چسکی بھر تے ہیں کہ دنیا جہان سے بے خبر ٹی وی پر نظریں جمائے بیٹھے ہیں۔ نہ ٹائیلٹ نہ شیو نہ برش جب جب اٹھنے کی کوشش کرتے ہیں تو فرمائش ہوتی ہے ذرا ٹھہرئیے پیالی میں طوفان آنے والا ہے بچے تائید کرتے ہیں۔ ہاں پاپا اس کو ضرور دیکھئے۔ بڑا مزیدار ہے بیٹھے بیٹھ گئے۔ یہ پروگرام ختم ہوتے ہی اعلان ہوتا ہے۔ اب ساڑھے آٹھ بجے سے احمد آباد میں کھیلے جا رہے کرکٹ میچ کا سیدھا پرسارن دیکھئے ہم خوش ہو کر اُٹھے کہ اس آدھ گھنٹے کے وقفہ میں جلدی سے ضروری کاموں کو ختم کر لیا جائے۔ ناشتہ کرنے بیٹھے ہی تھے کہ بڑے صاحبزادے نے جو تیسری جماعت میں پڑھتے ہیں جا کر ٹی وی کھول دیا اور خوش خبری سنائی پاپا میچ شروع ہو رہا ہے۔ خدا جھوٹ نہ بلوائے کرکٹ کھیلنے کے کم دیکھنے کے ہم بہت شوقین رہے ہیں چنانچہ جلدی جلدی ناشتہ ختم کر کے پھر آ بیٹھے ٹی وی کے سامنے۔ اب کہاں کا نہانا کہاں کا جوتہ پالش۔ کیا بازار کا کام کاج اور طرہ یہ کہ بیگم کو بھی گھر کا کام نہیں کرنے دیتے کبھی ہم کبھی بچے انھیں آوازیں دیتے رہتے ہیں

ارے بیگم کیا کر رہی ہو۔ دیکھو تو انھوں نے کیا چوکا مارا ہے۔ ارے بھائی کام پھر کر لینا آؤ اِدھر آ رہے۔

اتنے میں صاحبزادی چلائیں ممی ممی دیکھو تارو گلاٹ سنتری نے کیا شاندار چھکا جمایا ہے کیوں پاپا؟ غرض اسی ہنگامے میں کھیل کا بریک ہوا ہم اٹھے کہ لاؤ جلدی سے بازار ہو آئیں۔ اتنے میں اعلان ہوا کہ اب پیش ہے دیر تک چنانچہ ہم پھر پھنس گئے چکر میں اپنے ملک کے بہادروں اور جاں نثاروں سے شیں فلم نہ دیکھنا ہماری حب الوطنی کو مشکوک کر سکتا ہے۔ اس لئے بیٹھ گئے پھر صوفے پر پاؤں چڑھا کر آدھے گھنٹے کے بعد یہ سیریل ختم ہوا اور پھر میچ شروع ہو گیا۔ ہم نے بیگم سے کہا بھائی ایسا کرو بیگم کھانا یہیں لے آؤ بڑا مزیدار میچ چل رہا ہے۔ لیجئے صوفہ ہی ڈائننگ ٹیبل میں تبدیل ہو گیا بیگم بے چاری ایک ایک چیز اٹھا کر لا رہی ہیں۔ اور بکتی جھکتی جا رہی ہیں بھاڑ میں جائے ایسا میچ۔ ہم کانوں میں انگلیاں ڈالے واہ واہ کیا کیچ لیا ہے سالا ان ٹچ گئے بیٹا۔ ابھی ہو جاتے ایل۔ بی ڈبلو.....

جیتے رہو میرے شیر کیا رن لیا ہے واہ واہ غرض کہ ہم بچ کھاتے جا رہے ہیں اور صوفے پر اُچھل کود کر رہے ہیں۔ ۵ بجے تک کھیل جاری رہا اب اُٹھنے کے بعد جو چپل میں پیر ڈالا اب دیکھئے ہمالیہ درشن۔ پہاڑ دیکھنے کا ہمیں بچپن سے شوق رہا ہے۔ جیب کے تنگی کے باعث پہاڑ کشمیر خود نہیں دیکھ سکتے تو کم از کم ٹی وی پر وہاں کے مناظر دیکھنے سے کیوں محروم رہیں بلکہ اس معاملے میں ٹی وی والے یقیناً شکریہ کے مستحق ہیں ہم جیسے کم آمدنی والے لوگوں کو گھر بیٹھے دنیا جہان کی سیر کرا دیتے ہیں اب اس سے فیض حاصل نہ کرنا بے حسی نہیں تو اور کیا ہے۔

یہ ختم ہوتے ہی آ گئی پکچر۔ امراؤ جان ادا پرانی دیکھی بھالی پکچر ہے۔ لیکن اتنی اچھی ہے کہ دوبارہ دیکھے بغیر رہا نہیں جاتا جب تک اشتہارات آتے ہیں ہم نے اُٹھ کر کے ہاتھ منہ دھو لیا۔ مگر بچوں کے لئے اشتہارات چھوڑنا ممکن نہیں۔ پکچر چل رہا تھا غزل شروع ہوئی۔ ان کی آنکھوں کی مستی میں ... کسی نے باہر بیل بجائی۔ بڑا غصہ آیا کہ کون کم بخت آ گیا۔ اس کو اتنا بھی نہیں معلوم کہ اب اتوار کو کسی کے نہیں جانا چاہیئے۔ وہ دن گئے جب یار دوستوں سے ملاقات کا دن اتوار ہوتا تھا۔ اب اتوار پکچر کا دن ہوتا ہے مجبوراً اُٹھ کر دروازہ کھولا۔ ہمارے دوست انور میاں تھے۔ انھیں اندر لا کر بٹھایا اور بغیر خیریت دریافت کئے۔ ان سے کہا دیکھو یار کس قدر عمدہ غزل آ رہی ہے۔ وہ بولے ایک کام سے آیا تھا۔ ہم نے کہا ہاں ہاں کام بھی ہو جائے گا۔ پکچر دیکھ لو۔ ہماری اتنی سی گفتگو پر بچوں کے ماتھے پر بل پڑ گئے کہ پاپا بھی کیسے دوست ہیں جو پکچر کے وقت ڈسٹرب کرتے ہیں۔ ادھر بیگم کے منہ پر ہوائیاں اڑنے لگیں۔ کہ کہیں چائے بنانے کے لئے نہ اٹھنا پڑے۔ قصہ کوتاہ انور بھی ہم سب کے ساتھ ٹی وی پر آنکھیں گڑا کر بیٹھ گئے کیسی خیریت اور کیسا حال چال کہاں کا پانی اور کس کی چائے۔ ساڑھے آٹھ بجے پکچر ختم ہوئی۔ تب ان سے بات چیت ہوئی بھی اس انداز سے کہ انور میاں جلدی چلے جائیں۔ کیونکہ دس منٹ کے بعد خبریں سننا ہیں۔

لیجئے ہو گیا اتوار ٹی وی کی نظر اور سارے کام اگلے اتوار کے لئے ملتوی ہو گئے اب دیکھئے ایسے کتنے اتوار اور نکلیں گے تب جا کر جوتا مرمت ہو گا۔

اجنبی شناسا

طاہرہ بلوچ

وہ دھیرے دھیرے قدم اُٹھاتا ہوا۔ آگے ہی آگے بڑھتا چلا جا رہا تھا۔ خاردار جھاڑیوں سے اُلجھ کر اس کے کپڑے تار تار ہو چکے تھے۔ جسم پر خراشوں سے خون رس رہا تھا اور کہیں کہیں پر کھرنڈ جم چکے تھے۔ چہرے پر مسافت کی دھول تہہ در تہہ جمی تھی — آنکھوں میں رت جگا اپنا خمار لئے اس کی پلکوں کو بوجھل بنا رہا تھا۔ آنکھوں کی سُرخی سے یہ اندازہ لگانا مشکل تھا کہ یہ آرزوؤں اور تمناؤں کے مٹ جانے کی ہے یا نئی آرزوؤں اور تمناؤں کے جنم پانے کی۔ پسینے کی بوندیں ٹپکنے کی بجائے اس کے چہرے پر ابھر رہی تھیں۔ اداسی سے اس کے چہرے پر گرد کے درمیان مختلف نقشے بن اور مٹ رہے تھے۔ تھکن سے بدن کا عضو عضو ٹوٹتا ہوا محسوس ہو رہا تھا۔ مگر قدم تھے کہ متواتر ایک ہی رفتار سے بڑھتے جا رہے تھے۔ بالکل اس مسافر کی مانند جو لق و دق صحرا میں بھٹک جانے کے بعد دُور کہیں سے نخلستان کے آثار نظر آ جائیں۔

خشک جھاڑیوں کی ٹہنیاں اس کے پاؤں سے آکر مختلف آوازوں سے چیخ رہی تھیں — جیسے اُسے واقعی منزل پا لینے کی بشارت دے رہی ہوں۔ ہوا اگرچہ بند تھی۔ مگر پھر بھی کوئی نہ کوئی جھونکا درختوں کے پتوں کے کانوں میں سرگوشی کر جاتا۔ اور اس کی مانند سے انسان کے پپڑی بنے ہونٹوں پر مسکراہٹ بکھر جاتی تھی۔ حالانکہ ہر مسکراہٹ کے ساتھ اس کے پھٹے ہونٹ کے درمیان سے خون کی ایک ننھی سی دھار پھوٹ پڑتی تھی۔ مگر آج تو جیسے وہ بے خبر اور لاپرواہ سا نظر آ رہا تھا شاید اُسے وہ حِس جو تکلیف اور درد کو ظاہر کرتی ہے۔ بالکل مردہ ہو چکی تھی۔

اچانک ایک جھکی ہوئی شاخ سے ایک ننھا منا سا پرندہ پھڑ پھڑا کر اُڑ گیا۔ اور پھر آسمان کی طرف پرواز کرنے لگا — چند لمحوں کے لئے اس کی نظریں بھی آسمان کی طرف اُٹھ گئیں۔ گر بڑھتے قدم راہ میں پڑے ایک بڑے پتھر سے ٹکرا گئے — اور اس نے سنبھلنے کے لئے قریبی درخت کا سہارا لیا۔ سہارا پاتے ہی اس کے جی میں آئی کہ وہ کچھ دیر کے لئے سستا لے — مگر پھر خیال آیا کہ اگر اس وقت وہ یہاں رُک گیا۔ تو پھر شاید وہ کبھی بھی اپنے قدم اُٹھا نہ سکے گا۔ یہیں ان ہی درختوں کے سائے تلے پڑا رہے گا — احساس کا وجود ایک دن خزاں رسیدہ پتوں کے ڈھیر تلے دب کر کھو جائے گا۔ نہیں — نہیں مجھے رُکنا نہیں چاہیئے" یہ سوچ کر وہ دوبارہ آگے بڑھنے لگا۔ سائے پھیلتے گئے۔ اور سورج کی روشنی گھٹنے لگی۔ اسے جلد از جلد پھیلتے سایوں سے پہلے اس جنگل کے سفر کو ختم کر کے آبادی میں داخل ہونا تھا۔ اس کے قدموں میں اب لڑکھڑاہٹ پیدا ہو رہی تھی۔ جذبے کی قوت اسے بڑھائے جا رہی تھی۔ درختوں جھاڑیوں۔ اور ساگوان ہری گھاس کا سلسلہ ختم ہوا — سامنے چند ٹیلے نظر آئے۔ جن کا رنگ تو بھورا مٹیالا سا تھا۔ مگر اس وقت سرخی نظر آ رہے تھے کیونکہ ڈوبتے سائے ان ٹیلوں پر چھا سایہ کئے ہوئے تھے وہ ان ٹیلوں کے قریب پہنچ کے ٹھٹھک گیا۔ جیسے کچھ سوچ رہا ہو — پھر کوئی فیصلہ کر رہا ہو —

یہ بھی ہو سکتا ہے۔ وہ یونہی تھک گیا ہو۔ کہ اس کے پاؤں کے تلوے کانٹوں سے چھلنی تھے ۔۔۔ اور پھر کانٹے دار جھاڑی کی سمت کھال میں اس بُری طرح سما چبھ گئے تھے کہ ان کو نکالنا اس کے بس میں نہ تھا۔ صورت کی شوخی بجھنے سے بالکل معدوم ہو گئی۔ وہ منڈلوں سے لوٹ کر کچھ رفیلے اور پتھریلے راستے پر پہنچ چکا تھا ۔۔۔ سامنے ایک آزادی تھی۔ جو کچھ مُڑ جا کر دو حصوں میں منقسم ہو جاتی تھی۔ ایک تو اس کے گاؤں کی طرف جاتا تھا اور دوسرا دوسرا زری کے گاؤں کی طرف جس کے پاؤں میں ہر وقت پازیب بجتی تھی ۔۔۔ اور ہاتھ میں چاندی کے گھنگھرو والے کنگنوں کی جھنکار جھنکتی تھی۔ شاید اب بھی پازیب اور کنگنوں کی جھنکار پہلے کی طرح سنائی دیتی ہو۔ مگر اسے سنے ہوئے ایک عرصہ گزر چکا تھا۔ جو کہنے کو تو صرف اور صرف ایک ہفتے پر محیط تھا۔ مگر یہ ایک ہفتہ جس طرح اس نے گزارا تھا ۔۔۔ وہ جانتا تھا کہ اس ایک ہفتے کی طوالت ایک صدی کا گھیراؤ کئے ہوئے تھی۔

دُور دھڑکتا تے ہوئے ننھے ننھے دیئے دکھائی دینے لگے ۔۔۔ جو اسے ان کی تو تفرقہ ابھی تھی ۔۔۔ لیکن اس کے باوجود وہ روشن تھے۔ آبادی کے پہلے اور آخری نشان ۔۔۔ زندگی اور موت کی علامت۔ خوشی اور غم کے جلوے۔ وہ وہیں بیٹھ گیا۔ اور ان جھلملاتے دیئوں کو دیکھنے لگا۔

وہاں تو بس شہرِ خموشاں کے قریب آ گیا ہوں۔ جو آبادی کی نشان دہی کرتا ہے۔ یہ شہرِ خموشاں نہ ہو۔ تو گاؤں تک پہنچنے کے لئے شاید زیادہ فاصلہ طے کرنا پڑے گا یہ اس کا خیال تھا ۔۔۔ وہ یہاں کئی مرتبہ آیا تھا۔ بچپن میں کھیلتے کھیلتے اکثر یہاں تک پہنچ جاتا تھا دوستوں کے ساتھ ۔۔۔ مگر جب نانی اماں کی بات یاد آتی کہ ویران جگہوں پر اکیلا نہیں آنا چاہئے۔ کیونکہ ان کے شور مچانے سے یہاں کی خاموشی و سکون کے آرام میں خلل پڑتا ہے۔ اور پھر وہ بے چین ہو کر ۔۔۔ بد خواب ہوکر لوں پر جھپٹ پڑتی ہے۔ اور پھر ہمیشہ کے لئے خواب و بے سکون ہو جاتے ہیں۔ اور پھر وہ بھاگ کھڑا ہوتا۔ مگر جوں جوں اس کا شعور بیدار ہوتا گیا شہرِ خموشاں کی خاموشی سے کسی قسم کا خوف محسوس نہ ہوا اور پھر ایک

دن وہ گاؤں کے تمام بزرگوں کے ہمراہ نانی اماں کی لاش بھی یہاں شہرِ خموشاں تک لایا۔ اور جہاں اسے ایک مٹی کے ڈھیر تلے سلا دیا۔ آرام و سکون سے ۔۔۔ اس دن وہ کھویا کھویا سا رہا ۔۔۔ اُداس اُداس سا ۔۔۔ وہ ہر بعد شام کو اکثر ایک ننھا سا دیا مٹی کے ڈھیر کے سرہانے روشن کر کے کچھ دیر خاموش کھڑا رہتا۔ اور پھر دبے پاؤں لوٹ جاتا۔ کہ کہیں یہاں کے باسی بے خواب نہ ہو جائیں اسے بیٹھے ہوئے خاصی دیر ہو چکی تھی۔ وہ اب واقعی سوچ رہا تھا ۔۔۔ اور اپنی شناخت کر رہا تھا کیونکہ وہ جانتا تھا کہ ایک ہفتے میں وہ اپنی شناخت اپنی پہچان کھو چکا ہے۔ جنگل کی خودرو جھاڑیوں اُگی گھاس اور درختوں کی جھکی ہوئی لمبی لمبی شاخوں میں مگر اسے یہ تو یاد تھا ۔۔۔ کہ ایک ہفتہ پہلے اسے گاؤں کے لوگ اور گھر کے افراد اکبر کہہ کر بُلاتے تھے۔ زری بھی اسے اکبر کے نام سے پکارتی تھی ۔۔۔ اُس کے مُنہ سے اسے اپنا نام بے حد اچھا لگتا تھا۔ اس لئے اس کی پہلی آواز پر وہ کبھی بھی جواب نہ دیتا تھا۔ اکبر! اچھا نام ہے۔ بے حد اچھا۔ مگر شاید یہ نام اس کے لئے مناسب نہ تھا۔ اکبر ہوتے ہوئے بھی وہ کتنا چھوٹا نکلا تھا ۔۔۔ کہ اپنے ذاتی شکوہ اور اپنی ذاتی خواہشوں کو پورا کرنے کے لئے سب کچھ چھوڑ چھاڑ کر جنگل کو چل دیا تھا۔ یہ احساس اسے اب ہوا تھا ۔۔۔ اس احساس سے اس کے ذہن میں وہ دریچے جو ایک ہفتے سے بند تھے ۔۔۔ ہلکی سی چرچراہٹ سے وا ہونے لگے۔

وہ اکبر تھا۔ گاؤں کا واحد ایم۔ اے پاس جوان ایم۔ اے پاس ہونے کا فخر اس کے گھر والوں اور زری کے لئے خاصا اہم تھا ۔۔۔ مگر وہ خود یوں اجنبی اجنبی سا ہو گیا تھا۔ جیسے اس نے کوئی ایسا انوکھا اور ان ہونا کام کر لیا ہو ۔۔۔ جو کہ گاؤں اور گاؤں کے لوگوں کے لئے اسے اجنبی بنانے کا موجب بن گیا ہو۔ اس کے دوست احمد اور شبیر محمد بھی اس سے کچھ کھنچے کھنچے رہنے لگے تھے۔ ان کے انداز میں محسوس ہوتا کہ بے تکلفی نہ اخلاق کی جگہ تکلف نے لے لی تھی ۔۔۔ گھر میں امی اور بھائی اس کی آمد پر خاموش ہو جاتے اور پھر ادھر اُدھر بکھر جاتے ماں بھی اسے دیکھتے ہی بستر کی سلوٹیں اپنے ہاتھوں سے دُور کرنے لگتی ۔۔۔ حالانکہ اس کے اپنے ہاتھوں میں سلوٹیں

نمایاں ہونے لگی تھیں ۔۔۔ یہی حال بابا کا تھا۔ اس کی ڈانٹ پھٹکار میں بھی کچھ کچھ احترام کا رنگ تھا ۔۔۔ اور پھر سب سے زیادہ اسے زری کا رویہ دُکھ دیتا ۔۔۔ وہ الہڑ سی ۔۔۔ شوخ اور شریر سی لڑکی جو ہر وقت شرارت پر تُلی رہتی تھی۔ اُسے دیکھتے ہی اس کی رگِ شرارت کچھ زیادہ ہی پھڑکتی تھی ۔۔۔ اور اگر وہ یعنی اکبر سو رہا ہوتا تھا ۔۔۔ تو پھر تنکے سے اس کا کان کھجلانا ضروری ہو جاتا تھا۔ وہ اس پر ہڑبڑا کر اُٹھ بیٹھتا ۔۔۔ اور ساتھ ہی زری کی کھلکھلاتی ہوئی ہنسی سنائی دیتی۔ اس ہنسی نے اسے یوں گمان ہوتا۔ جیسے وہ کسی گاتے گنگناتے چشمے کے پُرسکون کنارے پر جا بیٹھا ہو۔ مگر ایم۔ اے کا امتحان پاس کرنے پر اس سے زری کی ہنسی روٹھ گئی تھی۔ اب وہ آتی تھی ۔۔۔ تو بات بہت کرتی تھی ۔۔۔ خوب سوچ سوچ کر ۔۔۔ کہیں منہ سے کوئی بے تکلفانہ لفظ نہ نکل جائے۔ اکبر اس پر جھنجھلا کر پوچھا۔

"زری یہ سب کیا ہے؟ یہ لوگ یوں بدل کیوں گئے ہیں؟ میں اکبر ہوں وہی اکبر جس سے تم سب واقف ہو۔"

جواباً زری اور بھی سنجیدہ ہو جاتی اور کہتی "اکبر اب تو تم بہت بڑے آدمی بن گئے ہو۔ ایم۔ اے پاس۔"

نام سے کیا ہوتا ہے؟ اکبر غور سے اس کے چہرے کو دیکھتا زری کی آنکھوں میں اسے اپنا عکس نظر آتا۔ مگر اجنبی ۔۔۔ اجنبی سا۔

آخر ان تمام لوگوں کے رویوں سے اس میں یہ احساس بیدار ہو ہی گیا ۔۔۔ کہ وہ اب ان سب سے منفرد ہے۔ سب سے الگ ۔۔۔ سب سے جُدا اس میں اجنبیت کا احساس زیادہ اُجاگر ہونے لگا۔ اور پھر وہ بے سکون ہو گیا ۔۔۔ بے چین و بے خواب راتوں کو آنگن میں ٹہلنا اور دن کو کمرے میں بند رہنا اس کا معمول بن گیا۔ ماں کے کاموں میں کچھ زیادہ تیزی آ گئی۔ بابا کے لہجے میں احترام کا جذبہ کچھ اور بڑھ گیا۔ بہن بھائی کچھ زیادہ ہی کونے میں دبکنے لگے۔ احمد اور شبیر محمد کی دوستی کا رنگ ماند پڑنے لگا۔ اور زری کی آنکھوں میں اجنبی کا عکس جم کر رہ گیا ۔۔۔ اس نے سوچا اب یہاں اس کی ضرورت نہیں رہی۔ کیا اُسے شہر چلا جانا چاہیئے؟ مگر وہاں بھی تو وہ اجنبی ہوگا ۔۔۔ پھر کیا کرے؟

اور آخر اس نے فیصلہ کر لیا۔ وہ چلا جائے گا۔

اس کا قاتل ہے — ہمیشہ ہمیشہ کے لئے — کچھ کہے بتائے بغیر۔ مگر وہ زندگی کو ضرور بتائے گا۔ شاید اس کی آنکھوں میں اجنبی کی جگہ شناسا سا عکس نظر آ جائے نہ آئی — اس نے اسے اپنے فیصلے سے آگاہ کیا۔ وہ چونک پڑی تھی — آنکھوں میں جھلملاہٹ پیدا ہوئی — اور وہ پانی میں ڈوبی ہوئی نظر آنے لگیں — کچھ دیر بعد وہ بولی۔

"اکبر کیا واقعی تم جا رہے ہو؟"

"ہاں۔ بالکل" اکبر نے جواب دیا۔

"مگر کیوں؟" وہ حیرت سے اسے دیکھنے لگی۔

"اس لئے کہ اب ایک اجنبی ان شناساؤں کے درمیان نہیں رہ سکتا۔"

"میں کبھی نہیں!"

"یہی تو مصیبت ہے۔"

"تو تم شہر جاؤ گے؟"

"نہیں۔"

"تو کیا کسی دوسرے گاؤں جاؤ گے؟"

"نہیں۔"

"پھر کہاں جاؤ گے اکبر؟"

"میں جنگلوں میں جاؤں گا۔"

اور اس پر زندگی بے ساختہ ہنس پڑی۔ گھنگھرو سے بجنے کا احساس اکبر کی آنکھوں میں لہرا گیا۔ مگر پلک جھپکتے ہی نگاہوں سے اوجھل ہو گیا۔ کیونکہ زندگی فوراً خاموش ہو کر اسے یوں دیکھنے لگی تھی جیسے کہہ رہی ہو۔ معاف کرو اکبر۔ گستاخی ہوئی۔

"زندگی! میں اسی رویے سے گھبرا کر انسانوں سے دور بھاگ رہا ہوں۔ مجھے لگتا ہے۔ اب انسانوں میں مجھے کبھی کوئی سکون نہ ملے گا۔ کبھی نہیں — تم لوگ اجنبی کو اپنا لیتے ہو۔ اور اپنے کو اجنبی میں بدل دیتے ہو۔ زندگی کیا ہو گیا ہے تم سب کو؟"

"ہمیں تو کچھ نہیں ہوا۔ — وہ اکبر تم ایم۔ اے پاس ہو گئے ہو نا۔ ڈر لگتا ہے ہم جاہل کوئی ایسی ویسی بات نہ کر دیں۔ جو تمہیں بری لگے۔" آخر زندگی نے کہے لفظوں میں انہیں کہہ ہی دیا۔

اکبر کا پڑھا لکھا ایم۔ اے پاس ہونا اسے احساسِ کمتری ہونے لگا تھا۔ اور ایک دن علی الصبح وہ جنگل کو چل نکلا۔

وہ اکبر کو ڈھونڈ لینا چاہتا تھا۔ جو کہیں کھو چکا تھا۔ اور اگر تھا بھی تو اجنبی — جنگل میں اس نے پہلے آپ کو واقعی پا لیا — دکھ — درد — تکلیف — بے چینی۔ بے سکونی اور بدحالی نے اسے بتایا کہ وہ یہاں بالکل بے مصرف ہے جنگل میں — بھوک اور پیاس نے احساس دلایا کہ صرف اور صرف اپنے لئے کھانا پینا ہی حق ہے تو پھر اسے کیا کرنا چاہئے؟ کیا ان خاردار جھاڑیوں میں الجھ الجھ کر وہ اپنے لباس کی مانند تار تار ہو جائے یا پھر کسی درخت سے ٹیک لگا کر ہمیشہ ہمیشہ کے لئے بیٹھ جائے اور خزاں رسیدہ پتوں کے ڈھیر میں کھو جائے؟ مگر اس سے کیا فائدہ ہوگا؟ — کیا اس طرح وہ اکبر کو دوبارہ پا لے گا — یہ ناممکن ہے — اسے لوٹ جانا چاہئے — اپنے گاؤں میں — اپنے لوگوں کے پاس اور — اور اپنی زندگی کے پاس — جس کی پازیب اور کنگنوں کی جھنکار ہزاروں بلبلوں کی چہچہاہٹ اور ندیوں کے مترنم گیتوں سے کہیں میل کھاتی تھی —

مگر وہاں — وہی اجنبی اکبر ہوگا ——————

اس نے کچھ دیر بعد پھر سوچا۔ اور اپنے آپ کو مجرم گردانا اپنے آپ کو اجنبی کا نام اور روپ دینے کا ذمہ دار وہ خود تھا — ہاں ہاں — وہ خود — چھ سال سے اس نے بابا کے ساتھ مل کر ہاتھ نہ لگایا تھا — اپنے کھیتوں سے چارے کے گٹھے اور اور سنہرے گٹھے کے ہمراہ اٹھا کر گھر تک نہ لایا تھا — اپنے چھوٹے بہن بھائیوں کے درمیان بیٹھ کر من گھڑت قصے کہانیاں نہ سنائی تھیں۔ ماں کے پاس چولہے کے قریب بیٹھ کر کھانا نہ کھایا تھا — اور زندگی کو کبھی موقع نہ دیا تھا کہ وہ اس کے کان تک سے کچھ کہتی۔ اپنے قصور کو تسلیم کرنے کے بعد اس نے لوٹنے کا فیصلہ کیا۔ کہ آبادی سے دور انسانوں سے الگ زندگی گزارنا اس کے لئے ناممکن تھا۔

وہ لوٹا۔ اپنے آپ کو دیکھنے کی کوشش کی مگر اندھیرے کے باعث نہ دیکھ سکا — چاند کسی دلہن کی طرح درختوں کی اوٹ سے نمودار ہو رہا تھا۔ کیا اس حلیے میں اسے گاؤں کے لوگ پہچان لیں گے؟ اگر نہیں تو وہ اپنی شناخت خود کروائے گا — قدم بڑھائے گئے — پگڈنڈیوں پر دور سے ہی دکھائی دے رہا تھا۔ اور بچوں کے شور اور بڑے بوڑھوں کے بولنے کی آوازیں اسے سنائی دینے لگی تھیں — جانے پہچانے راستے اور دیکھی بھالی گلیوں پر وہ آنکھیں بند کر کے بھی اپنے گھر تک پہنچ سکتا تھا — وہ جلد ہی اپنے گھر کے دروازے تک پہنچ گیا — دروازے کی درز سے ہلکی ہلکی روشنی نظر آ رہی تھی۔ ماں یقیناً چولہے کے قریب بیٹھی ہوگی اس لئے کہ کہیں آگ بجھ نہ جائے۔ کیونکہ دوبارہ آگ جلا کر کھانا گرم کرنا اس کے لئے خاصا مشکل ہوتا ہے ماں — وہ تو اسے یقیناً شناخت کرے گی۔ اور میرا اکبر کہہ کر گلے سے لگا لے گی۔ منہ ہاتھ دھو کر وہ ماں کے قریب بیٹھ کر گرم گرم کھانا کھائے گا۔ اس خیال کے آتے ہی — اس کے قدم گھر کی دہلیز کو چھو چکے تھے — اور وہ اجنبی سے شناسا میں بدل چکا تھا ——————

ہریانہ اُردو اکادمی

ڈاکٹر ہیرا لال چوپڑہ

یہ حقیقت سب پر واضح ہے کہ تقسیمِ ملک کے وقت ۱۹۴۷ء میں اگر کسی ادب کو نقصان پہنچا ہے تو وہ اُردو ادب تھا کیونکہ اُردو کے مسلمان شعراء اور ادباء اکثر و بیشتر پاکستان چلے گئے اور ہندوستان میں غلط اندازہ لگاتے ہوئے اُردو کو بعض مسلمانوں کی زبان سمجھتے ہوئے اس کی مخالفت کا بازار گرم ہو گیا۔ لیکن بعد میں ہوش آنے پر معلوم ہوا کہ اُردو تو ہندوستان کی تہذیب و ثقافت کی سب قوموں کی مشترکہ آئینہ دار ہے اور اسکے احیا و بقا کے وسائل کی تجویزیں سوچی جانے لگیں۔ سب سے زیادہ نقصان دہلی ہند کے علاقہ ہریانہ کو ہوا جو اُردو کا ایک گڑھ سمجھا جاتا تھا اور حالی اور دیگر اوّل درجے کے شعراء و ادباء کا مولد و مسکن تھا۔

اس علاقے میں اُردو کو پھر سے زندہ کرنے کے وسائل پر غور کرتے ہوئے ہریانہ کے ادیب گورنر سید مظفر حسین صاحب برنی (حال صدر اقلیتی کمیشن) نے ۹ راگست ۱۹۸۵ کو ہریانہ میں اُردو اکادمی کا سنگ بنیاد رکھا اور محض اُردو کے فروغ کو مدِّ نظر رکھتے ہوئے بلا امتیاز مذہب و ملت ایک ایسے فعّال شخص کو اس کا سکریٹری مقرر کیا جو حقیقتاً اُردو کا شاعر، افسانہ نویس، نقاد اور دل سے اُردو کی تبلیغ و اشاعت کا خواہاں تھا۔ پروفیسر جاوید وششٹ کے بعد جناب کشمیری لال ذاکر ایم۔ اے بی۔ ٹی جو گورنمنٹ کے محکمۂ تعلیم میں اچھے اساتذہ میں شمار کیا جاتا تھا۔ اس اکادمی کے سکریٹری مقرر ہوئے۔ اور ذاکر صاحب نے دل و جان سے اس بات کی کوشش کی کہ ہریانہ کی اُردو پیروری کی شان دوبارہ قائم کی جائے اور خدا کے فضل و کرم سے اور اپنی بے لاگ کوششوں اور اچھے رفقائے کار مددگاروں کی اعانت نیز حکومت ہریانہ کی قابلِ تعریف سرپرستی سے وہ اپنے ارادوں میں پوری طرح کامیاب ہو گیا۔ دیکھا جائے تو ہریانہ اُردو اکادمی نے اپنی پانچ سالہ مختصر سی زندگی میں اُردو ادب کی وہ خدمت انجام دی ہے جو ملک بھر کی دوسری اُردو اکادمیوں کیلئے شمعِ ہدایت اور دلیلِ راہ کا کام دیتی ہیں۔ اگر اکادمی کی مطبوعات پر نظر ڈالی جائے تو معلوم ہوگا کہ اکادمی نے کوئی ایسا موقع ہاتھ سے جانے نہیں دیا جب کہ عوام کے علم و دانش میں وہ کوئی ٹھوس خدمت سر انجام دے سکے۔ پنڈت جواہر لال نہرو و مولانا آزاد کی جنم صدی کے موقعہ پر اُنکے متعلق اُردو میں وہ مواد فراہم کیا جو کسی دوسری زبان میں ابھی تک میسر نہیں ہوا۔ اسی طرح سے ہریانہ کے گذشتہ ادباء و شعراء کے متعلق اپنے سہ ماہی جریدہ کے خصوصی نمبر شائع کئے۔ جمناتٹ کا حالی نمبر، ہریانہ نمبر، آزادی نمبر، افسانہ نگاری نمبر، جشن یادگار ریشی نیز ہریانہ کے موجودہ شعراء کے تعارف و کلام کے متعلق سلسلہ اور ہریانہ کے دیگر مصنفین کے ادبی کارناموں کی اشاعت کر کے یا مصنفین کو اپنے کارناموں کی اشاعت

ہیں مالی تعاون دے کر اُردو ادب کو کافی تونگر بنا دیا ہے۔

بائیس کے قریب کتابیں اکادمی نے خود شائع کی ہیں اور اتنی ہی کتابوں کی اشاعت میں مالی امداد دی ہے اس کے علاوہ اکادمی کا ماہوار ی جرنامہ اور سہ ماہی جنانشٹ اپنی نوعیت کے منفرد جرائد ہیں۔ بچوں کی مفت اُردو تعلیم کیلئے کوئی تیس مراکز قائم کئے جہاں بچوں کو کتابیں بھی مہیا کی جاتی ہیں اور اساتذہ کو مقرر کر کے اپنی گرہ سے تنخواہ دے کر وہاں انکو اس نیک کام کیلئے بھیجا جاتا ہے اور بچوں کو اُردو تعلیم کے بعد انعامات سے نوازا جاتا ہے۔

اسی طرح کتابت کے کئی مراکز قائم کئے ہیں جہاں سے لوگ کتابت سیکھتے ہیں اور پھر ان کی ملازمت کا بھی انتظام کیا جاتا ہے مختلف موضوعات پر اُردو سیمناروں کا اہتمام کیا جاتا ہے یہاں تک کہ سروجنی نائیڈو کے متعلق بھی سیمنار کیا گیا تھا تاکہ عوام کو انکی ادبی زندگی کی بھی شناسائی دی جاسکے۔ جب بھی کبھی کوئی ادیب یا شاعر ہریانہ میں وارد ہوتا ہے تو اس کی ادبی نشست بھی کی جاتی ہے تاکہ ادب کے دلدادگان اس کی حاضری سے مستفید ہو سکیں۔ اسی سلسلے میں گزشتہ دنوں جب میں انبالہ میں شام بہار ٹرسٹ کے زیر اہتمام ایک سیمینار متعلقہ "علامہ اقبال اور سوامی رام تیرتھ" کی دعوت پر شرکت کے لئے گیا تو مجھے بھی ہریانہ اُردو اکاڈمی نے نشست کا اعزاز بخشا جہاں اُردو کے استادوں سے مل کر بہت خوشی حاصل ہوئی۔ اکادمی نے اس سال سے پانچ سالانہ انعامات کا اعلان کیا ہے پہلا گیارہ ہزار روپے کا انعام منوہر لوہیا پر اُردو میں کسی اچھے لکھنے والے کے لئے مخصوص ہے۔ باقی انعامات پانچ پانچ ہزار روپے ہیں پہلا صحافی کے متعلق دوسرا ہریانہ کے اُردو اساتذہ میں سب سے اچھے اور فعال استاد کیلئے تیسرا سب سے اچھے اُردو کے ترجمان جریدہ کیلئے جس نے اُردو کی خدمت کی ہو چوتھا ہریانہ کے ادب و ثقافت پر جس میں ہریانہ کی ادبی، تاریخی اور سماجی ترقی کے لئے اُردو میں کام کرنے والے کو ملیگا۔ ذکر صاحب کی خوش قسمتی ہے حکومت ہریانہ ان کی نیک نیتی اور حقیقی اُردو پرستی کو مد نظر رکھتے ہوئے ان کی تمام سفارشات کو شرف قبولیت بخشتی ہے اور ان کو بھور رفقائے کار بھی ایسے ملے ہوئے ہیں جو ادبی خدمت کو اپنا ایمان سمجھتے ہیں۔ ان میں مشہور شاعر ناشر نیر نقوی شمس تبریزی اور ان کی ہی نائب پرنسپل عزیزہ فرزانہ نسیم خاص طور پر ذکر کے قابل ہیں۔ تینوں ہی اُردو میں پی۔ ایچ۔ ڈی کی ڈگری کے بھی طلبگار ہیں اللہ تعالیٰ انکی مدد فرمائے۔ نیز ہریانہ اکادمی کو زیادہ سے زیادہ ادبی اور ثقافتی کامیابیوں سے سرفراز کرے

بابِ انتقاد

طلسم ہوشربا

جلد اوّل:
ضخامت: ۹۵۵ صفحات، مجلد قیمت: ایک سو روپیہ

جلد دوم:
ضخامت: ۷۳۶ صفحات، مجلد قیمت: ، ،

جلد سوم:
ضخامت: ۹۹۶ صفحات، مجلد قیمت: ، ،

جلد چہارم:
ضخامت: ۱۲۸۰ صفحات، مجلد قیمت: ، ،

جلد پنجم، حصہ اوّل:
ضخامت: ۴۴۴ صفحات، مجلد قیمت: ، ،

جلد پنجم، حصہ دوم:
ضخامت: ۷۶۰ صفحات، مجلد قیمت: ، ،

جلد ششم:
ضخامت: ۱۱۵۶ صفحات، مجلد قیمت: ، ،

جلد ہفتم:
ضخامت: ۷۰۶ صفحات، مجلد قیمت: ، ،

خدا بخش لائبریری پٹنہ نے "طلسم ہوشربا" کو شائع کر کے اس نایاب داستانِ امیر حمزہ کے شائقین کی دیرینہ خواہش کو پورا کیا ہے۔ اس داستان کے ہر حصے کے شروع میں "پیش گفتار" کے عنوان سے جو لکھا گیا ہے وہ ملاحظہ ہو:

"داستانِ امیر حمزہ صاحبقران"

جس کے آٹھ دفتر ہیں، دفترِ پنجم "طلسم ہوشربا" جو کل داستانِ امیر حمزہ کی جان ہے۔ اور جس کی سات جلدیں ہیں۔

اس کی اوّل چار جلدوں کا ترجمہ منشی محمد حسین جاہ مرحوم نے اور آخری تین جلدوں کا ترجمہ منشی احمد حسین قمر نے فرمایا۔

آٹھ دفتروں کی چھیالیس جلدوں پر مشتمل تقریباً پچاس ہزار صفحات پر پھیلی داستانِ امیر حمزہ کا یہ پانچواں دفتر "طلسم ہوشربا" جو قریباً آٹھ ہزار صفحات پر پھیلا ہوا ، اُردو زبان کا طویل ترین نثری شاہکار ہے جسے اُردو کی اپنی چیز اور خالص تصنیف ہونے کے باوجود اس کے لکھنے والے کبھی کبھی ہیک جانے کی بات اور بے خاکساری اور انکساری سے ترجمہ کہتے رہے !! اور جو ۱۹ ویں صدی میں اس طویل داستانی سلسلہ کی شائع ہو کر منظرِ عام پر آنے والی پہلی کتاب ہے ' پیشِ خدمت ہے ۔"

۱۹ ویں صدی میں اس طویل داستانی سلسلہ کی یہ پہلی کتاب خدا بخش لائبریری کے زیرِ اہتمام شائع کی گئی ہے اور زمانۂ جدید کی اشاعتی خوبیوں کے ساتھ شائع کی گئی ہے۔

خدا بخش لائبریری کے ڈائرکٹر جناب عابد رضا بیدار کے عہد میں جو ادبی کام اس لائبریری میں ہوا ہے اس کی تفصیل کے لئے ایک الگ طویل مضمون کی ضرورت ہے۔ یہ "طلسم ہوشربا" کی اشاعت بھی ایک غیر معمولی کارنامہ ہے جس کے لئے خدا بخش لائبریری کے ڈائرکٹر اور ان کے رفقائے کار مبارکباد کے مستحق ہیں۔

"طلسم ہوشربا" سے متعلق ملک کے مشہور محققین اور قابلِ ذکر ادیبوں نے مختلف وقتوں میں جو مقدمات تحریر فرمائے ہیں، انہیں بڑی خوبصورتی کے ساتھ "مقدمۂ طلسم ہوشربا" کے نام سے الگ شائع کر دیا گیا ہے جس کے مطالعے سے "طلسم ہوشربا" کے پڑھنے والوں کو بڑی آسانیاں اور کئی معلومات سے جانکاری ہوگی۔ یہ مقدمہ ۱۵۰ صفحات پر مشتمل ہے اور اس کی قیمت بیس روپیہ ہے۔

"طلسم ہوشربا" کی یہ جلدیں خدا بخش اورینٹل پبلک لائبریری پٹنہ سے خریدی جا سکتی ہیں۔

مَن کہ مکتوب الیہ

برادرم سرور صاحب، تسلیمات!

آپ کے خط کے بعد آپ کا انتظار رہا۔ معلوم ہوتا ہے آپ کا لکھنؤ آنا نہ ہو سکا۔ خدا کرے آپ کی تندرستی اب بالکل ٹھیک ہو۔ میں بھی ان دنوں عرصے دلّی نہ آ سکا۔ مشاعرے والی کتاب کا انتظار رہے گا۔

آپ نے "شہرِ شور انگیز" پر بہت اچھا تبصرہ کیا تھا۔ آپ کی "وضع داری" اور محبت کے لئے ممنون ہوں۔

آپ کے یہاں کلاسیکی طرز کا کلام چھپتا رہتا ہے۔ اس لئے لکھنؤ کے ایک بزرگ شاعر شفق شاہ چشتی کا کلام آپ کی خدمت میں بغرضِ اشاعت بھیج رہا ہوں۔ شفق صاحب بالکل شاہ آدمی ہیں۔ پچاس برس سے شعر کہہ رہے ہیں لیکن ان کا نہ کوئی گروپ ہے، نہ سرپرست، حالانکہ ان کا کلام اس لائق ہے کہ دُنیا تک پہنچے۔ ان کی درخواست ہے کہ تصویر بھی شائع ہو جائے، اس لئے وہ بھی منسلک ہے۔ ازراہِ کرم اُن کے کلام اور تصویر کی رسید براہِ راست ان کو بھجوا دیں۔ ممنون ہوں گا۔

نیاز مند

شمس الرحمٰن فاروقی

لکھنؤ۔

آدرنیہ بھائی جی۔

یاد ہیں۔ طنز و مزاح نمبر میں پنڈت ہری چند اختر کا یہ شعر "بیٹھتا ہوں تو درد اُٹھتا ہے ۔ درد اُٹھتا ہے بیٹھ جاتا ہوں" ایسا پسند آیا، یا قطعی حسبِ حال محسوس ہونے لگا کہ زیر اور زبر دونوں اختیار سے باہر ہو گئے۔ یہ کمبخت شعر یوں بامعنی ثابت ہوا کہ ۲۹ ستمبر کی شام کو بیٹھے بیٹھے ایسا درد اُٹھا کہ میں خود ہی زیر و زبر ہونے لگا۔۔۔ ایمبولینس ۔۔ ہسپتال ۔۔ ۹ اکتوبر تک زیرِ علاج۔

دل کا ہلکا سا دورہ پڑا تھا۔ ڈاکٹروں کا کہنا ہے کہ جو نقصان ہوا ہے وہ دوائیوں کی مدد سے ٹھیک کر لیا جائے گا۔ (کیا ٹوٹے ہوئے دل کبھی جُڑتے ہیں؟) ۔ کمزوری بہت ہو گئی ہے۔

جیون لال شرما

ہنسلو، لندن۔

تصویر، ہر شاعر کے کردار اور خصوصیات کی عکاسی، پھر ہلکے سے طنز و ظرافت کی آمیزش، ادبیت، سلاست و روانی، بیان و اظہار پر بے پناہ قدرت، قدم قدم پر دامنِ دل کھینچتی ہے کہ "جا اینجاست"۔

آپ کا

پدم شری علی جواد زیدی

بمبئی۔

آدرنیہ بھائی صاحب، نمستے!

خط ملا۔ حالت سے آگاہی ہوئی۔ آپ کی علالت کا جان کر بہت افسوس ہوا۔ اگر آپ فراش ہو جائیں تو میں کیونکر پیچھے رہتا۔ ۱۲ اگست سے ۱۷ ستمبر تک پورا جینیہ خاندان کا اکیلا اکیلا فرد وائرل بخار کی زد میں آتا چلا گیا اور بخار بھی ۱۰۴ سے کم نہ ہوتا تھا۔ اب سکون ہے۔

پنجاب میں مسلسل مر رہے ہیں اور کوئی بھی سا دو حال نہیں، نہ ہندی مفقود و ہو چکی ہے مگر پھر بھی ہم ــــ

ایسے ناداں نہیں کہ رات ڈھلے
جاتی آنکھوں میں خورشیدِ سحر کی لَو ہے

اور یہ خورشیدِ سحر کون ہو سکتا ہے؟ قیاس لگائیں۔ بس فیل ہو گئے۔ اس عمر میں یادداشت واقعی کمزور پڑ جاتی ہے۔ حضور آپ ہی ہیں۔ اور کون ہو سکتا ہے؟

شیلا بہن جی کو ہم دونوں کی طرف سے بہت بہت نمستے۔ یکم اکتوبر کو دہلی آنے کا ارادہ ہے۔ بشرطِ حیات و صحت آنا ہوا تو ضرور درشن کروں گا۔

ادب کے ساتھ آپ کا

امید

لدھیانہ۔

محترم تونسوی صاحب،

عقیدتیں!

دو خاتونِ ہند کے تازہ شمارے میں بھائی مُطرب کے ایک خط سے یہ اطلاع ملی کہ ان دنوں آپ ناساز ہیں۔

وہی آپ کی ذات گرامی پوری اردو دُنیا کے لئے بڑی قیمتی ہے۔ آپ نے جس صدق دلی سے اردو زبان و ادب کی آبیاری کی ہے، وہ ایک

برادرِ مکرم ــــ تسلیم!

خط کا شکریہ۔ کتاب دلی کے مشاعرے موصول ہوئی۔ کتاب ہی ایسی ہے کہ ملتے ہی توجہ اُسی کی طرف مبذول ہو گئی۔ حسنِ ظاہری تو آپ کی تمام مطبوعات کی خصوصیت ہے لیکن آپ کے یہاں ادبی چاشنی کے ساتھ، صحافتی جزئیات نگاری اور ہر شے کو ایک وسیع تر کینوس پر دیکھنے کی جو غیر معمولی صلاحیت ہے وہ آپ کی تصنیفات کو طراز اوّل کی چیز بنا دیتی ہے۔ ہر شاعر کی سچی جاگتی

خیال ہے۔
اس [illegible] بیماری کو شکست دیجئے اور ہاتھ میں قلم لے کر ایک بار پھر تازہ دم ہو کر دشمنانِ اردو سے نبرد آزما ہو جائیے۔

؎ ہمتِ مرداں مددِ خدا "

امید کہ آپ اپنی خیریت سے مطلع فرمائیں گے۔

احقر
سید احمد قادری
(ایڈیٹر "مدھرتی" (گیا)

مدیر محترم
ماہنامہ شانِ ہند، نئی دہلی
آداب!

جون اور جولائی سنہ ۹۱ء کے دونوں شمارے ملے، شکریہ ۔۔۔! شانِ ہند دیکھنے کا پہلا اتفاق ہے۔ طباعت اور کتابت سے بھی مزاج خوش ہو گیا۔ مشمولات کی فہرست دیکھ کر مزاج کھل جاتا ہے۔ "شانِ ہند" یقیناً امتیازی اور انفرادی حیثیت کا مالک ہے۔ اسے مالی اعتبار سے مضبوط ہونا چاہیے تاکہ مستقبل میں بھی جاری رہے۔ آپ اردو کے دوسرے جرائد اور اخبارات میں "شانِ ہند" کا اشتہار کم سے کم سال میں ایک بار ضرور دیجئے۔ مجھے امید ہے اس کی تعداد اشاعت میں اضافہ ہو گا۔ بہت سارے لوگوں نے یقیناً تو اتنا خوبصورت پرچہ دیکھا ہو گا اور نہ اس کے بارے میں سنا ہے۔ آئندہ شمارے کا انتظار رہے۔

فقط
محمد شہید انصاری مالیگیرا

محترمی، آداب و نیاز!

بہت دن سے آپ کی خیریت نہیں ملی ہے جس کی وجہ سے تشویش ہے۔ خدا کرے آپ ہر طرح صحت مند ہوں۔

میری ایک کتاب "انتخاب رسالہ احسن" شائع ہوئی ہے جس کو بہت پسند کیا جا رہا ہے۔ رسالہ "احسن" حضرت آبر احسن گنوری رامپور

سے نکلتے تھے۔ اس رسالے میں فنِ شاعری، اصلاح اور زبان و قواعد پر جو مضامین شائع ہوئے، ان کا انتخاب شائع کیا ہے۔ کتاب جلد آپ کی خدمت میں ارسال کر رہا ہوں۔ دیکھ کر رائے گرامی اور تبصرے سے نوازیں۔ حضرت سلطر ہوشیارپوری نے جو تبصرہ ارسال فرمایا ہے اگر آپ شائع کرنا چاہیں تو ارسال کر دوں۔ ابھی تک وہ غیر مطبوعہ ہے۔ اور بہت عمدہ ہے۔

خیریت سے جلد مطلع فرمائیں۔

مخلص
ذکی تانگانوی
بدایوں۔

مشہور محقق جناب انور سدید کا فرمان

دِلّی کے مُشاعرے

مُشاعروں کی تمثیلی رُوداد نگاری کا اوّلین نقش مرزا فرحت اللہ بیگ نے بنایا۔ اس کو تمثیلی رُوپ دتاتریہ کیفی نے دیا۔ آزادی کے بعد ۲۶ فروری سنہ ۱۹۵۰ء کو جب دہلی میں بھارت کے جشنِ جمہوریہ پر لال قلعہ میں پہلا مشاعرہ ہوا تو اس کی رُوداد سرور تونسوی نے لکھی اور یہ اتنی مقبول ہوئی کہ اُن سے ہر سال اس قسم کی رپورٹ لکھنے کا مطالبہ کیا جانے لگا۔

زیرِ نظر کتاب "دلّی کے مشاعرے" سنہ ۱۹۵۰ء سے کر سنہ ۱۹۸۳ء تک کے اہم مشاعروں کی رُوداد ہے۔ سرور تونسوی نے ان مشاعروں میں محض ایک شریک مجلس شخص کا فریضہ ادا نہیں کیا، بلکہ وہ ان مشاعروں میں نکتہ رسی اور سخن شناسی کا ثبوت بھی دیتے ہیں۔ اور ہر غزل پر اپنا بے لاگ تبصرہ کر کے غزل کی تعیین قدر بھی کر ڈالتے ہیں۔ اس ضمن میں ان کی ایک خوبی یہ ہے کہ وہ صداقتِ رائے سے گریز نہیں کرتے اور کسی کو شائستہ رائے کی روشنی میں شعرا پر اثر ہونے کا موقع بھی نہیں دیتے۔ اس کتاب میں سرور تونسوی ایک ناظر کی صورت میں سامنے آتے ہیں جو مشاعرے کے منظر کا ہر سحر کن منظر دیکھتا ہے انہیں لوحِ دل پر محفوظ کر رہا ہے اور اب انہیں کتابی صورت دے کر اس دور کی یادوں کو تازہ کر رہا ہے۔

مشاعرہ اردو تہذیب کا ایک اہم اور دلکش ادارہ تھا، لیکن مرورِ ایام کے ساتھ شاعر تفریح رساں بن گیا اور مشاعرے کا تہذیبی مزاج روبہ زوال ہو گیا۔ یہ کتاب مشاعرے کے عروج کے عہد سے شروع ہوتی ہے اور اس کے زوال آمادہ دور تک کی تاریخ بالواسطہ سامنے لے آتی ہے۔

اسے مکتبہ شانِ ہند نے خوبصورت انداز میں شائع کیا ہے۔

انور سدید

"اوراق" خاص نمبر جون جولائی سنہ ۱۹۹۱ء

ماہنامہ شانِ ہند

جلد ۵۲ شمارہ ۱۰

چیف ایڈیٹر
سرور تونسوی

جوائنٹ ایڈیٹر
مطرب صحرائی

اشاعت کا ۵۲ واں سال

اس شمارے کی اہم جھلکیاں

پرنٹر، پبلشر، پروپرائٹر: وِدیا پرکاش سرور تونسوی
طباعت: خواجہ پریس، جامع مسجد دہلی۔ مقامِ اشاعت: دفتر ماہنامہ "شانِ ہند" فلیٹ ۸ انصاری مارکیٹ، دریا گنج، نئی دہلی ۱۱۰۰۰۲۔

ہندو پرست ہوں نہ مسلماں پرست ہوں
دامن پرست ہوں نہ گریباں پرست ہوں
ہر ذرۂ وطن سے ہے فیاض مجھ کو پیار
یعنی وطن پرست ہوں، انساں پرست ہوں

فیاض گوالیاری

قیمت فی شمارہ — پانچ روپے
قیمت سالانہ — پچاس روپے
لائف ممبری — پانچ سو روپے

ممالکِ غیر میں:-
بذریعہ سمندری ڈاک — ۱۰۰/- روپے
بذریعہ ہوائی ڈاک — ۲۰۰/- روپے

غزل

ڈاکٹر حقیر آستانی مرحوم



طرب ہو، آشتی ہو، خودسری ہو
اور اُس پر جان لیوا بَرہمی ہو
تجھے محفوظ رکھیں جان و دل سے
خدا رکھے اگر اِس میں کمی ہو
کسی کو بے وجہ مسمار کردیں
زیادہ گر نہیں، اِتنی تو پی ہو
وہ دِن آئے ضرور آئے خدایا
ہمیں بھی آپ کی طرح خوشی ہو
کوئی آتا ہو جاتا ہو بلا سے
کسی کے ہاں کسی کا جب بھی جی ہو
بہت ممکن ہے اِس دِل کو تڑپ کر
کسی نے دُور سے آواز دی ہو
حقیرؔ اب شام ہونے جارہی ہے
تری خِدمت گزاری کیا ابھی ہو؟

بلبل چہ گفت؟ و گل چہ شنید؟ و صبا چہ کرد؟

جناب سرور تونسوی علیل ہیں، اس لئے اداریہ نہ لکھ سکے۔
محترم غلام ربانی تاباں کے زرّیں خیالات پیش خدمت ہیں۔

——— مُضطرب صحرائی

سیکولر طاقتوں کے خلاف
گھناؤنی سازش

اب دیکھنا یہ ہے کہ مرکزی حکومت کب تک اس جارحانہ اور غیر قانونی روش کو برداشت کرتی ہے۔

ایک سوچی سمجھی سازش کے تحت اکالی
دل اور خالصتان کے حامی سمرنجیت سنگھ مان
سیکولر طاقتوں کی صفوں میں انتشار پیدا کرنا
چاہتے ہیں۔ سید شہاب الدین اور ابراہیم سلیمان

سیٹھ کی طرح کے قائدین ملت نے اُن کی ہمنوائی
کر کے اپنی فرقہ وارانہ ذہنیت کا مظاہرہ کیا ہے
کیونکہ ہم جنس باہم جنس پرواز؛ مسٹر مان کے بیان
نے اُن کے ..... ارادوں کو پوری طرح بے نقاب
کر دیا ہے۔ انھوں نے کہا کہ ہندوستان میں اکثریت

کے متشددانہ رویے کا مقابلہ کرنے کے لئے سکھوں،
مسلمانوں اور عیسائیوں کی طرح کی اقلیتوں کو متحد
ہو جانا چاہئے۔ انھوں نے ہندوستان کے تمام
ہندوؤں پر متشددانہ رویے کا الزام لگا کر اپنے
جذبۂ دشمنی کا مظاہرہ کیا ہے۔ اس کا اصل اس

حقیقتاً تو یہ ہے کہ ... کی بجائے جنھوں کی ہماری اکثریت فرقہ پرست نہیں۔

اگر اُن کی کوشش کامیاب ہو جائے اور ہندوستان کا اکثریت اور مذہبی اقلیتوں کے دو حصوں میں بٹ جائے تو اس سے کسی بھی مذہبی اقلیت کو کیا فائدہ ہوگا۔ کم سے کم مسلمانوں کو تو اس سے محض نقصان ہوگا۔ مسلمان پورے ملک میں بکھرے ہوئے ہیں۔ اپنے اپنے علاقوں کے ہندو ہمسایوں سے ناتا توڑنے کے بعد کیا وہ وہاں رہ سکیں گے۔

اس کے علاوہ سمرجیت سنگھ مان کی یہ سازش اگر کامیاب ہو جاتی ہے تو ہماری سیکولر طاقتوں کی صفوں میں دراڑیں پڑ جائیں گی جن کے نتیجے میں فرقہ پرستی کے خلاف ہماری جدوجہد کمزور ہو جائے گی۔ بنیادی طور سے اجودھیا کی نزاع ہندو مسلم نزاع نہیں ہے۔ جیسا کہ بارہا کہا جاچکا ہے۔ نہ صرف بابری مسجد بلکہ اس کے قریب واقع وہ مندر بھی سیکولرزم کی علامت بن گئے ہیں جن کو وشو ہندو پریشد کے کارکن مسمار کرکے رام مندر کی تعمیر کے لئے میدان ہموار کرنا چاہتے ہیں۔ یہ تو سنا تھا کہ بڑی مچھلی چھوٹی مچھلیوں کو کھا جاتی ہے، یہ کبھی نہیں سنا تھا کہ بڑا مندر چھوٹے مندروں کو کھا جاتا ہے۔ بہرحال بابری مسجد کی طرح ان کا دفاع بھی نہ صرف سیکولر نظام بلکہ ملک کے استحکام و سالمیت کے دفاع کے مترادف ہے۔ اس وقت جو لڑائی سیکولر طاقتیں لڑ رہی ہیں، اس میں نہ صرف سیکولر سیاسی پارٹیاں بلکہ ہمارے لاکھوں کروڑوں امن پسند اور غیر فرقہ پرست عام لوگ بھی شامل ہیں۔ آپ کو یاد ہوگا کہ نومبر ۱۹۸۹ء میں اجودھیا میں شلانیاس کیا گیا تھا۔ اس وقت ایک نہایت مذہبی مگر سیکولر ذہن رکھنے والے بزرگ و محترم کانگریسی لیڈر کملاپتی ترپاٹھی نے اعلان کیا تھا کہ بابری مسجد کو اگر مسمار کرنے کی کوشش کی گئی تو انھیں پہلا پھاوڑا میری پیٹھ پر مارنا ہوگا۔ وہ محض گفتار کے غازی نہیں تھے جس دن شلانیاس کیا جانے والا تھا وہ ستیہ گرہ کے ارادے سے فیض آباد پہنچ گئے تھے۔ لیکن چونکہ مسجد کو کوئی نقصان نہیں پہنچایا گیا، اس لئے انھوں نے ستیہ گرہ کا ارادہ ملتوی کر دیا۔ مسز شیندرا جونی اور میں اُن سے فیض آباد کے سرکٹ ہاؤس میں ملے تھے۔ اُن کا جملہ ابھی تک میرے کانوں میں گونج رہا ہے "مسجد کو توڑنا مہاپاپ ہے"۔ کہنے کا مقصد یہ ہے کہ سیکولرازم کی لڑائی کسی فرقے تک محدود ہے نہ کسی سیاسی پارٹی تک۔ بلاتفریق مذہب و ملت و سیاست ہندوستان کے وہ تمام عناصر اس میں شامل ہیں جو اپنے ملک سے محبت کرتے ہیں اور اس کی شاندار سیکولر روایات کو زندہ رکھنا چاہتے ہیں۔ سمرجیت سنگھ مان اور اُن کے ہمنوا و ہم خیال بھی اس میں حصہ لے سکتے ہیں اگر وہ ملک اور ملک کے دستور سے وفاداری کا عہد کریں اور اس کا عملی ثبوت پیش کریں۔ بہرحال اس وقت وہ اور کچھ ناعاقبت اندیش قائدین ملک سیکولر طاقتوں کی صفوں میں جو انتشار پیدا کرنے کی کوشش کر رہے ہیں اسے کسی قیمت پر کامیاب نہیں ہونے دیا جائیگا۔ اُن کے ہمنوا قائدین کو وقت سے پہلے صاف طور اعتراض کرنا ہے کہ ان کے سیاسی فلسفے میں ممکن ہے "جناب شیخ کے نقش قدم یوں بھی ہیں اور یوں بھی" کے مصداق ہو لیکن ملک کے دفاع میں سر دھڑ کی بازی لگانے والی سیکولر طاقتوں کو ان سے یہ مطالبہ کرنے کا پورا حق ہے کہ وہ فیصلہ کریں اور اس کا عملی ثبوت پیش کریں کہ بقول کرشن چندر وہ بھا کشتی کے پل کے ادھر ہیں یا اُدھر۔

بنیادی طور سے اجودھیا کی نزاع ہندو مسلم نزاع نہیں ہے جیسا کہ بارہا کہا جاچکا ہے۔ نہ صرف بابری مسجد بلکہ اُس کے قریب واقع وہ مندر بھی سیکولرازم کی علامت بن گئے ہیں جنہیں وشو ہندو پریشد کے کارکن مسمار کرکے رام مندر کی تعمیر کے لئے میدان ہموار کرنا چاہتے ہیں۔

قومی بساط پر فرقہ پرست بڑی شاطرانہ چالیں چل رہے ہیں۔ پچھلے عام انتخابات میں انھوں نے رام مندر کا کارڈ کھیل کر پورا پورا فائدہ اُٹھایا اور اُتر پردیش میں اقتدار حاصل کر لیا۔ ضمنی انتخابات کے پیش نظر انھوں نے ایک دفعہ پھر اجودھیا کے مسئلے کو اُچھالنا شروع کر دیا ہے۔ اُتر پردیش کی حکومت نے بابری مسجد کے پاس واقع نزول اور وقف کی زمین کو اپنی تحویل میں لے لیا ہے۔ وہ اس زمین کو وشو ہندو پریشد کو منتقل کرنا چاہتے ہیں تاکہ رام مندر کی تعمیر شروع کی جا سکے۔ لیکن ہائی کورٹ کے حالیہ فیصلے نے اُن کے ارادوں پہ پانی پھیر دیا۔ فیصلے میں صاف صاف کہا گیا ہے کہ تحویل میں لی جانے والی اراضی پر کوئی مستقل عمارت بنائی جا سکتی ہے نہ تا حکم ثانی اس کو کسی تیسرے فریق یا فریقین کو منتقل کیا جا سکتا ہے۔ اس فیصلے کی وجہ سے بھومی پوجا کے بعد شروع ہونے والا تعمیر کا کام ملتوی کرنا پڑا۔ لیکن اُن کی شرانگیزی جاری ہے۔ پچھلے سال ۳۰، ۳۱ اکتوبر کو اجودھیا میں مارے جانے والے کار سیوکوں کی برسی منانے کے لئے امسال ۳۰، ۳۱ اکتوبر کو "یوم شجاعت" منایا گیا جس میں بھارتی جنتا پارٹی، وشو ہندو پریشد اور بجرنگ دل کے ہزاروں کارکنوں نے حصہ لیا۔ اُن لوگوں نے نہ صرف بابری مسجد کے گنبد پر بھگوا جھنڈے لہرائے بلکہ اُس کی باہری دیوار کو

بھی نقصان پہنچایا۔ یہ سب کچھ ضلع کے اعلیٰ حکام کی موجودگی میں کیا گیا۔

مرکزی وزیر داخلہ نے جب اُتر پردیش کے وزیر اعلیٰ کلیان سنگھ سے رابطہ قائم کیا تو انہوں نے اس کی ذمہ داری کچھ سماج دشمن عناصر پر ڈالی اور حسب معمول بابری مسجد کی پوری حفاظت کرنے کا وعدہ کیا۔ حالانکہ جس وقت یہ حادثہ ہوا ہے اُس وقت بجرنگ دل کے نیتا ونے کٹیار، وی۔ پی سنگھل اور کئی دوسرے اہم لیڈر جائے وقوع پر موجود تھے۔

اب معلوم ہوا کہ سی آر پی کی تعیناتی پر کلیان سنگھ کیوں چراغ پا ہو گئے تھے۔ اگر سی آر پی کے جوان وہاں نہ ہوتے تو مسجد کو اور نقصان پہنچتا۔ اُسی دن ایک اور حادثہ ہوا۔ پارلیمنٹ کے ممبروں اور سابق ممبروں پر مشتمل ایک نو رکنی ٹیم موقع پر حالات کا جائزہ لینے کی غرض سے اجودھیا گئی تھی۔ جب وہ وہاں پہنچے تو انھوں نے دیکھا کہ پولیس کی موجودگی کے باوجود بابری مسجد رام جنم بھومی کا پیلیکس پر بھارتیہ جنتا پارٹی، وشو ہندو پریشد اور بجرنگ دل کے والنٹیرز قابض تھے۔ اور من مانی کر رہے تھے۔ جائزہ کمیٹی کے ممبروں کو دیکھ کر وہ مشتعل ہو گئے اور ان کی گاڑیوں پر سخت سنگ باری بھی کی۔ اُنھوں نے اپنی رپورٹ میں کہا ہے کہ اُتر پردیش کی سرکار نے اجودھیا میں سماج دشمن عناصر کو کھلی چھوٹ دے رکھی ہے۔ انہوں نے یہ بھی کہا ہے کہ مندروں کو مسمار کیا گیا ہے۔ حالانکہ مرلی منوہر جوشی بار بار کہہ چکے ہیں کہ اجودھیا میں کسی مندر کو نقصان نہیں پہنچایا گیا ہے۔ اس کو کہتے ہیں دروغ گو ہم بر روئے تو۔ اب دیکھنا ہے کہ مرکزی حکومت کب تک اس جارحانہ اور غیر قانونی روش کو برداشت کرتی ہے۔

جنتا دل اور بائیں بازو کی پارٹیوں نے اُتر پردیش سرکار کی غیر قانونی اور من مانی کارروائیوں کے خلاف احتجاج کرنے کیلئے دھرنوں اور ریلیوں کا پروگرام بنایا جس کی ابتدا ۲۶ ر اکتوبر کو وزیر اعظم کی رہائش گاہ کے سامنے احتجاجی دھرنے سے ہوئی جس میں جنتا دل اور بائیں بازو کی پارٹیوں کے سرکردہ لیڈروں اور ہزاروں کارکنوں نے شرکت کی۔ اجودھیا میں ۲۹ ر اکتوبر کو دھرنا دیا جانا تھا جس میں شرکت کے لئے کئی اہم لیڈر اجودھیا جانے والے تھے۔ ادھر اجودھیا سے بڑی تشویشناک خبریں آ رہی تھیں۔ وشو ہندو پریشد اور بجرنگ دل کے والنٹیروں نے اجودھیا کی ناکہ بندی کر لی تھی۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ اُتر پردیش سرکار نے اجودھیا میں نظم و نسق کی ذمہ داری اُن کے سپرد کر دی ہے۔ فسطائی طریق کار اور کسے کہتے ہیں؟ بہرحال تصادم کی نوبت نہیں آئی۔ اور حسب توقع حکومت نے امن و امان بحال رکھنے کے بہانے اُن سرکردہ لیڈروں کو راستے ہی میں گرفتار کر لیا۔ اُدھر فیض آباد میں جنتا دل، بائیں بازو کی پارٹیوں اور سماج وادی جنتا پارٹی کے کارکنوں نے احتجاجی ریلی نکالی اور اجودھیا تک مارچ کرنے اور وہاں دھرنا دینے کا اعلان کیا۔ پولیس نے انھیں راستے میں روک دیا اور اور نہایت بے دردی سے اُن پر لاٹھیاں برسائیں جس سے سرکاری اعداد و شمار کے مطابق ۲۵ ر اور اخباری اطلاعات کے مطابق سیکڑوں لوگ زخمی ہوئے جن میں سابق کمیونسٹ ممبر پارلیمنٹ مترسین یادو اور موجودہ پارلیمنٹ کے کمیونسٹ ممبر وشوناتھ شاستری کے علاوہ اور بہت سے مقامی لیڈر شامل تھے۔ اس کے باوجود پروگرام کے مطابق اُتر پردیش کے ہر ضلع کے صدر مقام دھرنوں اور ریلیوں کا سلسلہ جاری ہے۔

نئی تشکیل شدہ قومی یک جہتی کونسل کی میٹنگ دو نومبر کو دہلی میں ہوئی۔ کونسل کے نئے ممبروں کے ناموں کا اعلان ہوتے ہی بھارتیہ جنتا پارٹی کے لیڈروں نے چیخ پکار شروع کر دی۔ وہ چاہتے تھے کہ اس میں آدھا میں، میں کے نمائندوں کو بھی شریک کیا جائے۔ اس کے بعد انھوں نے میٹنگ کے انعقاد کی تاریخ کی مخالفت شروع کر دی۔ وجہ ظاہر ہے۔ وہ چاہتے تھے کہ ضمنی انتخابات سے پہلے اُن کے سیاہ کرتوتوں کا پردہ فاش نہ کیا جا سکے تاکہ عام انتخابات کی طرح ضمنی انتخابات میں بھی اُن سے پورا پورا فائدہ اٹھائیں۔ بہرحال مقررہ تاریخ پر کونسل کی میٹنگ ہوئی جس میں فرقہ پرست بالکل الگ تھلگ ہو کر رہ گئے۔

وزیر اعظم نے افتتاحی تقریر میں کہا کہ بابری مسجد رام جنم بھومی کے حساس مسئلے پر سنجیدگی سے غور کیا جانا چاہئے۔ دوسرے لیڈروں نے بھی اسی قسم کے خیالات کا اظہار کیا۔ صرف بھارتیہ جنتا پارٹی کے نمائندے اجودھیا کے مسئلے پر سے توجہ ہٹانے کے لئے کشمیر، پنجاب اور آسام کے مسائل پر زور دیتے رہے۔ ان مسائل کی اہمیت سے کسی کو انکار نہیں لیکن یہ جلسہ خصوصیت سے اجودھیا کے مسئلے پر غور کرنے کے لئے طلب کیا گیا تھا۔ اُس صورت حال پر غور کرنے کے لئے جس اُتر پردیش کی سرکار اور وشو ہندو پریشد کی ملی بھگت سے ہائی کورٹ کے فیصلوں کی صریحاً خلاف ورزی کی جا رہی ہے اور مندروں کو مسمار کر کے رام مندر کی تعمیر کے لئے میدان تیار کیا جا رہا ہے جس کا یہ ہے کہ اس کے دوارکا پیٹھ کے شنکر آچاریہ سوامی سروپانند جی کو بھی احتجاج کرنا پڑا۔ جنھوں نے اجودھیا میں مندروں کی توڑ پھوڑ نہ صرف غلط بلکہ ہندو دھرم کے منافی قرار دیا اور تعمیر نو کا مطالبہ کیا۔ آخر میں کونسل میں ایک قرارداد اتفاق رائے

مسلمان پورے ملک میں بکھرے ہوئے ہیں۔ اپنے اپنے علاقوں کے ہندو بھائیوں سے ناتا توڑنے کے بعد کیا وہ وہاں رہ سکیں گے؟

سے منظور کی گئی جس میں ہندوستان کے لوگوں سے
اپیل کی گئی کہ وہ ملک کے اتحاد اور یک جہتی اور اس
کے سیکولر جمہوری نظام کو درپیش کسی بھی چیلنج کا
متحد ہو کر مقابلہ کریں۔ مزید قرارداد میں اجودھیا
کے حالیہ حادثات پر تشویش کا اظہار کیا گیا اور
اس مسئلے کا اطمینان بخش حل تلاش کرنے اور
امن و امان برقرار رکھنے کی پُرزور اپیل کی گئی۔ کونسل

کی میٹنگ نے ایک دفعہ پھر ظاہر کر دیا کہ ہندوستان
میں سیکولر طاقتوں کی کمی نہیں اور بشرط ضرورت
متحدہ اقوام بھی کر سکتی ہیں۔ کونسل کا منظر نامہ
دلچسپ بھی تھا اور فرقہ پرستوں کے لئے عبرت
انگیز بھی۔

بہر حال انتہائی تشویشناک حالات کے باوجود
مایوسی کی کوئی وجہ نہیں ہے۔ یہ ضرور ہے کہ فرقہ
پرستی کے خلاف لڑائی جاری رکھتے ہوئے ہمیں
دوست نما دشمنوں سے ہوشیار رہنا ہوگا۔ اور
مسلمانوں کی حمایت کے نام پر سیکولر طاقتوں کے
خلاف جو سازشیں کی جارہی ہیں اُن کا ڈٹ کر
مقابلہ کرنا ہوگا۔

لہو کا قرض



اختر شاہجہاں پوری

چراغوں کی لوؤں سے جگنوؤں کی نمنابہٹ تک
ستاروں کی نمائش سے لہو کی آزمائش تک
اُجالا ہی اُجالا دشت و صحرا میں
گھٹاؤں اور ہواؤں میں
چمن کے چپّے چپّے میں
جفا کی تازہ کاری میں
گلابوں کی مہک میں رنگ و بُو میں ہے
کسے معلوم تھا ایسا بھی کوئی شخص آئے گا
جو اپنے سینے سے گلابوں کو لگائے گا
اور ان کو محترم کر دے گا دُنیا کی نگاہوں میں
وہی جو خادم حق کا تھا پجاری
اور غریبوں کا مسیحا تھا
وطن کے ذرّے ذرّے سے جسے بے حد محبت تھی
محبت تھی بہاروں سے خزاں بھی جس کو پیاری تھی
نہیں ثانی تھا جس کا کوئی بھی تو علم و دانش میں
اُسی کے علم اور تدبیر ہی سے اُسی کے زیرِ سایہ ہی
بلا تھا رنگ و نکہت کا خزانہ اس گلِ تر کو
کہ جس نے ساری دُنیا میں چمن کا نام روشن کر دیا لوگو
اسی کا نام تھا راجیو گاندھی
سربراہِ مملکت تھا وہ
جسے مسجد بھی پیاری تھی جسے مندر بھی پیارا تھا
جسے ہر دھرم سے تھی آستھا
جس کی نظر میں سب برابر تھے
اگر وہ آرتی مندر میں کرتا تھا
مزاروں پر بھی گلہائے عقیدت پیش کرتا تھا
بڑے مشکل مراحل سے گزر جاتا تھا آسانی سے وہ اختر
وطن کو ایک رکھنے کے لئے اپنا لہو تک جس نے دے ڈالا
لہو کا قرض ہم اس کا اُتاریں گے
وطن میں ایکتا رکھ کر
دلوں میں جذبۂ مہر و وفا رکھ کر



کل کی دنیا
باپو کی نظر میں



"آنے والے کل کی دنیا عدم تشدّد پر مبنی ہوگی، ہونی بھی چاہیئے۔ یہ بنیادی اُصول ہے باقی سب کچھ خود بخود ہوتا چلا جائے گا۔
شخص، جماعتوں اور قوموں سب کو عدم تشدّد اور پیار محبّت کا راستہ ہی اختیار کرنا پڑے گا۔
اگر ایسا ہوا تو آنے والے کل کی دنیا میں نہ غریبی ہوگی، نہ لڑائیاں ہوں گی، نہ انقلاب اور نہ ہی قتل و غارت ہوگا۔"

ترقی کے راستہ پر ــــــ امن کے ساتھ

مُنشی پریم چند کی کہانی اُن کی زبانی

دیا نرائن نگم

منشی دیا نرائن نگم نے ۱۹۳۶ء میں منشی پریم چند کی وفات کے بعد "زمانہ" کانپور کا پریم چند نمبر ترتیب دیا تھا۔ اس نمبر میں انھوں نے منشی پریم چند کا خود اپنے بارے میں لکھا ہوا ایک مضمون شائع کیا تھا۔ منشی پریم چند نے یہ مضمون رسالہ "ہنس" بنارس کے "آتم کتھا" نمبر کے لئے لکھا تھا۔ اس نمبر میں مشاہیر ادب اور دیگر معززین ملک کے خود نوشت حالات زندگی شائع کئے گئے تھے۔ منشی پریم چند نے "جیون سار" کے عنوان سے اپنے حالات زندگی قلمبند کئے جن کو منشی دیا نرائن نگم نے "زمانہ" کے "پریم چند نمبر" میں شائع کیا تھا —— یہ مضمون "زمانہ" سے ماخوذ ہے۔

میری زندگی ہموار میدان کی طرح ہے جس میں کہیں کہیں گڑھے تو ہیں لیکن ٹیلوں، پہاڑوں، گھنے جنگلوں اور غاروں کا پتہ نہیں ہے۔ جن حضرات کو پہاڑوں کی سیر کا شوق ہو، انھیں یہاں مایوسی ہوگی۔

میرا جنم ۱۸۸۰ء میں ہوا۔ والد ایک ڈاک خانے میں کلرک تھے۔ والدہ مریض تھیں۔ ایک بڑی بہن بھی تھی۔ اس وقت والد شاید بیس روپے پاتے تھے۔ چالیس روپے تک پہنچتے پہنچتے اُن کا انتقال ہو گیا۔ یوں تو وہ بڑے دور اندیش، محتاط اور دنیا بین آدمی تھے، آنکھیں کھول کر چلنے والے آدمی تھے، لیکن آخر عمر میں ایک ٹھوکر کھا ہی گئے۔ اور خود تو گرے ہی تھے اسی دھکے میں مجھے بھی گرا دیا۔ پندرہ برس کی عمر میں انھوں نے میری شادی کر دی جس کے چند سال بعد ہی انھیں بخار [illegible] آخر [illegible] بیکس ہو گیا۔ اس وقت میں نویں کلاس میں پڑھتا تھا۔ گھر میں میری بیوی، سوتیلی ماں، اور اُن کے دو لڑکے تھے مگر آمدنی ایک پیسے کی نہ تھی۔ گھر میں جو کچھ تھا، چھ ماہ تک والد کی علالت اور اس کے بعد تجہیز و تکفین میں خرچ ہو گیا۔ مجھے ایم اے پاس کر کے وکیل بننے کا ارمان تھا۔ سرکاری ملازمت اس زمانے میں اتنی ہی مشکل سے ملتی تھی جتنی کہ اب۔ دوڑ دھوپ کر کے شاید دس بارہ روپے کی کوئی جگہ پا جاتا مگر یہاں تو آگے پڑھنے کی دُھن تھی، پاؤں میں لوہے کی نہیں اشٹ دھات کی بیڑیاں پڑی ہوئی تھیں اور میں پہاڑ پر چڑھنا چاہتا تھا۔

پاؤں میں جوتے نہ تھے۔ بدن پر ثابت کپڑے نہ تھے۔ گرانی الگ۔ دس سیر کے جو تھے، اسکول سے ساڑھے تین بجے چھٹی ملتی تھی۔ کوئنس کالج بنارس میں پڑھتا تھا۔ ہیڈ ماسٹر صاحب نے فیس معاف کر دی تھی۔ امتحان سر پر تھا اور میں باس پھاٹک پر ایک لڑکے کو پڑھانے جاتا تھا

کرتا تھا۔ جاڑے کا موسم تھا، چار بجے شام کو پہنچ جایا کرتا تھا اور چھ بجے چھٹی پاتا تھا۔ وہاں سے میرا گھر پانچ میل پر تھا۔ تیز چلنے پر بھی آٹھ بجے رات سے پہلے گھر نہ پہنچ سکتا تھا۔ سویرے پھر آٹھ بجے گھر سے چل دیتا ورنہ وقت پر اسکول نہ پہنچتا۔ رات کو کھانا کھا کر کپی کے سامنے پڑھنے بیٹھتا اور نہ معلوم کب سو جاتے۔

میٹرکولیشن تو کسی طرح پاس ہو گیا لیکن سیکنڈ ڈویژن میں پاس ہوا اور کوئنس کالج میں داخلے کی کوئی امید نہ رہی۔ جنھیں صرف اول درجے میں پاس ہونے والوں کی معافی ہو سکتی تھی۔ خوش قسمتی سے اسی سال ہندو کالج کھل گیا تھا۔ میں نے اس نئے کالج میں پڑھنے کا ارادہ کیا۔ مسٹر رچرڈسن پرنسپل تھے۔ ان کے مکان پر گیا۔ وہ سر سے پاؤں تک ہندوستانی لباس میں ملبوس تھے اور دھوتی پہنے فرش پر بیٹھے کچھ لکھ رہے تھے۔ لیکن مزاج تبدیل کرنا اتنا آسان نہ تھا۔ میری گزارش سن کر، ابھی میں آدھی ہی بات کہہ پایا تھا، بولے کہ "گھر پر میں کالج کی بات نہیں سنتا!" ناچار کالج گیا۔ ملاقات تو ہوئی مگر نا امیدی کے سوائے کوئی نتیجہ نہ نکلا۔ اب کیا کروں۔ اگر کسی کی سفارش لے آتا تو شاید میری درخواست پر غور ہوتا۔ لیکن ایک دیہاتی لڑکے کو شہر میں جانتا ہی کون تھا۔

روز گھر سے اسی ارادے سے نکلتا کہ کہیں سے سفارش لکھا لاؤں لیکن بارہ میل کی منزل مار کر شام کو لوٹ ہی گھر واپس آ جاتا۔ شہر میں کوئی بات پوچھنے والا بھی نہ تھا۔

کئی دنوں کے بعد ایک سفارش ملی۔ ایک صاحب ٹھاکر اندرنارائن سنگھ ہندو کالج کی مجلس انتظامیہ کے کارکن تھے۔ ان سے جا کر رویا۔ انھیں مجھ پر رحم آ گیا اور انھوں نے سفارشی چٹھی لکھ دی۔ اس وقت میری خوشی کی انتہا نہ تھی۔ بہرحال خوش خوش گھر آیا۔ دوسرے دن پرنسپل صاحب سے ملنے کا ارادہ تھا لیکن گھر پہنچتے ہی مجھے بخار آ گیا اور دو ہفتے سے پہلے نہ اترا۔ نیم کا کاڑھا پیتے پیتے ناک میں دم آ گیا۔ ایک دن دروازے پر بیٹھا ہوا تھا کہ میرے پروہت جی آ گئے۔ میری حالت دیکھ کر مزاج پرسی کی اور فوراً کسی کھیت سے ایک جڑ کھود لائے اور اسے دھو کر سات دانے کالی مرچ کے ساتھ پیس کر مجھے پلا دیا۔ اس نے جادو کا اثر کیا۔ بخار چڑھنے میں گھنٹے بھر کی دیر تھی مگر اس دوا نے گھنٹے بھر کے اندر ہی گویا اس کا گلا گھونٹ دیا۔ میں نے پنڈت جی سے بار بار اس جڑی کا نام پوچھا مگر انھوں نے نہ بتایا۔ کہا نام بتانے سے اس کا اثر جاتا رہے گا۔

ٹھاکر اندرنارائن صاحب کا سفارشی خط لے کر جب میں پرنسپل صاحب کے پاس پہنچا تو... انھوں نے مجھ سے سوال کیا۔

"اتنے دنوں تک کہاں تھے؟"

"بیمار ہو گیا تھا۔"

"کیا بیماری تھی؟"

میں اس سوال کے لیے تیار نہ تھا۔ اگر بخار بتاتا ہوں تو شاید صاحب مجھے جھوٹا سمجھیں۔ بخار میری سمجھ میں معمولی بات تھی جس کے لیے اتنی لمبی غیر حاضری کی ضرورت نہ تھی۔ کوئی ایسی بیماری بتانے کی فکر ہوئی جو مجبوری اور تکلیف کے علاوہ رحم کے جذبات کو بھی ابھار سکے۔ اس وقت مجھے اور کسی بیماری کا نام یاد نہ آیا۔ ٹھاکر اندرنرائن سنگھ سے جب میں سفارش کے لیے ملا تھا تو انھوں نے اپنے اختلاج قلب کے مرض کا ذکر کیا تھا۔ ان کے الفاظ مجھے یاد آ گئے۔

میں نے کہا "پلپیٹیشن آف ہارٹ سر"
Palpitation of heart sir.
صاحب نے متعجب ہو کر میری طرف دیکھا اور کہا۔

"اب تم بالکل اچھے ہو؟"

"جی ہاں!"

"اچھا فارم داخلہ بھر کر لاؤ۔"

میں نے سمجھا چلو بیڑا پار ہوا۔ فارم لیا، خانہ پری کی اور پیش کر دیا۔ صاحب اس وقت کسی کلاس میں پڑھا رہے تھے۔ تین بجے مجھے فارم واپس ملا۔ اس پر لکھا تھا "اس کی لیاقت کی جانچ کی جائے۔"

یہ نیا مرحلہ پیش آیا تو میرا دل بیٹھ گیا۔ انگریزی کے سوا اور کسی مضمون میں پاس ہونے کی امید نہ تھی اور حساب و ریاضی سے تو میری روح کانپتی تھی۔ جو کچھ یاد تھا وہ بھی بھول گیا تھا۔ اب کوئی دوسری صورت کیا ہو سکتی تھی۔ تقدیر پر بھروسہ کر کے کلاس میں گیا اور اپنا فارم دکھایا۔ پروفیسر صاحب بنگالی تھے۔ انگریزی پڑھا رہے تھے۔ واشنگٹن ارونگ کا "RIP VAN WINKLE" کا سبق تھا۔ میں پیچھے کی قطار میں جا کر بیٹھ گیا اور دو ہی چار منٹ میں مجھے معلوم ہو گیا کہ پروفیسر صاحب اپنے مضمون پر پوری طرح حاوی ہیں۔ گھنٹہ ختم ہو جانے پر انھوں نے آج کے سبق پر مجھ سے مختلف سوالات کیے اور میرے جوابات سن کر میری عرضی پر "اطمینان بخش" کا لفظ لکھ دیا۔

دوسرا گھنٹہ حساب کا تھا۔ اس کے پروفیسر بھی بنگالی تھے۔ میں نے اپنا فارم دکھایا۔ نئی درسگاہوں میں عموماً وہی طلبہ آتے ہیں جنھیں کہیں جگہ نہیں ملتی۔ یہاں بھی یہی حال تھا۔ کلاسوں میں کم استعداد اور ناقابل طلبہ بھرے پڑے تھے۔ پہلے ریلے میں جو آیا وہ بھرتی ہو گیا۔

پروفیسر صاحب نے حساب میں میرا امتحان لیا اور میں فیل ہو گیا۔ فارم پر حساب کے خانے میں "ناقابل اطمینان" لکھ دیا گیا۔

میں اتنا نا امید ہوا کہ فارم لے کر پھر دوبارہ پرنسپل کے پاس نہ گیا، سیدھا گھر چلا گیا۔ حساب میرے لیے ہمالیہ کی چوٹی تھی جس پر میں کبھی نہ چڑھ سکا۔ انٹرمیڈیٹ کے امتحان میں حساب میں دو مرتبہ فیل ہوا اور نا امید ہو کر امتحان دینا چھوڑ دیا۔ دس بارہ سال کے بعد جب ریاضی کا مضمون اختیاری ہو گیا تو میں نے دوسرا سبجیکٹ لے کر آسانی سے انٹرمیڈیٹ پاس کر لیا۔ اس وقت تک ریاضی کی بدولت صدہا طلبا کی آرزوؤں کا خون ہوا۔ خیر میں نا امید ہو کر گھر لوٹ آیا لیکن پڑھنے کی تمنا باقی رہی۔

گھر بیٹھ کر کیا کرتا۔ کسی طرح حساب بخش کر کے پھر کالج میں داخل ہو جاؤں، یہی دھن تھی مگر اس کے لئے شہر میں رہنا ضروری تھا۔ اتفاق سے ایک وکیل صاحب کے لڑکوں کو پڑھانے کا کام مل گیا۔ پانچ روپے تنخواہ ٹھہری۔ میں نے دو روپے میں گزر کر کے تین روپے گھر دینے کا مصمم ارادہ کر لیا۔ وکیل صاحب کے اصطبل کے اوپر ایک چھوٹی سی کچی کوٹھری تھی۔ اس میں رہنے کی اجازت مل گئی۔ ایک ٹاٹ کا ٹکڑا بچھا لیا۔ بازار سے ایک چھوٹا سا لیمپ لے آیا اور شہر میں رہنے لگا۔ گھر سے کچھ برتن بھی لایا۔ ایک وقت کھچڑی پکا لیتا اور برتن دھو مانجھ کر لائبریری چلا جاتا۔ حساب تو بہانہ تھا، ناول وغیرہ پڑھا کرتا۔ پنڈت رتن ناتھ کا "فسانۂ آزاد" انھیں دنوں پڑھا۔ چندرکانتا سنتتی بھی پڑھا۔ بنکم بابو کے اردو ترجمے بھی جتنے بھی لائبریری میں ملے سب پڑھ ڈالے۔ جن وکیل صاحب کے لڑکوں کو پڑھاتا تھا، اُن کے سالے میٹریکولیشن میں میرے ساتھ پڑھتے تھے۔ انھیں کی سفارش سے مجھے یہ ٹیوشن ملا تھا۔ اس کی دوستی کی وجہ سے جب ضرورت ہوتی پیسے اُدھار لیا کرتا اور تنخواہ ملنے پر حساب بیباق کر دیتا۔ کبھی دو روپے ہاتھ آتے کبھی تین۔ جس دن تنخواہ کے دو تین روپے ملتے، میری قوتِ ارادی کی باگ ڈھیلی ہو جاتی۔ للچائی آنکھیں حلوائی کی دکان کی طرف کھنچ جاتیں اور دو تین آنے کے پیسے ختم کئے بغیر واپس نہ آتا۔ پھر اسی دن گھر جاتا اور دو ڈھائی روپے دے آتا۔ دوسرے دن سے پھر اُدھار لینا شروع کر دیتا لیکن کبھی کبھی اُدھار لینے میں پس و پیش بھی ہوتا۔ جس کی وجہ سے سارا دن روزہ رکھنا پڑتا۔

اسی طرح چار پانچ مہینے گزر گئے۔ اسی درمیان ایک بزاز سے دو ڈھائی روپے کے کپڑے سلوائے تھے۔ روز ادھر سے نکلنا ہوتا تھا۔ اس کا مجھ پر پورا بھروسہ تھا۔ جب مہینے دو مہینے ہو گئے اور میں روپے نہ چکا سکا تو پھر میں نے ادھر سے نکلنا ہی چھوڑ دیا۔ چکر دے کر نکل جاتا۔ تین سال کے بعد اس کے روپے ادا کر سکا۔ اسی زمانے میں شہر کا ایک بیلدار مجھ سے ہندی پڑھنے آیا کرتا تھا۔ اس کا گھر وکیل صاحب کے مکان کی پشت پر تھا۔ "جان لوبھیا" اس کا سخن تکیہ تھا۔ چنانچہ سب لوگ اُسے "جان لوبھیا" ہی کہا کرتے تھے۔ ایک مرتبہ میں نے اس سے آٹھ آنے پیسے اُدھار لے لئے تھے۔ یہ پیسے اس نے مجھ سے میرے گھر گاؤں میں جا کر پانچ برس کے بعد وصول کئے۔ اب بھی میری پڑھنے کی خواہش تھی لیکن روز بروز نا اُمید ہوتا جاتا تھا۔ جی چاہتا تھا کہ کہیں نوکری مل جائے تو کر لوں۔ لیکن نوکری کس طرح اور کہاں ملتی ہے، یہ مجھے معلوم نہ تھا۔

جاڑے کا موسم تھا۔ گھر کوڑی پاس نہ تھی۔ دو دن تک تو ایک ایک پیسے کے چنے بھونے چبے کھا کر کاٹے۔ میرے مہاجن نے ادھار دینے سے انکار کر دیا تھا۔ اور میں لحاظ کے مارے سائیس سے مانگنے کی جرأت نہ کر سکتا تھا۔ چراغ جل چکے تھے۔ اس وقت میں ایک بک سیلر کی دکان پر ایک کتاب بیچنے گیا جو پروفیسر چکرورتی کی بنائی ہوئی ارتھمیٹک کی شرح تھی۔ اور جسے میں نے دو سال ہوئے خریدی تھی۔ اب تک اسے بڑی احتیاط سے رکھا تھا۔ لیکن آج جب چاروں طرف سے مایوس ہو گیا تو اسے فروخت کرنے کا ارادہ کیا۔ کتاب کی قیمت دو روپے تھی، لیکن ایک روپے پر سودا ہوا۔ میں روپیہ لے کر دکان سے اُترا ہی تھا کہ لمبی مونچھوں والے ایک مہذب شخص نے مجھ سے پوچھا۔

"تم یہاں کہاں پڑھتے ہو؟"

میں نے کہا "پڑھتا تو کہیں نہیں۔ ہاں کہیں نام لکھانے کی فکر میں ہوں۔"

"میٹریکولیشن پاس ہو؟"

"جی ہاں۔"

"نوکری تو نہیں چاہیے؟"

"نوکری کہیں ملتی ہی نہیں۔"

یہ صاحب کسی اسکول کے ہیڈ ماسٹر تھے۔ اور انھیں ایک اسسٹنٹ ماسٹر کی ضرورت تھی۔ اٹھارہ روپے تنخواہ پر مجھے ملازم رکھ لیا۔ اس وقت یہ اٹھارہ روپے میری بلند نگاہی کی معراج تھے۔ میں دوسرے دن ہیڈ ماسٹر صاحب کے پاس حاضر ہونے کا وعدہ کر کے چلا تو پاؤں زمین پر نہ پڑتے تھے۔ یہ ۱۸۹۹ء کی بات ہے۔ میں گرد و پیش کے حالات کا مقابلہ کرنے کے لئے تیار تھا۔ اور اگر ریاضی کی وجہ سے اٹک نہ جاتا تو ضرور آگے تک جاتا مگر ریاضی نے سارے ارمان خاک میں ملا دیئے۔

پہلے پہل ۱۹۰۷ء میں میں نے کہانیاں لکھنی شروع کیں۔ ڈاکٹر رابندر ناتھ کی کئی کہانیاں میں نے انگریزی میں پڑھی تھیں۔ ان میں سے بعض کا ترجمہ کیا۔ اور پہلا ناول تو میں نے ۱۹۰۱ء ہی میں لکھنا شروع کیا۔ میرا ایک ناول ۱۹۰۲ء میں شائع ہوا اور دوسرا ۱۹۰۴ء میں۔ لیکن کہانیاں سب سے پہلے ۱۹۰۷ء میں ہی لکھیں۔ میری پہلی کہانی کا نام تھا "دنیا کا سب سے انمول رتن"۔ وہ ۱۹۰۷ء میں رسالہ "زمانہ" میں چھپی۔ اس کے بعد میں نے "زمانہ" میں چار پانچ کہانیاں اور لکھیں۔ ۱۹۰۹ء میں پانچ کہانیوں کا مجموعہ "سوزِ وطن" کے نام سے "زمانہ پریس" کانپور سے شائع ہوا۔ اس وقت ملک میں تقسیم بنگالہ کی شورش برپا تھی اور کانگریس میں "گرم دل" بنیاد پڑ چکی تھی۔ ان پانچ کہانیوں میں حبِّ وطن کا ترانہ گایا گیا تھا۔

اس وقت میں سررشتۂ تعلیم میں سب ڈپٹی انسپکٹر مدارس تھا اور ہمیرپور کے ضلع میں تعینات تھا۔ کتاب کو نکلے چھ مہینے ہو چکے تھے۔ ایک دن رات میں اپنے کیمپ میں بیٹھا ہوا تھا کہ کلکٹر صاحب کا پروانہ پہنچا کہ "فوراً آ کر مجھ سے ملو۔" جاڑے کا موسم تھا۔ میں نے بیل گاڑی جتوائی اور راتوں رات تیس چالیس میل کا سفر طے کر کے دوسرے دن صاحب سے ملا۔ اُن کے

سامنے "سوزِ وطن" کی ایک جلد رکھی ہوئی تھی۔ میرا ماتھا ٹھنکا۔ اس وقت میں "نواب رائے" کے نام سے لکھا کرتا تھا۔ مجھے اس کا کچھ پتہ چل چکا تھا کہ خفیہ پولیس اس کتاب کے مصنف کی کھوج میں ہے۔ میں سمجھ گیا کہ ان لوگوں نے مجھے کھوج نکالا اور صاحب کلکٹر نے اسی کی جواب دہی کے لئے مجھے بلایا ہے۔

صاحب نے مجھ سے پوچھا۔ "کیا یہ کتاب تم نے لکھی ہے؟"

میں نے کہا "ہاں"

صاحب نے ایک ایک کہانی کا مجھ سے مطلب پوچھا اور آخر میں بگڑ کر بولے "تمہاری کہانیوں میں حکومتِ وقت کے خلاف باتیں ہیں۔" بہت دیر اس پر بحث رہی آخر کار یہ فیصلہ ہوا کہ میں "سوزِ وطن" کی کاپیاں سرکار کے حوالے کر دوں اور آئندہ صاحب سے اجازت لئے بغیر کچھ نہ لکھوں۔ میں سمجھا کہ چلو سستا چھوٹ گیا۔ کل ہزار کاپیاں چھپی تھیں اور ابھی مشکل سے تین سو جلدیں فروخت ہو سکی تھیں۔ میں نے بقیہ سات سو کاپیاں زمانہ پریس سے منگا کر صاحب کی نذر کر دیں۔

میں یہ سمجھا بلا ٹل گئی، لیکن افسرانِ محکمہ کی اس سے سیری نہ ہوئی۔ چنانچہ جیسا کہ مجھے بعد میں معلوم ہوا کلکٹر صاحب نے ضلع کے دوسرے افسروں سے بھی مسئلہ بارے میں مشورہ کیا۔ سپرنٹنڈنٹ پولیس، دو ڈپٹی کلکٹر اور ڈپٹی انسپکٹر مدارس، جن کا میں ماتحت تھا میری تقدیر کا فیصلہ کرنے بیٹھے۔ ایک ڈپٹی کلکٹر صاحب نے میری کہانیوں سے ثابت کیا کہ ان میں شروع سے لے کر آخر تک باغیانہ خیالات اور انقلاب انگیز جذبات کے سوا اور کچھ نہیں۔ محکمۂ پولیس کے خداوند نے کہا کہ ایسا خطرناک آدمی سخت سزا کا مستحق ہے ڈپٹی انسپکٹر صاحب کو مجھ سے بڑی محبت تھی۔ اس ڈر سے کہ کہیں معاملہ طول نہ پکڑے، انھوں نے کہا کہ وہ دوستانہ طریقے پر مسئلہ سیاسی خیالات کا پتہ لگا کر کمیٹی کے سامنے اپنی رپورٹ پیش کریں گے۔ دراصل اُن کا ارادہ تھا کہ مجھے سمجھا بجھا کر رپورٹ میں لکھ دیں کہ مصنف صرف قلم کا مرد ہے اگر سیاسی امور سے اُسے کوئی دلچسپی نہیں ہے کمیٹی نے اس مشورے کو پسند کیا حالانکہ پولیس کے خداوند اس وقت بھی پینترے بدلتے رہے۔

مگر کلکٹر صاحب نے ڈپٹی صاحب سے پوچھا۔ "آپ کو اُمید ہے کہ وہ اپنے دل کی باتیں آپ سے کہہ دے گا؟"

ڈپٹی صاحب نے کہا۔ "اس سے میری گہری دوستی ہے۔"

"آپ دوست بن کر اس کے دل کی تھاہ لینا چاہتے ہیں، میں اسے کمینہ پن سمجھتا ہوں۔"

ڈپٹی صاحب اس جواب کے لئے تیار نہ تھے۔ صاحب کی باتوں سے مرعوب ہو کر بولے۔ "میں حضور کے حکم....." مگر صاحب نے بیچ ہی میں بات کاٹ دی۔

"نہیں، یہ میرا حکم نہیں ہے۔ میں ایسا حکم نہیں دینا چاہتا۔ اگر کتاب سے سازشی ثابت ہوتا ہو تو مصنف پر کھلی عدالت میں مقدمہ چلایا جانا چاہیئے ورنہ تنبیہ کر کے چھوڑ دیجئے۔ منہ میں رام اور بغل میں چھری مجھے پسند نہیں۔"

جب کئی دن بعد یہ واقعہ ڈپٹی صاحب نے مجھ سے بیان کیا تو میں نے پوچھا "کیا آپ سچ مچ میری مخبری کرتے؟"

وہ ہنس کر بولے "نہیں، یہ ناممکن تھا۔ کوئی لاکھ روپے بھی دیتا تو بھی میں ایسا نہ کرتا۔ میں تو صرف عدالتی کارروائی روکنا چاہتا تھا اور میں خوش ہوں کہ وہ رک گئی۔ مقدمہ عدالت میں جاتا تو سزا ہو جانا یقینی تھی۔ یہاں آپ کی پیروی کرنے والا کوئی نہ تھا مگر صاحب بڑے شریف آدمی ہیں۔" میں نے بھی منظور کیا کہ واقعی بہت شریف ہیں۔

میں بیس برس ہی میں تھا کہ مجھے پچپش کی شکایت پیدا ہو گئی۔ گرمی کے دنوں میں یہاں کوئی سبز ترکاری نہ ملتی تھی۔ ایک بار کئی دن لگاتار خشک اور سی کھانا پڑی ایک روز پیٹ میں ایسا درد ہوا کہ تمام دن مچھلی کی طرح تڑپتا رہا۔ چورن کھایا، پیٹ پر گرم بوتل پھیری، جامن کا عرق پیا، غرض دیہات میں جتنی دوائیں مل سکتی تھیں سب کھائیں لیکن درد کم نہ ہوا۔ دوسرے دن پچپش ہو گئی لیکن درد جاتا رہا۔

اسی طرح ایک مہینہ ختم ہو گیا۔ اس کے بعد میں ایک قصبے میں پہنچا تو وہاں کے تھانیدار صاحب نے مجھ سے تھانے ہی میں ٹھہرنے اور کھانے کو کہا۔ کئی دن سے مونگ کی دال کھاتے کھاتے اور پرہیز کرتے کرتے پریشان ہو گیا تھا۔ سوچا کیا ہرج ہے۔ آج یہیں ٹھہر جاؤ۔ کھانا تو لذیذ ملے گا۔ تھانے میں ہی رک جایا۔ دارو غہ جی نے زمین قند پکوایا، پکوڑیاں، دہی بڑے پلاؤ سب کچھ بنوایا۔ میں نے بھی خاص طور پر کھایا۔ لیکن کھانا کر جب تھانے میں دارو غہ جی کے پھوس کے بنگلے میں لیٹا تو دو ڈھائی گھنٹے کے بعد پھر پیٹ میں درد ہونے لگا۔ ساری رات اور اگلے دن پھر کراہتا رہا۔ سوڈے کی دو بوتلیں پینے کے بعد قے ہوئی تو چین ملا۔ مجھے یقین ہو گیا کہ یہ تمام زمین قند کی خرابی ہے۔ تب سے دارو غہ اور زمین قند دونوں کی صورت دیکھ کر کانپ جاتا ہوں۔ درد تو خیر جاتا رہا لیکن پچپش کی دائمی شکایت ہو گئی۔ پیٹ جلد میں گھنٹے تنا رہتا۔ اپھرن کی شکایت برابر قائم رہی۔ کچھ دنوں تک روزانہ بلا ناغہ چار پانچ میل ٹہلنے جاتا۔ کسرت کرتا، پرہیزی کھانا کھاتا اور کوئی نہ کوئی دوا بھی کھایا کرتا۔ لیکن پچپش میں کوئی کمی نہ ہوئی۔ اور بدن بھی سوکھتا جاتا تھا۔ کئی مرتبہ کا ہجو اکر "تارچ" کروایا۔ ایک بار مہینے بھر الہ آباد میں آیورویدک اور ڈاکٹری دوائیں کھاتا رہا لیکن کوئی فائدہ نہ ہوا۔ تب میں نے اپنے تبادلے کی درخواست کی چاہتا تو یہ تھا کہ روہیلکھنڈ میں تبدیلی ہو مگر بستی کے ضلع میں اور وہ حلقہ جا ہو نیپال کی ترائی کے قریب ہے مگر یہاں بھی طبیعت ٹھیک نہ رہی لہٰذا چھ مہینے

کی جھونجھی اور لکھنؤ کے میڈیکل کالج میں علاج کرایا۔ یہاں فائدہ نہ ہوا تو بنارس کے ایک حکیم کا علاج کیا۔ تین چار مہینے کے بعد تھوڑا فائدہ معلوم ہوا لیکن بیماری جڑ سے نہ گئی۔ رخصت کے بعد جب پھر بستی پہنچا تو وہی حالت ہو گئی۔ تب میں نے دورے کی نوکری چھوڑ کر بستی ہائی اسکول میں اسکول ماسٹری قبول کر لی۔ یہاں سے تبدیل ہو کر گورکھپور پہنچا، مگر پیچش کی شکایت قائم رہی۔ یہاں میرا تعارف مہابیر پرشاد جی پوددار سے ہوا۔ جو ہندی لٹریچر کے فاضل، مادر وطن کے سچے خادم اور بڑے جفاکش و محنتی شخص ہیں۔ میں نے بستی میں ہی ہندی کے رسالہ "سرسوتی" میں کئی کہانیاں چھپوائیں۔ پوددار جی کی صلاح سے میں نے "سیوا سدن" نامی ناول لکھا۔ گورکھپور ہی میں میں نے پرائیویٹ طور پر بی۔ اے بھی پاس کیا۔ "سیوا سدن" کی جو قدر و منزلت ہوئی اس سے میری جرأت حوصلہ افزائی ہوئی اور میں نے دوسرا ناول "پریم آشرم" لکھا۔ اس اثنا میں کہانیاں بھی برابر لکھتا رہا۔

پوددار جی کے مشورے سے میں نے پانی کا علاج شروع کیا لیکن تین چار مہینے کے غسل اور پرہیز کا الٹا اثر یہ ہوا کہ میرا پیٹ بڑھ گیا اور مجھے پیدل چلنے میں تکلیف محسوس ہونے لگی۔ ایک مرتبہ کئی دوستوں کے ساتھ مجھے ایک زینے پر چڑھنا پڑا۔ اور لوگ تو دھڑا دھڑ چڑھ گئے مگر میرے پاؤں اٹھتے ہی نہ تھے۔ بڑی مشکل سے ہاتھوں کا سہارا لیتے ہوئے اوپر پہنچا۔ اسی دن مجھے اپنی کمزوری کا احساس ہوا۔ سمجھ گیا کہ اب تھوڑے دنوں کا مہمان اور ہوں۔ پانی کا علاج بند کر دیا۔

ایک دن شام کے وقت اردو بازار میں شری جت دسرتھ پرشاد جی دویدی ایڈیٹر "سودیش" سے ملاقات ہو گئی۔ کبھی کبھی ان سے بھی لٹریچر کا تذکرہ ہوتا رہتا تھا۔ انھوں نے میری زرد صورت دیکھ کر کہا "بابو جی آپ تو بالکل پیلے پڑ گئے ہیں۔ اس کا علاج کیجئے۔" مجھے اپنی بیماری کا ذکر بہت برا لگتا تھا۔ میں اپنی بیماری کو بھول جانا چاہتا تھا۔ جب دو چار ہی مہینے کی زندگی ہے تو پھر کیوں نہ ہنستے ہوئے مروں۔ میں نے چڑھ کر کہا "مر ہی تو جاؤں گا بھائی یا اور کچھ؟.... میں موت کے خیر مقدم کیلئے تیار ہوں۔" بیچارے دویدی جی نے ندامت سے سر نیچے کر لیا۔ بعد کو مجھے بھی اس ترش گفتاری پر بڑا افسوس ہوا۔ یہ ۱۹۲۰ء کا واقعہ ہے۔ ان دنوں تحریک عدم اشتراک عمل زوروں پر تھی۔ جلیانوالہ باغ کا واقعہ ہو چکا تھا۔ انھیں دنوں مہاتما گاندھی نکا گھا بستی کے دورے پر آ گئے۔ انھیں میں نے کبھی نہ دیکھا تھا۔ مہاتما جی کے درشنوں کی یہ برکت تھی کہ مجھ سے ایسے مردہ دل آدمی میں بھی جان پڑ گئی۔ اس کے دو ہی چار دن کے بعد میں نے اپنی بیس سال کی سرکاری ملازمت سے استعفا دے دیا۔

اب دیہات میں کچھ کام کرنے کی طبیعت ہوئی۔ پوددار جی کا دیہات میں ایک مکان تھا۔ ہم اور وہ دونوں وہاں چلے گئے اور چرخے چلانے لگے۔ ایک ہی ہفتے بعد میری پیچش کم ہو گئی یہاں تک کہ ایک مہینے کے اندر بالکل صحت ہو گئی۔ پھر اس کے بعد میں بنارس چلا آیا اور اپنے دیہات میں بیٹھ کر پرچار اور ادبی خدمت میں زندگی بسر کرنے لگا۔ غلامی سے نجات پاتے ہی بیس سال کے پرانے مرض سے نجات پا گیا۔ اس تجربے نے مجھے پورے طور پر "قسمت پرست" بنا دیا۔

اب مجھے کامل یقین ہے کہ جو مالک کی مرضی ہوتی ہے وہی ہوتا ہے۔ انسان کی کوئی کوشش اس کی مرضی کے بغیر کامیاب نہیں ہوتی۔

پروین شاکر کی غزلوں کا
نیا رنگ روپ

ساحل احمد

غزلیہ تاریخ میں ایسی کئی منزلوں نے اپنا اعتبار قائم کیا ہے جو غزل کے مزاج واسلوب کے موافق ہے لسانی اور اسلوبیاتی فرق و امتیاز نے غزلیہ خدوخال کو سمجھنے اور جانچنے کے کئی پیمانے وضع کئے اس وضع کاری میں غزل اپنے دور کی مطابقت سے تخلیقی مرحلہ تمام کیا یہی وجہ ہے کہ ہر دور کی غزل ایک دوسرے دور سے مختلف ہے یہ فرق زمان ومکاں کے اعتبار سے بھی ہے اور اسلوب زبان سے بھی کیونکہ شاعری کے موضوعات و رجحان میں جو زمانی تضاد ملتا ہے وہ فطری ضرورتوں کا سرچشمہ ہے شعر کی بنیادی ضرورتوں میں ایک اہم بنیادی فکر ہے جو ہر زمانے میں اقتضائے وقت کے مطابق خود کو بدلتی اور سنوارتی رہی ہے زمانۂ شاہی سے لے کر عہد جدید تک مختلف رنگوں کی جو آتشانہ چمک دکھائی دیتی ہے وہ ایک دن میں پیدا نہیں ہوئی اسے پیدا کرنے چمکانے اور جانچنے میں کئی صدیوں کی محنت شامل ہے ان شعری رنگوں کو دیکھنے سے پتہ چلتا ہے ہمیشہ ہر دور میں اجتہاد کی لہر موجود رہی ہے ہر دور کے معتبر شعراء نے اپنی صلاحیتوں کے مطابق غزلیہ رشتے کا تعین کیا صنفِ نازک جب اس غزلیہ رشتے سے منسلک ہوئی تو اس نے ایک اور ہی رنگ پیدا کیا یہ نسائی رنگ غزلیہ قدر کے لئے نئی چیز تھی اور جب غزل خود پر عاشق ہوئی تو من و تو کا فرق مٹ گیا یہ لقا بائی چندا، زہرہ نگاہ، شفیق فاطمہ شعریٰ، بیگم ممتاز مرزا، فہمیدہ ریاض، کشور ناہید، ساجدہ زیدی، ادا جعفری، پروین شاکر کے شعری سفر میں یہی نسائی رنگ رختِ سفر کے طور پر موجود ہے

پروین شاکر ایک ایسی شاعرہ جنہوں نے غزل کی نزاکت بڑی دیانت داری سے قبول کی ہے اور جذبات کی تطہیر کے لئے ہر موقع و محل پر انتہائی جرأت و بے باکی سے اسے استعمال کیا ہے شعری ذرائع سے انکشافِ ذات کا کام لیا ہے اور زندگی کے مختلف النوع معاملات کو غزلیہ روایات کا حصہ بنا دیا صرف حصہ ہی نہیں معتبر رشتہ قائم کیا اس رشتے سے صداقتِ بیان اور بے باکیٔ اظہار کی توثیق ہوتی ہے۔

انھوں نے اپنی خوبصورت فکر اور توانا آواز سے شعری اسلوب میں ایک نئی جہت کا اضافہ کیا ان کا جو سفر خوشبو سے ہوکر گزر کی غزلیہ حقیقتوں (صد برگ ، تک پہنچا ہے وہ یقینی طور پر انفراد کی عمدہ مثال ہے ان کا رومانی طرزِ احساس اپنی ہم جنسوں میں الگ پہچان کا حامل ہے ایک عورت کی طرف سے اظہارِ عشق بحث کا موضوع بھی بنا اور رہتی ہے آنے کے مقابل ایک نئے رنگ کی طرح گیری

کاجل بھی پورا ہوا مگر جب انھوں نے اس بستر اور طبیر رنگ میں جنسی لذتوں کو کسی ملوث کرنے کی سعی کی تو وہ رنگ مطہرانہ اپنی آب و تاب قائم نہ رکھ سکا اور انکی غزلیہ تکو تضاد ردیوں میں تقسیم ہو کر گلِ انفراد کو فوراً آشنا کر گیا مگر وہ جلد ہی اس حصار سے باہر آگئیں اور شعری بہاؤ کو مقموباً ہونے سے بچا لیا ان کا دھیما دھیما وہ پُروقار لہجہ دوبارہ لوٹ آیا جسمانی لذتوں سے سرشار آنکھوں میں جرأتِ اظہار بھی ضو پانے لگا نتیجتاً شکستگیٔ احساس، جذبی صداقتیں کنایاتی طنز اور چھوٹی بڑی زندہ حقیقتیں غزلیہ قدر کا حصہ بن گئیں۔

جنس کا اظہار حد اعتدال میں ہو تو وہ غزل کو نیا ذائقہ ضرور عطا کرتا ہے مگر جب یہی چیز تجاوز کر جائے تو ملطیف جذبات کو ٹھیس لگتی ہے غزلیہ قدر شیشہ کی طرح نازک اور چاند کی طرح حساس ہے پروین شاکر جیسی ذہین شاعرہ نے بروقت محسوس کیا اور غزل کو غزل کی طرح استعمال کیا اس کے وقار کا تحفظ کرتے ہوئے غزلیہ رشتے کی حفاظت کی مگر نظموں میں تائب نہ ہو سکیں کیونکہ انکی نظموں کی یہی پہچان ہے انکے نظمیہ اسلوب کی تشکیل میں جنس (SEX) جزوِ خاص کی طرح موجود ہے انھوں نے غزل اور نظم کے حدِ فاصل کو قائم رکھا ہے وہ اگر غزل میں جھکی جھکی آنکھوں کی شاعرہ ہیں تو نظم میں ایک شکل بےباک عورت کی طرح۔ وصال، سپردگی، ہنی مون، بدن کے موسم بے اختیار میں، بے پناہی، ایک بُری عورت، نیگ، پذیرائی وغیرہ اسکی مثال ہیں۔

کنواریاں تو کیا
یہ کھیل کھائی عورتیں بھی
جس کے سائے سے پناہ مانگتی ہیں
بیاہتا دلوں میں اس کا حسن
خوف بن کے یوں دھڑکتا ہے
کہ گھر کے مرد شام تک نہ لوٹ آئیں تو
دعا شعار بیبیاں
دعائے نور پڑھنے لگتی ہیں (ایک بُری عورت)

بدن کے موسم بے اختیار میں
کسی پل
فصیلِ شہر سے باہر
حصارِ چادر و دستار کی حد سے نکل کر
ایک لمحے کو ـــــ بس ایک لمحے کو
ہم اپنے مقدر آزما لیں
شبِ ممنوع سے ایک پل چُرا لیں
(بدن کے موسم بے اختیار میں)

میرے بالوں پہ، آنکھوں پہ، پلکوں پہ
ہونٹوں پہ، ماتھے پر، رخسار پر
پھول ہی پھول سے تھے۔
(پذیرائی)

کچے رنگوں کی ساری میں
گیلے بال چھپائے گوری
گھر کا سارا باجرہ آنگن میں لے آئی
(نیگ)

میرا ساتھی میری بند آنکھوں کو کس پیار
سے چوم کر کہہ رہا ہے ارے ـــــ آج تو
برف باری ابھی سے ہی ہونے لگی۔
جان! آؤ مجھے اوڑھ لو
(بے پناہی)

مگر اس کے باوجود وہ فہمیدہ ریاض یا کشور ناہید نہیں بن سکیں شاید وہ غزلیہ قدر ہی ہے جس نے پروین شاکر کو جنس زدہ ہونے سے محفوظ رکھا اور وہ حدِ اعتدال سے باہر جا کر بھی لوٹ آئیں انھوں نے فہمیدہ ریاض یا کشور ناہید کی طرح اپنے وجود کو پگھلانے کی سعی نہیں کی اور نہ اپنے وجود کو "موجود" میں ڈھالنے کی کوشش کی یہی وہ پروین شاکر کا کمال ہے جس نے اس کے وجود کو قائم رکھا اور غزلیہ قدر معتبر نام بن گیا

۱۔ قریبِ شاہ رگ ، ۲۔ بعید وہم و خواب
۳۔ آنکھ کی رفاقتوں میں رات ، ہجر بھی شامِ وصال بھی

جو حرفِ سادہ کی صورت ہمیشہ لکھی گئی
وہ لڑکی تیرے لئے کس طرح پہیلی ہوئی

نہیں نہیں! یہ خبر دشمنوں نے دی ہوگی
وہ آئے، آ کے چلے بھی گئے، ملے بھی نہیں

ترا پہلو ترے دل کی طرح آباد رہے
تجھ پہ گزرے نہ قیامت شبِ تنہائی کی

میں اس کی دسترس میں ہوں، مگر وہ
مجھے میری رضا سے مانگتا ہے

مجھ پہ چھا جائے وہ برسات کی خوشبو کی طرح
انگ انگ اپنا اسی رُت میں مہکتا دیکھوں

لے جائیں مجھ کو مالِ غنیمت کے ساتھ عدو
تم نے تو ڈال دی ہے سپر تم کو اس سے کیا

کیسے کہہ دوں کہ مجھے چھوڑ دیا ہے اس نے
بات تو سچ ہے مگر بات ہے رسوائی کی

لڑکیوں کے دکھ عجب ہوتے ہیں سکھ اس سے عجیب
ہنس رہی ہیں اور کاجل بھیگتا ہے ساتھ ساتھ

میں سچ کہوں گی، مگر پھر بھی ہار جاؤں گی
وہ جھوٹ بولے گا اور لاجواب کر دے گا

میں اتنے سانپوں کو رستے میں دیکھ آئی تھی
کہ تیرے شہر میں پہنچی تو کوئی ڈر ہی نہ تھا

ہنسی کو اپنی سن کے ایک بار میں بھی چونک اٹھی
یہ مجھ میں دکھ چھپانے کا کمال کیسے آگیا

بچھڑ کے وہ مجھ سے ٹوٹا گیا ہے میرا وجود
یہ سانحہ میرے حق میں تو نیک فال ہی تھا

بارشیں آئیں تو در آنے لگے خوش رنگ عذاب
جیسے صندوق کھلنے لگے سوغاتوں کے۔

سہوگی کا مبتسم سوال بن کے کھلوں۔
خالی قطرۂ شبنم تیرا جواب اترے

ہزار ٹکڑوں میں بٹ کر بھی اس کا عکس ہی تھا
میں آئینہ تھی بکھرنے پہ اعتماد بھی تھا

وہ کہانی کہ ابھی سوئیاں نکلی بھی نہ تھیں
فکر ہر شخص کو شہزادی کے انجام کی تھی

خیمے سے دور، شام ڈھلے، اجنبی جگہ
نکلی ہوں کس کی کھوج میں بے وقت سرکشے

پرندوں کو دعا سکھلا رہی ہوں
میں بستی چھوڑ جنگل کی اذاں ہوں

ماہیا

دیپک قمر



بس جسم ہی بدلا ہے
لگتا ہے مجھے ہر دم
دل پہلے ہی جیسا ہے

تنہائی ضروری ہے
جب تک نہ ملیں خود سے
ہر سادھنا ادھوری ہے

جو یاد بہت آئیں
بے شرط محبت میں
ملنے نہ کبھی پائیں

یہ ڈھونگ چلے گا کیا
بن تیل تری باتی
دیپک یہ جلے گا کیا

یوں سب کو منائے گی
سن سن کے سبھی کی وہ
اپنی ہی چلائے گی

یوں وقت ہیں ہم کھوتے
اک پل میں جو دھن اک ہی
دو کام نہیں ہوتے

ماتھے پہ لگا چندن
وہ چاند ہے پونم کا
کیا خوب ہوا مونڈن

سہرے کا نہ ڈولی کا
یہ کھیل ابھی تک ہے
بس آنکھ مچولی کا

ہر بات میں بے ربطی
فن کار ہو یا شاعر
ہوتا ہے سدا خبطی

ماں لیتی بلیّاں ہے
برہن ہے تکے چھپ کر
گھر آیا وہ مہماں ہے

اپنا ہی نہ تم سوچو
کچھ ایسا کرو بندن
جیون اس کا سب کو

دیتا نہ خبر مجھ کو
میں کون ہوں جانے وہ
بتلائے نہ پر مجھ کو

”پھولیاں پھولیاں بچھار“ کا ایک ورق

افلاس کی دین

وجاہت علی سندیلوی

ماں کا خط پڑھ کر رمیش نے کچھ ایسا محسوس کیا جیسے اس کی روح کی ننگی پیٹھ پر کوڑے برسا دیئے گئے ہوں۔ وہ جب ہردوئی کی نوکری چھوڑ کر لکھنؤ میں زیادہ اچھی اور بڑی تنخواہ کے منصب پر تعینات ہوا تھا تو وہ اپنی ماں سے وعدہ کر آیا تھا کہ وہ ہر مہینے اپنے بھائی مکیش کی پڑھائی کے لئے کچھ روپئے ضرور بھیجتا رہے گا۔ لیکن آٹھ مہینے گذر جانے کے باوجود وہ اپنی ماں کو کچھ بھی نہیں بھیج پایا تھا۔ شہر آکر ایک تو یوں بھی ہر بات میں اس کا خرچ بڑھ گیا تھا۔ اور پھر دوسرے دفتر والوں کی ریس میں کپڑے لتوں کی ٹیم ٹام میں بھی اسکی تنخواہ کا اچھا خاصہ حصہ نکل جاتا

اپنے خط میں ماں نے اپنی اور مکیش کی خیریت بتانے کے بعد بوڑھی کی چھت ٹپکنے اور تھوڑے کے کھیت میں دھانوں کی فصل کے بارے میں لکھا تھا پھر بھینس کے بچہ بیانے کی خوشخبری سنائی تھی اور سب سے آخر میں لکھا تھا "تمہارے بھیجے ہوئے روپئے مجھے ہر مہینے مل رہے ہیں تم سے بہت خوش ہوں۔ جیتے رہو بیٹا۔ تمہاری ماں" روپیہ بھیجنے کے بارے میں۔ رمیش نے خط کو بار بار پڑھا۔ اور ہر بار پڑھنے کے بعد وہ تلملا اٹھتا۔ اس نے تو ایک پیسہ بھی نہیں بھیجا تھا۔ ماں نے کتنی مہین چٹکی کاٹی تھی؟ کیسی نفرت سے اس کے منہ پر تھوک دیا تھا۔ وہ چاہتا تھا کہ اسی وقت ماں کو کچھ بھیج دے۔ لیکن مہینہ ختم پر تھا بہت سے خرچ باقی تھے، اور اس کے پاس بیس تیس روپے بھی نہیں تھے اس نے اپنے ساتھی کلرک احمد دین سے اگلی تنخواہ ملنے تک کے لئے سو روپیہ قرض مانگے۔ لیکن وہ بیوی بچوں والا آدمی پہلے ہی سے پریشان تھا کہنے لگا۔ لڑکی کے لئے جمپر خریدنے کے لئے پچیس روپے بڑی مشکل سے گھر والی نے دیئے ہیں۔ تمہیں ایسی ہی ضرورت ہو تو دے دوں جمپر کا کپڑا اگلے مہینے آجائیگا۔ رمیش نے اس کا ہاتھ پکڑ کر اسے جیب سے روپئے نکالنے سے روک دیا۔ "اتنے سے میرا کام نہیں چلے گا۔ رہنے دو۔ میں کوئی دوسرا انتظام کروں گا۔" وہ سوچ رہا تھا کہ اتنے دنوں کے بعد وہ ماں کو سو روپے کم کیا بھیجے اور یہ رقم اتنی تھی جو وہ اگلی تنخواہ پر بھی نہیں بھیج سکتا۔ کیوں کہ درزی کے یہاں اس کا ایک سوٹ پڑا ہوا تھا اور باقی پورے دام ادا کر کے اس کا لینا ضروری تھا۔ اسکوٹر کی اگلی قسط بھی پچھلی قسط کے بقایا کے ساتھ اگلے مہینے میں دیئے بغیر چارہ نہیں تھا۔ اس کے سامنے صرف ایک ہی راستہ تھا کہ وہ اوشا جی کے سامنے ہاتھ پھیلائے اور اسے

...ین تھا کہ وہ اس کا ہرگز مایوس نہیں کریں گی۔ اور سو روپے قرض کیا بخشش کے طور پر دے دیں گی لیکن۔ لیکن۔ لیکن اس سلسلے میں بہت سے لیکن تھے اور رمیش کو کچھ ایسا محسوس ہوتا کہ جیسے انکی اوٹ میں اس کی خودداری اس کی شخصیت بلکہ اس کے پورے وجود کی میت رکھی ہو

کماری اوشا چترانشی نے اس پر اُسکی ساری پچیس سالہ زندگی ---- میں اتنے احسانات کئے تھے کہ وہ ان کے بوجھ تلے دب کر رہ گیا تھا۔ اوشا اس سے چند ہی مہینے بڑی تھی۔ اور ساتھ کھیلی اور پڑھی تھی لیکن اسکی کرم فرمائیوں کی وجہ سے وہ اپنے آپ کو اس کے سامنے انتہائی حقیر محسوس کرتا اور اس سے آنکھ ملا کر بات نہ کر سکتا اکثر اسے کچھ ایسا معلوم ہوتا جیسے اس کی ذات کا مصرف ہی صرف یہ ہو کہ اوشا جی اس پر اپنی غریب پروری کی نمائش کر سکیں۔

اسے اپنے بچپن کی سب سے پہلی بات جو یاد تھی وہ یہ کہ اوشا جی۔۔۔ انکی ماں سے یہ کہہ رہی تھیں: میں نے اپنا گرم کوٹ رمیش کو دے دیا ہے۔ وہ بیچارہ جاڑا رہا تھا اور پھر جہاں تک رمیش کی یادداشت کام کرتی اس کا بچپن تھا جو بھی اچھا اور خوش نما کپڑے پہنے وہ سب اوشا جی ہی کی اتارن تھے۔ اوشا کے دیئے ہوئے کھلونوں اور کتابوں کا اس کے پاس ایک ڈھیر سا لگ گیا تھا۔ اوشا کے باپ کی شاندار کوٹھی ہی کے کمپاؤنڈ میں رمیش کے باپ کا، جو کچہری میں چپراسی تھا۔ کچا اور کچھ مکان تھا۔ اوشا اپنے دولت مند باپ کی اکلوتی بیٹی تھی اور بہت فیاض تھی۔ اس نے ضد کر کے رمیش کا نام اسی اسکول میں لکھوایا جس میں وہ خود پڑھتی اور پھر اپنے پتا کانتا پرشاد چترانشی سے جو قصبے کے مشہور ڈاکٹر تھے ان کی فیس، کتابیں اور یونیفارم وغیرہ کا خرچ ادا کرواتی۔ رمیش اوشا سے بالکل پیچھے نہیں تھا۔ لیکن وہ اپنے [illegible] شوق سے جو کچھ پڑھتی اس کو باقاعدہ رمیش کو پڑھاتی اور اگر کسی بات پر خفا ہوتی تو اسکی گوشمالی بھی کرتی۔

انٹرمیڈیٹ میں اوشا اور رمیش دونوں ہی فرسٹ ڈویژن پاس ہوئے رمیش کو سرکاری وظیفہ ملا یونیورسٹی میں پڑھنے کے لئے وہ بنارس چلا گیا اور اوشا لکھنؤ چلی آئی۔ اوشا ایم۔ اے کرنے کے بعد جلد ڈگری کالج میں لکچرار ہو گئی، اس کے ماں باپ اس کے ملازمت کرنے کے خلاف تھے لیکن پھر اس کے شوق اور ڈاکٹریٹ کرنے کے ارادے کو دیکھ کر خاموش ہو گئے۔ رمیش کئی ---- مقابلے کے امتحان میں بیٹھا لیکن کامیاب نہیں ہوا۔ پھر ہردوئی میں اسے نہر کے محکمے میں ایک معمولی سی نوکری مل گئی اور وہ دو سال وہاں کام کرتا رہا۔ لیکن آٹھ مہینے ہوئے اسے کارپوریشن میں ایک بہتر جگہ مل گئی تھی لہٰذا وہ بھی لکھنؤ چلا آیا تھا جانتے ہوئے بھی وہ لکھنؤ آنے کے بعد چند روز تک اوشا سے نہیں ملا وہ مکان یا کم سے کم ایک کمرے کی تلاش میں بُری طرح سرگرداں رہا۔ لیکن کوئی کامیابی نہیں ہوئی اور اسے بیس راتیں چار باغ اسٹیشن کے مسافر خانے میں رہنا پڑا تھا تنگ آ کر وہ اوشا سے ملا اور اس نے چٹکی بجاتے اس کی یہ مشکل آسان کر دی اوشا کے فلیٹ سے ملی ہوئی دوسری بلڈنگ میں مالک مکان کا کچھ سامان ایک کمرے میں بند تھا اس نے کچھ سن کر مالک مکان کو اس بات پر راضی کر لیا کہ وہ اپنا سامان اس کے فلیٹ کی ایک [illegible] میں منتقل کر دے۔ اور صاف کرا کر خالی کمرہ رمیش کو کرائے پر اٹھا دے۔ رمیش سے اس نے کہا۔ "زیادہ تنگ کرنے کی اور انتظام نہیں ہوتا تم اسی کمرے میں آ جاؤ باتھ روم وغیرہ نیچے کی منزل میں ہے لیکن فی الحال اسی سے کام چلاؤ۔ رمیش کی منہ مانگی مراد مل گئی۔ یہ کمرہ اور اوشا کا فلیٹ بالکل ملے ہوئے تھے۔ لیکن چونکہ دونوں علیحدہ علیحدہ بلڈنگ سے متعلق تھے۔ لہٰذا کوئی درمیانی دروازہ نہیں تھا اور ایک دوسرے تک ایک زینہ اُتر اور دوسرا چڑھ کر ہی پہونچا جا سکتا البتہ دونوں کے سامنے کے برآمدے آپس میں بہت نزدیک تھے۔

رمیش کی سویرے کی چائے اور ناشتے کا مستقل ذمہ اوشا نے لے لیا تھا پہلی ہی صبح اس نے، اپنے برآمدے سے پکار کر کہا تھا۔ "رمو آؤ یہ چائے لو" رمیش کو رمو صرف اوشا اور اس کی آیا کہتی ہر روز سویرے رمیش ابھی ٹھیک سے جاگ بھی نہ پاتا کہ پہلے وہ یہ پکار سنتا اور پھر چند لمحوں بعد چائے اور ناشتے کی کشتی اس کے ہاتھ میں ہوتی ایک دو دفعہ تو رمیش نے کہا بھی "اوشا جی! آپ میرے لئے یہ کیوں تکلیف اُٹھاتی ہیں؟ تو اوشا منہ سے زبان نکال کر اس کو چڑھایا اور بولی "سیدھے ہاتھ سے چائے کی ٹرے تھامو۔ برتن میرے برآمدے کی منڈیر پر رکھ دینا میں اُٹھا لوں گی" رمیش اگر شام کو دفتر سے جلدی آ جاتا تو اوشا اس کو ایک پیالی چائے اور کچھ پھل اسوقت بھی بھیجتی۔ اس کے علاوہ یوں کھانے کی چیزیں جو اوشا قریب قریب ہر روز رمیش کو پکار کر دیتی رہتی ان کی گنتی ہی نہ تھی "رمو یہ دیکھو میں نے کیا پکایا ہے" "شام سے کئی دفعہ پکار چکی ہوں۔ لیکن تم سنتے ہی نہیں۔ لو یہ ملائی چانپ چکھو" "اسٹو کچھ جل گیا ہے کھا کے دیکھو۔ سویرے تک تم زندہ بچ گئے تو کل پھر پکا دوں گی۔ وہ ہنس کر کہتی ان عنایتوں سے مجبور ہو کر جب رمیش اکثر اوشا کو منع کرتا تو مصنوعی غصے سے کہتی بابو جی بہت دنوں سے تمہارے کان نہیں کھینچے ہیں! وہ اب کچھ چھوٹے چھوٹے دکھائی پڑتے ہیں — کھینچ کر تو انہیں برابر کر دوں۔ اور رمیش کو مسکرا کر خاموش ہو جانا پڑتا۔ چائے۔ ناشتہ کھانا

اور چیزوں کے علاوہ اوشا کو پروسی اسے تحفے دینے کا بڑا شوق تھا۔ کبھی بُش شرٹ یا پتلون کا کپڑا لے آتی کبھی بنیائن یا رومال لے آتی یا ٹافی دیتو کے ڈبے پیار کر دیتی اور کبھی چپکے سے اس کے برآمدے میں رکھ بھی جاتی ایک دن اوشا نے چائے ٹوسٹ اور انڈے کی کشتی رمیش کو دیتے وقت اسے اک بہت پرانا اور گھِس کر پھٹا ہوا گرم کوٹ پہنے ہوئے دیکھ لیا فوراً اس نے ضد کی وہ اسے دے دے وہ خود رفو کر دے گی۔ مجبوراً رمیش نے کوٹ اتار کر اس کے حوالے کر دیا تیسرے دن رمیش نے اس کوٹ کو نیچے سڑک پر درزی کی دکان میں دیکھا ایک ہفتے کے بعد جب اوشا نے اسے یہ کہہ کر وہ کوٹ واپس کیا۔ "رمّو دیکھو تمہارا کوٹ کیسا ٹھیک ہو گیا۔" تو رمیش کو واقعی تعجب ہوا نہ صرف رفو، بہت اچھا کیا گیا تھا بلکہ کپڑے کو پلٹ دیئے جانے سے قریب قریب نیا لگتا اس نے شکریہ ادا کرتے ہوئے کہا "ابھی تمہارے ہاتھ میں کیسے کیسے کمال چھپے ہیں۔ لیکن اپنے کو رمیش کب بتاؤ گی؟ اسے کب تک دیا ہی بچہ سمجھتی رہو گی جب تم میز کے نیچے چھپ کر اس سے دادی جی کو ڈرانے کے لئے بلی کی بولی بولا کرتی تھیں۔" اوشا بے اختیار ہنسنے لگی اور پھر بولی "شری رمیش چندر سریواستو ایم۔ اے آپ میرے لئے اس وقت تک رمّو ہی رہیں گے جب تک بلی کی بولی بولتے رہیں گے۔ اور جس دن آپ شیر جیسی حرکتیں کرنے لگیں گے تب سے ڈر کر آپ کا رعب ماننے لگوں گی۔"

رمیش بھی اوشا کے لئے کئی تحفے لایا تھا جنہیں اس نے مسکرا کر قبول کر لیا تھا البتہ ایک دفعہ جب وہ اس کے لئے گرد و نواح کے بہت ہی خوشنما پودوں کے چار گملے لایا تو وہ بہت خوش ہوئی اور اس نے انہیں اپنے برآمدے میں ترتیب سے سجا دیا۔ لیکن رمیش کو ابھی یہ کوششیں اوشا کی مسلسل داد و دہش کے مقابلے میں اونٹ کے منہ میں زیرہ معلوم ہوتی

جیسے سورج کو چراغ دکھانا۔ جس طرح زیادہ پانی دینے سے پودے مرجھا جاتے ہیں اسی طرح اوشا کی مہربانیوں سے وہ اپنی شخصیت روز بروز کم سے کم تر ہوتے محسوس کرتا اور اکثر اسے خود اپنے آپ پر غصہ آتا کہ آخر وہ اوشا کی سخاوتیں برداشت کیوں کرتا ہے اور ان کو روکنے کی کوئی مثبت کوشش کیوں نہیں کرتا؟ ماں کے خط کے متعلق رمیش کا ذہنی ہیجان کچھ کم ہوا تو اسے یہی طریقہ سب سے معقول دکھائی پڑا کہ وہ اوشا سے ہرگز کوئی روپیہ نہ مانگے بلکہ ماں کو صفائی کے ساتھ اپنی مالی حالت سے مطلع کر دے اور سمجھا دے کہ دو مہینوں کے بعد سے وہ ہر مہینے پابندی کے ساتھ اسے پچاس روپے بھیجتا رہے گا۔ ماں نہ سمجھ نہیں ہے وہ فوراً مان جائے گی اور غصہ تھوک دے گی۔

رمیش دفتر سے اپنے کمرے پہ پہنچا تو اس کی آہٹ پا کر اوشا نے برآمدے سے جھانک کر کہا "رمّو آج میں کافی بنا رہی ہوں ابھی تیار ہوئی جاتی ہے۔ تب تک یہ سموسے کھا کر بتاؤ کہ ان میں کتنا زہر ہے۔ کیونکہ یہ میری ملازمہ دو روز کی رخصت پہ جاتے وقت بنا گئی ہیں۔"

رمیش نے برآمدے پر جا کر اوشا کے ہاتھ سے پلیٹ لیتے ہوئے کہا "لیکن محترمہ تجربہ صحیح نہیں ہوگا کیونکہ آپ کا ہاتھ لگ جانے سے میرے لئے ان کا زہر بھی امرت ہو جائے گا۔"

اوشا ہنستے ہوئے بولی۔ "خوشامد مت کرو رمیش چندر سریواستو ایم۔ اے! انعام میں یہ سیب بھی کھاؤ کیونکہ سموسوں میں مرچ تیز ہونا لازمی ہے اور اس نے ایک سیب بھی رمیش کے ہاتھ میں دے دیا "سموسے ختم کرنے کے بعد وہ کافی کی پیالی لا کر کہنے لگی "آج ہم کو کالج پر اپنے کالج کی پرنسپل کے ساتھ مسوری تک جانا ہے سنا ہے وہ جگہ بہت اچھی ہے تم بھی آ جاؤ۔ لیکن وہاں مجھے پہچاننے کی کوشش نہ کرنا۔ ورنہ ـــــ تم یقین نہیں کر سکتے کہ

میرے کالج میں آئے دن نت نئے کیسے کیسے اسکینڈل اٹھتے ہیں اور ان سب سے زیادہ لطف میری کمزوری پر پرنسپل لیتی ہے بجلی کی تیزی سے ایک مکمل پلان رمیش کے ذہن میں آ گیا اور اس نے زندہ دلی سے کہا "اچھا آ جاؤں گا اور یہ کیا ہے گا کہ میں آپ کے بجائے آپ کی پرنسپل کو پہچاننے اور ان سے پینگ بڑھانے کی کوشش کروں۔"

اوشا ہنستی کھلکھلاتی چلی گئی اور اپنے کمرے سے پکار کر کہا۔ "آ ضرور جانا رمّو۔"

رمیش نے جب کئی عورتوں کے ساتھ بالکونی کی سیڑھیاں چڑھ رہی تھی اوشا کو بھی طرح اپنی جھلک دکھلا دی اور اس کی نگاہوں میں ایک شرارت آمیز مسکراہٹ بھی محسوس کی وہ اپنی ٹکٹ والی سیٹ پر جو بالکونی کے نیچے تھی۔ بیٹھ گیا لیکن جیسے ہی فلم شروع ہوا وہ سینما ہال سے باہر نکل آیا اور اپنے اسکوٹر کے بجائے کرائے کے رکشے پر اپنے کمرے کی طرف چل دیا شام ہو چکی تھی اور سڑک کی روشنی کے باوجود کافی اندھیرا تھا وہ نظریں بچا کر اپنے زینے پر چڑھ گیا اور پھر جوتے اتار کر اپنے برآمدے سے اوشا کے برآمدے پر پھاند گیا۔ دونوں دروازے اندر سے بند تھے وہ شیشہ توڑ کر اندر کی سٹکنی کھول لینے کے متعلق سوچنے لگا۔ لیکن پاس ہی اسے باورچی خانے کی کھلی ہوئی کھڑکی دکھائی دی جو برآمدہ ختم ہونے کے بعد تھی۔ وہ برآمدے کی منڈیر پر کھڑے ہو کر اس کھڑکی سے اندر پہنچ گیا۔

اسے معلوم تھا کہ اوشا اپنے نوٹ اپنے کمرے کی میز پر رکھی ہوئی کتابوں میں سب سے [illegible] کی لال والی جلد کی کتاب میں رکھتی ہے کئی روز ہوئے جب وہ اوشا کے برآمدے میں [illegible] تھا تو اس نے اس کو اسی کتاب سے کچھ نوٹ نکالتے ہوئے دیکھ لیا تھا [illegible] اوشا کی اس طرف پیٹھ تھی۔ اس نے لپک کر وہ کتاب کھول کر دیکھا کر اس میں سو سو کے

کردس نمک کے بہت سے نوٹ تھے زیادہ تر سو کے اور جن کی مالیت کئی ہزار ہو سکتی۔ لیکن ان نوٹوں کے ساتھ کچھ تی آڈریوں کی رسیدیں بھی تھیں اس نے ان کو پڑھنے کے لئے ٹارچ کی روشنی ڈالی تو تعجب کے مارے اسے ایک جھرجھری ... سے آگئی ہر مہینے اس کے نام اور اوشا کے معرفت سے اس کی ماں کو پچاس روپئے بھیجے گئے تھے اور ہر رسید پر وصول پائی کی سند میں اس کی ماں کا انگوٹھا تھا اس نے جلدی سے کچھ نکالے بغیر کتاب بند کر کے اسکی جگہ پر رکھ دی اور جس طرح سے فلیٹ میں داخل ہوا تھا ویسے ہی نکل کر انٹرول سے پہلے سینما ہال میں اپنی سیٹ پر پہونچ گیا۔

رمیش ایک بہت ہی اذیت ناک ذہنی اضطراب اور انتشار میں مبتلا تھا کیوں؟ کس لئے:۔ وہ یہ کچھ نہ جانتا اسے کیا کرنا چاہیئے یہ بھی اس کی سمجھ میں نہ آتا البتہ بار بار ایک موہوم خواہش اس کے دل میں یہ ابھرتی کہ وہ کسی صورت اوشا کو کوئی تکلیف پہونچائے۔ اُسے نیچا دکھائے۔ اُسے ذلیل کرے۔ لیکن آخر کیوں اس سوال کا جواب دینے کے متعلق وہ پھر ایک ذہنی بھول بھلیاں میں کھو جاتا کبھی وہ سوچتا کہ

اُسے اوشا کے پیروں پر سر رکھ کر اپنی حد درجہ کمینہ پن کی حرکت پر معافی مانگنا چاہیئے لیکن وہ پھر بڑی حقارت سے اس خیال کو ٹھکرا دیتا۔

وہ انٹرول ہی میں سینما ہال سے نکل گیا تھا اور پارک اور سڑکوں پہ بے مقصد گھومتا رہا تھا۔ وہ کوئی فیصلہ نہیں کر پایا گیارہ بجے کے قریب جب اُسے یقین تھا کہ اوشا سو چکی ہوگی وہ اپنے کمرے میں واپس آ گیا۔ لیکن اس کی آہٹ پاتے ہی اوشا نے پوچھا، رمیش فلم کیسی تھی

رمیش ٹھٹکا اوشا پھر باتوں میں لگا لے گی اور خود اس کے دل کی دل ہی میں رہ جائیگی لہٰذا اس نے ذرا سخت لہجے میں جواب دیا۔

اوشا جی مجھے آپ سے کچھ کہنا ہے "

اوشا اپنے نائٹ گون پر ایک چادر پہنچا اپنے برآمدے پر آگئی "کہو کون سی ایسی بات ہے جو اسی وقت کہنا ضروری ہے "

"میں آپ سے نفرت کرتا ہوں کیونکہ آپ مجھے حقارت سے دیکھتی ہیں آپکے ٹکڑوں اور چیتھڑوں پہ پلنے والا ایک غریب چپراسی کا لڑکا ہوں نا؟ آپ مجھے اپنی خیرات دیدے کر کبھی سر اٹھا کر زندہ رہنے کا موقع نہیں دینا چاہتی اپنی انا کی طمانیت کے لئے آپ مجھے ہمیشہ اپنا دست نگر بنائے رکھنا چاہتی ہیں آپ نے میرے جسم کے ریشے ریشے کو اپنے احسانوں سے خرید کر مجھے صرف اپنے ایک حلقہ بگوش غلام کی حیثیت سے دیکھنا چاہتی ہیں۔

بکواس بند کرو یہ تمہیں کیا ہو گیا ہے آج؟ ادھر آؤ میرے کمرے میں اوشا صوفے پر بیٹھ گئی اور اپنے سامنے والی کرسی پر بیٹھنے کے لئے رمیش کو اشارہ کیا، اور پھر بولی "رمیش، تم خود اپنے احساس کمتری کا شکار ہو کسی غریب چپراسی کی اولاد ہونا کوئی گناہ نہیں میرے تایا جی کے والد خود ایک زمیندار کے یہاں صرف منشی تھے اور شاید اس سے بھی کم تنخواہ جو تمہارے تایا جی پاتے تھے۔ میں تمہیں ایک خود ساختہ اور قابل قدر انسان سمجھتی ہوں۔ جیسے اپنے تایا جی کو سمجھتی ہوں

آپ مجھ پر اتنی عنایت، اتنا احسان کیوں کرتی ہیں

میں جو کچھ بھی تمہارے لئے کرتی ہوں مجھے کر کے اچھا لگتا ہے تم عنایت کے الفاظ بھلا دو یوں بات تمہاری سمجھ میں آجائے گی میرے تایا جی مجھے جو بلا ضرورت روپے کپڑے زیور اور کپڑے اور تحفے بھیجتے ہیں کیا مجھے ذلیل اور حقیر سمجھ کر مجھے اپنا دست نگر اور غلام بنانے کے لئے؟ میں ان کی سوغاتوں کو اس بات کا انعام سمجھتی ہوں کہ میں انہیں اچھی لگتی ہوں کیا تم اس صورت سے نہیں سوچ سکتے۔

رمیش کا ہیجان بہت کچھ پگھل رہا تھا لیکن وہ اپنے آپ پہ جارحانہ کیفیت طاری کرتا جا رہا تھا۔ "آپ نے میری ماں کو ماہوار روپئے میرے نام سے بھیجے اور مجھے بتائے بغیر بھیجے؟

تو کیا ہوا؟ تم ہی نے چند مہینے ہوئے بتایا تھا۔ تم وعدہ کر آنے کے باوجود ماتا جی کو روپے نہیں بھیج پاتے میں نے یہ سوچ کر وہ منتظر ہونگی بھیج دیئے تمہیں بتانے سے کیا فائدہ تھا نہ بتانے سے زیادہ سے زیادہ یہی تو ہوتا کہ اگر ان کو تم بھی بھیج دیتے تو انھیں ڈبل روپے مل جاتے۔

رمیش پر اوشا کے دلائل کا کوئی اثر نہیں ہو رہا تھا بلکہ یہ محسوس کرتے ہوئے کہ وہ پھر اس پر سبقت لے جا رہی ہے اور اسکی شخصیت کو پامال کرنے پر تلی ہوئی ہے اوشا کو تکلیف پہونچانے کی موہوم خواہش کی جو چنگاری اس کے دل میں چھپی ہوئی تھی وہ ایک دم سے شعلہ بن گئی وہ کسی بھی قیمت پر اسے نیچا دکھا کر اس پر اپنی اہمیت کا سکہ جمانا چاہتا "اوشا جی آپ کو معلوم ہے کہ میں کتنا احسان فراموش ہوں اور قابل نفرت ہوں اور پھر اوشا کے چہرے پر تعجب کی کوئی بھی علامت نہ پا کر اس نے بہت زور دے کر کہا میں آج سینما ہال سے بھاگ کر آپکے فلیٹ میں چوری کرنے کی نیت سے داخل ہوا تھا

تم فلم سے بور ہو کر سو گئے ہوگے بہر کیف تم میرے فلیٹ میں گھس بھی آتے تو میں تم سے نفرت نہ کرتی" اوشا نے ہنستے ہوئے کہا

مجھے زمین پر رینگنے والے کسی کیڑے سے بھی حقیر نہ سمجھئے میں اپنے آپ سے نفرت کرنے پر آپ کو مجبور کر دونگا۔ دیکھئے اس وقت تو میں نہیں سو رہا ہوں" رمیش نے کہا اور اپنی کرسی سے اٹھ کر ایک دم سے اوشا کو دبوچ لیا اور اسکے ہونٹوں پر زبردستی اپنے ہونٹ رکھ دیئے

اوشا نے کسمساتے ہوئے اپنی پوری طاقت سے اسے صوفے کے ایک کونے میں دھکیل دیا اور کھڑے ہو کر......... زور سے تھپڑ مارا

اب نہ کرو گی مجھ سے نفرت، رمیش نے اپنا گال سہلاتے ہوئے کہا۔

اوشا کچھ نہ بولی اور آہستہ سے چلتی ہوئی اس نے کمرے کی لمبائی کے دو چکر لگائے وہ گہری سوچ میں ڈوبی ہوئی تھی پھر وہ رمیش کے پاس ہی صوفے پر بیٹھ گئی اور متوازن لہجے میں کہنے لگی۔۔ تمہیں خود نہیں معلوم رمیش کہ تم نے یہ سمجھ کیوں رکھا ہے مجھے تم سے نفرت نہیں ہمدردی ہے۔ میں تمہاری فطری ضرورت اور پیاس کو اچھی طرح سمجھتی ہوں لیکن ہر بات کا ایک سلیقہ اور قرینہ ہوتا ہے

رمیش نے شرمندگی سے گڑگڑاتے ہوئے لہجے میں کہا مجھے معاف کر دو اوشا جی تم عورت نہیں دیوی ہو! تم عظیم ہو میرا کوئی بھی عمل تمہیں تمہاری بلندی سے نیچے نہیں لا سکتا میں تمہیں بچپن سے پیار کر رہا ہوں لیکن میں تمہیں ہمیشہ اپنی پہنچ سے دور بہت دور سمجھتا میں مجبور رہتا کہ تمہاری محبت اور ہمدردی کو دوسری معنی پہناؤں مجھے معاف کر دو۔ میں کل سویرے ہی اپنے کمرے سے کسی ہوٹل میں اٹھ جاؤں گا اور پھر کبھی منہ نہ دکھاؤں گا۔

اوشا نے رمیش کے چومتے ہاتھوں کو اپنے ہاتھوں میں لیتے ہوئے کہا، رمیش تم کہیں نہیں جا سکتے اب تمہیں زندگی بھر مجھ سے قریب رہنا ہو گا۔ اور شاید تمہیں یہ بتا دینا بھی ضروری ہو کہ ڈاکٹر کانتا پرشاد چترانشی جی اصلی باپ نہیں ہیں۔ میں ان کی گود لی ہوئی لڑکی ہوں میں صرف ۱۱ برس کی تھی جب وہ مجھے ایک یتیم خانے سے لائے تھے اور انہوں نے اور ممی نے مجھے ٹوٹ کر پیار اور ممتا دی ہے لیکن۔ لیکن۔ تمہاری ہی طرح میں اپنے بچپن کا افلاس بھول نہیں سکتی۔

غزلیں

دیر و کعبہ ہی نہ قصر و بام و در اچھے لگے
دھوؤں میں لپٹے ہوئے ہم کو نگر اچھے لگے
پیاس کی شدت مٹانے کے لئے تشنہ کام کو
سوچتا ہوں آج کیوں زید بکر اچھے لگے
کیا کہیں کس سے کہیں کیونکر کہیں یہ ماجرا
موسمِ گل میں ہمیں تو جلتے گھر اچھے لگے
ہم کبھی بیٹھے نہ رکتے تھے جن کی چھاؤں میں
آج وہ اشجار بے برگ و ثمر اچھے لگے
اک زمانہ تھا ہمیں جب بستیوں سے پیار تھا
اس برس لیکن ہمیں سنسان گھر اچھے لگے
آج بادل کے برسنے کا عجب انداز تھا
شادماں چہرے نہیں بس نوحہ گر اچھے لگے

دلیپ بادلؔ

اب دور تلک کوئی مکاں ہے نہ مکیں ہے
تا حدِ نظر آگ ہے اور شعلہ زمیں ہے
ڈھا کر اسے لوٹ گیا دستِ تعصب
پھر بھی مری نظروں میں یہ فردوسِ بریں ہے
سرگرداں ہوں میں اسکے تجسس میں ازل سے
ہر حال میں جو میری رگِ جاں سے قریں ہے
یہ شوقِ طلب تو کوئی دیکھے کہ خدا سے
وہ مانگ لیا میں نے جو مقدور میں نہیں ہے
اللہ سے نسبت ہے مجھے تیری محبت
میں تجھکو بھلا دوں یہ مرے بس میں نہیں ہے
میں ٹوٹ چکا لیکن یقیں جان اے بسملؔ
کیسا بھی ہے وہ میری امانت کا امیں ہے

بسملؔ نقشبندی

کبھی خاطر کو جب زخمِ جگر آواز دیتا ہے
تو اس دم شعر گوئی کا ہنر آواز دیتا ہے
خبر ہے اب نہ لوٹوں گا مگر آواز دیتا ہے
سفر سے گھر چلوں ادھر تو گھر آواز دیتا ہے
اترتا ہے وہ قطرہ قطرہ دل کے آبگینے میں
کوئی تو ہے کہ جو مجھ کو پہر آواز دیتا ہے
بہت ہمت شکن ہے دوریٔ منزل مگر اے دل
مجھے پیہم برائے ذوقِ سفر آواز دیتا ہے
مسلسل یادِ ماضی کے دریچے کھلنے لگتے ہیں
تصور میں جو میرا ہم سفر آواز دیتا ہے
دو حق میں جیتے تو ہو مگر محتاط بھی رہنا
یہاں خطرہ عطاؔ ہر موڑ پر آواز دیتا ہے

عطا عابدی

عصمت چغتائی کی باتیں

رام لعل

میرے نام عصمت آپا کا پہلا خط

۳۰، انڈس کورٹ، اے ، چرچ گیٹ روڈ، بمبئی
۲۴، اپریل سنہ ۱۹۶۷ء

عزیزم

شاہد بالکل اچانک چلے گئے صبح دس بجے پہلا دورہ پڑا۔ دس منٹ بعد ٹھیک ہو گئے رات کو دس بجے ایک دم سانس اکھڑ گئی اور پندرہ منٹ بھی نہ لگے اس عمر میں خلا بہت بے حد محسوس ہوتی ہے

تمہاری ہمدردی کا شکریہ بڑی ڈھارس بندھتی ہے یہ جان کر کوئی اپنے دکھ میں شریک ہوا

شگفتہ کو اور بچوں کو دعا۔

فقط عصمت آپا

شاہد لطیف عصمت آپا کے شوہر تھے یا عصمت آپا شاہد لطیف کی بیوی تھیں۔ فقط شوہر تھا یا بیوی؟ اس بات کے معنی ان سے ملنے کے بعد سمجھ میں آ سکتے ہیں۔ شاہد لطیف بھی افسانہ نگار تھے۔ آزادی سے پہلے ۱۹۴۲ء کے آس پاس ان کی کہانیاں ادب لطیف میں پڑھی تھیں عصمت آپا کا پہلے سے ذہن پر طاری اور حاوی تھا۔ وہ نئی تعلیم یافتہ لڑکیوں ہی کی نجات دہندہ نہیں تھیں ہم لڑکوں کیلئے بھی بڑی کشش رکھتی تھیں انکے افسانوں کے پیچھے ہم نوعمر لڑکے آزادی کیلئے تڑپتی لڑکیوں کے بارے میں بڑے سہانے خواب دیکھنے کے عادی ہو چکے تھے۔ لحاف اور بعض ایسی کہانیوں نے اچانک نہ صرف عصمت آپا کی شخصیت کا ایک نیا رخ ہمیں دکھا دیا بلکہ جرأت مندانہ اظہار سے بھی پہلی بار روشناس کرایا۔

لحاف "میں لیزبین ازم" (عورتوں کی عورتوں کے ساتھ جنسی چھیڑ چھاڑ) کو موضوع بنایا گیا تھا جس میں ایک عورت مرد کو نہ پاسکنے کی شدید خواہش میں اچانک مبتلا ہو جاتی ہے

لیکن عصمت چغتائی کی افسانہ نگاری میں یہ دو افسانے عارضی DEPARTURE تھے۔ پھر بھی اس دور کے ادب لطیف اور ساقی، یہ دو رسالے ہمارے لئے کرشن چندر، بیدی، منٹو، قاسمی وغیرہ کے ساتھ ساتھ عصمت کے نام کی وجہ سے بھی بڑی کشش رکھتے تھے۔ لحاف کی وجہ سے تو لاہور کی عدالت میں ان پر مقدمہ بھی چلا تھا اسی زمانے میں انھوں نے شاہد لطیف کے ساتھ شادی کر لی تھی۔ اور کچھ افسانے عصمت شاہد لطیف کے نام سے بھی لکھے۔ اس کے بعد وہ اپنی گذشتہ پہچان قائم رکھنے کے لئے پھر سے عصمت چغتائی کے نام سے لکھتی رہیں۔

عصمت آپا سے میری پہلی ملاقات کہاں ہوئی کب ہوئی ٹھیک ٹھیک یاد نہیں پڑتا اتنا یاد ہے آزادی کے بعد سرکاری کام سے بمبئی گیا تو عصمت آپا سے بھی ملنے چلا گیا ایک بہت ہی طرحدار ملازمہ نے دروازہ کھولا تھا

بمبئی میں عام طور پر متمول لوگ گھر میں اوپر کے کام کاج کے لئے ایسی ہی لونڈیاں ملازم رکھتے ہیں عصمت آپا نے بڑی محبت سے بٹھایا اپنے لنچ میں شریک کیا اور بہت سی باتیں کیں۔

"ہم دونوں نے لو میرج کی تھی لیکن شاہد پر میں نے کبھی روک ٹوک نہیں لگائی۔ چاہے جس سے ملے میں اپنے لئے صرف لکھنے کی آزادی چاہتی تھی۔ جو ہمیشہ قائم رہی۔ یہ ایک مثالی سمجھوتہ ہے۔"

ایک اچھی کہانی کے کلیدی جملے کی طرح ان کے منہ سے سُنی ہوئی یہ بات مجھے اچھی لگی اور آج تک یاد رہ گئی ہے ۱۹۶۶ء میں ستمبر کی کسی تاریخ کو پھر بمبئی جانا ہوا تو... بغیر فون کئے ان کے یہاں چلا گیا۔ شاہد لطیف گھر پر اکیلے تھے اور ہم ایک دوسرے کو نہیں جانتے تھے۔ انھوں نے میرا نام تو پوچھا لیکن چونکے نہیں۔ شاید میرے نام میں چونکانے والی کوئی بات تھی ہی نہیں۔ یہ معلوم کرکے میں عصمت آپا سے ملنے آیا ہوں اندر سے جا کر بٹھایا اور یہ بتا کر کہ وہ ابھی آتی ہونگی خود ایک انگریزی ناول پڑھنے میں معروف ہوگئے جو وہ میرے آنے سے پہلے پڑھ رہے تھے۔

دس پندرہ منٹ سخت بے چینی میں گزرے غصہ آرہا تھا۔ شاہد لطیف کیسا ادیب ہے جواب فلم پروڈیوسر اور ڈائریکٹر زیادہ ہے اپنی بیوی کے دوستوں کے ساتھ ایسی بے اعتنائی سے کیوں پیش آرہا ہے

اچانک انھوں نے کتاب ہاتھ سے رکھ دی اور پوچھا "آپ افسانہ نگار رام لعل ہیں؟"

ان کی حیرانی میری بے چینی کو کم نہ کرسکی "جی ہاں" کہہ کر ادھر اُدھر دیکھنے لگا

"آپ کو میں پروڈیوسر سمجھا معاف کیجئے عصمت سے ڈائیلاگ لکھوانے کے لئے اکثر لوگ آجاتے ہیں۔"

ہم دونوں مسکرانے لگے انھوں نے میرے لئے شربت منگوایا اب کے کچن میں سے کوئی دوسری طرحدار ملازمہ سامنے آئی پھر چائے بھی لائی گئی اور شاہد لطیف بولے"

"کچھ عرصہ ہوا میں نے آپ کا پتہ کسی سے تلاش کرایا تھا۔ آپکی ایک کہانی کسی رسالے میں پڑھی تھی جسے میں فلمانا چاہتا تھا چونکہ آپ کا سُراغ نہ مل سکا اس لئے ڈراپ کردیا گیا"

میں ایک دم الرٹ ہوکر بیٹھ گیا سجاد ظہیر کی بیٹی نجمہ کی شادی میں جو دِلّی میں ہوئی تھی۔ پرکاش پنڈت نے کہا تھا کہ کسی فلم پروڈیوسر نے آپ کا پتہ پوچھا تھا اب تو اس کا نام بھی یاد نہیں رہا۔ خیر!

"وہ کون سی کہانی تھی میری؟" میں نے شاہد لطیف سے پوچھا۔

"اُس کا عنوان تو یاد نہیں رہا اس میں ایک بوڑھے کا ذکر ہے جس کے چھ بیٹے ہیں جو ایک ایک کرکے اس سے الگ ہوتے چلے جاتے ہیں اور وہ اپنی بیٹی کے ساتھ تنہا رہ جاتا ہے جسے اس کے شوہر نے چھوڑ رکھا ہے وہ اسی بیٹی کے ساتھ گاڑی کے ایک سفر میں ہے اور پھر راستے میں دم توڑ دیتا ہے کچھ اسی قسم کا پلاٹ تھا اس کا"

میں نے بتایا۔ "وہ کہانی "ہمسفر۔ مسلسل" کے عنوان سے شاعر کے کسی سالنامہ میں چھپی تھی۔"

"آپ ایسا کیجئے۔ شاعر کا دفتر تو بمبئی میں ہے آپ کل اس شمارے کو لے کر آیئے دادر کے رنجیت اسٹوڈیو میں۔ میں وہاں آج کل بچوں کے لئے ایک فلم بنا رہا ہوں اس کے مکمل ہوتے ہی آپکی کہانی پر کام شروع کردونگا۔ مجھے یہ کہانی بہت پسند ہے"

ابھی ہم باتیں کر ہی رہے تھے کہ عصمت آپا ایک آدمی کے ساتھ اندر آئیں۔

"ہائے رام لعل! تم کب آئے؟ بیٹھو بیٹھو میں ابھی آئی شاہد سے باتیں ہوگئیں؟ - کھانا کھا کر جانا"

شاہد لطیف نے دوسرے آدمی سے نام لے کر تعارف کرایا تو میں نے ایک صدمہ سا محسوس کیا۔ اس کے سر کے بال بالکل سفید ہو چکے تھے۔ اور وہ کافی متفکر معلوم ہو رہا تھا۔ وہ کئی فلموں میں ہیرو کا کام کر چکا تھا وہ دلیپ کمار کا چھوٹا بھائی تھا۔

لنچ پر بھی میری اسی کہانی پر گفتگو ہوتی رہی۔ عصمت آپا نے کہا یہ کہانی میں نے بھی شاہد سے Recommend کی تھی پھر بھول گئے شاید اب تم لے کر آؤگے تو اس کے ڈائیلاگ میں ہی لکھونگی"

اسی شب کو میں اعجاز صدیقی کے یہاں کھانے پر مدعو تھا۔ اعجاز صاحب کو سارا واقعہ سُنایا اور ان سے رسالہ عنایت کرنے کی درخواست کی لیکن اس شمارے کا مجھے نہ تو سن اشاعت یاد تھا۔ نہ ہی مہینہ۔ انھوں نے پھر بھی اسے ڈھونڈ نکالا اور مجھے نیک خواہشات کے ساتھ یہ کہتے ہوئے رخصت کیا — "یہ شاعر کے لئے اعزاز ہوگا اس میں تمہاری چھپی ہوئی ایک کہانی پر فلم بنے گی"

دوسرے دن اسٹوڈیو کے سیٹ پر جاکر میں نے شاہد لطیف کو وہ رسالہ دے دیا انھوں نے کہا "میں آپ کو دسمبر میں بمبئی بلاؤں گا۔ ہم سب مل کر اسکرپٹ پر کام کریں گے۔"

لیکن دسمبر میں ان کا اچانک انتقال ہوگیا۔

یہ خبر میں نے ریڈیو پر سُنی تھی۔ عصمت آپا نے میرے تعزیتی خط کے جواب میں جو سطور لکھیں اس سے انکے اندرونی کرب و تنہائی کا شدید احساس ہوتا ہے انکی دونوں بیٹیاں شاید اپنی دنیا بسا کر جا چکی تھیں۔ ایک تو [illegible] جس سے ایک بار مل بھی چکا تھا اب وہ فلم کا پروجیکٹ چلا رہی ہیں، دوسری کے بارے میں معلومات نہیں رکھتا۔

اس کے بعد عصمت آپا سے کئی سیمیناروں میں ملاقاتیں ہوئیں۔ وہ اکثر بمبئی سے باہر آتیں

اپنی تنہائی کو کم کرنے کے لئے کبھی پاکستان چلی جاتیں کبھی ہندوستان میں دہلی، علی گڈھ کلکتہ یا لکھنؤ پہونچ جاتیں۔

۸ مارچ ۱۹۷۸ء کو لکھنؤ میں کرشن چندر کی پہلی برسی تھی۔ اس دن عصمت آپا لکھنؤ میں تھیں۔ میری درخواست پر انھوں نے شرکت اور صدارت کرنا بھی منظور کر لیا تھا برسی کے موقع پر یادگاری مباحثے کے لئے دو موضوعات دیئے گئے تھے: کرشن چندر اور عام آدمی۔ اور قلم کی آزادی، اردو اکادمی کا ہال سامعین سے کھچا کھچ بھر گیا تھا عصمت آپا اپنی صدارتی تقریر میں اردو زبان کے مسئلے پر اظہار خیال کرتے ہوئے کہہ گئیں: "اردو تو مر چکی ہے اب اسکی ارتھی اٹھانا باقی ہے۔"

اس سے سامعین میں سخت غم و غصہ پیدا ہو گیا جو اردو کے ایسے حسرت ناک انجام کا تصور تک نہیں کرنا چاہتے تھے اردو کے کئی ملک گیر روزناموں اور ہفت ناموں نے عصمت آپا کے اردو کے بارے میں خیالات کو اچھالا اور ان کے خلاف لکھا عصمت آپا کا افسانہ نگار ذہن تجسس باقی ہے جو انجام پر زیادہ مرکوز رہتا ہے وہ کسی مسئلے کے حل کے لئے لڑائی وہاں سے شروع کرتی ہیں جہاں جلے ہوئے مکان کے ملبے سے پھر سے تعمیر کرنا ناممکن ہو جاتا ہے رضیہ سجاد ظہیر نے تو لڑائی شروع کرنے سے پہلے ہی شکست تسلیم کر لی تھی۔ اور صرف ہندی میں افسانے لکھنے پر زور دیا تھا۔ راہی معصوم رضا بھی یہی منطق اپناتے ہوئے ایک قدم اور آگے بڑھ گئے تھے اردو کوئی زبان نہیں ہے۔

میرے نزدیک اردو کا مسئلہ ہندی کے ساتھ لڑائی لڑنے سے حل نہیں ہوگا جسے بدقسمتی سے لسانیاتی اور سیاسی طور سے ہندو مسلم رنگ دے دیا گیا ہے جبکہ حقیقت یہ ہے ہندی قومی رابطے کی زبان ہوتے ہوئے بھی آج تک اردو روزی کا اتنا بڑا وسیلہ نہیں بن سکی ہے ادبی سطح پر ہندی میں ایسے رسالوں کی سخت کمی ہے جو لکھنے والوں کو خود کفیل بنا دے جب۔ کہا زردو میں کچھ ایسے رسالے ہیں جو لکھنے والوں کو باقاعدہ معاوضہ پیش کرتے ہیں ان میں سرکاری اور غیر سرکاری رسائل شامل ہیں اور ان میں چند ایک تو تعداد اشاعت کے اعتبار سے قومی سطح پر رکھے جا سکتے ہیں۔"

"اب ایک اور خط عصمت آپا کا ملاحظہ فرمایئے۔ رام لعل جی "مفاہیم" کی حالت بدتر ہے کہ وہ لکھنے والوں کو پیسے نہیں دیتا تو اسکی سفارش کیوں کر رہے ہو۔ لکھنؤ سے بلاوا آیا ہے مگر پٹنہ سے بھی ۲۱-۲۲-۲۳ کا بلاوا ہے ایک ہی تاریخ کیوں رکھی گئی؟ بہار جانے کا پھر موقع کہاں ملے گا۔ اگر ۵، ۶ جنوری ہو تاریخ تو وہاں سے لکھنؤ تک کا واپسی ہوائی جہاز کا کرایہ کافی ہوگا۔ بڑا مزا لگ رہا ہے نئی کہانی پٹنہ میں پڑھنے کے بعد بھیج سکوں گی۔ اب دوسری کہانی کہاں لکھنے بیٹھوں۔ کیا پٹنہ میں ملاقات ہوگی دلہن بی کو دعا بچوں کو پیار۔

"مفاہیم" گیا (بہار) سے نکلنے والا ایک سہ ماہی ادبی جریدہ تھا جسکے چند شمارے نکال کر اسے بند کر دیا گیا وجہ وہی اشتہارات اور قارئین کی کمی اسکے مدیر نے مجھ سے بعض اہم ادیبوں کے نام بلا معاوضہ تخلیقات بھجوانے کے لئے خطوط لکھوائے تھے ہندوستان میں غیر سرکاری ادبی رسائل ادیبوں کو معاوضہ پیش نہیں کرتے جبکہ وہ کاغذ ڈھونے کے لئے رکشہ والے تک کو مزدوری ضرور دیتے ہیں۔ یہ بدعت جاگیردارانہ دور سے شروع ہوئی جب صاحبان اقتدار ادبی ذوق کے مالک ہوتے تھے۔ وہ خود بھی لکھتے تھے اور ادبی رسائل کی سرپرستی بھی کرتے تھے چنانچہ ذاتی طور پر کوئی بھی شخص ادبی رسالہ نکالنے کا منصوبہ بناتا ہے تو اس میں ہر طرح کے اخراجات شامل کرتا ہے نہیں کرتا تو صرف اہل قلم کا معاوضہ۔ موجودہ دور میں ریڈیو، ٹیلی ویژن یا اردو اکادمیوں کے رسائل ہی ان کے معاوضے کا وسیلہ بنے ہوئے ہیں یا پھر چند ایک کمرشیل نیم ادبی رسالے۔

عصمت آپا نے لکھنؤ کے جس بلاوے کا ذکر کیا ہے مذکورہ بالا خط میں کیا ہے وہ غالباً اتر پردیش اردو اکادمی کی طرف سے تھا اب یہ یاد نہیں آتا کہ وہ ان دنوں لکھنؤ آئی تھیں یا صرف پٹنہ ہی گئی تھیں وہاں بھی بہار اردو اکادمی کا ایک سیمینار اور افسانہ خوانی کا پروگرام تھا میں بھی وہیں مدعو تھا اور شانتی نکیتن (مغربی بنگال) سے ہوتا ہوا وہیں پہنچا تھا

اب میں ایک اور دلچسپ واقعہ کا ذکر کرنا چاہتا ہوں۔ حیدرآباد (دکن) کے ایک فلمی و ادبی رسالہ "فلمی تصویر" کی جولائی ۱۹۸۱ء کی اشاعت میں عصمت آپا کی ایک نہایت ہی خوبصورت کہانی "اندھا ٹیگ" شائع ہوئی تھی انھوں نے چوتھی کا جوڑا اور ہندوستان چھوڑ دو جیسی معرکہ کہانیوں کے بعد ایک طویل مدت کے بعد یہ کہانی لکھی تھی اس کہانی پر میں نے اپنا ردعمل ظاہر کرتے ہوئے عصمت آپا کو جو خط مدیر فلمی تصویر کو بھجوایا تو انھوں نے میرا خط عصمت آپا کو بھجوا کر جواب منگوا لیا اور دونوں خطوں کو ستمبر یا اکتوبر کی اشاعت میں آمنے سامنے شائع کر کے ایک دلچسپ صورت پیدا کر دی آپ بھی ان دونوں خطوں کو ملاحظہ فرمائیں۔

میرے نزدیک ان دونوں خطوں کی ایک خاص اہمیت یوں ہے کہ ان سے ہم دونوں کے انداز فکر کا پتہ چلتا ہے پہلے مدیر رسالہ کا نوٹ ملاحظہ کریں۔

(رام لعل کا کھلا خط عصمت چغتائی کے نام)

فلمی تصویر کے شمارہ جولائی ۱۹۸۱ء میں عصمت چغتائی کا افسانہ "اندھا ٹیگ" شائع ہوا تھا رام لعل نے اس افسانہ کے پس منظر میں ان کے نام جو کھلا خط لکھا ہے وہ قارئین کی دلچسپی کے لئے شائع کیا جا رہا ہے — ادارہ

لکھنؤ

۳۱ جولائی ۱۹۸۱ء

عصمت آپا جی

آداب۔ ابھی ابھی آپ کی بڑی عمدہ نئی کہانی پڑھنا ہوا جو مجھے بڑا آتا ہے شاید دشمنی کی روح آپکے اندر

داخل ہوگئی ہے حالانکہ آپ پہلے بھی ذرا پینے والوں کہاتیا کھلاتی کرتی تھیں پراب تو یہ مقصد آپ کا جیسے ایک مشن کا درجہ اختیار کر گیا ہے لیکن خدا کے لئے یہ مت سمجھئے گا کہ میں آپکی مخالفت کر رہا ہوں۔

خدا یاد آگیا ہے تو عید کی مبارکباد بھی لے لیجئے۔ ہاں میں یہ کہہ رہا تھا آپ کو جہاں بھی گندگی نظر آتی ہے جھاڑو لے کر اسے صاف کرنے پر جٹ جاتی ہیں" اندھا گیگ میں تو پورے ایک ٹیگ کی نہیں کئی ٹیگوں کی گندگی بھری پڑی ہے کرشن نے کئی رانیاں کئی پٹ رانیاں رکھی ہوتیں تھیں اور ایک ہی ہلے میں وہ تو سولہ ہزار ایک سو آٹھ کنواریاں کو ہانکتا ہوا سوراشٹر گجرات، لے گیا تھا میرا خیال ہے ہماری انسانی ہسٹری میں وہ پہلا اور سب سے بڑا عورت باز شوہر تھا! اسکی اولادیں کتنی ہوئیں اس بارے میں ہندو مائتھولوجی کا دفتر، خاموش ہے۔

تیز اندھا گیگ "بہت پسند آئی جی واقعی خوش ہوگیا پچھلے دنوں علی گڑھ میں ایک سیمینار تھا وہاں لڑکیوں نے عبداللہ ہال کا ایک میگزین تھما دیا اسمیں آپ کا بھی ایک دلچسپ مضمون تھا جس میں آپ نے کہا تھا میرے سامنے کوئی عشق کرتا ہے تو مجھے بہت اچھا لگتا ہے اور میرا جی چاہتا ہے میں ہر شخص کے ساتھ عشق کروں جو مجھے بہت اچھا لگتا ہو! وغیرہ وغیرہ

مجھے یاد ہے میں نے دو تین سال پہلے شراب کے نشے میں آپکی موجودگی میں ایک لڑکی کا بوسہ لیا تھا جس پر آپ نے ہنستے ہوئے کہا تھا تم لوگ اپنی بیویوں سے نہیں ڈرتے ہو۔

بوسہ تعریف کا ایک اظہار ہوتا ہے۔ یورپ میں تو ہے یہاں کیوں نہیں؟ ہاں حرامکاری کو میں بھی پسند نہیں کرتا ایسی حرامکاری جو بنے بنائے گھر کی پاکیزہ دیواروں کو ہلا کر رکھ دے، حرامکاری کے خلاف آپ نے بھی بہت لکھا ہے

آپ لکھنؤ کب آ رہی ہیں؟ میری دوسری آنکھ کا آپریشن دسمبر میں ہو سکے گا جیسے ہی دونوں سے دنیا نظر آنے لگی ہوں امید ہے اکتوبر تک

پہلا انسان ہے کہ تیار ہو جائیگا اس کا پتہ شعر پر چھپا ہوا ہے میں ایسا اس خلیفت میں ہوں ایسا کہانی پر بنی انشر پر آئے والے علم نہار سے ہیں دل آخر دل ہے اسپیل فرلز ہدایت کار ہے۔ راکھی نصیرالدین شاہ، پروین بابی، اور سری رام لاگو کام کر رہے ہیں۔ موسیقی خیام کی ہے گانے ندا فاضلی اور راہی نور کے ہیں۔ ان میں ایک تو ہرا لم چالنڈ ہے اسے آپ بھی جانتی ہیں۔ دیکھئے کیا ہوتا ہے شگفتہ عید کی مبارکباد کھرا رہی ہے۔ عید کے روز صبح اور رات کے یہاں سیوئیاں کھانے کے لئے جائیں گے

اچھا خدا حافظ رام لعل

(۲)

کیا اندھیر ہے تمہیں میرا پتا نہیں معلوم مجھے اپنے اندھے پن سے سخت ندامت ہے میرے گھر آئے تھے اور پھر بھی میں لاپتہ رہی۔ میں بھی کتنی بار تمہارے یہاں آچکی ہوں یعنی جب لکھنؤ گئی تمہارے یہاں کا نمک کھایا اور مجھے بھی تمہارا پتہ نہیں معلوم ویسے تمہارے گھر بہ آسانی پہونچ جاتی ہوں اُف کس مردود زمانے کا ذکر چھیڑ دیا۔ منٹو کے نام سے نہ جانے کیوں غم غصہ کا پہاڑ ٹوٹ پڑتا ہے اور پھر اس کی روح کو میرے وجود میں داخل کر کے یہ بھی بتا دیا کر مر چکا ہے ایک منٹو ہے جسکی ساری کتابیں اسکی بیوی صفیہ نے بھیج دی تھی

تم نے اسے یاد دلا دیا اور اس کی روح تو اس کا اپنا کلیجہ چیر کر فنا ہو گئی۔ بھلا وہ میرے وجود میں سمانے کی ذلت کیوں کر برداشت کرے گی؟ ایک تو کریلا دوجے نیم چڑھا۔ ارے بھئی تم نے کنہیا جی کو عورت باز کہہ کر بڑا جی جلایا ایک وہی ڈھنگ کے بھگوان ہیں۔ سب سے زیادہ ہمدرد بیوا اور عشق تو تھے ہی یعنی اپنی ہی ذات پارٹی کے ہوتے کیا کی تخلیق کی

سب سے بڑی کرامت یہ کمال تھا کہ انھوں نے عورت کو بھی انسانوں کی صف میں شمار کیا دنیا کے کسی ادب میں اس دیدہ دلیری سے عورت کو مرد سے اظہار عشق کرنے کی مثال نہیں ملتی کسی تہذیب نے عورت کو عاشق اور مرد کو معشوق بنانے پر توجہ نہیں دی۔ فرانسیسی اور انگریزی ادب میں بھی عورت ہی محبوبہ ہے اور زیادہ تر مرد ہی نے آزار عشق کیا ہے جسے تنہا اور بیوپاری رنگ دے دیا گیا ہے مگر کرشن جی نے جسمانی عشق کو بھگتی کا رتبہ دیا ہے۔ رادھا شادی شدہ ہے مگر کرشن کے عشق میں ایسی دیوانی ہوئی کہ پردہ ڈالی گئی۔ اتنی باغی اور منہ زور عاشق کی مثال کہیں اور نہیں ملے گی عورت تو دنیا میں محبوبہ بنا کے بھیجی گئی ہے اس پہ عاشق ہوا جا سکتا ہے لیکن شریف عورت چھپ چھپ کر بھی لگائے یا تو لعب مرتی ہے یا زہر کھا کر فنا ہو جاتی ہے اور دنیا ہی عورت پتی اس کا بھگوان ہوتا ہے۔ خدا نے بیاہی ہوتا ہو بیاہی رادھا اپنے پتی کی نہیں کرشن کی ہے لعنت ہے شوہر نامدار کا کیا نام تھا؟ مجھے تو نہیں معلوم ہاں اسکے محبوب کا نام ـــ ـــ دنیا جپتی ہے۔

یہی نہیں، اگر کوئی غیر مرد کسی کی ماں بہن کی طرف نظر اٹھا کے دیکھ لے تو اسکی آنکھیں نکال لے مگر جب ارجن عاشق ہو جاتے ہیں مگر باپ شادی پر تیار نہیں ہوتا تو کرشن کہتے ہیں میں بہن کو کسی بہانے سے لے آؤں گا اور تم اسے بھگا لے جانا۔ ہے کسی ماں کے لال کا اتنا بڑا کلیجہ کہ بہن کو اس کے محبوب کے ساتھ بھگانے میں مدد دے!

جنس کو کرشن نے تقدس کا رتبہ دیا۔ یقینا اس زمانے میں بھی آج کی طرح عورت مرد کے ملاپ پہ پہرہ تھا سودے بازی کے بغیر ان کا میل جائز مانا جاتا تھا یعنی عورت مرد کا رشتہ ایک دوسرے کی لگاوٹ پر نہیں دولت کے لین دین پر منحصر تھا مرد تو عورت کے زیور خرید سکتا تھا عورت اسکی ملکیت بن جاتی تھی۔ اور اس کے ساتھ چتا پر پھونک دی جاتی تھی جیسے بچے بیاہی مر جاتی تھی۔ کرشن جی رادھا کو نہ سونے سے خریدا نہ اس پر کوئی چھاپ لگائی جنس بیان نامعہ کبھی چل آئی۔ دنیا کی کوئی تہذیب نہ روک سکی ایسی آزادی کی مثال کسی ملک یا کسی مذہب میں نہیں ملتی ہے مگر عصمت کو بھی۔

تاریخ اٹھا کر دیکھو بادشاہ، نواب

عورتوں کے غول کے غول پالتے ہیں کیا وہ انھوں نے
اپنے پیار کی بدولت پائی تھی یا خریدی تھیں؟ لوگوں
نے انکے سر منڈھ دی تھیں اور ... اور جبڑے
بنتے تھے پتہ بازی کی طرح اور ماں بہن ابھی بیٹی
کو ترپ بنا کر مارا تھا کرشن نے سیکس کی آزادی
کو دھرم کا ایک رکن کیوں سمجھا؟ کس نے اس وقت
کی سماج پابندیوں پر ریسرچ کی ہے؟ کیا ایسا تو
نہیں تھا جیسا آج بھی زیادہ تر ہے کہ عورت ستی
تھی بے بس تھی نیم مردہ تھی مال کی طرح بیچی خریدی
جاتی تھی پرانے کوڑے کرکٹ کی طرح پھینکا پھلانگ
دی جاتی تھی ۔ عورت اور مرد کا رشتہ جب ان
گھٹنوں کو پہنچ جاتا ہے تو اس سماج کی ذہنی حالت
کیا ہوتی ہے عورت کو پیر کی جوتی بنا کر کیا مرد واقعی
جنسی آسودگی حاصل کر سکتا ہے؟ ضرورت سے زیادہ
کھانوں سے بدہضمی اور اکثر ہیضہ ہو جاتا ہے پیر کی
جوتی کوئی چبا کر نگلنے لگے تو کیا پیٹ بھر سکے گا؟ روٹی
کی بھوک سے بھی موت ہو سکتی ہے مگر بدو... کی مار
دیتے ہیں غریبوں کا حق دبا کر اپنے لئے عیش خریدتے
ہیں ان میں جنسی عیش سب سے مہنگے پڑتے ہیں کہ
عورتوں کے گہنے پالتے پڑتے ہیں۔ ان گہنوں کے لئے
بھی عیش پالتے ہیں۔ انھیں عورتوں کے غول چاہیے
ملک کی دولت کا زیادہ حصہ حاکم اور امرا اسکے
مصاحبین کے حصہ میں آتا ہے۔ جہاں جہاں امپرل
ازم پلا ہے اور اب سرمایہ داروں کی صورت
میں پل رہا ہے، وہاں عوام بھوکے مر رہے ہیں
بس چور اور ڈاکو عیش کر رہے ہیں۔

اسی کلائمکس میں کرشن پیدا ہوئے اور
عورت مرد کی طرح شاہی طاقت سے بچ نکلے
اور اوتار بن گئے انھوں نے بڑے بڑے کام انجام
مگر مار گئے کنہیا جی بھی۔ انھیں تو پوجا
ڈالا جرم مجرم کر یا دھا کرشن کے گیتوں پر سر
دھنتے ہیں۔ لیکن اگر پتہ چل جائے کہ انکی اپنی
بیوی کسی کنہیا کے ساتھ راس رچا رہی ہے تو
اسکی ناک چوٹی کی خیر نہیں اور کنہیا جی کی چٹنی
کوشش کر جنتر بنا کر رکھا تھا لگتے ہیں مگر ان کی
بانی بھول گئے یہ بھول گئے کہ عورت اور مرد میں
اگر ایک آزاد اور دوسرا نظر بند ہوگا تو ملن فراڈ
ہوگا۔ جنسی خواہشات اگر ناپاک ہوتیں تو اس
ملن سے بڑے بڑے پیغمبر اور رسول کیسے پیدا
ہو سکتے تھے؟ جب سے جنس من کی موج کے بجائے
بازاری جنس بن گئی۔ انسانی ذہن مسخ ہو گیا

ارے شہناز یہ تم نے کیا ذکر چھیڑ دیا
خواہ مخواہ میرا قلم بہکنے لگا

ایک بات اور جو سولہ ہزار کنواریاں کرشن
جی ہانک کر لے گئے تھے وہ سب اکیلے تھوڑا ہی
ہضم کر لی ہونگی سکھے بھی تو ہوا کرتے تھے ان کے
وہ جانتے تھے کہ اگر یہ لڑکیاں حاکموں کے
ہاتھ لگ گئیں تو وہ جنسی ہیضے کا شکار ہو کر راکشس
بن جائیں گے اور ایک دوسرے کے اوپر چڑھائی کریں
گے جوتیوں میں دال بٹے گی

نیا گھر مبارک ہو شکر ہے تم آخر کو گھر والے
ہو گئے ہو جی چاہ رہا ہے خط پھاڑ دو دیوانی ہانڈی
بن گیا۔ ایک دم کاغذ ختم ہو گیا دوسرا پیڈ کھریا ہوا
ہے جی کڑا کر کے بھیج دیتی ہوں۔ خدا کرے تم سکو
بیگم کو دعا بچوں کو پیار

اور ہاں قلم کی بھی مبارکباد پھر کبھی سہی

عصمت آپا

۹/۹/۱۹۸۱ء

برسوں بعد عصمت آپا کے اس خط کو پھر پڑھا ہے جو یقیناً
ان کی تمام تر افسانہ نگاری کا ترجمان ہے انکی افسانہ
نگاری اردو ادب پر نصف صدی سے چھائی ہوئی
ہے ان کی ذات اور افسانہ نگاری کے زندگی میں رتی
برابر فرق نہیں ہے جو کچھ انھوں نے سوچا لکھ دیا جو
دل میں آیا منہ پر کہہ دیا جن دنوں میں لکھنؤ میں
شیام بینیگل کی فلم "جنون" کی شوٹنگ چل رہی
تھی۔ وہ بھی اسی یونٹ کے ساتھ آئی تھیں اس فلم
میں انھیں معمر عورت کا رول دیا گیا تھا اور انھوں
نے لکھنؤ کے ایک فور اسٹار ہوٹل کلارک اودھ میں
ٹھہرایا گیا تھا لیکن وہ قریب قریب ہر شام کو ہوٹل
سے کھسک لیتیں اور رکشہ لے کر میرے یہاں پہنچ
جاتیں تھیں ہم لوگ دیدہ و دل فرش راہ کئے ہوتے
تھے کبھی کبھی اور لوگوں کو بھی ان سے ملانے کیلئے بلا لیا
کرتے تھے ان میں زیادہ تر یونیورسٹی اور کالج
کی لڑکیاں اور لڑکے ہی ہوتے تھے لڑکیاں جنھیں
زیادہ ہوتیں جو انکے افسانوں کی دلدادہ تھیں اور
انھیں قریب سے دیکھنے کے ساتھ ساتھ انکی چٹ پٹی
باتیں سننے کی خواہش مند رہتی تھیں۔ کچھ لڑکیاں
میری بیوی پر بار نہ بننے کے لئے کھانا چائے وغیرہ
بنانے میں میری بیوی کا ہاتھ بٹا دیتیں جب کہ وہ انھیں
دیکھتی ہی کرتی رہ جاتی تھیں اُردو کی افسانہ
نگار ... ڈاکٹر صبیحہ انور تو جب بھی آتیں، اپنے ساتھ
کباب، بریانی، شیر مال، رومالی روٹیاں وغیرہ گھر
سے مزدور رکھوا کر لے آتیں ان نشستوں میں کئی بار مشہور شاعرہ
ساجدہ زیدی، انکی بیٹی صبا زیدی اور اُردو کی دو
افسانہ نگار خواتین مسرور جہاں، اور عائشہ صدیقی
بھی شریک ہوتیں انھیں اس بات پر بڑی حیرت
تھی کہ عصمت آپا نے اس سے پہلے کبھی اداکاری نہیں
کی تھی پھر انھیں فلم میں کیسے لے لیا گیا عصمت آپا نے
انھیں ہنستے ہنستے بتایا اس بڑھیا کا رول پہلے ایک
اور آرٹسٹ کو ملا تھا لیکن وہ موت سے بہت ڈرتی
تھی اس فلم میں آخر میں اسے مرجانا تھا اور اتفاق دیکھئے
وہ آرٹسٹ فلم میں ادھورا کام کر کے مر گئی مرنے کی
اداکاری کرنے سے پہلے ہی شیام بینیگل نے ایک
دن اچانک وہی رول مجھے آفر کر دیا میں تو موت سے
ڈرتی نہیں کل کو آتی موت آج آ جائے میں نے جھٹ
اس رول کو قبول کر لیا

جن لوگوں نے اس فلم میں عصمت آپا کو دیکھا
ہے انھیں یقین ہو گیا ہوگا کہ وہ زندگی اور اداکاری
کو ایک جیسی فطری سطح پر رکھ کر دیکھتی ہیں انھوں
نے اپنے مکالمے بنا کوشش کے ادا کر دکھائے ہیں

۱۹۸۰ء کے مارچ اپریل میں وہ پھر لکھنؤ آئی
تھیں۔ وہ بہرائچ جا کر درگاہ شریف کی زیارت
کرنے کے علاوہ اس مکان کو بھی ایک نظر دیکھنا
چاہتی تھیں۔ جہاں وہ آٹھ نو برس کی عمر میں اپنے
والدین کے ساتھ رہ چکی تھیں۔ لکھنؤ میں ان کا قیام
ڈاکٹر صبیحہ انور کے یہاں تھا لیکن ہمارے ساتھ
بھی رہتیں وہ ستر برس پار کر چکی تھیں چلنے پھرنے
میں تھوڑی دقت محسوس کرنے لگی تھیں انکی گردن

میں خفیف سا بڑھاپا بھی نظر آتا تھا لیکن باتیں وہ ہمیشہ کی طرح چہک چہک کر کے کرتیں انکی آنکھوں میں شوخی کی چمک بھی برقرار تھی لیکن اب کے یہ بھی محسوس ہوا کہ انکی قوت یادداشت کبھی کبھی ساتھ نہیں دیتی اپنی چیزیں رکھ کر بھول جاتی ہیں کسی سے ملنے کا وقت مقرر کر کے اسے یاد نہیں رکھ سکتیں۔ جس کا الزام میزبان پر آجاتا ہے۔ برسوں پہلے انہوں نے میرے گھر پر سجاد ظہیر... رضیہ آپا سینئیش تیرا اور کچھ اور دوستوں کی موجودگی میں بڑے فخر سے بتایا تھا کہ کرشن چندر اور سلمیٰ صدیقی کے نکاح میں شریک تھیں اور کرشن چندر سلمیٰ سے شادی کرنے کے لئے مسلمان ہو گئے تھے اور ان کا نام اللہ رکھا رکھا گیا تھا جسے کرشن چندر نے پسند نہیں کیا تھا لیکن عصمت آپا نے اب نا صرف اس بات سے انکار کیا کہ وہ انکے نکاح میں شریک تھیں بلکہ یہ بھی کہہ دیا کہ ان کی شادی ہوئی ہی نہیں۔ اردو کے بارے میں بھی انہوں نے اپنی کہی ہوئی اس بات سے انکار کیا کہ اردو مر چکی ہے اب اسکی ارتھی اٹھانے کی دیر ہے

بڑھتی ہوئی عمر کے ساتھ قوت یادداشت کا کمزور ہوتے جانا کوئی غیر معمولی واقعہ نہیں ہو سکتا حیرت اس بات پر ہونی چاہیئے کہ انہیں اب بھی بہت سی بچپن کی باتیں یاد ہیں بلکہ ان پر تو اب یادوں کے ہجوم اترتے چلے جاتے ہیں انہوں نے اپنی مختصر سوانح لکھی ہو انٹرویو دیئے ہوں یا دوستوں کو خط لکھے ہوں ان سب میں ہی یادداشتوں کا تذکرہ بے اختیار ہو جاتا ہے جن کا اصل مضمون سوال یا نفس مضمون سے کوئی تعلق نہیں ہوتا لیکن ان کا اظہار اس لئے ہو جاتا ہے کہ اس میں ایک جیسے ہیں یہ لوگ وہ سب بھی مزدور ہیں جو وہ کہنا چاہتی ہیں۔

آخر میں مجھے ایک اور خط کا ذکر کرنا چاہتی ہوں یہ میرے اس خط کے جواب میں ہے جو میں نے انہیں میرے اس [illegible] لکھا تھا جس میں قلم کاروں کے بیشمار خطوط کا [illegible] کے بارے میں لکھا تھا اور ان سے [illegible] کے لئے بھجوانے کی درخواست کی تھی [illegible] انہوں نے [illegible] ساتھ [illegible]

کتنی ڈھیر سی ادھوری باتیں بتاتی ہیں

۲۳۔ مئی ۱۹۸۸ء

سوال: کیا آپ اردو ادب کی کہانیاں چھاپ رہے ہیں یا [illegible] کی جدا جدا کا ایک [illegible] سلسلہ ہیں؟

میں پہلے انسان ہوں بعد میں عورت ہوں اور انسانوں کی فہرست میں شریک ہو سکتی ہوں

میں نے ساری زندگی عورت مرد دونوں کو برابر کی اہمیت دی ہے عورتوں کی جہالت، ظلم اور زیادتی کے خلاف قلم اٹھایا ہے اگر مرد ظالم، بے انصاف ہو رہا ہے تو سب سے پہلے وہ عورتیں مجرم ہیں جنہوں نے اسے اپنے عیش و آرام کے خاطر چھوڑ رکھا ہے [illegible] اور مرد [illegible] بنایا ہے مرد دنیا کے ہر اہم صرف ماں، بہن، بیوی، ساس اور ساتھی کے عیش و آرام کے خاطر کرتا ہے اور تباہ و برباد ہوتا ہے لوگوں کا خیال ہے کہ میں عورت کی حمایت کرتی ہوں کتنا احمق ہے یہ خیال اس سے بار برداری کا کام لیا جاتا ہے اور وہ خود کو برتر سمجھتا ہے حالانکہ اسے برابری کا بھی حق نہیں سوائے چند ملکوں کے جہاں عورت مرد کو برابر کی محنت کا برابر پھل ملتا ہے اور مزے کی بات یہ کہ [illegible] کے غلام مرد بھی اس انصاف پر بگڑتے ہیں

میں نے بہت بچپن سے لڑکوں کے ساتھ برابر برابر کا حق حاصل کرنے کی کوشش کی ہے ان ہی جیسے سادہ لباس پہننے کی ضد کی اور زیور گہنے کی سجاوٹ کو ٹھکرا دیا کنبہ بڑا تھا بہت سے خاندانوں کے بچوں کا والد پر بار تھا لڑکوں کے اور اپنے کپڑے وہ بہت سادہ اکثر گاؤں کے لائے ہوئے گاڑھے اور کھدر کے بنواتے تھے مگر لڑکیوں کے جہیز کے لئے ریشمی بیش قیمت اور سونے چاندی کے برتن اور زیورات بنوائے جاتے تھے

کانگریس کی جیت اس لئے ہوئی کہ عورت مرد دونوں نے بے حد [illegible] کا اشتراک کیا۔ گاندھی جی نے میری [illegible] انگریزی [illegible] سے انکار کیا [illegible] کپڑے پہنیں [illegible] کسانوں کی دستکاریاں خریدیں اور گاندھی جی کی [illegible]

کسی کیمپ میں [illegible] ہمیں استحصال کرنے والوں [illegible] اور امریکا اور یورپ کا فیشن [illegible] ستمگار [illegible] ملاقاتیں [illegible] ہے [illegible] ایک عہد بادشاہی ہیں جنہیں پریذیڈنٹ کہا جاتا ہے ہر صوبہ کا گورنر شاہی ٹھاٹ سے رہتا ہے۔ ہر صوبہ کی اپنی سرکار ہے لیڈر بہت موٹے اور بچے [illegible] ہیں اور [illegible] مرتے ہیں تب بڑی دھوم دھام سے ان کا [illegible] اور ریڈیو پہ باتیں [illegible] جیسے [illegible] ہوتے ہیں ملک و کنور کی [illegible] راجہ [illegible] ہیں ڈھال کر کھڑا کر دیا جاتا ہے۔ جس پر کتنے [illegible] بت کی صورت میں ان کا آدر کرتی ہیں جبکہ کروڑوں گاؤں کے بچے نت نئی بیماریوں سے مرتے ہیں۔

اور بڑی چرچا ہوتی ہے ادب کی ایسی تیسی ہو گئی ہے اکادمیاں جو تمغہ [illegible] تنقید نگار بڑی بوڑھیوں کی طرح [illegible] نئے ادب کو بے معنی سمت کی طرف بھٹکا رہے ہیں

تمہاری ڈاک سے اعلان کرتی ہوں کہ میں ادیب [illegible] نہیں ہوں اپنی مرضی سے جیتی ہوں جیسے برس تک جی ہوں مگر اگر [illegible] ہو گئی تو مرنے کے بعد مجھے سمندر میں پھینک دیا جائے تاکہ مچھلیوں کے پیٹ میں کا ناشتہ بن جاؤں اور کسی بہت [illegible] کے حلق میں [illegible] کسی [illegible] کا باعث بن سکوں۔

میرے پاس نئے لکھنے والوں کے بہت سے مجموعے آتے ہیں۔ بڑے [illegible] کے [illegible] ہزار کے خرچ سے خود کتاب چھپوائی ہے۔ [illegible] ہوتا ہے [illegible] کسی کی طرف [illegible] تنقید نگار [illegible] [illegible] ہوا ہے عورت [illegible] شادی ہوتی ہے [illegible] امیر طبقے [illegible]

بہت مشکل ہے
تو میں کیا کروں؟
ادیب بننے کا جنون اُردو والوں میں بھی ہے یا سب زبانوں کے ... ٹیکنیک اس مرض میں گرفتار ایک شخص ... بھی ہیروئن ... کی باتیں کرتی ہے۔ ریپ ہو کر خودکشی کرتی ہے یا منگنی ہو کر ہمدردی وصول کرتی ہے۔ ... جیتی ہیں امراؤ جان ادا آج بھی نوجوانوں کے دل کی کلی کھلا رہی ہے ... سے کس سلیقے کی داستہ

بچپن میں زیادہ مشتاق ہیں۔
دیکھو ناول ... اس وقت بہت ہی چل رہا ہے کوئی ایسی ویسی بات لکھ دی تو پھر رہ ڈھ جاؤ گے اس وقت مولانا فضلی کسی کے لاڈ کرنے کا نہیں ہو رہا ہے تم بہت پیارے انسان ہو۔
تم میں بڑی سلیقہ شناسی ہے۔ بیٹی تمہاری کہانیاں تنقید نگار ہو کر نہیں انسان کی حیثیت سے پڑھتی ہوں اور مزا بھی لیتی ہوں۔ مگر قلم کے علاوہ بھی تو کچھ ہے اور وہ لگن ہے۔ ٹی وی بھی دیکھتی ہوں ریڈیو بھی، پھر خود کہانیاں لکھنا نہیں چھوڑ سکی ہوں مجھے بھی ... دوسروں کی کہانیوں کو پسند یا ناپسند کرتی ہوں اور تمہاری کہانیوں میں تو شدید ... ہے۔ آج تک کوئی لفظ تمہارے قلم سے کانٹا بن کر نہیں چبھا۔

اچھا جب کتاب چھپ جائے گی تب پھر بات کروں گی۔

— عصمت آپا۔

غزلیں

کب بچھڑ کے ہوئی تھی تنہائی، مجھے یاد نہیں
کب خیالوں کی بات آئی، مجھے یاد نہیں
میری منزل کی طرف پاؤں بڑھاتا ہی گیا
کب تلک ساتھ تھی تنہائی، مجھے یاد نہیں
اتنا معلوم ہے ڈوبا تھا دریا غم کا
کتنی پائی تھی گہرائی، مجھے یاد نہیں
یاد اتنا ہے کہ ٹوکا تھا کسی نے ایک دن
کوئی دشمن تھا کہ وہ بھائی مجھے یاد نہیں
پھول کو صبح ملا تھا ... [illegible]
کس کی بستی پہ نظر آئی، مجھے یاد نہیں
جس کی ... [illegible]
برق وہ تھی کہ جس ... مجھے یاد نہیں
اعتبار آتا ہی نہیں ... [illegible]
میری تقدیر کہاں لائی مجھے یاد نہیں

اعتبار جے پوری

اُن کی ضد میری ادا، کچھ نہ معاملہ ہو جائے گا
یہ محبت ہے کسی دن فیصلہ ہو جائے گا
بے نیازی آپ کی گر اس طرح بڑھتی رہی
دیکھئے اک روز کوئی حادثہ ہو جائے گا
اس طرح میری طرف با شتاب مت دیکھئے
پھول ناکام کو کچھ حوصلہ ہو جائے گا
ہم نہیں کرتے ہیں تعمیر نشیمن اس لئے
آئے دن برقِ تپاں کا سلسلہ ہو جائے گا
رہروانِ کاروانِ عشق یوں اب ہو ہوشیار
راہِ الفت میں کسی دن واقعہ ہو جائے گا
وحشتِ دیوانگی میں بڑھ گئے ناحق اگر
زندگی بھر کے لئے اک مشغلہ ہو جائے گا
دیکھ پردے میں رہو میری نظر سے اے جگر
حشر کے دن تو یقیناً سامنا ہو جائے گا

جگر بستوی

مفرور نہ مجبور نہ نادار ہیں الفاظ
تاریخ کے خریدار ہیں زردار ہیں الفاظ
گنجینۂ معنی ہیں تو مجمل کا خزینہ
داناؤں کے نادانوں کے اظہار ہیں الفاظ
حسرت کی کہانی ہو کہ ہو عشق کے قصے
غم میں کبھی ڈوبے کبھی سرشار ہیں الفاظ
ملکوں کی ... بنیاد دیتے ہیں ... [illegible]
کیا شکوہ نایاب ضیا بار ہیں الفاظ
ہے کوثر و تسنیم کی موجوں کی روانی
تخلیق کے بہتے ہوئے اشعار ہیں الفاظ
وہ مختصر اشارہ ہو کنایہ ہو یا ایہام
رنگ اپنا دکھاتے ہیں پُراسرار ہیں الفاظ
تقریر ہیں، تحریر ہیں، ہر فن سخن میں
سوچو تو قمر کتنے مددگار ہیں الفاظ

قمر ایلوی



جب فلمی ستارے مدّاح بن گئے



● اداکار سنجے دت اور اُن کے مہمان نورمحمدی ہوٹل کے کھانے سے لطف اندوز ہو رہے ہیں

فلمی ستارے جو ہر دم مدّاحوں میں گھرے رہتے ہیں، جب خود کسی کے مدّاح بن جائیں تو یہ حیرت کی بات ہے۔ لیکن اگر آپ نورمحمدی ہوٹل کی نلی نہاری کا ایک بار ذائقہ لے لیں تو پھر آپ کو تعجب نہیں ہوگا۔ یہ ہے ہی اتنی عمدہ، لذیذ اور صحت مند کہ پہلے ہی نوالے میں خواص و عوام کا دل موہ لیتی ہے۔ اسی لئے نورمحمدی ہوٹل کے مستقل گاہکوں میں بڑی بڑی ہستیاں، مشہور فلمی ستارے شامل ہیں۔ یہاں کی نلی، نہاری، بھیجہ، پائے، ماش کی دال اور دیگر کھانوں کے پیچھے ۶۰ سال کا تجربہ اور جناب عبدالحکیم مالک نورمحمدی ہوٹل اور ان کے فرزند خالد حکیم کی ذاتی نگرانی شامل ہے، جس نے اُسے ممتاز بنا دیا ہے۔ آپ یہاں تشریف لاکر شوق فرمائیں، اپنے احباب کے لئے گھر لے جائیں یا پارسل کر کے لے جائیں۔ آپ اور آپ کے مہمان ذائقہ کو کبھی فراموش نہ کر سکیں گے۔

نورمحمدی ہوٹل، وزیر بلڈنگ 181/183 ای۔ آر۔ روڈ، بھنڈی بازار، بمبئی ۳۔۰۰۰۴

فون ہوٹل: 8511008 فون دفتر: 8916115

بابِ انتقاد

"آدمی درندہ ہے"
(حقیر آستانی)

سالِ اشاعت: ۱۹۹۰ء
قیمت: ایک سو روپے
ناشر: شریمتی راج رانی سین۔ ۲۰۲، گولڈ کراؤن، جے پی روڈ، اندھیری ویسٹ، بمبئی ۴۰۰۰۶۱
تقسیم کار: شانِ ہند پبلی کیشنز، فلیٹ ۸، انصاری مارکیٹ، دریا گنج، نئی دہلی ۱۱۰۰۰۲

"آدمی درندہ ہے" آنجہانی ڈاکٹر کیشو چندر سین حقیر آستانی کا نہایت دلکش اور گرانقدر مجموعۂ کلام ہے۔ اس مجموعہ کی ناشر خود اُن کی ذہین بیوہ راج رانی ہیں۔ "آدمی درندہ ہے" حقیر آستانی کی ایک طویل نظم ہے اور اسی کی نسبت سے اس کتاب کا نام رکھا گیا ہے۔ اس طویل نظم میں حقیر آستانی نے آج کے دور کے انسان کی اس کشمکش کا ذکر کیا ہے جس نے انسان سے خود انسان کو چھین لیا ہے۔ ایک سو صفحات پر پھیلی ہوئی یہ نظم انسانیت کی عبرتناک تصویر پیش کر رہی ہے۔ آج آدمی آدمی کا دشمن ہے۔ غربت و افلاس کا شکار ہے۔ تہذیب کی جامہ دری اس کا مقدر ہے۔ مذہب اور زبان، رنگ اور نسل کے نام پر ریشہ دوانیوں کا شکار ہے۔ ان سب موضوعات پر حقیر صاحب نے بھرپور روشنی ڈالی ہے۔ اس نظم کے ہر بند کے بعد ہر صفحے پر ایک تصویر دکھائی گئی ہے، جو مشہور آرٹسٹ بدر کشور کے فن کا اعلیٰ نمونہ ہے۔ یہ نظم پڑھنے سے تعلق رکھتی ہے۔ اس میں ابتدائے آدم سے زوالِ آدم تک کا ایک طویل المیہ شاعر نے اپنے حساس افکار کے ذریعے انسانی ضمیر کو بیدار کرنے کی کوشش کی ہے۔ زبان و فن اور فکر کے نقطۂ نظر سے یہ نظم ہماری اُردو شاعری کی اچھی نظموں میں شمار کی جائے گی۔

اس کے علاوہ اس کتاب میں ۴۹ غزلیں ہیں جو فکر و فن کے اعتبار سے نہایت اہم ہیں۔ اُن میں روایت اور جدت دونوں کی لذت شامل ہے۔ حقیر صاحب انسانیت نواز اور تہذیب و شرافت کے علمبردار تھے، اس لئے اُن کی غزلوں میں انسانی قدروں سے محبت، جذبات کی فراوانی ہے۔ وہ محبت و اخلاص کا صاف و شفاف آئینہ تھے۔ اُن کا دل انسانی معاشرہ کی تباہی و بربادی پر روتا تھا۔ اس لئے اُنھوں نے غزل جیسی نازک صنفِ سخن میں اپنے پاکیزہ خیالات کو پیش کر کے ہمیں اپنی جانب متوجہ کیا۔ حقیر نے وفات کی ورنہ وہ اور غزلیں کہہ کر ہماری اُردو شاعری کے دامن کو مالا مال کرتے۔ اُن کے احساس اور فکر کو سمجھنے کے لئے ہم اُن کی غزلوں کے چند اشعار پیش کر رہے ہیں۔ جن سے جدید اسلوب اور فکر کی تازگی کا اندازہ بخوبی لگایا جا سکتا ہے:

ہر کوئی ہے زیست کی جھنکار میں اُلجھا ہوا
کون ہے دائم خراماں عالمِ امداد میں

قومی یک جہتی کے نام
لاکھوں پتے ایک شجر

کفر کیا ہے میں نے آج
کہہ ڈالی ہے دل کی بات

پھول بنتی ہی رہیں گی کلیاں
مسکرانے کی اجازت کیسی؟

کس نظر کی بات کرتے ہو حقیر
اس نظر میں ایک ہیں دیر و حرم

چار سو تمدن کے دیکھئے بڑھے شعلے
اپنے اپنے دامن کو آگ سے بچانا ہے

حقیقت یہ ہے کہ حقیر آستانی کی غزلوں میں مثبت افکار ملتے ہیں۔ یہ کتاب صوری اور معنوی اعتبار سے نہایت دیدہ زیب ہے۔ اس مجموعے کی کتابت مشہور خوش نویس جمال گیاوی نے کی ہے مجھے کہیں کتابت کی خامی نہیں ملی۔ کاغذ اور ڈسٹ کور بھی اچھا ہے۔ اس کتاب کا سرورق کتاب کی نمائندگی کرتا ہے۔ اُمید ہے حلقۂ ادب میں اس کی بھرپور پذیرائی ہوگی۔

کمال جعفری

مَن کہ مکتوب الیہ

محترم سرور تونسوی، آداب!

میرے خلاف کوئی کچھ بھی لکھے، میں کبھی بھی ایسی تحریروں کا جواب نہیں دیتا جب مجھے دوسروں کے خلاف لکھنے کا حق ہے تو میں کسی پر اعتراض کیوں کروں؟ آپ نے مجھے فرقہ پرست لکھا، میں نے اس کا کوئی جواب نہیں دیا —— دوسروں نے اپنے ردِ عمل کا اظہار کیا اور آپ نے اُسے اپنے موقر ماہنامہ میں جگہ دی۔ یہ آپ کی وسیع النظری اور وسیع القلبی ہی نہیں، صحافتی ایمانداری بھی ہے۔

شانِ ہند کے شمارہ (اپریل ۱۹۹۱ء) میں آپنے پھر نوازش فرما ہے۔ یعنی میں غالب انعام کا مستحق نہ تھا اور حیات اللہ انصاری کے ذریعے نامنظور کئے جانے پر یہ انعام مجھے دیا گیا۔

میں یہ خط صرف آپ کی ایک غلط فہمی دُور کرنے کے لئے لکھ رہا ہوں۔ ورنہ مجھے اپنے سلسلے میں قطعی کوئی خوش فہمی نہیں ہے۔ غالب انعامات برائے ۸۹-۱۹۸۸ء کا اعلان ایک ساتھ ہوا تھا۔ ۱۹۸۸ء کا غالب انعام برائے اردو صحافت حیات اللہ انصاری کو ملا تھا اور ۱۹۸۹ء کا اس حقیر فقیر کو۔ حیات اللہ صاحب کے ذریعے انعام واپس کرنے پر یہ کسی کو نہیں دیا گیا اور صحافت کا انعام صرف مجھے ملا۔ اس لئے آپ کا یہ لکھنا دُرست نہیں ہے کہ حیات اللہ صاحب کے ذریعے رد کئے جانے کے بعد انعام مجھے دے دیا گیا۔

اپنی صحافت یا خدمات کے سلسلے میں مجھے قطعی کوئی خوش فہمی نہیں ہے۔ میں ستائش اور صلہ کی پرواہ کئے بغیر لکھتا ہوں۔ کسی انعام یا اعزاز کے ملنے کو خاص نہیں سمجھتا۔ العقرا اب یہ

محترمی سرور تونسوی

تسلیمات! کافی عرصہ سے آپ کا خیریت نامہ نہیں ملا۔ خدا کرے آپ صحت مند، تندرست اور توانا ہوں

ملتان میں مارچ ۱۹۹۲ء کے دوسرے ہفتے میں ایک عالمی اُردو کانفرنس منعقد ہو رہی ہے جس میں آپ کا نام بھی شامل ہے۔ دو چار روز میں اس سلسلے میں خطوط لکھنے والا ہوں۔ آپنے ہر حال میں تشریف لانا ہے۔ ہندوستانی مندوبین کے کچھ نام تجویز کر لئے گئے ہیں۔ اگر آپ بھی اس سلسلے میں کچھ مناسب اصحاب کے نام تجویز کر سکیں تو فوری طور پر تفصیلات سے آگاہ کیجئے۔

ڈاکٹر طاہر تونسوی

پرنسپل گورنمنٹ کالج ملتان (پاکستان)

محسوس ہوا کہ غالب انعام کے اعلان کے بعد آپ نے اپنے مکتوب میں جو پُرجوش خراجِ پیش کیا ہے وہ حقیقی نہیں تھا۔ میرے لئے تو سب سے بڑا اعزاز اور انعام وہ تحریریں ہیں جو میری حقیر صحافت کے خراج میں قاضی عبدالودود، پروفیسر کلیم الدین احمد، پروفیسر گوپی چند نارنگ، آل احمد سرور، ڈاکٹر گیان چند جین، پروفیسر فرمان فتح پوری جیسی جید شخصیتوں نے لکھی ہیں۔ میرے لئے ان سے بڑا کوئی اور انعام نہیں۔

آپ نے جن خیالات کا اظہار کیا ہے وہ آپ کے نظریات ہیں اور میں ان کو بُرا نہیں مانتا۔

خدا کرے آپ بعافیت ہوں۔ میرے لائق کوئی خدمت ہو تو ضرور لکھیں۔

خاکسار

رضوان احمد

ایڈیٹر "عظیم آباد ایکسپریس"

(پٹنہ)

گرامی قدر مکرم و محترم سرور تونسوی!

مزاج گرامی — بخیریت ہوں اور جناب کی خیریت کا طالب!

گرامی نامہ صادر ہو کر کاشفِ حالات ہوا ممنون و مشکور ہوں۔

"خاتونِ مشرق" میں تو آپ کا ذکر خیر نہایت مختصر ہے۔ دراصل اپنے سلسلہ وار مضامین "شخص اور عکس" میں مفصل ذکر ہوگا آپ کی خدمات، اُردو دوستی، حب الوطنی، حق گوئی اور بیباکی کا —— مجھے آپ کی خدمات کا اعتراف ہے۔ آپ نے اُردو کے لئے بہت کچھ کیا ہے۔ مجھے اُمید ہے کہ مستقبل کا مورخ آپ کی خدمات جلیلہ کو نظر انداز نہ کر سکے گا۔ آپ اپنی ذات سے ایک انجمن ہیں، ایک ادارہ ہیں، ایک تاریخ ہیں۔

اللہ تعالے آپ کو تا دیر صحتمند حیات رکھے۔

آمین —— محترم انور دہلوی صاحب تعزیتی اور عزیز گرامی جناب توفیق فاروقی کا سہرا پڑھتا جا رہا ہے۔ اس لئے انتہائی عدیم الفرصت ہونے کے باوصف جلد از جلد دہلی پہنچ رہا ہوں آپ سے مل کر مجھے بے انتہا مسرت ہوگی۔

میری رائے ہے کہ آپ کی شخصیت عہد ساز

بھی ہے۔ دہلی پہنچنے کے بعد آپ کی خدمت میں حاضر ہونے کی سعادت حاصل کروں گا۔

نیاز مند قدیم
ڈاکٹر آزاد قاسمی
ٹونک

محترم سرور صاحب،

تسلیمات عرض!

آپ اور آپ کے ہمارے شعرائے کرام کے محبوب رسالہ شانِ ہند نے جو علم و ادب اور شعر و فن کی خدمات انجام دی ہیں، اور اب بھی جو سرگرم عمل ہیں وہ حقیقت اظہر من الشمس ہے۔

ماشاء اللہ آپ کی ذاتِ گرامی ہمارے لئے ایک نمونہ ہے۔ مثال ہے۔ آپ ایک لاجواب شاعر، بے مثل ادیب، شاندار مبصر، بے نظیر محقق، جانے کیا کیا ہیں۔ آپ کی نظر نہایت وسیع، بہت بلند ہے۔ مزاج میں کس قدر گہرائی ہے۔ میں اور میری اوقات، بساط اور حقیقت کیا۔ شاعر گمنام اور ہستی بے کام، بہت کم مایہ، ذرّۂ ناچیز سوچتا ہوں شاید آپ کی اور شانِ ہند کی اس حقیر فقیر پر بھی نظر ہو جائے۔ ایک غریب مدرس وہ بھی ریٹائرڈ۔ شاید کمترین کو آپ بھولے نہ ہونگے۔ بزمِ صادق کی جانب سے کلام مشاعرہ میں آپ تشریف لائے تھے۔ کے۔ کے مینک صاحب اور صادق صاحب بھی شریک تھے۔ قبلہ شمس صاحب نے مشاعرہ کا اہتمام کیا تھا۔

خدا آپ کو اور شانِ ہند کو سلامت رکھے۔ کم از کم دعائے خیر میں نہ بھولئے۔

آپ کا ایک ادنیٰ خادم
اظہار رشادانی
دھار، (ایم۔ پی)

محترمی۔ آداب و نیاز!

پہلے مکتوب گرامی اور پھر "شانِ ہند" کے شمارے ملے۔ شکریہ! آپ کی علالت کے بارے میں پڑھ کر دکھ ہوا۔ اللہ تعالیٰ سے دعا ہے کہ وہ آپ کو مکمل صحت عطا فرمائے۔ آمین!

"شانِ ہند" نے ابتداء سے جو اپنی ادبی شناخت بنائی ہے وہ آج تک قائم ہے۔ خواہ کوئی کچھ کہے لیکن آپ کے اداریئے ایسی حقیقت پر مبنی ہوتے ہیں جن کو جھٹلایا نہیں جا سکتا۔

"دلی کے مشاعرے" پر برادر محترم کمال داس گپتا رضا کا مختصر تبصرہ "من کہ مکتوب الیہ" میں پڑھ کر دل پھڑک گیا ——

مخلص
ذکی تھانوی

مراسلات صاف اور خوشخط لکھیں۔

آزادی کے بعد اُردو شاعری کی سرفرازی اور پستی کی دلفریب داستان

دِلّی کے مُشاعرے

ماہنامہ "ایوانِ اُردو" کی نظر میں

سرور تونسوی ایک تجربہ کار مدیر ہونے کے ساتھ ساتھ زبان و ادب کے نباض بھی ہیں۔ دیارِ ادب و صحافت کی خاک چھاننے ہوئے وہ انسانی فطرت سے خوب واقف ہو گئے ہیں اور اسی واقفیت کے طفیل انھوں نے "دلی کے مشاعرے" جیسی کتاب ترتیب دی ہے۔ ایسی دستاویزی کتاب کیلئے مواد فراہم کرنا اور اسکو دلچسپ انداز میں پیش کرنا آسان کام نہیں تھا۔ انھوں نے تیس برس ان گنت راتوں کی نیند حرام کرکے دلی میں جا بجا ہونے والے مشاعروں میں اوّل سے آخر تک شرکت کی اور ان کی روداد کو نہایت دلچسپ اور مؤثر پیرائے میں قلمبند کرکے اردو شاعری کی جو خدمت انجام دی ہے، وہ معمولی نہیں۔

کتاب اتنی دلچسپ ہے کہ اسے ایک بار پڑھنا شروع کرتے تو چھوڑنے کو جی نہیں چاہتا بلکہ لوٹ کر گزرے ہوئے مشاعرے میں جا بیٹھنے کیلئے دل بے چین ہو اٹھتا ہے۔ اس کتاب کا قاری اردو شاعری کے تنوع، اسکی غنایت اور اس کے تلذذ میں کچھ اس طرح گم ہو جاتا ہے کہ اسکے شاعرانہ ذوق کی تسکین کے سارے سامان موجود ہونے کے باوجود اس کی پیاس بڑھتی جاتی ہے۔

"دلی کے مشاعرے" ایک رواں دواں ادبی عہد کی متحرک اور مستند کہانی سے عبارت ہے کہ اس میں جگر مرادآبادی، جوش، یگانہ، فراق، مخمور دہلوی، گوپال متل، دتاتریہ کیفی، ہری چند اختر، شعری بھوپالی اور دیگر بزرگ شاعروں کے ساتھ ساتھ مضطر گوردی، نریش کمار شاد، عرش ملسیانی، جگن ناتھ آزاد، عدم، احسان دانش اور ان کے بعد ابھر کر آنے والے شاعروں میں بشیر بدر، مخمور سعیدی، اور راج نرائن راز کے علاوہ بہت سارے شاعر اپنی خوش فکری کا اظہار کرتے نظر آتے ہیں۔ اسی کتاب میں ہماری ملاقات عہد ساز شاعروں کے ساتھ ان کے تمام تر تیوروں کی جھلک دیکھتے ہوئے ہوتی ہے۔ ہم ایسا محسوس کرتے ہیں جیسے ہم بذاتِ خود مشاعروں میں بیٹھے انھیں ایک دوسرے پر چھینٹے پھینکتے، ایک دوسرے کا مذاق اڑاتے، ایک دوسرے پر فقرے کستے، ایک دوسرے کی ٹانگ کھینچتے اور ایک دوسرے کو بیک وقت داد دیتے اور استہزاء کا شکار بناتے ہوئے دیکھتے ہیں۔

سرور تونسوی نے جوش ملیح آبادی کی گھن گرج، فراق کی جمالیات اور جوش ملسیانی کی زبان و بیان پر استادانہ عبور، گوپال متل کی رجائیت اور جگر کے والہانہ پن کا ذکر کرنے کے ساتھ ساتھ ہر اچھے شعر کو اچھا اور کمزور شعر کو کمزور کہنے سے چنداں گریز نہیں کیا۔ شعر پڑھتے وقت شاعر کی شکل، موڈ اور لہجہ، اور اس پر سامعین کا ردعمل بھی بھرپور ذکر کرتے ہوئے سرور تونسوی نے ہر مشاعرے کے ماحول کو ہمارے سامنے ایک تصویر کی طرح پیش کر دیا ہے۔

کتاب پورے اہتمام سے شائع کی گئی ہے۔ اور شاعروں اور شاعری سے لگاؤ رکھنے والوں کیلئے ایک نعمت ہے۔ اُردو اکادمی نے مالی اعانت دے کر ایک اہم فریضہ انجام دیا ہے۔

شانِ ہند

جلد ۵۲ شمارہ ۱۱

چیف ایڈیٹر
سرور تونسوی

جوائنٹ ایڈیٹر
مطرب صحرائی

اشاعت کا ۵۲ واں سال

پرنٹر، پبلشر، پروپرائٹر: وِدّیا پرکاش سَرور تونسوی
طباعت: خواجہ پریس، جامع مسجد دہلی۔ مقامِ اشاعت: دفتر ماہنامہ
"شانِ ہند" فلیٹ ۵ انصاری مارکیٹ دریا گنج نئی دہلی ۱۱۰۰۰۲۔

اس شمارے کی اہم جھلکیاں

سرکاری عہدے دار حکومتِ وقت کے وفادار ہوتے ہیں، نہ کہ سرکار مخالف سیاسی پارٹیوں کے ایجنٹ۔ (ابل جوگنت)

پڑھتے ہی سردار دم بخود رہ گیا اور سوچنے لگا کر بیٹا کو اپنی والدہ کا حکم ہیرا سے زیادہ عزیز ہے۔ "غوث عبدالقادر جیلانی"۔ (نجم جاوید عثمانی)

ابنِ خلدون کے نزدیک خواب کی حقیقت (ڈاکٹر حسن شرقاوی) گلزار کی تلاش میں۔ (شاہد رعنا) شرمیلا (اقبال متین) وہ (مختار احمد)

حکومتِ اصلاح (ڈاکٹر زاہد مقامی)

غزلیں — ڈاکٹر مظہر آسامی، سرور شاہجہانپوری، رادھا کرشن سہگل، حضرت ادیب، اخلاق سہسوانی، سرجیت سنگھ صبا، آئی مقبول آوگوی، منصور صدیقی، میر شفقت علی وفا، احساس فاروقی۔

ماہیا (ویک فر) "باب انتقاد" "من کو مکتوب الیہ" متفرق کالم وغیرہ

ہندو پرست ہوں نہ مسلماں پرست ہوں
دامن پرست ہوں نہ گریباں پرست ہوں
ہر ذرۂ وطن سے ہے فیاضؔ مجھ کو پیار
یعنی وطن پرست ہوں انساں پرست ہوں

فیاض گوالیاری

ممالکِ غیر میں:۔		قیمت فی شمارہ۔	پانچ روپے
بذریعہ سمندری ڈاک	-/۱۰۰ روپے	قیمت سالانہ	پچاس روپے
بذریعہ ہوائی ڈاک	-/۳۰۰ روپے	لائف ممبری	پانچ سو روپے

غزل

ڈاکٹر حقیر آستانی مرحوم



کوئی کسی کی آہ نہیں بھرتا ہے
کوئی کسی کی موت نہیں مرتا ہے

اپنا اپنا دکھڑا سب روتے ہیں
کوئی کسی کا ماتم کب کرتا ہے

کوئی بھی موسم ہو سچ تو یہ ہے
جب بھی دیکھا پھول کوئی جھڑتا ہے

اس خونخوار درندوں کی بستی میں
آدم سے آدم کتنا ڈرتا ہے

اپنے جلو میں اک طوفان اٹھائے
صبر کا پیالہ ہے جب بھی بھرتا ہے

اتنا ہی وہ نفع کماتا ہوگا
جتنا کوئی جس کا دم بھرتا ہے

بولنے دو کچھ آج حقیر انھیں بھی
کون یہاں فرزانوں سے ڈرتا ہے

بلبل چہ گفت؟ گل چہ شنید؟ و صبا چہ کرد؟

لفٹنٹ گورنر

مارکنڈے سنگھ

مارکنڈے سنگھ نے اپنے طرزِ عمل سے یہ ثابت کیا کہ وہ نہ تو چندر شیکھر کے پروردہ ہیں، اور نہ کسی ایک شخصیت کے وفادار

راجہ وشوناتھ پرتاپ سنگھ جب وزیر اعظم بنے تو انھوں نے اکثر و بیشتر گورنروں کو کانگریس حکومت کا وفادار سمجھتے ہوئے اُن کی جگہ اپنے وفاداروں کو گورنر مقرر کیا۔ چنانچہ دہلی کے لیفٹننٹ گورنر سابق ائیر مارشل سردار ارجن سنگھ کو مقرر کیا گیا۔ اور جب شری چندر شیکھر وزیر اعظم بنے تو انھوں نے بھی اپنے پیش رو کے نقشِ قدم پر چلتے ہوئے اپنے وفاداروں کو گورنری عطا کی۔ اور اس ضمن میں شری مارکنڈے سنگھ کو دلی کا لیفٹننٹ گورنر مقرر کیا گیا۔ کسی نے کہا کہ شری مارکنڈے سنگھ وزیر اعظم چندر شیکھر کے ساتھی رہے ہیں، اور کسی نے کچھ کہا۔ بہر کیف شری مارکنڈے سنگھ نے اپنے طرزِ عمل سے یہ ثابت کیا کہ وہ نہ تو چندر شیکھر کے پروردہ ہیں۔ اور نہ کسی ایک شخصیت کے وفادار۔ وہ وفادار ہیں

موجودہ لفٹننٹ گورنر شری مارکنڈے سنگھ ہر سیاسی پارٹی اور عوام کے دیکھے جاتے ہیں اور شری مارکنڈے سنگھ کو داد دی جانی چاہئے کہ اُن سے ہر کوئی خوش ہے۔ ایسی حالت میں دلّی کو ریاست کا درجہ مل جانے پر شری مارکنڈے سنگھ سے بہتر کوئی دُوسری شخصیت نہیں ہے جسے لفٹننٹ گورنری کے لئے انتخاب کیا جا سکے۔

تو اپنے ملک کے اور خدمت گزار ہیں تو اہلِ دلّی کے۔

جب شری پی۔ وی نرسمہا راؤ نے ہندوستان کی وزارتِ عظمیٰ سنبھالی تو ہر کسی کا یہی خیال تھا کہ دیکھیں اب دلّی کے لفٹننٹ گورنر کون مقرر کئے جاتے ہیں۔ کسی نے شری رومیش بھنڈاری کا نام لیا، تو کسی نے کسی دُوسری شخصیت کے بارے میں اندازہ لگایا۔ یہاں تک کہ اخبارات نے لکھا کہ دلّی کے لئے نئے لفٹننٹ گورنر کی تلاش ہے۔ مگر شانِ ہند نے وزیر اعظم کی خدمت میں یہ گزارش کی کہ شری مارکنڈے سنگھ کی کارکردگی اپنے پیش روؤں کی نسبت اس درجہ بہتر ہے اور قابلِ تعریف ہے کہ کسی بھی سیاسی پارٹی نے یہ مطالبہ نہیں کیا کہ شری مارکنڈے سنگھ کی جگہ کسی اور کو لیفٹننٹ گورنر بنایا جائے۔ ہاں کچھ مفاد پرست حضرات کا یہ ارادہ ضرور ہے کہ اُن کا کوئی اپنا حبیب لبیب اس عہدے پر متمکن ہو جائے تو اُن کے لئے بہتر رہے گا۔

مگر شری نرسمہا راؤ کی اس ضمن میں تعریف کی جانی چاہئے کہ اُنھوں نے کسی بھی گورنر یا لیفٹننٹ گورنر کو بدلنے کی ضرورت نہیں سمجھی۔ کیونکہ وہ جانتے تھے کہ سرکاری عہدے دار حکومتِ وقت کے وفادار ہوتے ہیں، نہ کہ سرکار مخالف سیاسی پارٹیوں کے ایجنٹ۔ یہ دوسری بات ہے کہ ایک دو گورنر صاحبان نے اپنی مرضی سے استعفٰے دیا۔

حال ہی میں پارلیمنٹ سے ترمیمی بل پاس ہو جانے کے بعد ایک قدیم مطالبے کی تکمیل میں دہلی کو ریاست کا درجہ دیا جانا قرار پایا ہے۔ لہٰذا یار لوگوں میں چہ می گوئیاں ہونی شروع ہو گئی ہیں کہ اگر کانگریس پارٹی دلّی میں اقتدار سنبھالتی ہے تو کسے لفٹننٹ گورنر بنایا جائے گا اور اگر بھارتیہ جنتا پارٹی کامیاب ہو جاتی ہے تو وہ کسے گورنر بنانا چاہیگی۔

چونکہ دہلی دیگر ریاستوں سے مختلف حیثیت رکھتی ہے کیونکہ یہ مُلک کا دارُالسلطنت ہے جس کی وجہ سے کئی شعبے مرکز کے تحت رہنا ضروری ہیں۔ مثلاً پولیس کا انتظام، سیکورٹی فورسز کی انجام دہی، یا زمینوں کی رجسٹری کا معاملہ، آبادکاری کا مسئلہ وغیرہ اگر ان کو مرکز کے زیرِ انتظام نہیں رکھا جاتا تو اس سے کئی طرح کی انتظامی دشواریاں پیدا ہو سکتی ہیں۔

موجودہ لفٹننٹ گورنر شری مارکنڈے سنگھ ہر سیاسی پارٹی اور عوام کے دیکھے بھالے ہیں اور شری مارکنڈے سنگھ کو داد دی جانی چاہئے کہ اُن سے ہر کوئی خوش ہے۔ ایسی حالت میں دلّی کو ریاست کا درجہ مل جانے پر شری مارکنڈے سنگھ سے بہتر کوئی دوسری شخصیت نہیں ہے جسے لفٹننٹ گورنری کے لئے انتخاب کیا جا سکے۔

شری مارکنڈے سنگھ نے جو صبر آزما حالات میں دلّی میں امن و امان قائم رکھنے میں کامیابی حاصل کی ہے، اس کے پیشِ نظر دلّی کا ہر فرد دل و جان سے چاہتا ہے کہ آنے والے دنوں میں جب کہ اس کے مخالف لوگ افراتفری پھیلانے کی کوشش کریں گے، ایسے نازک وقت میں شری مارکنڈے سنگھ ایسے آزمودہ کار اور دلّی نیز دلّی والوں کے مزاج سے پوری طرح واقف کو ہی دلّی کا لفٹننٹ گورنر رہنا چاہئے۔

وزیر اعظم شری نرسمہا راؤ سے یہ جائز اُمید کی جا سکتی ہے کہ وہ اہلِ دلّی کی اس خواہش کا یقیناً خیال رکھیں گے۔

من چہ می سرائم و طنبورۂ من چہ می سراید

عالمی اُردُو کانفرنس دلّی کے بانی اور آرگنائیزنگ سیکریٹری علی صدیقی کا ایک بیان پچھلے دنوں اخبارات میں شائع ہُوا کہ ماریشش عالمی اُردُو کانفرنس کے منتظمین نے چونکہ اُن کی مجوّزہ فہرست کے مُطابق ہندوستانی مندوبین کو مدعو نہیں کیا اور آئی۔سی۔سی۔آر کی ڈائریکٹر محترمہ دینا سکری نے ماریشش میں ہندوستانی سفارت خانے کے مشورے سے دیگر حضرات کا وفد بھجوانا منظور کیا ہے لہٰذا ان حالات میں علی صدیقی کی فہرست کے مُطابق جناب ارجن سنگھ وزیرِ تعلیم حکومتِ ہند کی قیادت میں وفد نہ جانے کی وجہ سے جناب ارجن سنگھ نے ماریشش نہ جانے کا فیصلہ کیا ہے۔

اور دُوسری طرف جناب ارجن سنگھ کا یہ فرمان اخبارات میں شائع ہُوا ہے کہ چونکہ پارلیمنٹ کا اجلاس چل رہا ہے لہٰذا وزیر اعظم نے اُن سے کہا ہے کہ وہ راجدھانی میں ہی رہیں۔

اِسے کہتے ہیں " من چہ می سرایم و طنبورۂ من چہ می سراید "۔ حالانکہ جناب ارجن سنگھ نے علی صدیقی کو اپنا طنبورہ بھی ڈیکلیئر نہیں کیا کہ وہ وزیرِ تعلیم کے بارے میں اخبارات میں کسی قسم کا اعلان شائع کرائیں۔

قومی شاعر الحاج نذیر بنارسی اور وزیرِ اعظم

پچھلے دنوں بنارس میں جو فرقہ وارانہ فساد یا دوسرے لفظوں میں مسلمانوں کے خلاف انسانیت سوز مظاہرے ہوئے اُس کے بارے میں انسانیت، شرافت اور مذہب کی غیرت انگشت بدنداں رہ گئی۔ اور قومی شاعر الحاج نذیر بنارسی کی بے حرمتی، ان کے بھتیجے ڈاکٹر امین کی پولیس حراست میں موت اور اُن کے گھر میں فسادیوں کی حرام زدگی سے گنگا تیا بھی پانی پانی ہوگئی۔

وہ نذیر بنارسی جو گزشتہ ستر سال سے بنارس ہی نہیں سارے ملک میں اپنی سیکولر شاعری کے باعث اپنا ثانی نہیں رکھتے اور جنھیں پنڈت موتی لال نہرو، جواہر لال نہرو، محترمہ اندرا گاندھی اور دوسرے اکابرینِ ملک نے ہمیشہ ہندوستان کی شان کہا اور جن نذیر بنارسی نے ملک کی آزادی کے لئے جیل جانے میں بھی بازی لگائی تھی۔ اس نذیر بنارسی کے ساتھ ایسا سفاکانہ سلوک سارے ملک کے لئے باعثِ شرم ہے۔

قاعدہ ہے تو یہ کیا جانا چاہئے کہ اس فساد میں مرنے والوں اور زخمیوں کو جو مالی نقصان ہوا ہے اس کے لئے معاوضہ دینے کے لئے صوبائی سرکار ذمہ دار ہے جبکہ یہ کھلے عام کہا گیا ہے کہ یہ فساد ہی صوبائی حکومت کے ایماء سے ہوا ہے تو ایسی حالت میں صوبائی سرکار سے کچھ اُمید رکھنا فضول ہے۔ تاہم وزیرِ اعظم جناب نرسمہا راؤ صاحب کا فرض ہے کہ وہ بنارس جائیں اور جناب نذیر بنارسی سے ان افسوسناک واقعات کے لئے اظہارِ ہمدردی کریں جو انھیں اس فساد میں پیش آئے۔ اور وزیرِ اعظم [illegible] فرض ہے کہ وہ نذیر بنارسی کی کم از کم دو ہزار روپیہ ماہانہ مالی امداد بھی جاری کریں تاکہ ہماری ملت [illegible] حضرت نذیر بنارسی آئندہ زندگی آرام سے بسر کر سکیں۔

وزیرِ اعظم صاحب دیکھیں کہ اس ذلت اور بے عزتی برداشت کرنے پر بھی جناب نذیر بنارسی کیا فرماتے ہیں:

ہر جگہ ایک ہی نظر آتی ہے
کوئی کمزور فسادی ہی اگر آتی ہے
میری چشم کو کر جو سارا جہاں کی خیر
سب کا اس میں حب ہم الفت ہی تو آتی ہے



شیخ عبدالقادر جیلانیؒ

نجم جاوید عثمانی

ہر دور اور ہر زمانے میں اللہ تعالیٰ نے اپنی مخلوق کو رشد و ہدایت کے لئے نبی بھیجے لیکن آج سے چودہ سو سال پہلے اللہ تعالیٰ نے اپنے پیارے محبوب حضرت محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو بھیجا۔ جو نبیوں میں آخری نبی تھے اور ہیں۔ ان کے بعد اب کوئی نبی نہیں آئیں گے۔ ان پر اللہ تعالیٰ نے اپنا دین مکمل کر دیا اور آپ پر نبوت ختم ہو گئی۔ لیکن آپ کے بعد اللہ تعالیٰ نے تبلیغ اسلام کا کام اصحاب اکرم اور ہر زمانے میں پیدا ہونے والے غوث اور قطب و ابدال کو سونپ دیا۔ ہر زمانے میں ولی اللہ آتے رہے ہیں اور نبی اکرم کی تائید اور ان کی سنت پر عمل کرنے کی ترغیب دیتے ہیں۔

اسی طرح پانچویں صدی میں مسلمانوں میں نفاق پیدا ہو گیا اور مسلمان دین اور اسلام سے دور ہوتے جا رہے تھے۔ وہ مایوسی اور احساسِ محرومی کا شکار ہو چکے تھے۔ تبلیغ کا کام رک چکا تھا۔ لوگ اسلام کی روح سے ناواقف تھے۔ مسلمانوں کے دین و ایمان میں تاریکی کی گھٹا ٹوپ رات کو ختم کرنے کے لئے ایک سورج طلوع ہوا۔ اور اس سورج کی روشنی سے مسلمان ہی نہیں بلکہ بھٹکے ہوئے بہت سے ذی شعور لوگ حق کی طرف لوٹے۔ یہ نام تھا حضرت شیخ عبدالقادر جیلانیؒ کا۔

حضرت شیخ عبدالقادر جیلانی — ایران کے شمال مغرب میں بحیرۂ خزر کے جنوبی ساحل پر صوبہ طبرستان واقع ہے۔ اس میں مقام جیلان ہے، جہاں آپ کی ولادت ہوئی۔ اسی علاقہ جیلان کی نسبت سے آپ کو جیلانی بھی کہا جاتا ہے۔ آپ کی ولادت یکم رمضان المبارک ۴۷۱ھ کو سادات گھرانے میں ہوئی۔ آپ کو حسنی، حسینی، سید کہا جاتا ہے کیونکہ آپ کے والد کا نسب حضرت امام حسنؓ سے اور والدہ کی طرف سے حضرت امام حسینؓ سے ملتا ہے۔ آپ نبی اکرم کی گیارہویں پشت سے ہیں۔ اس وجہ سے بھی آپ کو "گیارہویں والا پیر" کے نام سے موسوم کیا جاتا ہے۔ جب آپ پیدا ہوئے تو والدین نے آپ کا نام "عبدالقادر" رکھا۔ "ابو محمد" آپ کی کنیت ہے اور آپ کا لقب "محی الدین" ہے۔ آپ نے جو دین اسلام کی خدمت کی اور جو کارنامے سرانجام دیئے تو آپ کے معتقدین نے عقیدت سے آپ کو بہت سے القاب سے نوازا مثلاً پیرانِ پیر، دستگیر، سلطان الاولیاء وغیرہ وغیرہ۔

آپ بچپن ہی سے [illegible] تھے۔ جب آپ [illegible] کیا گیا تو آپ نے [illegible] دوسرے بچوں کے ساتھ کھیلا کودا [illegible] تو بلا غیب سے آواز آتی [illegible]

تو نہیں بڑھ جاتا اور لڑکے بچوں کے ساتھ نہیں کھیلتا تھا۔ ابتدائی تعلیم اور قرآن مجید آپ نے والد کی نگرانی میں حفظ کرنا شروع کیا۔ آپ کے والد نے آپ کی عقل بصارت کو بھانپ لیا اور زیادہ توجہ آپ کی تعلیم پر دینا شروع کر دی۔ لیکن ابھی آپ مکمل قرآن مجید حفظ نہ کر پائے تھے کہ والد ماجد کا سایہ سر سے اٹھ گیا۔

آپ کی والدہ ماجدہ بڑی دور اندیش تھیں۔ انھوں نے پوری توجہ آپ کی تعلیم پر دینی شروع کر دی اور جلد ہی آپ نے اپنی ابتدائی تعلیم مکمل کی اور قرآن مجید حفظ کر لیا۔ اس وقت بغداد علم کا گہوارہ تھا۔ آپ کے دل میں بھی شوق پیدا ہوا کہ تحصیلِ علم کے لئے بغداد جائیں اور وہاں جا کر مزید دینی تعلیم حاصل کریں۔ لہٰذا آپ نے والدہ ماجدہ سے ذکر کیا کہ "میں بغداد جا کر علم حاصل کرنا چاہتا ہوں"۔

جیلان سے بغداد تک کا سفر انتہائی خطرناک اور تکلیف دہ تھا۔ راستے میں قزاق لوٹ مار، قتل و غارت گری کا بازار گرم رکھتے تھے۔ لیکن والدہ نے خدا کی رضا کے مطابق آپ کو ایک قافلے کے ساتھ روانہ کر دیا۔ اور چلتے وقت جب خرچ کے لئے اسّی دینار دیئے گئے تو آپ نے فرمایا کہ چالیس دینار میرے بھائی کا حصہ ہے۔ لہٰذا چالیس دینار آپ کی والدہ نے آپ کی قمیص کے نیچے صدری کی بغل میں سی دیئے تاکہ جب قزاق حملہ کریں تو ان کا جسم تو ان کے پاس رہے لیکن آپ کا مال محفوظ رہے۔ راستے میں ہی قافلہ لٹ گیا۔ ایک مقام پر ڈاکوؤں نے حملہ کر دیا اور تمام مال و اسباب اکٹھا کرنا شروع کر دیا۔ آپ کی عمر اس وقت اٹھارہ برس تھی۔ یہ خیال کرتے ہوئے کہ اس کے پاس کیا ہو گا کسی نے آپ سے کچھ نہ کہا۔ چلتے چلتے ایک ڈاکو نے آپ سے پوچھا لڑکے تیرے پاس بھی کچھ ہے تو آپ نے والدہ کی نصیحت یاد رکھی۔ کیونکہ چلتے وقت والدہ کا ارشاد تھا کہ جھوٹ کبھی نہ بولنا۔ آپ نے فرمایا "ہاں میرے پاس چالیس دینار ہیں"۔ وہ مذاق سمجھ کر آگے بڑھ گیا۔ اسی طرح ایک اور ڈاکو نے آپ سے پوچھا تو آپ نے پھر وہی بتا دیا۔ وہ بھی مذاق سمجھا۔ دونوں نے اپنے سردار کو آپ کے بارے میں بتایا تو سردار کو اس بات پر غصہ آیا کہ لڑکے نے مذاق کیا ہے۔ اس نے حکم دیا کہ اسے پکڑ کر میرے پاس لاؤ۔ لہٰذا ڈاکو آئے اور آپ کو پکڑ کر اپنے سردار کے پاس لے گئے۔ سردار نے آپ سے پوچھا کہ اے لڑکے تیرے پاس کیا ہے تو آپ نے دلیری سے وہی جواب دیا تو وہ حیران ہو کر پوچھنے لگا کہ کہاں ہیں، تو آپ نے فرمایا کہ میری والدہ نے صدری میں میری بغل کے نیچے کپڑے میں سی دیئے ہیں۔ ڈاکوؤں کا سردار بولا "تجھے معلوم ہے کہ ہم ڈاکو ہیں اور دینار چھین لیں گے۔" تو آپ نے فرمایا کہ ہاں۔ پھر سردار بولا "تو پھر تم نے یہ بات چھپائی کیوں نہیں۔" آپ نے جواب دیا کہ میں نے والدہ کا حکم مانا ہے۔ انھوں نے ہمیشہ ہر حال میں سچ بولنے کو کہا تھا۔ لہٰذا میں وعدہ خلافی نہیں کر سکتا۔ یہ سنتے ہی سردار دم بخود رہ گیا اور سوچنے لگا کہ یہ ایک لڑکا اپنی والدہ کا حکم اس مستعدی سے مان رہا ہے۔۔۔ افسوس کہ میں جانتے ہوئے بھی غافل رہا اور اللہ تعالیٰ کی نافرمانی کرتا رہا۔ وہ فوراً تائب ہوا اور تمام قافلے کا لوٹا ہوا مال واپس لوٹا دیا اور اس کے تمام ساتھیوں نے بھی توبہ کر لی۔

ماہ صفر ۴۸۸ھ میں آپ بغداد پہنچ گئے۔ اور تحصیلِ علم کا سلسلہ شروع ہوا۔ سب سے پہلے آپ نے قرآن کی تعلیم حافظ ابو طالب یوسف کے زیر نگرانی مکمل کی۔ اس کے بعد آپ نے علم فقہ کے لئے حضرت ابو سعیدؒ کی شاگردی کی اور علم حدیث حضرت ابو بکر بن مظفر سے اور حضرت ابو محمد جعفر اور حضرت ابو سعید ہمدانی سے تفسیر کا علم حاصل کیا اور یہ تمام تعلیم مکمل کرنے کے بعد بھی بڑے بڑے علماء کی شاگردی کی۔ کچھ عرصہ بعد آپ کے علم و فضل کی شہرت پورے شہر میں پھیلنے لگی اور دور دراز کے لوگ آپ کی محفلوں میں آنے لگے۔ اس صورت حال کو دیکھ کر بغداد کے تمام علماء آپ سے حسد کرنے لگے۔ ایک دن تمام علماء نے مل کر فیصلہ کیا کہ ہم ایک دن آپ کی محفل میں جائیں گے۔ جب بہت بڑا اجتماع ہو گا تو ہم سب جن کی تعداد ایک سو تھی، جائیں گے اور باری باری مشکل سے مشکل مسئلہ پوچھیں گے۔ اس وقت اگر وہ کسی کا مسئلہ بتانے سے قاصر رہے تو ان کی محفل میں کمی آ جائے گی۔ جب اس ارادے سے تمام علماء اکٹھے ہو کر آپ کی محفل میں جا بیٹھے تو آپ نے وعظ شروع کر دیا اور کچھ دیر گزرنے کے بعد حضرت عبد القادر جیلانیؒ نے ایک ایک کی طرف متوجہ ہو کر اُن کے دلوں میں جو سوال تھے اُن کے جواب دینا شروع کر دیئے۔ اور تمام کے تمام سوالوں کا جواب دے دیا تو اُن میں سے زیادہ نے اپنے کپڑے پھاڑ لئے اور پوچھنے پر بتایا کہ ہم اس ارادے سے آئے تھے۔ واقعی ان حضرت کا کوئی ثانی نہیں۔

آپ کی ایک تصنیف "غنیۃ الطالبین" ہے جو ایک مکمل ضابطۂ حیات کی غمازی کرتی ہے زندگی کے تمام مسائل کے بارے میں تفصیل بتاتی ہے۔ بیشتر زبانوں میں اس کا ترجمہ ہو چکا ہے۔ آج بھی لوگ اس سے مستفید ہو رہے ہیں۔ آپ کی یہ تصنیف آج بھی لوگوں کے لئے ہدایت کا کام کر رہی ہے۔ اس کے علاوہ بھی آپ کی بہت سی اور بہت سی کتابوں میں آپ کی کرامات اور فیوض و برکات کے بارے میں تحریر کیا گیا ہے۔

علومِ ظاہری کی تکمیل کے بعد آپ نے علومِ باطنی حضرت ابو سعید مخزومی کے دستِ مبارک پر بیعت کی۔ کئی سال تک ریاضت اور نفس کشی کی خاطر جنگلوں میں پھرتے رہے۔ دنیاوی خواہشات سے ہٹ کر اللہ تعالیٰ پر اپنی توجہ مرکوز کر دی۔ آپ نے چالیس سال تک مسلسل عشاء کے وضو سے فجر کی نماز ادا کی۔ ایک دفعہ آپ بہت دور جنگل کے ویرانے میں

پہنچنے لگا اور حضور پاک ... بھی اسے اتفاق نے چھوڑ دیا تو آپ فرماتے ہیں کہ ایک مرتبہ [illegible] سے یہ حالتِ استغراق میں تھا کہ اچانک ایک نور نمودار ہوا اور وہ آہستہ آہستہ بڑھنے لگا اور کچھ ہی دیر میں سورج کی روشنی اس نور کے سامنے ماند پڑ گئی۔ اور میں محو حیرت تھا کہ اس نور سے یکایک آواز آئی کہ "اے قادر! ہم نے تجھے اب ہر چیز پر قادر کر دیا۔ اب تجھ پر حرام بھی حلال ہے۔" پہلے میں سمجھا کہ شاید یہ نور ذاتِ الحق کا ہے۔ لیکن ایک دم خیال آیا کہ آنحضرت جہاں حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم پر جب یہ مشکل دور آیا تو مجھ پر کیسے طرح آ سکتا ہے۔ آپ نے لاحول ولا قوۃ پڑھا تو ایک دم تمام نور منتشر ہو گیا شیطان اپنے اصلی روپ میں ظاہر ہو کر کہنے لگا کہ حضرت میں نے اس حربے سے ہزاروں بزرگوں کو [illegible] دی ہے۔ لیکن آپ عالم ہیں اور میں آپ کو ہرگز نہ پہنچا سکا۔

آپ کی زندگی کی ان گنت کرامات ہیں۔ آپ کی مسجد میں [illegible] سے زیادہ لوگوں کی تعداد ہوتی تھی۔ آپ کی ایک ادبی کرامت یہ تھی کہ آپ کی آواز یکساں [illegible] پہنچتی تھی اور تمام سننے والے خواہ وہ کسی بھی جگہ [illegible] بیٹھے ہوں یکساں آواز سن سکتے ہیں۔

بہرحال آپ کی [illegible] بشارت آپ کی کرامات آپ کی تعلیمات سے کوئی بھی انکار نہیں کر سکتا۔ حقیقتاً آپ "قطب الاقطاب" اولیاء کے ولی ہیں۔

غزلیں

دشتِ ہستی میں سرابوں کا سفر جاری ہے
ابتدا اوّل ہی سے خوابوں کا سفر جاری ہے
کیا تو پوشیدہ ہے یہ عالمِ [illegible] کی دُنیا
سینہ در سینہ کتابوں کا سفر جاری ہے
جب سے بے گھر ہوئے منزل نہ ملی [illegible]
آج بھی [illegible] کا سفر جاری ہے
قابلِ غور ہے تعلیم کا معیار ابھی
درسگاہوں میں نصابوں کا سفر جاری ہے
لٹ نہ جانے کہیں [illegible] آنسو
غم کے دریا میں حبابوں کا سفر جاری ہے
ہائے بیماری کا احساس [illegible] نہیں
نیند جاری ہے [illegible] کا سفر جاری ہے
[illegible]
[illegible] کا سفر جاری ہے

[illegible]

وہ ایک گھونٹ [illegible] کیا ہوا
تھا زہر زندگی کا [illegible] میں گھلا ہوا
گر کر اٹھا اور [illegible] میں
ہر موڑ پر حیات کے یہ حادثہ ہوا
تنہائی کرب یاس خلش درد نارسی
سب کچھ ہے میرے پاس [illegible] ہوا
تحسینِ رنگ و نکہتِ فصلِ بہار ہے
سینے میں [illegible] کا ٹکڑا چبھا ہوا
یہ [illegible] یہ [illegible] نقاب
دربارِ حسن دیکھ رہا ہوں لٹا ہوا
[illegible]
[illegible]
[illegible]
[illegible]

[illegible] سہگل

میرے [illegible] آپ کا نام آگیا
قلب کی اضطراب کو [illegible] کا جام آگیا
ضبط اور اختیار کا [illegible]
جو [illegible] کا [illegible] آگیا
[illegible]
منزل [illegible] آگیا
غالب کیا اگر [illegible]
[illegible] آگیا
[illegible]
[illegible]
[illegible]
[illegible]

عشرت ادیب

ایڈز

ہلاکت خیز ہے
اس کا کوئی علاج نہیں ہے
مگر اس کی روک تھام کی جا سکتی ہے

کس طرح محفوظ رہیں ؟

صرف ایک ہی یا دو ساتھی سے جنسی تعلقات قائم کیجیے۔
اگر ایسا نہ کر سکیں تو ہمیشہ کنڈوم استعمال کریں۔
ایک ہی سوئی سے دو آدمیوں کو انجکشن نہ لگایا جائے

ایک شخص کے خون سے آلودہ کسی چیز کا استعمال دوسرے شخص کے لیے نہ کیا جائے

مندرجہ ذیل باتوں سے آپ تک

ایڈس

نہیں پہونچ سکتا

جس شخص کو ایڈس کی بیماری ہے اس کے ساتھ بوس و کنار اور گلے ملنا، اس کے ساتھ کھانا کھانا یا اس کی پیالیوں اور پلیٹوں کا استعمال کرنا، مشترک ٹوائلیٹوں میں جانا یا ایک دوسرے کو چھونا



عوام کی دلچسپی کو مد نظر رکھتے ہوئے
ڈائرکٹوریٹ آف انفارمیشن اینڈ پبلی سٹی
دلی انتظامیہ کی طرف سے جاری



خواب کی حقیقت

ڈاکٹر حسن شرقاوی

علامہ ابن خلدون نے علم رویا کو دینی علوم میں شمار کیا ہے۔ اس متعدد مسلم علماء کی تصانیف موجود ہیں۔ علم رویاء کے مشہور علماء میں ابن سیرین کا نام سر فہرست آتا ہے اس موضوع پر متعدد کتابیں ہیں جن میں وہ باتیں آ گئی ہیں جو اس وقت علمائے سابقین میں مشہور تھیں اور جن کے متعلق وہ ایک دوسرے سے معلومات حاصل کرتے تھے۔

اس موضوع پر ابن سیرین کے بعد عالم اسلام کے مشہور عالم ابو اسحاق الکرمانی نے ایک کتاب تصنیف کی پھر بعد کے علماء متاخرین نے بھی اس موضوع پر اپنی آراء کا اظہار کیا ہے اور اس سے متعلق مسائل کے استنباط اور اس کے بعض [illegible] غایت کی تعیین میں بہت کچھ لکھا ہے۔ ابن خلدون اپنے مقدمے میں لکھتے ہیں کہ:

"علم تعبیر دینی علوم شرعیہ [illegible]

تعبیر (وغیرہ) نے اس علم کو کافی اہمیت دی اور ان کے یہاں اس کا رواج رہا۔"

ابن خلدون نے اس فن کے بعض علماء کا نام بھی لیا ہے۔ مثلاً ابو علی غالب القیروانی جنہوں نے ایک کتاب تصنیف کی، اس کا نام "الممتع" ہے اور اسی طرح ایک دوسرے عالم ابو عبداللہ محمد بن احمد بن عمر السالمی نے اس موضوع پر ایک کتاب تصنیف کی جس کا نام "الاختصار" رکھا۔ اسی موضوع پر شیخ عبد الغنی النابلسی کی ایک کتاب ہے جو "تعطیر الانام فی تعبیر المنام" کے نام سے موسوم ہے اور شیخ ابن فارس الظاہری نے اس موضوع پر ایک کتاب تصنیف کی جو "الاشارات فی علم العبارات" کے نام سے مشہور ہے۔ اسی طرح دیکھا جائے تو ان علماء کی فہرست بہت طویل ہو جاتی ہے جنہوں نے اس موضوع پر قلم اٹھایا

علماء کے نزدیک خواب کا علم ایک ناقابل انکار حقیقت ہے جس پر کسی نے شک ظاہر نہیں کیا۔

علامہ ابن خلدون (رحمۃ اللہ علیہ) [illegible] کریم صلی اللہ علیہ وسلم [illegible] خواب سے ہوا۔ آپ خواب میں جو کچھ دیکھتے بیداری میں وہ ہو بہو سامنے آتا۔ حدیث کے الفاظ ہیں:

"فکان لا یری رؤیا الا جاءت مثل فلق الصبح۔"

(آپ [illegible] جیسا کہ تعبیر [illegible] سامنے آ جاتی تھی)

[illegible] صلی اللہ علیہ وسلم کا معمول [illegible] نماز کے بعد [illegible]

[illegible]

نے اس نے دریافت فرمائے تھے کہ ان کے خوابوں صدیوں کے طلبہ اور اسکالر کی خود تعبیر حاصل کریں۔ ابن خلدون یہ تسلیم کرتے ہیں کہ خواب اور اس کی تعبیر سلف صالح (وہ پچھلے علماء جو عقیدہ اور عمل کے اعتبار سے محمود ہیں۔ اور ان کے نقشِ قدم پر چلا جا سکتا ہے۔ مراد اہل سنت کے معتبر علماء جو علم دین اور عقیدہ کے اعتبار سے سب کے معتمد علیہ تھے۔ مثلاً صحابہ کرام، تابعین وغیرہم) کے دور میں بھی موجود تھی جس طرح بعد کے زمانے میں اس کا وجود ہے۔ اور ان کا خیال ہے کہ یہ علم پچھلی امتوں میں بھی پایا جاتا تھا لیکن ہم تک نہیں پہنچا۔ اس وقت یہ علم صرف ماہرینِ تعبیر ہی تک محدود تھا، اس کی تدوین و تالیف کی کوشش نہیں کی گئی تھی۔

ابن خلدون کا خیال ہے کہ مسلمانوں سے پہلے کسی نے بھی اس علم کی تالیف اور اس کے مسائل کی وضاحت میں پیش قدمی نہیں کی۔ وہ پچھلی امتوں میں بھی علم رؤیا کے وجود کے قائل ہیں۔ اور ان کا کہنا ہے کہ خواب کا تعلق ہمیشہ انسان ہی سے ہے اور اس کی تائید میں حضرت یوسف علیہ السلام کے خواب اور ان کی تعبیر کو پیش کرتے ہیں جیسا کہ قرآن شریف میں آیا ہے۔

ترجمہ: اے اہل دربار! مجھے اس خواب کی تعبیر بتاؤ، اگر تم خوابوں کا مطلب سمجھتے ہو۔

ان لوگوں نے کہا (یعنی اہل دربار نے) یہ تو پریشان خوابوں کی باتیں ہیں اور ہم اس طرح کے خوابوں کا مطلب نہیں سمجھتے۔

اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا قول۔

"لم یبق من النبوۃ الا المبشرات"

(یعنی نبوت ختم ہو گئی اور اس میں سے صرف "مبشرات" باقی رہ گئی ہے جس کی خواب میں بشارت دی جائے۔)

جب آپ سے مبشرات کے متعلق دریافت کیا گیا تو آپ نے کہا "الرؤیا الصالحۃ" یعنی سچے خواب۔

حضرت ابوذر غفاری نے حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے مبشرات کے متعلق دریافت کیا تو آپ نے فرمایا:

"ہی الرؤیا یراھا المومن
فتحقق لہ۔"

یعنی وہ خواب جو ایک مرد مومن دیکھتا
ہے اور وہ عمل کر سامنے آجاتا ہے۔

ابن خلدون استشہاد میں حدیث متواتر پیش کرتے ہیں:

"رؤیا المومن جزء من ستۃ
واربعین جزءا من النبوۃ۔"

(بحوالہ بخاری)

یعنی "مومن کا خواب نبوت کا
چھیالیسواں حصہ ہے۔"

خواب کی حقیقت

ابن خلدون کا خیال ہے کہ خواب نام ہے غیب کی باتوں کے ادراک کا۔ بالفاظ دیگر ان چیزوں کا ادراک جو انسان کے حسی مدرکات سے ماوراء ہوں۔ اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ حس کے علاوہ دوسرے وسائل سے بھی ان کا ادراک محال ہے، بلکہ ان کا ادراک روح غیر جسمی مدرکات کے ذریعے ممکن ہے۔ ان کے نزدیک روح (جس کو وہ روح قلبی سے موسوم کرتے ہیں) تمام جسمانی اعضاء کی رگوں اور اس کے خون میں لطیف بھاپ کی شکل میں رواں دواں ہے اور خارجی احساسات اسی کے ذریعے حاصل ہوتے ہیں۔

اسی طرح جب یہ لطیف بھاپ روح قلبی سے نکل کر پھیلتی ہے تو اس کی مدد سے حیوانی قوتیں جسم کے اعضاء پر کام کرتی ہیں۔ لیکن سوتے وقت روح قلبی سے نکلنے والی یہ لطیف بھاپ سونے والے کے جسم میں [illegible] ہونے کی وجہ سے [illegible] ہو جاتی ہے اس طرح جسمانی [illegible] جسم کے [illegible] ہو جاتے ہیں [illegible] دیکھ سکتا ہے، نہ سن سکتا ہے، نہ کسی چیز کا ذائقہ محسوس کر سکتا ہے۔ یہی نوم (سونے) کی حقیقت ہے۔

ابن خلدون مزید تحریر فرماتے ہیں کہ روح قلبی روح عاقل کے تابع ہے جو عالم امر میں موجود تمام اشیاء، اعمال و افعال کا ادراک کرتی ہے۔ اس لئے کہ یہی عین ادراک یا ادراک بالذات یا حقیقت ادراک ہے۔ یہاں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ جب انسان کی روح عاقل عالم امر میں پائی جانے والی تمام چیزوں کا ادراک کر لیتی ہے تو انسان ہمیشہ پردۂ غیب میں پوشیدہ چیزوں کا ادراک کیوں نہیں کرتا؟ ابن خلدون اس کا جواب دیتے ہوئے لکھتے ہیں کہ وہ غیب کا ادراک اس لئے نہیں کرتا کہ اس کے اندر ایک حجاب ہے۔ یہ جسم اور جسمانی حواس نیز حیوانی قویٰ کے ساتھ اس کی مشغولیت کا حجاب ہے۔ اگر یہ حجاب دور ہو جائے تو اس کی قوتِ ادراک اس قابل ہو جائے کہ اپنی حقیقت یعنی عین ادراک یا ادراک بالذات تک پہنچ جائے اور تمام چیزوں کا ادراک کر لے نیز سارے مدرکات سمجھ لے۔

جب بھی حس کی مشغولیتیں اور ان کے تقاضے اور قوتِ حیوانی کی خواہشات کمزور پڑ جاتی ہیں تو انسان کی روح عاقل آزاد ہو جاتی ہے۔ اور عالم روح کے مناسب محسوسات کو قبول کرنے کی اہل ہو جاتی ہے۔ نتیجہ یہ ہے کہ جسمانی مشاغل اور حواس ظاہرہ ہی وہ عظیم ترین موانع ہیں جو روح عاقل کو مغیبات اور عالم روح میں موجود حقائق کے ادراک سے باز رکھتے ہیں جیسا کہ پہلے اوپر ذکر کیا۔ جس قدر روح عاقل کی مشغولیتیں کم ہوتی ہیں، اسی نسبت سے وہ عالم روح کی ایک جھلک پا لیتی ہے۔ پھر جب روح عاقل اپنے جسم میں لوٹ آتی ہے تو اس وقت وہ جسمانی وسائل یعنی آنکھ جیسی مدرکات اور [illegible] خیال کی مدد کے بغیر کسی تصرف سے قاصر ہو جاتی ہے۔

ابن خلدون خواب کی حالت میں خیال کا عمل متعین کرتے ہوئے یہ خیال پیش کرتے ہیں کہ خیال کا کام یہ ہے کہ محسوس کی جانے والی صورتوں کو اخذ کرے تاکہ انھیں خیالی صورتوں میں تبدیل کر کے قوت حافظہ کے سپرد کر دے کہ بوقت ضرورت کام آنے کے لئے انھیں محفوظ کر لے۔ خود نفس بھی یہی کام انجام دیتا ہے۔ چنانچہ وہ بھی حسی صورتوں کو نفس اور عقلیاتی صورتوں میں تبدیل کر دیتا ہے تو اس عمل تجرید میں محسوسات سے معقولات میں تبدیل ہو جاتی ہے اور خیال اس عمل میں رابطہ بن جاتا ہے۔

خواب کی حقیقت بیان کرتے ہوئے ابن خلدون یہ وضاحت کرتے ہیں کہ نفس انسانی جب مادی دنیا میں کوئی چیز محسوس کر لیتا ہے تو اس کو خیال میں منتقل کر دیتا ہے جیسے وہ مناسب شکل دے کر حس مشترک کی طرف منتقل کر دیتا ہے چنانچہ سونے والا اُسے ایسی شکل میں دیکھتا ہے جس میں طول، عرض، عمق، سب کچھ موجود ہوتا ہے۔

اس طرح ابن خلدون کی رائے میں خواب نام ہے اس عمل کا کہ روح عقلی، عالم امر کے اخبار کا ادراک کرے اور انھیں حس مشترک کے حوالے کر دے۔ اور روح عقلی اور حس مشترک کے درمیان خیال واسطہ کا کام کرے۔

خواب اور پراگندہ خیالات :

ابن خلدون سچے خوابوں اور بے حقیقت پراگندہ خیالات میں تفریق کے قائل ہیں۔ ان کا خیال ہے کہ دونوں ہی عالم خواب کی خیالی صورتیں ہیں۔ لیکن رویائے صالحہ کے وقت وہ روح عقلی سے بلاواسطہ آتی ہیں اور اضغاث احلام کے وقت وہ [illegible] حافظہ میں آتی ہیں جن [illegible] خیال نے عالم بیداری میں حافظہ کے حوالے کیا ہوتا ہے۔ قرآن مجید نے بھی رویائے صالحہ اور اضغاث احلام (سچے خواب اور بے حقیقت پراگندہ خیالات) کا فرق ملحوظ رکھا ہے جیسا کہ بادشاہ مصر اور اس کے درباریوں کی گفتگو سے معلوم ہوتا ہے۔

(ترجمہ)[13] "اے اہل دربار! مجھے اس خواب کی تعبیر بتاؤ۔ ان لوگوں نے کہا یہ تو پریشان خوابوں کی باتیں ہیں اور ہم اس طرح کے خوابوں کا مطلب نہیں سمجھتے"

خواب کی تعبیر :

جیسا کہ پہلے بیان کیا گیا ہے کہ روح عاقلہ نیند کی حالت میں عالم ارواح سے مناسب چیزوں کا ادراک کرتی ہے اور انھیں عالم خیال کو منتقل کر دیتی ہے جو ان کی حتی الامکان مناسب صورت گری کر دیتا ہے۔ ابن خلدون نے اسے بعض مثالوں سے واضح کیا ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ بادشاہ اعظم کی تصویر سانپ اور اژدہے کی شکل میں خیالات کے پردے پر ابھرتی ہے۔ خواب دیکھنے والا بیدار ہونے کے بعد اس کی صحیح تعبیر سے نہیں واقف ہو پاتا ہے اور اسے حقیقت سمجھ بیٹھتا ہے۔ لیکن معبر یعنی تعبیر بتانے والا اسے سمندر سے سلطان اعظم اور اژدہے سے مراد دشمنی کی تعبیر بتاتے ہیں۔

تعبیر بتانے والا اس میدان میں قوت تشبیہ کا سہارا لیتا ہے۔ اس تشبیہ کے بعد سمندر کا خواب میں نظر آنا، سلطان اعظم یعنی بڑی قوت کی تعبیر ہے۔ اس کو کچھ قرائن و اشارات کی ضرورت ہوتی ہے۔ اس لئے معبر کا صاحب علم و بصیرت ہونا لازمی ہو جاتا ہے۔ چنانچہ جب سمندر کی تعبیر "سلطان اعظم" سے کرتا ہے تو گویا وہ دونوں کو باہمی مشابہت اور مناسبت کی وجہ سے مربوط کر دیتا ہے اس لئے کہ سمندر بھی اسی طرح تخلیق کا عظیم شاہکار ہے جس طرح "سلطان اعظم"۔ اور اسی طرح سانپ بھی دنیا کی حقیر مخلوق اور موذی ہے جیسے دشمن۔ اور برتن کی تعبیر عورتوں سے کی جاتی ہے کیونکہ وہ دونوں ہی ظروف کی حیثیت رکھتے ہیں۔

علامہ ابن خلدون بیان کرتے ہیں کہ بعض اتنے واضح ہوتے ہیں کہ اس کی تعبیر و تشریح کے لئے کسی تعبیر بتانے والے کی ضرورت نہیں پڑتی اور دین کے لئے یہ حدیث پیش کرتے ہیں۔

"الرؤیا ثلاث: رؤیا من اللہ، رؤیا من الملک، رؤیا من الشیطان۔"

خواب تین ہیں: یعنی وہ خواب جو خدا کی جانب سے ہوتے ہیں، اتنے واضح ہوتے ہیں کہ ان کی تعبیر کی ضرورت نہیں ہوتی، اور خواب ملکی یعنی فرشتوں کے دکھلائے ہوئے خواب بھی سچے ہوتے ہیں لیکن ان کی تعبیر کے لئے کسی تعبیر بتانے والے کی ضرورت پڑتی ہے۔ اور شیطانی خواب وہ ہیں جنھیں ہم پراگندہ خیالات سے تعبیر کرتے ہیں، نہ ان کی تعبیر ہوتی ہے، نہ تاویل۔

ابن خلدون مزید وضاحت کرتے فرماتے ہیں کہ روح عاقلہ جس شکل میں حس مشترک کے سامنے [illegible] خوابوں میں خواب کی تصویر کشی کر سکتی ہے اگر حس نے کبھی اس چیز کا ادراک نہیں کیا ہے تو روح عاقلہ اس کی تصویر کشی نہیں کر سکتی۔ [illegible] نفسیات عالم [illegible] اور احلام [illegible] لغت عربی میں خواب کے لئے استعمال ہوتے ہیں میں فرق نہیں کرتے اور دونوں کو ایک [illegible] ہیں۔ وہ خواب کے بارے میں [illegible] انسانی شخصیت کو [illegible] کا بھی یہی خیال ہے۔ [illegible] خواب بھی [illegible] ہوا تعبیر بتانے والے [illegible] پہلو مکمل ہو جاتا ہے۔ [illegible] جن سے [illegible] وہ ہر قسم [illegible] اس کے لئے [illegible] کا وہ تصور کر سکتا ہے۔ ابن خلدون کی [illegible] میں تعبیر بتانے والے کو [illegible]

اس لئے کہ جب وہ کبھی اِن چیزوں کے لئے سمندر کو شیطان، سانپ کو سلطنت اور پہاڑوں کو امور سے تعبیر کرے گا تو اس وقت جا کر اس کے لئے پیچیدہ ہو جائے گا اور وہ تعبیر خواب کی قانونی شکل کرنے میں غلطیوں میں مبتلا ہو جائے گا۔ اسی وجہ سے علماء معبرین نے کہا ہے کہ علم تعبیر خواب کے کچھ قوانین و کلیات ہیں جن سے تعبیر بتانے والے کا پوری طرح واقف ہونا ضروری ہے اور جو بھی وہ تعبیر بیان کرے اسی کی بنیاد پر چلتا۔ خارجی طور پر جب ایک جگہ سمندر کی سلطان سے تعبیر کی جائے گی اور دوسری جگہ آسمانی عذاب اور غم و آلام سے بھی تعبیر کی جائے گی۔ اسی طرح سانپ کی تعبیر دشمن ہوتی ہے لیکن کبھی اس سے اسرار و رموز کی حفاظت بھی مراد ہوتی ہے۔ موقع و مناسبت کے لحاظ سے۔ اسی لئے معبر کے لئے ضروری ہے کہ اسے تعبیر کے قوانین کی پوری پوری آگاہی ہو اور اس کے ذریعے تو قیود مناسبت خواب کی تعبیر بیان کرے۔ وہ قرائن و شواہد جن کا معبر سہارا لیتا ہے، ان میں سے بعض خواب دیکھنے والے کی حالت بیداری سے تعلق رکھتے ہیں، اور بعض حالت نوم سے اور بعض معبر کے دل کی پاکیزگی پر منکشف ہوتے ہیں۔ جو جس معتقد ہستی کا پیدا کیا گیا ہے اس کے لئے اس میں سہولت پیدا کر دی جاتی ہے۔

غزلیں

پیکرِ شعار رہا ان کا جو بالیدہ رہا
راہرو کا ہر قدم لرزیدہ لرزیدہ رہا
بامرادی بھی اس کا مسرت سے مگر
ہائے بیزاری کہ وہ اس پر بھی رنجیدہ رہا
[illegible]
میں تو اپنے شہر میں رہ کر بھی ترسیدہ رہا
کیا اسی محفل کے جلوے ہیں جو گلشن کا وقار
[illegible] چشم گاہ میں رہ کر بھی خندیدہ رہا
[illegible]
جو بھی جانب گیا یاں رہ کے پوشیدہ رہا
[illegible]
اس طرح غم کی دنیا میں ترسیدہ رہا
[illegible]
کیا خبر کیوں [illegible] میں بھی ترسیدہ رہا
[illegible]
[illegible]
زندگی میری ہے جیسے اک [illegible] کا سوال
اس طرح میرا وجود اخلاق پیچیدہ رہا

اخلاق سہسوانی

تم تو انساں ہو انساں کے مددگار بنو
آدمیت کا انوکھا کوئی کردار بنو
اجنبی تم نہ بنو، قوم کے معمار بنو
ذہنِ ملت کو بھی آمادۂ پیکار بنو
جس طرح پھول کھلیں مہکے چمن میں یارو
تم بھی پھولوں کی طرح گوشۂ گلزار بنو
کبھی دل میں نہ عداوت کو جگہ دو یارو
کوئی بیگانہ نہ ہو سب کے ہی تم یار بنو
کوئی دشمن جو وطن اپنے پہ حملہ کر دے
مردِ میداں بنو، تیشۂ و تلوار بنو
جاں نثارو اے جوانو اپنے وطن کی خاطر
تم نگہبانی وطن کی کرو، ہشیار بنو
[illegible] کبھی بچنے پائے
اہلِ عالم کے ہمیشہ ہی [illegible] بنو
اپنے ہی خون سے سینچا ہے وطن کا گلشن
اس کے پھولوں کی حفاظت کے طلبگار بنو
[illegible] تڑپنے کے لئے
اے سیالؔ اُٹھو اللہ [illegible] بیدار بنو

ہرچرن سنگھ سیال

زندگی ہوتی ہے انجام کا ڈر ہونے تک
دردِ یہ سانس تو ہے عمر بسر ہونے تک
منتظر تھا شبِ آخر کی سحر ہونے تک
آپ غافل رہے بے خبر میری خبر ہونے تک
اپنی خوبی کا بھی احساس کہاں ہوتا ہے
حسن کو زینتِ آغوشِ نظر ہونے تک
زخم پر رحمت کے لئے بیمار کا لازم ہے
اشک پلکوں پہ لرزتا ہے گہر ہونے تک
میں کہ جب بن گیا ان کا تو کسی کا نہ رہا
وہ کہ میرے نہ بنے عمر بسر ہونے تک
حسرتِ وصل ہے کیا صدمۂ ہجراں کیا ہے
کون جانے گا محبت کا اثر ہونے تک
مجھ کو ہے میری قسم ہر نفس میری قضا
[illegible] ان کی نظر ہونے تک
روشنی آ نہ سکے گی مرے گھر کے اندر
در پہ دربان اندھیرا ہے سحر ہونے تک
ہم سے اس بات پہ کچھ بات بنائے نہ بنی
عشق کا سوز ہے پرواز شرر ہونے تک
[illegible] اعمال کی مقبول ہے
میری [illegible] تقصیر کے [illegible] ہونے تک

مقبول آنولوی



کردار کی تلاش میں

شاہد رضا

آئیے اندر تشریف لے آئیے
معاف کیجئے کہ آپ کو تھوڑا انتظار کرنا پڑا۔ حالانکہ میں آپ ہی کا منتظر تھا۔ گھنٹی کی آواز میں نے فوراً سن لی تھی۔ لیکن روشنی کا بندوبست کر رہا تھا۔ جب گھر میں کوئی مہمان آئے تو تھوڑی بہت روشنی ضرور ہونا چاہئے۔ آئیے آئیے روشنی کم ضرور ہے۔ مگر آپ کو کوئی پریشانی نہیں ہوگی۔ یہاں پر ذرا دیکھ کر۔ یہاں پر گندی نالی بھی ہے۔ اور زمین بھی کچھ ہموار نہیں ہے۔ ابھی جب میں آپ کو لینے جا رہا تھا تو یہیں پر لڑکھڑا گیا تھا۔ حالانکہ اتنا اندھیرا بھی نہیں ہے اور پھر تو میں یہاں برابر آیا کرتا ہوں۔ لیکن ایسا ہوتا ہے۔ کبھی کبھی اس جگہ ٹھوکر لگتی ہے جہاں اس کی توقع بھی نہ ہو مگر ہاں آئیے میں آپ کا ہاتھ پکڑ لوں۔ یہ دیکھئے سیڑھیاں بھی ٹوٹی ہوئی ہیں۔ لیکن جس سالے سے اینٹیں جوڑ کر بنایا گیا تھا وہ بہہ گیا۔ اب کے بارش بھی تو غضب ہوئی

ارے آپ رک کیوں گئے اتنا ڈر گئے گھبرا گیا آپ نے۔ آپ کا چہرہ کیوں بگڑ گیا ہے اور اب سمجھا۔ یہ آوازیں۔ آپ ڈریئے نہیں۔ اور پھر جس شخص سے ملاقات کے لئے آپ آئے ہیں یہ اسی کی آوازیں ہیں۔ بڑی بھیانک ہیں نا۔ پاگلوں کی طرح چلا رہا ہے وہ لیکن آپ بالکل پریشان نہ ہوں۔ تھوڑی دیر میں یہاں قبرستان جیسی خاموشی چھا جائیگی میں نہیں ڈرتا ان آوازوں سے۔ ایک مدت سے سنتا آ رہا ہوں۔ چند دن ہی میں رہتا ہوں یہیں۔ وہ ٹوٹی ہوئی دیوار ہے ناں۔ اس کے دوسری طرف ایک چھوٹا سا میدان ہے۔ ہمارے گھر اور اس دیوار کے درمیان۔ لیکن جب یہ شور بلند ہوتا ہے تو اس ٹوٹی ہوئی دیوار کو پار کر کے میدان کے علاوہ [illegible] میرے گھر کی چہار [illegible] سے نیچے اتر جاتا ہے۔ یقین کیجئے یہ شور [illegible] کر میرے گھر کے در و دیوار خاموش ہو جاتے ہیں

ہاں کیوں نہیں آس پاس اور لوگ بھی رہتے ہیں۔ ایسی بات نہیں ہے یہ انسانوں کی بستی ہے۔ لیکن اس مشینی دور نے ہر کسی کو ایک دوسرے سے بے تعلق کر رکھا ہے۔ یہ بڑی رفتار والی یہ راتوں رات منزل پانے کی خواہش اور گرد و پیش دیکھنے کی مہلت ہی کہاں دیتی ہے

ہاں اب آپ کو انتظار کرنا پڑے گا جب یہ آوازیں بند ہو جائیں گی تب اس سے ملاقات ہو سکے گی۔ میرا خیال ہے کہ [illegible] انتظار کرنے سے بہتر ہے بیٹھا جائے۔ آئیے اوپر کمرے میں بیٹھئے۔

کیا کہوں ان آوازوں نے مجھے پاگل بنا رکھا ہے [illegible] بھی بند نہیں کر سکتا کس قدر سخت گرمی ہے۔ موسم بھی کتنا عجیب ہے [illegible] طاقت کے مظاہرے [illegible]

بادل سمندروں سے پانی لے کر دریاؤں کو بھرتے ہیں، دریا ... قدرت کے ... دیتا ہے۔ ہوائیں اپنے ساتھ نہ جانے کیا کیا اڑائے جاتی ہیں۔ اور ... یہ بھی کم ... نہیں ہے۔ راستوں کو اس قدر گرم کر دیتا ہے کہ چلنا دشوار ہو جاتا ہے

اور ہاں ایک بات تو بتانا بھول ہی گیا۔ اس دورے کا وقفہ کبھی کبھی بہت طویل ہو جاتا ہے۔ ساری ساری رات گزر جاتی ہے۔ کئی کئی دن گزر جاتے ہیں۔ لیکن آپ فکرمند نہ ہوں۔ یہاں آپ کو کوئی تکلیف نہ ہوگی۔ سوائے اس کے کہ یہ آوازیں آپکی سماعت سے ٹکراتی رہیں۔ وہ بھی اگر بجلی آ گئی تو یہ کھڑکیاں اور دروازہ بند کر دوں گا۔

آپ کھڑے کیوں ہو گئے۔ جانا چاہ رہے ہیں آپ۔ اپنے کردار سے ملے بغیر۔ ارے صاحب آپ ناحق ناراض ہو رہے ہیں۔ میں آپ کی ملاقات کسی پاگل سے نہیں کروا رہا ہوں۔ ہاں اس گھر میں اور لوگ بھی رہتے ہیں لیکن اس وقت یہاں موجود نہیں ہیں اور اگر ہوتے بھی تو ان آوازوں کو بند کروانے کی کوشش کوئی نہیں کرتا۔ میں جرأت نہیں کر رہا کہ آپ کو ... ابھی نہیں لگ رہی۔ آپ کان دیواروں سے لگا لیں آپ کو اپنے کردار سے ... آتے ہیں بس۔

ٹھیک ہے اگر آپ بضد ہیں تو چلا جائے۔ لیکن بس اتنی دیر ٹھہر جائیے کہ میں آپ کو ایک کہانی سنا سکوں۔ لیجئے بجلی بھی آ گئی۔ اب آپ آرام سے بیٹھیں میں یہ کھڑکیاں اور یہ دروازہ بند کئے دیتا ہوں۔

ویسے تو وہ انسان اپاہج ہوتا ہے جس کا کوئی عضو بیکار ہوتا ہے۔ قدرت اس کو اپاہج پیدا بھی کرتی ہے یا بعد میں کر دیتی ہے لیکن ان کے علاوہ کچھ ایسے اپاہج بھی ہوتے ہیں جو مکمل ہوتے ہیں۔ قدرت ان کو پوری طرح نواز کر بھیجتی ہے یہ وہ لوگ ہوتے ہیں جو ہاتھ پاؤں سلامت ہوتے ہوئے بھی وہاں نہیں پہنچ پاتے جہاں ان کی ضرورت ہوتی ہے۔

ارے آپ پھر ناراض ہونے لگے میں آپ کو کوئی نصیحت نہیں کر رہا ہوں اور نہ ہی کوئی تقریر کر رہا ہوں۔ یہ الفاظ آپ کے کردار ہی کے ہیں۔ لیکن آپ سے بہت پہلے کے جب یہ شخص بالکل ٹھیک تھا وہ ہماری طالب علمی کا دور تھا ہم لوگ گہرے دوست تھے۔ قدرت نے اعجاز کو بڑا اچھا ذہن عطا کیا تھا وہ تعلیم حاصل کرنے کے لئے گاؤں سے شہر آیا تھا غریب والدین کی اولاد تھا لیکن ماموں نے اس کو سنوارنے کا عہد کیا تھا وہ بہت خوش تھا شہر آکر کھلی فضا حسین خواب سجانے کے لئے خوبصورت ماحول سبھی کچھ موجود تھا

پھر تھوڑے دنوں کے بعد یہ راز کھلا کہ ماموں اعجاز کی نہیں بلکہ اپنی اپاہج بیٹی کی زندگی سنوار رہے ہیں۔ اعجاز ہی نے بتایا تھا کہ عندلیب کا ایک ہاتھ بیکار ہے گہری ہمدردی کا اظہار کیا تھا اس نے۔ پھر ایک دن اس نے بتایا کہ وہ عندلیب کے لئے اپنے دل میں محبت کا بیج پھوٹتا ہوا محسوس کر رہا ہے۔ یہ محبت بھی عجیب جذبہ ہے دل میں چپکے چپکے اتر جاتا ہے بغیر اجازت لئے ہوئے بغیر کچھ کہے۔ اور اگر کبھی اس کو ایسا کرنے میں کوئی دشواری پیش آنے کا خدشہ ہو تو ہمدردی کا روپ دھار لیتا ہے پھر سب کے سامنے لباس اس طرح تبدیل کرتا ہے کہ کسی کو کچھ نظر نہیں آتا۔

میں کہانی سے تھوڑا بہت ہٹ گیا تھا۔ معافی چاہتا ہوں ہاں تو پھر میں نے دیکھا کہ اعجاز کے دل کا وہ پودا جوان ہو گیا ہے میں نے ہی نہیں بلکہ اس کے ہر ساتھی نے دیکھا ہوگا کیونکہ اس کی سبز سبز ڈالیاں اعجاز کی آنکھوں سے باہر پھوٹتی ہوئی نظر آتی تھیں۔ اس کی رفتار میں ایک نشہ سا محسوس ہوتا تھا جیسے کوئی خوشبوؤں کے شہر سے گزر رہا ہو۔

پھر وہ پہلے سے زیادہ محبت کرنے لگا وہ اکثر کہا کرتا تھا کہ اب میں اپنے لئے نہیں عندلیب کے لئے سب کچھ کرتا ہوں۔ وہ کہتا تھا کہ عندلیب بہت اداس رہتی ہے۔ سب کے لئے رشتے آتے ہیں۔ لیکن اس کے لئے کوئی نہیں آتا جیسے وہ موجود ہی نہ ہو پھر ایک دن اعجاز نے اس کے ہاتھ کا بنا ہوا سوئٹر مجھے دکھایا تھا بہت خوبصورت تھا وہ اس سوئٹر کو دیکھ کر میرے تصور میں ایک پیکر ابھرا تھا لیکن جب عندلیب کو دیکھا تو وہ اس سے بہت زیادہ حسین نظر آئی تھی۔ کچھ چہرے ایسے ہوتے ہیں جن پر پڑتے ہی نگاہیں عقیدت سے جھک جاتی ہیں ایسا ہوتا ہے عندلیب بھی ایسی ہی تھی پاکیزہ پاکیزہ منور چہرے والی۔

اعجاز نے اپنے ماموں کو اور عندلیب کو یہ یقین دلایا تھا وعدہ وفائی نبھائے گا پھر ہم لوگ الگ الگ ہو گئے تھے۔ کامیاب زندگی گزارنے کے لئے کسی خاص میدان کا انتخاب ضروری تھا اور اتفاق سے گہرے دوست ہوتے ہوئے بھی ہم لوگوں نے الگ الگ میدان کا انتخاب کیا۔

دو سال پہلے ہی اس شہر میں آیا ہوں امید بھی نہیں تھی کہ اعجاز سے ملاقات ہوگی اور وہ بھی اس صورت میں۔ اچھا ہوتا اگر اعجاز مجھ سے نہ ملتا۔

اس شہر میں وہ مجھ کو ایک چوراہے پر ملا تھا پہچاننا مشکل تھا اس کو لیکن چونکہ میں نے اس کے چہرے کا ہر نقش بہت قریب سے دیکھا تھا اس لئے فوراً پہچان لیا۔ بڑھا ہوا شیو۔ اور ہاتھ پر ... کا بیگ تھا مگر اس کے جسم پر سوئٹر تھا۔ وہی سوئٹر جس کو

عندلیب نے بنایا تھا۔ لیکن اس کے سارے رنگ اڑ چکے تھے۔ وہ اس بار اُسے دیکھنے کے سبب گلشن تک پہنچ گیا تھا [illegible] اعجاز اُس وقت بھی پاگل ہی نظر آ رہا تھا۔ لیکن اب سے بہت بہتر تھا۔ مجھ سے باتیں کرتا تھا۔

اُسی نے مجھے بتایا تھا کہ جب وہ ایم بی۔ بی۔ ایس کے آخری سال میں تھا تو اُس نے ابھی ایک ساتھی سے شادی کر لی تھی۔ اُسکی بے پناہ دولت دیکھ کر عندلیب کو جب خبر ہوئی تو اُس نے خواب آور گولیاں کھا کر خودکشی کر لی۔ اُسکی زندگی کی ڈور تو اعجاز کے وعدے سے بندھی تھی۔ انھوں نے اپنا وعدہ توڑا اس کی زندگی کی ڈور ٹوٹ گئی

اس دن کے بعد اعجاز بالکل خاموش رہنے لگا تھا۔ اور اب تو اس کی حالت دیکھی نہیں جاتی وہ خود کو پاگل سمجھتا ہے حالانکہ وہ بالکل ٹھیک ہے۔ اس کے جسم میں بھی اتنی ہی طاقت ہے جتنی ایک عام آدمی کے جسم میں ہونا چاہیے

ارے آپ ایک دم کھڑے ہو گئے ابھی کہانی ختم نہیں ہوئی ہے۔ کیا اب آپ ایک لفظ نہیں سن سکتے۔ ایسا کیوں؟ آپکی چھڑی لا دوں۔ کیا کہہ رہے ہیں آپ۔ بیٹھ جائیے پلیز ورنہ گر پڑیں گے آپ۔

یہ جانے کس کردار کی تلاش میں آیا تھا۔ اپنے پیروں پر چل کر بغیر کسی سہارے کے لیکن جب واپس ہوا تو [illegible] گزر رہے تھے حالانکہ میں نے اس کو چھڑی دے دی تھی۔ پھر بھی وہ دوسرے ہاتھ سے دیوار کا سہارا لے رہا تھا نہ جانے کیوں وہ اعجاز سے ملے بغیر چلا گیا جاتے وقت اس کا ماس بھی پہلے سے تر تھا [illegible] سارے وقت اپنی اپنی رفتار سے چلا تھا اور وہ چیخیں وہ چیخیں کیسی تھیں جو اس کے دروازے سے نکلتے ہی فضا میں ارتعاش پیدا کرتی ہوئی لمحہ بہ لمحہ مجھ سے دور ہوتی جا رہی تھیں۔

غزلیں

تقدیر کے ہاتھوں میں جو مجبور ہوئے ہیں
وہ لوگ حقائق سے بہت دور ہوئے ہیں
جائیں تو کہاں جائیں حصارِ دل سے نکل کر
ہاتھوں کی لکیروں میں جو محصور ہوئے ہیں
ہونٹوں پہ تبسم کو سجائے ہوئے رکھیے
غم دنیا کے رونے کہیں دور ہوئے ہیں
کیا عشق حقیقت تھا ترے چاہنے والے
گمنامی کے عالم میں بھی مشہور ہوئے ہیں
اے کاش انھیں دیکھے کوئی میری نظر سے
[illegible] بھی پُر نور ہوئے ہیں
جراح کی بے حکمت عملی کی بدولت
جو زخم تھے کل آج وہ ناسور ہوئے ہیں
ہر حال میں [illegible] منتظر
وہ اور ہیں عشرت پہ جو مغرور ہوئے ہیں

منتظر صدیقی

جب ہمیں آپ یاد آتے ہیں
ہم زمانے کو بھول جاتے ہیں
تجھ کو خوش دیکھنے کی خاطر ہم
اپنے ہر غم کو بھول جاتے ہیں
جب چراغِ وفا جلاتا ہوں
تیز جھونکے ہوا کے آتے ہیں
جن کو سمجھا ہوں چارہ گر اپنا
زہر اکثر وہی پلاتے ہیں
شمعِ دل کو وہ اپنے دامن سے
جاتے جاتے بجھا کے جاتے ہیں
بجلیاں گرتی ہیں جہاں اکثر
ہم وہیں آشیاں بناتے ہیں
میرے احباب ہیں وہی شفقت
رات دن جو مجھے ستاتے ہیں

میر شفقت علی وفا

زمیں والوں کی کمی ہے نہ غریبوں کی
کمی اگر ہے جہاں میں تو آدمیت کی
کمی ہے دھرم نہ ایمان نہ عقیدت کی
کمی ہے اپنے وطن میں تو بس انسانیت کی
وہ دین دھرم کی خدمت کیا کریں گے خیر
اگر رہے ہیں محروم جہاں شرافت کی
[illegible]
[illegible]
[illegible]
[illegible]
[illegible]
[illegible]
[illegible]
[illegible]

احسان آفاقی

شرمیلا

اقبال متین

بیوی بنا لاؤں گا تو اسی کو ورنہ عمر بھر کنوارا ہی رہوں گا۔"

ایسی کوئی بات واجد میاں نے اپنے ماں باپ سے نہیں کہی۔ بس خفا سے جاتے اور کسی کو چاہے جاتے۔ بچی جیتی ہے تو اطراف ہی میں آجاتے بھی سکتی ہے۔ لیکن واجد میاں جس کے لئے جی رہے تھے اس کے چہرے میں بھی روشنی کی ایک کرن تک دکھائی نہیں دے پا سکتی۔ وہ بیچاری بھی گھور اندھیروں میں بھٹک رہ گئی۔ جہاں ذرا سی جگنو کی چمک نظر آئی اور وہ دوڑ پڑتی۔ ایسے میں چلا گیا ہاتھ تک نکل سکتا تھا۔ اور اگر جگنو ہی ہاتھ لگ جاتا تو وہ بھی ایسا کیا ہو جاتا۔ یہی نا کہ وہ چمک بھی بیت جاتی جو اندھیروں کا احساس بڑھا دیتی ہے۔

اب ظاہرہ کے لئے واجد میاں ستارے بن چکا تھا جو اتنا خوددار ہے تھے۔ اب تو بس تمنّا رہ گئے تھے اور بس —— خاندان بھر میں باتیں ہوئیں۔ گھر گھر میں چرچا ہوا۔ جس کسی نے سنا واجد میاں کی تعریف کی۔ بھوری بیگم کی قسمت کو سراہا۔

"انہیں تو آنکھ بند کر کے اپنی لاڈلی کا ہاتھ واجد میاں کے ہاتھوں میں تھما دینا چاہیے۔ کونسے ہیرے جڑے ہیں ظاہرہ میں —— پھر لڑکا بھی واجد میاں جیسا کہ لوٹ جو دریا کے سینے سے سیپ نکال لائے اور سیپ کے سینے سے موتی۔"

اور جب تک واجد میاں داماد کی کے اُمید میں بھوری بیگم کے گھر کا طواف کرتے رہے۔

بھوری بیگم کے دن اچھے ہی گزرے، اچھا کھاتیں، اچھا پہنتیں، اور ظاہرہ کو تو جیسے کسی چیز کی کمی ہی نہ تھی۔

ویسے بھی بھوری بیگم مزاج کی بڑی نرم تھیں۔ واجد میاں پسند نہ بھی ہوتے تو ظاہرہ کی خاطر وہ سب کچھ سہہ لیتیں۔ لیکن یہاں تو معاملہ ہی دوسرا تھا۔ واجد میاں نہ صرف بھوری بیگم کو پسند تھے، بلکہ سارے خاندان کے ایک ایک فرد نے ان کی طرفداری میں اپنا ووٹ دے دیا تھا۔ اور بات بالکل طے تھی کہ بھوری کو بڑا اچھا داماد مل رہا ہے جو پتھر کا کلیجہ چیر کر لعل نکال لاتا ہے۔ اور اسی لعل کی روشنی سے بھوری کا گھر منوّر ہے۔

واجد میاں یوں بھی بھوری بیگم کے لئے غیر تو نہیں تھے۔ انہیں کے دیور کے لڑکے تھے۔ اور شہر بھر میں بھوری بیگم کے دیور کا کاروبار بڑے ٹھسے سے چل رہا تھا۔ بس کھڑے کھڑے ہزاروں کی کوٹھیاں، مکانات، باغات، زمینیں نیلام کروا دیتے تھے۔ کمیشن تھا سو الگ، سازباز ہوتی سو جدا۔ دولت بٹوری سو الگ، نام کمایا سو جدا۔ اور ایسے دیور کے واجد میاں اکلوتے بیٹے تھے۔ اس طرح یہ گھر بھی واجد میاں ہی کا گھر تھا۔ لیکن بات دراصل یہ تھی کہ

دونوں گھروں کے آپس میں تعلقات کچھ کشیدہ تھے۔ ان کا رشتہ عداوت کی دنیا میں بہت کچھ ہوتا ہو تو ہوتا ہو، دل کی نگری میں تو بس پیار کا جادو چلتا ہے۔ بھائی بھائی سے جدا تھا، لیکن واجد میاں اپنی بنتِ عم سے بیاہے تھے۔ اب اُن کے پاس تو دونوں نعمتیں تھیں۔ خون کا رشتہ بھی، پیار کا جادو بھی۔ لیکن اُن کی ماں اس پیار کی لہلہاتی کھیتی پر ٹڈی دَل کی طرح کسی وقت بھی یلغار کر سکتی تھی۔ اور یہی وسوسہ واجد میاں کی مسکراہٹوں پر پہرے بٹھائے رکھتا۔

یہی خوف بھوری بیگم کو بھی کھل کر ملنے سے روکتا رہتا۔

لیکن خاندان کی وہ عورتیں جنہیں واجد میاں کی خوشنودی منظور ہوتی، کچھ اس قسم کی باتیں کرتیں۔

"اونہہ، دو دل راضی تو کیا کرے گا قاضی"

وہ عورتیں جنہیں بھوری بیگم سے قربِ خاطر تھا، انہیں بھی تسلی دیتیں۔

"ہاں بہن بڑا نیک لڑکا ہے۔"

"لیکن ماں کے آگے بے بس ہو جاتے ہیں اس کے" بھوری بیگم دُکھ سے کہتیں جیسے اُس کی نیکی کا ماتم کر رہی ہوں اور بعض اوقات واقعی ان کی آنکھیں بھیگ جاتیں۔

"چلو بی تم تو کمال کرتی ہو بھوری — واجد بچہ تو ہے نہیں جو اپنا بُرا بھلا نہ سمجھتا ہو۔ ظلم حد سے سوا ہوتا ہے تو مرتا کیا نہیں کرتا۔"

"ماں، ماں نہ ہوگی تو اولاد، اولاد کیوں ہونے لگی" — بھوری بیگم کی ہمدرد عورتیں تسلیاں دیتیں۔

واجد میاں اپنی چچی کے گھر "وجّو میاں" پکارے جانے لگے۔ سبھوں نے انہیں اپنایا اور ان کی منزلت کی۔ خود وجّو میاں بھی چاہے جانے کے بڑے ڈھنگ تھے۔ خاندان بھر کو اپنانے کا ایک ایسا طریقہ انھوں نے ایجاد کیا تھا جو کہ اُن کے [illegible] میں کسی کے بس کا روگ نہ تھا۔

واقعی وجّو میاں کا اعجاز تھا، عقلیں حیران رہ جاتی تھیں۔ زبانیں گنگ، لوگ منہ تکتے رہ جاتے اور واجد میاں پھولے نہ سماتے۔

"بھئی ایف ڈی خان کے پاس سے ہم نے کنٹرول ریٹ پر دو روپے پونے چھ آنے گز سے یہ کپڑا خریدا تھا۔"

"وجّو بھائی کن داموں لے گئے امّی؟"

"ایک روپیہ چار آنے سے لے آیا ہے بیٹا، صرف ایک روپیہ چار آنے گز۔"

"آدھے کو آدھا فرق امّی!!"

"ہاں بیٹا ہاں — بلا کا ہوشیار ہے یہ لڑکا — مٹی سے سونا اٹھائے گا۔"

"اللہ وجّو بھائی آپ کتنے اچھے ہیں — طاہرہ آپا تو بس طواف کریں گی امّی۔"

اور واجد میاں اپنی تعریف و توصیف سُن سُن کر لاجونتی کی طرح لجاتے بہت انکساری سے اس راز کا انکشاف کر دیتے کہ انھیں اتنے کم داموں پر کپڑا کس طرح دستیاب ہو جاتا ہے۔

"خالہ امّی، بات دراصل یہ ہے کہ کپڑے کا جو سب سے بڑا ہول سیل بیوپاری ہے نا سوہن لال، اُس سے میری زمانے سے ملاقات ہے بلکہ آپ دوستی سمجھئے۔ بلکہ — بلکہ میں اب آپ سے کیا چھپاؤں، بے چارا معمولی سا آدمی ہے۔ اپنی کمپنی سے ابّا کو کہہ کر میں نے اس کو قرض دلوایا۔ بس اسی رقم سے کپڑوں کا دھندہ شروع کیا اور دیکھتے ہی دیکھتے آج نمبر کا بڑا بیوپاری بن بیٹھا ہے — مجھے وہ سارا کپڑا لاگت کے بھاؤ دیتا ہے — ایک پیسہ بھی منافع نہیں لیتا۔"

"تم سے بھلا کیسے منافع لے گا میاں — تمہاری ہی بدولت تو اس کا فضل ہے جو آج وہ سیٹھ بن بیٹھا ہے۔" خالہ بھی واجد میاں کی تعریفوں کے پُل باندھتیں اور بھوری بیگم پھولی نہ سماتیں۔

پھر خاندان بھر میں واجد میاں کے اس کارنامے نے پھیلتے پھیلتے تک وہ شہرت پائی کہ کیا صاحبزادے کیا [illegible]

دُنیا بھر میں پالی ہوگی۔

بھوری بیگم کے بھرپا چنے والے نے واجد میاں کو زحمت دی اور واجد میاں خوشی خوشی ہر قسم کا کپڑا بازار کے کوٹے وا ہوں، بل کے ریٹ سے خاندان بھر کے لئے فراہم کرتے رہے۔ عمدہ سے عمدہ ساڑیاں کم سے کم داموں والیں۔ اچھی سے اچھی طرز کے اوڑھنے پہننے والا دی۔ وہ تو خریدار کی توجیہ خریدے بس اسے جواب دے دیا۔ اب بھلا لوگ کہاں تک سب کچھ چھوڑ کر صرف کپڑا ہی خریدتے تو رہتے۔ جس سے جتنا ہو سکا اس سے بڑھ چڑھ کر اس نعمت سے [illegible] اور واجد میاں خدمتِ خلق نہیں تو خدمتِ خویش و اقارب سے خوش ہوتے رہے۔

واقعی واجد میاں کو اس کام میں ملکہ تھا۔ آئے دن مختلف قسم کے بیوپاریوں سے ملنا جلنا، اُٹھنا بیٹھنا، بہر حال کے ایسے یار کہ کبھی [illegible]۔ زندگی کی ہر چھوٹی بڑی ضرورت ایسی قیمت میں فراہم کر دیتے جن کا حصول کسی دوسرے کے لئے ان داموں میں ممکن ہی نہ تھا۔

چھوٹی خالہ بھی بھوری بیگم کی ہم خیال تھیں۔ واجد میاں کا طاہرہ سے ناطہ انھیں ایک آنکھ نہ بھاتا تھا۔ اس معاملے کی آنکھوں سے بڑی تشہیر بھی کی تھی۔ واجد میاں ان کے ہاں کم ہی جاتے تھے۔ ایک روز واجد میاں کی امی نے کام سے اپنے بھائی کے گھر واجد میاں کو بھیجا۔

بادلِ ناخواستہ سہی انھیں گھر میں [illegible]

[illegible]

واجد میاں [illegible]

ان کے ماموں کو کسی نے بازاروں میں ٹھگ ہو۔

"کیا قیمت چکائی ممانی جان آپ نے؟" وہ جیسے اپنی جگہ سے اچھل کر پوچھا۔

"بیس پچیس روپے میاں۔"

"بہت قیمت دے دی آپ نے۔"

ممانی نے کچھ چیں بہ جبیں ہو کر کہا۔ "تو میں تم سے جھوٹ بولوں گی۔"

واجد میاں سنبھلے "نہیں یہ بات نہیں۔ پہلے کسی ملازم سے تو نہیں منگوایا؟"

"نہیں بھئی، میں خود آج ہی لے آیا ہوں۔" ماموں بیچ میں بول اٹھے۔

"آج ہی خریدا ہے آپ نے؟" واجد میاں نے مزید تصدیق چاہی۔

"آج ہی نہیں بلکہ ابھی ابھی لائے ہیں۔" ممانی نے تصدیق کی۔

"تو پھر فوراً ہی واپس کر دیجئے۔" واجد میاں نے اصرار کیا۔

"آخر کیوں بھئی؟" ماموں نے کچھ بیکل ہو کر پوچھا۔

"میں یہی ٹی سیٹ صرف سترہ روپے میں آج ہی لا دوں گا۔" واجد میاں بولے۔

"سچ۔"

"جی ہاں۔ بھلا آپ سے جھوٹ کہہ سکتا ہوں۔"

"میں کہتی ہوں نا ۔۔۔ تمہیں تو ڈھنگ سے ایک چیز خریدنی بھی نہیں آتی۔ ٹھگ لیے جاتے ہیں ۔۔۔ پورے آٹھ روپے زیادہ دے آئے ہیں ۔۔۔ جاؤ بھی اب، آؤ جلدی سے۔" ممانی نے ایک ہی سانس میں اتنی ساری باتیں اپنے شوہر سے مخاطب ہو کر کہہ دیں۔

ماموں نے ٹی سیٹ ڈبے میں پیک کر لیا تو واجد میاں کہنے لگے "چلیے میں بھی ساتھ ہی چلتا ہوں۔ آپ سے پیسے وہیں لے لوں گا اور آج شام تک ٹی سیٹ خدمت میں پہنچا دوں گا۔ میں ابھی آپ کو لا دیتا لیکن مجھے دکان سے کچھ لینا ہے وہ بہت دور ہے اور مجھے دوسرے کام بھی ہیں اس وقت۔"

ماموں نے ٹی سیٹ واپس کر کے واجد میاں کو سترہ روپے دے دیئے اور تو روپے لا کر بیوی کے ہاتھ میں رکھے تو وہ خوش ہو گئیں۔ کہنے لگیں "واجد بڑا سمجھدار اور پیارا لڑکا ہے۔ بڑا کاروباری۔ بڑا لال بیلی۔"

میں اپنی نند سے کہوں گی طاہرہ کو جھٹ پٹ اپنی بیٹی بنا لیں۔

ادھر بجلی کے سوئچ آن ہوئے ہی تھے کہ واجد میاں مسکراتے ہوئے پہنچے۔

بالکل وہی ٹی سیٹ۔ ساتھ میں سترہ روپے کی باقاعدہ رسید۔

ممانی نے گلے لگا کر پیشانی چوم لی۔ "میں اب میاں جو بھی خریدوں گی تمہارے مشورے سے خریدوں گی۔ یہ تمہارے ماموں تو بس گھر کا دیوالہ ہی نکال دیں گے۔"

اور واجد میاں بیٹھے لجاتے اور مسکراتے رہے۔

لوگ کہتے ہیں کہ شرم و حیا لڑکیوں کا زیور ہے، لیکن واجد میاں نے بڑی چاؤ سے یہی زیور خود پہن رکھا تھا۔ شرم اُن کا مزاج تھی تو حیا اُن کی فطرت۔ اب شرم و حیا کے ان پردوں سے باہر نکل کر طاہرہ تک ایک جست میں پہنچ جانا اُن کی فطرت کے منافی تھا۔ ان کے مزاج کے منافی۔

لیکن محبت بھی کوئی ایسا درخت تو ہے نہیں جو کسی بنجر زمین میں، لق و دق صحرا میں آپ ہی آپ پھلتا پھولتا رہے۔ اور اِدھر اس ننھے سے پودے کی آبیاری کرنے والے ہاتھ خود اگر اتنے نازک نازک ہوں کہ ہوا کا ہر سرد گرم جھونکا ان سے مس ہو کر انہیں چھوئی موئی کی طرح مرجھا دے تو محبت کا پودا ان چڑھنا تو موہوم۔ آخر کوشش ہوا بھی ہیں۔

طاہرہ کی سہیلیوں نے خود اپنے کانوں سے سنا کہ طاہرہ مسکین بھائی سے کہہ رہی تھی۔

"اللہ واجد بھائی کا نام لے کر آپ مجھے کیوں چھیڑتے ہیں ۔۔۔ وہ تو میرے سگے بھائی ہیں ۔۔۔ سگے ۔۔۔ سگے بھائی۔"

اور مسکین بھائی کے چہرے پر کلیاں سی کھل گئی تھیں۔

مسکین بھائی چار پانچ محبتوں کی اچھی بُری یادیں زادِ سفر کے طور پر اپنے ساتھ لے آئے تھے۔ اس فن میں انہیں یدِطولیٰ حاصل تھا ۔۔۔ تجربہ کار کھلاڑی تھے۔ طاہرہ جیسی لڑکی جو ہر جگنو کی چمک کو اُجالوں کا پیام سمجھتی تھی، مسکین میاں کی سرچ لائٹ میں ہوش و حواس کھو بیٹھی۔ آنکھیں ایسی خیرہ ہوئیں جیسے بجلی پڑ گئی ہو۔

"اللہ واجد بھیا تو میرے سگے سگے بھائی ہیں۔"

"اللہ واجد بھیا تو میرا سگا ۔۔۔ سگا بھائی ہے۔"

ایک بار تو ایسا بھی ہوا کہ واجد میاں کو طاہرہ کے پاس بیٹھا ہوا دیکھ کر مسکین میاں نے آتے ہی طاہرہ کو چھیڑا "مبارک مبارک۔"

"اوئی ۔۔۔ واجد بھیا تو میرا سگا بھائی ہے۔"

"دیکھو تو ہے نا میرا سگا بھائی؟"

اور واجد میاں کے پیروں کے نیچے ساری دھرتی ڈول کر رہ گئی۔ یا اللہ یہ کیا ہو گیا طاہرہ کو؟

پھر یہ دھرتی خاندان بھر کے قدموں کے نیچے ڈول گئی۔ کسی نے طاہرہ سے ہمدردی کی، کسی نے بے وفا ٹھہرایا۔

"سنتے ہو بھئی ۔۔۔ محمودی بیگم کی لاڈلی کے کرتوت ۔۔۔ واجد میاں کو حقیقی بھائی کہنے لگی ہے اور وہ بیچارا ہے کہ آج تک اپنے سینے میں الاؤ سا سلگائے خاندان بھر کا کوڑا کرکٹ اسی الاؤ کے لئے چنتا پھر رہا ہے۔"

لاکھ کرے کوئی جتلا ۔۔۔ آشکار ہے

کوئی فکر جھنڈے تو رہا۔ واجد میاں الاؤ جلائے رکھیں یا آتش فشاں سینے میں سمائیں۔ طاہرہ خود بھی تو ایک جلتی ہوئی شمع ہے — الاؤ کی آنچ آنکھوں سے چھپی تو نہیں رہ سکتی۔ آتش فشاں بہت بھی تو پھٹ پڑتا ہے۔ لیکن اس جلتی ہوئی شمع کا کیا ہوگا جس کے شعلے اپنے ہی دھوئیں میں چھپ جاتے ہیں۔

مسکین میاں نے اس شمع پر پیار کی اتنی بارش کی کہ آخرش کونپلیں پھوٹ آئیں۔

مجوری بیگم بس ٹکر ٹکر دیکھتی رہ گئیں۔

مسکین میاں اُمڈتے ہوئے بادل کی طرح چھائے، ٹوٹ ٹوٹ کر برسے اور بادل چھٹے تو کھیتی لہلہا رہی تھی۔ یہ سب کچھ اس قدر تیزی سے ہوا کہ مجوری بیگم کیا سب کے سب دیکھتے کے دیکھتے رہ گئے۔

خاندان بھر کے چہیتے واجد میاں مجوری بیگم کے داماد نہ بن سکے۔ اُن کی پیار کی کھیتی پہ واجد میاں کی ماں نے کھلے بندوں ٹڈی دل کی طرح یلغار بھی نہیں کی۔ لیکن ان کی فطرت میں شرم و حیا کا مادہ اور وہ کر جو بزدلی چھپی بیٹھی تھی، وہ بھی تو واجد میاں کی ماں ہی نے اُن کے سینے میں چھپا دی تھی۔ جس کا احساس واجد میاں کو اس وقت ہوا جب طاہرہ نے اُن سے پوچھا۔

"کیوں رے، تُو ہے نا میرا سگا بھائی!"

لیکن یہ خلش مجوری بیگم کے دل میں جیسے جاگزیں ہو کر رہ گئی۔

کیسا کماؤ پوت داماد ہاتھ سے نکل گیا تھا۔ خاندان بھر میں جس کی ہوشیاری سے زیادہ جس کے کاروبار کی دھوم تھی۔ جس نے ہر اس شخص کو چاہا تھا جس کو مجوری بیگم نے اپنا سمجھا۔ خاندان بھر کی خبر دیا سب اُس نے آدھی حقیقتوں میں [illegible]۔ جس گھر میں نکل جاتا، ہاتھوں ہاتھ لیا جاتا۔ کیسا خاموش شرمیلا سا۔

مجوری بیگم کانپ کر رہ جاتیں۔ اس

کی ہائے دیکھ جائے کہیں طاہرہ کے بسے بسائے گھر کو۔

طاہرہ کے بسے بسائے گھر کو تو بلائے دائے گی نہیں — ہاں واجد میاں اندر ہی اندر ایسے بیٹھتے گئے جیسے بستی کا گھروندا پانی پڑتے ہی ڈھے جائے۔

ایک دن وہ مجوری بیگم سے ملنے آئے تو طاہرہ نے اپنی نئی ساری انھیں دکھلائی جو وہ پہنے ہوئے تھی۔

"واجو بھیا — یہ مسکین نے میرے لئے چھتیس روپے میں دلائی ہے۔" واجو میاں ساری دیکھ ہی رہے تھے کہ چھوٹے ماموں آدھمکے۔

آداب سلام کے بعد سب اپنی اپنی جگہ بیٹھ گئے تو واجد میاں نے ساری کا پلّو ہاتھ میں لے کر بغور دیکھا۔ بہت تعریف کی — پھر آہستہ سے کہا۔ "بھئی چھتیس روپے بہت دے دیئے مسکین نے — بائیس، چوبیس سے زیادہ کی نہیں ہے۔"

"تو لوٹا دوں اسے؟" طاہرہ نے پوچھا۔

"بالکل لوٹا دو بھئی!" واجد میاں بولے۔

"تو لا دے گا نا بھیا بائیس روپے میں؟"

طاہرہ نے مزید اطمینان کرنا چاہا۔

"ہاں بھئی لا دوں گا۔"

ماموں بیچ میں بول اُٹھے — "بھئی مسکین میاں جہاں سے لائے ہیں، اس دوکان کا پتہ چلا کر انھیں کو دے دو نا — یہ اس ساری کو لوٹا بھی دیں گے اور ایسی ہی دوسری لا بھی دیں گے۔"

"ٹھیک ہے، ٹھیک ہے۔" واجد میاں بولے۔

ماموں کہنے لگے۔ "واجو تمہیں یاد ہے نا ہماری سیٹ لوٹا کر تم نے تو روپے بچائے تھے؟" واجد میاں نے شرما کر نظریں جھکا لیں — پھر اس طرح تڑپ کر ماموں کو دیکھا جیسے کچھ کہہ دینا چاہتے ہوں۔ لیکن کچھ بھی نہ کہہ سکے۔ یہ بھی نہ کہہ سکے کہ میں اپنے ہی گھر میں لوٹ لیا گیا ماموں [illegible] آپ نے بچایا نہ مجوری بچی سے۔

طاہرہ نے ساڑی بدل کر پہنی ساری کا [illegible] تو وہ ہاتھ میں لے کر [illegible] باہر نکل گئے۔

ماموں نے کہا "مجوری، دیکھا تم نے، وہ آب دیدہ ہو کر بھاگا ہے یہاں سے۔ بڑا جذباتی لڑکا ہے۔ خاندان بھر میں چاہے جانے کی خاطر اس نے کیا کیا نہیں کیا۔" اور ماموں نے جھک کر مجوری کے کان میں کہا۔

"یہ سب کچھ غریب نے طاہرہ کو حاصل کرنے کے لئے کیا تھا۔"

"ہمیں بھی سنائیے نا ماموں" — طاہرہ نے پوچھا۔

"کچھ نہیں بیٹی — میں کہہ رہا تھا عجیب احمق سا لڑکا ہے — ایک بار میں نے ایک نئی سیٹ چھتیس روپے میں خریدا تھا۔ اس نے کہا، بہت مہنگا لیا ہے، ستر روپے میں ملتا ہے۔ بس اتنا سننا تھا کہ تمہاری ممانی گلے کا ہار ہو گئیں کہ جاؤ لوٹا آؤ فوراً — میں واجد میاں کے ساتھ ہی جا کر وہ نئی سیٹ لوٹا آیا اور ستر روپے انھیں دے دیئے کہ وہ ایسا ہی لا دیں۔ اسی روز واجد میاں نے نئی سیٹ ہمیں لا دیا۔ یہ سیٹ انھوں نے پھر اسی دوکان سے ۳۶ قیمت میں خرید لیا اور کچھ پیسے جیب سے پورے کر دیئے۔ مجھے یہ بات کچھ دن بعد [illegible] دوکان والے نے بتائی [illegible] آپ کے ساتھ [illegible]

[illegible] طاہرہ نے سوال کیا۔

[illegible]

[illegible] رہ گیا۔

"تو ابھی انھوں نے [illegible]

ہیں —" طاہرہ [illegible]

"اب یہاں ہر بات کی تہہ میں جانا بھی ضروری ہے؟"
ظاہر ہونے دل ہی دل میں سوچا۔ کہتے

پہنچتے ذرا انھوں نہیں جاہیں کہ سنتے چلے گئے وہ جو بیٹیا اور کتنے سے دامنوں اپنی ہی بزدلی کا ثبوت
مجھے بیچ دیا۔

پھر وہ کھلکھلا کر ہنس پڑیں۔ "اللہ جو بھتیا بے چارے۔"
دامنوں بھی ہنس پڑے۔ اللہ بخشوں بیگم بھی۔

ماہیا

دیپک قمر



خود اپنی ہی کرنی ہے
کھیتی کو وہ کاٹیں گے
ہاتھوں میں درانتی ہے

دیکھا ہے تو دیکھا کیا
بے حد ہے پرے سے بے حد
آکاش کی سیما کیا

آپس میں سمونا ہے
دونوں کو محبت میں
احساس بھی کھونا ہے

اس میلے سے یوں نکلی
وہ ملنے کو خود آیا
جب بھی وہ ہوئی اکیلی

اب بیچ میں اک پل ہے
اک تٹ پہ پپیہا بیٹھا
اک چھور پہ پاگل ہے

اب تک نہ بھلا پائے
کچھ لوگ نہیں ہیں جو
پھر سے یاد ہمیں آئے

جو بیچ میں لیٹا تھا
دیوار سمجھ بیٹھے
وہ اپنا ہی بیٹا تھا۔

کچھ یادیں سہانی سی
سب بیت گئی اپنی
باقی ہیں نشانی سی

سمجھیں ہیں سمجھاتے
کچھ وہم بھری باتیں
مانے ہی چلے جاتے

جب بند کرے گی در
یہ موت بھروسے کو
کھوئے گی پیا کے گھر

گھٹن ہیں سے ڈر کر باتیں
چلنے کی ہو تیاری
ہیں ختم ملاقاتیں

ہر بات کی دُم 'شاید'
'شاید' میں چھپا شک ہے
کیسے ہو یہ گم 'شاید'

دیکھا یا سنا کیا ہے
گھبرائے سے رہتے ہیں
کیا جانے کیا کیا ہے

لڑتے ہیں جھگڑتے بھی ہیں
سب کی ہی ضرورت ہے
چھوٹے ہیں بڑے بھی ہیں

وہ

ممتاز مفتی

یہ کون آ گھسا ہے میرے گھر میں بن بلائے، بن پوچھے۔ بن بتائے۔ کیوں۔

یہ کیسی موجودگی ہے۔ میرا سارا گھر اس سے بھرا ہوا ہے۔ وہ ہر کمرے میں بیٹھا ہے۔ سیڑھیوں میں بیٹھا ہے۔ صحن میں۔ برآمدوں میں۔ باورچی خانے میں۔ ہر جگہ۔ ہر وقت۔ دن ہو یا رات، صبح ہو یا شام۔ میرا گھر مجھ سے اس قدر بھرا ہوا نہیں جس قدر اس سے بھرا ہوا ہے۔

کیا مصیبت ہے۔ زندگی میں پہلی بار۔ میں دو کیسے ہو گیا ہوں ۔۔۔ میں، جو ازلی طور پر اکیلا تھا۔

بچپن میں اپنے گھر میں اکیلا تھا۔ جب وہ جاتا تو کسی کو پتہ نہ چلتا کہ کون چلا گیا ہے۔ آ جاتا تو کوئی محسوس نہ کرتا کہ آ گیا ہے۔

[illegible] میں اپنا آپ لیے [illegible] میں نے بڑی جرأت سے محبت لگائی، اپنا سب [illegible] مجھے کر خود اس کی دہلیز پر بیٹھ گیا۔ [illegible] تو پتہ چلا کہ اکیلا پن اور بھی گہرا ہو گیا ہے۔ جرأت ہوتی تو دہلیز سے اٹھ جاتا۔ لیکن ایک بار بیٹھ کر اٹھ جانا میری سرشت میں نہ تھا۔ نہیں ہے۔ لہٰذا اٹھنے کی جرأت نہ ہوئی۔ اس لیے بیٹھا ہوا بیٹھا رہا۔ سولہ سال بیت گئے۔ حتیٰ کہ مجھے بیٹھے اور اکیلے رہنے کی لت پڑ گئی۔ پھر وہ اپنا گھر چھوڑ کر میرے گھر میں آ گئی۔ میری ہو گئی اور میں اپنے گھر کی دہلیز پر آ بیٹھا۔ مجھے دیکھ وہ حیران رہ گئی۔ بولی "اب میں تیری ہوں۔"

"ہاں۔" میں نے وہیں بیٹھے بیٹھے جواب دیا۔ کتنی خوشی کی بات ہے۔ وہ بھی اپنی آنکھوں سے مجھے دیکھتی رہی۔ دیکھتی رہی۔ میں خوشی کے نشے میں چور اسے دیکھتا رہا۔ دیکھتا رہا۔

"تو مجھے دیکھ رہا ہے۔" وہ بولی۔

"اور میرا کام ہی کیا ہے۔"

"میں یہاں ہوں، یہاں۔ تیرے پاس۔"

"ہاں، تو تیرے سامنے ہے۔"

"لیکن تو تو اب بھی دہلیز پر بیٹھا ہے [illegible] اور کہاں بیٹھوں؟"

"قریب آ جا۔"

"قریب آ گیا تو تو مجھے نظر نہ آئے گی [illegible]"

"پتہ ہے تیری جگہ کون سی ہے" [illegible] اپنی گود پھیلا دی۔

"وہی جہاں میں بیٹھا ہوں۔" میں نے سر اٹھائے بغیر کہا۔

حیرت سے اس کی آنکھیں [illegible] رہ گئیں۔

[illegible]

[illegible] سات سال اپنے چھوٹوں کے
انتظار میں دہلیز پر بیٹھ کر گزار دیے تھے۔

ہمارا آپس میں ان کا سمجھوتہ ہو گیا۔
اور ہم دونوں دو کمرے میں اکیلے رہنے لگے۔

ہاں میں تو ازلی طور پر اکیلا ہوں۔ اب
یہ کون آ گیا ہے میرے گھر میں۔ کیوں دھرنا مار کر
بیٹھ گیا ہے آخر —— وجہ —— مطلب۔

ویسے دیکھیے میں آج بھی اکیلا دکھتا ہوں۔
کسی کو خبر نہیں کہ گھر میں کون آ گیا ہے —— میری
بیوی کو بھی پتہ نہیں۔ صرف میں جانتا ہوں کہ
میں اکیلا نہیں رہا —— وہ آ گیا ہے اور میرا گھر
اس سے یوں بھر گیا ہے جیسے ماں کا سارا
وجود ہونے والے بچے سے بھر جاتا ہے۔

صاحبو! مجھے پتہ نہیں کہ وہ کون ہے۔
بس اتنا جانتا ہوں کہ وہ ہے۔ کیوں ——
کس لئے اس نے میرے اکیلے پن کی اس سندرتا کو
تار تار کر دیا ہے۔ مجھے علم نہیں صرف دکھ
ہے —— اپنے اکیلے پن کو کھو دینے کا دکھ۔

زندگی میں میں نے ایک ہی امتیاز حاصل
کیا تھا۔

زندگی کرنے کا ایک ہی طریقہ سیکھا تھا۔
اکیلے پن نے مجھے بڑا امتیاز بخشا تھا۔
مقام بخشا تھا۔

مجھے بڑا چاؤ تھا —— بہت بڑا تھا۔
صاحبو! اکیلا پن بہت بڑا تحفہ ہے۔
زندگی بھر یہ تحفہ بنا رہا۔
سب کا خیال ہے کہ اکیلا پن بیماری ہے۔ نہ
[illegible]

موجودگی نے اتنے بڑے بُحران کو کیسے توڑ دیا۔
اس کے ہاتھ میں بیلچہ نہیں، کلہاڑی نہیں،
کدال نہیں، بلکہ بم تو نہیں۔ اس کے انداز میں
تشدد نہیں، طیش نہیں، غصہ نہیں —— پھر یہ
کیسے ہوا۔

بُتوں کو توڑنے کے لئے تو غزنوی پیدا
ہوتے ہیں۔ حملے کئے جاتے ہیں۔ ایک دو
نہیں، سولہ سترہ فوجیں چڑھائی کرتی ہیں۔
تہس نہس کرتی ہیں۔ یوں تو کبھی نہیں ہوتا کہ
ایک بے نام اجنبی چپکے سے آئے، دھرنا مار کر
بیٹھ جائے اور اس کی موجودگی سے بُت خود
بخود ٹوٹ جائیں۔

کبھی کبھی مجھے شک پڑتا ہے کہ یہ وہی
تو نہیں جس کا نام لے لے کر بچپن میں بڑے
بوڑھے مجھے ڈرایا کرتے تھے۔ جس سے ڈر ڈر
کر میں جوان ہوا تھا۔ پھر جوانی میں دانشوروں
سے ملا تو ہم مل کر اس کا مذاق اڑایا کرتے تھے۔
دراصل بچپن میں اس سے ڈر ڈر کر اب ہم اس
سے انتقام لے رہے تھے۔

پھر ادھیڑ عمر میں میں اس سے بے نیاز
ہو گیا۔ تو پڑا ہو —— نہیں ہے تو نہ سہی۔ کیا
فرق پڑتا ہے۔ لیکن نہیں، یہ وہ نہیں ہو سکتا۔
وہ تو بہت ڈراؤنا تھا۔ اس نے آگ کی ایک
بہت بڑی بھٹی جلا رکھی تھی۔ ہاتھ میں سونٹا
تھا۔ سونٹا چلاتا۔ لوگوں کو دھڑا دھڑ آگ
میں ڈالتا جاتا۔ بس یہی اس کا کام تھا۔

پھر جوانی میں علم کے ساتھ ساتھ اس کی
عظمت ابھر آئی۔ عظمت ہی عظمت، عظمت
ہی عظمت۔ ڈر اور خوف کی جگہ حیرت نے جنم لیا۔
نہیں یہ وہ بھی نہیں۔ یہ موجودگی نہ تو ڈراؤنی
ہے، نہ حیرت کا جذبہ طاری کرتی ہے۔ یہ تو ایسے
ہے جیسے گھی اور لگاؤ سے بھیگی ہوئی ایک فضا
ہو۔ یوں لگتا ہے جیسے ماں کی گود نے پھیل کر
سارے گھر کو سمیٹ لیا ہے۔ ایک "ہگ" ہے
جو چاروں طرف سے گھیرے ہوئے ہے۔ ایک عجیب
سا سکون۔ نشاط کا ایک ہلکورا۔

مجھ پر خواہ مخواہ ایک احساس تشکر چھا
جا رہا ہے۔ جیسے میں نے پا لیا ہے۔ کیا پا لیا ہے۔
اونہوں، اس کا پتہ نہیں چلتا۔ بس پا لیا ہے۔
جیسے سب کچھ پا لیا ہے۔ میں نے کبھی اس کی آرزو
نہیں کی تھی۔ اس کے لئے ڈھونڈ نہیں کی تھی۔ اسے
پانے کی آرزو نہ کی تھی۔ کیونکہ اسے چاہا نہ تھا۔ کتنی
عجیب بات ہے کہ ڈھونڈے بغیر پا لو۔ جانے بغیر
جان لو۔

پہلی مرتبہ جب میں نے اس کی موجودگی کو
محسوس کیا تو میں ہکا بکا رہ گیا تھا۔ ان دنوں میں
سخت فکرمند تھا۔ بے چین تھا۔ میرے افسر نے مجھ
پر دو جھوٹے کیس بنا رکھے تھے جو بڑی سنگین
نوعیت کے تھے۔ وہ اس دھوم دھڑکے سے بار بار
ان کیسوں کا ذکر کیا کرتا تھا کہ مجھے خود پر شک پڑنے لگا تھا
کہ وہ مجھ پر الزام نہیں دھر رہا بلکہ سچ بول رہا ہے۔
میں خود کو مجرم سمجھنے لگا تھا۔ مجھ پر احساس جرم
چھائے جا رہا تھا۔

اسی روز شام کا وقت تھا۔ بڑی اداس
شام تھی وہ۔ تھکی تھکی۔ اس روز دفتر میں میری
بہت تذلیل ہوئی تھی۔ انکوائری کمیشن نے میرے
بیان کا مضحکہ اڑایا تھا۔ وہ لوگ جو جانتے تھے
کہ مجھ پر بہتان لگایا گیا ہے انہوں نے بھی میرے
حق میں گواہی نہ دی تھی۔

دکھ، فکر اور اندیشوں کی بوجھل گٹھڑی
کندھوں پر اٹھائے میں گھر پہنچا۔ پہنچتے ہی دھڑام
سے کھاٹ پر گر پڑا۔ وہاں پڑا رہا۔ پڑا رہا۔ پتہ
نہیں کتنی دیر تک پڑا رہا —— پھر دفعتاً میں نے
محسوس کیا جیسے سر پر کوئی بوجھ نہ ہو —— وہ
گٹھڑی کیا ہوئی۔ میں اٹھ بیٹھا۔

میرے گرد ایک عجیب سی فضا معلق تھی
جیسے ایک نورانی ہوا میں تیر رہی تھی جیسے کمرے
میں ایک میٹھی کنا پھیل رہا ہو۔ جیسے کمرے میں
کوئی ہو۔ گھی اور لگاؤ سے بھیگی ہوئی موجودگی۔
یہ کون ہے۔ میرے گھر میں کون گھس آیا ہے۔ میں
نے سارے گھر کا چکر لگایا کہ شاید کوئی ہو۔ کوئی
بھی نہ تھا۔ پھر بھی کوئی ضرور تھا۔ دن بدن ہم

موجودگی کا احساس بڑھتا جا رہا تھا۔

باورچی خانے میں میری بیوی گھٹنوں میں سر دیئے پیاز چھیل رہی تھی۔ میں نے غور سے اسے دیکھا۔ دیکھتا رہا۔ وہ اکیلی بیٹھی تھی۔ اکیلی۔ لق و دق تنہا ــ اسے دیکھ کر مجھے پتہ چل گیا کہ کوئی نہیں ہے۔ کوئی بھی نہیں۔ یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ گھر کی موجودگی ایک کو متاثر کرے دوسرے کو خبر ہی نہ ہو۔

سونے سے پہلے میں پڑھنے کا عادی ہوں۔ اس لئے نہیں کہ مجھے پڑھنے سے دلچسپی ہے۔ ایک تو اس لئے کہ کتاب سامنے ہو تو نیند کے امکانات پیدا ہو جاتے ہیں۔ دوسرا اس لئے کہ تلخ حقائق سے بچنے کے لئے مطالعہ ایک نعمت ہے۔

ان دنوں تو میرے لئے مطالعہ از بس ضروری تھا۔ دفتری حقائق سے فرار کا ایک ہی راستہ تھا۔ پھر بھی میں زبردستی کتاب پڑھتا تھا۔ بار بار دفتری حالات سامنے آ کھڑے ہوتے تھے۔ مطالعے کا عمل رک جاتا۔ دل پر ایک گھٹن سی چھا جاتی، پھر اندیشوں کی لہریں رینگنے لگتیں۔ سرخ چیونٹے زمین کی طرف یورش کرتے۔ پھر سارے جسم میں خوف کی دھمک بجتی۔

اس روز پتہ نہیں کیا ہوا۔ کتاب ہاتھ میں اٹھائے میں بیٹھا رہا۔ بیٹھا رہا۔ سوچتا رہا۔ حالانکہ عام طور پر میں سوچنے سے گریز کرتا ہوں۔ کیونکہ سوچ مجھے دلخراش وسوسوں کی طرف بہا کر لے جاتی ہے ـــ پھر وہی گھٹن ـــ وہی چیونٹے ـــ وہی دھمک۔ اس روز میں سوچ رہا تھا لیکن ذہن میں کوئی بات نہ تھی جیسے ذہن گھٹنوں، رنجشوں اور خوشیوں سے بے نیاز ہو چکا ہو۔ ماورا ہو چکا ہو۔

ذہن خیالات سے خالی تھا۔ کوئی تلخی نہ تھی۔ گھٹن نہ تھی۔ چیونٹے نہ تھے۔ دھمک نہ تھی۔ ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے میں خلا میں لٹکا ہوا ہوں۔ اور یہ خلا بے نام راحت سے بھرا ہوا ہے۔ مطالعہ کرنے کو جی نہیں چاہتا تھا۔ جب کوئی خوف ہی نہ ہو تو فرار کیسا۔ نیند بھی نہیں آ رہی تھی۔ ایسی خوشگوار فضا کو چھوڑ کر کون سوئے۔

اگلے روز جب میں نیند سے بیدار ہوا تو ایسے میں چونکا۔ عام طور سے جب میں جاگا کرتا ہوں تو یوں تھکا ٹوٹا ہوا اٹھتا ہوں، جیسے کوئی مار کھا کر اٹھا ہو۔ اس روز میری کیفیت کچھ ایسی تھی جیسے گیس بھرا غبارہ ہو۔ ایسے محسوس ہو رہا تھا جیسے پھول نکھر رہے ہوں۔ آنگن میں چڑیاں چہک رہی تھیں اور سورج کھڑکی میں کھڑا مسکرا رہا تھا۔ ارے یہ کیا ... میں گھبرا کر اٹھ بیٹھا۔ یہ کیسی صبح ہے۔ کیا میں میں ہی ہوں یا کوئی اور؟ ساتھ ہی مجھے غصہ آنے لگا۔ یہ کون ہے جو میری شخصیت کو بدل رہا ہے۔ کیوں؟

پھر کوئی انجانا ہاتھ بڑھا اور اس نے مجھے تھپکنا شروع کر دیا، جیسے تھپک تھپک کر مجھے وسوسوں سے دور لے جا رہا ہو۔ سارا کمرہ اس تھپک سے بھر گیا۔ مجھے ایسا لگا جیسے وہ ہاتھ میری ماں کا ہاتھ ہے۔ وہ مجھے تھپک رہی ہے۔ سو جانے کے لئے نہیں بلکہ جینے کے لئے۔ سارا کمرہ جینے کی لذت سے بھرا ہوا تھا۔ میں ہکا بکا رہ گیا۔

پھر دفتر گیا تو وہاں بھی سب کچھ بدلا ہوا تھا۔ تذلیل و تضحیک کی باتیں یوں سنائی دے رہی تھیں جیسے دور سے آ رہی ہوں۔ یوں محسوس ہو رہا تھا جیسے وہ باتیں مجھ سے متعلق نہیں بلکہ کسی اور کے بارے میں تھیں۔ ذہن میں ایک اطمینان سا تھا۔ میری سیٹ کے گرد ایک تبسم گھیرا ڈالے کھڑا تھا۔

آج بھی میرا سارا گھر اسی تبسم سے بھرا ہوا ہے۔ رات کو سوتا ہوں تو وہ میری چارپائی پر بیٹھا مجھے تھپک رہا ہوتا ہے۔ جاگتا ہوں تو وہ میرے سرہانے کھڑا مسکرا رہا ہوتا ہے۔ کام کرتا ہوں تو وہ میرے پاس بیٹھا اپنی کرنوں کی مٹھاس بکھیر رہا ہوتا ہے۔ باہر جاتا ہوں تو مجھے دروازے پر چھوڑنے آتا ہے۔ واپس آتا ہوں تو دہلیز پر بیٹھا میرا انتظار کر رہا ہوتا ہے۔ کبھی کبھی مجھے خیال آتا ہے کہ اس نے میری ذاتی زندگی کو کیوں تہس نہس کر رکھا ہے۔ حقیقت میں میری

کلیاں چٹکنے لگتی ہیں۔ یہ سب کیا ہے ـــ تم کون ہو ـــ کیوں ہو ـــ بولو ـــ جواب دو۔

اس نے زبان سے کبھی جواب نہیں دیا۔ وہ گونگا ہے۔ اس کی نگاہوں سے شعاعیں سی نکلتی ہیں۔ ایک لطیف سی لہر میرے بند بند سے ٹکراتی ہے۔ جسم میں ایک گھنٹی سی بجنے لگتی ہے۔ پھر احساسات کا ایک طوفان سا اٹھتا ہے۔ میرے سوال کی ساری گھٹن بکھر جاتی ہے۔ مٹھاس کی ایک پھوار پڑتی ہے اور ایسا لگتا ہے جیسے میرے سوال کا جواب مل گیا ہو۔

اس نے کبھی میری "میں" میں رد و بدل کرنے کی کوشش نہیں کی۔ میری خلاف منشا کبھی ناک نہیں چڑھائی۔ میری کمزوریوں [illegible] کا نوٹس نہیں لیا۔ لیکن میری ذات کے غلیظ گوشوں پر جب اس کی مدھم روشنی پڑتی ہے، میں انہیں دیکھتا ہوں تو میرا دل کراہت سے بھر جاتا ہے۔ سر احساس ندامت سے جھک جاتا ہے۔

پھر میری انا کا تڑپتا ہوا کیڑا سر اٹھاتا ہے۔ نہیں نہیں، میں ان گوشوں کو صاف نہیں کروں گا۔ میں جیسا بھی ہوں ـــ ہوں ـــ مجھے تو کوئی واسطہ نہیں ہے۔ میں ایسے ہی جینا چاہتا ہوں۔ کسی کو مجھے بدلنے کا حق نہیں۔

"ٹھیک ہے ٹھیک ہے" [illegible] ایک سرگوشی ابھرتی ہے۔ مجھے اپنی [illegible] ہے۔ میں اپنی "میں" کو نہیں بدلوں گا۔ کوئی بات نہیں [illegible] "[illegible]" [illegible] مجھے [illegible] ہے۔

تو کیوں میری ہر بات [illegible] کیوں۔ [illegible] [illegible] کوئی چارہ [illegible] سے بھر جاتا ہے۔ [illegible] [illegible] کیوں اپناؤں۔ کیوں [illegible] [illegible] میری [illegible] ہو جائے گا۔

[illegible] کوئی مطلب نہیں
کیا [illegible] وہ بھی مطلب نہیں
ہو گا اس میں مطلب [illegible] نہیں سکتی ہے۔
اس کا ایک ہے [illegible] اپنے دکھوں [illegible]
[illegible] دنوں اور تکلیفوں کی گٹھری [illegible] اٹھا
کے [illegible] دے۔ مجھ پر بھروسہ کر۔ خدا کو میرے
بھروسے پر چھوڑ دے۔

جب میں اپنی تکلیفوں کی گٹھری سر پہ اٹھائے
گھومتا [illegible] گٹھری [illegible] ایک [illegible] سا
پیدا ہو جاتا ہے۔ میرے گرد چاروں طرف سے
[illegible] ہیں۔ یہ گٹھری [illegible] پر لاد
دے۔ [illegible] دے [illegible] ذرا [illegible] سکون
سے بھر جاتا ہے۔ [illegible] ایک طوفان [illegible] آتا ہے

مجھ پر بھروسہ کر۔

نہیں نہیں، گٹھری میں اس کے [illegible]
کیوں کروں۔ یہ میری گٹھری ہے۔ میری ساری
زندگی کی کمائی ہے۔ مجھے اپنی مشکلات سے عشق
ہے۔ اپنی مجبوریوں سے محبت ہے۔ میں بڑی
محنت سے اپنے راستے [illegible]
بڑے شوق سے اپنے راستوں پہ [illegible]
اٹھاتا چلوں تاکہ اپنی آبلہ پائی پہ [illegible] سکوں
یہی میری سب سے بڑی مشکل ہے۔

یہی میری سب سے بڑی طاقت ہے۔

میں اپنے دکھوں کی گٹھری کیسے اسے
دے دوں۔

میں تو [illegible] ہوں۔

مجھے کیوں [illegible] اس پر بھروسہ کروں۔
چاروں طرف سے میری جانب [illegible]
ہیں۔

مشکلوں سے سارا گھر بھر جاتا ہے۔
کب سے یہی ہوتا آ رہا ہے۔
وہ منتیں کر کر نہیں ہارا
میں [illegible] دے دے کر ہارتا [illegible]
ہوں۔

مجھے ڈر ہے کہ میں اپنے دکھوں کی گٹھری
اس کے حوالے نہ کر دوں۔ مجھے ڈر ہے کہ
میں اس پر بھروسہ کر کے بیٹھ نہ جاؤں۔
صاحبو کیا وہ کبھی مجھ سے مایوس نہ ہوگا!

حُسنِ اِصلاح

ڈاکٹر زار علامی

ڈاکٹر ہری چند گل انباری انبالہ
شہر کے ایک متمول گھرانے سے تعلق رکھتے ہیں
صنعت گری ان کا محبوب مشغلہ رہی ہیں
مشق سخن تقریباً ۵۰ سال سے ان کا دیوان
جذبات شمیم گل کے نام سے شائع ہو چکا ہے
موصوف تقریباً تمام اصناف سخن میں طبع
آزمائی کرتے ہیں بیشتر ستون کو مجبور کر
جاتا ان کی عروض دانی پر دال ہے نہایت
باغ و بہار قسم کے انسان ہیں نہایت خلیق اور
اچھے انسان ہیں آج کل انبالہ شہر کی ایک
[illegible] میں [illegible] کام کر
رہے ہیں۔

شعر گل:۔
دل میں الفت کی روشنی ہے کہاں
آدمی اب تو آدمی ہے کہاں

اصلاح زار:۔
دل میں پہلی سی روشنی ہے کہاں
آدمی . . . . بحال

توجیہ:۔
شعر تو پہلے بھی صحیح تھا مگر مولانا کے پیش نظر تبدیلی ضروری تھی بظاہر دونوں قوافی میں "ایطا" نظر آتا ہے مگر ایسا نہیں۔ دونوں قوافی میں یائے کی ترکیب جداگانہ ہے

شعر گل:۔
اتنے سے آپ ہو گئے برہم
میں نے اچھی ابھی کہی ہے کہاں۔

اصلاح زار:۔
ابھی سے . . . . بحال
میں نے دل کی ابھی کہی ہے کہاں۔

توجیہ:۔
زندگی میں ہزاروں واقعات پیش آتے رہتے ہیں جن کا [illegible] سے ذکر [illegible]

ہوتا ہے جب [illegible] سے متعلق صرف [illegible] ہو سکتی ہے

شعر گل:۔
اے حسن تیرے [illegible]
گفتار نظر [illegible] زبان [illegible]

اصلاح زار:۔
اے حسن تیرے [illegible]
انداز نظر [illegible]

توجیہ:۔
[illegible]

شعر گل:۔
[illegible]

اصلاح زار:۔

یہ چمن ... نہیں ختم ترانہ
اسے ابھی آنے کی گلستاں میں خزاں بعد

تصیحہ:-
"چمن" بے ربط غلط اس میں "دو"
اظہار حرکت کے لئے آیا ہے صحیح حفظ میں
ہمیشہ ثقل ہے۔ ابھی آنے کی خزاں بعد
سے یہ معنی بھی برآمد ہوتے ہیں کہ بہتر یہی
خزاں سے کچھ جھونکے ہیں اور ابھی اور
چلنا باقی ہیں

شعر گل ہے
جہاں ہے میرے خانۂ دل میں غمِ حیات
اس لا کہیں بھی اور گزارا نہ ہو سکا

اصلاح زار:-
شہرا میرے ہی خانۂ دل میں غمِ حیات
اس کا . . . . اصل حال

توجیہہ:-
جہاں تو صرف دو چار دن کے لئے آتا ہے
اصلاح سے شعر کا صحیح مفہوم واضح ہو گیا۔

شعر گل ہے
اہلِ ہنر کہاں ہیں وہ اہلِ نظر کہاں
دنیائے کور دیدہ میں وہ دیدہ ور کہاں

اصلاح زار:-
اہلِ ہنر ہے نہ وہ اہلِ نظر رہے
دنیائے کور ذوق میں دیدہ ور کہاں

توجیہہ:-
شعر پہلا بہت عجیب نظر آتا تھا مگر غور کرنے
پر معلوم ہوا کہ اگر دنیا ہی کور دیدہ ہے تو
اس میں کسی دیدہ ور کا ملنا ممکن نہیں کور ذوق
سے یہ عیب دور ہو گیا کہ دنیا پہلے بھی کور ذوق
تھی مگر ... دیدہ وروں کی کمی نہ تھی مگر
اب دنیا انقلاب آیا کہ وہ اہلِ ہنر رہے
اور نہ اہلِ نظر۔ ... دنیا ... کی ... ہے

شعر گل ہے
وہ پھول کہ ... ہے ... کر گیا
جس کا ... ہم رنگ ... کر گئی
ہم سر کوئی اس کا نہ ہے تو کیوں کر

وہ پھول بنا جس کے برابر کوئی
اصلاح زار:-
وہ پھول . . . . اصل حال
جس کا . . . . اصل حال
ہم سر کوئی خلق ہو اگر تو کیوں کر
وہ پھول کہ جس کا نہیں ہم سر کوئی

توجیہہ:-
"ہم سر بننا" خلافِ زبان اصلاح ایک خاص
فنی پہلو کے پیشِ نظر کی گئی ہے
صنفِ رباعی ایک ایسی صنفِ سخن ہے
جس پر آسانی سے قابو نہیں پایا جا سکتا۔
رباعی اور صنعتِ مثلث میں تخلیق کرنا تو
بہت ہی مشکل ہے اس صنعت میں ہوتا یہ
ہے کہ رباعی کے پہلے تین مصرعوں کے ابتدائی
الفاظ سے چوتھا مصرعہ برآمد کیا جاتا ہے۔
اصلاح میں خلق کے اصل مصارعے کے ابتدائی
الفاظ "وہ پھول کہ، جس کا نہیں، ہم سر کوئی"
پہلا مصرعہ، دوسرا مصرعہ، تیسرا مصرعہ
کو اکٹھا کر کے چوتھا مصرعہ حاصل کیا گیا ہے
رباعی کا مفہوم بھی وہی رہا اصلاح سے رباعی
صنعتِ مثلث میں ہو گئی۔

شعر گل ہے
افسانہ ہو کہیں بھی محبت کی داستاں
اے عشق دیکھنا یہ تہمت کی بات ہے
اصلاح زار:-

افشا . . . . اصل حال
اے عشق احتیاط یہ پردے کی بات ہے

توجیہہ:-
شعر گل پہلے بھی بے عیب تھا بہت
کی تکرار بھی حسین تھی مگر محبت کی بات بجو
حسین ترین پہلو "پردے کی بات" میں موجود
ہے اس کا لطف اہلِ ذوق ہی اٹھا سکتے
ہیں یہ درست ہے کہ "دیکھنا" میں معنی کی
نزاکت احتیاط کے مقابلہ میں حسین تر ہے
مگر یہاں احتیاط کا لفظ بھی کسی طرح کم نظر
نہیں آتا

شعر گل ہے
دل میں تڑپ، جگر میں خلش، روح بیقرار
تیرا تو لمحہ لمحہ مصیبت کی رات ہے
اصلاح زار:-
دل میں . . . . اصل حال
فرقت کا جو بھی دن ہے قیامت کی رات ہے

توجیہہ:-
لمحہ لمحہ پوری زندگی پر محیط ہے یہ خلاف
حقیقت ہے کہ کبھی انسان کی زندگی کا ہر
لمحہ مصیبت کی رات بن کر رہ جائے یہی وہ
سبب ہے جس کے تحت اصلاح ضروری تھی
اصلاح سے اب تضاد کا پہلو بھی آ گیا اور شعر
بھی بلیغ ہو گیا

بابِ انتقاد

خاکسترِ دل

(اخلاق سہسوانی)

سالِ اشاعت: ۱۹۹۱ء

صفحات: ۱۶۰۔ ڈیمائی سائز

قیمت: پچیس روپے

ملنے کا پتہ: مکتبہ شانِ ہند، نئی دہلی ۲۔

اخلاق سہسوانی نباضِ سخن مولینا راز سہسوانی کے تلامذۂ ارشد کی صفِ اوّل میں شمار ہوتے ہیں۔ فنِ عروض سے واقفیت کی بنا پر ان کا کلام شعری محاسن کا آئینہ دار ہے اور ان کا شمار اب مُلک کے اچھے شعرا میں ہوتا ہے۔

اخلاق سہسوانی کا کلام شانِ ہند میں بارہا شائع ہوکر مقبولیت پا چکا ہے۔ ان کے افسانے بھی شانِ ہند میں شائع ہوتے رہے ہیں۔

"خاکسترِ دل" حمد۔ نعت۔ غزل۔ نظم۔ قطعہ۔ رُباعی اور ادبیات کا ایسا بیش بہا شعری مجموعہ ہے جو اپنے قاری کے لئے ایک بیش بہا نعمت سے کم نہیں۔

گھر جلتے رہے خون بھی بہتا رہا لیکن
الزام کسی شخص کے سر پہ نہیں آیا

دُنیا فریب دیتی رہی ہم کو اور ہم
کچھ سوچ کر خلوص کے سانچے میں ڈھل گئے

ہنسے جو پھول تو شبنم کی آنکھ بھر آئی
غم و خوشی میں کوئی ربط سا لگے ہے مجھے

کسی کی رہروی یا رہبری سے کچھ نہیں ہوتا
نہ ہو جب تک جنوں کسی سے کچھ نہیں ہوتا

وہیں وہیں مجھے بغض و تعصبات ملے
جہاں جہاں بھی تلاشِ خلوص کی میں نے

مری آنکھ سے ایسے آنسو بھی چھلکے
ٹھکانہ بنا جن کا مژگاں نہ دامن

شاید کوئی تسکین کی صورت نکل آئے
ساغر میں ذرا کشکول کے ہم دیکھ رہے ہیں

میں فریب و مکر میں مشغول ہوں
اس لئے اب ہر جگہ مقبول ہوں

اب کیا کروں میں اپنے دلِ سادہ لوح کو
وہ جھوٹ کہہ رہے ہیں مجھے اعتبار ہے

ہر اک نقشِ پا پہ نشانِ جبیں ہے
کہیں یہ تری رہگزر تو نہیں ہے

مجھے ڈر تھا کہاں جائیں گے کھلتے ہوئے غنچے
چلو اچھا ہوا خود روک لی تم نے ہنسی اپنی

ایسے ہزار ہا اشعار کا یہ مجموعہ پچیس روپے میں نعمت کے برابر ہے۔ اگر آپ کو اچھے اشعار پڑھنے کا ذوق ہے تو اپنی ذاتی لائبریری میں "خاکسترِ دل" کو جگہ دیجئے۔

سرور تونسوی

مَن کہ مکتوب الیہ

محترمی سرور تونسوی صاحب،

تسلیمات!

کافی عرصہ سے آپ کا خیریت نامہ نہیں ملا۔ خدا کرے آپ صحت مند، تندرست اور توانا ہوں۔

ملتان میں مارچ کے دوسرے ہفتہ میں ایک عالمی اُردو کانفرنس کرانے کا پروگرام ہے جس میں آپ کا نام بھی شامل ہے۔ دو چار روز میں اس سلسلے میں خطوط لکھنے والا ہوں۔ آپ نے ہر حال میں تشریف لانا ہے۔ میرے پی۔ ایچ۔ ڈی کے مقالے کی دو کاپیاں آپ کو مل گئی ہیں۔ اس میں ایک باب "مسعود حسن رضوی کے ادبی معرکے" نہیں چھپا یہ الگ صحیفہ میں شائع ہوا تھا۔ میں اس کی کاپی آپ کو بھیجوں گا تاکہ وہ بھی شامل ہو جائے۔

ملتان کے صحافی، ادیب اور شعراکثر آپ کا ذکر کرتے ہیں اور چاہتے ہیں کہ ایک بار آپ ملتان ضرور آئیں۔

مسعود حسن رضوی کی غالب کے بارے میں کتاب "غالب — تب اور اب" بھی شائع ہوئی ہے۔ اسے میں نے ہی مرتب کیا ہے۔ آپ کو جلد بھجواؤں گا۔ آپ نے کچھ کتابیں بھجوانا تھیں۔ براہِ کرم ارسال کر دیں۔ رسالے بھی کافی دنوں سے نہیں ملے۔

خیر اندیش

ڈاکٹر طاہر تونسوی

ملتان (پاکستان)

مکرمی محترمی بھائی سرور صاحب —

خلوص!

بہت دن کے بعد شانِ ہند دیکھنے کو ملا۔

ماشاء اللہ پہلے سے کہیں زیادہ خوبصورت اور دیدہ زیب ہو گیا ہے۔ ٹائٹل، کتابت، طباعت، ہر چیز انتہائی خوبصورت ہے۔ آپ کو مبارکباد پیش کرتا ہوں۔ مگر شانِ ہند کے صفحات کا اختصار بہت گراں گزرا۔ آپ شانِ ہند کے صفحات بڑھا دیجئے۔ اس کے ساتھ قیمت بھی بڑھا دیجئے۔ پڑھنے کے بعد سیری نہیں ہو پاتی —

والسلام۔

خلوص کار

اخلاق سہسوانی، سہسوان

محترمہ محترم انکل جی و آنٹی جی

آداب عرض

اُمید ہے آپ خیریت سے ہوں گے۔ اور آپ کی صحت پہلے سے بہتر ہوگی۔ میں نے اپنا مقالہ پورا کر لیا ہے اور اب ٹائپ ہونے کے لئے دیا ہے۔ آج کل آپ کی کتابیں بڑے شوق سے پڑھ رہی ہوں۔ مشاعروں کی ترتیب میں آپ نے بہت محنت کی ہے اور آپ کی یادداشت کی بھی داد دیتی ہوں۔ آپ کی دوسری کتاب "یہ کوئے یار" مجھے بے حد پسند آئی ہے۔ میں اسے تھوڑا تھوڑا کر کے پڑھتی ہوں کہ کہیں ختم نہ ہو جائے۔ بے حد دلچسپ ہے اور اکثر وہاں سے باتیں پڑھ کر سعید صاحب کو سناتی ہوں۔ خدا آپ کو صحت اور زندگی عطا فرمائے۔ آمین!

انکل جی کبھی دہلی یونیورسٹی کے اُردو کے اساتذہ سے ملنا ہو تو دریافت کیجئے کہ دہلی یونیورسٹی سے پی۔ ایچ۔ ڈی کرنے کے لئے کیا شرائط ہیں اور غیر ملکی لوگ یہاں سے پی۔ ایچ۔ ڈی کر سکتے ہیں۔ میں نے اپنا مقالہ "کرشن چندر کے ناولوں کا تنقیدی مطالعہ" مکمل کیا ہے اور یہ تقریباً پونے چار سو صفحہ کا ہے جس کا سائز ۱۱ × ۸ ہے۔ کرشن چندر پر تو بہت سارے لوگوں نے پی۔ ایچ۔ ڈی کی ہوگی۔ اگر اُن کے ناولوں کے سماجی پہلو یا انسان دوستی کے حوالے سے مجھے کوئی عنوان عنایت کر سکیں؟ مجھے کرشن چندر سے بہت دلچسپی ہے۔

اور انکل آپ کیسے ہیں۔ جب میں بہت چھوٹی تھی تو میرے والد کی نگرانی میں تونسہ بیراج بنا تھا۔ وہ اُس وقت اریگیشن ڈیپارٹمنٹ میں ایس۔ ڈی۔ او تھے۔ اپنے ڈیپارٹمنٹ میں سب سے پرانے اور تجربہ کار آدمی تھے۔ شاید بیراج پر اُن کا کہیں نام لکھا ہے، انجینئر مرزا احمد شریف۔ آج ریٹائرمنٹ کی زندگی گزار رہے ہیں جب بھی "تونسہ" کا لفظ پڑھتی ہوں تو لگتا ہے میرا اس لفظ سے رابطہ ہے۔

بہت لمبا خط لکھا ہے میرے میاں آجکل سیاسی کاموں میں مصروف ہیں۔ وہ ایڈوکیٹ ہیں اور خواجہ احمد عباس کا غمیری کے مقلد ہیں۔ اور اپنے اصولوں کی خاطر چھ سال جیل کاٹی ہے۔ آج ساحر کی نظم جو یوسف کا غمیری پر لکھی تھی اور آپ نے اپنی کتاب میں درج کی، اس کو سنایا تو ان کی آنکھوں میں نمی آگئی۔

سعید صاحب کی طرف سے اور میری طرف سے آپ کو، آنٹی جی کو، میرے بہن بھائیوں کو سلام و آداب!

آپ کی مخلص بہن
آنسہ احمد سعید
لائل پور

جناب پروپرائٹر صاحب
ماہنامہ خاتونِ ہند دہلی، تسلیمات!

خاتونِ ہند پبلی کیشنز جس قابلِ تعریف انداز سے اردو کی کتابیں شائع کر رہا ہے، اس کا مقابلہ غیر مُلکی مطبوعات سے کیا جا سکتا ہے جس کے لئے آپ اور خاتونِ ہند پبلی کیشنز کے ترتیب کار مُبارکباد کے مستحق ہیں۔

مَیں اپنا دُوسرا مجموعۂ کلام بھی آپ کے ہاں سے شائع کرانا چاہتا ہُوں جس کی تفصیل حسبِ ذیل ہے۔ براہِ کرم تخمینہ اخراجات سے مُطلع فرمائیں۔ جلد بندی ایسی چاہتا ہوں جیسی "یہ کوئے یار ۔۔۔" کی ہے۔ اور کتابت بھی بہتر ہو ۔۔

طالبِ خیریت
اَطہر صدّیقی

محترم سرور صاحب، تسلیم!

آپ نصف صدی سے میدانِ صحافت میں ہیں۔ عُمر کی ۷۷ بہاریں طے کر چکے ہیں۔ آپ کی تصنیفِ لطیف "یہ کوئے یار بہ اندازِ محرمانہ گزر" اپنی طرز کی واحد کتاب ہے جس پر کئی ایوارڈ بھی ملے ہیں۔ آپ کی دُوسری تصنیف "دِلّی کے مشاعرے" ایک ایسی کتاب ہے کہ جب تک اُردُو باقی ہے، یہ کتاب حوالوں کے لئے تلاش کی جائے گی۔ مگر حسرت یہ ہے کہ۔

۱۔ دِلّی میں کئی سمینار ہوتے رہے جن میں مقالہ نگاروں اور ناقدوں حضرات کے ایسے ایسے نام ہوتے ہیں جنھیں آپ برسوں پڑھا سکتے ہیں۔ مگر آپ کو ان سمیناروں میں بحیثیت مقالہ نگار وغیرہ کیوں شامل نہیں کیا جاتا؟

۲۔ دِلّی اُردُو اکادمی کی گورننگ باڈی میں ایک دو صحافی بھی ہوتے ہیں۔ آپ ایسے صحافی کو کبھی اُردُو اکادمی کا ممبر بننے کا بھی شرف حاصل نہیں ہوا۔ کیوں ۔۔؟

۳۔ غالباً ہمارا اُردُو اکادمی ہر سال تین غیر مُسلم ادیبوں کو ایوارڈ دیتی ہے۔ آپ کے ایک شاگرد کو بھی یہ ایوارڈ مل چکا ہے اور یہ ایوارڈ حاصل کرنے والے ایسے بھی حضرات ہیں جن کا اَدب میں کوئی مقام نہیں ہے۔ کیا وجہ ہے کہ اب تک آپ کو اس ایوارڈ کا حقدار نہیں سمجھا جاتا؟

سُکھال سنگھ جیل
نیو تیوری نگر
کولابہ، بمبئی۔

—— ——

مُراسلات صاف اور خُوشخط لکھیں۔

آزادی کے بعد اُردُو شاعری کی سرفرازی اور دلچسپی کی دِلفریب داستان

دِلّی کے مُشاعرے

ماہنامہ "ایوانِ اُردُو" کی نظر میں

سرور تونسوی ایک تجربہ کار مُدیر ہونے کے ساتھ ساتھ زبان و ادب کے نباض بھی ہیں۔ دیارِ اَدب و صحافت کی خاک چھانتے ہوئے وہ انسانی فطرت سے خوب واقف ہو گئے ہیں اور اسی واقفیت کے طفیل انھوں نے "دِلّی کے مُشاعرے" جیسی کتاب ترتیب دی ہے۔ ایسی دستاویزی کتاب کیلئے مواد فراہم کرنا اور اسے دلچسپ انداز میں پیش کرنا آسان کام نہیں تھا۔ انھوں نے کئی برس ان گنت راتوں کی نیند حرام کر کے دِلّی میں جابجا ہونے والے مشاعروں میں اوّل سے آخر تک شرکت کی اور ان کی رُوداد کو نہ صرف دلچسپ اور مُؤثر پیرائے میں قلم بند کر کے اُردُو شاعری کی جو خدمت انجام دی ہے وہ معمولی نہیں۔

کتاب اتنی دلچسپ ہے کہ اسے ایک بار پڑھنا شروع کرو تو چھوڑنے کو جی نہیں چاہتا بلکہ فوت کر گزرے ہوئے مشاعرے میں جا بیٹھنے کیلئے دل بے چین ہو اُٹھتا ہے۔ اس کتاب کا قاری اُردُو شاعری کے تنوّع، اُسکی خامیاں اور اُس کے تنازعوں کی بساط کچھ اس طرح گُم ہو جاتا ہے کہ اسے شاعرانہ ذوق کی تسکین کے سارے سامان موجود ہونے کے باوجود اس کی پیاس بڑھتی جاتی ہے۔

"دِلّی کے مشاعرے" ایک رواں دواں اَدبی عہد کی متحرک اور مستند کہانی سے عبارت ہے کہ اس میں جگر مرادآبادی، جوشؔ، یگانہ، فراقؔ، مسعود لکھنوی، گوپال متل، دتاتریہ کیفی، ہری چند اختر، شہری بھوپالی، اور دیگر بزرگ شاعروں کے ساتھ ساتھ مضطر گولڑوی، نریش کمار شادؔ، عرش ملسیانی، جگن ناتھ آزادؔ، عدمؔ، احسانؔ دانش اور اُن کے بعد اُبھر کر آنے والے شاعروں میں بشیر بدر، مخمور سعیدی، اور راج نرائن رازؔ کے علاوہ بہت سارے شاعر اپنی خوش فکری کا اظہار کرتے نظر آتے ہیں۔ اسی کتاب میں ہماری مُلاقات عہد ساز شاعروں کے ساتھ اُن کے تمام تر تیوروں کی جھلک دیکھتے ہوئے ہوتی ہے۔ ہم ایسا محسوس کرتے ہیں جیسے ہم بذاتِ خود مُشاعروں میں بیٹھے اُنھیں ایک دوسرے پر چھینٹے پھینکتے، ایک دوسرے کا مذاق اُڑاتے، ایک دوسرے پر فقرے کستے، ایک دوسرے کی ٹانگ کھینچتے اور ایک دوسرے کو بیک وقت داد دیتے اور استہزا کا شکار بناتے ہوئے دیکھتے ہیں۔

سرور تونسوی نے جوش ملیح آبادی کی گھن گرج، فراقؔ کی جمالیات اور جوش ملسیانی کی زبان و بیان پر استادانہ عبور، گوپال متل کی رجائیت اور جگر کے والہانہ پن کا ذکر کرنے کے ساتھ ساتھ بُرے شعر کو اچھا اور اچھے شعر کو کمزور کہنے سے چنداں گریز نہیں کیا۔ شعر پڑھتے وقت شاعر کی شکل، موڈ اور اطوار اور اس پر اثر انداز ہونے والے ماحول کا بھی بھرپور ذکر کرتے ہوئے سرور تونسوی نے ہر مُشاعرے کے ماحول کو ہمارے سامنے ایک تصویر کی طرح پیش کر دیا ہے۔

کتاب پورے اہتمام سے شائع کی گئی ہے۔ اور شاعروں اور شاعری سے لگاؤ رکھنے والوں کیلئے ایک نعمت ہے۔ اُردُو اکادمی نے مالی اعانت دے کر ایک اہم فریضہ انجام دیا ہے۔

شانِ ہند

جلد ۵۲ شمارہ

چیف ایڈیٹر
سرور تونسوی

جوائنٹ ایڈیٹر
مطرب صحرائی

اشاعت کا ۵۲ واں سال

پرنٹر، پبلشر، پروپرائٹر: وِدیا پرکاش سرور تونسوی
طباعت: خواجہ پریس، جامع مسجد دہلی۔ مقام اشاعت: دفتر ماہنامہ "شانِ ہند" فلیٹ ۵ انصاری مارکیٹ دریا گنج نئی دہلی ۱۱۰۰۰۲۔

اس شمارے کی اہم جھلکیاں

خلیق انجم نے فرمایا کہ ہندو دیومالا کے ... کا انتظام ہم سے ... حضرات کے ذمہ لگایا۔ ایک کہانی تو منتر ہے ——

بلبل چہ گفت

"ہندی ادب کے بے لوث خادم" بالو خیام گنید داس (خواجہ وحید الدین) سورج مکھی (نظم بالک بھارتی) وقت کا اسیر (حسن ساجد) تکبیر جانی ایک منتخب ذخائر (ساجد احمد) سیکی انتخابات (شعیب) غزلیں — اکمل حیدرآبادی، ساجد حیدرآبادی، نعیم آزاد، کوثر ... گوپال کرشن شفق، میر شفقت، ... گیت (منظور صدیقی) ماہیا (دیپک قمر) کیسا آدمی ہوں میں (جمشید مسرور)

اور باب انتقاد "من کو مکتوب الیہ"

مستقل کالم بدستور

ہندو پرست ہوں نہ مسلماں پرست ہوں
دامن پرست ہوں نہ گریباں پرست ہوں
ہر ذرۂ وطن سے ہے فیاض مجھ کو پیار
یعنی وطن پرست ہوں انساں پرست ہوں

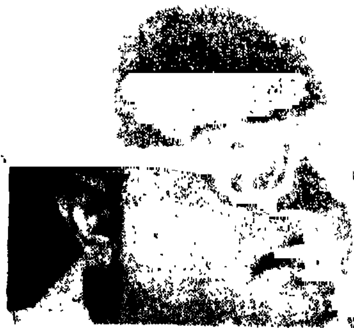
فیاض گوالیاری

ممالک غیر میں:-
بذریعہ سمندری ڈاک -/۱۰۰ روپے
بذریعہ ہوائی ڈاک -/۳۰۰ روپے

قیمت فی شمارہ - پانچ روپے
قیمت سالانہ پچاس روپے
لائف ممبری پانچ سو روپے

غزل

ڈاکٹر حقیر آستانی مرحوم



طوق اِس کو سمجھ، کہ ہار سمجھ
دہر کو ایک خارزار سمجھ

جو گنہگار ہے ازل سے، اُسے
تا ابد مت گناہگار سمجھ

ایک دل ہی تمہارا ہے ضامن
دل کو کچھ بھی ہو ایک بار سمجھ

پڑھ ہی لیتا ہے آخرش نیت
وقت کو اتنا ہوشیار سمجھ

آن کاٹے گی وہ کسی بھی طرح
موت کو شتر بے مہار سمجھ

زیست ناپائیدار ہے اتنی
اس کو ہرگز نہ پائیدار سمجھ

خود کو تو بھی حقیر دنیا میں
زندہ درگور بے قرار سمجھ

سمیناروں کی آڑ میں

خود غرضی کا ناپاک جذبہ

ان سمیناروں سے اُردو کو کونسی تقویت ملی ہے سوائے اس کے کہ لاکھوں روپیہ چند حواریوں اور احباب کی جیب میں چلا گیا۔

اُردُو ہندوستان میں زندہ رہے یا مرے مگر ایسے ادارے جن کے سپرد حکومت نے اُردو کی بقا و حیات کی باگ ڈور کر رکھی ہے، اُن اداروں کے ارباب بست و کشاد نے یہ سمجھ لیا ہے کہ اردو انھیں کے دم سے ہندوستان میں باقی ہے۔ لہٰذا خود اور اپنے اعزا نیز دوست احباب کو اُردو کی اس لوٹ سے جس قدر فائدہ پہنچایا جا سکتا ہے پہنچایا جائے اور ایسے لوگوں کو بھی اس بہتی گنگا میں غوطے لگانے دیے جائیں جن سے [illegible] اُردو کے [illegible] ترقی دینے کے امکانات [illegible] جہاں جن اُردو کے نام پر [illegible] ہو تو انھیں [illegible] کیا جائے۔ [illegible]

سابق سیمینار کیا۔ یہ سیمینار کئی وجوہ سے کافی اہم سیمینار ہوتا ہے۔ کوشش کی جاتی تھی کہ سیمینار کے موضوع پر اچھے سے اچھے مقالہ نگاروں کو بلایا جائے مگر اس سال یہ سیمینار بھی اردو کے عام سیمیناروں کی طرح رطب و یابس کی نذر ہو گیا حد یہ ہے کہ مدعو مقالہ نگاروں کی نصف تعداد بھی سیمینار کے اجلاسوں میں موجود نہ ہوتی تھی، سامعین تو بہت دُور کی بات ہے۔ نہ معلوم غالب انسٹی ٹیوٹ ایک گراں قدر رقم ہر سال کیوں ضائع کرتا ہے۔ غالب کا کونسا ایسا گوشہ ہے جس پر مزید لوحنی ڈالنی باقی ہے۔

انجمن ترقی اُردو ہند کی جانب سے بابائے اردو مولوی عبدالحق سیمینار منعقد کیا گیا۔ داد دینی چاہیے انجمن کے جنرل سیکریٹری کو جنھوں نے ونجمن کے دیگین ہیرے مقالہ نگاروں کو اکٹھا کیا مگر اس میں ماتھے کے اُجالے کے علاوہ کچھ مقالہ نگار انجمن کی خوش قسمتی سے از خود بھی کبھی نہ کسی طرح تشریف لائے۔ کچھ پاکستانی مندوبین تو وہ تھے جو غالب سیمینار میں مدعو تھے اور انہیں اُردو اور بابائے اُردو کے نام کا واسطہ دے کر روک لیا گیا اور انھیں انجمن کی طرف سے کوئی معاوضہ نہیں دیا گیا۔ افسانہ نگار ہرچرن چاولہ ناروے کے مندوب کی حیثیت سے ماریشش اُردو عالمی کانفرنس میں شرکت کے بعد ہی تشریف لائے کیونکہ اُن کی خوش دامن صاحبہ کا انتقال ہو گیا تھا۔ لہٰذا اُن کی بیگم صاحبہ دِلی میں مقیم تھیں۔ اور چاولہ صاحب کو تعزیت کے لئے دلی آنا ہی تھا۔ دلی پہنچنے تک انھیں اس کا علم بھی نہ تھا کہ انجمن کا یہ سیمینار ہو رہا ہے۔ لہٰذا انھیں مالِ غنیمت سمجھ کر سیمینار کی بین الاقوامی حیثیت کو تقویت دینے کے لئے ناروے کا مندوب بنا لیا گیا۔ اسی طرح جاپان کے مندوبین پاکستان کا دورہ کر کے ہندوستان تشریف لائے تھے۔ انھیں بھی مالِ مفت سمجھ کر جاپانی مندوبین کی حیثیت سے سیمینار میں شریک کر کے سیمینار کو عالمی سیمینار کا بھاری بھرکم نام دیا جا سکا۔

بے چاری وہ عصمت چغتائی جن کے جنازے کے ساتھ ایک بھی مسلمان نہیں تھا کیونکہ عصمت کا جسدِ خاکی اُن کی وصیت کے مطابق بجلی کے شمشان میں جلایا جانا تھا، اسلئے اگر کوئی مسلمان اُن کے جنازے کے ساتھ جاتا تو ہو سکتا ہے اُس پر قہرِ خدا نازل ہو جاتا۔ اُسی عصمت کے فن پر آنسو بہانے کے لئے ۲۳ پاک طینت، شرع کے پابند اور اسلام کے کھوکھلے مسلمان اکٹھے ہو رہے ہیں کیونکہ عصمت چغتائی کی لاش میں بھی ایسے گُن تھے کہ اُردو کے گورکنوں کے لئے مفاد کے دروازے کھل سکتے ہیں۔

اس سیمینار میں مقالہ نگار حضرات اور دیگر مندوبین کی تعداد بیالیس تھی۔

مولانا عبدالحق کے ان بہتر نشتروں میں کچھ ایسے حضرات بھی تھے جنھوں نے بابائے اُردو کو اپنی تیز دھار سے کسی حد تک مجروح بھی کیا۔ کمال احمد صدیقی اور ایک دو حضرات کے علاوہ کلیم الدین سہسرامی جو بنگلہ دیش سے کسی مذہبی کانفرنس میں شرکت کے لئے دِلی آئے ہوئے تھے (بقول اُن کے) نے فرمایا کہ بابائے اُردو سلہٹ وغیرہ مقامات پر قیامِ پاکستان کی تحریک کے استحکام کے لئے آئے تھے۔ دوسرے الفاظ میں اسے یوں کہیے کہ وہ بابائے اُردو جو قیامِ پاکستان کے لئے کوشاں رہے اور پاکستان بنتے ہی دلی کو خیرباد کہہ دیا۔ ہمارے خلیق انجم صاحب جو بظاہر سیکولرزم کے علمبردار کہلوانے کے آرزومند ہیں اور وجودِ پاکستان کو مسلمانوں کے لئے بہتر خیال نہیں کرتے نے اُس بابائے اُردو پر سیمینار کرایا ہے جو قیامِ پاکستان کی تحریک کے استحکام کے لئے کوشاں تھے۔ یہ دوسری بات ہے کہ خلیق انجم صاحب جب پاکستان جاتے ہیں تو وہاں ہندوستان کی ایسی تیسی کرنے میں نمایاں کردار نبھانے میں یہاں تک کہہ جاتے ہیں کہ دیکھو پاکستانیو، میری بیوی ہندو ہے اور میں نے ہندوستان میں، پاکستان بننے کے بعد اسے مسلمان کر کے اپنا رفیقِ حیات بنایا ہے۔

(پاکستانی اخبارات میں خلیق انجم کے یہ الفاظ محفوظ ہیں)

معاف کیجئے، بات ہو رہی تھی بابائے اُردو مولوی عبدالحق سیمینار کی اور درمیان میں آ گئے خلیق انجم۔

اس سیمینار میں مقالہ نگاروں کا انتخاب بھی غضب تھا کہ نوّے فیصد مقالہ نگاروں نے تو مقالے پڑھنے کی بجائے زبانی ہی چند الفاظ میں اپنا فرض نبھا دیا۔ ہاں محترمہ فہمیدہ بیگم صاحبہ ڈائریکٹر ترقی اُردو بورڈ کا مقالہ "مولوی عبدالحق اور قواعدِ اُردو" بے شک اپنے موضوع کے اعتبار سے واحد مقالہ ایسا تھا جو ہر لحاظ سے قابلِ ستائش تھا۔ مگر وہ بھی پورا مقالہ نہ پڑھ سکیں۔ موصوفہ نے اپنے مقالے میں ماریشش عالمی اُردو کانفرنس کی تعریف کی کہ جسے صحیح معنوں میں عالمی اُردو کانفرنس کہا جا سکتا ہے وہ ماریشش کی یہ کانفرنس تھی۔ موصوفہ نے اس کانفرنس کی کچھ خوبیاں بیان کی تھیں، اس لئے مقالہ کے اختتام پر اس اجلاس کے نقیب رفعت سروش نے بڑی ناگواری کا اظہار کیا اور فرمایا کہ ماریشش والے ہمارے سہارے ہی اُردو کانفرنس کرتے ہیں۔ ہمیں لوگ وہاں جا کر مشاعرے پڑھتے ہیں دوسرے لفظوں میں رفعت سروش کا یہ شدید احتجاج تھا کہ انھیں نہ تو کبھی ماریشش بلایا گیا ہے اور

مذہبی اُن کے آقائے اُردُو علی صدیقی کے احکام کی تعمیل میں سرکار نے مندوبین کا انتخاب کیا۔ علی صدیقی صاحب نے مندوبین کی اپنی فہرست میں رفعت سروش کا نام بھی دیا تھا۔)

اس میں کوئی شک نہیں کہ ترقی اُردُو ہند کا میٹنگ ہال جس میں بہ مشکل تمام ایک صد اشخاص بھی نہیں بیٹھ سکتے' ہر اجلاس میں ہاؤس فل کا نقشہ پیش کرتا رہا۔ (۲۰، ۲۲ تو مقالہ نگار ہی ہوتے تھے)

اس سیمینار کا افتتاحی اجلاس اچھا رہا محترمہ گرجا دیاس نائب وزیر اطلاعات ونشریات انجمن کے صدر جناب سید حامد صاحب' پاکستان کے سفیر کبیر تشریف لائے۔ اچھی تقاریر ہوئیں۔ پیام فتحپوری نے محترمہ گرجا دیاس کے مجموعۂ کلام کے ریلیز ہونے پر جو تقریر فرمائی وہ اعلان کر رہی تھی کہ پیام فتحپوری واقعی طور پر مولانا نیاز فتحپوری کے جانشین اور "نگار" کے مُدیر ہونے کی اہلیت رکھتے ہیں۔

خلیق انجم صاحب نے اپنی تقریر میں انجمن کی بے بسی، مفلوک الحالی اور غربت کا اظہار کرتے ہوئے فرمایا کہ ہم نے مالی امداد کیلئے محترمہ گرجا دیاس صاحبہ سے گزارش کی تو انھوں نے ہماری درخواست ایک ایسے محکمے میں بھجوا دی جو ناچ گانے پر تو کروڑوں روپیہ برباد کر رہا ہے مگر اس نے اس سیمینار کے لئے مالی امداد سے بالکل انکار کر دیا۔ اس پر یکیس مرزا نے باآواز بلند اعتراض کیا کہ ناچ گانا ہندوستان کے تہذیبی نشان ہیں۔ انہیں آپ تحقیر آمیز لہجے میں کنڈم نہیں کر سکتے۔

خلیق انجم نے فرمایا کہ مندوبین کے لئے کھانے کا انتظام بھی ہم نے کچھ مخیر حضرات کے ذمہ لگایا۔ ایک کھانا تو محترمہ گرجا دیاس دے رہی ہیں۔ حکیم عبدالحمید صاحب اور جناب ساقی نارنگ صاحب بھی ایک ایک کھانا دے رہے ہیں۔ اور یہ کہ پچھلے دنوں کانفرنس اجلاس حکومت ہریانہ نے "ہریانہ بھون" میں کرانے کے لئے ذکر کیا ہے لہٰذا ہریانہ کے وزیر اعلیٰ جناب بھجن لال صاحب کی طرف سے کھانا بھی وہیں ہوگا۔

حیرت ہوئی کہ انجمن ترقی اُردُو کی مالی حالت اتنی پتلی ہو گئی ہے۔ جبکہ اُردُو گھر کی بلڈنگ سے لاکھوں روپیہ سالانہ کرایہ وصول ہوتا ہے۔ حالانکہ جب حکومت نے اُردُو گھر کے لئے زمین مفت دی تھی تو یہ معاہدہ ہوا تھا کہ بلڈنگ کا ایک حصہ U.T.D کو دیا جائے گا۔ مگر خلیق انجم صاحب نے اپنی چابکدستی سے ڈی۔ ٹی۔ ڈی کو دستبردار کیا اور ساری بلڈنگ کا کرایہ انجمن ہی وصول کرتی ہے۔ تو ایسی حالت میں انجمن کی مالی حالت پتلی کیوں ہے کہ اسے مندوبین کے کھانے کے لئے بھی مخیر حضرات کا زیر احسان ہونا پڑا۔ حکومت ہندوستان لاکھوں روپے کی گرانٹ بھی انجمن کو دیتی ہے حالانکہ اُردُو گھر کے کرایہ کی معقول رقم کے سامنے یہ گرانٹ کی رقم کچھ بھی نہیں ہے۔

اگر انجمن کی مالی حالت اتنی خستہ ہے تو پھر اتنا بڑا سیمینار کرانے کے لئے حکیم اجمل خاں کی رُوح نے تو استدعا کی نہیں ہو گی۔ دراصل یہ سیمینار اس لئے کرایا گیا کہ تاکہ روس' جاپان' پاکستان' بنگلہ دیش کے مندوبین اپنے یہاں خلیق انجم صاحب کو بلا سکیں اور ہندوستانی مندوبین اس احسان کا بدلہ انھیں اپنے یہاں ادبی تقریبات میں مدعو کر کے چکانے کی کوشش کریں گے۔ دوسرے لفظوں میں یہ سیمینار بابائے اُردُو مولوی عبدالحق کی یاد تو ایک بہانہ تھا۔ حقیقت یہ تھی کہ خلیق انجم صاحب نے ملکی اور غیر ملکی زرخیز زمینوں میں تخم ریزی کی ہے جس کا پھل بہت جلد انھیں کھانے کو ملے گا۔

پاکستان سے ایک وفد جمیل الدین عالی کی طرف سے اور دوسرا وفد انجمن ترقی اُردُو پاکستان کی طرف سے آیا تھا۔ ظاہر ہے کہ وہ اپنے اخراجات آپ ادا کر رہے ہیں۔

پچھلے دنوں قرۃ العین حیدر نے مسعود حسن ...

لکھنؤ کے چیئرمین جناب رام لعل نے بھی لکھنؤ میں ایک سیمینار لکھنؤ میں کرایا جس کی روداد قومی آواز لکھنؤ میں شائع ہوئی ہے۔ رام لعل صاحب نے بھی زیادہ تر احباب کو ہی مدعو کیا ہے۔ لکھنؤ پر سیمینار ہوا اور اس میں جگدیش چندر ودھاون کو مدعو کیا جائے' جن کی تصنیف "لکھنؤ نامہ" ہندوستان اور پاکستان میں متفقہ طور پر لکھنؤ پر بہترین کتاب قرار دی گئی ہے۔ حالت یہ ہے کہ پاکستان میں حال ہی میں ایک کتاب شائع ہوئی ہے "لکھنؤ ایک شہر لاجواب" اس کتاب میں جگدیش چندر صاحب کی کتاب "لکھنؤ نامہ" سے چار مضامین لفظ بلفظ نقل کر لئے گئے ہیں۔ اور جو حضرات لکھنؤ پر مقالے پڑھتے ہیں' اُن کے مقالے بھی "لکھنؤ نامہ" کے رہین منت ہیں۔

یہ اداریہ لکھا جا رہا تھا کہ دلی اُردُو اکادمی کی طرف سے عصمت چغتائی اور نیا افسانہ" پر سہ روزہ سیمینار منعقد کئے جانے کی اطلاع ملی ہے۔ اس سیمینار میں بھی ۲۵ کے قریب مقالہ نگار وغیرہ حضرات شرکت فرما رہے ہیں۔ اس سیمینار کے ڈائرکٹر پروفیسر قمر رئیس ہیں۔

ظاہر ہے کہ پروفیسر قمر رئیس بھی اتنے کے دانشور ہیں اور وہ اُردُو کا دانشور ہو ہی نہیں سکتا جو ایسے سیمینار میں اپنے شاگردوں اور احباب کو نظر انداز کرے کیونکہ یہ تو موقعہ معاوضہ والی بات ہے۔ آخر قمر رئیس کسی سے پیچھے کیوں رہیں۔ لہٰذا انھوں نے دلی اُردُو اکادمی کے کندھوں پر بندوق رکھی ہے۔ گویا ہینگ لگے نہ پھٹکری اور رنگ چوکھا آئے۔ اُردُو اکادمی کی کارگزاری میں ایک سیمینار کا اضافہ ہو جائے گا اور اس کے ساتھ ساتھ قمر رئیس صاحب کا اپنے شاگردوں اور احباب میں بول بالا ہو جائے گا۔

ہمیں اس سیمینار سے ایک خوشی ضرور ہوئی کہ قمر رئیس کے کچھ سے زیادہ ... عام ہو سکے گا ... اور انھیں اُردُو کی ... مالی ... بھی ہو گا۔

بے چاری عصمت چغتائی جن کے جنازے کے ساتھ ایک بھی [illegible] نہیں تھا۔ کیونکہ عصمت کا جسد خاکی اُن کی وصیت کے مطابق بجلی کے شمشان میں جلایا جانا تھا۔ اس لئے اگر کوئی مسلمان اُن کے جنازے کے ساتھ جاتا تو ہو سکتا ہے اُس پر قہر خدا نازل ہو جاتا۔ اُسی عصمت کے غم پر آنسو بہانے کے لئے ۳۳ پاکستانی خرچے پر باہر اور اسلام کے رکھوالے مسلمان اکٹھے ہو رہے ہیں۔ کیونکہ عصمت چغتائی کی وفات میں بھی ایسے حق ہے کہ اُردو کے کروڑوں کے لئے سفارت کے دروازے کھل سکتے ہیں۔

ویسے ڈائریکٹر سیمینار پروفیسر قمر رئیس، کنوینر سیمینار جناب غلام ربانی تاباں کہنے کو کمیونسٹ ہیں اور کمیونسٹ کے نزدیک ہندو مسلم کا کوئی سوال نہیں ہوتا۔ مگر اس سیمینار میں صرف تین غیر مسلم حضرات کو مدعو کیا گیا ہے۔ رام لعل کو اس لئے کہ وہ فخر الدین علی احمد میموریل کمیٹی کے چیئرمین ہیں۔ اُن سے قمر رئیس صاحب کے کئی اداروں کے منصوبوں پر مالی امداد منظور کرائی جا سکتی ہے۔ کے۔ کے۔ کھلر بھی کسی نہ کسی طور سے دا ہیانہ سیمینار کے لئے مفید ثابت ہو سکتے ہوں گے۔ اور رہے پروفیسر گوپی چند نارنگ۔ اُن کے بغیر دہلی یا ہندوستان بلکہ عالمی سطح پر اُردو کی کوئی ادبی تقریب منعقد ہوتی ہے تو اسے معتبر قرار نہیں دیا جاتا۔ اس لئے اُن کا نام شریک کرنے کی مجبوری تھی۔

آخر میں ہم ان چند سیمیناروں کے انعقاد کرانے والوں سے دریافت کرنا چاہیں گے کہ اگر اُن کا ایمان زندہ ہے تو وہ سینے پر ہاتھ رکھ کر بتا دیں کہ ان سیمیناروں سے اُردو کو کونسی تقویت ملی ہے، سوائے اس کے کہ لاکھوں روپیہ چند اداروں اور احباب کی جیب میں چلا گیا۔ یا مفت کے مرغن کھانے کھا لئے گئے۔ اُردو تو بے چاری جہاں تھی وہیں کی وہیں کھڑی ہے۔

اگر ان سیمیناروں کے انعقاد کرانے والوں یا اُن کے کسی ادارے میں یہ سکت ہو کہ وہ ان سیمیناروں کے فوائد بتا سکیں، تو اُن کے ہر بیان کردہ فائدے کے خلاف خادم ہند دلیل کے ساتھ جواب دینے کو تیار ہے۔

غزلیں

وہ جس کے پاس درد کا احساس ہی نہیں
پتھر ہی میں کہوں گا اُسے آدمی نہیں
ہم نے جگر کے خون سے سینچا نہ ہو جسے
ماضی سے حال تک کوئی ایسی صدی نہیں
منزل کی جستجو ہے تو بے شک ہو حوصلہ
منزل کبھی کسی کی طرف خود بڑھی نہیں
سانسوں کی بستیوں کا بھروسہ نہیں کوئی
لمحے کا اس سفر میں کسی کا کوئی نہیں
دنیا ہے آرزو کے سرابوں کا اک ہجوم
جو محوِ آرزو رہے، وہ زندگی نہیں
مٹی ہی کا مدار نہیں ہے مآلِ زیست
ساجد کہاں سبق دانش میں بھی نہیں

ساجد خیرآبادی

کچھ اور مدعا نہیں اس مدعا کے بعد
دشمن پہ بھی جفا نہ ہو کوئی جفا کے بعد
ایمان سے غرض نہ مجھے کام کفر سے
دل اُس کو یاد کرتا ہے یادِ خدا کے بعد
منزل پہ بھی پہنچ کے ہے منزل کی جستجو
گردش ہے یہ بھی گردشِ ارض و سما کے بعد
یہ سوچ کر سکوں کی تمنا ہے بے محل
اک اور بھی جہان ملے گا فنا کے بعد
اُس کو بھی ظلم و جور کی لت پڑ گئی شمیم
ہم بھی دلیر ہوتے گئے ہر سزا کے بعد

شمیم آنولوی

بجھتے ہیں تو وہ فتنوں کو جگا دیتے ہیں
اور اٹھتے ہیں تو اک حشر اُٹھا دیتے ہیں
زہر آلودہ مجھے جام پلا دیتے ہیں
اور پھر کہتے ہیں ہم آبِ بقا دیتے ہیں
ہو نہ جائے کہیں برہم یہ نظامِ عالم
کچھ خبر ہے کسے پھانسی کی سزا دیتے ہیں
تیری رعنائی و زیبائی کی بڑھتی ہے جلا
تیرے انکار وہ تصویر بنا دیتے ہیں
تیری دیوانگی رکھے گی کہیں کا نہ مجھے
مجھ کو انجامِ محبت یہ بتا دیتے ہیں
جب کبھی ظلم سے تو ہاتھ اُٹھا لیتا ہے
ہم دعاؤں کے لئے ہاتھ اٹھا دیتے ہیں
یہ جو یارانِ چمن ہیں انہیں کچھ کوثر
اک ذرا بات کا افسانہ بنا دیتے ہیں

کوثر شاجاپوری

ہندی ادب کے بے لوث خادم

بابو شیام سندر داس

خواجہ وجیہُ الدین

ہندی ادب میں عہد سازی کے جنون سے بے نیاز، جہدِ مسلسل کے قائل اور خاموشی و سنجیدگی کے ساتھ زبان کے گیسو سنوارنے اور سرمایۂ ادب کو قدیم و جدید روشنی سے منور کرنے والے دانشوروں میں بابو شیام سندر داس کا نام سرِ فہرست ہے۔

بابو شیام سندر داس کا ادبی عرصہ پنڈت مہاویر پرساد دویدی کے عہد سے شروع ہو کر آچاریہ رام چندر شکلا کے دور میں ختم ہوتا ہے۔ انھیں ان دونوں ادوار کی ایک اہم کڑی تسلیم کیا جاتا ہے۔ ان کی خصوصیت یہ ہے کہ انھوں نے ان دونوں ہی عہدوں میں اپنی انفرادیت کو برقرار رکھا ہے۔ ان کو جو اہمیت دویدی عہد میں حاصل ہے وہی اہمیت رام چندر شکلا کے دور میں بھی برقرار رہتی ہے۔ اسی لئے ڈاکٹر [illegible] چترویدی نے لکھا ہے:

"بابو شیام سندر داس دویدی عہد کے انشاپردازوں میں خصوصی اہمیت رکھتے ہیں۔ انھوں نے زیادہ تر فکری انشائیے لکھے ہیں۔ ان کے انشائیوں میں منطق کے ذریعے ہدایات کی دکھاوٹ کے ساتھ ساتھ ثبوت بھی فراہم کئے گئے ہیں جس کی وجہ سے ان کے انشائیوں میں فطری رکھ رکھاؤ ملتا ہے۔"

اس ضمن میں ڈاکٹر ساگر پانڈے کی رائے بھی قابلِ توجہ ہے۔ وہ کہتے ہیں:

"دویدی جی کے اصلاحی دور میں بابو شیام سندر داس ایک مصلح کے روپ میں ہندی زبان و ادب کی بیش قیمت خدمت کرتے ہوئے آچاریہ رام چندر شکلا کے عہد میں بھی ایک اہم اور منفرد ادیب کے فرائض انجام دیتے ہوئے نظر آتے ہیں۔"

ان دونوں افراد کی کاوشوں کی وجہ سے ہندی زبان و ادب کی تاریخ کا ایک نیا گوشہ سامنے آتا ہے۔ اور یہ کہا جا سکتا ہے کہ اگر مہاویر پرساد دویدی اور آچاریہ رام چندر شکلا کے ادوار کو متعین کر کے انھیں کوئی ایک نام دینا ہو تو یقیناً وہ نام بابو شیام سندر داس [illegible] کہا جائے گا۔

بابو شیام سندر داس کی زندگی کا [illegible] ادبی خدمات اور قول و فعل [illegible] معلوم ہوتا ہے کہ وہ اپنے ارادے کے [illegible] کے پکے اور [illegible] کے [illegible] باستقلال تھے۔ اسی لئے وہ [illegible] کرنے میں کامیاب رہنے کے باعث [illegible] کی تاریخ میں [illegible] وہ مستحق ہے۔ [illegible]

پرساد و خطرناکی کی [illegible] سے نہیں بچایا جا سکتا ہے۔

"جب بابو شیام سُندر داس نے ناگری پرچارنی سبھا کے ذریعہ رمیش چندر دت کی لکھی ہوئی کتاب "اینشینٹ سولائزیشن آف انڈیا" کا ترجمہ شائع کرنا شروع کیا، تب ہمارا اُن کے ساتھ اختلاف ہو گیا۔ ہم اُن کے نقطۂ نظر کے بالکل مخالف تھے، کیونکہ ایسی کتاب کی ترویج و اشاعت ہمارے خیال میں نوجوانوں کے دماغوں میں آریائی تہذیب کے لئے نفرت پیدا ہونے کے علاوہ اچھے خیالات نہیں پیدا کر سکتے تھے۔ اس موضوع پر ہماری اُن کی خط و کتابت بہت دنوں تک ہوتی رہی۔ اپنے خطوں میں بابو شیام سُندر داس نے اس کتاب کی اشاعت کی ضرورت اور افادیت سے ہمیں آگاہ کرنے کی بھرپور کوشش کی، لیکن بدقسمتی سے اُن کی منطق ہماری سمجھ میں نہ آئی۔ تب ہم نے اپنے موقف کی اشاعت "ہمالیہ" میں مضامین لکھ کر کی۔ ان مضامین پر بحث و مباحثہ کاشی کے [illegible] تک ہی محدود نہ رہا بلکہ بمبئی کے مشہور سماچار پتر میں بھی ہوا، لیکن بابو شیام سُندر داس نے اپنا موقف نہیں بدلا اور ہمیں سبھا سے رشتہ توڑنا پڑا۔"

اس اقتباس سے بخوبی اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ اُن کے متعلق یہ ریمارک اُن کے کسی ہم نوا کا نہیں بلکہ اُن کی مخالفت کرنے والے اُن کے ہم عصر ادیب کا ہے، جو تحریر و تقریر کے ذریعہ اُن کی مخالفت کرتا ہے جس سے ہم بھی اور عوام بھی متأثر ہوتے ہیں لیکن شیام سُندر داس بھی اپنی کوششوں یا فکر میں موقف اور ادارہ میں ردّ و بدل نہ کر کے اپنی [illegible] اپنی ادبی دیانتداری اور قوتِ فیصلہ اور اُس کے احترام کا ثبوت پیش کرتے ہیں۔

ایسے موقعوں پر یہ دیکھا گیا ہے کہ جب کسی ہم عصر سے کوئی اختلاف ہو جاتا ہے اور مخالف پے در پے حملے کرتا ہے تو اس کے لئے دل میں ایک دراڑ سی پیدا ہو جاتی ہے جسے بغض کا نام دیا جا سکتا ہے جو ادبی دیانتداری کے راستے میں رکاوٹ پیدا کرتا ہے۔ لیکن ایسے نازک موقعہ پر بھی شیام سُندر داس نے ہمیشہ فراخدلی اور ادبی دیانتداری کے راستے کو چھوڑا نہیں ہے۔ جب ہی تو دوارکا پرساد سے اس قدر مخالف ہونے کے باوجود انھوں نے موقعہ پڑنے پر کبھی فراموش نہیں کیا۔ اسی لئے دوارکا پرساد خود لکھتے ہیں:

"بابو شیام سندر داس سے اختلاف ہو جانے کے بعد ہم تو اُن سے رشتہ توڑ بیٹھے تھے لیکن انھوں نے موقعہ پڑنے پر ہمیں فراموش نہیں کیا اور انڈین پریس کی "سرسوتی سیریز" اور منورنجن گرنتھ مالا کی اشاعت کے وقت برابر انھوں نے ہمیں یاد کیا۔"

اس اقتباس سے ایک طرف تو اُن کی حقیقت پسندی سامنے آتی ہے اور دوسری طرف یہ بھی پتہ چلتا ہے کہ انھوں نے ادب کی خدمت کے راستے میں کبھی ذاتیات کو حائل نہیں ہونے دیا۔ اور ہمیشہ وہی لکھا جو سچائی کی کسوٹی پر کھرا اُترا۔ اُن کے مقبولِ عام نہ ہونے اور مخالفت کی جانے کی ایک وجہ کا اشارہ پریم چند کی تصنیف "جیسا ہم نے دیکھا" سے بھی ملتا ہے۔ وہ لکھتے ہیں:

"جب کبھی بات چیت کرنے کا موقع ملا تب گفتگو کا موضوع ہندی ادب ہی ہوتا تھا۔ اُن کی بات چیت سے عصری ہندی ادب کی ترقی اور ہندی ادیبوں کا مخصوص تعاون حاصل ہوا کرتا تھا۔ اُن کے وقت کی ناگری پرچارنی سبھا کی سالانہ رپورٹ کے تحت اس وقت کے اخبارات کی سمت و رفتار سے متعلق نوٹ سے اخبارات میں چھپ چھپ جایا کرتی تھی۔ سبھا اور اس کی ترقی کی خاص وجہ تھے بابو شیام سُندر داس سے جڑنے والے افراد سبھا کے کاموں پر تنقید کرتے ہوئے بابو شیام سُندر داس کو بھی ادھر گھسیٹتے تھے۔ لیکن جہاں تک مجھے یاد ہے شیام سُندر داس نے ایسے افراد کے اعتراضات کو بھی اپنے پاؤں کی زنجیر نہیں بننے دیا۔ بھلے ہی اُن کا کتنا ہی نقصان کیوں نہ ہوا ہو۔"

اس طرح کے اختلافات کا مقابلہ کرتے ہوئے ہندی ادب کے بے لوث خدمت انجام دینے والے سنجیدہ اور خلیق مدیر اور دانشور کو اس بات کی فکر ہی نہ تھی کہ اس کے نام سے ہندی ادب کی تاریخ میں کسی عہد کو موسوم کیا جائے کیونکہ انھوں نے اپنی شخصیت کو کسی خاص عہد اور فکر سے اوپر اٹھا کر ہمیشہ ایک یونیورسل شخصیت بنانے کی کوشش کی تھی۔ جس سے کہ وہ ہندی زبان و ادب کو دنیا کے کونے کونے میں پھیلا سکیں۔

ہندی ادب کے اس بے لوث خادم کا جنم پنجابی کھتری خاندان میں ۱۸۷۵ء کو ہوا تھا۔ اُن کے والد کا نام دیوی داس اور والدہ کا نام دیوکی دیوی تھا۔ ان کی ابتدائی تعلیم مشن اسکول میں کچھ عرصہ تک حاصل کرنے کے بعد وہ ہنومان سیمینری اسکول میں داخل ہو گئے۔ وہاں سے انھوں نے [illegible] میں [illegible] مڈل امتحان پاس کرنے کے بعد [illegible] میں داخلہ لیا۔ [illegible] میں اس کالج سے انٹر

اور ۱۸۹۶ء میں انٹرمیڈیٹ کے امتحانات پاس کیے۔ اس وقت اعلیٰ تعلیم حاصل کرنے کے لیے کاشی میں کوئی انتظام نہ تھا۔ اس لیے وہ بی اے کرنے کے لیے پریاگ یونیورسٹی گئے۔ لیکن بوجہ علالت وہاں سے بی۔ اے مکمل نہ کر سکے اور انھیں کاشی واپس لوٹنا پڑا۔ اتفاق سے انھیں دنوں کاشی میں کوئنس کالج میں بی۔ اے درجات کی تعلیم کا آغاز ہوا۔ آپ نے ۱۸۹۷ء میں کوئنس کالج سے بی اے مکمل کیا۔

بی۔ اے کا امتحان پاس کرنے کے بعد وہ اور اعلیٰ تعلیم حاصل کرنا چاہتے تھے، لیکن معاشی حالات موافق نہ ہونے کی وجہ سے انھیں اپنے اس ارادے کو ترک کرکے ملازمت کا راستہ اختیار کرنا پڑا۔ سب سے پہلے انھوں نے کاشی کے چندر پربھا پریس میں چالیس روپے ماہوار پر ملازمت اختیار کی لیکن وہاں کام کرنے میں ان کی طبیعت نہ لگی۔ اس لیے کچھ مہینوں تک وہاں کام کرنے کے بعد ۱۸۹۹ء میں وہ ہندو اسکول میں بحیثیت مدرس ملازم ہو گئے۔

ان کے مطالعے، تجربے اور تدریسی انتظامی صلاحیتوں کو پہچانتے ہوئے گنگا پرساد ورما نے انھیں ۱۹۱۳ء میں لکھنؤ کے کالی چرن اسکول جو کہ اب ڈگری کالج ہو چکا ہے، میں ہیڈ ماسٹر کے منصب پر فائز کیا جہاں وہ ۱۹۲۱ء تک حسن و خوبی کام کرتے رہے۔ اسی دوران کاشی میں وشو ودیالیہ میں ہندی زبان اور ادب کی اعلیٰ تعلیم کی تجویز پاس ہوئی۔ اسے کامیاب بنانے کے لیے ۱۹۲۱ء میں ہی بابو شیام سندر داس نے کاشی وشو ودیالیہ جوائن کیا اور اسی پلیٹ فارم سے ہندی زبان و ادب کی نمایاں خدمات انجام دیتے ہوئے اگست ۱۹۴۵ء میں ان کا انتقال ہوا۔

کاشی وشو ودیالیہ میں ہندی ڈپارٹمنٹ کے سربراہ کی حیثیت سے انھوں نے ہندی زبان اور ادب کی اعلیٰ تعلیم کے لیے نہ صرف درس و تدریس اور تحقیق کے جوہر دکھلائے، بلکہ درسی کتب کی ترویج و اشاعت کی سمت میں بھی جو کارہائے نمایاں انجام دیے ان کی وجہ سے بھی وہ ہندی زبان و ادب کی تاریخ میں ہمیشہ یاد کیے جائیں گے۔

کاشی وشو ودیالیہ میں انھوں نے اپنی صلاحیتوں کا استعمال کرتے ہوئے ہندی زبان و ادب کے سنجیدہ مطالعہ کی ایک ایسی روح پھونک دی کہ جو لوگ صرف مغربی ادبیات کی تعلیم کو ہی سرمایۂ افتخار سمجھتے تھے، وہ بھی ہندی تعلیم کی طرف متوجہ ہوئے اور دُور دراز سے ہندی کی اصلی تعلیم حاصل کرنے کے لیے لوگ اس یونیورسٹی میں جمع ہونے لگے۔ ان میں وہ ادیب اور دانشور بھی شامل ہیں جنھوں نے آگے چل کر ہندی زبان و ادب کی تعمیر و ترقی میں نمایاں کردار ادا کیا۔ ایسے افراد میں پنڈت نند دلارے باجپئی کا نام خصوصی طور سے لیا جا سکتا ہے، جو کہ بابو شیام سندر داس کے چہیتے شاگرد رہے۔

ان کی ان خدمات کا صلہ انھیں ہندی زبان و ادب کی تاریخ میں تو نمایاں طور سے مل سکا، لیکن ہندی ساہتیہ سمیلن نے ۱۹۳۳ء میں انھیں اپنی سب سے اعلیٰ ڈگری "ساہتیہ واچسپتی" سے نواز کر اپنی ہندی دوستی اور سرپرستی کا ثبوت فراہم کیا اور ان کے سبکدوش ہونے کے بعد کاشی ہندو یونیورسٹی نے بھی ان کو اپنی ڈی۔ لٹ کی اعزازی ڈگری سے نوازا۔ اس وقت کی انگریزی سرکار نے بھی انھیں ۱۹۲۷ء میں "رائے صاحب" کا خطاب عطا کیا تھا۔

ہندی زبان اور ادب کی خدمت کے جذبے سے معمور شیام سندر داس نے سب سے پہلے اس کی تبلیغ اور منظم پیروی کے لیے گریٹ برٹین اور آئرلینڈ کی رائل ایشیاٹک سوسائٹی کے طرز پر اپنے کچھ نوجوان ساتھیوں کی مدد سے کاشی میں ناگری پرچارنی سبھا کی بنیاد ڈالی جس کی ممبری اس وقت باعث افتخار بات سمجھی جاتی تھی۔ اسی سبھا کے ذریعے انھوں نے ہندی زبان و ادب کی ترویج و اشاعت کے لیے [illegible] ادب میں دلچسپی رکھنے والے افراد کو ایک پلیٹ فارم مہیا کرنے کا تاریخ ساز کام انجام دیا۔ یہ سبھا آج بھی ان کی مقرر کردہ پالیسی پر گامزن ہندی زبان و ادب کی خدمت میں نمایاں طور سے مصروف ہے۔

دراصل بابو شیام سندر داس ایک ایسے روشن خیال، ذی علم، دانشمند ہندی دانشور تھے جن کے سامنے سنسکرت اور انگریزی ادبیات خصوصیات کے ساتھ جلوہ گر تھے۔ وہ ان کی بیش بہا سرمائے اور ان کی خوبیوں سے اچھی طرح واقف تھے۔ اس لیے انھوں نے ان کا گہرا مطالعہ اور تجزیہ کرکے ان سے استفادہ کرکے ہندی ادب کو اونچا مقام دلانے کی سعی کی جس کا ثبوت ان کی تصانیف ساہتیہ لوچن، بھاشا وگیان، ہندی بھاشا کا [illegible] ہیں جن میں ان کے مطالعے کے ساتھ ساتھ ان کی تخلیقی صلاحیتیں، لسانی معلومات اور ادبی تنقیدی نقطۂ نظر کی جھلکیاں دکھائی دیتی ہیں۔

انھوں نے اپنی تصنیف "ساہتیہ لوچن" کے ذریعہ ہندی ادب کے افق پر ایک ایسے سورج کو طلوع کیا جس کی کرنوں سے ہندی ادب میں تحقیق کرنے والوں کی رہنمائی کی۔ دراصل انھوں نے یہ تصنیف یونیورسٹی کی تعلیم کے لیے پیش کی تھی جس میں ادبی تنقید کے اصولوں پر بڑی تفصیل کے ساتھ بحث کی گئی تھی۔ اس سے ہندی ادب کو ایک نئی سمت ملی۔ اسی لیے ان کی اس تصنیف کی اہمیت کا ذکر کرتے ہوئے ڈاکٹر [illegible] نے لکھا ہے:

> "بابو شیام سندر داس کی تصنیف "ساہتیہ لوچن" کے بعد اسی طرز میں اس سے استفادہ کرتے ہوئے ہندی ادب میں متعدد گرنتھ لکھے گئے جن میں [illegible] بھاشا وگیان اور ہندی [illegible]

کا اس ان کی لسانیات سے متعلق تصانیف میں [illegible] مختلف لسانی اصولوں [illegible] ہوئے اس بات کی کوشش کی ہے کہ ہندی لسانیات میں انھیں اصولوں کو اپنایا جائے جن سے ہندی زبان کی انفرادیت قائم رہے۔ اس لئے وہ لکھتے ہیں:

"جب ہم غیر ملکی الفاظ کا استعمال کریں تو انہیں ایسا بنا لیں کہ ان میں سے غیر ملکی پن نکل جائے اور وہ ہمارے اپنے ہو کر ہماری ثقافت اور تہذیب کا جزو بن جائیں۔

جب تک ان کے اس تلفظ کو زندہ رکھ کر ہم ان کے پہلے کے روپ تک کو باقی بنائے رہیں گے، تب تک وہ ہمارے اپنے نہ ہوں گے اور ان کو قبول کرنے میں ہمیشہ کھٹک اور رکاوٹ بنی رہے گی۔"

ان معرکۃ الآرا تصانیف کے علاوہ انھوں نے بے شمار انشائیے اور مضامین بھی لکھے جو بیس سے کچھ کم رسالوں کے نام سے ناگری پرچارنی سبھا کی طرف سے شائع ہوئے، لیکن ان کے زیادہ تر انشائیے اور مضامین درسی ریڈروں کی زینت بنے جو ہندی زبان و ادب کی تاریخ میں سنگ میل کی حیثیت رکھتے ہیں۔

بابو شیام سندر داس کے انشائیے اپنے فکری عکس و آہنگ کی وجہ سے تعلیم کے ساتھ ساتھ ادب میں بھی بہت اہم تسلیم کئے جاتے ہیں۔ ان انشائیوں میں ان کی شخصیت اور انفرادیت جھلکتی ہوئی دکھائی دیتی ہے۔ ان تخلیقی کارناموں کے علاوہ انھوں نے تنقیدی اور تحقیقی خدمات بھی انجام دیں۔ ان کے وقت میں تنقید کی جو شکل رائج تھی، وہ غیر سائنسی یا دو رنگی کا مرقع تھی۔ انھیں سے مولی اور ادبیات کے مطالعہ کے ذریعے ہندی ادب میں عملی تنقید کو رواج دیا۔

انہیں کے ذریعے سب سے پہلے ہندی ادب میں مختلف شعراء کی تخلیقات کی تنقید سے عملی تنقید کے خد و خال متعین ہوئے جس سے شعراء کی تخلیقات کے ساتھ ساتھ ان کی ذہنی کیفیات کو سمجھنے میں بھی کافی مدد ملی۔ انہوں نے متعدد ہندی رسالوں اور قدیم تصانیف کی ترتیب اور تحقیق میں بڑی عرق ریزی سے کی ہے۔ ہندی رسالوں کے ذریعے جہاں انھوں نے ہندی زبان کو عام کرنے کی کامیاب کوشش کی وہاں انھوں نے قدیم تصنیفات کی اپنی ایڈیٹنگ کے ذریعے ہندی ادب میں بھی چار چاند لگائے ہیں۔

بابو شیام سندر داس کی زبان خالص کھڑی بولی ہے جو سنسکرت سے بہت زیادہ متاثر ہے۔ اس میں انگریزی، اردو اور دوسری زبانوں کے الفاظ کا بھی استعمال ہوا ہے لیکن یہ استعمال اتنا کم ہے کہ سنسکرت کی دھوم دھام میں ان کا پتہ نہیں چلتا ہے۔ وہ چونکہ دوسری زبانوں کے الفاظ کا استعمال کرتے وقت ان کے ہندی کرن کے حامی تھے اس لئے سنسکرت کے الفاظ کا استعمال کرتے وقت بھی وہ اپنے

گیت

اے جانِ تمنا جانِ جگر، تم جانے کب تک آؤ گے
خاموش ہے میرے دل کا نگر، تم جانے کب تک آؤ گے

اب دل کا چمن شاداب نہیں، شبنم میں بھی آب و تاب نہیں
آنکھوں کو میسر خواب نہیں، بے نور ہوا ہر اک منظر
تم جانے کب تک آؤ گے

یہ دردِ محبت سہہ سہہ کر، روداد جدائی کہہ کہہ کر
تم جاؤ گے آنسو بہہ بہہ کر، ہے چشمِ تمنا جانبِ در
تم جانے کب تک آؤ گے

شمعِ احساس جلائے ہوئے، تخئیل کی بزم سجائے ہوئے
اس دل کو یونہی بہلائے ہوئے، میں دیکھ رہا ہوں راہ مگر
تم جانے کب تک آؤ گے

کچھ اپنوں میں بیگانہ صفت، جگنو کی طرح پروانہ صفت
مستانہ صفت دیوانہ صفت، راتوں کو کبھی پچھلے پہر
تم جانے کب تک آؤ گے

اک بارِ گراں گزرا ہر دن، ہر رات گنی تارے گن گن
اے میرے صنم میرے محسن، ہے دل کو یقیں آؤ گے مگر
تم جانے کب تک آؤ گے

رعنائی بکھرنے والی ہے، تقدیر سنورنے والی ہے
اب رات گزرنے والی ہے، ہونے کو ہے آغازِ سحر
خاموش ہے میرے دل کا نگر
تم جانے کب تک آؤ گے

معظم صدیقی



اسی رویے پر قائم ہے اور سنسکرت کے الفاظ میں بھی ضرورت کے مطابق ردّ و بدل کرکے انھوں نے اُن کا بھی ہندی کرن کیا ہے جس سے وہ الفاظ ہندی زبان کے اپنے الفاظ معلوم پڑتے ہیں ۔

ان کے اسلوب میں اُن کے مزاج اور شخصیت کا بھرپور پرتو ملتا ہے۔ اس سے بھی اُن کی انفرادیت منہ سے بولتی ہوئی معلوم پڑتی ہے۔ انھوں نے مشکل موضوعات پر لکھتے وقت چھوٹے اور آسان اور عام مضامین میں نسبتاً بڑے جملوں کا استعمال کیا ہے۔ ان کے یہاں کہاوتوں اور محاوروں کا فقدان ملتا ہے ۔

ہندی زبان کو وسعت دینے اور اس کے ذریعے اپنے موضوع کا اچھی طرح احاطہ کرنے کے لیے انھوں نے اپنے خیالات کو بار بار دُھرانے اور انھیں جمع کرنے کی بھی سعی کی ہے۔ اس طرح انھوں نے جذبات و خیالات کی ترسیل میں پوری ذمہ داری کا ثبوت پیش کرتے ہوئے اس امر کا پوری طرح سے دھیان رکھا ہے کہ اس میں کہیں بھی موضوع سے دُوری اور مصنوعیت جیسے عیوب پیدا نہ ہونے پائیں۔ ان کے اسلوب میں فکر اور تحقیق توازن برقرار رہا ہے۔

ماہیا

دیپک قمر



یہ بوجھ ہے من پر ہی
ہیں سوانگ بہت باقی
اب رات ہے تل بھر ہی

دوہرانے سے کیا ہوگا
چاہت ہے وہی دھوکا
پھر کھانے سے کیا ہوگا

دن رات پکاریں گے
بہروں کے نگر میں وہ
آواز اُتاریں گے

ہر چیز کو کھونے سے
کافی ہے بہت تھوڑا
بہتر ہے نہ ہونے سے

من خالی کبھی کر لیں
ہے بھیڑ صداؤں کی
چُپّی کی خوشی بھر لیں

ہونے کو ہوا کیا ہے
چنتا یا خوشی کیسی
یہ ایسے ہی چلتا ہے

وہ تن تھا مگر اُس میں
دیکھا تو نہیں تھا وہ
اوروں کا تھا مگر اُس میں

مغرور سجاوٹ سے
خالی سا یہ غبارہ
پھولا ہے بناوٹ سے

پیوند لگانے کو
یہ موت ہی جوڑے گی
کچھ پھول کھلانے کو

انکار بھی دعوت ہے
نظروں میں جھجکتی سی
کم بیں سی محبت ہے

چھوڑے گی خدائی کب
تنہائی کے بندھن سے
پائیں گے رہائی کب

جائے گی کہاں اُڑ کر
پنکھوں نے جہاں چھوڑا
بیٹھی ہے وہاں اُڑ کر

سورج مکھی

شام بارک پوری

ننھا عمران ساحل کی ریت پر بیٹھا حسرت سے دور تک پھیلے ہوئے بحر بیکراں کو دیکھ رہا تھا۔ جس کے سینے کے سربستہ راز کو آج تک انسان نہ پا سکا تھا۔ اس ترقی یافتہ دور میں انسان کی رسائی چاند، سورج اور دوسرے سیاروں تک ہو گئی ہے۔ تسخیر کائنات میں روز بروز اضافہ ہو رہا ہے، سمندروں کو کھنگالا جا رہا ہے۔ مگر سمندر پر اختیار اس کی استطاعت سے باہر ہے۔ ٹھاٹھیں مارتا ہوا سمندر اپنی عظمت، قدرت اور بے پناہ قوت کا مظہر ہے جس کے سامنے انسان ایک تنکے کی حیثیت رکھتا ہے۔

پانچ برس کا عمران پراجکٹ انجینئر وجاہت حسین کا بیٹا تھا۔ ہوش کہانی میں وجاہت حسین کا تبادلہ ہو گیا تھا۔ وہ اپنی بیوی برجیس اور بچے کے ساتھ یہاں چند روز قبل آیا تھا۔ اسے رہائش کے لئے پہاڑی پر بنگلہ ملا تھا۔ سرسبز اونچی پہاڑیوں میں گھرا ہوا، بنگلہ زمرد کا ٹکڑا لگتا تھا۔ ہر طرف سبزہ ہی سبزہ تھا۔ ہوا میں جھومتے ہوئے ناریل کے درخت، لہلہاتے کھیت، دھان سے لدی ہوئی بالیوں کے جھرمٹ، بانسری کی دلدوز اور مسرت آمیز تانیں مسحور کن تھیں۔ جب سمندر کی موجیں ساحل سے آکر سر پٹختیں، تو وہ ترنم اور نغمگی سے پُر ہوتیں۔ جیسے انھوں نے محبوب کے وصال دائمی کے گیت گائے ہوں۔

عمران کا اسکول میں داخلہ ہو گیا تھا۔ اس کی نگہداشت کے لئے ایک آیا ماریا کو رکھ دیا تھا ماریا مقامی عیسائی تھی۔ اس کے آنے سے پہلے ہی سنی کا بار تھا۔ دو ماہ قبل اس چھریرے بدن اور گندمی رنگ کی عورت کے شوہر کا انتقال ہو چکا تھا۔ صبح سویرے وہ اپنے شیر خوار بچے کو پڑوسی کے پاس رکھ کر عمران کے پاس آجاتی۔ منہ ہاتھ دھلا کر اسے ناشتہ کراتی، کپڑے پہنا کر اسکول چھوڑ آتی۔ پھر گھر کے کام کاج میں لگ جاتی۔ برجیس کا پاؤں بھاری تھا اس لئے ڈاکٹر نے اسے کام کاج کرنے سے منع کر رکھا تھا۔

وجاہت حسین اس جزیرے میں الگ تھلگ زندگی گزارنا چاہتا تھا۔ ڈھاکے ہی میں اس نے محسوس کر لیا تھا کہ صوبائی عصبیت کی چنگاری بھڑک اٹھی ہے۔ لوگوں میں نفاق کا بیج پنپ رہا ہے۔ اس لئے اس نے اپنے آپ کو لئے دیئے رہنے میں عافیت سمجھی۔ دوسروں سے راہ و رسم بڑھانے پر نئی کا زہر پھیلنے کا اندیشہ تھا۔ اس نے اپنے پراجکٹ، بیوی بچے کے سوا کسی سے تعلقات نہیں بڑھائے تھے۔ عمران کو بھی سختی سے ہدایت کر دی تھی کہ اسکول میں لڑکوں سے زیادہ ربط ضبط نہ بڑھائے۔ اسکول سے چھٹی ہونے پر عمران سیدھا گھر چلا آتا۔ پھر گھر سے باہر قدم نہ نکالتا۔ وجاہت حسین کا رویہ بہت محتاط تھا اور وہ اس پر سختی سے عمل کر رہا تھا۔

ننھا عمران اسکول میں تمام لڑکوں سے بالکل

اُلگ تھلگ اور چپ چاپ رہتا۔ اس کا نہ کوئی دوست تھا اور نہ ہی ساتھی۔ کھیل کود میں حصہ نہیں لیتا۔ تفریح میں جب لڑکے بھاگ دوڑ اور اُودھم مچاتے، وہ کسی درخت کے سائے میں بیٹھا اپنی کتابیں پڑھتا یا سمندر کی لہروں کا شور سنتا۔ لڑکوں کے لیے اس کا رویہ عجیب سا تھا۔ لڑکے اس سے بے تکلف ہونا چاہتے، مگر وہ کسی کو منہ نہ لگاتا۔

آج اسکول میں چھٹی ہونے کے بعد وہ سیدھے سمندر کے کنارے چلا گیا۔ سرسراتی ہوئی ٹھنڈی ہواؤں اور موجوں کے جلترنگ سے لطف اندوز ہو کر واپس جا رہا تھا کہ راستے میں ہم جماعتوں سے مڈبھیڑ ہو گئی۔

ایسا لگ رہا تھا کہ لڑکے اس کی راہ تک رہے تھے۔ اسے دیکھ کر مسرت سے چیخ پڑے۔

"عمران آج تمہیں بتانا ہی پڑے گا۔" ایک لڑکا اس کی راہ میں حائل ہو گیا۔

"کیا؟" اس نے حیرت سے اُن کی طرف دیکھا۔

"تمہاری خاموش طبیعت سے ہمیں کوفت ہوتی ہے۔ آخر تم ہمارے ساتھ کھیل کود میں شرکت کیوں نہیں کرتے؟" سہیل نے پوچھا۔

"تم لوگوں کو میں بتا نہیں سکتا۔" عمران نے بیچارگی سے کہا۔

"کیوں نہیں بتا سکتے؟ ہم تمہارے ہم جماعت ہیں۔" سید علی نے کہا۔ "تمہیں کوئی تکلیف ہوگی تو ہم اُسے دُور کریں گے۔"

"ابو جان نے منع کر رکھا ہے۔" وہ مشکل بتا سکا۔

"آخر کیوں؟" سہیل نے سوال کیا۔

"اس لیے کہ ہم مہاجر ہیں۔" اس نے سادگی سے کہا۔

"تو کیا ہوا؟" ضمیر الدین اس سے اُلٹا پوچھ بیٹھا۔ "کیا مہاجر کے ساتھ رہنا گناہ ہے۔"

"میں یہ سب نہیں جانتا۔ ابو نے سختی سے تنبیہ کی تھی کہ میری وجہ سے کہیں کوئی رنجش نہ پہنچے۔"

"ہمارے ہاں مل جل کر رہنا، بھائی بھائی اور کھیل کود کرنے سے رنجش کیسے پیدا ہوگی؟" سہیل نے تعجب سے کہا۔

"ابو کہہ رہے تھے کہ بہاری، بنگالی ایک دوسرے سے نفرت کرتے ہیں۔" وہ معصومیت سے بولا۔ "اس لیے دُور دُور رہنا چاہیے۔ آپس میں کوئی بات ہو گئی تو خواہ مخواہ جھگڑا ہو جائے گا۔"

"یہ تو عجیب بات ہے۔ ہم نہیں مانتے۔" لڑکوں نے یک زبان ہو کر کہا۔

"مجھے جانے دو۔ دیر ہو رہی ہے۔ میری امی انتظار کر رہی ہوں گی۔ وہ پریشان ہو کر مجھے تلاش کرنے نہ نکل پڑیں۔"

عمران کتابوں کا بستہ کندھے پر لٹکائے اُن سے رخصت ہوا۔ لڑکے حیرانی سے اُسے جاتا دیکھ رہے تھے۔ اُس کی بات اُن کے پلے نہ پڑی۔

دُوسرے دن اسکول میں میلاد تھی۔ لڑکوں نے مولوی صاحب پر سوالات کی بوچھاڑ کر دی۔

"اسلام دُنیا کے تمام انسانوں کو برابری کا پیغام دیتا ہے۔ اسلام آفاقی ہے۔ تمام مسلمان آپس میں بھائی بھائی ہیں۔ خدا کے بندے اور رسول کی اُمت۔" مولوی صاحب نے جتایا۔ "ہمارا مذہب آپس میں بیر رکھنا نہیں سکھاتا۔"

"بنگالی بہاری کیا ہوتا ہے؟"

"یہ جنوں ہے عصبیت کی ایک شکل ہے۔ یہ زہر اُن کا پھیلایا ہوا ہے۔" مولوی صاحب سنجیدگی سے بولے۔ "تم لوگ گھل مل کر بھائی چارگی سے رہو۔ اللہ تعالیٰ نے اخوت اور مساوات کی تلقین کی ہے۔"

اس دن سے تمام بچے مل کر کھیلنے لگے۔ رفتہ رفتہ عمران اور سہیل کی دوستی ہو گئی۔ دونوں اسکول سے ساتھ لوٹتے، پہاڑی کے نیچے جا کر اپنے اپنے گھروں کو چلے جاتے۔ سہیل کا مکان پہاڑی کے دامن میں تھا۔ اس کا باپ فیروزہ فیکٹری میں کلرک تھا۔ جب وہ گود میں تھا تو اس کی امی کا انتقال ہو چکا تھا۔

ایک شام جب سورج مغرب کی طرف رواں دواں تھا، بادِ نسیم کیوڑا کو گدگدا گئی۔ فضا میں خوشبو رچی ہوئی تھی۔ عمران کی سالگرہ تھی۔ اس دن وہ اسکول نہیں گیا تھا۔ وجاہت بازار سے کیک، بسکٹ، کیلے اور کھانے کے لوازمات لے آیا تھا۔ تینوں افراد کے درمیان سالگرہ کا کیک کاٹا ہی تھا کہ اچانک بچے شور مچاتے ہوئے بنگلے میں داخل ہوئے۔ دیکھتے ہی دیکھتے کمرہ بچوں سے بھر گیا۔ تمام بچے اس کی سالگرہ میں شرکت کے لیے آئے تھے۔ کسی کے ہاتھ میں گلدستہ تھا، کوئی سیپ کی ننھی منی مورتی، کوئی گھونگھے کے کھلونے، کوئی ہاتھوں کی بنی ہوئی ٹوکری لایا تھا۔ وجاہت حسین اور پروین نے بچوں کو ہاتھوں ہاتھ لیا۔ بچوں کے پیار اور اپنائیت سے ان کی پلکوں پر خوشی کے ستارے جھلملانے لگے۔ مسرت کی اس گھڑی میں دوستوں کی رفاقت عمران کے لیے طمانیت کا باعث تھی۔ وہ خوشی سے سرشار ہوا جا رہا تھا۔

"انکل ہم اپنی مرضی سے آئے ہیں۔ کیا آپ ہمیں سالگرہ میں شرکت کرنے نہیں دیں گے؟" ضمیر الدین نے معصومیت سے پوچھا۔

"عمران کی خوشی ہماری خوشی ہے۔" سہیل نے کہا۔

"کیوں نہیں ــــ تمہاری آمد میرے لیے باعثِ مسرت ہے۔" بچوں کے خلوص و محبت سے وہ بے حد متاثر ہوئے۔

وجاہت حسین نے اپنے بیٹے کی سالگرہ پر اُسے پانچ موتی کی مالا دی۔ یہ موتی یہاں کے سمندر سے نکالے جاتے ہیں۔ عمران نے کیک کاٹا۔ دوستوں نے تالیاں بجا کر اپنی مسرت کا اظہار کیا۔

"انکل آپ عمران کو ہمارے ساتھ کھیل کود سے منع کیوں کرتے ہیں؟" سہیل کے اس اچانک سوال سے وہ چونک گئے۔

"ایسی بات نہیں ــــ احتیاطاً میں نے پابندی لگا رکھی تھی۔"

"ہم بھائیوں کی طرح رہیں گے۔" سہیل

نے چونک کر کہا۔

بچوں کے پیار اور جذبے نے وجاہت حسین کے ذہن پر چھائی ہوئی تلخی کی کثافت دھو دی۔ بچے، جو پھولوں کی طرح نازک اور معصوم ہوتے ہیں، دُنیا کی تنگ نظری کو نہیں سمجھتے ہیں ایسے پھولوں کی تازگی اور نکھار دیکھنے سے انسان کے دل میں کانٹا چبھ جاتا ہے۔

"ہماری دوستی سے آپ کو تکلیف ہوتی ہے؟" سہیل نے پوچھا۔

"نہیں بیٹے ـــــ تم لوگوں کا خلوص دیکھ کر میں یہ سوچنے پر مجبور ہو گیا ہوں کہ ابھی دُنیا میں انسانیت اور محبت باقی ہے۔" وجاہت اپنے اندر ایک تازگی، ایک نیا پن محسوس کر رہا تھا، جیسے خلوص کے صدقے سے پیار کا گوہر مل گیا ہو۔

یہ سالگرہ ان کی زندگی میں نیا پیغام لے کر آئی۔ دل نورِ محبت سے معمور ہو گیا تھا۔ اُخوت، بھائی چارگی اور خلوص کا سورج نکلی جس پر سورج کی تیز کرنیں پڑنے سے اور بھی نکھار آ جاتا ہے۔

اس دن سے تمام بچے بلا روک ٹوک پوری آزادی سے کھیل کود میں مصروف ہو گئے۔

ایک بار عمران اور سہیل پہاڑی کے نیچے کھیل رہے تھے۔ ان کا آپس میں جھگڑا ہو گیا۔ سہیل نے عمران کو ایک گھونسہ لگا دیا اور عمران نے اس کا منہ نوچ لیا۔ دونوں گتھم گتھا ہو گئے۔ پھر روتے منہ بسورتے اپنے اپنے والد کے پاس شکایت کرنے لگا۔

"انجینئر صاحب!" فیروز نے بنگلہ کے باہر سے وجاہت حسین کو آواز دی۔ وہ سہیل کی انگلی پکڑے باہر کھڑا آگ بگولہ ہو رہا تھا۔

"کون ہے؟" وجاہت عمران کو گود میں اُٹھائے باہر نکلا۔ پرجبیں بھی برآمدے تک آئی۔ عمران کی ناک پھول گئی تھی۔ سہیل کا چہرہ سوج گیا تھا۔

"آپ نے اپنے لڑکے کی حرکت دیکھی ـــ میرے بیٹے کی کیا دُرگت بنا دی ہے۔" فیروز ناراضگی سے بولا۔

"آپ کے بیٹے نے میرے عمران کو بھی مارا ہے۔ یہ دیکھیئے اس کی ناک پر کو بڑ نکل آیا ہے۔" اس نے عمران کو اس کے سامنے کر دیا۔ دونوں بچے سامنے کھڑے ایک دوسرے کو گھور رہے تھے۔

"میں کہتا ہوں آپ اپنے بچے کو سنبھالئے ورنہ ایک دن مصیبت کھڑی کر دے گا۔" فیروز کا غصّہ سرد نہ ہوا تھا۔

"فیروز صاحب غصّہ تھوک دیجئے۔ بچے آپس میں لڑتے ہی ہیں۔ اس سے ہمیں بدگمان نہیں ہونا چاہیئے۔" وجاہت نے سمجھانا چاہا۔

"اس کا یہ مطلب نہیں کہ میرا لڑکا کمزور یا کمتر ہے۔ اپنے بیٹے کو کنٹرول کریں۔" وہ تیز آواز میں بولا۔

ان میں بحث و تکرار ہو رہی تھی کہ اچانک پرجبیں چیخ پڑی۔

"عمران کہاں ہے؟"

"ارے سہیل بھی غائب ہے۔" فیروز بھی چونک پڑا۔

دونوں کے والد اپنے اپنے بچوں کو تلاش کرتے ہوئے پہاڑی سے نیچے اُترے۔ راستے میں جگہ جگہ چھوٹے چھوٹے قدموں کے نقش اُبھرے ہوئے تھے۔ ان کے تعاقب میں چلتے ہوئے سمندر کے کنارے جا پہنچے۔ دونوں بچے ریت سے گھروندا بنانے میں مشغول تھے۔

انہیں کھیل میں مصروف دیکھ کر وجاہت حسین ہنسا۔

"فیروز صاحب ساری دُنیا کے بچے ایک جیسے ہوتے ہیں۔ وہ رنگ، نسل، زبان اور مذہب سے بیگانہ ہوتے ہیں۔ وہ سبھوں کے لئے محبت کا پیغام ہوتے ہیں۔ ان سے صرف پیار کیا جا سکتا ہے۔ یہ تفریق صرف انسانوں نے پیدا کی ہے۔ ایک باغ میں مختلف قسم کے پھول ہوتے ہیں۔ گلاب، چنبیلی، بیلا، رجنی گندھا ان کی خوشبو سے باغ مہکتا ہے۔ وہ مختلف ٹہنیوں پر خوشبو بکھیرنے کے لئے کھلتے ہیں۔ انسان نے ان کا الگ الگ نام رکھ دیا ہے۔

"انجینئر صاحب، آج میری آنکھیں کھل گئیں۔ ہم لوگ چھوٹی چھوٹی باتوں کا جھگڑا بنا دیتے ہیں۔ یہ بچے ہم سے لاکھ درجہ بہتر ہیں جو ملنسار اور خوش مزاج ہوتے ہیں۔ جن کی دوستی اور محبتوں میں کوئی سیاست یا عصبیت نہیں ہوتی۔

دُنیا میں محبت لافانی اور لازوال ہوتی ہے۔ اسے نہ کوئی خرید سکتا ہے اور نہ اس کی قیمت ادا کی جا سکتی ہے۔ پودوں اور درختوں پر کھلنے والے پھول مُرجھا جاتے ہیں مگر محبت کی مٹی سے پروان چڑھ کر جو پھول کھلتا ہے وہ شاداب اور خوشبو دار ہوتا ہے۔"

دونوں بچوں کو کھیلتا چھوڑ کر ساتھ ساتھ لوٹے۔ ان کی کدورت اور غلط فہمی دور ہو گئی تھی۔ گرمجوشی سے مصافحہ کیا، بغلگیر ہوئے اپنے دلوں میں پیار کی ٹھنڈک اور سانسوں میں محبت کی نکہت محسوس کر رہے تھے۔

رات ستارے اپنی آنکھوں میں غم کا کاجل لگائے آئے تھے۔ پرجبیں درد سے مچھلی کی طرح تڑپ رہی تھی۔ صبح وجاہت نے ڈاکٹر کو دکھایا۔ انھوں نے وقتی طور پر نسخہ تجویز کر دیا تھا اور ساتھ ہی مشورہ بھی دیا۔

"آپ انھیں فوراً ڈھاکا کے کسی بڑے ہسپتال میں داخل کرا دیں۔ کیس سیریس ہے۔"

وجاہت کے لئے یہ لمحہ بڑا کربناک تھا۔ اتنا لمبا سفر طے کر کے بیوی کو ڈھاکا لے جانا اور علاج کے لئے قیام کرنا سوہانِ رُوح تھا۔ اس کے علاوہ عمران کا امتحان سر پر کھڑا تھا۔ عمران کو چھوڑ کر جانے کو اس کا دل نہیں مانتا تھا۔ ماں باپ سے دُور، ننھے بچے کو کس کے سہارے چھوڑا جائے۔ وہ دل مسوس کر رہ جاتا۔ اس کی بے چینی اور اُلجھن دیکھ کر ماریا نے کہا۔

"صاحب اگر آپ مُناسب سمجھیں تو عمران کو میرے پاس چھوڑ جائیں۔ میں ہر طرح سے اس کی دیکھ بھال کروں گی۔"

"ہمیں چھوڑ کر عمران تمہارے پاس کیسے رہے گا؟ اس کا ننھا دل والدین کی جدائی برداشت نہ کر سکے گا۔" اس کی پیشانی پر تفکر کی شکنیں اُبھر آئی تھیں۔

"انسان وقت کا غلام ہوتا ہے۔ وہ حالات کے دھارے کے ساتھ بہتا رہتا ہے۔ وقت کا تقاضا یہی ہے کہ بیگم صاحبہ کی حالت کو مدِ نظر رکھ کر عمران کو چند دنوں کے لئے تنہا چھوڑ دیں۔" ماریا نے کہا "میں اس کی خدمت میں کوئی کسر نہیں اُٹھا رکھوں گی۔ اس کی دلجوئی اور تنہائی کے لئے ہمیشہ اس کے پاس رہوں گی۔"

ماریا کی تسلی بخش گفتگو نے اسے ڈھارس بندھائی۔ بر جیس کی حالت بگڑتی جا رہی تھی۔ اس لئے اس نے دل پر پتھر رکھ کر عمران کو ماریا کے حوالے کیا اور بیگم کے ہمراہ ڈھاکا روانہ ہو گیا۔ سفر بڑا کٹھن تھا۔ لانچ سے چاٹگام جانا، پھر وہاں سے طیارے پر ڈھاکا تک، مریضہ کے لئے تکلیف دہ تھا۔ اس کے علاوہ کوئی چارہ بھی نہ تھا۔ آمد و رفت کا صرف یہی ذریعہ تھا۔

جدائی کی پہلی رات عمران کے لئے صبر آزما تھی۔ آسمان سیاہ بادلوں سے کیا ڈھکا، اس کی قسمت پر کالی گھٹائیں چھا گئیں۔ اچانک سمندر سے دیو پیکر لہریں اُٹھنے لگیں۔ شدید ہوا کے شور سے کھڑکیاں، دروازے کانپنے لگے۔ بارش کا لامتناہی سلسلہ شروع ہو گیا تھا۔ موجیں کسی منہ زور سمندر کی طرح پر پھیلائے حملہ آور تھیں۔ سمندر کا پانی جزیرے پر چڑھ رہا تھا۔ ہوا کا تیز جھونکا جیسے ہر فرد کو تنکے کی طرح بہا لے جائیگا۔ ماریا سہمے ہوئے عمران کو اپنے سینے سے چمٹائے چپ چاپ بستر پر لیٹی تھی۔ خوف سے اس کا دل دھک دھک کر رہا تھا۔ اس بلائے ناگہانی سے وہ بھی خائف تھی۔ اس نے ننھے عمران کو سینے سے بھینچ لیا۔ اس کا بچہ پڑوسی کے پاس کس حال میں ہوگا؟ اس خیال سے وہ کانپ گئی۔ ممتا کی تڑپ سے بے چین ہو گئی۔ جیسے کسی نے دل میں سوئی چبھو دی ہو۔ چاروں طرف طوفان کی حکمرانی تھی۔ اس طوفانی رات میں وہ باہر قدم نہیں نکال سکتی تھی۔ وہ عجیب کشمکش میں مبتلا تھی ــــ سہمے ہوئے عمران کو دیکھ کر اس کے دل میں ممتا کا خیال جاگ اٹھتا تھا۔ قدرت نے اس کا امتحان لینے کے لئے آزمائش میں مبتلا کر دیا تھا۔

ہوا کا ایسا تیز جھونکا آیا کہ کھڑکیوں کے پٹ آڑا کر لے گیا۔ کمرے کی ہر چیز تتر بتر ہو گئی۔ پانی کی بوچھار سے سارا کمرہ شرابور ہو گیا۔ موت کی چڑیلیں دروازے کی کنڈی ہلا رہی تھیں۔ ایسا لگ رہا تھا جیسے کوئی غیر مرئی طاقت سارے بنگلے کو ہلا رہی ہو۔ خوف سے اس پر کپکپی طاری تھی۔ عمران اس کی چھاتی میں اتنی زور سے چمٹ گیا جیسے اس کے سینے میں سما جانا چاہتا ہو۔ والدین کی یاد سے وہ بیقرار ہو گیا تھا۔ اندھیرے میں موت رقص کر رہی تھی۔ دونوں کو ایک دوسرے کے دل کی دھڑکنیں سنائی دے رہی تھیں۔

لہریں پہاڑ کی طرح سر اٹھائے ہر چیز کو اپنے دامن میں سمیٹ لینے کے لئے بڑھ رہی تھیں۔ جھونپڑیاں، مکانات ریت کے گھروندے کی طرح بہہ گئے تھے۔ ایسا ہیبتناک طوفان کبھی بھی نہ آیا تھا۔ ہر چیز تاریکی میں ڈوب گئی۔ دس لاکھ انسان لقمۂ اجل ہو گئے۔ جزیرہ کی جگہ موت کا سمندر نظر آ رہا تھا۔

صبح سورج نمودار ہوا۔ ہوا مند تھی۔ ہر طرف قبرستان کی طرح سناٹا طاری تھا۔ حدِ نگاہ تک پانی ہی نظر آ رہا تھا۔ کہیں کہیں پہاڑیوں کی چوٹیاں نظر آ رہی تھیں۔ پانی کے ساتھ انسانی لاشیں اور مُردہ مویشی بہہ رہے تھے۔

ماریا نے پہاڑ کی چوٹی پر اپنے اور عمران کو ایک تناور درخت سے باندھ کر بچایا تھا تاکہ پانی کی لہروں میں بہہ نہ جائیں۔ پانی کی سطح پہاڑی کی چوٹی تک پہنچ چکی تھی۔

پانی کی باڑھ کے ساتھ زندہ، مُردہ، انسان بہے جا رہے تھے۔ اچانک ماریا کی نظر فیروز اور سہیل پر پڑی۔ فیروز سہیل کو اپنے کندھے پر سوار کئے موت کی لہروں سے نبرد آزما تھا۔ تیرتے تیرتے اس کے بازو شل ہو گئے تھے۔ خوف و کرب سے چہرے مرجھا گئے تھے۔ آنکھوں میں ویرانی تیر رہی تھی۔ وہ جب پانی کے ریلے کے ساتھ بہتا ہوا ماریا کے قریب سے گزرا تو ماریا نے رسّی اس کی طرف پھینکی۔ اس نے رسّی کا سرا پکڑنے کی کوشش کی مگر ناکام رہا ــــ وہ آہستہ آہستہ اُن سے دُور ہوتا جا رہا تھا۔ ماریا نے مایوس ہو کر رسّی کھینچ لی۔ پانی کی سطح پر صرف فیروز کا سر نظر آ رہا تھا۔ اور کندھے پر ننھا سہیل بے چارگی کی تصویر بنا ہوا تھا۔ اس کی آنکھوں سے خوف عیاں تھا۔ معصوم کلی مرجھا گئی تھی۔ ماریا نے آخری بار زور سے رسّی اُن کی طرف پھینکی۔ اتفاق سے رسّی کا سرا ننھے سہیل کے ہاتھ آ گیا۔ فیروز کے ہاتھ پاؤں لہروں سے معرکہ آرائی میں مصروف تھے۔ سہیل نے زور سے رسّی تھام لی۔ اب وہ اپنے باپ کے کندھے سے جھٹکا کھا کر الگ ہو چکا تھا۔ ماریا تیزی سے رسّی اپنی طرف کھینچ رہی تھی۔ سہیل نے مضبوطی سے رسّی پکڑ رکھی تھی۔ وہ پانی میں ڈبکیاں کھاتا ماریا تک پہنچ گیا۔ اس کا باپ فیروز پانی کے ریلے میں بہہ کر زندگی کے کرب سے آزاد ہو چکا تھا۔ جب ماریا نے سہیل کو لے کر گود میں اُٹھایا تو وہ بلک بلک کر رونے لگا۔ ننھا عمران ماریا کے زانو سے لپٹا مبہوت کھڑا تھا۔ بھوک اور پیاس سے اس کے ہونٹوں پر پپڑیاں جم گئی تھیں۔ حلق میں کانٹے پڑے ہوئے تھے۔ وہ رحم طلب نظروں سے ماریا کی طرف دیکھ رہا تھا۔ وہ دونوں بچوں کو سینے سے چمٹائے زمین پر بیٹھ گئی۔ غم سے اس کا کلیجہ پھٹا جا رہا تھا۔ اس نے موت کا ایسا بھیانک روپ نہیں دیکھا تھا۔ وہ ہراساں پھٹی پھٹی آنکھوں سے دونوں بچوں کو تک رہی تھی۔ لاکھوں انسانوں کے ساتھ موت کے دیوتا نے اس کے لختِ جگر کو بھی نگل لیا تھا۔ آج سورج بھی سمندر کی گہرائی سے گہنا گیا تھا۔

ہر طرف ہُو کا عالم تھا۔ چیلیں اور گِدھ سروں پر منڈلا رہے تھے۔ دھوپ کی تمازت شدت اختیار کر چکی تھی۔

وجاہت نے ڈھاکا پہنچ کر جبیں کو ہسپتال میں داخل کرا دیا۔ اس کی بیوی کی حالت غیر ہو گئی تھی۔ ڈاکٹروں نے معائنے کے بعد بتایا کہ مریضہ کی جان بچانے کے لئے بچے سے ہاتھ دھونا پڑے گا۔ بمشکل تمام ہی سے جبیں کی جان بچ سکی۔ وہ آئندہ بچے پیدا کرنے کی اہلیت کھو چکی تھی۔ جس دن جبیں زیست و موت کی کشمکش میں مبتلا تھی، اُسی روز سمبولا، مہیش کھالی اور سندیپ میں طوفان آیا تھا۔ وجاہت نے ریڈیو پر اس وحشتناک طوفان کی خبر سنی تھی۔ عمران کی یاد میں اس کا دل خون کے آنسو رونے لگا۔ جبیں کی طبیعت سنبھلنے میں ہفتہ لگ گیا۔ اس دوران اس پر سراسیمگی کی کیفیت طاری تھی۔ بار بار عمران کا معصوم چہرہ اس کی آنکھوں کے سامنے آتا۔ وہ کراہ کر رہ جاتی۔ کبھی کبھی انسان کتنا مجبور اور بے بس ہو جاتا ہے۔

جب جبیں ہسپتال سے ریلیز ہوئی تو وجاہت نے اس المناک واقعہ کی اطلاع دی۔ وہ ممتا سے بے قابو ہو کر پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔ ضبط کا بندھن ٹوٹ چکا تھا۔ وہ لوگ ہوائی جہاز پر سوار ہوئے۔ طیارہ چاٹگام کے ہوائی مستقر پر اترا۔ وہ لوگ وہاں سے سیدھے اسٹیمر گھاٹ کی طرف چلے گئے۔ لانچ پر بیٹھ کر مہیش کھالی کی طرف روانہ ہوئے۔ انھوں نے راستے میں سُنا کہ اس جزیرے میں کوئی بھی انسان زندہ نہیں بچا۔ اب پانی سمٹ کر سمندر میں سما گیا تھا۔ لاکھوں جانیں تلف ہو چکی تھیں۔ ان کے دل میں درد کی ٹیس اٹھی۔ کلیجہ پھٹا جا رہا تھا۔ سب سے بُرا حال جبیں کا تھا۔ بچے کی یاد بچھو کی طرح ڈنک مار رہی تھی۔ وجاہت نے اُسے صبر کی تلقین کی اور بڑی مشکل سے قابو میں رکھا۔

جب انھوں نے جزیرے پر قدم رکھا، ہر طرف موت کی خاموشی چھائی ہوئی تھی۔ گِدھ، چیلیں، کوّے مُردہ جسم نوچ نوچ کر کھا رہے تھے۔ سڑی ہوئی لاشوں سے بدبو پھیل رہی تھی۔ ہر طرف اُداسی اور غمگین سماں نظر آ رہا تھا۔ ایک لاش درخت سے اٹک کر لٹکی ہوئی تھی جسے گِدھ اور چیلوں نے کھا کھا کر مسخ کر دیا تھا۔ یہ دردناک منظر دیکھ کر جبیں کو غش پر غش آنے لگے۔ رو رو کر اس کا بُرا حال ہو گیا تھا۔ آنکھیں سوج گئی تھیں۔ تھکاوٹ اور پریشانی سے بُرا حال تھا۔

پہلے ہی سے حکومت کی طرف سے امدادی سامان لے کر لانچ پہنچ چکے تھے۔ میڈیکل ٹیم اپنی کارروائی میں مصروف تھی۔ دس لاکھ انسانوں کی بے کس موت پر ساری دنیا سے ریلیف کا سامان آنا شروع ہو گیا تھا۔ بیرونِ ملک کے فوٹوگرافر اس سانحے کو اپنے کیمرے میں منتقل کر چکے تھے۔ اور اخباری نمائندے مزید خبریں بھیج رہے تھے۔

عمران کے والدین پاگلوں کی طرح اپنے بچے کو تلاش کر رہے تھے۔ بہت سارے لوگ اپنے اپنے رشتہ داروں کی کھوج میں آئے تھے۔ سمندر کی لہریں شور مچا رہی تھیں۔ ماحول میں اب تک موت کی ہیبت طاری تھی۔

حکومت کے کارندوں نے پہاڑی کی چوٹی سے بہت سے بچے کچھے انسانوں کو ڈھونڈ نکالا تھا۔ ان پر دہشت طاری تھی۔ کچھ لوگ ہوش و حواس کھو بیٹھے تھے۔ انھیں دیکھتے ہی وہ لوگ دھاڑیں مار مار کر رونے لگے۔

وجاہت پہاڑی پر چڑھتے ہوئے اچانک پھسلا اور ایک جھاڑی میں پھنس گیا۔ وہاں اسے اُمید کی کرن نظر آئی۔ بچے کی پانچ موتی کی مالا جھاڑی میں اٹکی ہوئی تھی۔ اس نے بے قابو ہو کر موتی کی مالا نکالی۔ جبیں مالا دیکھ کر پچھاڑیں کھانے لگی۔ وہ شدتِ غم سے نڈھال ہوئی جا رہی تھی۔ وجاہت نے نظر دوڑائی۔ چوٹی کی اونچی اور سنسان نظر آ رہی تھی۔ وہ امید و بیم کی کشمکش میں پہاڑی پر چڑھنے لگے۔ چڑھائی بہت زیادہ تھی۔ چڑھتے چڑھتے ہانپنے لگے۔ اونچائی سے سمندر کی طرف نظر دوڑائی جو موت کے اژدہے کی طرح پھنکار رہا تھا۔ چوٹی پر پہنچ کر دیوانوں کی طرح چاروں طرف چکر لگانے لگے۔ دل میں یاس کا دیا ٹمٹما رہا تھا۔ اچانک جھاڑی کے دوسری طرف کسی کے سسکنے کی آواز سنائی دی۔ جھاڑی ہٹا کر دوسری طرف پہنچے۔ بھوک اور نقاہت سے بچوں کا بُرا حال تھا۔ چہرے سے کرب کا اظہار ہو رہا تھا۔ ماریا بے سُدھ ہو کر چت پڑی تھی۔ اور دونوں بچے اس کی چھاتی میں منہ لگا کر دودھ پی رہے تھے۔ وہ ان کی آمد سے غافل تھے۔

”میرے لال، میری آنکھوں کا تارا!“ کہہ کر جبیں نے عمران کو جب گود میں اٹھایا تو وہ کھوئی کھوئی سی نظروں سے اپنی ماں کو دیکھنے لگا۔ وجاہت نے سہیل کو اٹھا کر گلے سے لگایا۔ وہ حیران پریشان سا اس سے لپٹ کر رونے لگا۔ انھوں نے ماریا کو آواز دی۔ وہ اسی طرح بے سُدھ پڑی رہی۔ جبیں نے اس کے کپڑے درست کئے۔ پھر ہلا ہلا کر اُسے ہوش میں لانے کی کوشش کرنے لگی۔ وہ کراہ کر اٹھی۔ اس کی آنکھوں سے وحشت ٹپک رہی تھی۔ چیخ کر جبیں سے لپٹ گئی اور پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔ وہ پاگلوں کی طرح کبھی جبیں سے کبھی عمران سے لپٹ کر زار و قطار رونے لگی۔ اس کے ہوش و حواس بجا نہ تھے۔ صدمے نے اسے ادھ مُوا کر دیا تھا۔

عمران کو اس کی ماں جبیں مل گئی تھی۔ مگر ماریا کو اس کا بیٹا نہ ملا۔ موت کے دھارے اسے اپنے ساتھ بہا لے گئے تھے۔ سہیل کا باپ بھی موت کی لہروں کے ساتھ بہہ گیا تھا۔ سہیل وجاہت کی گود میں تھا۔ وہ حیرانی اور مایوسی سے سبھوں کے چہرے تک رہا تھا۔ اس کی دنیا میں اب اس کا کوئی سہارا نہ تھا۔

”میم صاحب! آپ بہت دیر سے آئیں۔

میرا سب کچھ کٹ گیا' برباد ہو گیا۔" ماریا کی آنکھوں سے آنسو رواں رہتے ۔

"ماریا تم نے ماں کی ممتا کی ایک مثال قائم کر دی ہے۔ ساری دُنیا کی انسانیت تم میں سما گئی ہے۔" برجیس اسے تسلی دینے لگی۔" تم نے میرے بچے کو زندہ رکھا۔ یہ احسان میں ساری زندگی نہیں بھول سکتی۔"

"ماریا! تم نے ساری دُنیا کے سامنے انسانیت کی ایسی تصویر پیش کی ہے کہ متعصب لوگوں کا سر شرم سے جھک جاتا ہے۔ انسان ایک دوسرے کے خون کا پیاسا ہے۔ آفرین ہے تم جیسی عورت پر جس نے اپنا دودھ پلا کر دو بچوں کی زندگی بچائی۔ آج تمہاری جیسی فرشتہ صفت سے انسانیت کا نام روشن ہے۔ ہم لوگ بہاری بنگالی کے نام پر تعصب اور نفرت کی آگ میں جل رہے ہیں۔ تمہارے کردار اور عمل سے ہم لوگوں کی آنکھیں کھل جانی چاہئیں۔" وجاہت جذبات سے مغلوب ہو رہا تھا۔

برجیس عمران کو اپنی گود میں لے کر بار بار اس کا منہ چوم رہی تھی۔ پیاسی ممتا کو قرار آگیا تھا۔ وہ اپنے دل میں عجیب سا سکون محسوس کر رہی تھی۔

"بیگم تمہیں اپنا بیٹا مل گیا۔ اس عورت کی عظمت عورت دیکھو۔ جس نے اپنی اولاد کی قربانی دے کر ہمارے بیٹے کی جان بچائی۔" وجاہت نے سہارا دے کر ماریا کو کھڑا کیا۔ اسے سکتہ سا لگ گیا تھا۔ وہ خالی خالی نظروں سے اسے تک رہی تھی۔ برجیس نے اپنے آنچل سے گرد میں لپٹے ہوئے اس کے چہرے کو صاف کیا۔ سورج کی روشنی میں اُس کا چہرہ شاداب پھولوں کی طرح کھلا ہوا تھا۔ برجیس بولی۔

"اگر میرے پاس کوئی ایسا دھاگا ہوتا جس میں خلوص' محبت' سچائی' فرض' دیانت' شرافت پرو کر مالا بنا سکتی' تو وہ مالا اس دیوی کے گلے کا ہار بن جاتی۔"

"ہر انسان کے دل میں خدا ہوتا ہے۔ جس کے نور سے روح منور ہو جاتی ہے۔ اس عظیم عورت نے اپنا دودھ پلا کر ہمارے لختِ جگر کو نئی زندگی دی ہے۔ ساری دُنیا کی عورتوں کے دودھ کا رنگ ایک سا ہوتا ہے۔ کیا یہ بچہ اس سے عیسائی بن جائے گا؟ اگر وہ گائے یا بکری کا دودھ پئے گا تو جانور کہلائے گا؟

"نہیں بیگم۔ دُنیا کا ہر مذہب انسانیت کا درس دیتا ہے۔" وجاہت ماریا کو عجیب نظروں سے دیکھ رہا تھا' جس پر جنونی کیفیت کے باوجود سورج مکھی جیسا نکھار تھا۔

اس کا ہمارے مذہب سے کوئی تعلق نہیں تو کیا ہوا؟ اس نے انسانیت کے ناطے دُنیا کے تمام مذاہب کے لئے ایک مثال قائم کر دی ہے۔ ان بچوں کے لئے فرشتۂ رحمت ثابت ہوئی ہے۔ یہ وہ دیوی ہے جو اپنے ہاتھ میں دیا جلائے لوگوں کو انسانیت' فرض شناسی اور ایمان کی روشنی دکھاتی ہے۔" برجیس نے مسرور جذبات سے ماریا کی پیشانی چوم لی۔

"بیگم آپریشن کے بعد تم بچے سے محروم ہو گئیں۔ اس لئے اللہ تعالیٰ نے ایک اور اولاد سے نوازا ہے۔ یہ معجزہ نہیں تو اور کیا۔" وجاہت نے پیار سے سہیل کو بٹھا لیا۔ وہ اس کے سینے سے لگا باپ کی شفقت کی دھڑکنیں سن رہا تھا۔

وہ لوگ ایک دوسرے کا ہاتھ پکڑے آہستہ آہستہ پہاڑی سے نیچے اُترنے لگے۔ برجیس کی گود میں عمران اور وجاہت کی گود میں سہیل تھا ماریا بھی لڑکھڑاتی ہوئی اُن کے ساتھ پہاڑی سے اُتر رہی تھی۔ انسانیت کے نور سے اس کا چہرہ دمک رہا تھا ——— جیسے آفتاب کی روشنی میں سورج مکھی۔

——— ———

وقت کا اسیر

حسن ساہو

اتفاق کی بات ہے کہ جب بھی میں نے اپنی تشنگیٔ حیات کو اُداسی کے بحرِ بیکراں میں غوطہ زن پایا اور جب بھی میں مصائب سے دوچار ہُوا تو ہر بار آگے بڑھ کر یار انور نے مجھے حوصلہ دینے کی کوشش کی دراصل وہ سدا پریشانیوں میں میری ڈھارس بندھاتا رہا۔ ایسا نہ ہوتا تو نہ جانے کب کا فراریت کا راستہ اپناتے میں نے اس جہاں کو الوداع کہہ چکنے کی بابت شدت کے ساتھ سوچا ہوتا اگر دیکھا جائے تو انور میرے ہی وجود کا دوسرا روپ نظر آئے گا۔ لیکن کبھی کبھی میں جب اس کی زندگی پر غور کرتا ہوں تو مجھے اس سے بے حد نفرت ہونے لگتی ہے۔ بارہا میں نے چاہا کہ اس کے وجود کا لمحہ گزشت سے سکون حاصل کر سکوں۔ لیکن میں کچھ بھی نہیں کر پاتا صرف سوچتا ہوں!

میٹرک کا امتحان پاس کرنے کے بعد ہی میرا بوڑھا باپ مہلک بیماری کی زد میں آ کے انتقال کر گئے۔ بدلے میں میرے کمزور کاندھوں پر دو جوان بہنوں اور بیمار ماں کا بوجھ ڈال گئے۔ ان دنوں میں خود تلاشِ روزگار کے سلسلے میں سڑکیں ناپتا تھا۔ اور دفتروں کی خاک چھانتا تھا۔ بہنوں کی ابتر حالت اور ماں کی بیماری سے تنگ آ کر میں نے چاہا تھا کہ اس سماج کے خلاف علمِ بغاوت بلند کروں۔ لیکن بدحالی و بے بسی کا ہدف بننے میں کچھ بھی نہ کر پایا۔ ماں برابر خون تھوکنے لگی۔ جب میں ہر طرف سے مایوس ہو گیا تو چوک کے نکڑ پر انور سے ملاقات ہوئی وہ اُداس اُداس تھا۔ اسی روز اس کی ماں نے پریشانی سے تنگ آ کر خودکشی کر لی تھی لیکن وہ پھر بھی زندہ رہا۔ اپنی بہنوں کی خوشنودی کی خاطر وہ ماں کی دائمی جدائی کو ہنستے ہنستے برداشت کر گیا اور یہ کہہ کر کہ "ہر ڈراؤنی رات کے بعد نئی صبح ہوتی ہے..." انور مجھ سے بچھڑ گیا۔ یہ سب دیکھتے ہوئے مجھ میں زندہ رہنے اور زندگی بنانے کی تمنا جاگ اٹھی

بڑی تگ و دو کے بعد مجھے ایک نیم سرکاری ادارے میں ملازم ہونا نصیب ہوا قلیل تنخواہ پر ——— وقت کا پرندہ! [پرواز] کرتا گیا۔ اور میں اپنے ساتھی انور کی یاد کو فراموش کر گیا۔ دراصل پریشانیوں نے مجھے گھیرے رکھا تھا۔

ماں کا خون تھوکنا بند نہیں ہُوا اس کی بیماری نے میری تنخواہ کو مہینے میں بیس دنوں سے زیادہ چلنے نہ دیا۔ آدھا پیٹ کھانے اور بہنوں کو اسکول سے اٹھانے کے عوض جو رقم بچی وہ ماں کی بیماری کے سبب ڈاکٹروں کے حصے میں آ گئی البتہ [illegible]

تقدیر سے آگے میری ایک نہ چلی اور ایک رات سارا خون تھوک کے ماں نے اپنے سرد و بے جان جسم کو مٹی کے . کرنے کے لئے چھوڑ دیا وہ بھی مہینے کی پچیس تاریخ کو

ماں کی تجہیز و تکفین کے لئے میرے پاس کچھ نہ تھا ۔ سب کا سب اثاثہ ختم ہو چکا تھا پریشانیوں نے سر سو گھیر لیا ۔ مایوسیوں کے اندھیرے مجھے نگلنے لگے ۔ اسی وقت میرے دل میں خودکشی کرنے کا ..... جذبہ ابھر پڑا لیکن عین وقت پر انور ... بڑھ کر دست گیر بنے ۔

سپاہی اُسے پکڑ کر لئے جا رہے تھے اُس نے کسی ایک کی جیب کاٹ لی تھی انور رو رہا تھا ۔ چلا رہا تھا ۔ کہ وہ چور نہیں جیب کترا نہیں اسکی جوان بہن کی لاش اس کے جھونپڑے میں پڑی ہے جس کے کفنانے اور دفنانے کا انتظام کرنے کی خاطر وہ جیب کاٹنے پر مجبور ہُوا پولیس نے ایک نہ سنی وہ اسے لے جا رہے تھے اور آدمیوں کی ایک خاصی بھیڑ اس کے ساتھ ساتھ پولیس اسٹیشن کی طرف جا رہی تھی اس بھیڑ میں گھس کے میں نے دوسرے آدمی کا وزنی بٹوہ اچک لیا ۔ اور اپنی ماں کے ٹھنڈے جسم کو قبرستان میں سُلا دیا ۔

انور سے میری آخری ملاقات اس وقت ہوئی جب کہ میری بہن نے ماں کی طرح خون تھوکنا شروع کیا میں اپنی قسمت کو کوسنے لگا اس پر طرّہ یہ کہ ادارہ میں تخفیف کی ہوا چلنے لگی ۔ جس کی زد میں آئے مجھ دیگر کئی ساتھیوں سمیت بے روزگاری کا شکار ہونا پڑا اُداسی کا مجسمہ بنے اپنی زیست کو ختم کرنے کے منصوبے پر ایک بار پھر غور کرنے لگا ۔ اب جینے کے لئے رہا ہی کیا تھا ۔ اسی دوران مجھے انور ملا وہ جیل ٹل کے کنارے ایک خوش پوش آدمی سے باتیں کر رہا تھا ۔

صاحب تیس روپے ایک دم خوبصورت اور جوان میری طرح"

• تیری طرح کیا تیری بہن ہے

انور کا چہرہ فق ہو گیا

میں نے دیکھا کہ کچھ فوراً ہی صاحب کا بٹوہ کھلا دس دس کے تین نوٹ ہوا میں لہرائے اور انور کے پھٹے کوٹ کی جیب میں چھپ گئے اتنے میں مجھ سے نظریں ٹکرائیں تو کہنے لگا ۔

وہ حالات سے سمجھوتہ کرنا سیکھو میرے دوست ورنہ یہ دنیا والے تمہیں جینے نہ دیں گے

میں نے انور کی بات ان سنی کر دی اور سوچا کہ اس اندھیری رات کا سویرا ہو گا لیکن ایسا نہیں ہُوا

میری بہن نے خون تھوکنا بند نہیں کیا وہ برابر خون تھوکتی رہی اور میری زندگی عذاب مسلسل بن کے رہ گئی ۔ یہ زمانہ مجھے بھی ذکر چولا کترا کر دینا چاہتا ہے لیکن اس کے تصور سے گھبراتا ہوں ۔ میری حالت اب اس ملاح سے کسی طور کم نہیں جس کی کشتی منجدھار میں چھپی چٹانوں کی طرف رواں دواں ہو ۔

مگر اب مجھے انور نہیں ملتا ایک مدت گذر گئی اُسے دیکھے ۔ نہ جانے اب وہ میرا رفیق کس حال میں ہے یا پھر ہو سکتا ہے کہ عیش و مسرت سے لبریز لمحات کو اپنی زندگی سے وابستہ کرنے کی تمنا میں انور نے اپنی ہستی کو داؤ پر لگا دیا ہو ۔ ویسے میں پُر اُمید ہوں کہ انور کبھی نہ کبھی اور کسی نہ کسی راستہ میں مجھے پھر ملے گا ۔

———— ————

حقیر آستانی

ایک وضع دار شاعر

ساحل احمد

اُردو غزل اپنے گوناگوں تجربات کی بنا پر ممتاز و منفرد حیثیت اختیار کر گئی ہے۔ اس کی اس حیثیت کو قائم و دائم رکھنے میں غزل گویوں نے عمل جہاد سے کام لیا ہے۔ مخالفت کی تند و تیز ہواؤں کے درمیان بھی اس کی خصائص ریزی کم نہیں ہوئی جیسے ناقدوں کی طرح بعض غزل گویوں نے بھی اسے تعلیاتی کی کوشش کی اور غزل کے موضوعی منطقے میں وسعت پیدا کی۔ اس سلسلہ میں متعدد اشکال کو بدلنے کی سعی کی جس کو ولی دکنی، میر، غالب، مومن، حسرت، اقبال، تسلیم جیسے اہم سخن شعراء نے مضبوط و پختہ کر دیا تھا۔ غزل کا اپنا ایک مخصوص مزاج ہے۔ وہ کسی دوسری صنف کا پیرہن اوڑھ سکتی ہے اور نہ کسی کی تقلید ہو سکتی ہے۔ اس لئے دانشوروں نے لسانیاتی یا ہیئتی تبدیلیوں کے خلاف آواز اٹھائی اور اس کے اس منفرد اسلوب و مزاج کی حفاظت کی جو غزل کا امتیازی وصف ہے۔

ان کی غزلوں میں حیات و کائنات اور فکر و نظر کی تمام فنی و اسلوبی نزاکتیں موجود ہیں۔ انہوں نے غزلیہ روایت کی تقلید کی ہے اور وہ فکری لمحات میں ناقدانہ رنگ تغزل سے گریز کیا ہے۔ غزل کی آرائش فکر اور لوازمات شعری کے تقاضے کا بطور خاص خیال رکھا۔ عصری تقاضوں کو بھی گرا نگی سے آشنا کیا۔ ان کے کلام کا اصل رنگ عشق سے ہی مستعار ہے۔ لیکن انہوں نے اپنی غزل اسی اکیلے رنگ سے نہیں رنگی ہے۔ بلکہ زندگی کے شدید تجربات کو بھی اپنی غزل کا جزو خاص بناتے ہوئے نئی اور رنگوں کی اختراع کی ہے۔ ان کی یہ اختراع سازی کلام کی معنوی تہ داری کو اور بھی زیادہ وسیع بنا دیتی ہے۔ ان کا کلام متنوع مضامین سے سرسبز ہے۔

رنگ ہے، مہک ہے، ذوق ہے، تحیرت کیسی
ساز شکستہ جو اگر جسم کا بدن لگتا ہے

بہت زمانہ ہوا پھر بھی یاد آتا ہے
وہ ایک لمحہ جو دونوں کے درمیان گزرا

محبت کی آنکھوں میں شمعیں جلا کر
کسی کی وفا آئینے ڈھونڈتی ہے

وہ ولولے، وہ جوش، وہ بے تابیاں نہیں
وہ راستے، وہ گلیاں، وہ بام و در کہاں

کیا کیا نہ ہم کلام کریں اُن سے جب ملے
لیکن نیاز و ناز کا اُن پہ اثر بھی ہو

ہماری پیاس تو اک بوند ہی سے بجھ جاتی
یہ کس خیال سے اتنے سراب نکلے ہیں

جو منظر آپ کے اندر کہیں ہے
وہ منظر آپ کے باہر نہیں ہے

جو اتفاق سے ہم اپنے روبرو آئے
ہماری دید کو کتنے ہی رنگ و بو آئے

گھرے ہیں اپنی اڑانوں میں یہاں طائر تمام
جس کا جیسا آسماں ہے جس کی جو پرواز ہے

ہم جمِ جاناں، غمِ دوراں سے ہجرت کر گئے
وہ نہ جانے کس سے اب تک برسرِ پیکار ہیں

اب اختلافِ رنگ و بو تو ہے مگر جو سوچئے
ہر ایک پھول اپنی اپنی شاخ پر گلاب ہے

انھوں نے اپنی غزل کی آراستگی میں جس صلح و بردباری کا ثبوت دیا تھا، اس کے جلو میں عزم و حفظ اور سرکشی روی بھی اپنا اثر ڈالتی رہی۔ نتیجۃً ان کی غزل معرکۂ کارزار میں بھی کھری اترتی ہے۔ زندگی اور زمانۂ موجود کی اس روش نے وارثِ شعری کو مطمئن نہیں رہنے دیا۔ انہوں نے اپنے منصبِ شعری کے وقار کو قائم رکھتے ہوئے زندگی کی کڑی، کھردری، اکیلی حقیقتوں سے چشم پوشی نہیں کی۔ عصری ضرورتوں کی وجہ سے شعری معنویت مغلوب نہیں ہوئی۔ ان کا مستحکم قلم ہر محاذ پر وسیلۂ اظہار بننے کی صلاحیت رکھتا ہے۔ کلام میں درد، یاسیت، محرومی اور اضمحلال کی وجہ سے منفی اثرات بھی مرتب ہوئے ہیں ـــ

یہ کیسی پارگی ہے یارو، یہ کیسا ماحول ہے یہاں کا
جسے پکارا جسے بلایا، وہی یہاں بے قرار نکلا

نہ جانے کتنے ارادے نہ جانے کتنے اصول
[illegible] کے یہاں خواب ٹوٹے ہیں

کہاں کہاں سے نہ گزرا وہ [illegible] گزرا
جہاں جہاں سے وہ گزرا [illegible]

اب نہیں ہے زندگی میں وہ لذتِ طلب
ایک مدت سے بہت بیمار ہیں

نقش بر دیوار ہوں یا پھر خیالِ خام ہوں
ایک لمحہ بیٹھا ہے لرزہ براندام ہوں

حیات و موت کے مابین بڑھ گئی رنجش
حیات ہو گئی محتاج [illegible] والے کی

مگر ان کا یہ خوف کوئی بے جا بھی نہیں، زندہ حقیقت ہے جس کو خود آدمی نے اپنے اوپر مسلط کر لیا ہے۔ زمانے کے گرم و سرد سے نبرد آزما ہوتے ہوئے ان سچائیوں کا سامنا کرنا چاہیے اور اپنی کھوئی یا چھپی طاقت کا ادراک کرنا چاہیے تاکہ زندگی ان سچائیوں سے اور زیادہ مدقوق و بدرنگ نہ ہو جائے۔ زندگی جب بے وقعت ہو جاتی ہے تو یہ آدمی اپنی مردہ لاش ڈھونے میں ہی عافیت سمجھتا ہے۔ اور خود کو بے سہارا مانتے ہوئے سہارا ڈھونڈتا ہے۔

حقیر آستانی کا یہ اسلوب شعر فنود کا... راستہ نہیں دکھاتا بلکہ ہر ایک شخص کو قنوطی ہونے سے باز رکھتا ہے، انہوں نے غزل کی بنیادی فکر کو قائم رکھتے ہوئے زندگی کی اس سچی راہ اور تلاش و جستجو کی آگ کو مشتعل رکھنے کی سعی کی ہے کیوں کہ زندگی کی پائیداری اور خوشیوں کے حصول کے لئے اسی آگ کی ضرورت ہوتی ہے۔

حوصلۂ پرواز سے کیوں بھٹک رہا ہے تو
اپنے ساتھ ساتھ اپنی راہبری میں آ

شمشیر خود اپنے ہی دستے سے نہیں چلتی
قاتل کی کلائی بھی شمشیر کا حصہ ہے

چلو تم بھی چھو پرواز کو، پرواز لازم ہے
بہت ممکن ہے جی اٹھو جو ہمت آزما لیجے

چلیں جو موسم ہوں تو پھول پتے آ ہی جاتے ہیں
تماشۂ وقت کی جادوگری دکھلا ہی جاتے ہیں

چلو تو سہی دو قدم اور دیکھو
کہ ہر رہ گزر کا تقاضا ہوا کیا؟

لے کے نکلے ہیں سفر [illegible] ہے
آپ کی ہمسری کریں گے ہم

طائرانِ زیست ہیں اپنی اڑانوں میں مگن
ایک طائر حلقۂ پرواز میں بھٹکا کیا

کوتاہیِ پرواز میں ہے موت فراواں
اس کو [illegible] اڑان میں [illegible] دام بہت ہیں

جب نہیں خود پہ بھروسہ تو تعجب کیا
جامِ جمشید کسی بختِ سکندر مانگوں

سماجی اور اخلاقی رشتوں کے ٹوٹنے کا بھی انھیں احساس تھا۔ انسانیت، شرافت، صلح جلیمی، دوستی، وفاداری اور بھائی چارے کی خوشبو زائل ہوتے دیکھ کر قلم کی سیاہی گریاں ہوئی۔ ہر شخص ایک دوسرے کو شک و شبہ کی نظر سے دیکھنے لگا ہے۔ باہمی رشتوں کے اس انہدام نے ہندوستانیت کو بھی زک پہنچائی ہے۔ سیاسی شعبدہ بازوں نے اور بھی زیادہ ملک کی فضا خراب کی ہے۔ لیکن دوسرے شعرا کی طرح حقیر آستانی نے بھی اپنی غزلوں میں احتجاج کی شدید کیفیت پیدا کی ہے۔ کلام میں بے باکی اظہار کی کرنیں، کرب اور تسکین کے لمحوں کی زخم خوردہ تصویریں موجود ہیں۔

[illegible] کے نام پر
[illegible]

ہر طرف پھیلی ہوئی ہے دہشت
کیسے انداز ہیں ستمگر کا

ہوگیا جیسا زمانے میں محال
آدمی کو آدمی کہنا تھا

اس کی دنیا میں غم ہے اور یہ اتحاد کیوں
آدمی تو آدمی ہے پھر یہ ذات و پات کیوں

یاریاں، دلداریاں، غم خواریاں کم ہو گئیں
بھائی چارہ اپنا پن صدیوں کے لٹنے کی جگہ

نہ کوئی اپنے نہ کوئی یہاں پرائے ہیں
تمام لوگ فقط چلتے پھرتے سائے ہیں

کہاں ہے کوئی جسے اب پکار کر دیکھیں
نقاب اور بھی کتنے اتار کر دیکھیں

زبان و بیان کے اعتبار سے بھی اُن کا کلام وقیع اور توانا ہے۔ وہ الفاظ و تراکیب ہوں یا مرکبات، اُن کی مدد سے تہذیبی اور نفسیاتی رشتوں میں گہرا ربط اور گہرا شعور پیدا کرنے کے ہنر سے واقف ہیں۔ انھوں نے فکری رویے کو زیادہ سیال صورت دینے کی سعی کی ہے۔ صوتی اعتبار سے بھی انہیں بہت موزوں و مناسب خیال کیا ہے۔ جادوگری، جبر و حرص و ہوس، بہتر قومی یکجہتی، قبرستان، دربارِ عقل، ایاغِ زیست، دستہ دار، قتل گاہ و شوق، نظامِ نیک و بد، خدوخال، خداداد فضیلت، عقلِ سلیم، خیر مقدم، ایک ایک کا چہرہ، قائم و دائم، اندرونی، خانماں برباد، گواہ، ناکردہ گناہوں کی سزا، قد آور، انا کے آئینے، منی مانی، تازہ دم، دہلیز، لاچارگی، کم ہمت، ترکِ تعلق، گمانِ گردشِ عکس و قمر، جنبشِ نگاہ، عکسِ تصویر، مہر ریزاں، انہدام، وضعداری، تمرِ یابی، جنبش، نوکِ جھونک، برائے نام، جڑیا گھر، لہولہان، خطۂ ارضی، قائم مقامیاں، زیست کی بے چیدگی، سادہ، مشغلہ سا، ناحق تدبیر، لامحالہ، معروس

مہر ریزاں، شب و بادہ، بے مروت، دروازہ، ستم نوازی، جلوہ افروز، قبر گاہ، شریعتِ جہاں، بے خبر، شعلۂ خیر و خطا، آئینہ بردار، بود و باش، حلقۂ ظلمات، احساسِ رواداری، تانا بانا، پراگندہ، بالا دستیاں، منتظم، بانگِ ذوق، میدان، المیہ، تحقیق، ممنوع، آنجہانی، پیپرویٹ، مردم شناسی، دھوم دھام، صاحبِ جاں، تحفظ، طائرانِ زیست، حلقۂ پرواز، اُٹھتے ہوئے رہیے، معتقد، پس تحریر وغیرہ کو کلیدِ معنی کہا جا سکتا ہے۔

اس جنبشِ نگاہ کے تیر و تبر کہاں
ہو چکا ہے ایک عرصہ سے ہمارا انہدام
وضعداری، اپنا پن، اخلاص، ہمدردی، لگاؤ
کیوں زعمِ بود و باش کا اظہار کرے کوئی
وہ نوک جھونک کا عالم بھی دیدنی ہوگا
یونہی برائے نام سبھی مر کے دیکھیے
حاجِ زیست کی قائم مقامیاں دیکھیں
تدبیر کا ناحق بھی تقدیر کا حصہ ہے
کھلکھلا کر ہنس دیا پھر بات پہ بے ساختہ
تمازتِ مہر ریزاں جو برستی رہی
پراگندہ ہے کتنا آدمی کا ذہن کیا کیجیے
اپنی اپنی بے حسی کے لوگ بے بس دار ہیں
وقت کا ناگ ازل سے پڑا پھیلا تھا
وہ اور بات ہے کہ دھوم دھام سے گزری
مہر ریزاں سے کیوں جھلک رہا ہے تو
بے مروت ہے ہمیں اپنا بنانا ہی نہیں

انہوں نے اپنی غزلوں میں مرکبات اور ترکیبوں کے اجتماع سے بھی شعری تفکر کے کئی متنوع زاویے اُجاگر کئے ہیں اور ان میں معنوی صفات کی وہ جوت جگائی ہے جو شعری اسلوب کی بازیابی میں معاون ہو سکتی ہے۔ الفاظ جو معنی کا دریچہ کھول دیتے ہیں اور جہانِ معنی کی بڑی سے بڑی دنیا بھی آباد کر سکتے ہیں اور جب یہ لفظ تخلیقی سطح پر استعمال ہوتے ہیں تو وہ زندگی کے بیچ ناظر کی طرح ہماری زندگی کا ایک حصہ بن جاتے ہیں۔ اس کا ثبوت وہ تکرار

کیسا آدمی ہوں میں

درد کی زمینوں کو
خون سے دل بناتا ہوں
رت جگے اگاتا ہوں
کیسا آدمی ہوں میں
ظلم کے نشانے پر
آ کے گر جاتا ہوں
گر کے مسکراتا ہوں
کیسا آدمی ہوں میں
شوق کے گھروندوں میں
پھول بھی اگاتا ہوں
آگ بھی لگاتا ہوں
کیسا آدمی ہوں میں
اپنے آپ کو جمشید
روز یاد آتا ہوں
روز بھول جاتا ہوں
کیسا آدمی ہوں میں

جمشید مسرور

لفظی اور تکرار تراکیب ہیں جن کا برتاؤ تخلیقی سطح پر ہوا ہے۔

کٹ گیا راستہ دیکھتے دیکھتے
یہ پہ نسبے، یہ جو نسبے، یہ سمندر، یہ ہوا
[illegible]
[illegible]
[illegible]
[illegible]
[illegible]
جہاں جہاں سے [illegible]

یہ شگفتہ شگفت میں ہمارے سنگ
کہیں جنوں عقل ہے جنوں عقل ہو چلا ہے
آئینہ عکس بھی ہے حیرت عکس بھی
جستجو، دیدہ وری، فہم و ادراک کے باوجود
چلتے چلتے، چلتے چلتے تھک بھی تو زندگی
خود باتیں خود سے خود نہیں خود کہیں
رفتہ رفتہ اپنی ڈگر و باطن ہی میں گھر گیا۔
کوئی بھی اونچا نہیں، نیچا نہیں
شناسا کی بندگی بھی نہ شناسا کی بندگی نہیں ہے
تھوڑی تھوڑی سی بے رخی بھی چاہیے۔

کلام اتنا متنوع ہے، مختصر لفظوں میں یہ الفاظ
ہے کہ سب کا احاطہ بہ یک وقت محال ہے۔
روزمرہ، محاورہ اور نثری لہجہ ایک اپنی
جمالیاتی فکر سے آراستہ ہیں تو ادھر حجابِ
ہستی اور رموزِ ہستی کے بے سجائے لگا رہنے
ہمیں متوجہ کرتے ہیں۔

تدبیر کا ناخن ہیں تقدیر کا عقدہ ہے
سب کے نکلے ہیں کسی راستے پہ
ہماری آنکھ کسی سے کہیں لڑی ہوگی
پھر بھی شیشے میں بال آتا ہے
آ گئے وہ لباس پہنے ہوئے

زندگی بہت ہی وزنی ہو گئی
فون کی ایک گھنٹی کے نام
سلیقے سے چلا گیا ہوگا
ان کی باتوں پہ ہنسیں کیسے ہم۔
کون ہے اس خالی بازار میں
بات کرنے میں بہت اچھا رہے
بیت زمانہ ہوا ابھی یاد آتا ہے
سادگی آپ نے یہ کیا چھپ سی
لگتا ہی ہے
دیکھتے ہی دیکھتے آ گئے دار و قطار

غزلیں

آتشِ غم میں مرا دل ہے کہ جلتا جائے ہے
زندگی کا روپ کس سانچے میں ڈھلتا جائے ہے
قدرِ حاضر کی کرم فرمائیاں ہم سے نہ پوچھ
وقت ہر لمحہ بہم نفرت اُگلتا جائے ہے
پائے ہمت میں وہ پہلی سی توانائی کہاں
ہر قدم پہ آدمی اب تو پھسلتا جائے ہے
اے متینِ حسنِ دُنیا اب تو لے اپنی خبر
میرے ہاتھوں سے ترا دامن نکلتا جائے ہے
کس قدر بے آسرا ہے آج کل کا آدمی !
خود ہی گرتا جائے ہے خود ہی سنبھلتا جائے ہے
حسنِ خود بیں کی ستم انگیزیاں ہائے نہ پوچھ
عشق بے چارہ کفِ افسوس ملتا جائے ہے
پھول کی سی نازکی ہے بجلیوں کی سی تڑپ
حسن کس کا اے شفق شعروں میں ڈھلتا جائے ہے۔

گوپال کرشن شفق

ہیں دُنیائے دل کو مٹا جانے والے
نگاہوں میں میری سما جانے والے
ذرا دیکھ لے حالِ چاکِ گریباں
کہ دیوانہ اپنا بنا جانے والے
کہاں تجھ کو ڈھونڈوں کہاں تجھ کو پاؤں
اب اتنا بتا دے پتا جانے والے
تصور میں تیرے میں کھویا ہوا ہوں
مجھے اپنا جلوہ دکھا جانے والے
ہر اک لمحہ اب تیرا یادوں میں گزرے
دعائیں مری سن ذرا جانے والے
اندھیرے میں کیوں چھوڑ کر جا رہے ہیں
مری شمعِ دل کو بجھا جانے والے
ملاقات شفقت کی ہوگی کہاں پہ
خدا کے لئے یہ بتا جانے والے

میر شفقت علی وفاؔ

رہزنی کا ماجرا تھا کہ ہر جادے میں تھا
رہبر کا نقشِ پا بھی مگر راستے میں تھا
جو شور ہر طرف تھا وہ کس سلسلے میں تھا
شاید کوئی تو بال مرے آئینے میں تھا
مے خانۂ حیات کی مستی نہ پوچھئے
عالم تھا بے خودی کا نئے نشے میں تھا
میری ہی آنکھ بند رہی ورنہ وہ مستور
ماہِ تمام جلوہ فگن غم کدے میں تھا
سجدے میں سر جھکائے ہوئے اپنے دل مگر
انسانیت کا راز نہاں میکدے میں تھا
منزل پہ اے مسافرِ ہستی کہاں نصیب
وہ لطفِ انتظار کہ جو فاصلے میں تھا
سہگل پہنچ کے منزلِ مقصود پہ کھلا
منزل میں تھا کہاں جو مزا راستے میں تھا

رادھا کرشن سہگل

مسیحی تعلیمات

شعیب

قرآن حکیم کے بموجب اس دُنیا کے ہر کونے پر ہر قوم میں، ہر دَور میں نبی اور پیغامبر بھیجے گئے تاکہ وہ اپنی قوم کی اصلاح کریں اور نیک راہ پر چلنے کے راستوں کی نشاندہی کریں تاکہ دُنیا میں امن و امان قائم رہے اور انسان دُکھ سُکھ میں اپنے معبود کو یاد بھی کرتا رہے۔ ان نبیوں کی تعداد ایک لاکھ چوبیس ہزار بتائی گئی ہے۔ ان میں سے چار پیغمبروں کا ذکر زیادہ کیا گیا ہے جس سے کہ ان کی اہمیت کا اندازہ ہوتا ہے۔ انھیں چاروں نبیوں پر اللہ تعالیٰ نے اپنا مکمل کلام بھیجا ہے۔ سب سے پہلا نام حضرت داؤد علیہ السلام کا آتا ہے، جن پر توریت اُتاری گئی۔ دوسرا نام حضرت موسیٰ علیہ السلام کا آتا ہے جن پر زبور اتاری گئی۔ تیسرا نام حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا آتا ہے جن کو انجیل مقدس عنایت کی گئی۔ اور سب سے بعد میں تمام صحائف اور تینوں بڑی کتابوں کو ملا کر اسلام کو مکمل کر کے قرآن شریف کی شکل میں اُتارا گیا، حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم پر۔

حضرت داؤد علیہ السلام کے پیرو اب روئے زمین پر تقریباً ناپید ہیں۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام کو ماننے والے جو یہودی کہلاتے ہیں۔ ان کا تسلط اسرائیل پر ہے۔ ویسے یورپ اور امریکہ کے ممالک میں بزنس اور سائنس پر بھی انھیں کا قبضہ ہے۔ یہودیوں کی تعداد بھی بہت کم ہے۔ حضرت عیسیٰ کے ماننے والے اس دُنیا میں زیادہ پائے جاتے ہیں۔ دُنیا کے انتہائی پچھڑے اور غیر مہذب علاقوں میں بھی حضرت عیسیٰ کے ماننے والے ضرور ملیں گے۔ عیسائیوں کے بعد تعداد کے لحاظ سے مسلمانوں کا نمبر آتا ہے۔

سوال یہ پیدا ہوتا ہے۔ وہ کونسی وجوہات یا عوامل ہیں جن کی بنا پر عیسائیوں کی تعداد دُنیا بھر میں سب سے زیادہ ہے۔ نیز یہ لوگ کیوں اور کس بنا پر دُنیا بھر میں پھیلے ہیں، کیوں؟ یہ لوگ ان علاقوں میں جا بسے ہیں جہاں کسی زمانے میں انسان کو انسان کو سب سے زیادہ مرغوب تھا۔ ان باتوں کا مکمل اور چھوٹا سا جواب ہے حضرت عیسیٰ کی تعلیمات اور پھر ان تعلیمات کو بڑھانے یا پھیلانے والوں کا جذبہ یقین عمل پر بھروسہ وغیرہ۔

حضرت عیسیٰ علیہ السلام اللہ کے اور پیغمبروں کی طرح معجزات سے نوازے گئے مُردہ جسم میں "قُم" کہہ کر جان ڈال دیا کرتے خطرناک سے خطرناک مرض کی شفا مریض کے ہاتھ پھیر دینے سے ہو جاتی تھی۔ حضرت کو ایک گھرانے سے بہت محبت تھی۔ اس میں ایک نوجوان رہتا تھا جس کا نام لعزر تھا اور اس کی دو بہنوں کا نام مارتھا اور مریم تھا۔ مسیح پر ایک وقت ایسا آیا کہ وہ بستی

کے زیادہ تنگ کرنے پر شہر سے دُور اپنے حواریوں کے ساتھ گوشہ نشین ہو گئے تھے۔ اسی دوران ایلاجر بیمار پڑا اور اس کا انتقال ہو گیا۔ اس کے انتقال کی خبر سن کر مسیح اپنے ساتھیوں کے منع کرنے کے باوجود کہ شہر والے پھر تنگ کریں گے اور پتھر ماریں گے وہ بیت اللحم کی جانب چل پڑے۔ ان کے آنے کی خبر سن کر دونوں بہنیں اُن سے ملنے کے لئے گھر سے بھاگتی ہوئی آئیں اور مسیح کو دیکھ کر زار زار رونے لگیں اور کہا۔ "اے آقا! اگر تو یہاں ہوتا تو ہمارا بھائی کبھی نہ مرتا۔" مسیح نے کہا موت اور زندگی میں ہی ہوں۔ اگر کوئی مر بھی جائے اور مجھ میں بنا رہے تو وہ پھر سے زندہ ہو جائے گا۔ مریم بولی ہاں جب خدا سب کو زندہ کرے گا تب میرا بھائی بھی زندہ ہو جائے گا۔ ان لڑکیوں کے دُکھ کا احساس کرتے ہوئے مسیح دل میں بہت دُکھی ہوئے اور کہا ایلاجر کی قبر کہاں ہے؟ لوگوں نے انھیں ایلاجر کی قبر پر پہنچایا۔ مسیح نے دل میں بہت درد سے بھر کر آواز دی۔ "اے ایلاجر میں تجھے آواز دیتا ہوں تو باہر نکل آ۔" ایلاجر اپنے کفن میں بندھا ہوا قبر سے باہر نکل آیا۔ مسیح نے لوگوں سے کہا: "اس کے کفن کو کھول دو اور اس کو اس کے گھر جانے دو۔" اس سے پہلے ایلاجر کی بہنوں نے مسیح کو روکا تھا کہ اسے کیوں دستک دیتا ہے؟ مرے ہوئے کئی دن ہو گئے ہیں اور اب کچھ نہیں ہو سکتا۔ مسیح نے کہا ___ اگر تم ایمان رکھو گی تو خدا کے بڑے کرشمے کو دیکھو گی۔ مسیح نے کہا کہ گناہ کی مزدوری موت ہے۔ گناہ سے توبہ کرو۔ کیونکہ گناہ کرتے رہتے ہوئے کوئی انسان خدا کے پاس نہیں جا سکتا۔ خدا روح ہے اور یہ لازمی ہے کہ لوگ پاکیزگی اور دل کی سچائی سے اس کی پرستش کریں۔

ہر دَور اور ہر سماج میں ہمیشہ سے یہ ہوتا آیا ہے کہ کوڑھیوں کو بستی میں نہیں رہنے دیتے حضرت عیسیٰ کے زمانے میں بھی یہی رواج تھا۔ ایک مرتبہ کچھ کوڑھی اُن کی خدمت میں حاضر ہوئے اور اُن سے اپنے مرض سے چھٹکارا پانے کے لئے درخواست کی۔ مسیح نے اُن کے جسموں پر ہاتھ پھیرا تو وہ پل بھر میں بھلے چنگے ہو گئے اور دُعائیں دیتے ہوئے چلے گئے۔ ان میں ایک نوجوان کے علاوہ باقی سب ناشکرے نکلے۔

حضرت عیسیٰؑ کے ماننے والے لوگوں کے پاس نہ تو معجزات تھے، نہ کمالات۔ انھوں نے اس کا بدل یہ نکالا کہ غریب اور نادار بستیوں میں جا جا کر تعلیم کو عام کیا، چلتی پھرتی ڈسپنسریاں قائم کیں اور لوگوں کو مفت دوائیں اور غذائیں تقسیم کیں۔ اور یہ کام اس طرح سے کیا کہ غریب لوگوں کے دلوں کو جیت لیا۔ عیسائی نرسوں اور ننوں میں خدمت کا جذبہ زیادہ ہوتا ہے۔ دوسرے نرسنگ ہوم کے پیشے کو بھی باعزت اور باوقار بنا دیا۔ ان سب کاموں کو بوڑھے لوگ نہیں نوجوان لوگ چلاتے ہیں۔ بوڑھے تو صرف ہدایات دینے کا کام کرتے ہیں۔

عدم تشدد، جس کا سب سے زیادہ پروپیگنڈہ اور استعمال ہندوستان میں ہوا، اس کی سب سے پہلی آواز اور ہدایت حضرت عیسیٰؑ نے دی تھی۔ انھوں نے اپنے حواریوں کو سمجھایا تھا کہ اگر کوئی شخص تمہارے گال پر طمانچہ مارے تو فوراً اسے دوسرا گال پیش کر دو۔ وہ خود ہی شرما جائے گا، معافی مانگے گا اور اپنی غلطی کا احساس کرے گا۔ اسی وجہ سے عیسائی مرد و عورت دونوں میں نرمی، حلیمی، ملنساری، دوسروں کے دُکھ درد میں شریک ہونے کا جذبہ زیادہ ملتا ہے۔ ویسے اس زمانہ جاہلیت میں اس بات پر عمل کرنا خود ایک معجزے سے کم نہیں۔ اور یہ کون کرتا تھا، حضرت عیسیٰؑ کے نوجوان حواری، ساتھی اور پیرو۔ اس نرمی، حلیمی، ملنساری کی ٹریننگ شروع سے ہی ملتی ہے اور یہی عادات اطوار عیسائیوں کو اپنے مذہب کی تبلیغ میں بہت مدد کرتی ہیں۔ ہر سماج میں، ہر طبقے میں اچھائیاں بُرائیاں اور کمیاں ہوتی ہیں۔ اسی طرح اشخاص میں بھی اچھائیاں اور بُرائیاں دونوں موجود ہوتی ہیں۔ لیکن اگر خرابی ہی سے خرابی کو ختم کیا جائے تو نہایت غیر مناسب بات معلوم ہوتی ہے۔ ایک سماجی برائی کو ختم کرنے کا یا اس کو روکنے کا جو طریقہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے اپنایا وہ نہایت مناسب اور انصاف، ایمانداری اور سچائی پر مبنی تھا۔ گنہگار مرد یا عورت کو اس کے گناہ کی سزا ضرور ملنی چاہیئے۔ لیکن اگر ایک گنہگار دوسرے گنہگار کو سزا دینے کے لئے اٹھ کھڑا ہو تو برائیوں کا خاتمہ ناممکن ہو جائے گا اور انصاف بھی کہیں نہیں رہے گا۔ ایک مرتبہ حضرت عیسیٰؑ اپنے شاگردوں کے ساتھ کہیں جا رہے تھے۔ راستے میں انھیں ایک جگہ بہت بھیڑ دکھائی دی۔ وہ وہاں پہنچے تو دیکھا کہ ایک عورت کو بیچ میں کھڑا کر کے لوگ اس کے چاروں طرف دائرے کی شکل میں کھڑے ہو کر اس پر پتھر برسا رہے تھے۔ اس عورت کے ہر حصے سے خون رس رہا تھا۔ مسیح بھیڑ کو چیرتے ہوئے اس عورت تک پہنچے اور انھوں نے بلند آواز سے لوگوں سے سوال کیا کہ اس عورت کا قصور کیا ہے؟ لوگوں نے جواب دیا کہ یہ زانیہ ہے اور رنگے ہاتھوں پکڑی گئی ہے اس نے بستی میں بڑی گندگی پھیلا رکھی ہے۔ مسیح نے کہا یقیناً اس نے گناہ کیا ہے مگر اب اس پر پہلا پتھر وہی شخص پھینکے گا جس نے زندگی میں کوئی گناہ نہ کیا ہو۔ تمام لوگ دھیرے دھیرے کھسک گئے۔ بعد میں اس عورت نے بہت توبہ کی اور گناہ نہ کرنے کا عہد کیا۔ تلسی داس نے شاید اسی واقعے سے متاثر ہو کر کہا:

بُرا جو دیکھن میں چلا بُرا نہ ملیا کوئے
جب دیکھا من اپنا مجھ سے بُرا نہ کوئے

بہادر شاہ ظفر نے بھی اسی واقعہ کی طرف اشارہ کیا ہے:

نہ تھی حال کی جب ہمیں اپنے خبر
رہے دیکھتے اوروں کے عیب و ہنر
پڑی اپنی بُرائیوں پر جو نظر
تو نگاہ میں کوئی بُرا نہ رہا

مذہب وہی کامیاب ہوتا ہے جو سماج کے ہر طبقے پر نظر رکھے اور زندگی کی تمام باریکیوں کو

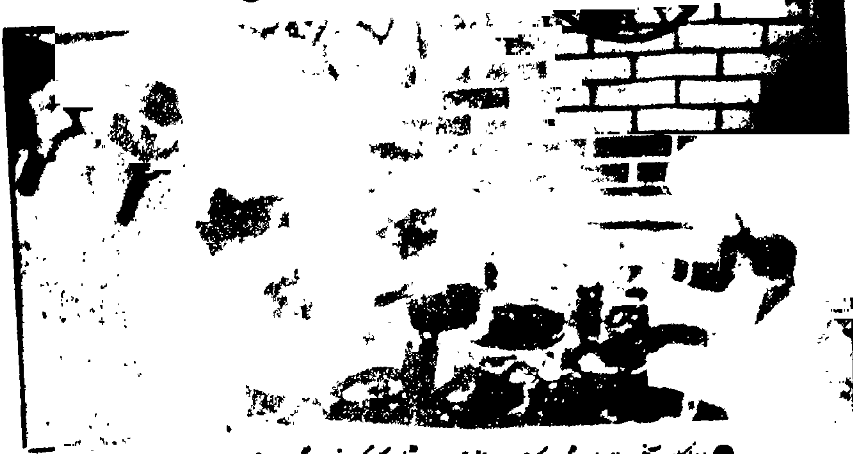
تفصیل کے ساتھ بیان کرے۔ امیر اور غریب کا فرق ازل سے ہے اور ابد تک رہے گا۔ ہر دفعہ جب امیر اپنی دولت کے بل بوتے پر مذہب کو اپنے مطلب کو بنانے کی کوشش کی یا پیسے کے زور پر اعمال میں کمی بیشی کر کے جنت کا حقدار بننے کی تمنا کی۔ ایک مرتبہ ایک نوجوان مسیح کے پاس آیا اور ان سے معلوم کیا کہ حیاتِ ابدی پانے کے لئے میں کیا کروں؟ مسیح نے اس سے سوال کیا کہ کیا تو پاک کلام کو اچھی طرح جانتا ہے؟ تو اس نے جواب دیا کہ ہاں، خوب اچھی طرح سے جانتا ہوں اور عمل بھی خوب اچھی طرح کرتا ہوں۔ تب مسیح نے کہا کہ ایک کام کر دو کہ تم اپنی ساری جائیداد اور دولت کو غریبوں میں تقسیم کر دو، اس کا اجر تمہیں دوسری دُنیا میں ملے گا۔ وہ نوجوان مایوس ہو کر چلا گیا۔ دولت کے بدلے میں اس نے ابدی زندگی اور حقیقی زندگی کے حصول کو نقصان کا سودا تصور کیا۔ اس دولت مند نوجوان کے جانے کے بعد حضرت عیسیٰؑ نے اپنے شاگردوں سے فرمایا کہ اونٹ کا سوئی کے ناکے میں سے نکلنا آسان ہے مگر ایسے دولت مند کا آسمان میں داخل ہونا ناممکن ہے جو دولت کو غریبوں، ضرورت مندوں اور ناداروں پر اس لئے خرچ کرنے سے گھبراتا ہو کہ اس کی دولت میں کمی آجائے گی۔

حضرت عیسیٰؑ کو بچّوں سے بہت پیار تھا۔ بچے کا دل چھل کپٹ اور ریاکاری سے بالکل پاک ہوتا ہے۔ اسی وجہ سے اس کو معصوم کہتے ہیں۔ ایک مرتبہ حضرت عیسیٰؑ کہیں سے بہت تھکے ہارے آکر بیٹھے ہی تھے کہ بہت سی عورتیں اپنے معصوم بچّوں کو لے کر آئیں تاکہ وہ اُن کے سر پر ہاتھ رکھیں اور انھیں دُعائیں دیں۔ مسیح کے حواریوں نے انھیں روکا تو مسیح نے انھیں منع کیا اور کہا کہ بچّوں کو میرے پاس آنے دو، انھیں منع مت کرو کیونکہ آسمان کی بادشاہت ایسے ہی بچّوں کی ہے۔ اور انھوں نے بچّوں کو گود میں لے کر انھیں پیار کیا اور دُعائیں دیں۔

حضرت عیسیٰؑ نے اپنے شاگردوں کو نصیحت کی کہ اگر کوئی گنہگار اپنے کئے پر شرمندہ ہو اور آئندہ گناہ نہ کرنے کا عہد کرے اور اللہ کی عبادت میں خلل نہ ڈالے تو اللہ اس کو معاف کر دیتا ہے۔ مریم نام کی ایک عورت کو جب یہ معلوم ہُوا کہ مسیح اس کی بستی کے ایک عالم شمعون کے گھر تشریف لائے ہیں تو وہ اُن سے ملنے سیدھی اُن کے پاس آئی اور اُن کے قدموں پر سر رکھ کر رونے لگی۔ اپنے آنسوؤں سے مسیح کے پیروں کو گیلا کرتی اور اپنے بالوں سے پیروں کو صاف کرتی۔ شمعون کو یہ بُرا لگا۔ اُس نے اپنے دل میں یہ سوچا کہ اگر مسیح نبی ہوتا تو ضرور یہ احساس کرتا کہ یہ عورت جو اسے چھُو رہی ہے کتنی بد چلن ہے اور اتنی گنہگار عورت کو کبھی اپنے پیر چھُونے نہیں دیتا۔ حضرت عیسیٰؑ جو کہ اللہ کے پیغمبر تھے، انھوں نے شمعون کے دل کی بات جان لی اور اس کو مخاطب کر کے کہا شمعون جس کا زیادہ قرض ہو اور اس کا اس کا مالک معاف کر دے اور جس کا قرض کم ہو، وہ بھی معافی پائے تو بتا کون اپنے مالک سے محبت کرے گا۔ شمعون نے جواب دیا جس کا قرض زیادہ تھا۔ مسیح نے کہا۔ تو نے ٹھیک سوچا۔ پھر کہا دیکھو میں تیرے گھر میں مہمان ہو کر آیا اور تو نے میرے پاؤں دھونے کو پانی تک نہ دیا اور یہ عورت جب سے آئی ہے رو رو کر اپنے آنسوؤں سے میرے پاؤں کو گیلا کرتی ہے اور بالوں سے پونچھتی ہے۔ پھر انھوں نے اس عورت سے کہا۔ اے بیٹی جا تیرے گناہ معاف ہوئے، اب پھر سے گناہ مت کرنا۔ وہ عورت یہ سُن کر خوش خوش اپنے گھر چلی گئی۔



جب فلمی ستارے مدّاح بن گئے



● اداکار سنجے دت اور اُن کے مہمان نورمحمدی ہوٹل کے کھانے سے لطف اندوز ہو رہے ہیں

فلمی ستارے جو ہر دم مدّاحوں میں گھرے رہتے ہیں، جب خود کسی کے مدّاح بن جائیں تو یہ حیرت کی بات ہے۔ لیکن اگر آپ نورمحمدی ہوٹل کی نلی نہاری کا ایک بار ذائقہ لے لیں تو پھر آپ کو تعجب نہیں ہوگا۔ یہ ہے ہی اتنی عمدہ، لذیذ اور صحت مند کہ پہلے ہی لقمے میں خواص و عوام کا دل موہ لیتی ہے۔ اسی لئے نورمحمدی ہوٹل کے مستقل گاہکوں میں بڑی بڑی ہستیاں، مشہور فلمی ستارے شامل ہیں۔ یہاں کی نلی، نہاری، بھیجہ، پائے، ماش کی دال اور دیگر کھانوں کے پیچھے ۹۰ سال کا تجربہ اور جناب عبدالحکیم مالک نورمحمدی ہوٹل اور ان کے فرزند خالد حکیم کی ذاتی نگرانی شامل ہے، جس نے اسے ممتاز بنالیا ہے، آپ یہاں تشریف لاکر شوق فرمائیں، اپنے احباب کے لئے گھر لے جائیں یا پارٹی کے لئے لے جائیں۔ آپ اور آپ کے مہمان ذائقہ کو کبھی فراموش نہ کرسکیں گے۔

نورمحمدی ہوٹل، وزیر بلڈنگ 181/183 ای۔ آر۔ روڈ، بھنڈی بازار، بمبئی ۴۰۰۰۰۳

فون ہوٹل: 8511008 فون دفتر: 8516115

بابِ انتقاد

'بچھڑے بلاوے'
(دیپک قمر)
قیمت : پچاس روپے
ناشر : دیپک قمر، ۱۸۵۔ آبو لین۔
میرٹھ چھاؤنی ۲۵۰۰۰۱۔
تقسیم کار : خانِ جہاں بک سنٹر اینڈ نیشنل
انصاری مارکیٹ' دریا گنج '
نئی دہلی ۱۱۰۰۰۲۔

دیپک قمر نے اس نئے گزرے عہد میں اردو ادب کو اپنی تابانیوں سے کس قدر جگمگ کیا ہے اور اپنے فکر و شعور سے کتنا متاثر کیا ہے یہ ان تمام پرستارانِ اردو پہ کوئی آشکار ہے جنہوں نے ان کی تخلیقات کو پڑھنے کی طرح پڑھا ہے۔

"بچھڑے بلاوے" ان کی تازہ تصنیف ہے جو زیور طباعت سے آراستہ ہو کر حال ہی میں منظر عام پر آئی ہے۔ اس کے ایک ایک حرف میں کتنی مستیاں ہیں، یہ ان سے پوچھئے جنہوں نے بچھڑے بلاوے کرنے والوں، بولیاں ٹھولیاں بولنے والوں اور بھٹے بھٹے کپڑے والوں کی ٹولیاں دیکھی ہیں۔

قمر کے ماہیوں میں روایتی حسن کے ساتھ ساتھ بانکی جدیدیت کا البیلا پن بھی جلوہ گر ہے۔ تمام ماہیے ایک ہی بحر اور ایک ہی وزن یعنی بحر ہزج مربع اخرب "مفعول مفاعی لن" میں تخلیق ہوئے ہیں۔ اس وزن میں "مفعول فع' مفعول فع" کرنا بھی روا ہے۔ مگر ماہیے کی روایت ہے پیشِ نظر اس مخصوص روایت سے کسی بھی ماہیے میں استفادہ نہیں کیا گیا ہے۔ "ماہیے" کو مزید دوآتشہ بنانے کے لئے اس کو مقفیٰ کرنا بھی شاعر کی فنکارانہ صلاحیت کا پتہ دیتا ہے۔

اصطلاحِ اردو شاعری میں اس صنفِ سخن کو "تثلیثِ مقفیٰ" کا نام دیا جا سکتا ہے۔

اردو ادب میں قمر کی یہ کوشش نہایت کامیاب ہے اور اوّلین اضافہ ہے!

ڈاکٹر زار علامی

شاعری فن ہے وجدانی کیفیت کا۔ یہ سچے جذبوں کی ایک ایسی ورکشاپ ہے جس میں کام کرنا کسی مادی میکینک کے بس کی بات نہیں۔ اگر کوئی فنکار سچے جذبوں کا تاثر دینے میں کامیاب ہو جائے تو سارے اخلاقی ساز و برگ مصنوعی معلوم ہوتے ہیں۔ دیپک قمر ان شعرا میں سے ہیں جو ہمیشہ غیر تقلیدی انداز میں فن پارے پیش کر کے اپنے قاری کو نہ صرف چونکاتے ہیں، بلکہ اس کی روح کے اندر تک اتر جاتے ہیں۔ سچے اور کھرے معصوم جذبوں کے ساتھ۔ دھیمی دھیمی کہیں تیز رَو کے ساتھ دیپک قمر کا شعری سفر بڑا مستحکم ہے۔ شاعری کی پنچایت میں کسی اچھے اور سچے شاعر کے لئے اپنی شناخت کرانا اور اسے برقرار رکھنا ایک بہت مشکل کام ہے، مگر دیپک قمر اس ہفت خواں سے بڑی مردانگی سے گزر گئے ہیں۔ "بچھڑے بلاوے" اردو میں "ماہیا" کی اوّلین شکل ہے جو بنیادی طور پر عشق اور اظہارِ عشق کی مظہر ہوتی ہے۔

ان کے یہاں اپنے طویل تخلیقی سفر کا وہ محتاط رویّہ بھی ہے کہ کہیں بھی شاعر کو ماضی کے تسلسل سے وابستہ رکھتا ہے اور کہیں کس مقام سے گریزاں ہوتا ہے۔ "بچھڑے بلاوے" کی شاعری میں واقعوں کے جتنے عکس نقاب کشا ہوئے وہ ادبی بصیرت میں اضافے معلوم ہوتے ہیں۔ "ماہیا" کی عوامی صنفِ سخن کو دیپک قمر نے اپنے مخصوص لب و لہجے سے خواص کی چیز بھی بنا دی ہے۔ سچی اور اصلی واردات کو خوبصورت اسلوب میں پیش کرنا بڑی صلاحیت کا کام ہے جبکہ دوسرے لوگ ان وارداتوں کو ڈرامائی انداز میں پیش کر کے غیر فطری بنا دیتے ہیں۔ دیپک قمر اپنے عہد کے ایسے شاعر ہیں جو آئندہ بہت برسوں تک ہندوستان کی سوندھی دھرتی کی خوشبو کی طرح اپنی رسیلی شاعری سے قریہ قریہ، گلی گلی، شہر شہر، دشت دشت تشنگانِ ادب کو سیراب کرتے رہیں گے۔ مجھے ان سے بہت توقعات ہیں اور ان کے اگلے مجموعے "پھولیاں پھولیاں پھوار" کا بے صبری سے انتظار ہے۔

مصوّر سبزواری

مَن کہ مکتوب الیہ

مکرمی۔ تسلیم!

" دلی کے مشاعرے" اپنی مثال آپ ہے۔ جب تک اُردو زبان اور اس کی شاعری دُنیا میں رہے گی " دلی کے مشاعرے" ریفرنس بُک کے طور پر اپنی اہمیت اور افادیت کی حامل رہے گی۔ "کل ہند مشاعرے" اور " انڈو پاک مشاعرے" کتابی شکل میں کب تک آرہے ہیں۔

آپ کی طبیعت ان دنوں کیسی ہے؟ صحت کا خاص خیال رکھیں کیونکہ آپ کی شخصیت اردو دُنیا کی امانت ہے۔

خیراندیش
ضمیر اختر، رانچی

مکرمی سرور صاحب

آداب!

آپ کی علالت کے باعث 'شانِ ہند' کی اشاعت میں دیری ہونے کے باوجود آپ سال بھر کے بارہ شمارے دیتے ہیں یہ آپ کی صحافتی ایمانداری ہے۔ آپ نہ تو دو ماہ کا مشترکہ شمارہ شائع کرکے خریداروں کو نقصان پہنچاتے ہیں اور نہ ہی کسی ماہ کا ناغہ کرکے۔ میں گزشتہ پچیس سالوں سے شانِ ہند کا مستقل خریدار رہا ہوں۔ آپ نے ہر سال کے بارہ شمارے دیئے ہیں۔ یہ اہتمام آجکل کے رسائل میں نہیں پایا جاتا۔ بھگوان سے پرارتھنا ہے کہ آپ صحت مند رہیں اور شانِ ہند کو اسی عزم و استحکام سے جاری رکھیں۔

دُعاگو
رام چندر کھتوریہ۔
کیتھل (ہریانہ)

سرور صاحب۔ تسلیمات!

آپ نے "دلی کے مشاعرے" اس شرط بعد رجسٹرڈ پیکٹ سے بھجوادی کہ اگر مجھے کتاب پسند نہ آئے تو رجسٹرڈ پیکٹ سے واپس کردوں۔ میں انتہائی شکریے کے ساتھ اس کتاب کی قیمت بذریعہ منی آرڈر بھجوا کر آپ کے اس اعتماد کی داد دیتا ہوں کہ " دلی کے مشاعرے" ایک ایسی کتاب ہے جسے کوئی بھی ناپسند نہیں کرسکتا، بشرطیکہ کتاب پڑھنے والے میں ادبی اور شعری شعور کا فقدان نہ ہو۔ کیا آپ اپنی پہلی تصنیف " یہ کون یار بہ انداز محرمانہ گزرا" بھی اسی شرط اور اعتماد سے بھجواتے ہیں؟ اگر ایسا ہے تو واپسی ڈاک یہ کتاب بھی مجھے رجسٹرڈ پیکٹ سے بھجوادیں۔ اگر کتاب پسند آئی تو کتاب دستیاب ہونے کے دو دن بعد ہی اس کی قیمت بذریعہ منی آرڈر پیش کردوں گا۔

نیاز مند
ڈاکٹر ادم پرکاش فرحت

برادرم سرور صاحب

ابھی حال ہی میں اسٹاک ہوم (سویڈن) کے کسی ادارۂ ادبی کی طرف سے ۳۰ ستمبر سے ۸ اکتوبر ۱۹۸۹ء تک وہاں پر ادیبوں کی ورکشاپ کی ایک سرگذشت موصول ہوئی ہے جس میں یوروپ اور امریکہ میں بسنے والے چند نوجوان ہندوستانیوں کی اردو، ہندی اور پنجابی کی شاعری اور نثر نویسی کے نمونے دیئے گئے ہیں۔ ان میں سے بیشتر قلمکار آزادی کے بعد کی پیداوار ہیں اور کئی دہائیوں سے اُن ممالک میں رہ رہے ہیں۔ لیکن خوشی اس امر کی ہے کہ وہاں رہتے ہوئے بھی ان کو اپنے ملک کی ثقافت سے گہرا لگاؤ ہے اور وہاں رہ کر وہ اپنے آباء و اجداد کی زبانوں کے فروغ میں سرگرمی سے حصہ لے رہے ہیں۔ اس ادبی ورکشاپ میں جن قلمکاروں نے حصہ لیا ان کے نام ہیں۔

اُردو شاعری میں اسعد فقیہہ (سویڈن)، جاوید دانش (کینیڈا)، عرفان ملک (سویڈن)، نصر ملک (ڈنمارک)، افتخار نسیم (امریکہ)، مسعود قمر (سویڈن) اور خالد سہیل (کینیڈا)۔

اُردو نثر میں لکھنے والے ہیں: حمید اکرم (ناروے)، مسعود قمر (سویڈن)، خالد سہیل (کینیڈا) اور سائیں سچا (سویڈن) کا نام شامل ہیں۔

پنجابی شاعری میں عرفان ملک (سویڈن)، رانی نگیندر (امریکہ) اور افتخار نسیم (امریکہ) کی پنجابی شاعری کے نمونے دیئے ہوئے ہیں اور پنجابی نثر میں رانی نگیندر کی کہانی ہے جو موجودہ پنجاب کی سیاسی حالات کے متعلق ہے۔ شکایت کی بات یہ ہے کہ یہ تمام مضامین اُردو رسم الخط میں چھپے گئے ہیں۔ صرف رانی نگیندر کی کہانی گورمکھی میں چھپی ہے ورنہ تمام اشعار و حکایات اُردو رسم الخط میں ہیں اور اس تقریب کو منعقد کرنے والے اور کامیابی سے چلانے والے سائیں سچا (سویڈن) اور خالد سہیل (کینیڈا) ہیں۔ یہ امر باعث مسرت ہے

ان دو دو میشوں میں بستے ہوئے یہ لوگ اپنے ملک اور صوبجات کی ثقافت کو بدستور فروغ دینے میں منہمک ہیں۔ خوشی کی بات تو یہ ہے کہ ان تمام مضامین شعر و نثر کا بڑا اچھا انگریزی ترجمہ بھی دیا گیا ہے تاکہ مغربی ممالک کے لوگ بھی اس سے استفادہ حاصل کر سکیں۔ اس کتاب کی طباعت کلکتہ کے اُردو ماہنامہ "انشاء" کے مدیر جناب ف۔ س۔ اعجاز کی وساطت سے انہی کے پریس میں ہوئی ہے۔

تمام نویسندگان کے بارے میں مختصراً اُن کے جنم دن اور مستقل رہائش کے ممالک کے نام بھی دیئے گئے ہیں۔ اس سے یہ پتہ چلتا ہے کہ تمام نویسندگان نے ملک کی تقسیم کے بعد ہی ہوش سنبھالا ہے اور کئی تو پیدا بھی بعد از تقسیم ہوئے ہیں اور کئی دہائیوں سے ان ممالک میں آباد ہیں۔ جب اُن کے والدین تقسیم کو دیکھتے ہوئے ان ممالک میں ہجرت کر گئے اور یہ اُن کے ساتھ ہی چلے گئے۔ حیرانی اس امر کی ہے کہ ان ممالک میں مستقل رہائش رکھتے ہوئے بھی اُنہوں نے اپنی تہذیب، ثقافت اور زبان کو فراموش نہیں کیا بلکہ اس میں لکھنے بھی لگے ہیں۔ ان کی تحریروں میں اکثر و بیشتر غیر ممالک کے رسوم و رواج کا پس منظر ہے لیکن زبان اُن کی مستند ہندوستانی ہے جو بہت خوشی کا مقام ہے۔ ایسے لوگوں کی حوصلہ افزائی ہر ہندوستانی کا فرض ہے۔

آپ کا دعاگو بندہ

ہیرالال چ[illegible]

محترم سرور صاحب، تسلیم

آپ کا کرم نامہ ملا، تہہ د[illegible] شکریہ۔

آپ کی تحریر نے مجھے جو حوصلہ دیا، اس کا کس زبان سے شکریہ ادا کروں۔ یہ دُرست ہے کہ آزادی کے بعد سے اب تک اُردو اور چھوٹے اخبارات کے بارے میں پارلیمانی سطح پر جو آواز نہیں اٹھائی گئی تھی میں نے چھوٹے اور اُردو اخبارات کی دشواریوں کو عملی طور پر دیکھا ہے۔ اسی لئے اپنی مختصر سی مدت میں ایوان میں اس سلسلہ میں جو آواز میں نے اٹھائی ہیں ان کے مثبت نتائج سامنے آرہے ہیں، اور آئیں گے۔ ابھی تو آغاز ہے اور میری ادنیٰ سی جدوجہد۔ آپ جیسے بزرگوں کی دعائیں شامل حال رہیں تو میں اس میدان میں کچھ خدمت کرنے کے قابل ہو سکوں گا میرے لئے جو خدمت ہو یاد فرمائیں۔

نیازمند

م۔ افضل

(ممبر پارلیمنٹ)

مشہور محقق جناب انور سدید کا فرمان

دِلّی کے مُشاعرے

مُشاعروں کی تخیلی رُوداد نگاری کا اوّلین نقش مرزا فرحت اللہ بیگ نے بنایا۔ اس کو تمثیلی رُوپ دتاتریہ کیفی نے دیا۔ آزادی کے بعد ۶ فروری ۱۹۵۰ء کو جب دہلی میں بھارت کے جشنِ جمہوریہ پر لال قلعہ میں پہلا مُشاعرہ ہُوا تو اس کی رُوداد سرور تونسوی نے لکھی اور یہ اتنی مقبول ہوئی کہ اُن سے ہر سال اس قسم کی رپورٹ لکھنے کا مطالبہ کیا جانے لگا۔

زیرِ نظر کتاب "دِلّی کے مُشاعرے" سنہ ۱۹۵۰ء سے لے کر سنہ ۱۹۸۴ء تک کے اہم مُشاعروں کی رُوداد ہے۔ سرور تونسوی نے ان مشاعروں میں محض ایک شریکِ محفل شخص کا فریضہ ادا نہیں کیا، بلکہ وہ ان مشاعروں میں نکتہ رسی اور سخن شناسی کا ثبوت بھی دیتے ہیں۔ اور ہر غزل پر اپنا بے لاگ تبصرہ کر کے غزل کی تعیینِ قدر بھی کر ڈالتے ہیں۔ اس ضمن میں اُن کی ایک خوبی یہ ہے کہ وہ صداقتِ رائے سے گریز نہیں کرتے اور کسی کو ستائشی رائے کی روشنی میں سرابلند ہونے کا موقعہ بھی نہیں دیتے۔ اس کتاب میں سرور تونسوی ایک ناظر کی صُورت میں سامنے آتے ہیں جو مشاعرے کے منظر کی سب حرکتیں دیکھ رہا ہے انہیں لوحِ دل پر محفوظ کر رہا ہے اور اب انھیں کتابی صُورت دے کر اس دور کی یادوں کو تازہ کر رہا ہے۔

مُشاعرہ اُردو تہذیب کا ایک اہم اور روشن ادارہ تھا، لیکن مرورِ ایام کے [illegible]تو شاعر تفریح رساں بن گیا اور مشاعرے کا تہذیبی مزاج رُو بہ زوال ہو گیا۔ یہ کتاب [illegible]عرے کے عروجی دور سے شروع ہوتی ہے اور اس کے زوال آمادہ دور تک کی تاریخ [illegible]واسطہ سامنے لے آتی ہے۔

اسے مکتبہ شانِ ہند نے خوبصورت انداز میں شائع کیا ہے۔

انور سدید

"اوراق" خاص نمبر، جون جولائی سنہ ۱۹۹۱ء

Phone 3275602 Regd. No. D-(DN)-353

SHAN-E-HIND MONTHLY NEW DELHI-110002 DECEMBER, 199[illegible]

Regd. with the Registrar of Newspaper at R. No. 644/57 Delhi Postal.